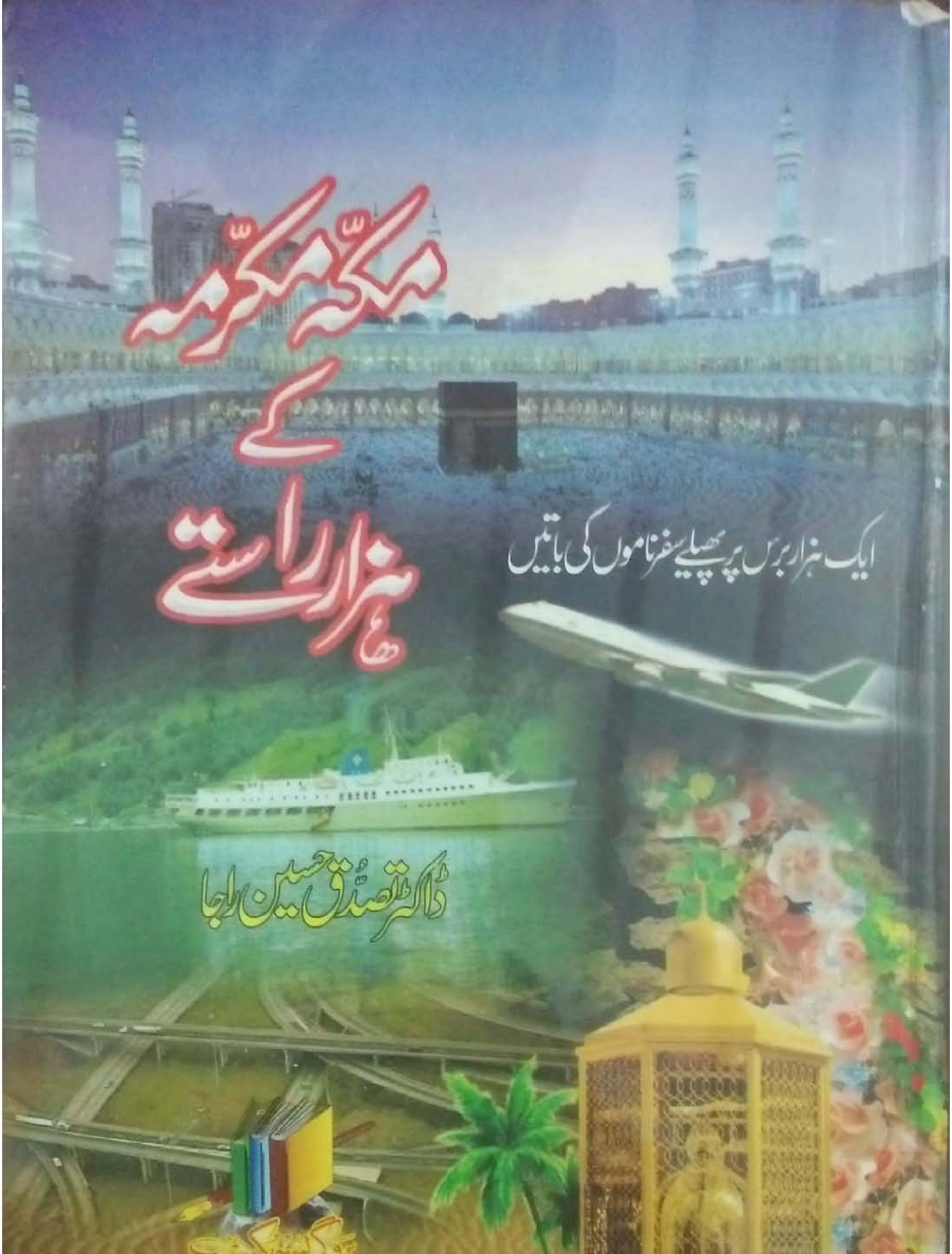

مکّہ مکرّمہ کے ہزار راستے
ایک ہزار برس پر پھیلے سفرناموں کی باتیں
ڈاکٹر تصدُق حسین راجا
پروگریسو بکس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پروگریسو بکس

ایک ہزار برس پر پھیلے سفرناموں کی باتیں

ONE THOUSAND ROADS TO MAKKAH

مکۂ مکرمہ کے ہزار راستے

1050-1990ء

تدوین و تعارف: مائیکل وُلف

مترجم: ڈاکٹر تصدّق حسین راجا

نام کتاب..........................مکہ معظمہ کے ہزار راستے

(ایک ہزار برس پر پھیلے سفرناموں کی باتیں)

one Thousand Roads to Makkah

تدوین وتعارف..........................مائیکل وولف

ترجمہ..........................ڈاکٹر تصدق حسین راجا

سن اشاعت (اردو ترجمہ) 2004ء

پرنٹرز.......................... زاہد بشیر پرنٹرز

ناشر..........................چوہدری غلام رسول میاں جواد رسول

قیمت.......................... (پاکستانی کرنسی)

ISBN..........................969-8325-05-Q

ملنے کا پتہ

پروگریسو بکس۔ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

042-7124354-7352795

اسلام بک ڈپو۔ 12 گنج بخش روڈ لاہور

ملت پبلی کیشنز۔ فیصل مسجد اسلام آباد: 051-2254111

انتساب

اُن کے نام

جو سینکڑوں برس پہلے مختلف قافلوں کے ہمراہ نکلے تو تھے حج کرنے لیکن اللہ کے گھر تک پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں راہزنوں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔ حج کی ابتدا اگر گھر سے نکلنے والے پہلے قدم سے ہو جاتی ہے تو اِن کا حج اللہ تعالیٰ جل شانہ نے قبول فرما لیا ہوگا۔

فہرست

☆☆☆

ISBN 969-8325-05-0

عرض مترجم

یہ سب تیرا کرم ہے آقاؐ............

''مکہ مکرمہ کے ہزار راستے'' امریکی نومسلم'' مائیکل عبدالجید ولف کی تدوین ہے۔ کتاب انگریزی زبان میں "One Thousand Roads to Makkah" کے عنوان سے 1997ء میں امریکہ سے شائع ہوئی تھی۔ مائیکل ولف مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اپنا پورا نام مائیکل عبدالجید ولف لکھتے ہیں لیکن قلمی نام مائیکل ولف ہی ہے ان کی دیگر مطبوعہ کتابیں یہ ہیں۔

1۔ آنکھوں سے اوجھل ہتھیار (فکشن) (Invisible Weapons)

2۔ سفرنامہ مراکش (Travel In Morocco)

3۔ حج۔ ایک امریکی کا سفرِ حج (THE HADG: An American's Pilgrimage to Makkah)

4۔ (شاعری)۔ محبت کیسے پھیلتی ہے (How Love Gets Around)

۔آپ کی اپنی دُنیا (World Your Own)

۔نہیں تم نے سُرخ جوڑا پہنا تھا (No, You Wore Red)

مجھ تک ایک نسخہ برادر مکرم کیپٹن (ر) راجہ مقبول حسین جنجوعہ کی وساطت سے پہنچا تھا، جو اپنے بچوں سے ملنے امریکہ گئے ہوئے تھے۔ مجھے جس وقت یہ کتاب ملی میں ان دِنوں "Miracles Of The Quran" By Haroon Yahya کے ترجمہ واشاعت سے فارغ ہوا تھا اور ''معجزات قرآن'' کو طبع ہوئے صرف ایک ماہ ہوا تھا۔ دل تو یہی چاہا تھا کہ کچھ مدت کا وقفہ ڈال کر نئی کتاب ترجمے کے لیے منتخب کی جائے تاکہ دم لے کر نئے منصوبے پر کام شروع کیا جائے مگر یہ کتاب میرے ہاتھوں میں کیا پہنچی کہ بغیر کسی وقفے کے فوراً کام شروع کرنے پر طبیعت آمادہ ہوگئی۔ کتاب ضخیم تھی، اور 550 صفحات کے ترجمے پر کم از کم چار ماہ درکار تھے جس میں پانچ سے چھ گھنٹے بلاناغہ بیٹھنے کی پابندی ضروری تھی۔

دو نفل ادا کیے، پروردگار سے دعا مانگی کہ کام وقت پر مکمل ہو اور اس سے قبل جو گیارہ کتابیں ترجمہ کی تھیں (جن کی تفصیل اسی کتاب میں ''تعارف مترجم'' میں موجود ہے) یہ کتاب ترجمے کے حوالے سے ان

سے بہتر ترجمہ پر مشتمل ہو۔ اس بار کتاب کا موضوع (سفر حج) مجھے اجازت دیتا تھا کہ بطور مترجم اردو میں بھی ویسا ہی خوبصورت اسلوب اختیار کروں جو انگریزی میں مائیکل ولف نے اپنایا تھا جسے اس کتاب کی تدوین کے دوران ایسا کرنے کی آسانی اس لیے حاصل تھی کہ وہ خود انگریزی فکشن لکھتا رہا تھا۔ اللہ نے اس سے قبل بھی مجھے بارہا اپنے کرم اور خاص مہربانی سے نوازا تھا اور اس بار بھی اس نے میری دعا کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے میری آرزو پوری کردی ہے جس کی تصدیق قارئین کتاب پڑھ کر خود کریں گے۔

علم وادب سے جن قارئین کا رشتہ پرانا ہے وہ یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ ترجمہ خواہ کسی بھی ایک زبان سے دوسری زبان میں ہو، موضوع کوئی بھی ہو یہ بھی اسی قدر محنت طلب کام ہے جس قدر ادب میں محنت طلب کوئی تخلیقی کام ہوتا ہے۔ مجھے ملک کے صف اوّل کے مترجمین میں شمار ہونے کا نہ دعویٰ ہے نہ ہی اس کی کبھی خواہش کی البتہ ایک بات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اللہ کی طرف سے ایک اضافی مہربانی ہمیشہ میرے شامل حال رہی اور آج سے نہیں عملی زندگی میں قدم رکھنے (1955ء) کے ساتھ سے ہی، جس کا ذکر میں ''جادۂ حیات'' (سن اشاعت 1980ء) کے پیش لفظ میں بھی اس طرح کر چکا ہوں کہ ''مجھے ایک عرصے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی غیبی طاقت میری انگلی پکڑے میری رہنمائی فرما رہی ہے۔ اللہ کرے یہ صورت حال قائم رہے'' اور آج 24 برس مزید گزرنے کے بعد بھی میرے پروردگار کے خاص فضل اور میرے آقاؐ کی نظر اور مرشد باہوؒ کے وسیلے سے یہ صورت حال بدستور قائم ہے چنانچہ ان تراجم کے دوران تین بار کچھ باتیں عالم خواب کے ذریعے ایسی پیش آئیں جنہوں نے میرے تراجم کو میرے ہم منصب مترجمین کے کام سے منفرد بنا دیا ہے۔ 1998ء میں میں نے The Life Of Muhammad (PBUH) The Prophet Of Allah By Suleman Ibrahim & A. Dinet کا ترجمہ ''سید مکی مدنی العربی ﷺ'' کے نام سے کیا تھا جس کی اشاعت 1998ء میں مکتبہ جدید لاہور نے کی تھی۔ اس کتاب کا مسودہ پریس جا رہا تھا کہ میں نے (میں ان دنوں مقتدرہ قومی زبان کے دارالترجمہ کے سربراہ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا) اپنے چیئرمین افتخار عارف صاحب سے اس کتاب کے شروع میں کوئی ایک شعر شامل کرنے کے بارے میں ذکر کیا اور ان سے اس سلسلے میں مدد چاہی۔ شعر جو انہوں نے تجویز کیا وہ میر محمد علی رائج سیالکوٹی کا تھا جو 1150ء کے شاعر تھے:

من ز خورشید قیامت چہ خطر داشتہ ام

سایہ صاحب بے سایہ بہ سر داشتہ ام

مجھے یہ شعر پسند آیا اور میں نے اسے کتاب کے شروع میں لگا دیا تھا۔ اسی رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک نئے تعمیر شدہ کمرے میں کھڑا ہوں جس کی چھت کے سوراخوں سے ریت اندر آ رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فرش گندا ہو رہا ہے تو وہ سوراخ بند ہو جاتے ہیں لیکن اب چھت سے پانی ٹپکنا شروع ہو جاتا ہے۔ میں پھر سوچتا ہوں کہ فرش تو اسی طرح اب بھی گندا ہو جائے گا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ پانی ٹپکنا بند ہو جاتا ہے اور چھت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک چادر تن جاتی ہے اور اسی خوشی میں میری آنکھ کھل جاتی ہے اپنے سر پر اس تنی چادر والی چھت کا سایہ دیکھ کر ایک طمانیت سی محسوس ہو رہی تھی۔

دوسری بار دو ایک سال کے وقفے سے "سیدنا بلالؓ" کی اشاعت ہوئی یہ ترجمہ تھا۔ Bilal (RAU) By H.A.L. Craig کا۔ جس روز مسودہ پریس جا رہا تھا اس روز موسم گرما میں ظہر کی نماز کے بعد میں جائے نماز پر گھر میں لیٹ گیا تھا۔ میں اس وقت گھر پر اکیلا تھا۔ آنکھیں بند تھیں جو وقفے وقفے سے میں نیم وا کر کے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، میرا سونے کا ارادہ تھا نہ ہی نیند آ رہی تھی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سیاہ فام بزرگ، افریقی لباس زیب تن کیے کمرے میں کبھی ایک طرف جاتے ہیں کبھی دوسری طرف اور آواز آتی ہے "میں بلالؓ ہوں...... میں بلالؓ ہوں" میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اور اب "مکہ مکرمہ کے ہزار راستے" کا ترجمہ جاری تھا اور میں ایک ایسے سفرنامہ نگار کی روداد حج کا ترجمہ کر رہا تھا جسے جدہ میں کسی شخص سے ایک ڈرافٹ کیش کرانا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں جدہ میں بنک نہیں تھے اور بنکوں کے نہ کھولے جانے کی وجہ وہ یہ بیان کرتا ہے کہ قرآن میں چونکہ سود کو حرام قرار دیا گیا ہے اس لیے مسلمان بنک کھولنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اس کے فوراً بعد اس نے ایک جملہ یہ لکھا ہے کہ "ہنڈی" بھی تو بنک کی طرح کے کاروبار پر مشتمل ہے وہ سود کیوں نہیں تصور ہوتا اور یہ کہ سود پر مسلم سکالرز نے بھی تو اپنی رائے دی ہوئی ہے۔ غالباً اس کا اشارہ ان علماء کی طرف ہوگا جو بنک کے سود کو منافع بتا کر اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرنے والوں کے لیے ڈھال بن گئے ہیں۔ میں اس پر رکا اور معاً مجھے یہ خیال آیا کہ مائیکل ولف نے یہاں بطور مدون کے تردیدی نوٹ کیوں نہیں دیا کہ اسے مصنف کی رائے سے اختلاف ہے۔ میں نے اسے ضروری اس لیے سمجھا تھا تا کہ قارئین اس تحریر سے کہیں اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں کہ بنکوں سے بنک اکاؤنٹس پر ملنے والا سود منافع ہی

''حسن دیوانہ'' کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ میں نے 1328ء میں اس شخص کو خود دیکھا تھا۔ یہ شروع سے دیوانہ نہیں تھا۔ یہ کسی زمانے میں ایک بزرگ نجم الدین اصفہانی کی خدمت میں رہتا تھا جس زمانے میں شیخ مکہ میں تھے۔ حسن رات کا زیادہ وقت طواف میں گزارتا تھا اور اسے ایک صوفی طالب علم بھی صرف رات کو ہی طواف کے دوران نظر آتا تھا۔ ایک رات وہ صوفی نوجوان حسن سے ملا اور اس سے کہا! ''تمہاری ماں تمہارے لیے روتی رہتی ہے، ماں سے ملنا چاہتے ہو؟'' حسن نے کہا'' مگر وہ تو اس دنیا میں نہیں ہے'' صوفی نے جواب دیا۔ ''دیکھتے ہیں اللہ کیا کرتا ہے''۔ اگلی رات جو جمعرات کی رات تھی مُعلی دروازے کے باہر صوفی طالب علم اور حسن ملے، حسن کو کہا گیا کہ آنکھیں بند کرلو اور میری قمیض بازو سے پکڑلو۔ حسن نے ایسا ہی کیا اور آنکھیں کھولیں تو ماں کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ اندر گیا اور تین ہفتے تک ماں کے پاس رہا۔ پھر ایک روز وہ قبرستان گیا تو صوفی طالب علم سے ملاقات ہوگئی اور حسن نے کہا کہ وہ شیخ نجم الدین سے ملنا چاہتا ہے کیونکہ کئی روز سے وہ ان سے نہیں ملا۔ طے پایا کہ وہ دونوں رات کو ملیں گے۔ رات کو حسن اسی قبرستان میں پہنچا تو صوفی وہاں موجود تھا۔ وہ حسن کو جس طرح لے گیا تھا اسی طرح واپس لے آیا۔ صوفی نے حسن کو تاکید کی کہ اس واقعہ کا ذکر شیخ نجم سے نہ کرے مگر شیخ کے مجبور کرنے پر کہ حسن اتنے روز کہاں رہا حسن نے شیخ کو جو اس کے ساتھ بیتی تھی اس کی ساری کہانی سنا دی۔ صوفی اتفاق سے وہاں پہنچ گیا تھا اور حسن کو شیخ نجم کو سارا واقعہ سناتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے حسن کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا'' خاموش ہو جاؤ'' اور لوگ بتاتے تھے کہ پھر اس کے بعد حسن ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ وہ طواف تو رات کو اب بھی کرتا تھا مگر بولتا کسی سے نہ تھا نہ لباس کا خیال رہا نہ کھانے پینے کا۔ لوگ اس کی خدمت کرتے اور دعاؤں کی درخواست کیا کرتے تھے۔ 1329ء میں اسے مصر سے حج پر آنے والا سلطان کا گارڈ واپس مصر لے گیا تھا۔

میں مزید کیا کہوں، کتاب کا مطالعہ کیجیے اور اس مقدس سفر میں آپ بھی شامل ہو جایئے۔ کہیں کوئی کمی محسوس ہو، کوئی تجویز دینی ہو تو ضرور رابطہ کیجیے اس لیے کہ اس کتاب کے اور ایڈیشن بھی (انشاءاللہ) شائع ہوں گے، اس کی مقبولیت کا مجھے پورا پورا اندازہ ہے۔

آخر میں مجھ پر کچھ احباب کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ جنہوں نے کسی نہ کسی حوالے سے میری مدد بھی کی اور میرا حوصلہ بھی بڑھایا کہ میں اتنے بڑے کام کو مختصری مدت میں تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ پروفیسر غلام یاسین انجم، عزیز محترم اقرار حسین شیخ (اسسٹنٹ ڈائریکٹر نیشنل لائبریری آف

پاکستان) اسلام آباد، قاضی محمد صدیق صاحب (جلالپوری) فراست شفیع اللہ صاحب (سابق لائبریرین، سینٹرل لائبریری، سلطانہ فاؤنڈیشن) شامل ہیں۔ میری بہوارم زبیر راجااوراس رفیقہ حیات نے جو کتاب اور میرے علمی وادبی کاموں کو ہمیشہ اپنی ایک ایسی سوکن سمجھتی رہی ہیں جس کے ساتھ ایک ہی چھت تلے دونوں نے کم وبیش 23 برس مل جل کر گزار دیئے ہیں، اس کام کے دوران مجھے آرام پہنچانے کا بڑا خیال رکھا۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔

مزید دونو جوانوں نے میرے لیے بڑا کام کیا: عزیزم ہارون الرشید نے اس کتاب کا خوبصورت ٹائیٹل بنانے میں بڑی محنت کی اور عزیزم جواد رسول نے اس کی اشاعت کو ملت پبلی کیشنز سے کم سے کم عرصے میں ممکن بنایا۔ میں دونوں کا ممنون بھی ہوں اور دونوں کے لیے دعا گو بھی کہ میرے آقاؐ کے روضے کی حاضری اور اللہ کے گھر کا سفر انہیں بھی نصیب ہو (آمین)۔

☆☆☆

پیش لفظ

جس دوران میں نے حج کیا تھا، اس وقت 1990ء اور 1993ء کے درمیان میں نے حج پر ایک کتاب لکھی تھی۔ مجھے تب اس بات کا علم ہوا کہ گذشتہ ایک ہزار برس کے دوران ان مسلمانوں اور غیر مسلموں نے جو کئے گئے تھے حج کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ کچھ ہی عرصے بعد میں نے ترتیب کے ساتھ ان کی تحریروں کو پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس مجموعے میں جن پہلے تین مصنفین کی تحریروں سے میں نے اقتباسات پیش کیے ہیں، انہیں تلاش کرنا میرے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ نصر خسرو (1050ء) ابنِ جُبیر (1185ء) اور ابن بطوطہ (1326ء) تینوں مستند سیاح ہیں۔ دیگر کتب بھی جو یقیناً معروف ہیں اور جن کے مصنفین کا تعلق مغربی دنیا سے ہے مثلاً سر رچرڈ برٹن (1853ء) اور میلکم ایکس (1964ء) کتب فروشوں کے ہاں سے بہ آسانی دستیاب ہیں۔ کتابیاتی تحقیق اور سکالرز کو شمار کرنے کی کوشش نے مجھے ان کتب سے بھی متعارف کرایا جو اس سے قبل میری نظر سے نہیں گزری تھیں۔ ان میں سے چند ایک نادر نسخے تھے جو میں نے بیرونِ ملک کتب خانوں سے منگوائے۔ جس دوران یہ کتب میرے ہاتھوں میں ہوتی تھیں، ان میں سے کچھ کے پہلے ایڈیشن کبھی کبھی میرے ہاتھوں میں ورق ورق ہو جاتے تھے مگر میرے مطالعے کا یہ اختتام نہیں تھا۔ ہر کتاب کو سیاق و سباق کے حوالے سے پڑھتے وقت کئی دوسری کتابوں کا حوالہ ملا۔ ان میں تاریخ، دینیات اور مغربی ادبی تنقید کی کتابیں شامل تھیں۔

میں نے اس کام کے دوران لطف اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ میرا یقین پختہ تر ہوتا گیا کہ یہ ادب یکجا کئے جانے کے قابل ہے۔ یقیناً باعمل مسلمانوں کو اس مجموعے میں اپنی دلچسپی کی بہت سی باتیں ملیں گی۔ دوسرے لوگوں کو اِن کہانیوں میں مُہم جوئی کا لطف حاصل ہوگا۔ ان کی ثقافتی اہمیت بھی بالخصوص ان مغربی لوگوں کے لئے بہت ہوگی جو اسلام کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیوں کے دور میں زندہ ہیں۔ اسلام دنیا کے ان 54 ممالک میں اکثریتی آبادی کا مذہب ہے، جن میں سے زیادہ تر مشرق وسطیٰ، مشرقی دنیا اور افریقہ میں واقع ہیں۔ مزید یہ کہ آج کل کئی ملین مسلمان مغربی دنیا کے شہروں اور ملکوں میں اور مغربی دنیا کی ہمسائگی

میں زندگی بسر کرر ہے ہیں۔ یہ اب کوئی راز کی بات نہیں رہی کہ اس صورت حال میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات ہر طرف سے غلط فہمیوں کا شکار ہیں اگر آج مغربی دنیا کے لوگوں کے لیے اسلام کے بارے میں جاننا ضروری ہو گیا ہے تو ان کے اس علم میں حج ایک راستہ مہیا کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کے مذہب میں بیشک سالانہ حج کی ادائیگی جو مکے کے سفر سے ہوتی ہے ایک عمدہ اظہار ہے۔ مناسکِ حج میں عقیدے سے متعلق تمام اصولی باتیں موجود ہیں جو ان مناسک کی ادائیگی کے دوران مزید کُھل کر سامنے آتی ہیں مزید یہ کہ ان حاجیوں کے اُس سفر کے حالات، جو یہ آج سے تیرہ صدیاں قبل سے کرر ہے ہیں اس اسلامی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں جو دنیا کی بہت بڑی سوسائٹی ہے، جس کے کئی مراکز ہیں اور اس کا اتنا مضبوط مذہبی پہلو ہے جس کا مغربی دنیا کے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

حج کی ادائیگی محض ایک مذہبی رسم کے پورا کرنے کی کھوکھلی بات نہیں ہے۔ حج کے سفر کے یہ حالات بوقتِ ضرورت ایک ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ یہ ہر قسم کے مسلمان کے لیے ایک مسلسل، دلکش قوت ہے حج کی ادائیگی کے لیے کئی لوگ ہزاروں میل کا سفر طے کرتے ہیں، کثیر تعداد میں آتے ہیں اور ہر مشکل اور پریشانی سے گزر کر مکے پہنچتے ہیں۔ ایک تسلسل ہے کہ اب تک جاری ہے جدید دور میں بھی یہ ختم نہیں ہوا۔ اسے تو بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ فروغ حاصل ہوا ہے۔

حج اور اس سے متعلق تحریریں غیر مسلم قارئین کے لیے اِسلام کو ایک نئے طریقے سے جاننے کا موقع فراہم کرتی ہیں، وہ بھی بطور خاص اس وقت جب اس پر بہترین لکھنے والے اکثر مصنفین کا تعلق مغرب سے ہے۔ اس مجموعے میں جن سفرناموں کو شامل کیا گیا ہے ان میں سے دو تہائی کے لکھنے والے یورپی اور امریکی ہیں۔ یہ اسلامی تہذیب کی ثقافتی قدر و قیمت کو مغربی زبانوں اور افکار میں پیش کر کے اسے زیادہ واضح کرتے ہیں۔ ان کتب میں سے چند ایک تو صرف اپنے عہد میں مقبول ہوئیں مگر کچھ ایسی بھی ہیں جو آج تک اسی پسندیدگی سے پڑھی جاتی ہیں۔ مکہ و مدینہ پر برٹن کی کتاب انیسویں صدی میں انگریزی میں لکھے گئے سفرناموں میں بہترین ہے اسی طرح میلکم ایکس کی حج پر لکھی گئی کتاب بیسویں صدی میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب تھی۔ مگر حیرت ہوتی ہے اس بات پر کہ غیر مسلم ان کتابوں کے بارے میں جانتے ہیں مگر پھر بھی اسلام اور حج مکہ کے متعلق ان کا تصور واضح نہیں ہے؟ میں نے یہ توقع رکھی کہ ان غیر مسلموں کے لیے یہ مجموعہ تدریسی بھی ثابت ہو گا جو اسلام سے تو واقف تھے مگر نہ جانے کیوں حج کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے۔ میرا

یہ خیال بھی تھا کہ مغربی دنیا کے اکثر قارئین جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ان دونوں کے بارے میں تقریباً کچھ بھی نہیں جانتے وہ بھی اس سے مفید ہوں گے۔ یہ کتاب ان سیاحوں کے سفرناموں کے منتخبات پر مشتمل ہے جنھوں نے حج ادا کیا اور اس بارے میں کم از کم حسن تحریر سے کام لیا۔ یہ کتاب زمانی طور پر سن وار آگے بڑھتی ہے جس کا آغاز گیارھویں صدی کے وسط سے شروع ہوا اور جو بیسویں صدی میں اختتام کو پہنچی۔ میں نے سفرناموں کے انتخاب میں تنوع کو پیش نظر رکھا ہے تاکہ قارئین کو بتا سکوں کہ صدیوں کے اس طویل سفر میں حج کے کن کن پہلوؤں میں تبدیلی آئی ہے اور حج کی مذہبی رسوم دائمی رہ کر کس طرح بہتر ہوئی ہیں۔ ایسے سفرنامے جن میں حج سے واپس آنے والے حجاج نے اپنے سفر کو اپنے دوستوں اور عزیزوں کے لیے یادگار بنانے کے لیے عارضی سی مختصر باتیں لکھیں میں نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ صرف ایسی بنیادی دستاویزات یکجا کروں جن میں ایسی باتیں شامل ہوں جنہیں جذبات کے بجائے سنجیدگی سے دیکھا گیا ہو۔ بدقسمتی سے ترک مصنفین کا کوئی سفرنامہ شامل کتاب نہیں ہے حالانکہ استنبول میں قائم دربار عثمانیہ نے پانچ صدیوں تک حج کے سفر دیکھے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کا سبب صرف اچھے تراجم کی کمی ہے۔ یہی معاملہ جنوب مشرقی ایشیاء کی تحریروں کو درپیش تھا۔ یہ خطہ حاجیوں کی ایک بڑی تعداد کو حج کے لیے بھیجتا ہے۔ مگر ایسے سفرنامے کی مفصل روداد صرف ایک ایسی انگریزی میں لکھی گئی کتاب میں ہے جس میں ایک صحافی اودون رٹر نے 1937ء میں ایک تیسرے شخص کے طور پر اپنے سفر کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح 1848ء میں تحریر کردہ "احمد کا حج" اور لیون روچز کا "Dix ans a travers' Islam"(1834-44) دونوں بہترین کتابیں ہیں مگر میں نے دونوں کو اس مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ میں نے اپنے اس مجموعے کے لیے انتخاب پر زیادہ زور دیا ہے ہر سفرنامہ شامل نہیں کیا۔

تین سفرنامے فارسی سے ترجمہ کیے گئے اور انگریزی ایڈیشنوں میں الفاظ کے ہجے وہی برقرار رکھے گئے ہیں۔ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ عربی کے انگریزی میں قریب ترین الفاظ میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک مرکزی اصطلاح "طواف" کے اصل سفرناموں میں چھ مختلف ہجے لکھے گئے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے ناموں اور مقامات کے ناموں کے ہجے بھی مختلف ملتے ہیں۔ مکہ کو کہیں "ای" کے ساتھ، کہیں اے کے ساتھ۔ پھر کہیں ڈبل سی سے تو کہیں ڈبل "کے" سے لکھا گیا ہے۔ مصر میں بیسویں صدی کے ایک حکمران صلاح الدین کو مختلف ہجوں سے لکھا جاتا ہے۔ جب ہجے بدل جائیں تو کہیں کہیں پہچان اور

شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ میں نے اس مجموعے میں کوشش یہ کی ہے کہ پوری کتاب میں املا کی معیار بندی کر دوں۔ زیادہ ممیز نشانات کو میں نے حذف کر دیا ہے۔

کُل 23 سفر ناموں کو پانچ تاریخی ادوار میں تقسیم کر کے ان کے ساتھ مختصر تعارفی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ مضمون کے عنوان کے نیچے دی گئی تاریخیں اس سال کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس سال مصنفین نے حج کیا تھا۔ اس پیش لفظ کے بعد ایک طویل عمومی تعارف آئے گا جو حج کو ایک وسیع تناظر میں پیش کرے گا۔ کہیں کہیں اقتباسات کی تدوین بھی کی گئی ہے یا متن کو زیادہ سے زیادہ قابل مطالعہ بنانے کے لئے کسی کسی جگہ سے کچھ کاٹ دیا گیا ہے۔ ایسے قارئین جو حج اور مکہ کے بارے میں ایسی مکمل تاریخی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں جو ابتدائی ماخذ پر مبنی ہوا نہیں چاہیے کہ ایف ای پیٹر کی 1994ء کی جلدوں کی طرف رجوع کریں۔ دوسری جانب یہ کتاب ایک سفر کی داستان ہے جو گھر سے شروع ہوا اور مکہ تک جاری رہا، خواہ گھر کہیں بھی ہو اور جسے سیاحوں نے ایک ہزار برس کے دوران قلمبند کیا۔

حج کی کہانی ہمیشہ ایک سادہ سی کہانی نہیں ہوتی۔ اس کا انتظام و انصرام بہت سے تجربہ کار حکمرانوں کے ہاتھوں میں رہا ہے اور اس میں جس بیزاری کا مظاہرہ کیا گیا وہ بے حد تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ اس کا ایک اور رُخ یہ بھی ہے کہ حج نے ہر قسم کے سیاح کو اپنی طرف کھینچا ہے، جس سے یہ مجموعہ مختلف ثقافتوں اور شخصیات کا ایک گنجلک مرکب بن گیا ہے۔ کتاب کے ان صفحات میں شعراء، سرکاری اعلیٰ افسروں، جاسوسوں، ملکاؤں، سکالرز، ناول نگاروں، وجودیت کے نظریے کے پیروکاروں اور ایمان کامل رکھنے والوں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں جن مصنفین کو نمائندگی حاصل ہے ان میں فارسی، مراکشی، افغانی، مکی، اسپینی، آسٹریلوی، ہندوستان کے ہندی، آسٹریائی، اطالوی، سوس، امریکی اور برطانوی شامل ہیں۔ ہر اقتباس کی شمولیت سے ایک طویل کہانی شامل ہو جاتی ہے۔ ان سیاحوں کو ہم اس وقت زیادہ بہ نظر تحسین دیکھ سکیں گے اگر ہم اس دور پر نظر رکھیں جس سے ان کا تعلق تھا۔ میں جو کہتا ہوں اس میں میرے تحفظات شامل ہوتے ہیں کیونکہ میرے کرائے گئے تعارف کا اختصار ان کے دائرے کو بہت حد تک محدود کر دیتا ہے۔ کتابیات میں جن کتب کی فہرست دی گئی ہے وہ ان کتابوں کی ہے جن کے مطالعہ کی سفارش کی گئی ہے۔

مائیکل ولف، بہار 1997ء

عمومی تعارف

رسم ایک کتاب کی طرح ہوتی ہے جس میں بہت کچھ لکھا ہوتا ہے۔ ایک رسم کے اندر اکثر ایک سو سے زیادہ کتابیں شامل ہوتی ہیں۔

(جارج گرد جیف، نامور انسانوں سے ملاقاتیں)

حج یا مکہ تک کا سالانہ سفر بنی نوع انسان کی نہایت پائیدار مذہبی رسم ہے۔ دنیا بھر کے کئی ملین مردوں اور عورتوں کو اس نے تقریباً 14 سو سال سے ایک روحانی منزل مہیا کر رکھی ہے۔ اس کی دلکش قوت نے عظیم سلطنتوں سے زیادہ پائیداری حاصل کر لی ہے۔ نصف دنیا سے تجارتی راستے بن گئے ہیں اور جنگ، قحط اور طاعون کی وبا پھیل جانے کے باوجود اسے دوام حاصل ہے۔ آج اسلام دنیا کا دوسرا سب سے بڑا اور سب سے تیز پھیلنے والا مذہب ہے۔ حج اس کی سب سے بڑی عوامی مذہبی رسم ہے۔ ہر سال 125 ممالک سے 2 ملین سے زیادہ مسلمان حج ادا کرتے ہیں۔ ایک مقام پر ایک ہی وقت میں ایک خاص مقصد کے لیے زمین پر یہ دنیا کا واحد سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ اس سفر کا مقصد ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے: لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو ان کے گھروں سے جدا کر کے اسلام کی جائے پیدائش میں لے آنا جہاں تمام انسان اپنے خالقِ حقیقی کے حضور اتحاد و یکجہتی کا ثبوت دیتے ہیں۔ حج کی پہلی شرط یہ ہے کہ ایک مخصوص وقت پر پہنچا جائے اور مسلمان برادری کے ساتھ طے شدہ دنوں میں پہنچنے کا وعدہ پورا کیا جائے۔ مکہ پہنچنے کے بعد حجاج ایک ہفتے کے دورانیے پر مشتمل مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔

حج ایک اجتماعی رسم کی ادائیگی بھی ہے اور ایک بالکل ذاتی تجربہ بھی جو ایک مسلمان کی زندگی کا مذہبی عروج تصور کیا جاتا ہے۔ ابتدائے زمانہ ہی سے اسلامی سفرناموں میں اسے ایک مرکزی موضوع کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ عربی میں اسے رحلۃ اور فارسی میں سفرنامہ کہتے ہیں۔ عہد وسطیٰ کے ابتدائی دنوں سے یہ سفرنامے قارئین کے لئے معلومات کے ساتھ ساتھ لطف و مسرت کا سامان بھی مہیا کرتے چلے آرہے ہیں اور انہیں شہروں، غیر ملکی خطوں اور مکہ تک اور مکے سے واپسی کے مقامی سفر کے بارے میں مستند معلومات فراہم

کرتے رہے ہیں۔اس کے علاوہ یورپی نشاۃ ثانیہ سے شروع کر کے مکہ تقریباً چار صدیوں تک چند ادیبوں کی منزل بھی بنا رہا، جن کا تعلق مسیحی مغرب سے تھا۔انہوں نے کسی نہ کسی بہانے اس شہر میں داخل ہونے کو اپنے لیے ممکن بنالیا تھا جس میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع تھا۔ان سیاحوں نے (خواہ وہ مسلمان تھے یا اپنے آپ کو صرف مسلمان ظاہر کر رہے تھے) بہت بڑا خطرہ مول لے کر اپنے سفر کے حالات قلمبند کیے۔ان دونوں روائتوں سے جو حالات معلوم ہوئے انہیں اس کتاب کا موضوع بنایا گیا ہے۔قارئین ان کو بہ نظر تحسین صرف اسی وقت دیکھ سکیں گے جب وہ سب سے پہلے اسلام، مکہ اور مناسک حج کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کرلیں۔

اسلام کی روایت

اسلام کی وہ تاریخ جو بہت پھیلی ہوئی ہے اس سے باہر نکل کر دیکھا جائے تو اسلام اسی قدر ایک ''مغربی'' مذہب ہے جس قدر یہودیت اور عیسائیت۔یہ تین ایک دوسرے سے ملتے جلتے عقیدے اصلاً سامی ہیں جو کئی جگہ بہت گہرائی میں ایک دوسرے کو مَس کرتے ہیں، جہاں یہ ایک واحد ثقافتی بنیاد توحید کی قدیم مغربی ایشیائی روایت کے اندر واضح طور پر ہم پہلو تہیں پیدا کر دیتے ہیں۔یہ رشتہ و تعلق جغرافیائی سے کہیں بڑھ کر ہے۔اپنے بڑے عم زادوں کی طرح اسلام ایک ابراہیمی عقیدہ ہے اور تورات کے بار بار دہرائے جانے والے مضامین کے مطابق ہے۔صرف اس واحد بنیاد پر اسے روحانی عکسی تصویر کے تیسرے حصے کی مانند قرار دیا جاسکتا ہے۔اس دین کی اپنی مقدس آسمانی کتاب قرآنِ حکیم میں اسلام کو اس دائمی مذہب کو تسلسل دینے والا بتایا گیا ہے جو یہودیت سے بہت پہلے موجود تھا، جس کی یہودیوں نے تجدید کی جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعد میں کریں گے اور قرآن پاک میں آتا ہے:

ہم اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور اس پر جو ہمارے لیے بھیجا گیا، جسے حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ حضرت اسحٰقؑ پر اور ان کی اولاد پر منکشف کیا گیا اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اور دوسرے تمام پیغمبروں کو اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا۔ہم ان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

قرآن کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ ''یہ کوئی ایسی کہانی نہیں جسے گھڑ لیا گیا ہو۔یہ تو اس سب کی تصدیق کرنے والی کتاب ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔''اس کے ابواب کا دو تہائی حصہ وہ ہے جس میں بائبل اور

اس میں مذکور پیغمبروں کے حوالے ہیں۔حضرت آدمؑ ،اماں حواؑ، ابراہیمؑ ،نوحؑ ،لوطؑ ،یونسؑ ،موسیٰؑ ،ہارونؑ، داؤدؑ ،ہابیل کا بڑا بیٹا اور جان بپٹسٹ ،عیسیٰؑ اور مریمؑ کو روحانی ہیروز کے طور پر الگ کر دیا گیا ہے جن پر تمام جہانوں کے مالک کا بڑا فضل تھا اور جنہیں ربانی رہنمائی حاصل تھی۔ یہ کوئی محض ادبی استعارہ نہیں ہے یہ تو ایک پیغمبرانہ شجرۂ نسب ہے جس میں مسلمان یقین رکھتے ہیں۔وہ بلا ناغہ اپنی نمازوں میں ایک روایت کے طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابراہیم علیہ السلام کے نام بطور پیغمبروں کے لیتے ہیں۔اللہ اور سیلاب کا خدا ایک ہی خالق کے لیے پکارے جاتے ہیں۔تورات اور انجیل کے برعکس قرآن کوئی تاریخی ریکارڈ کسی سیاق وسباق میں پیش کرنے کا متمنی نہیں ہے۔قرآن میں وقت کو ہمیشہ موجودہ وقت کے طور پر دکھایا گیا ہے اور اس کے ہر ہر ورق پر جو الفاظ ہیں وہ اللہؐ کا کلام ہے۔ان معنوں میں اسلام سے اس کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا عیسائیت سے عیسیٰ علیہ السلام کا ہے۔لفظ مجسم کلمہ کی جگہ ہمارے پاس ایک لفظ اور ہے جسے حرکت میں آئی ہوئی آواز کہا جا سکتا ہے۔مسلمان آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مثالی انسان اور عظیم پیغمبر کے طور پر مانتے اور عزت واحترام کے انتہائی مقام کے قابل تصور کرتے ہیں۔آپؐ نے دنیاوی کاروبار زندگی بھی سنبھالا ،شادی کی ،آپؐ کی اولاد ہوئی ،آپؐ نے معاشرے کو سدھارا اور 62 برس کی عمر میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بچوں کی مرگ پر سوگ منایا ،وہ ناراض بھی ہو سکتے تھے تنک مزاجی کا مظاہرہ بھی کر سکتے تھے ،آپؐ میں حسِ مزاح موجود تھی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک قدم پوری طرح ریکارڈ کیا گیا اور آپ کے الفاظ اور کام کو مفید رہنما سمجھا جاتا ہے مگر اپنی بشری حیثیت میں وہ فانی تھے۔ان کی نہ پرستش کی جاتی ہے نہ عبادت۔انہوں نے اپنے آپ کو خادم سمجھا اور اپنے پیروکاروں کو بھی ایسا ہی کرنے کے لیے ہدایت فرمائی۔

آج بیشک ہمارے پاس کتابوں کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے اور ایک ایسی روایت موجود ہے جس کی مدد سے ہم اسلام کا ایک مغربی مذہب کی حیثیت سے پتہ چلا سکتے ہیں۔ ہمارے پاس آبادی کے اعداد وشمار موجود ہیں۔دنیا میں اس وقت 1.2 بلین مسلمان ہیں اور اسلام دنیا کا وہ واحد مذہب ہے جس کے ماننے والوں کی تعداد اسقفیوں اور یہودیوں سے زیادہ ہے اور ان میں سے نصف ایسے ہیں جو پیدا ہی وہاں ہوئے ہیں۔مغرب میں اسلام کی اس نئی مقبولیت کی وجہ یہ حقیقت ہے کہ اسلام افراد سے عالمگیر طریقوں سے بات کرتا ہے۔تاہم اس کی جڑیں ماضی کے ایک دور دراز کے عہد اور ایک دور دراز واقع شہر مکہ تک پہنچ جاتی ہیں۔

آج اسلام کو سمجھنے اور دورِ جدید کے مسلمانوں اور جن سفرناموں کا ذکر آگے چل کر آنے والا ہے ان کے قارئین کے لیے حج کے معانی جاننے کے لیے اس شہر کے پس منظر سے شناسا ہونا ضروری ہے۔

مکّہ مکرمہ، اسلام کی جائے پیدائش

مکہ عرب کے مغربی ساحل کے ساتھ تقریباً وسط میں اس پہاڑی سلسلۂ کوہ میں واقع ہے جو سدِ راہ کے خطے کا کام کرتا ہے جسے حجاز کہتے ہیں۔ یہ بنجر زمین کا ایک تنگ نو سو میل لمبا راستہ ہے اور خطِ سرطان اس کے درمیان میں سے گزرتا ہے۔ دوسری صدی کے ایک یونانی مصری جغرافیہ دان پٹولمی نے اس شہر کو مکورابا یعنی معبد کہا ہے۔ اس کا ایک شمالی جنوبی طاس بھی ہے جو دو میل لمبا اور بحیرۂ احمر سے مشرق کی سمت 50 میل کے فاصلے پر نصف میل چوڑا ہے۔ مکہ کو موجود رکھنے والا زم زم کنواں ہے جو اس خشک اور بنجر وادی میں جسے بے آب و گیاہ سنگلاخ چوٹیاں گھیرے ہوئے ہیں پانی کا واحد منبع ہے۔ اس کے موسم اور آب و ہوا کا ذکر کرتے وقت اسے دم گھوٹ دینے والی گرمی، آندھیوں اور بادلوں کی طرح سایہ فگن مکھیوں کا مجموعہ کہا جاتا ہے۔ اس سرزمین پر کبھی کوئی فصل نہیں اگتی۔ زمانہ قبل از تاریخ میں اس سرزمین کو "جس پر کھیتی باڑی نہ ہوتی ہو" باقاعدہ آبادی کے لیے بہت مقدس سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اس کنویں کو ایک خاص مقام حاصل تھا جس طرح کا مقام اس خطے میں گرنے والے شہاب ثاقب کو دیا جاتا تھا۔ یہاں پودوں کو کاٹنے کی اجازت تھی نہ جنگلی حیات کے شکار کی۔ ان ممنوعات کے باوجود یہاں ایک شہر آہستہ آہستہ آباد ہو گیا تھا جس کا معمولی سا ذریعۂ آمدنی یہاں آنے والے حاجیوں اور زائرین سے وابستہ تھا۔ چھٹی صدی کے آخر میں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لڑکپن تھا، آپ کا اپنا قبیلہ قریش مکہ کو کنٹرول کرتا تھا۔ وہ اس کے درمیانی حصے میں خالی جگہ پر رہائش پذیر تھا اور مکہ آنے والوں کو تحفظ اور پانی فراہم کرتا تھا۔

شہر کی بڑی سڑکوں کے ایک چوراہے پر کعبہ تھا، جو زم زم کنویں سے چند گز کے فاصلے پر شش پہلو، مکعب نما قدیم طرز کی ایک عمارت تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ عمارت زمانوں سے وہاں کھڑی ہے۔ اس طرزِ تعمیر کی عمارات جزیرہ نما عرب کے دوسرے حصوں میں بھی اردن سے یمن تک میں موجود تھیں۔ جیسا کہ اور بہت سے سامی مزارات پر رواج تھا مکہ میں کعبے کے گردونواح کے علاقے کو بھی ایک مقدس علاقہ سمجھا جاتا تھا جہاں حُرمت اور لباس کے مخصوص قوانین تھے۔ یہاں بہت سے مشرق وسطیٰ کے مختلف مسلک کے لوگوں نے بت بنا رکھے تھے، ایک قبل از اسلام عبادت گاہ قائم تھی اور ان میں ایک بُت ہبل نامی بھی تھا جسے اردن سے درآمد کیا

گیا تھا۔اس کے علاوہ وینس، چاند، مریمؑ کا بت اور کوئی دوسرے بت بھی شامل تھے۔اہل مکہ کا بڑا معبود اللہ تھا جو عربوں کا خداوند اعلیٰ تھا جسے غالباً بھلا کر انہوں نے ابراہیمؑ کے خدا سے ملا دیا تھا۔بہرصورت اس شہر نے بہت سے قبیلوں کے دیوتاؤں کو خوش آمدید کہا تھا۔یوں اس پورے خطے سے لوگ مکہ کی جانب کھچے چلے آتے تھے تاکہ آداب بجالاسکیں اور قدیم رسوم ادا کرسکیں۔یہ خاص موسموں میں سفر کرنے والے قافلوں کی شکل میں ہوتے تھے جو یمن، شام اور خلیج فارس سے آتے تھے۔یہاں اپنی آمد کے بعد یہ لوگ کعبے کا سات بار طواف کرتے تھے۔(غالباً اس کا انحصار ان کے مسلک پر ہوتا تھا) اور دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑتے تھے، اپنے تراشیدہ خداؤں کو خوش کرنے کے لیے آگ لاتے تھے، شمسی یادگاروں پر پتھر پھینکتے تھے اور شعروشاعری کے مقابلے کراتے تھے، جانوروں کی کھالوں پر اشعار کندہ کر کے کعبہ کی دیواروں کے ساتھ لٹکا آتے تھے۔قبل از اسلام کی مکے میں ادا کی جانے والی رسوم میں ایک عجیب وغریب ساعنصر ہوتا تھا۔کوئی قدیم شے ایسی تھی جو چاروں طرف موجود لاوا اگلنے والی زمین سے ملتی جلتی تھی۔پھر رفتہ رفتہ یہ سرزمین تبدیل ہونے لگی تھی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے قبل بھی وسطی ضلع میں مٹی گارے کی بنی ہوئی عمارات کی جگہ خیمے لے رہے تھے اور ایک شہری آبادی وجود میں آرہی تھی، اس میں وہ لوگ تھے جن کے ہاں خانہ بدوش قبیلوں کے اصول کارفرما تھے۔صاحبِ اقتدار قبیلوں کی آمدنی میں اضافہ ہوا تو انہوں نے اہل مکہ کے ایک حصّے کو صحرا کی غربت کی گرفت سے نکالنے کا وعدہ کیا۔اس کے ساتھ ساتھ وفاداری کی پرانی شکلیں مرتی جارہی تھیں۔قریش کی طرف سے شہری آزادی کی جانب تیز تر نقل مکانی نے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے سماجی تاروپود کو منتشر کردیا تھا۔دولت کا چند کامیاب خاندانوں کے ہاتھوں میں ارتکاز ہو گیا تھا اور کمزور اور غریب انسانوں کی ضروریات کی طرف سے عدم توجہ برتی جارہی تھی۔چند عشروں کے بعد جب ہم اس معاشرے پر نظر ڈالتے ہیں جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم 570ء میں پیدا ہوئے تھے تو پتہ چلتا ہے کہ کثیر خداؤں کی پرستش ہوتی تھی، امراء کی حکومت تھی اور غریب امیر کی طبقاتی تقسیم وجود میں آچکی تھی۔لڑکیوں کو زندہ زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا، شرح سود کنٹرول سے باہر تھی۔زیادہ خواتین اور یتیموں کے نہ حقوق تھے نہ کوئی جائیداد۔610ء میں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم چالیس برس کے ہوئے تو آپ شہر سے باہر پہاڑوں میں چلے جاتے روزہ رکھتے اور غوروفکر فرمایا کرتے تھے۔پھر جب آپ کو ایک روحانی تجربہ ہوا جب جبریل امین فرشتہ ان کے پاس آیا تو آپؐ قرآن کی پہلی وحی کے نزول پر کانپتے ہوئے شہر کو واپس لوٹے۔اس تجربے

کے بعد رفتہ رفتہ ایک خدائے واحد والا مذہب، اسلام وجود میں آیا، جس کے معنی تھے سر تسلیم خم کر دینا اہل مکہ نے فوراً اس کی مزاحمت کی اور آنحضورؐ کے پیروکاروں کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوا۔ جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خدا کی عبادت پر زور دیا تو ان لوگوں کو خطرہ محسوس ہوا جنہوں نے خانہ کعبہ میں وہ بت رکھے ہوئے تھے جنہیں انہوں نے مشرقِ وسطیٰ سے درآمد کیا تھا اور کئی مسالک سے انہیں آمدنی حاصل تھی، کعبہ کے متولیوں کو یہ دعویٰ بہت تخریبی لگا کہ خدا ہر کہیں موجود ہے۔ ستمبر 622ء کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو جو تعداد میں چند سو تھے جلاوطنی پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

مسلمان شمال کی جانب مدینہ کے نخلستان کی جانب نکل گئے جہاں انہوں نے خوشحالی دیکھی اور اس شہر کی آبادی کا زیادہ حصہ ان کے ساتھ مل گیا تھا۔ یوں ایک نئی برادری وجود میں آئی تھی جو مکے والوں کے وقتاً فوقتاً حملوں کو روک سکتی تھی۔ جنگیں ہوئیں، تجارتی راستے متاثر ہوئے اور بالآخر 628ء میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مکہ کے درمیان معاہدوں پر دستخط ہوئے۔ ان کے مطابق مسلمانوں کا ایک گروہ مکہ حج کے لیے جا سکتا تھا۔ جب ایک برس بعد قریش نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج کے ہمراہ شہر پر حملہ کر دیا۔ اہل مکہ نے جنگ کے بغیر ہار تسلیم کر لی تھی۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی کہ اسلام کے جھنڈے تلے اس شہر نے کس قدر ترقی کر لی تھی حالانکہ آنحضورؐ نے مدینہ میں اپنا قیام مستقل رکھا ہوا تھا۔ ان دوشہروں کے درمیان جو ایک دوسرے سے چند سو میل کے فاصلے پر تھے اسلام بڑی تیزی سے پھیلا۔

اس دنیا سے رخصت ہونے سے تین ماہ قبل محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے 90 ہزار مسلمانوں کے ہمراہ مکّے کا رُخ کیا اور یہ حجتہ الوداع کہلایا۔ دو سال قبل مدینے سے فتح و نصرت کے ساتھ واپسی پر آپؐ نے کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیا تھا۔ اسے آنحضورؐ نے مسلمانوں کے خدا کا گھر قرار دیا۔ آخری بار اس شہر میں آنے کے بعد آپؐ نے حجاج آج کے لیے ایک راستہ مقرر کر دیا تھا جو اس شہر اور صحرا کے درمیان سے گزرتا تھا اور اس کے گرد چکر لگانے میں کئی دن لگتے تھے۔ اس راستے پر آپ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو لے کر چلے اور مناسک حج ادا کیے جنہیں حجاج آج بھی ادا کرتے ہیں۔ اس حج کی ادائیگی کے دوران حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قدیم حج کی ازسرنو تعریف یہ کی کہ یہ اسلام کا اجتماعی اظہار ہے۔ آنحضورؐ نے حج کی کچھ بہت پرانی رسوم کو قائم کر رکھا اور ایک قدیم قوت محرکہ کو محفوظ کر لیا جس سے سب سے پہلے اسلام وجود میں آیا تھا۔ آپؐ نے حج کی رسومات کے تناظر کو وسعت دی اور انہیں اور مکی مقامات کو پانچ پیغمبروں ابراہیمؑ، حاجرہؓ، اسمٰعیلؑ، آدمؑ اور حوا کے قصص

سے جوڑ دیا تھا۔ حجۃ الوداع نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بطور روحانی پیغامبر کے کام کو مکمل کر دیا تھا۔ اس کا نقطۂ عروج وہ تھا جب صحرا میں عرفات کے میدان میں آپؐ نے قرآن حکیم کی آخری آیات تلاوت فرمائیں، مسلمانوں کے دین کو ان کے لیے مکمل کر دیا اور حج اور مقدس کتاب کو اس کے ستون قرار دیا۔ یہ ایک منفرد مسلم حج تھا جو پوری ملت کے لیے آپ کا آخری کام تھا۔ اسے بعض اوقات اسلام کا آخری ستون بھی کہا جاتا ہے۔

مکہ غالباً کبھی بھی ایک بڑا تجارتی مرکز نہ رہا تھا۔ قبل از اسلام کے عہد میں بھی یہاں پہنچنا آسان نہ تھا نہ ہی ہمارے علم کے مطابق یہاں کوئی قیمتی شے تھی جسے تجارت کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہو۔ شروع ہی سے لوگ یہاں بجوم در بجوم جمع ہوتے تھے کہ یہ ایک مقدس مقام تھا۔ ایک لق و دق صحرا میں جہاں قبیلوں کے درمیان جنگ و جدل کا دور دورہ تھا یہ ایک ایسی پناہ گاہ تھی جہاں تحفظ کی ضمانت تھی اور پانی مفت تھا، شاید اسی لیے یہ بہت اہم مقام تصور کیا جاتا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد 750ء سے آگے سفر کرنے والوں کی مدد فاصلوں پر واقع دارالخلافوں کے حکمران مثلاً دمشق، بغداد اور قاہرہ وغیرہ کرتے تھے۔ انہوں نے راستے میں پانی کے کنویں کھدوا دیے تھے اور مسافروں کے ٹھہرنے کے انتظامات کم خرچ پر ہو گئے تھے۔ ان کے پیشِ نظر مسلم رعایا کو فائدہ پہنچانا تھا اور ان کے خطے کو مذہب کی خدمت سے جوڑنا تھا۔ یہ ان قافلوں کے لیے بہتر تجارت کے مواقع فراہم کرنے کے لیے نہیں کیا گیا تھا بلکہ حجاج کی بڑھتی ہوئی تعداد کا خیال رکھنا تھا کیونکہ اسلام اب دنیا بھر میں پھیل رہا تھا۔

زمانہ بدلتا گیا اور مکہ میں ہر آنے والے نئے دور میں قدیم مٹتا گیا۔ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ اب یہاں فلک بوس عمارات کھڑی ہو گئی ہیں اور شہر کا نقشہ ہی تبدیل ہو گیا ہے۔ کنویں، ڈیم، دیواریں، شہروں کے صدر دروازے، مکانات، مارکیٹیں اور شاہراہیں ڈرامائی رفتار سے آتی رہی ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مکہ کا صرف ادبی منظر نامہ وہی ہے جو ایک عہد سے دوسرے عہد تک موجود رہا۔ اس بہاؤ میں صرف دو چیزیں نہیں تبدیل ہوئیں۔ مناسک حج اور مقامات حج میں بذاتِ خود وقت گزرنے پر بہت کم تبدیلی آئی ہے۔ سات سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود اس شہر میں ایک خاندانِ واحد کی حکومت رہی ہے۔ اس خاندان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ پیغمبر خدا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۂ نسب سے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو شرفاء کہتے ہیں۔

یہ سلسلۂ نسب اس زمانے میں سامنے آیا جب 1100ء کے آخری دنوں میں ہماری اس کتاب کا

آغاز ہوتا ہے، جب مٹھی بھر علاقائی حکمران حجاز مقدس کا کنٹرول سنبھالنے کے لیے تگ و دو کر رہے تھے۔ 1201ء میں شریف قتادہ نے جو بحیرہ احمر کی ایک بندرگاہ یانبو کا گورنر تھا، مکہ کے خلاف اپنی فوجیں بھیجیں اور اسے فتح کر لیا۔ اس شہر کو اپنی سلطنت کا دارالخلافہ بنانے کے بعد اس کے خاندان کی نسلوں نے 1925ء تک حجاز پر حکومت کی۔ حکمرانوں کی تبدیلی جنگ و جدل اور خون ریزی سے ہوئی اور ملک میں بدعنوانیوں کی کثرت ہوگئی تھی مگر حج اور حجاز کے مقدس مقامات کے نگرانوں کی حیثیت سے ان کا تخت و تاج قائم رہا اور یہ پھلتے پھولتے رہے۔ شریف قتادہ کے خاندانوں کے حکمرانوں کو دور دراز کے طاقتور بادشاہوں کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ انہوں نے مکہ کی مدد کے لیے سالانہ قیمتی تحائف بھیجنے کی روایت کو قائم رکھا۔ اس خاندان نے ٹیکسوں اور حجاج کے ذریعے بڑی دولت کمائی۔ اس کے عوض حجاز کے حکمرانوں نے مسافروں اور حجاج کو سڑکوں کا تحفظ فراہم کیا۔ شریف خاندان کے پورے عہد سلطنت میں کیے گئے ان گنت انتظامات کا ذکر ہر مصنف نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔

بیسویں صدی کی آمد حجاز میں توازنِ قوت میں نمایاں تبدیلیاں لائی۔ جنگِ عظیم اوّل میں ایک جوئے میں یہ سلطنت جب محض ایک کٹھ پتلی حکومت رہ گئی تو شریف خاندان کا آخری تاجدار مکہ سے فرار ہوگیا، اور عبدالعزیز ابنِ سعود کی سربراہی میں ایک نئی حکومت وجود میں آئی جس نے شہر مکہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ 1933ء میں ابنِ سعود نے جزیرہ نما عرب کی زیادہ تر سلطنتوں کو یکجا کر لیا تھا اور اپنے جدامجد پہلے سعودی بادشاہ سعود ابن عبدالعزیز محمد ابن سعود (1813ء) کی سلطنت کو ایک بار پھر زندہ کر دیا تھا۔ اس نے حج کی انتظامیہ کی تشکیل نو کی اور شاہراہوں پر پیش آنے والے ڈاکوں کو ختم کر دیا تھا۔

چند عشروں بعد تیز رفتار ذرائع نقل و حمل اور حجاز میں جدید ٹیکنالوجی کے متعارف کرائے جانے کے بعد مکہ میں طبعی تبدیلی آ گئی تھی۔ تاہم اس شہر کا اہم کردار آج بھی کسی تبدیلی کے بغیر جاری ہے۔ مکہ کی مقامی آبادی 1.2 ملین افراد پر مشتمل ہے اور وہ حجاج کی میزبانی اور زم زم کنویں اور خانہ کعبہ کی دیکھ بھال میں مصروف ہے۔

مناسکِ حج

اس کتاب میں جن 23 سفرناموں کے انتخابات کو شامل کیا گیا ہے ان میں حج کی مذہبی رسوم کا

ذکر بہت سے زاویوں سے کیا گیا ہے۔اس سے قبل کہ ان کا خلاصہ بیان کیا جائے اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ حجاج جو حج ادا کرتے ہیں ایک ایسے ڈرامے میں حصہ لیتے ہیں جو پیچھے چلتے چلتے پہلے پیغمبروں اور بنی نوع انسان کے خدا پر یقین کی آزمائش تک پہنچ جاتا ہے۔اس لحاظ سے حج زمان و مکاں سے گزر کر جانے والے سفر کا نام ہے جس کا مقصد لوگوں کو اولین مذہب سے جوڑنا ہے جو ابراہیمؑ کا توحید کا مذہب ہے۔ یہ حج کی وہ پوشیدہ جہت ہے جو ساری مذہبی رسوم کے عمل میں سے ہو کر گزرتی ہے جو لمحہ حاضر کو ماضی سے ملا دیتی ہے تاکہ آج کے نہایت جدید حجاج بھی اپنی رسمی تنظیم و ترتیب کے ساتھ اور قدیم نظر آنے والی قباؤں سمیت کتاب مقدس کے اوراق سے باہر قدم رکھتے نظر آئیں۔ان مذہبی رسوم میں سے جن کا یہاں ذکر ہوا ہے زیادہ قدیم کہانی کی کتاب میں رکھے ہوئے فیتے کی طرح ہیں۔جب حجاج ان رسوم کو ادا کرتے ہیں تو قدیم ڈراما کھل جاتا ہے۔

حرم یا مقدس علاقہ: لفظ حرم کے معنی ہیں ''جائے حرمت'' جس کا ذکر حج کے بیان میں اوّل تا آخر رہتا ہے۔اس اصطلاح کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ان حجاج کے لیے جو حجاز میں داخل ہوتے ہیں اس سے مراد پورا مکہ اور اس کے اردگرد کی سرزمین ہوتا ہے جس کی حد بندی ستونوں کے ذریعے شہر سے باہر پانچ بڑے سٹیشنوں پر کر دی گئی ہے۔اہلِ مکہ کہتے ہیں ''پورا مکہ جائے حرمت ہے''۔اس مقدس شہر کے اندر صرف مسلمان داخل ہو سکتے ہیں جہاں حرمت کے خصوصی قوانین لاگو ہو جاتے ہیں۔اس وسیع علاقے کے علاوہ لفظ حرم مکہ کی عظیم مسجد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔حجاج عموماً اسے مسجد الحرام یا حرم شریف، مقدس جائے حرمت کہتے ہیں۔وہ اسے بیت اللہ، خدا کا گھر یا خانہ کعبہ بھی کہتے ہیں۔

حرام کے قوانین اور احرام: بہت سے مذاہب اپنی رسوم کا تحفظ خصوصی ضابطوں اور لباس سے کرتے ہیں۔حرم میں داخل ہونے والے حجاج احرام باندھے ہوتے ہیں جو ایک خصوصی لباس ہوتا ہے۔ پانچ سٹیشنوں میں سے کسی ایک پر پہنچنے کے بعد جنہیں میقات کہتے ہیں، تمام حجاج غسل کرتے ہیں اور حج کی نیت کر لیتے ہیں۔خواتین اپنا قومی لباس پہن سکتی ہیں حالانکہ بہت سی خواتین ایک ہلکے رنگ کی قبا پہن لیتی ہیں جس میں صرف ان کے ہاتھ اور چہرے نظر آ سکیں۔مردوں کے لیے البتہ مخصوص تقاضے پورے کرنے ضروری ہیں۔انہیں ننگے سر اور ننگے پاؤں رہنا ہوتا ہے (تاہم سینڈل پہننے کی اجازت ہوتی ہے) روزمرہ کا لباس دو اَن

اصلی چادروں میں بدلنا ہوتا ہے، ایک چادر کو کمر کے گرد لپیٹ لیا جاتا ہے (کمر بند کے استعمال کی اجازت ہوتی ہے) دوسری چادر کو بائیں کندھے پر یوں لٹکا لیا جاتا ہے کہ دایاں کندھا ننگا رہے۔

یہ رسم گلہ بانوں جیسی قبل از زمانہ تاریخ کی اور علامتی ہے۔ احرام اس بات کی ظاہری علامت ہوتا ہے کہ حجاج جب تک اس خطۂ زمین پر رہیں گے حرم کے قوانین کی پابندی کریں گے اور امن و سلامتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے روحانی طور پر اپنے آپ کو پابند بنائیں گے۔ وقتی طور پر جنسی فعل معطل ہو جاتے ہیں۔ ہر طرح کا تشدد ممنوع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مقامی جنگلی حیات کو پریشان کرنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی نہ ہی اشتعال اور غصے یا بے مہری کا اظہار کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اسی طرح ظاہری شکل و صورت سے متعلق کچھ چیزیں ممنوع ہوتی ہیں مثلاً بال ترشوانے، ناخن کٹوانے کی اجازت نہیں ہوتی، بناؤ سنگار ممنوع ہوتا ہے۔ حرم کے قوانین کے مطابق مکہ کے قریب پہنچنے والے حجاج کے لیے کچھ دُعاؤں کا بیک آواز بار بار پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ کلمہ طیبہ کا ورد بھی کرتے ہیں جو ان کی روحانی آمادگی کو ظاہر کرتا ہے: ''میں حاضر ہوں میرے مالک، میں آپ کے حضور حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں'' .... لبیک اللھم لبیک کی صدا گونجتی ہے۔ جو حاجی بھی حرم کے علاقے میں داخل ہوتا ہے اس کے لیے احرام میں ملبوس ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کی سادہ سی یونیفارم ہوتی ہے جس سے مال و دولت، حسب نسب، مقام و مرتبے کے تمام امتیازات مٹ جاتے ہیں اور سبھی ایک جیسے ہو جاتے ہیں تا کہ حج کا مقصد پورا ہو سکے۔

حج کے تقاضے: اسلام ایک ایسا عالمی مذہب ہے جس میں سفر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ تمام مسلمانوں کے لیے زندگی میں کم از کم ایک بار حج کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے بشرطیکہ وہ صحت مند، عاقل و بالغ ہو، قرض دار نہ ہو نہ اسے کسی جنگ کا خطرہ ہو نہ کسی وبائی مرض کا اور سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی استطاعت رکھتا ہو اور جن لواحقین کو اپنے پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہو ان کے لیے مناسب سی رقم چھوڑ جانے کی حالت میں ہو۔ سالانہ حج کا ایک مقررہ وقت ہوتا ہے۔ یہ مسلمانوں کے قمری سال کے آخری مہینے کے آٹھویں دن شروع ہوتا ہے اور وہ لوگ جو اس کے نویں دن کی مرکزی مذہبی رسوم کی ادائیگی سے محروم رہ جائیں ان کا حج نہیں ہوتا تاہم وہ اگلے سال دوبارہ حج کی ادائیگی کے لیے یہ سفر کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس چھوٹا حج یا عُمرہ ایسا ہے جس میں حج کی تمام نہیں بلکہ چند ایک رسوم ادا کرنی ہوتی ہیں، یہ سال کے کسی بھی حصے میں ادا ہو سکتا ہے۔ ہر مسلمان جو مکہ میں داخل ہوتا ہے اس کے لیے ان دو میں سے ایک کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ وہ

لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو کام کاج کے سلسلے میں بار بار اس شہر میں داخل ہونے پر مجبور ہوں۔ اس طویل سفر کے لیے لوگ برسوں اپنی بچت جمع کرتے رہتے ہیں تا کہ یہ سعادت حاصل کر سکیں، ان کی زندگیوں میں یہ سفر اللہ کا بہت بڑا انعام ہوتا ہے۔

مسجد الحرام: حج کی تمام بنیادی رسوم مکہ میں مسجد الحرام میں ادا کی جاتی ہیں۔ اس عمارت کا وسطی حصہ ایک کھلے صحن پر مشتمل ہے اور اس کے مرکز میں سنگ خارا کا بنا ہوا مکعب نما کعبہ ہے۔ قریب ہی زم زم کا کنواں ہے۔ کچھ فاصلے پر صفا اور مروہ، دو پہاڑیوں کے درمیان ایک چوتھائی میل پر مشتمل راستہ ہے جس پر حجاج سعی کرتے ہیں۔ اس مسجد کے اندر قدیم مذہبی رسومات کے مقامات کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔

حرم مکہ دنیا کی واحد مسجد ہے جو گول شکل میں ہے۔ اس کے چاروں طرف عبادت کے لیے بنائے گئے ہال کمروں کا رُخ کعبہ کی جانب ہے اور پوری عمارت کو اس کے گرد تعمیر کیا گیا ہے۔ کعبہ جو اسلام کا مقناطیس ہے پچاس فٹ بلندی کے ساتھ کھڑا ہے۔ اس پر سیاہ سلکی غلاف چڑھا ہوا ہے جسے عربی میں کسوۃ کہتے ہیں۔ حجاج اسے متبرک گھر بھی کہتے ہیں۔ اس میں کوئی تبرکات نہیں رکھے گئے نہ یہ خود کوئی ایسی شے ہے جس کی پرستش کی جائے۔ کعبہ کے اندر چند متبرک مقامات ہیں جن کا احترام کیا جاتا ہے، اس میں حجر اسود بھی ہے جسے حجاج چھونے کی کوشش کرتے یا بوسہ دیتے ہیں۔ کعبہ ان کی وجہ سے مقدس نہیں بلکہ یہ تو اپنی علامتی قدر و قیمت کی بنا پر مقدس ہے جو قبلہ کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ روحانی طور پر توجہ مرکوز کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اور اس سمت کی نشان دہی کرتا ہے جس سمت قبلہ رُو ہو کر مسلمان عمر بھر نمازیں ادا کرتے ہیں۔ خانہ کعبہ پر نگاہِ اوّل پڑتے ہی بہت سے حجاج کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ رات دن یہ نماز کے دوران ان کی نظروں کے سامنے رہتا ہے جہاں بیٹھ کر حجاج آنکھیں بند کیے اپنے اللہ سے رجوع کرتے ہیں۔

مسجد الحرام سے بہت سی کہانیاں وابستہ ہیں۔ مگر ان میں سب سے بڑی کہانی اس داستان کی گردش ہے جو اس کی عمارت کے فنِ تعمیر میں منعکس ہوتی ہے۔ یہ کہانیاں اور حج کی مذہبی رسوم مختلف مراحل میں مشرق وسطیٰ میں توحید کی ابتدا کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس منصوبے کے بانی کی یاد دلانے کے لیے اس مقدس و متبرک گھر کے ایک جانب ڈھکے ہوئے ایک چبوترے کی شکل میں مقام ابراہیم ہے، جسے یہ نام کعبہ کے اولین معمار ابراہیمؑ کے نام پر دیا گیا۔ کعبہ کے شمال مغرب میں سنگ مرمر کے جنگلے سے گھری ہوئیں حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ (حضرت ابراہیمؑ کے فرزند اور بیوی) کی قبریں ہیں۔ یہ تین ایسی بنیادی

شخصیات ہیں جن سے ہر مسلمان بچہ واقف ہے۔ جب حجاج حج کے مقامات کے گرد گھومتے ہیں اور مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں تو ان کے ذہنوں میں یہاں کا نقشہ ابھر آتا ہے۔ اس داستان کے کچھ مخصوص حصوں پر مکہ میں زور دیا جاتا ہے: کس طرح ابراہیمؑ نے سارہ کی تعظیم اور احترام کے لیے حضرت حاجرہ اور ان کے بیٹے کو صحرا کے ایک مقدس مقام پر چھوڑ دیا تھا۔ پھر جب انہوں نے توبہ کی تو وہاں کعبہ کی تعمیر کی۔ اس خاندان کے ایمان کو اس طرح آزمایا گیا کہ اللہ نے بیٹے کی قربانی مانگ لی۔ پھر کس طرح آخری لمحے ان کے بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے اللہ نے ایک مینڈھا بھیج دیا تھا۔ وقت کی حدود سے آزاد ایمان کی یہ آزمائش اور رحم حج کی ریڑھ کی ہڈی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آئندہ اوراق میں جو تفصیلات آئیں گی ان سب میں اس کا ذکر آئے گا۔

حج کی ترتیب: حج کو مذہبی رسومات کی ادائیگی کے حوالے سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: تین شہری رسوم جنہیں گھنٹوں میں مکہ کے اندر مسجد حرام میں ادا کیا جا سکتا ہے اور ایک چار حصوں میں منقسم جلوس جو حجاج کے ہجوم کو اس 15 میل کی مسافت والے سفر پر لے جاتا ہے جس صحرائی سفر میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔ ابتدائی رسوم جو شہر کے اندر ادا کی جاتی ہیں ان میں کعبہ کے گرد سات چکر لگانا شامل ہے، اس دوران حجاج زم زم کے کنویں پر بھی جاتے ہیں اور صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سات بار سعی کرتے ہیں۔

طواف: کعبہ کے گرد سات چکر طواف کہلاتے ہیں۔ یہ تعداد اور ان چکروں کا گھڑی کی سوئیوں کے چلنے کی مخالف سمت لگایا جانا قدیم دنیا کے ان سات سیاروں کی مانند ہے جو سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ حال ہی میں انہیں ایٹمی ذرات کے جوہری راستوں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ طواف مکہ کی اس مسجد میں ایک طرح کی عبادت ہوتی ہے اور یہاں آنے والے اس عبادت کو کثرت سے کرتے ہیں۔ جب حج کے دن ہوتے ہیں ان دنوں ہزاروں افراد کا ہجوم ایک ہی وقت میں طواف کر رہا ہوتا ہے۔ حج کے دوران یہ مذہبی رسم تین موقعوں پر ادا کی جاتی ہے۔ کسی حاجی کا پہلا طواف یہاں پہنچنے کے بعد مہینے کے آٹھویں روز ہوتا ہے۔

آبِ زم زم اور سعی: آخری چکر لگانے کے بعد حجاج زم زم کے کنویں پر جا کر روحانی تازگی حاصل کرتے ہیں۔ اس کنویں کی کہانی کو صفا و مروہ کے درمیان دوڑنے (سعی) کی رسم سے جوڑا جاتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اسے ادا کرنے کے لیے حجاج مسجد سے گزر کر عمارت کی مشرقی سمت پہنچتے ہیں جہاں ایک میل کے تیسرے حصے کے برابر مسافت مذکورہ دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑ کر طے کرنی ہوتی ہے۔ بتایا

جاتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ ماجدہ حضرت حاجرہؓ یہاں صحرا میں پانی کی تلاش میں آگے پیچھے سات بار دوڑی تھیں۔ آخری چکر میں انہیں بیٹے کے چلانے کی آواز سنائی دی۔ وہ واپس مڑیں تو دیکھا کہ صحرا کی زمین پھاڑ کر پانی کا چشمہ پھوٹ نکلا ہے۔ آج یہ رسم حاجیوں کو زمانے کی گرفت سے ماورا ایک ڈرامے میں شرکت کی لذت کا احساس دلاتی ہے جس میں والدین کی محبت وشفقت اور مذہبی عقیدہ میزان میں تُل رہے ہوتے ہیں۔ نسلی سطح پر یہ کہانی تمام عربوں کی بقا کو ظاہر کرتی ہے جہاں اسمٰعیل ان کے جدِ امجد کے طور پر موجود ہیں۔

صحرا میں قافلے کی صورت سفر: حج کے مہینے کے آٹھویں روز، حجاج احرام باندھے ہوئے شہر کو چھوڑ کر مشرقی سمت پانچ میل کا سفر طے کرتے منیٰ کی وادی میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں وہ خیموں میں رات بسر کرتے ہیں۔ شہر کی آسائشوں کو چھوڑ کر صحرا میں آ جانا طبقاتی امتیازات کو ختم کر دیتا ہے اور حجاج برادری کو زیادہ قریب کر دیتا ہے۔ اگلی صبح یہ خروج عرفات کی جانب مشرق میں مزید پانچ میل آگے کی جانب بڑھ جاتا ہے۔ یہاں حج کا نقطہ عروج ہوتا ہے جب حجاج شب بیداری کے لیے اپنے اللہ کے حضور کھڑے رہتے ہیں اسے یوم الوقف کہتے ہیں۔ عرفات میں جبل الرحمت ہے جہاں حرم کی سرزمین سے کچھ فاصلے پر ایک کھلا میدان ہے۔ حج کی اس رسم کے بارے میں جو داستانیں مشہور ہیں وہ یاد رکھے گئے زمانے سے کہیں بلند و بالا ہیں جو واپس لوٹتے لوٹتے ابراہیمؑ سے ہوتی ہوئیں یونسؑ تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہاں یہ بات مشہور ہے کہ بنی نوع انسان کے ماں باپ، حوا و آدمؑ جنت سے نکالے جانے کے بعد آپس میں دوبارہ ملا دیئے گئے تھے۔ انہیں جبریل امین نے پتھر کی ایک کھوہ کے اندر عبادت کرنا سکھا دیا تھا جو جبل الرحمت کی مغربی سمت میں تھا۔ مسلمان عرفات کو روحانی ملاپ نو کا مقام سمجھتے ہیں۔ حجاج یہاں تک خاندانی تعلق و رشتہ کو نئے سرے سے جوڑنے، توبہ کرنے، ایمان وعقیدہ کا ازسرنو اعلان کرنے اور اپنی روحوں کو یاد کرنے کے لیے سفر کرتے ہیں۔ ایک ایسے ماضی کے علاوہ جو کسی زمانے میں مقید نہیں عرفات کا ایک مؤثر مستقبل بھی ہے۔ یہ ایک طرح سے یوم حشر کے لیے سالانہ ریہرسل کا مقام ہے۔ ہر لحاظ سے حج یہاں خارجی حدود تک پہنچتا ہے۔

مزدلفہ میں شب بیداری: اس لمحہ جب حجاج عرفات چھوڑ دیتے ہیں، یہ قافلہ سورج غروب ہوتے ہی مراجعت کر جاتا ہے۔ اب اس کا رُخ اس مغربی راستے کی جانب ہوتا ہے جو وادی منیٰ کو جاتا ہے۔ پہلی شب حجاج کے ہجوم نصف سفر طے کرتے ہیں، یہ راستے میں مزدلفہ کے مقام پر رکتے ہیں جو ان پہاڑیوں کا

سلسلہ ہے جو اس میدان سے تین میل دور ہیں۔ یہاں یہ ستاروں بھرے آسمان تلے پڑاؤ کرتے ہیں اور دوسری شب بیداری کرتے ہیں۔اس مرتبہ وہ حرم کے علاقے کے اندر ہوتے ہیں۔شب بھر یہ مراقبے میں رہتے ہیں اور اگلے دن کی مذہبی رسم کی ادائیگی کے لیے کنکریاں جمع کرتے ہیں۔

کنکریاں مارنے اور ضیافت کا دن: صبح ہوتے ہی حجاج وادیٔ منٰی کی سمت روانہ ہو جاتے ہیں جو مزید مغرب میں چند میل اور دور ہے۔ یہاں وہ قربانی کرتے اور عیدالاضحی مناتے ہیں۔اس روز پورے عالم اسلام میں چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ یہاں حجاج پہلے منٰی کے اس حصے میں جاتے ہیں جہاں بطور خاص تین اونچے ستون (جمارات) موجود ہیں۔ابراہیمی کہانی کے ایک اور باب میں یہ تین داستانوی مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ ظلمات کا فرشتہ نمودار ہوا تھا جس نے اسمٰعیلؑ کو ورغلانے کی کوشش کی تھی اور دلیل یہ دی تھی کہ ابراہیمؑ کو جو حکم اللہ کی طرف سے ملا تھا کہ بیٹے کو قربان کردو وہ دراصل شیطان کا حکم تھا اور ابراہیمؑ کا پاگل پن تھا۔اسمٰعیلؑ جو شیطان کی آواز اور اللہ کی آواز کا فرق جانتے تھے انہوں نے شیطان کو سات بار پتھر مارے تھے۔آج حجاج اس مثال کی تقلید کرتے ہیں۔وہ پہلے روز ایک ستون پر اور بقیہ دو دنوں میں تینوں ستونوں کو پتھر مارتے ہیں۔تیسرے ستون کے قریب بتایا جاتا ہے کہ ایک جھاڑی اُگ آئی تھی جس میں قربانی کے مینڈھے کو پکڑ کر ذبح کیا گیا تھا۔

مکہ مکرمہ کو واپسی: پہلے روز کنکریاں مارنے کے بعد ہی حجاج احرام کی زیادہ پابندیوں سے آزاد کردیئے جاتے ہیں تاہم انہیں آئندہ تین روز میں مکہ پہنچ کر واپسی کا طواف کرنا ہوتا ہے۔آئندہ کے ایام میں جو حجاج ابھی تک مدینہ میں مسجد نبوی حاضری نہیں دے سکے تھے وہ شمال کی جانب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک پر نذرانۂ عقیدت و محبت پیش کرنے حاضری کے لیے چلے جائیں گے۔تاہم روانگی سے قبل حجاج کو آخری بار طواف کرلینا چاہیے اور پھر وہ مسجد الحرام کے الوداعی گیٹ سے رخصت ہوسکتے ہیں۔

حج کی اہمیت: آج جب سفر ماضی کی نسبت زیادہ آسان ہوگیا ہے ایک ہزار بالغ مسلمانوں میں سے صرف دو ہر سال حج کی ادائیگی کے لیے جاتے ہیں۔ان میں زیادہ تر افراد درمیانی عمر کے ہوتے ہیں۔انہوں نے اپنی کمائی میں سے اس سفر کے لیے رقم پس انداز کر رکھی ہوتی ہے اور اپنی اولاد کی پرورش سے فارغ ہوکر اہم خاندانی ذمہ داریاں پوری کردی ہوتی ہیں۔اب یہ یا تو خود مذہبی فرائض کی انجام دہی کی جانب

متوجہ ہوتے ہیں یا ان کے بچے اپنے وسائل یکجا کر کے والدین کو فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے روانہ کرتے ہیں۔ نئے شادی شدہ جوڑے بھی اکثر مکے جاتے ہیں تاکہ وہ کامیاب اور خوش و خرم زندگی کی دُعا کر سکیں۔ ایسے افراد جنہوں نے زندگی میں بہت مشکل وقت دیکھا ہو، مسائل سے دو چار رہے ہوں،......ان کے کسی پیارے کا انتقال ہو چکا ہو یا ان کا ساتھی انہیں تنہا چھوڑ کر چل بسا ہو، کوئی ذاتی ڈپریشن ہو، ایسے لوگ اپنے اندر نیا حوصلہ و ہمت پیدا کرنے حج پر جاتے ہیں۔ حج کی کامیاب ادائیگی سے سماجی مقام میں تبدیلی آتی ہے، ان کے نام میں رضا کارانہ طور پر حاجی یا حجن کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس سماجی مقام سے معزز لوگوں میں شمولیت حجاج کے لیے قوت محرکہ رہی ہے مگر چودھویں صدی کے مراکشی ابن بطوطہ اور بیسویں صدی کے امریکی میلکم ایکس کے اس بارے میں بیانات مختلف ہیں۔ تاہم حج کی ادائیگی کے وقت اصل میں جو بات پیش نظر رہتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ادا احسن وخوبی ہو جائے اور اس سے بڑھ کر اس کا یہ تجزیہ زیادہ اہم ہے کہ اللہ نے کسی کا حج قبول کر لیا ہو۔ انسان تو اپنا یہ عمل صرف اپنے مالک کے حضور پیش کر سکتا ہے منظور کرنا نہ کرنا تو مالک کا کام ہے۔

مسلمانوں کے لیے مکہ مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔ مکہ وہ شہر ہے جس کی طرف منہ کر کے مسلمان عمر بھر نمازیں پڑھتے ہیں۔ اس شہر کی سرزمین پر قدم رکھنے کی آرزو برسوں دلوں میں پلتی ہے تب عمر کے کسی حصے میں کہیں جا کر یہ آرزو پوری ہوتی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کہانی بھی مکہ میں ایک نئے معنی حاصل کرتی ہے کہ کس طرح ایک بشر کی شکل میں آپؐ نے حج ادا کیا اور اسے اسلام کی روح کے عین مطابق بنالیا۔ صدیوں پر پھیلے زمانے میں خواہ امن ہو یا جنگ، مکہ نے اپنے پاس آنے والوں کو قابل بھروسہ واپسی کا عندیہ دیا جیسے یہ کوئی مذہبی رسوم کی ادائیگی کا ایک ایسا پودگھر ہو جہاں آ کر روح کھل اُٹھتی ہو خواہ مسجد الحرام کی سرحدوں سے باہر کچھ بھی ہو رہا ہو۔ ایک یاددہانی کے طور پر کہ زندگی کیسے گزارنی ہے اس سفر نے کسانوں، شہزادوں، صوفیاء اور انقلابیوں کو جوش و جذبہ عطا کیا ہے اور ان تمام اسباب کی وجہ سے یہ زندگی کا ایک حقیقی سفر سمجھا جاتا ہے۔

سفر حج

ایسے افراد جنہیں یہ بات پریشان کر دیتی ہو کہ حج کی مذہبی رسوم وہ کیسے ادا کر پائیں گے انہیں پہلے سے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان کو ایک گائیڈ یا مطوف کی ضرورت ہوگی جو حج کی رسوم کی ادائیگی میں ان کی مدد

کرے گا ان کا ذکر ان صفحات میں اتنی بار آئے گا کہ غیر مسلم بھی جب ان کا مطالعہ کریں گے تو وہ بھی جان لیں گے۔ اس مرحلے میں ایک بات کو سمجھ لینا بے حد اہم ہے کہ حج محض مکے کے ایک سفر کا نام نہیں ہے۔ مکہ پہنچنے کے بعد تو ابتدا ہوتی ہے۔ حج اپنے طور پر ایک ایسی سیماب صفت کیفیت ہے جس کے بہت سے مراحل ہیں جن میں سے ہر ایک میں اجتماعی رسم ادا کرنی ہوتی ہے۔ یہ دن بدن اپنی شکل اور مقصد تبدیل کر رہا ہے۔ یہ رسم اس قدر رواقع نہیں ہوتی جس قدر یہ منکشف ہوتی ہے..... پہلے ایک شہر میں، پھر صحرا میں پھر دائرے کی شکل میں رقص کی سی بات، ایک روحانی ریس کورس، ایک ہجوم، ایک جلوس، ریگستان میں خیمہ زنی، ایک اتھلیٹک کا کوئی کھیل، تجارتی میلہ، چلتے پھرتے ایک مراقبہ۔ یہ ایک قسم کی مسلم اقوام متحدہ ہے جس میں دنیا بھر کے مسلمان اکٹھے ہوتے اور اکٹھے رہتے ہیں..... مگر پھر بھی حج کے معنی ایک سفر کے بھی ہیں۔

جیسا کہ یہ سفرنامے اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ مکے کا سفر ہمیشہ سے کسی منزل تک پہنچنے کے ایک ذریعے سے زیادہ اہم رہا ہے۔ جدید ذرائع حمل و نقل کی ایجاد تک اس سفر کے لیے مہینے بلکہ کئی کئی برس درکار ہوتے تھے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ اس کتاب میں شامل ان سفرناموں میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جن میں آنے جانے، پہاڑوں، سمندروں اور صحرائی بیابانوں کو عبور کرنے، مقدس مزارات کے راستے میں آنے، بڑے بڑے شہروں، بدیسی راستوں سے گزرنے، عجیب و غریب رسوم دیکھنے اور اجنبی لوگوں سے ملنے کا ذکر ہے۔ حج پر دستیاب لٹریچر میں مشکلات کا بڑا ذکر ملتا ہے۔ زمینی مشکلات، سماجی مشکلات، جسمانی زخم ناگزیر نقصان اور غیر متوقع رنج و غم۔ حجاج کا سفر کبھی بھی خطرات سے خالی نہیں رہا..... چوروں ڈاکوؤں کا خطرہ، سرحدوں پر موجود حریص اور لالچی کارندے، جنگ، غلامی، مالی تباہی، سیاسی ابتری، تعصب، بیماری، براعقیدہ، دھوکہ و فریب اور تحفظ مہیا کرنے والے جھوٹے افراد سبھی سے انہیں واسطہ پڑتا ہے۔ سفرنامہ لکھنے والے اس بڑی سچائی سے واقف ہوتے ہیں کہ مشکل و پریشانی، بالخصوص حاجیوں کے لیے علاقے کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے۔ حج پر لکھنے والے تین ادیبوں کو بغیر کسی مخصوص ضابطے کے چنا گیا ہے: ابن بطوطہ جب 1350ء میں وطن واپس لوٹا تو طاعون اس کی ایڑیاں چاٹ رہا تھا۔ جوزف پٹس نے جو 1685ء میں مکہ میں تھا 15 برس غلامی میں بسر کیے جبکہ جان لیوس برکات قاہرہ میں اس بیماری سے مرا جو اسے حج کے دوران لاحق ہو گئی تھی۔

مکہ پہنچنا پکنک کبھی نہیں رہی۔ ان سب کی تفحیک اس بات سے ہوئی جس کا ذکر ایک سے دوسرے

سفرنامے میں کیا گیا ہے کہ تقریباً 1930ء تک جوں جوں یہ حجاج اپنی مقدس منزل کے قریب پہنچے زندگی ان کے لیے اتنی ہی زیادہ خطرناک ہوتی گئی۔ دھاوا بول دینے والے قبیلے مثلاً بنو حرب اور بنو عتیبہ جنہوں نے حجاز میں گزرنے والے سفر کو ایک زندہ دوزخ بنا دیا تھا، ان کا ذکر ان صفحات میں تکرار کے ساتھ آئے گا۔ یہ اور دوسرے قبائلی بدوؤں نے اپنی دولت ان تاجروں اور حاجیوں سے وصول کی جو ان کے علاقے سے گزرتے تھے اگر یہ قافلے انہیں روپیہ نہ دے سکتے تو یہ ان پر بے رحمی سے حملہ کر دیتے تھے۔ یہ کوئی وسطی دور کی انوکھی چال نہیں تھی۔ پہلی جنگ عظیم تک استنبول اور لندن سے پہنچنے والی مدد ان غارت گر لٹیروں کو خریدنے پر خرچ ہو جاتی تھی تا کہ زمینی راستوں کو خاص طور پر حج کے مہینوں میں کھلا رکھا جا سکے۔

لوٹ مار میں حجاز کے قبیلے کوئی منفرد نہ تھے نہ ہی صرف حاجیوں پر یہ حملہ کرتے تھے۔ شام، عرب، عراق، لیبیا یا مصر میں سے گزرنے والے ہر قافلے کو ایک جیسی اذیت اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان میں اس وقت تک کمی نہ آئی جب تک ذرائع نقل و حمل نے 19 ویں اور بیسویں صدی میں اونٹ کو پیچھے نہیں چھوڑ دیا۔ مثال کے طور پر امریکی ناول نگار جان دوس پیسوس ایک ایسے کارواں کے ساتھ بغداد سے دمشق تک کے سفر پر تھا جس میں 500 اونٹ شامل تھے۔ اسے بھی تحفظ دلانے کا جھوٹا سہارا ایک ایسے بدمعاش نے دیا تھا۔ ہمارا پہلا حج پر لکھنے والا مصنف نصر خسرو مکہ کے مشرق میں 11 ویں صدی میں اسی قسم کی ایک واردات کا شکار ہوا تھا۔ سفر کے دوران دونوں افراد کو زبردستی روک کر ان کے سامان کو بطور تاوان طلب کیا گیا تھا۔ انہوں نے ایک قبیلے کو کچھ رقم دی کہ وہ آنے والے ایسے حالات میں ان کی مدد کرے اور انہیں بچائے۔ دوس پیسوس کے معاملے میں تو ایسا واقعہ ہر پچاس میل کے بعد پیش آتا تھا۔

تاہم یہ سفر صرف مشکلات ہی لیے ہوئے نہ تھا۔ سفر کے دوران حجاج اچھے اسٹیشنوں، مشہور مساجد، اولیائے کرام کے مزارات اور صوفیاء کے آستانوں پر رکتے تھے۔ اپنے اپنے مقام و مرتبے کے مطابق یہ شہروں میں کام بھی کرتے تھے تا کہ زادِ راہ کما سکیں یا بڑے بڑے حکمران اور سلاطین اپنے درباروں میں ان کی میزبانی کرتے تھے۔ جن قافلوں میں یہ حجاج شامل ہوتے تھے وہ اونٹوں کی ایک واحد مہار سے لے کر قطار اندر قطار اونٹوں پر مشتمل قافلوں میں بھی شامل ہوتے تھے جن کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے پورا شہر حرکت میں ہو۔ وہ قارئین جو اس سفر کے وسطی ذکر پر کتاب کے پہلے حصہ میں داخل ہوتے ہیں انہیں قاہرہ اور دمشق کی بڑی خوبصورت تفصیل سے آگاہ کیا جائے گا۔ چودھویں صدی تک اسلامی دنیا اپنی جائے

پیدائش عرب، مشرق وسطیٰ سے کہیں بڑھ گئی تھی۔ یہ مراکش سے لے کر انڈیا سے گزر کر چین تک پھیل گئی تھی۔ اس اسلامی دنیا نے ایک باہم ملا ہوا ایسا عالمگیر معاشرہ تشکیل کر دیا تھا کہ اب حجاج دنیا کے کسی کونے سے بلاخوف و خطر مکہ کی جانب سفر کر سکتے تھے اور اس سفر میں مسلم ثقافت سے ان کا رشتہ کہیں بھی منقطع نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار جب یہ دور دراز کے حج راستے کھل جاتے تو پھر کبھی بند نہ ہوتے تھے۔ برکات نے مدینے جانے والے ملایا کے ایک بڑے قافلے میں 1800ء کے اوائل میں شامل ہو کر سفر کیا تھا پھر 1930ء میں انڈونیشیا سے حجاج کی ایک بڑی تعداد نے حج کے لیے ہزاروں میل کا سفر طے کیا تھا۔ مختلف زمانوں میں اپنے ذاتی مشاہدات اور حکایات کے ساتھ حج لٹریچر حج کے سفر کے اس بین الاقوامی اور عالمی کردار کو ریکارڈ کرتا ہے جسے جدید ذرائع نقل و حمل نے بڑی وسعت دے دی ہے۔

بیسویں صدی کی ٹیکنالوجی، صحت و صفائی میں بہتری اور نئے انتظامی طریقوں نے حج کے خطرات کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے۔ جیسا کہ تمام جدید سفر تبدیل ہوئے، حج کے سفر کا ڈھانچہ بھی تیزی سے تبدیل ہوا۔ صرف 75 برس کی مدت میں مکے جانے والے پرانے راستے بحری جہازوں، ریل گاڑیوں اور دوسری جدید ٹرانسپورٹ سے بہت حد تک منسوخ ہو گئے۔ چند عشرے اور گزرے تو ہوائی جہاز نے سڑکوں کو غیر ضروری بنا دیا تھا۔ 1980ء میں 90% غیر ملکی حجاج چارٹرڈ پروازوں کے ذریعے حج کے لیے آ رہے تھے اور مشرق وسطیٰ کے اردگرد سے آنے والے حاجیوں نے شیشے کی مانند سڑکوں پر اس قدر تیز رفتار گاڑیاں استعمال کیں کہ صحرا کو دھندلا دیا۔ میں نے 1990ء میں جب حج کیا اس وقت بھی معاشی بدحالی کے ہاتھوں مجبور ہو کر چند حجاج افریقا سے مکہ کے سفر پر تھے مگر ایسی مثالیں بہت جلد ختم ہو جائیں گی۔ ہوائی جہاز سے حج پر کم پیسے لگتے ہیں۔ کرایہ بھی کم اور حجاج کا اپنے کاروبار اور خاندان سے دور رہنا بھی بہت مختصر سا۔ ہوائی سفر نے حجاج کی تعداد میں بیسویں صدی کے نصف آخر میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔

اس کتاب کا مواد اور ترتیب

متن: یہاں شامل کیے گئے اقتباسات دنیا کے 23 سیاحوں کے سفرناموں میں سے لیے گئے ہیں۔ انہیں سن وار، زمانی اعتبار سے پانچ حصوں میں ان کے زمانے کے لحاظ سے ازمنہ وسطیٰ تا عصرِ حاضر اکٹھا کیا گیا ہے۔

پہلے حصے میں تین کلاسکس شامل ہیں، جو اسلامی وسطی دور سے تعلق رکھتے ہیں، یہ دور اسلام کے

عالمی سطح پر عروج کا دور تھا۔ یہ حصہ گیارھویں صدی کے ایک سفر مکہ سے شروع ہوتا ہے جسے ملک فارس کے ایک کلاسیکی شاعر اور صوفی نصر خسرو نے اختیار کیا تھا۔ یہ تسلسل بارھویں صدی کے اواخر کی ابن جبیر کی کتاب کے ساتھ آگے بڑھتا ہے جس نے مسلم اسپین سے مشرق کی جانب بحری سفر کیا تھا۔ اس کا اختتام ایک بہت مشہور مسلمان سیاح، ابن بطوطہ کے سفرنامے کے اقتباسات سے ہوتا ہے، جس کا تعلق چودھویں صدی کے مراکش سے تھا۔ اس عہد میں دمشق اور قاہرہ حج کے مجموعی سرپرستوں کے طور پر زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ یہاں ہمیں شریف خاندان کے افراد مکے اور حجاز کے مقامی گورنروں کی حیثیت سے نظر آتے ہیں جو ان صلیبیوں سے نبرد آزما ہیں جو عرب دنیا پر حملہ آور ہوئے۔ ہمیں اسی دوران صلاح الدین ایوبی جیسے عظیم سلاطین کے دارالخلافے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس حصے کے انتخابات میں اس زمانے کی اہم کتابوں کے اقتباسات شامل کیے گئے ہیں۔ ان سے قارئین کو حج اور سفر حج کی پیچیدگیاں پڑھنے کو ملیں گی۔ تعارفی مضامین قدرے طویل ہیں تا کہ اہم باتوں کو پوری کتاب میں مطلوبہ اہمیت دی جا سکے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں سفرنامے کی مغربی سمت کو متعارف کرایا گیا ہے۔ اس میں پانچ سفرناموں سے روداد سفر شامل کی گئی ہے جو نشاۃ ثانیہ تک پل کا کام دیتی ہے۔ یہ عہد شعور و آگہی اور ابتدائی رومانوی دور ہے جسے اٹلی، برطانیہ، اسپین اور سوئٹزرلینڈ کے یورپی مصنفین نے لکھا۔ ان کا آغاز بتونیا (اٹلی) لوڈ و وسوڈی ورتھما کے برعکس جو 1503ء میں مکے میں چھپ کر داخل ہو گیا تھا اور حج کے ایک قافلے کے ساتھ بطور گارڈ کے منسلک ہو گیا۔ اس نے اپنا سفرنامہ لاطینی زبان میں لکھا ہے۔ ورتھما کی کتاب کے بعد ایک گمنام رپورٹ 1580ء کی دہائی میں دمشق سے مکہ کارواں کی شائع ہوئی، جس کے ایک صدی گزرنے کے بعد ایک انگریز ملاح جوزف پٹس نے ایک نہایت غیر معمولی کتاب لکھی۔ اسلام کے بارے میں اس کتاب میں پہلی بار مغربی ماخذ کے ساتھ صحیح صحیح باتیں تحریر کی گئی تھیں۔ یہ حصہ اختتام کو اس وقت پہنچتا ہے جب دو اعلیٰ تعلیم یافتہ مشاہد، اسپینی مسلمان ڈومینگو بدائے لیبلیچ (1807ء)، جو علی بے العباسی کے نام سے سفر کر رہا تھا اور ایک سوئٹزرلینڈ کے مہم جو جان لیوس برکات (1814ء) کی کتابوں کے اقتباسات شامل کتاب کر لیے جاتے ہیں۔ اس طویل دور کے چند ابتدائی برسوں کے دوران استنبول کی سلطنت عثمانیہ نے حج کے لیے مالی امداد کے ذریعے حجاج کو تحفظ دیا اور حج کی نگرانی کی۔

کتاب کے تیسرے حصے کا آغاز ایک یورپی سر رچرڈ برٹن کی 1856ء کی ذاتی تحریر سے ہوتا ہے پھر

ان سفرناموں کے درمیان باری آتی ہے ایک انڈین شہزادی، سکندر بیگم بھوپال (1864ء) کی اور فارس کے ایک سفارت کار محمد فارانی (1885ء) کی، ایک یہ ہیں تو دوسری جانب بعد کے یورپی جھوٹے مدعیان: جان کین (1877ء) اور آرتھر ویول (1908ء) ہیں۔ برٹن نے سفرِ حج کو بڑے رومانوی انداز میں لکھا ہے۔ یہ ماہر سیاح شعور و آگہی کے پرسکون مشاہدوں کو بدل دیتا ہے۔

اس عہد میں اسلامی روایتی سفر میں ایک تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ محمد فارانی کے انسائیکلوپیڈیائی انداز کے ساتھ ایک سائنسی زاویہ نظر اس سفر کی روداد میں داخل ہو جاتا ہے۔ جدیدیت اب صرف یورپیوں کا ہی حصہ نہیں رہ جاتی۔ ایک جدید انداز اور ایک جدید دنیا مسلمان سیاحوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے متشکل ہوتے ہیں۔

کتاب کے تیسرے حصے کا اختتام اس لٹریچر میں ایک آبی دھارے کی شکل اختیار کر لیتا ہے: ہمارے دور تک 1908ء میں تحریر کیا گیا آرتھر ویول کا سفرنامہ کسی غیر مسلم کی طرف سے پیش کیا گیا حج پر آخری سفرنامہ بن جاتا ہے۔ ماضی کی طرف لوٹ جائیں تو ان سفرناموں کو جن کے مصنفین جعلی حجاج بن کر مکہ گئے، اس زاویے سے پرکھا جاسکتا ہے، کہ یہ ایک ایسا تاریخی منصوبہ تھا جس میں یورپی اور مشرقِ وسطیٰ کے علاقوں کے افراد تجارتی مفادات کی وجہ سے متحد ہو گئے تھے۔ مسلمان حجاج کی طرح، بہروپ بھرنے والے غیر مسلم حاجیوں نے ان قوتوں کے جواب میں سفر کیا جو ان کی ثقافت میں رکھ دی گئی تھیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ مذہبی فریضے کی ادائیگی تھی۔ سماجی توقعات تھیں مگر وہ قوتیں جنہوں نے مغرب والوں کو مکے کی سمت بلا یا وہ کسی مہم پر بلانے والی آواز تھی۔ یہ اتنی ہی قدیم تھی جتنا یولسس، ایک آرزو تھی کہ انسانی علم میں اضافہ کیا جائے۔ یہ انسانی خواہشات کی تکمیل بھی ہو سکتی تھی کہ شہرت و ناموری کیسے حاصل ہو۔ اخلاقی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غیر قانونی مداخلت کرنے والے تھے یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ حج کی ہیئت میں ان کا بڑا حصہ ہے اور کہیں کہیں انہوں نے یورپ کے اسلام کے بارے میں غلط تصور کو درست بھی کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ ان کی کوششوں میں جو کمی رہ گئی وہ بھی جدید قارئین تک ضروری پہنچنی چاہیے۔ جس حج کا ذکر انہوں نے کیا یہ صرف ایک ایسا تجربہ ہے جو صرف مسلمانوں کو حاصل ہوتا ہے۔

اس کتاب کا چوتھا حصہ بیسویں صدی کی باہمی جنگوں کی جانب جا نکلتا ہے۔ اس میں ان پانچ یورپی مصنفین کے سفرنامے شامل ہیں جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ اس کی ابتدا 1925ء میں لکھے گئے انگریز مسلمان

مصنف ایلڈن رٹر کے دو جلدوں پر مشتمل سفرنامے سے ہوتی ہے۔ اونٹوں کے قافلوں کے ساتھ حج کا سفر کرنے کا یہ آخری عشرہ تھا۔ یہ تسلسل آگے بڑھ کر دو نومسلم خواتین کے سفرناموں کو بھی شامل کر لیتا ہے جو انگریزی زبان بولتی تھیں ایک کا نام ونیفریڈ سٹیگر ہے جس کا تعلق آسٹریلیا سے ہے اور دوسری لیڈی ایولین کوبولڈ، برطانیہ کی ہیں۔ یہ سفرنامے بالترتیب 1927ء اور 1933ء میں لکھے گئے۔ زمانی اعتبار سے ان دو سفرناموں سے اقتباسات کو علیحدہ علیحدہ کر کے مشہور سکالر اور سیاح محمد اسد نے اپنی کتاب میں شامل کیا جو شمال مغربی اسپین کے گلیشیا نامی خطے سے تعلق رکھتے تھے صحافی بھی تھے اور مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ محمد اسد ابن سعود کے دربار میں بھی چند برس رہ چکے تھے۔ حج کی یادداشتیں جمع کرنے والے ہیری سینٹ جان فلبی نے بھی ان سفرناموں سے اقتباسات دیئے، جو خود ایک برطانوی سفارت کار تھے جن کا قیام مشرق وسطیٰ میں رہا۔ یہ بھی جہاں گرد تھے اور محمد اسد کی طرح کئی برس سعودی دربار میں رہ چکے تھے۔ چوتھا حصہ صرف ایک عشرے پر پھیلا ہوا ہے مگر حج کے لیے یہ عرصہ بڑا نازک ہے۔ اس عرصے میں سعود کے ایوان نے مکہ میں شریف خاندان کی حکومت کو ختم کر دیا تھا اور جنگ عظیم اول شروع ہوتے ہی سلطنتِ عثمانیہ توڑ دی گئی تھی۔ جدید حج کی بنیادیں اسی عہد سے شروع ہوتی ہیں۔ کئی صدیوں بعد پہلی بار یہ براہِ راست مقامی کنٹرول میں آئی۔

پانچواں حصہ اس مجموعے کو اختتامی شکل دیتا ہے جب ان پانچ سفرناموں کو اس میں شامل کیا گیا ہے جن کا تعلق مابعد نوآبادیاتی عہد سے ہے، جسے عہد جیٹ حج کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ سفرنامے ہیں جو ان مسلمانوں نے لکھے جن کا تعلق مکہ، افغانستان، ایران، برطانیہ اور امریکہ سے تھا۔ یہ جنگ عظیم دوم کے بعد تحریر کیے گئے تھے جب جنگ کے نتیجے میں پارہ پارہ ہو جانے والے یورپ نے بالآخر دنیا بھر میں اپنی سلطنت چھوڑنی شروع کر دی تھی۔ ان مسلم نوآبادیوں کو آزادی اور حکومت سونپنی شروع کی اور سپردگی کی اہم ذمہ داری ریاستہائے متحدہ امریکہ کو دے دی گئی۔ وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اسلام مغرب میں اس وقت پھیلا جب سعودی عرب میں عالمگیر جدیدیت آئی اور حج میں طبعی تبدیلی آئی جس میں اونٹوں کی جگہ موٹر کاروں اور ہوائی جہازوں نے لے لی تھی اور حاجیوں کے مقامات میں بے پناہ وسعت آئی تھی۔ یہ حصہ حمزہ بوگرے کی بچپن کی یادوں سے شروع ہوتا ہے جو 1940ء کی دہائی کے عرصے کی ہیں اور مکے کے بارے میں ہیں۔ بعد میں آنے والی تیز تبدیلیوں کی یہ بنیاد بن جاتی ہیں۔ قارئین اس عمل کے مختلف مراحل میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں جس کے لیے انہیں 1960ء کی دہائی کے دو معزز حجاج اپنی تحریریں پڑھنے کے لیے

دے دیتے ہیں۔ان میں سے ایک ایرانی ناول نگار جلال آلِ احمد (1964ء) اور دوسرا افریقی امریکی لیڈر میلکم ایکس ہے۔آل احمد (1964ء) نے حج کو اسلام کی مسلسل اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے استعمال کیا، یہ شاہ محمد رضا پہلوی کا عہد تھا جب وہ ایران کو تیزی سے سیکولرزم کی طرف لے جا رہا تھا۔میلکم ایکس نے اپنی زندگی کے آخری برس میں اسلام کو امریکی نسل پرستی کے خلاف ایک آزاد کرانے والی الٰہیات کے طور پر اپنی جدوجہد میں شامل کیا تھا۔دونوں جوابی ثقافت کا پرچار کرنے والی شخصیات تھیں۔پانچواں حصہ جب ختم ہوتا ہے تو دو ایسے سفرناموں کے اقتباسات کے ساتھ ختم ہوتا ہے جنہیں سیاسی رنگ کم دیا گیا ہے: ایک سعید ولر خلیفہ کا ''اسلام کا پانچواں ستون'' ہے۔یہ 1970ء میں قاہرہ سے شروع کیے جانے والے سفرِ حج کے بارے میں ہے اور دوسرا میری اپنی کتاب سے ہے جو میں نے 1990ء میں حج پر لکھی تھی۔

بیسویں صدی کو غالباً اس حوالے سے ایک بہترین صدی کے طور پر یاد رکھا جائے گا جس میں اپنے وطن سے باہر رہ کر بھی کچھ گروہوں نے اپنی ثقافت کو برقرار رکھا۔جہاں تک اسلام کا تعلق ہے آج دنیا کی تقریباً نصف آبادی ان ممالک میں رہتی ہے جہاں اسلام اقلیتوں کا مذہب ہے۔اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے چوتھے اور پانچویں حصے میں حج کے سفر سے متعلق زیادہ تحریریں وہ شامل کی گئیں جوان نومسلموں کی تھیں جن کا تعلق اسلام کی زیادہ روایات کی حامل سرحدوں والے ملکوں سے باہر کے ممالک سے تھا۔پیدائشی مسلمانوں میں سے صرف جلال آل احمد (1964ء) اپنے روایتی وطن حج کے بعد واپس لوٹ آئے تھے۔جس طرح ٹیکنالوجی نے حج کی شکل اور ٹائم ٹیبل کو بدل دیا ہے اسی طرح جدیدیت نے اس میں اپنا ادب اور ذہنی روایات داخل کردی ہیں۔ان جدید مسلم حاجیوں نے اپنا جو نقطۂ نظر بیان کیا ہے اس میں کچھ بھی عہدِ عتیق سے متعلق نہیں ہے۔محمد اسد اور بوگرے دونوں اپنے فرائیڈ کو جانتے ہیں اور آل احمد اور میلکم ایکس اپنے مارکس سے واقف ہیں۔عالمگیر سیاح ہوں یا مقامی شخصیات وہ عالمی ثقافت سے متاثر ہوتی ہیں اور اسے اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال لیتی ہیں۔یہی ریل گاڑیوں میں (بعدازاں ہوائی جہازوں میں) اسی طرح بخوشی سفر کرتے ہیں جس طرح ان کے آباؤاجداد اونٹوں پر سفر کیا کرتے تھے۔مغربی دنیا کے لوگ جو جدیدیت کو ایک مخصوص مقبوضہ تصور کرتے ہیں یہاں اسے دیکھ کر حیران ہوں گے۔یہ انہیں کوئی بے اثر نقالی کی شکل میں دکھائی نہیں دے گی بلکہ دنیا کے گرد اسے مقامی استعمال کے لیے مطابقت پذیری کے ایک طریقے کے طور پر دیکھیں گے۔

مضامین: ان پانچوں حصوں میں سے ہر ایک سے قبل ایک عام مضمون بھی ہے جو اس عہد کی چند

اہم قوتوں کا ذکر کرتا ہے خصوصاً اس بات کا ذکر کہ یہ قوتیں مکہ پر اور حج پر کس طرح اثر انداز ہوئیں۔ ہر سیاح کے سفرنامے کے اقتباس سے قبل ایک پیش لفظ بھی ہے جو مختصر سے مضامین کی شکل میں ہے جو مصنفین کے عہد، تناظر اور حج کے مخصوص پہلوؤں سے مخاطب ہیں۔ یہ تمام تعارف تاریخی قسم کے ہیں اور ان کا مقصد اقتباسات کو پیش کرنا اور جمع کرنا ہے۔ یہ حج اور ان سیاحوں کے بارے میں مواد مہیا کرتے ہیں جنہوں نے اس بارے میں لکھا۔ میں نے ملکی سیاست پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی انہوں نے دی ہے۔ جہاں کوئی مصنف کسی حکمران یا اس کی حکومت میں دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے میں نے صرف قارئین کے لیے اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ وگرنہ میری ساری توجہ تو حج پر نہ کہ مقام پر رہی۔ ہر اقتباس ایک طویل کہانی میں ایک مختصر سا اضافہ کر دیتا ہے۔ اقتباسات کو سن وار پیش کرنے کی کوشش موضوع کو مجموعی طور پر قابل فہم بنانے میں مدد دے گی۔ تاہم یہ اسلامی یا مشرقی تاریخ کے جائزے میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ کہیں کہیں سینکڑوں برس ایک سیاح کو اگلے سیاح سے جدا کرتے ہیں اور لامحالہ بہت کچھ حذف بھی کیا گیا ہے۔ وہ قارئین جو مزید تاریخی پس منظر جاننا چاہتے ہوں وہ کتابیات کی طرف رجوع کریں۔ اس کتاب کی زمانی ترتیب کو تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف کر کے دیکھا جائے تو ان سیاحوں کی تین قسمیں بنتی ہیں۔

اسلامی گروپ میں ہمارے پاس سات سفرناموں کے اقتباسات ہیں جو ان مصنفین نے لکھے ہیں جو پیدائشی مسلمان ہیں یہ کتاب کے پانچ میں سے چار حصوں میں ملیں گے۔ مغربی مصنفین میں سے آٹھ کتابیں ان سیاحوں کی ہیں جن کا تعلق یورپ سے ہے ان کو کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصے میں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ آخر میں ہمارے پاس بیسویں صدی کے آٹھ مصنفین وہ رہ جاتے ہیں جن کا تعلق مغربی دنیا سے ہے اور جو نومسلم ہیں۔ کتاب کے آخری دو حصوں میں ان کتابوں سے لیے گئے اقتباسات کی ضخامت زیادہ بن جاتی ہے۔ یوں تشکیل شدہ گروپس کے مصنفین کی نیت، مزاج اور نقطہ نظر میں پائے جانے والے نمایاں فرق کو کتاب میں جگہ جگہ زیر بحث لایا گیا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ مسلم سیاح مکے کو ایک یکساں سماجی نظام والا شہر خیال کرتے ہیں، ایک ایسا مقام جہاں روحانی بالیدگی کے حصول کیساتھ ساتھ تعلیم کے حصول کی کوشش بھی کی جا سکتی ہے اور پیشہ ورانہ کیریئر بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ غیر مسلم سیاح مصنفین دوسری طرف مشرق کو بند، پُراسرار اور دشمن تصور کرتے ہیں۔ ان کے لیے مقدس زمین (خواہ وہ مسلمان ہے یا عیسائی) کہیں اور ہے جبکہ مسلمانوں کے لیے مقدس مقامات (مکہ اور یروشلم) زیادہ جانی پہچانی دنیا کے مراکز ہیں۔ سب سے آخر میں

یہ بات بھی واضح ہے کہ مسلمان سیاح اس بات سے زیادہ اچھی طرح واقف ہوتے ہیں کہ وہ کہاں جارہے ہیں جبکہ باہر کے لوگ ایک اجنبی، انجانی سرزمین کو تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ خلافِ قیاس مؤخرالذکر گروپ ہمیں مکے اور حج کے بارے میں زیادہ کچھ بتاتا ہے شاید اس لیے کہ وہ ناواقف قارئین کو نئے حقائق بتانا چاہتے ہیں۔ ورتھما سے لے کر جس کے پاس کم معلومات ہیں (1503ء) محنتی برکات اور برٹن تک قارئین دیکھیں گے کہ یہ مغربی اپنے علم اور معلومات کو بہتر بھی بنارہے ہیں اور انہیں دوسروں تک منتقل بھی کرر ہے ہیں۔

کچھ قارئین کو شاید حج پر مسلسل غیر مسلم مداخلت کاروں کے سامنے رہنے سے اختلاف ہو یا اچھا بھی نہ لگے۔ مذہبی قانون کے تحت شہر میں ان کا داخلہ ممنوع ہے۔ وہ حج کو اپنے لیے ایک سوانگ بنائے بغیر نہ رہ سکے تاکہ اس شہر میں داخل ہوسکیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی ان کتابوں کے فوائد تھے۔ خواہ ہمدرد سکالرز کے لیے یا مصنف جہاں گردوں کے لیے یا پیشہ ور جاسوسوں کے لیے اور ان کے یہ سفرنامے واپس حکمرانوں تک بھی پہنچے جن کے ذہنوں میں فتح کا خیال تھا۔ بالخصوص انیسویں صدی کے نوآبادیاتی نظام میں ایک نسل کے جستجو کے کام نے چند برس بعد سیاسی برتری کے لیے نقشے فراہم کیے۔ اس حوالے سے ان حج سفرناموں کو عالمی استحصالی تناظر میں بھی پڑھا جاسکتا ہے جسے علمی حلقوں میں مغرب کی ہوسِ حکمرانی کہا جاسکتا ہے مگر مکہ کا معاملہ اس سے مختلف ہے کہ یہ کبھی کسی نوآبادیاتی نظام کا حصہ نہیں رہا، مکہ اور حج پر یہ نظریات اثرانداز بھی نہیں ہوتے۔

میری یہ کوشش ایک ہزار برس پر پھیلا ہوا نمونے کا ایک مجموعہ ہے جس میں ان سفرناموں کے اقتباسات شامل ہیں جو مختلف مقاصد کے لیے، مختلف راستوں سے سفر کرنے والے ان 23 سیاحوں کی تحریروں پر مشتمل ہیں جنہوں نے ایک ہی منزل، مکے تک پہنچنے کے لیے یہ سفر کیا۔ ان سفرناموں کے اوراق اس سفر کی روداد لیے ہوئے ہیں جس میں ایک ہزار راستے استعمال ہوئے۔

☆☆☆

پہلا حِصّہ

اَزمنۂ وُسطیٰ:

تین مُستند مُسلم سیّاح

1326—1050ء

مُلک فارس کے نصر خسرو (1003-1077ء) اسپین کے ابنِ جُبیر (1145-1217) اور مراکش کے ابن بطوطہ (1303/1304-1368/69) تینوں سرکاری ملازم، تعلیم یافتہ اور پکے مسلمان تھے۔ ان تینوں کے درمیان اگرچہ صدیوں کا وقفہ تھا مگر انہیں اکثر ایک ہی عہد کے معاصرین کے گروپ میں شامل کیا جاتا ہے جو اسلام کی توسیع کا وسطی عہد تھا۔ اس دور کو اسلامی سیاحت کا سنہری دور کہا جاتا ہے جس میں کچھ حصہ ان مصنفین کی کوششوں کا بھی ہے۔ ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک قاری یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد وہ کون سے علاقے تھے جہاں اسلامی دنیا میں وسعت ہوئی۔

جیسا کہ مغربی قارئین عموماً اس بات سے باخبر ہیں کہ ابتدائی اسلام (620-800ء) دو سمتوں میں بہت تیزی سے پھیلا، مکہ سے شمال مشرق تا افغانستان ایک جانب اور دوسری طرف مغرب سے مراکش اور اسپین تک۔ اس بات سے زیادہ دنیا واقف نہیں کہ اس کے بعد کی چھ صدیوں کے دوران اسلام یورپ کی طرح طویل عہد ظلمت میں کبھی نہیں رہا بلکہ ایک مذہب اور ایک سماجی نظام ایک تجارتی نیٹ ورک اور ایک مربوط طرزِ حیات تھا۔ یہ دنیا میں پہلا عالمی کلچر بن کر ابھرا۔ اس نے ایک مخلوط تہذیب اور ایک وسیع یورو ایشیائی مشترک سرزمین تخلیق کی جسے حجاج، تاجر اور اعلیٰ سرکاری افسر حیرت انگیز آسانی کے ساتھ عبور کرتے تھے۔

یہ ایک مکمل اسلامی دنیا تھی جس میں سے یہ سب گزر کر جاتے تھے، اس کا ایک ایسا نیٹ ورک تھا جس کے مختلف دارالخلافے تھے۔ دور دراز کے ملک عرب میں مکہ کے مقدس شہر نے مرکز حج کے طور پر ایک منفرد اور اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تھا۔ ہر سال بیشمار حجاج یہاں جمع ہوتے تھے مگر آٹھویں صدی میں اصل سیاسی قوت زیادہ قابل دسترس شہروں مثلاً دمشق اور بغداد کی جانب بتدریج منتقل ہو گئی تھی۔ تقریباً دو صدیوں بعد جب ہمارا پہلا مصنف نصر خسرو سفر میں تھا، طاقت ایک بار پھر قاہرہ منتقل ہو گئی تھی تاہم اس وقت تک ایک سلطنت کا کلاسیکی تصور جس پر ایک دارالخلافے سے حکومت کی جاتی تھی کمزور ہونا شروع ہو گیا تھا جسے امریکی مؤرخ مارشل ہاجسن نے ایک مسلسل وسعت پذیر بین الاقوامی معاشرہ کہا ہے جس پر متعدد آزاد مسلم قوتوں کی حکمرانی ہوتی ہے۔

مشرق قریب میں بغداد اور قاہرہ کی حکومت جاری رہی مگر ہر سمت میں اس سے آگے، ہزاروں،

میلوں تک سیاسی اور تجارتی اثر ورسوخ کے مالک خطے موجود تھے، ان میں پوری کی پوری مُسلم سلطنتیں، اسپین، شمالی افریقا اور انڈیا میں برسر اقتدار تھیں۔ جیسا کہ ہمارے سیاح ہمیں بار بار یاددہانی کراتے جاتے ہیں ان علاقوں کے قابل فخر دارالخلافے بھی تھے..... قرطبہ، تیونس، دہلی مگر بنی نوع انسان کی نوے فی صد آبادی ان سے باہر قصبوں، شہروں اور دیہات میں سڑکوں کے کنارے رہتی تھی۔ آج کے سکالر اس مغربی من گھڑت نظریے کو مسترد کر چکے ہیں کہ اس توسیع کو بزور طاقت حاصل کیا گیا تھا۔ زیادہ تر علاقوں میں مقامی آبادیوں نے اس نظام کو بخوشی قبول کر لیا تھا جو اُن پر کم ٹیکس لگاتا تھا اور انہیں نئی نئی سہولیات پیش کرتا تھا۔ عام طور پر یہ بات کہنے کو جی چاہتا ہے (اور جس میں حقیقت شامل ہے) کہ اسلام لوگوں کے لیے ایک ایسا مذہب تھا جس میں ڈھل جانا آسان تھا، جو تین براعظموں کے شہری اور دیہاتی علاقوں میں بڑا ہی پرکشش نظر آتا تھا۔

وہ قوتیں جو اس دور دراز کے نیٹ ورک کو وسعت دے رہی تھیں وہ سیاسی، تجارتی یا شہری نہیں تھیں۔ باہم جوڑنے اور قریب لانے والے عناصر میں مشترک سماجی طرز زندگی تھا جس کا ذکر اسلام کی روزمرہ روایات میں کیا گیا ہے (نماز، وضو، خوراک اور رہن سہن کے طریقے)؛ ایک کتاب، قرآن اور قوانین کا ایک مشترک مجموعہ یعنی شریعت جو دیانتدارانہ تجارت پر زور دیتی ہے۔ طنجہ، قاہرہ، دمشق اور دہلی کے درمیان تجارت کو بری قافلوں اور بحری راستوں کا پیچیدہ نظام مزید مدد دے رہا تھا جن کے ذریعے سامانِ تجارت ہزاروں میل تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ پورے مشرق قریب میں حج کے لیے مستعمل سڑکوں کا جال اس نظام کی شریانوں کی طرح بچھا ہوا تھا۔ ہر سال تین ماہ کے موسم میں ان شاہراہوں پر حجاج کے قافلے ہی قافلے نظر آتے تھے جو اپنے ساز و سامان سمیت مکہ کی جانب بڑھ رہے ہوتے تھے۔ یہ مختلف صوبوں کے درمیان خبر رسانی کا کام بھی کرتے تھے۔ اس لیے کہ ہر کوئی کسی نہ کسی کو ضرور جانتا تھا اور اس لیے کہ مکہ ان کے مشترک مذہب کی جائے پیدائش تھی۔ یہ غیر مسلموں کے لیے ممنوع تھا اور مغرب کے لیے پراسرار۔ مگر اسے ہمیشہ ایک بہترین مسلم شہر کے طور پر جانا جاتا تھا۔ صرف دس برس کا شہری لڑکا بھی خواہ وہ مُلک فارس کا تھا یا مراکش کا، وہ حج کی مذہبی رسوم سے ضرور آشنا تھا۔ اس نے مکہ سے واپس آنے والے کسی چچا یا چچی کی زبانی حج کے بارے میں ضرور سن رکھا تھا۔ دیہات میں بھی مکہ لوگوں کے تصورات میں آباد تھا، خواہ وہ گئے تھے یا نہیں، خواہ وہ بہت پکے مسلمان تھے یا نہیں مگر سبھی مکے سے ایک عقیدت رکھتے تھے۔

ابن بطوطہ کی چودھویں صدی میں حج ایک منظم مہم اور سفر کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ مقررہ اوقات میں

اور کم خرچ کے ساتھ قاہرہ، دمشق یا بغداد میں پہنچنے والے حجاج مخصوص سڑکوں پر نکل کھڑے ہوتے تھے۔ لوگ سرکاری قافلوں کے ساتھ سفر کرتے تھے جو انہیں بروقت مکہ پہنچا دیتے تھے تا کہ وہ مقررہ رسوم ادا کر سکیں۔ حجاج مشرقی نصف کرۂ ارض کے تمام حصوں سے آتے تھے، درجنوں زبانیں بولتے تھے اور مختلف قسم کا لباس زیب تن کیے ہوتے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کنبوں کی شکل میں سفر پر روانہ ہوتے تھے۔ چند ایک تو ایک ہی شہر یا گاؤں سے تعلق رکھتے تھے مگر زیادہ تر ان میں اجنبی ہوتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حج ادا کرنے کے لیے ارادے کا اعلان ایک طرح سے ایک ہی مقام پر ایک ہی جگہ ان ہزاروں لوگوں کے ساتھ پہنچنے کا اعلان تھا جو آپس میں ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں قبیلے اور خون کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی حج کے سفر کا یہ پہلو عمومی وفاداریوں کو منسوخ کر دیتا تھا۔ ہر سال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطہ نظر یہ ثابت کرتا تھا کہ مسلمانوں کو قبیلے اور نسل سے کہیں زیادہ کوئی اور رشتہ ایک دوسرے کے قریب کرتا ہے اور وہ تھا اسلام کا رشتہ، دین کا رشتہ۔ اس اجنبیت کے علاوہ حج کے موقعہ پر حجاج کو ایک اور خطرہ بھی درپیش رہتا تھا۔ سیاسی انتشار کے وقت مسافروں کو مکے پہنچنے کے لیے اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈالنا ہوتا تھا۔ شدید گرمی، صحرا کی خستہ حال سڑکوں، بدو ڈاکوؤں کا خطرہ اور ظالم صلیبیوں کے ظلم کے باوجود مکے پہنچنا ایمان وعقیدے کا امتحان تھا جس پر یہ لوگ پورا اترتے تھے۔

بڑے بڑے قافلے جب دارالخلافوں سے روانہ ہوتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے شہر کے شہر حرکت میں آ گئے ہیں۔ مختلف علاقوں کے حکمران ان کی مدد اور حفاظت کرتے تھے اور یہ قافلے بے آب وگیاہ خطوں، صحرائی بیابانوں، نخلستانوں سے ہوتے ہوئے، پڑاؤ پر پڑاؤ کرتے منزل پر پہنچ ہی جاتے تھے۔ سماجی مؤرخ کے نزدیک ان قافلوں کے سفر کے انتظام والنصرام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تنظیمی شعور بہت زیادہ تھا۔ حج کے راستوں سے واقفیت بھی اپنی جگہ ان کی کامیابیوں میں شمار ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر کوفہ تا مدینہ نو سو میل لمبی بغداد روڈ قبل از اسلام عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ تاہم نویں صدی کے وسط تک اس شاہراہ پر سنگ میل لگا دیئے گئے تھے اور 54 بڑے اسٹیشن قائم کیے گئے تھے جہاں پانی کے حوض، تالاب، کنویں، گنبد جن پر سے آگ لگنے کی اطلاع دی جاتی تھی۔ دارالاقامتہ اور چھوٹے چھوٹے قلعے تعمیر کرائے گئے تھے۔ ان کے اخراجات خلافت عباسیہ کے خزانے سے ادا کیے گئے تھے۔ سوئیز سے دمشق تک کے اہم راستوں کی طرح بغداد روڈ پر خورد ونوش کا سامان مہیا کرنے کے لیے بھی اسٹیشن قائم کیے گئے تھے۔ مقامی تاجر یہاں آ کر اپنا سامان

بچتے تھے۔ جیسا کہ ابن بطوطہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہر قافلے کی اپنی انتظامیہ ہوتی تھی۔ سالانہ بنیاد پر ایک لیڈر، یا امیر مقرر کیا جاتا تھا جس کا رابطہ اعلیٰ افسروں کے ساتھ رہتا تھا جو یاترج خدمات کے طور پر اونٹ، دوائیں، لیے مشعل بردار، باورچی، آتش بازی کے ماہرین، سکاؤٹس، گائیڈ، سپاہیوں کے دستے اور موسیقاروں کا انتظام کرتے تھے۔ قاہرہ، دمشق اور بغداد سے گزرنے والے راستوں کے علاوہ دوسرے راستوں پر بھی مسافر سفر کر سکتے تھے مثلاً شمال کی جانب اوپر کی طرف دریائے نیل کے ذریعے جو مصر سے گزرتا تھا اور پھر بحیرۂ احمر سے گزر کر یا شمال میں یمن کے پہاڑی سلسلوں کو عبور کرنا ہوتا تھا۔

ان راستوں میں سے زیادہ تر کا ذکر ان اوراق میں کیا گیا ہے۔ اس عہد کی تحریروں میں سے چند بہترین وہ ہیں جن میں کئی قافلوں کے سفر کی تفصیل دی گئی ہے۔ رات کے وقت صحراؤں میں چلنے والے خاموش اونٹوں، پر مشتمل قافلوں، ان کے ہمراہ حرکت کرتے لالٹینوں، طنبوروں کی مدھم آوازوں اور خانہ بدوشانہ پھر ان تحریروں کا حصہ بنے ہیں۔ اگر یہ سامنے آ جائیں تو ایسے مناظر آج کے شہری مُسلم قارئین کے لیے بھی بے حد دلکشی کا باعث ضرور بنتے۔ حج پر کتابیں لکھنے والوں کے پیش نظر لطف اندوز کرنے کے علاوہ مستقبل کے حجاج کو پہلے سے باخبر کرنا بھی شامل رہا کہ قافلوں کو یہ بتا سکیں کہ انہیں سفر حج کے دوران خطرات بھی درپیش ہوں گے اور مشکلات کا سامنا بھی ہوگا مثلاً پانی کی قلت، تیز و تند ہوائیں، چوروں ڈاکوؤں سے سامنا ہوگا اور پچھلے برس راستے میں لقمہ اجل بننے والوں کی ہڈیاں بھی دیکھنے کو ملیں گے ان راستوں کے بارے میں تفصیلات کا جاننا ضروری تھا کیونکہ ان پر بہت سے گڑھے، بہت سی رکاوٹیں انہیں پیش آ سکتی تھیں۔ ڈاکوؤں سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے مُسلّح محافظوں کی بڑی ضرورت تھی۔ 1051ء میں نصر خسرو جب مکے سے وطن واپس آ رہا تھا تو بغداد قافلے کی حفاظت سے اس لیے محروم ہو گیا کہ وہ راستے سے بھٹک گیا تھا اور اس بارے میں اسے لکھنے کا بمشکل موقع ملا تھا۔ ایک صدی اور گزرنے کے بعد جنوبی مصر میں ابن جبیر نے، جو ہماری اس کتاب میں شامل دوسرے سیاح ہیں، ان متعدد جھتوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا جو مکے کے راستے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ زمانہ مزید آگے نکلتا ہے اور ابن بطوطہ ایک ایسے تیر اندازوں کے 100 یا اس سے زیادہ کے دستے کا ذکر کرتا ہے جو لیبیا کے اس قافلے کی حفاظت کر رہا تھا جس کے ہمراہ یہ جا رہا تھا۔ اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ اس کتاب میں شامل کیے گئے سفرناموں کے اقتباسات جزواً مستقبل کے حجاج کو سفر کی مشکلات کے بارے میں باخبر کرنے اور انہیں تحفظ فراہم کرنے کے لیے لکھے گئے۔

کتاب کے پہلے حصے میں جب ہم ابتدائی وسطی عہد کی گیارہویں اور بارہویں صدی کا ذکر کرتے ہیں تو اسلام کے دو مختلف فرقوں سنی اور اہل تشیع کے درمیان طاقت کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ دونوں فرقے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے تیس برس بعد مسلم برادری میں ایک اختلاف پیدا ہونے کی وجہ سے وجود میں آئے تھے۔ اختلاف خلفائے راشدین کے انتخاب میں ترتیب کا ہے، دونوں مختلف نظریے کے حامل ہیں۔ سُنیوں کی زیادہ تعداد کا خیال تھا کہ ہر نئے خلیفے کے لیے الیکشن کا طریقہ اپنایا جائے جبکہ اہل تشیع کا خیال تھا کہ رسول کریم کی جانشینی کا حق ان کے داماد اور چچازاد حضرت علیؓ کو حاصل تھا۔ تاہم 945ء تک خلیفہ کی اسامی (خلیفہ یا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین) جو کبھی اسلام کا روحانی اور دُنیوی حکمران ہوتا تھا، اب تیزی سے وسعت پذیر ایک ایسی اسلامی دنیا کے ایک سربراہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا، جو اب ایک عرب مرکز سے کنٹرول نہیں کی جا سکتی تھی۔ خلیفہ اس خیال کی صدارت کے لیے آیا تھا کہ اسلامی دنیا کو اکٹھا کس طرح کیا جائے جبکہ سلاطین (وسیع سلطنتوں کے حکمران) اور امیر (جو زیادہ تر مقامی مقبوضات پر حکومت کرتے تھے) عملاً حکومت سنبھالتے تھے۔ ایک چوتھی طاقت فوج کی مدد سے وجود میں آئی۔ طاقت کی یہ وسیع تقسیم 1500ء تک ہر کہیں ایک عام قوت بن چکی تھی۔ ابتدائی وسطی عہد (945-1250ء) کا زیادہ عرصہ وہ تھا جب مرکزی عرب خطہ دو طاقتوں میں بٹ چکا تھا: سُنّی سلطنت عباسیہ، جس کا مرکز بغداد میں تھا اور ابھرتی ہوئی تشیع کی طاقت، خلافتِ فاطمیہ (961-1171) جس کا دارالخلافہ قاہرہ کا نیا شہر تھا۔ ان کے درمیان ایک مقابلہ تھا کہ مراکش تا ایرانی سطح مرتفع ایک واحد مستحکم حکومت قائم کی جا سکے۔

مکہ اس جدوجہد سے متاثر ہوا۔ پہلے فاطمیہ حکومت کو گیارہویں صدی میں غلبہ حاصل ہوا پھر 1170ء میں یہ عباسیوں کے پاس چلی گئی۔ دونوں طاقتیں چاہتی تھیں کہ مکہ میں اقتدار اعلیٰ ان میں سے کسی ایک کو حاصل ہو۔ مکہ اس وقت ایک ایسا غریب، صوبائی، صحرائی شہر تھا جس کے پاس حج کے سوا کچھ نہ تھا۔ حج کے دوران ہونے والی آمدنی کے علاوہ اس کی دیگر آمدنی بہت قلیل تھی۔ مکہ میں بڑے بڑے تجارتی مراکز کوئی نہ تھے۔ تاہم دونوں طاقتوں کو یہ ضرور معلوم تھا کہ مکہ کو ایک مقدس شہر حج ہونے کی وجہ سے ایک علامتی طاقت ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اور اسلام کے ایک مقدس مرکز کے محافظین کا اعزاز کوئی کم بڑا اعزاز نہ تھا جس کی خواہش یہ دونوں طاقتیں رکھتی تھیں۔ مکہ کی مہر منظوری اس لیے ضروری تھی کیونکہ خلیفہ کی سلطنت سے ہر کسی نے کبھی نہ کبھی مکہ ضرور جانا ہوتا تھا۔ مساجد میں جمعہ کی نماز میں حکمران کا نام بھی خطبے میں لیا جاتا تھا۔ سلطنت کے

خزانوں سے مقامی حکمرانوں (شریف خاندان) کو بڑی فیاضی سے رقوم ملتی تھیں۔ مکہ اور مدینہ کی مساجد کی مدد ہوتی تھی۔ یہی حکمران حج کے لیے استعمال ہونے والی سڑکوں کی حفاظت کا کام اپنے ذمے لیتے تھے۔

ہمارے پہلے دو سفرناموں کے اقتباسات اس انتظام کی پوری تفصیلات کی عکاسی کرتے ہیں۔ کتاب کے پہلے حصے میں ناصر خسرو، جو شیعہ تھا 1047ء میں حج کی ادائیگی کے لیے جاتا ہے۔ اس حج میں اس کی زیادہ مدد مصر کے شیعہ حکمران مستنصر کی طرف سے کی گئی تھی۔ ایک صدی بعد طاقت واپس عباسیوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور ابنِ جبیر قاہرہ پہنچتا ہے، ایک ایسے شہر میں جو کسی سنّی حکمران کی سلطنت میں ہو اور حجاز میں حج کی ادائیگی میں اسے ایک سنّی کی مدد حاصل ہو سکے۔ حکومت میں انقلاب آ چکا ہے، حجاز اور دوسرے علاقے دوسرے ہاتھوں میں چلے گئے ہیں۔ تاہم دونوں ادوار میں مکہ اور طاقت کے حامل خطے کے درمیان پرانا عسکری اتحاد قائم رہتا ہے۔ مقدس شہر میں ہر حکومت کا اقتدارِ اعلیٰ قائم رہا اور اس کے عوض اس حکومت نے مدد اور تحفظ فراہم کیا۔ تقریباً 1180ء کے بعد مکہ کے شریف خاندان کے حکمرانوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے فنڈز کا ایک حصہ حجاز کے حملہ آور قبیلوں کے حملوں میں تخفیف کرنے کے لیے استعمال ہوگا تاکہ وہ حاجیوں کو لوٹ نہ سکیں۔ اس انتظام و انصرام کا بنیادی خاکہ صدیوں تک موجود رہا۔ مملوکوں مصری سلاطین کے خاندان (1250-1517) کے عہد میں قافلوں کے ساتھ مسلح محافظوں میں اضافہ کیا گیا۔ سلطنت عثمانیہ کے عہد (1517-1924) میں حج کے لیے جانے والے قافلوں کی حفاظت پر بجٹ کا زیادہ حصہ خرچ ہوتا تھا۔ اس پر اتنا ہی خرچ آتا تھا جتنا کسی جنگ پر سالانہ خرچ ہوتا ہے۔

شریف خاندان کون تھا؟ ابن بطوطہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ جب پہلی بار مکے پہنچا تو اس وقت اس شہر کے گورنر دو بھائی تھے، ایک سابق حکمران ابونعمان قتادہ کے بیٹے۔ قتادہ کا شجرۂ نسب ایک صدی سے زیادہ عرصہ پیچھے تک جا پہنچتا ہے، ابوعزیز "النابغہ" قتادہ، یانبو کے حکمران اور ایک ہاشمی تک، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلے سے تھا۔ "النابغہ" کا مطلب ہے غیر معمولی ذہین، جوہر قابل، طباع۔ یہ اس کا عرف تھا جو اسے اس وقت ملا جب اس نے اپنے بیٹے کو 3۔ مئی 1201ء کو ایک فوج دے کر مکہ پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس سیاسی ذہانت نے اس کی بعد میں آنے والی نسلوں کا ساتھ بھی دیا۔ اس تاریخ سے قتادہ کا شجرۂ نسب سات صدیوں تک چلا۔ شریف خاندان کا آخری حکمران (جو حسین ابن علی 24-1908 تک حکومت کرتا رہا) قتادہ بھی تھا اور ہاشمی بھی۔ اس سارے زمانے میں یہ شجرۂ نسب منقطع نہیں ہوا۔ ابونعمان اول (1255-1425)،

باراکاطس (1425-1524) ابونعمان دوم اپنے بہت سے قبیلوں (1524-1636) کے ساتھ اور شریف غالب اور اس کے رشتے داروں (1771-1881) میں سے ہر ایک صدی یا اس سے کچھ زیادہ عرصے تک حکمران رہا۔ ان کے ادوار حکومت مضبوط اور مستحکم نہ تھے۔ شریف خاندان کے ہر حکمران کے بہت سے بیٹے تھے جو اکثر دشمن بن جاتے تھے۔ بیرونی طور پر بھی حکومت کا شیرازہ بکھیر دینے کے لیے مصریوں، ترکوں کے دباؤ زیادہ تھے، جن کی فوجیں بعض اوقات کئی کئی عشروں تک صدیوں شہر کا محاصرہ کیے رکھتی تھیں۔

چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی طرح، جو کسی بھی ملک کے ہوں قتادہ خاندان نے بھی اپنی پوری ذہنی صلاحیتوں اور دانشمندی کے ساتھ حکومت کی، انہوں نے اپنے بانی باپ کی دم مرگ نصیحت کو باپ سے بیٹے تک منتقل کرنے کو جاری رکھا۔ یہ نصیحت حکومت کرنے کے اصولوں سے متعلق تھی۔ یہ پانچ اصول تھے جن کو اپنا کر ایک غریب صوبے کا حکمران اپنی حکومت کو استحکام دے سکتا تھا: سب سے پہلے تو اسے حجاز کی دور دراز کی مسافت کا فائدہ اٹھانا چاہیے، اسے اس کے اندر ایسے رکھنا ہے جیسے کوئی کسی قلعے میں ہوتا ہے، اپنی محدود قوت کو غیر ملکی جدوجہد میں ضائع کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ اسے شمال میں واقع مراکز قوت (قاہرہ اور بغداد) کے درمیان ہمیشہ مکمل توازن رکھنا چاہیے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ جنوب میں سچے اور مخلص اتحادیوں کے لیے یمن کی سمت دیکھ رہا ہو۔ تیسرا یہ کہ اسے چاہیے کہ وہ مسجد الحرام میں نمازوں کے دوران غیر ملکی سلطان کا نام پڑھنے کی اجازت دے دے، جو اس کے اقتدارِ اعلیٰ کی علامت ہوگی۔ چوتھا یہ کہ اسے مقامات مقدسہ اور سڑکوں پر خرچ کرنے کے لیے امیر اور متمول مسلمان حکمرانوں سے تحائف اور عطیات وصول کر لینے چاہئیں۔ سب سے آخری یہ کہ اسے حاجیوں پر قابل برداشت حد تک ٹیکس لگانے چاہئیں۔ یہ آخری اصول جو طمع و لالچ کو روکتا تھا، اسے زیادہ ناپسند کیا گیا۔ تاہم بقیہ اصولوں پر کاربند رہ کر قتادہ خاندان کے حکمرانوں نے مکے پر حکومت کرنے کو بیسویں صدی تک ممکن بنائے رکھا۔ گو بستر مرگ کا منظر مشکوک لگتا ہے لیکن ان حکمرانوں کا قدیم اصول ایک ایسے خاندان کے لیے بہترین راستہ کھول دیتا ہے جو مکے کے تخت و تاج سے محروم نہیں ہونا چاہتے۔

یہ ابتدائی سفرناموں کے اقتباسات ایک خوبصورت شہر میں آنے والوں کی صرف رپورٹوں پر مشتمل نہیں ہیں نہ یہ خالصتاً جغرافیے کی باتیں ہیں مثلاً ''دی بک آف روٹس اور صوبے'' از ابن خرداذبہ (جس کا انتقال 893 یا 894ء میں ہوا) یا ''دی بک آف ارتھ روڈز (977ء) از ابن ہیکل۔ ان کتابوں میں اس

بات کا صحیح صحیح تذکرہ ہے کہ مکے تک جانے والی سنائی روڈ پر چالیس پڑاؤ تھے۔ان میں سے ہر ایک 28 تا 30 میلوں کے بعد آتا تھا۔ان میں اس بات کا ذکر کہیں نہیں کہ قافلے اس سڑک پر کیسے نمودار ہوتے اور یہ ہجوم کیا تاثر دیتا تھا۔قارئین اس بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو سیاحوں کی طرف رجوع کریں۔مگر یہ کوئی مہماتی لٹریچر نہیں ہے نہ تلاش و جستجو کے سفر کا تذکرہ ہے۔یہ مصنفین اپنی منزل سے واقف ہیں اور جہاں انہیں پہنچنا ہے اس جگہ کے بارے میں انہیں پہلے سے کچھ نہ کچھ علم حاصل ہے۔یہ تجارت بھی نہیں نہ کوئی تجسس جو انہیں اس مقام کی سمت کشاں کشاں لیے جاتا ہو۔ان اولین سیاحوں کی منزل مقصود اپنی نوعیت میں روحانی اور تائب ہونے سے متعلق ہے۔یہ محض دنیا کو دیکھنے نہیں نکلے (حالانکہ انہیں سفر کے دوران بہت کچھ دیکھنے کو مل جاتا ہے) دراصل یہ ایک عہد پورا کرنے کے جا رہے ہیں اور خدا کا زیادہ گہرا تجربہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔یہ ابن بطوطہ اور مارکو پولو کے درمیان پایا جانے والا ایک نمایاں فرق ہے۔

ابتدا ہی سے اس لٹریچر میں باہم گڈمڈ متن اکٹھے ہو گئے ہیں، اسے ادبی سرقہ نہیں کہا جا سکتا۔مثال کے طور پر ابن جبیر، جو بارہویں صدی کا عرب اور اسپین سے تعلق رکھنے والا تھا مگر وہ نصر خسرو کی کتاب حج سے واقف تھا حالانکہ یہ ایک صدی قبل فارسی میں لکھی گئی تھی۔وہ اس کتاب میں سے بھی حوالے اسی طرح دیتا ہے جس طرح وہ ازراقی اور مکے کے دوسرے ابتدائی مؤرخین کی کتابوں میں سے حوالے پیش کرتا ہے۔ڈیڑھ سو سال بعد ابن بطوطہ تینوں کا حوالہ دیتا ہے، یہاں تک کہ ابن جبیر کے سفرنامے میں سے ٹکڑے اپنی کتاب میں شامل کرتا ہے۔ایسے حوالوں کا رواج بہت ابتدا میں شروع ہو گیا تھا۔یہ انیسویں صدی تک جاری رہا (بالخصوص برکات (1814) اور برٹن (1853) کو ملاحظہ کیجیے) کیونکہ مسلم اور غیر مسلم سیاح اپنے پیشروؤں کی تحریروں میں سے اپنے سفرناموں میں حوالے دیتے رہے ہیں۔

یہ قدیم سفرنامے ایک تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔قارئین نے انہیں ذوق و شوق سے پڑھا کیونکہ یہ حجاج کے سفر پر گرانقدر روشنی ڈالتے تھے اور لوگ آج بھی ان کا مطالعہ بڑی دلچسپی سے کرتے ہیں۔ابن جبیر کا سفرنامہ زمان و مکاں کی مربوط تفصیل پیش کرتا ہے اور ایک ایسے دوطرفہ سفر کے بارے میں ہے جس میں دو برس لگے تھے۔ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کے سفر سے قبل اتنا ہی وقت لگتا تھا۔سو سال قبل نصر خسرو نے بھی ایک دوطرفہ سفر قلمبند کیا ہے مگر اس سفر میں سات برس لگ گئے تھے اور بڑے پراسرار انداز میں اس سفر میں قوت محرکہ پیدا ہوئی تھی۔اس حصے میں آخری اور طویل ترین سفرنامہ ابن بطوطہ کا ہے جو ایک

رسمی حج رپورٹ کے طور پر شروع ہوتا ہے پھر اس میں دنیا کے بارے میں تفصیل شامل ہوتی جاتی ہے۔ان پہلے تین مصنفین کو متعارف کراتے وقت جو ادارتی رائے دی گئی ہے وہ کتاب کے بعد کے حصوں کی نسبت زیادہ طویل ہے۔ایسا اس لیے ہے کیونکہ وہ ایسے نظریات پیش کرتے ہیں جو بنیادی نوعیت کے تین موخرالذکر ریکارڈز کے لیے جو موضوعات لازمی ہیں مثلاً خلافت، سنی شیعہ فرقوں کا اسلام میں موجود ہونا اسلامی دنیا میں وسیع ،انہیں سب سے پہلے یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

ابتدائی منتخبات جو عہد وسطیٰ کے مصنفین کی کتابوں سے لیے گئے ہیں وہ مسلم سامعین کے لیے ہیں ۔ضروریات زندگی کے بارے میں ان کا خیال سہولت اور آرام و آسائش کے بارے میں ان کی تشریح اور لب سڑک نظر آنے والے سامانِ دلکشی، سب ان کے اپنے ہیں۔ان کے شہر ہمارے شہروں کی نسبت کم خطرناک نظر آتے ہیں اور ان کی سڑکیں زیادہ غیر محفوظ ہیں۔وہ جس آواز میں بات کرتے ہیں وہ بھی ہمیں انوکھی لگتی ہے۔ابن بطوطہ بھی جو سب سے زیادہ ذاتی نظر آتا ہے،اگر اس کا مقابلہ اس کے معاصر مصنفین سے کیا جائے تو وہ بھی پیچھے ہٹتا دکھائی دیتا ہے جس کے لیے ذاتی نفسیات قدرتی طور پر عوامی ریکارڈ کا معاملہ ہوتا ہے۔سفر کی رفتار بھی مختلف ہے۔1800ء کے ابتدائی دور تک حج کے لیے پہلی پرائیویٹ گاڑی کا استعمال تحریروں میں کہیں نظر نہیں آتا۔اس دوران سواری سے قریب تر جو شے نظر آئی وہ اونٹ پر لدا ہوا ایک شگدف تھا جو زین کے اوپر ابھرا ہوا ایک چھتر تھا جو سورج کی دھوپ اور گرمی سے بچاتا تھا۔ابن جبیر نے 1184ء میں ایسی سواری کا ذکر کیا۔سات صدیاں گزر جانے کے باوجود سر رچرڈ برٹن نے اس کے استعمال کی سفارش کی۔ عرب کے اندر 1930ء کی دہائی تک سفر حج کی رفتار کا تعین پہیوں سے نہیں بلکہ قدموں کی چاپ سے کیا جاتا تھا۔

☆☆☆

1۔نصرخسرو

فارس......1050ء

نصرخسرو کا سفر نامہ ایک مستند کلاسیکی متن ہے جس نے اہل فارس کے ایک ہزار برسوں پر پھیلے ہوئے سفرناموں کے لیے ایک بنیاد فراہم کردی ہے۔ یہ سڑک کے کنارے نظر آنے والی چیزوں پر لکھی گئی ایک ڈائری ہے جسے بغیر کسی پہلے سے کی گئی تیاری کے لکھ ڈالا گیا ہو۔ یہ ایک تجربہ کار سیاح کا تحریر کردہ ریکارڈ ہے جس نے خوبصورت مناظر دیکھے ہوں اور سفر کی صعوبتیں کھیل ہی کھیل میں برداشت کی ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ہمیں ایک ایسا شخص نظر نہ آئے جو اپنے بارے میں کچھ بتا رہا ہو مگر پھر بھی اس کی کتاب کا آغاز ایک اعتراف سے ہوتا ہے کہ یہ کتاب اس کے سفر زندگی کے نصف النہار کے بحران کے نتائج کے اظہار پر مبنی ہے۔

نصرخسرو 1003ء میں مشرقی فارس کے صوبے خراسان میں پیدا ہوا تھا۔ بیالیس برس کی عمر میں مکے کے سفر پر روانہ ہونے تک وہ میرو (آج کا ماری) اور بلخ میں مختلف انتظامی اسامیوں پر تعینات رہا۔ وہ اکثر شہزادوں کے درباروں میں جایا کرتا تھا۔ اس کی طنزیہ نظم "The Aging Rake" کی بنیاد وہ مستند معلومات ہیں جو اس نے ایک عیاشانہ زندگی کے بارے میں ذاتی تجربے سے حاصل کی تھیں۔ وہ خود لکھتا ہے کہ وہ شراب نوشی جیسی نہایت غیر اسلامی برائی میں گھرا ہوا تھا کہ 1045ء میں اس نے ایک خواب دیکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ وہ ایک ماہ سے سفر پر تھا اور راستے میں شراب بھی پیتا تھا۔ پھر ایک رات اسے نیند میں کوئی شخص ملا جس نے اس سے کہا کہ دانائی حاصل کرو۔ خسرو نے سوال کیا کہ دانائی کہاں ملتی ہے تو اس مہربان شخص نے مکے کی سمت اشارہ کرکے کہا "وہاں سے" اور یہ کہہ کر غائب ہوگیا۔

گیارہویں صدی کے ملک فارس میں اس قسم کے خواب کو روحانی حوالے سے اسمٰعیلی شیعہ مسلک کے کسی شخص کے لیے زندگی کا اہم موڑ تصور کیا جاتا تھا۔ ذہنی طور پر یہ لوگ سکالر ہوتے تھے اور سائنسی علوم کے حصول کا شوق بھی رکھتے تھے، وہ چھپے ہوئے دریائے معانی پر بھی نظر رکھتے تھے اور یہ سیاسی طور پر خراسان کی سنی

حکومت کا رنگ لیے ہوئے تھے کیونکہ قاہرہ میں فاطمی سلطان حکومت کرتا تھا اور ان کی وفاداریاں اس کے ساتھ تھیں۔ عقیدے کے لحاظ سے وہ جلد آنے والے ایک ہزار برس میں یقین رکھتے تھے جس میں انقلاب اور سماجی انصاف کی وعید سنائی گئی تھی۔

خسرو پہلے ہی اسمٰعیلی تھا یا سفر کے دوران اسمٰعیلی ہوا یہ بات معلوم نہیں ہو سکی۔ تاہم ہمیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ اس زمانے میں نئے سنی سلجوقی سلاطین نے اسمٰعیلیوں پر جور وستم میں تیزی سے اضافہ کر دیا تھا۔ اُجرت پر لڑنے والے ان سپاہیوں کے لیے اس فرقے (اور عموماً اہل تشیع نے) نے خطرہ کھڑا کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی ہمدردیاں خلیفہ کے علاوہ ایک نئے لیڈر کے لیے وقف کرنے پر بھی اصرار شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے کچھ خفیہ روایات کو اپنایا تھا۔ خسرو نے شکایت کی کہ سلجوقیوں کے ماتحت کسی سرکاری اسامی پر فائز رہنا ''دنیا کا ایک بہت بڑا عذاب جان تھا''۔ اسباب خواہ کچھ بھی ہوں اس نے ساری باتیں راستے میں ہی ترک کر دی تھیں۔ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا اور یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ مکے جا رہا ہے۔ اس نے اپنی ابتدائی دور کی نظمیں بھی تلف کر دی تھیں۔ وہ ایک سالانہ قافلے کو چھوڑ کر اپنے ایک بھائی اور خادم کے ساتھ علاحدہ سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ بجائے سیدھا بغداد جانے کے وہ جنوب کی سمت مکہ کو جانے والے عام راستے پر ہو لیا تھا۔ اس نے شہروں، قصبوں اور دیہات سے گزر کر سفر جاری رکھا (کتاب کے اس حصے میں خوراک، تعمیرات اور کلچر کو سکالرز سے ملاقات اور صلیبیوں کے عہد سے قبل کے فارس شام، اردن، فلسطین اور مصر کے مزارات پر حاضری کے حالات کو یکجا کر دیا گیا ہے) موجودہ صورت حال میں خسرو نے گمامی کو تحفظ پر ترجیح دی، خصوصاً ان سڑکوں پر جنہیں سنّی محافظوں نے محفوظ بنا دیا تھا۔

اگر فارس اور میسوپوٹیمیا کے زیادہ حصے میں اسمٰعیلیوں کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا تھا تو فاطمیوں کے مصر میں یہ تخت وتاج کے مالک تھے۔ مکے کے پہلے حج کے بعد خسرو مصر کی طرف بڑھا۔ قاہرہ پر اس زمانے میں عظیم فاطمی بادشاہ، سلطان مُستنصر (1036-94) کی حکومت تھی، جس کے آباؤ اجداد نے دریائے نیل کے کنارے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کی بہترین پالیسیوں کی وجہ سے قاہرہ تجارت کا بہت بڑا مرکز بن گیا اور یہ تجارتی علاقہ (تیونیشیا) تا گجرات (انڈیا) پھیل گیا تھا۔ پہلی مُسلم یونیورسٹی الازہر یہاں قائم کی گئی جس سے اس دارالخلافہ کو جو اس سے قبل فنون اور علم دوستی کے لیے مشہور تھا مزید شہرت حاصل ہوئی۔ خسرو نے جو خوشحالی کا دور دورہ یہاں دیکھا اسے قلمبند کیا تھا۔ وہ جن باغات، مساجد، مفت علاج معالجے کے لیے

شفاخانوں، محفوظ راستوں، قابل قدر سکالرز، سخاوت و فیاضی کے قوانین کا ذکر کرتا ہے، بھی ثقافتی طور پر اس سنہری عہد کی داستان بیان کرتے ہیں۔ اس دور حکومت کے بارے میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ جدید قارئین کے لیے زیادہ جاذب نظر ہو تو اسے مبالغہ آمیزی نہ سمجھا جائے۔ مستنصر کا عہد حکومت جو تقریباً 60 برس تک قائم رہا اسلامی کلچر کی ایک بہترین تصویر پیش کرتا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خسرو شاہی دربار میں مستقل طور پر تعینات ہو گیا تھا اور اس نے داؤد شیرازی کی شاگردی اختیار کر لی تھی جو ایک عظیم اسمٰعیلی عالم تھے۔ اس کی بطور داعی چیف مشنری کے تربیت کی گئی۔ یہاں قیام میں توسیع کے دوران اس نے تین بار مکے میں حاضری دی۔ اس میں سے اس کا آخری سفر اس کتاب کا مرکز بنتا ہے۔ جو اقتباسات اس سفرنامے میں سے لیے گئے ہیں وہ اس کے سیاحت نامے کی منازل کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی ابتداء شروع کے سیاحت ناموں سے ہوتی ہے جن میں وہ فارس اور ملکِ شام سے گزرا۔ ان میں قاہرہ میں فاطمی دور کے حیرت انگیز کاموں کا زیادہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں وہ اقتباسات بھی شامل ہیں جو اس عرصے سے متعلق ہیں جو خسرو نے مکے میں گزارا۔ اختتام اس کے وطن واپسی کے سفر کی مشکلات کے ذکر سے ہوتا ہے جب وہ اکیلا سعودی عرب میں سے گزر رہا تھا اور جنگ پسنگز کے پیدا کردہ خطرات سے اس کا سامنا تھا۔

مکہ کے بارے میں خسرو نے جو کچھ لکھا وہ صرف چند صفحات پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے یہ ابتدائی زمانے کے دیگر سیاحت ناموں سے ملتا جلتا ہے۔ ان کے اختصار کا سبب بڑا آسان سا ہے: یہ مسلمان قارئین کے لیے لکھے گئے تھے، ان قارئین کے لیے جو مکہ سے پوری طرح واقف تھے، گویا یہ روئے زمین پر ایک ایسا شہر تھا جس کے بارے میں کوئی بات ان کے لیے صیغۂ راز میں نہ تھی۔ مکے کی مساجد کے اندر ادا کی جانے والی مذہبی رسوم کا ذکر خسرو نے تفصیل سے کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ وہاں کا عمارتی مرکزی نقشہ وہی پیش کرتا ہے جو آج نظر آتا ہے: عمارت کے مرکز میں دومنزلہ کعبہ، جس کے گرد حجاج طواف کرتے ہیں؛ زم زم کا کنواں، جہاں سے یہ اپنی پیاس بجھاتے ہیں؛ صفا و مروہ کی پہاڑیاں جن کے درمیان یہ دوڑتے ہیں۔ حج کی رسومات میں سے پہلا مرحلہ یہاں یوں مکمل ہو جاتا ہے، مکہ کا مقدس جغرافیہ اور شہر سے عرفات کے میدان تک کا جلوس۔ یہ اور دیگر موضوعات (مکہ کی اقتصادیات، وہ حجاج جو اپنا قیام طویل کر لیتے ہیں اور شہر کا آبی نظام) یہاں مختصر کر کے بیان کیے گئے ہیں۔ بعد میں آنے والے سیاح انہیں تفصیل کے ساتھ بیان کریں

گے۔خسرو کی کتاب ان سب کو بڑے واضح انداز میں پیش کرتی ہے۔

اپنے چوتھے حج کے بعد خسرو واپس قاہرہ نہیں آیا۔ وہ اپنے وطن مشرقی سعودی عرب کے راستے روانہ ہو گیا تھا۔ اسے کسی قافلے کا تحفظ حاصل نہ تھا اور اس پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا۔ یہاں اس نے ہمیں سعودی عرب کے سفر کی صعوبتوں کی تفصیل بتائی ہے کہ عرب بدو کس طرح مسافروں کو پریشان کرتے ہیں۔ صدیوں تک سفر حج پر لکھی جانے والی کتب میں ان واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ خسرو کو اونٹوں پر سوار قزاقوں نے آلیا تھا اور لوگوں سے روپیہ پیسہ اور پھر کپڑے تک لے گئے تھے۔

سفر کے راستوں کے انتخاب میں ایک بڑی تسلی نویں مہینے میں لحسہ شہر میں رک جانا تھا۔ یہ شہر حسہ صحرا کے مشرق میں واقع ہے اور بحرین سے یہاں تک ایک دن کا سفر ہے۔ خسرو نے یہ مناسب سمجھا کہ شیعہ سلطنت کے اس دارالخلافے میں ٹھہر جائے۔ جہاں اس فرقے کے چھ بادشاہوں نے حکومت کی تھی۔ یہاں وہ معاشرہ موجود تھا جس کی حملہ آوروں سے حفاظت اس شہر کی فصیل کے ذریعے کی جاتی تھی۔ خسرو یہاں کی تصویر بڑے اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہے جہاں تہذیب و تمدن کے فنون ترقی کر رہے تھے وہاں کی آسائشوں کو چھوڑ کر شمال کی سمت سفر کرنے کو اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ وہ طویل سفر جو سیاح صحراؤں میں سے گزر کر طے کرتے تھے تھکا کر چُور کر دیتے تھے۔ آٹھ ماہ کے بعد خسرو بصرہ کی سمت روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ اس کے دو ساتھی بھی تھے۔ ان کی ہیئتِ کذائی دیکھ کر عوامی حماموں کے مالکوں نے انہیں ان میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔

نصر خسرو کے سیاحت نامے سے اقتباس

تعارف: میں پیشے کے لحاظ سے کلرک تھا اور سلطان کی ریونیو سروس کے انچارج کے عہدے پر تعینات تھا۔ میں نے دن رات اس قدر محنت اور لگن سے کام کیا کہ اپنی انتظامی حیثیت میں، اپنے رفقاء میں ایک خاص شہرت اور مقام حاصل کر لیا تھا۔

یہ ربیع الثانی 437ھ (اکتوبر 1045ء) کی بات ہے جب خُراسان کا شہزادہ ابوسلیمان چاغری بیگ داؤد بنِ میکائیل بن سلجوق تھا۔ میں سرکاری کام سے میرو سے میرورڈ میں ضلع پنج دہ کے لیے روانہ ہوا،

جہاں پہنچ کر میں رک گیا تھا۔

دہاں سے میں جزجنان گیا جہاں میں کم وبیش ایک ماہ مقیم رہا۔ اس دوران ایک رات میں نے شراب نوشی کی حد کردی تھی۔ (پیغمبر خدا، صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''سچ کہو خواہ اپنے آپ سے ہی کہنا ہو'') ایک رات میں نے عالم خواب میں دیکھا کہ کوئی مجھ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے: ''تم کب تک یہ شراب نوشی جاری رکھو گے جو انسان کے ذہن اور اس کی عقل کو تباہ کر دیتی ہے؟ اگر تم شراب سے اجتناب کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔''

میں نے جواب دیا: ''دانشمند اس دنیا کے غم و آلام کم کرنے کے لیے شراب کے علاوہ کوئی اور شے دنیا کو نہیں دے سکے''۔ جواب ملا: ''ہوش و خرد کے بغیر رہنا کوئی سکون یا اطمینان تو نہیں۔ وہ شخص عقلمند نہیں کہا سکتا جو دوسرے انسانوں سے ان کی عقل و دانش چھین لے۔ بلکہ کوئی ایسی شے تلاش کر لینی چاہیے جو دلیل اور دانائی میں اضافہ کرتی ہو''۔

میں نے پوچھا: ''ایسی شے مجھے کہاں سے مل سکتی ہے؟'' جواب ملا: ''ڈھونڈو تو تمہیں ضرور مل جائے گی، پھر اس محترم شخصیت نے خاموشی اختیار کر لی اور صرف قبلہ کی سمت اشارہ کیا اور غائب ہو گئے۔ میری جب آنکھ کھلی تو مجھے ہر وہ بات یاد تھی جس نے بلاشبہ مجھ پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا: ''تم کل رات کی نیند سے بیدار ہو گئے مگر تم چالیس برس کی طویل نیند سے کب بیدار ہو گے؟'' مجھے معاً یہ خیال آیا جب تک میں اپنے آپ کو تبدیل نہیں کر لیتا اس وقت تک مجھے خوشی و مسرت نہیں مل سکتی۔

یہ جمعرات 19۔ دسمبر 1045ء کی بات ہے، میں نے اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک دھویا، غسل کے بعد مسجد گیا اور خدا سے یہ دعا مانگی کہ اے خدا جو میں کرنا چاہتا ہوں اس کی اور جس سے میں بچنا چاہتا ہوں اس کی مجھے توفیق بخش دے، میری مدد فرما میرے پروردگار...... جو تُو نے ممنوع فرما دیا ہے اس سے مجھے دور رکھ۔

اس کے بعد میں شوبرگاں گیا اور فریاب کے ایک گاؤں میں رات بسر کی۔ وہاں سے میں براستہ ثمن گاں اور تلاکاں، میرورڈ گیا اور پھر میں میرو پہنچ گیا تھا۔ میں نے ملازمت سے چھٹی لی اور اعلان کیا کہ میں مکے کے حج کے لیے روانہ ہونے والا ہوں۔ میں نے جس کسی کا قرض دینا تھا، وہ ادا کیا اور دنیا کی ہر شے ترک کر کے صرف چند ضروری چیزیں ساتھ رکھ لی تھیں۔

میں 5 مارچ 1046ء کو ملک فارس سے گزر رہا تھا اور اب میں نیشاپور کے لیے روانہ ہو گیا تھا اور میرو سے سارخس تک سفر کر رہا تھا جو کم و بیش 100 میل دور تھا۔

ذیقعد کی 2 تاریخ کو میں نیشاپور سے چل پڑا تھا۔ سلطان کا ایک کارندہ خواجہ موفاق میرے ساتھ تھا۔ میں براستہ گون قُمز تک پہنچ گیا تھا۔ یہاں میں نے شیخ بایزید بسطامیؒ کے مزار پر حاضری دی۔

بروز جمعہ، آٹھ ذیقعد، 17 مئی کو میں دامغان گیا۔ یکم ذی الحجہ 437ھ (9 جون 1046ء) کو میں براستہ آبخواری اور چشتخوااراں، سمنان پہنچا تھا۔ یہاں میں کچھ وقت ٹھہرا اور کسی عالم کو تلاش کیا۔ مجھے ایک صاحب کا نام پتہ معلوم ہوا جنہیں لوگ ماسٹر علی نسائی کہہ کر پکارتے تھے۔ میں اس سے ملنے گیا۔ یہ ایک نوجوان آدمی تھا جو فارسی زبان دیکماتی لہجے میں بولتا تھا، سر سے ننگا تھا۔ لوگوں کا ایک گروپ اس کے پاس بیٹھا تھا جو اقلیدس پڑھ رہے تھے۔ ایک اور گروپ طب پڑھ رہا تھا اور مزید ایک اور علم ریاضی۔ ہماری گفتگو شروع ہوئی تو اس نے کہا: ''میں اسے ابن سینا کے ساتھ پڑھتا ہوں، اور میں نے اسے ابنِ سینا سے سنا ہے''۔ وہ غالباً مجھے یہ بات باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ ابنِ سینا کا شاگرد رہ چکا ہے۔ جب میں ان لوگوں میں سے چند ایک کے ساتھ بات چیت کر چکا تو اس نے کہا: '' مجھے علم حساب بالکل نہیں آتا اور میں علم حساب کے فن کے بارے میں کچھ پڑھنا چاہوں گا۔'' میں مایوس ہو کر واپس آ گیا کہ جو شخص خود کچھ نہیں جانتا بھلا وہ مجھے کیا پڑھائے گا......

ملک شام: 11۔ رجب (11۔ جنوری) ہم نے الیپو شہر چھوڑا تو ہم تین فرسنگ کے فاصلے پر واقع گاؤں جو ندقنسرین پہنچے تھے۔ دوسرے روز چھ فرسنگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم سارمن نامی قصبے میں تھے جس کے گرد کوئی فصیل نہ تھی۔

مزید چھ فرسنگ آگے معارت النعمان کا گنجان آباد شہر تھا۔ اس کے گرد پتھر کی فصیل تھی۔ شہر کے دروازے کے قریب مجھے پتھر کا بنا ہوا ایک بیلن نما ستون نظر آیا جس پر عربی کے علاوہ کسی اور رسم الخط میں کوئی عبارت بھی لکھی ہوئی تھی۔ میں نے کسی سے پوچھا یہ کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ بچھوؤں سے بچنے کے لیے تعویز تھا۔

اگر کبھی اس شہر کے اندر کوئی بچھو آئے اور اسے یہاں کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ بھاگ جائے گا اور شہر میں ٹھہر نہ سکے گا۔ یہ ستون تقریباً پندرہ فٹ اونچا تھا۔ میں نے بازاروں میں بڑی رونق اور چہل پہل دیکھی۔ شہر کی جامع مسجد کے شہر کے مرکز میں کچھ بلندی پر تعمیر کی گئی تھی تاکہ جس جگہ سے بھی کوئی مسجد کے اندر داخل ہونا

چاہے اسے 13 سیڑھیاں چڑھنی پڑیں۔ زرعی اجناس میں گندم، زیادہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ انجیر، زیتون، پستہ، بادام اور انگوروں کی کثرت تھی۔ شہر کا پانی بارش اور کنوؤں سے حاصل ہوتا تھا۔

شہر کا نام ایک شخص ابوالاعلیٰ آف معرئی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ گو وہ نابینا تھا مگر وہ شہر کا سربراہ تھا اور وہ بہت امیر تھا جس کے کئی غلام اور خادم تھے۔ دراصل شہر کا ہر شخص اس کے سامنے ایک غلام کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر اس نے اپنے لیے ریاضت و عبادت کی زندگی کا انتخاب کر لیا تھا۔ وہ کھدر کے کپڑے پہنتا اور گھر پر ہی رہتا تھا۔ ساڑھے تین پونڈ کی جو کی روٹی کے وہ نو ٹکڑے کر لیتا تھا اور دن رات میں صرف ایک ٹکڑا کھاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں کھاتا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس کے گھر کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا اور اس کے کارندے اور ڈپٹی شہر کا سارا کام کرتے تھے۔ وہ خود صرف مجموعی نگرانی کیا کرتا تھا۔ وہ خود تو مسلسل روزے سے ہوتا تھا مگر اس کی دولت سب کے لیے تھی۔ وہ شب بیداری کا عادی تھا اور رات کے وقت معاملات دنیا بالکل سرانجام نہ دیتا تھا۔ اس شخص نے شعر و شاعری اور ادب میں وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ شام، مغرب اور عراق کے علماء اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس جیسی قد آور شخصیت اس عہد میں اور کوئی نہیں ہے۔ اس نے ایک کتاب تالیف کی ہے جس میں وہ رمز و کنایے اور تمثیلی انداز میں گفتگو کرتا ہے۔ کتاب کی تحریر میں روانی بھی ہے اور حیرت کا عنصر بھی مگر اسے وہی چند افراد سمجھ پائے ہیں جو اس کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ اس پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ اس نے قرآن سے مقابلے کی کوشش کی ہے۔ اس کے اردگرد ہمیشہ دو سو سے زیادہ افراد ادب اور شاعری پڑھنے کے لیے جمع رہتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے ایک لاکھ سے زیادہ اشعار لکھے ہیں۔ ایک بار کسی نے اس سے سوال کیا کہ خدا نے اُسے مال و دولت سے نوازا ہے مگر وہ اسے دوسرے لوگوں میں بانٹ دیتا ہے اور خود بمشکل کچھ کھاتا ہے۔ اس نے جواب دیا: ''میں جو کھاتا ہوں اس کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی نہیں''۔ میں جب اس علاقے سے گزرا اس وقت یہ شخص ابھی زندہ تھا......

مصر تک کا سفر: یروشلم کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں سمندری راستے سے مصر جاؤں گا اور وہاں سے میری منزل مکہ ہوگا...... جلد ہی میں ایک بندرگاہ پر پہنچا جسے تینا کہتے تھے جہاں سے تانس کو راستہ جاتا ہے۔ میں ایک کشتی میں سوار ہو کر تانس پہنچا، یہ ایک جزیرے میں واقع ہے۔ یہ ایک خوبصورت شہر ہے جہاں چھت پر سے بھی ساحل نظر نہیں آتا۔ شہر گنجان آباد ہے اور اس کے بازاروں میں خوب رونق ہے۔ اس میں دو جامع مسجدیں ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس میں 10 ہزار دکانیں تھیں جن میں سے 100 ادویات کی

تھیں۔

کئی رنگوں کا لینن بک رہا تھا جس سے پگڑیاں اور پٹیاں اور خواتین کا لباس تیار ہوتے تھے۔ تانس میں تیار ہونے والے لنن کا مقابلہ کسی اور جگہ کا لنن نہ کر سکتا تھا اور سوائے اس سفید لنن کے جو ڈمیاط شہر میں بُنا جاتا تھا۔ وہ لنن جو شاہی ورکشاپ میں بنا جاتا ہے اسے عام لوگوں کے ہاتھ فروخت نہیں کیا جاتا۔ میں نے سنا تھا کہ ایک بار فارس کے بادشاہ نے بیس ہزار دینار تانس بھیجے تھے تا کہ کپڑے کا ایک سوٹ منگوا سکے۔ اس کے کارندے کئی برس وہاں ٹھہرے رہے مگر انہیں یہ کپڑا حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی۔ یہاں کے بافندے جس کے لیے زیادہ مشہور ہیں وہ اُن کا خاص خام مال ہے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ ایک بار کسی بافندے نے مصر کے سلطان کے لیے ایک پگڑی کا کپڑا بنا تھا جس کی قیمت 500 سونے کے دینار تھے۔ یہ پگڑی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اور مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ چار ہزار دینار کی تھی۔ تانس شہر میں وہ ایک خاص قسم کا کپڑا بنتے ہیں جسے بقلا مون کہتے ہیں اور یہ دنیا میں کہیں اور نہیں بنتا۔ اس کپڑے کی خاصیت یہ ہے کہ یہ دن کے مختلف حصوں میں مختلف رنگ منعکس کرتا ہے۔ یہ تانس سے مشرق و مغرب کو برآمد کیا جاتا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ بازنطینیہ کے سلطان نے ایک بار مصر کے بادشاہ کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ وہ تانس کے بدلے میں اپنی سلطنت کے 100 شہر دینے کو تیار تھا۔ مگر مصر کے بادشاہ نے اسے قبول نہ کیا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اس شہر کے لنن اور بقلا مون کی وجہ سے یہ سودا کیا جا رہا ہے۔

جب دریائے نیل کا پانی چڑھتا ہے تو یہ سمندر کے نمک کو تانس سے دور پھینک دیتا ہے اور یوں یہ پانی 10 فرسنگ کے فاصلے تک تازہ ہو جاتا ہے۔ سال کے اس حصے کے لیے اس جزیرے میں زیرِ زمین حوض تعمیر کر دیے گئے ہیں۔ جب دریائے نیل کا پانی نمکین سمندری پانی کو واپس دھکیلتا ہے تو سمندر کے اندر سے ایک راستے کے ذریعے پانی ان حوضوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ پھر سال بھر یہ پانی شہر کے استعمال میں آتا ہے جب کسی کے پاس پانی کی بہتات ہو جائے تو یہ اُسے دوسروں کو فروخت کر دیتا ہے۔ ایسے حوض بھی ہوتے ہیں جن میں سے پانی غیر ملکیوں کو دیا جاتا ہے۔

اس شہر کی آبادی پچاس ہزار نفوس پر مشتمل ہے، بندرگاہ پر ہر وقت کم از کم ایک ہزار بحری جہاز لنگر انداز رہتے ہیں جو یا تو تاجروں کی ملکیت ہوتے ہیں یا سلطان کی۔ چونکہ یہاں کوئی اور چیز نہیں ہوتی اس لیے ہر قابل استعمال شے باہر سے درآمد کی جاتی ہے۔ اس جزیرے کے ساتھ تمام بیرونی لین دین بذریعہ بحری

جہاز ہوتا ہے اور فرینکس اور بازنطینیوں کے حملوں سے بچاؤ کے لیے مُسلّح سپاہی یہاں تعینات رہتے ہیں۔ یہ بات میرے علم میں آئی کہ ہر روز ایک ہزار دینار سلطان کے خزانے میں جاتے ہیں۔ ہر روز لوگ ٹیکس کی شکل میں یہ رقم ٹیکس کلکٹر کو دیتے ہیں جو اسے خسارہ ظاہر کرنے سے قبل سرکاری خزانے میں جمع کرادیتا ہے۔ کسی سے بھی زبردستی کچھ وصول نہیں کیا جاتا۔ سلطان کے لیے جولنن اور بقلا مون بُنا جاتا ہے اس کی پوری قیمت ادا کی جاتی ہے تاکہ لوگ آزادی اور خوشی کے ساتھ کام کرتے رہیں۔ یہاں ایسے دوسرے ممالک کی طرح نہیں ہوتا کہ ہنرمندوں کو مجبور کر کے وزیروں اور بادشاہوں کے لیے شے تیار کروالی جائے اور اس کا معاوضہ اور اُجرت بھی ادا نہ کی جائے۔ یہاں کے ہنرمند امراء کے اونٹوں کی زینوں کے لیے غلاف اور کپڑا تیار کرتے ہیں اور اس کے عوض وہ مصر کے دیہات سے پھل اور خوردونوش کی چیزیں برآمد کرتے ہیں۔ یہ لوہے کے بہت اعلیٰ اوزار مثلاً قینچیاں اور چاقو وغیرہ بھی بناتے ہیں۔ میں نے ایک قینچی دیکھی جو وہاں سے مصر درآمد کی گئی تھی اور اس کی قیمت پانچ دینار تھی۔ یہ اس طرح بنائی گئی تھی کہ اس میں سے ایک پن نکال لی جائے تو اس کے دو ٹکڑے ہو جاتے تھے اور جب پن لگا دی جاتی تو یہ کام کرنا شروع کر دیتی تھی......

ہم مصر کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ جب ہم ساحل سمندر پر پہنچے تو ایک کشتی دریائے نیل میں اوپر کی سمت جانے والی تھی۔ جب دریائے نیل ساحل کے قریب پہنچتا ہے تو کئی شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور شاخ در شاخ سمندر میں جا گرتا ہے۔ جس شاخ میں ہم سفر کر رہے تھے اس کا نام رُمیش ہے۔ کشتی رواں دواں تھی یہاں تک کہ ہم ایک ایسے قصبے میں پہنچ گئے تھے جس کا نام صالحیہ ہے جو بہت زرخیز ہے اور بہت سے بحری جہاز جو دوسومن تک سامانِ خوردونوش تک کا وزن قاہرہ تک اٹھا کر لے جاسکتے تھے، یہاں تیار کیے جاتے ہیں۔ اگر یہ جہاز نہ ہوں تو شہر تک جانوروں پر لاد کر سامان اس خوش اسلوبی سے لانا ناممکن ہوتا ہے۔ ہم صالحیہ میں اتر کر اسی رات شہر کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ 3۔ اگست 1047ء کو ہفتے کے روز ہم قاہرہ پہنچ گئے تھے۔

نیل کے صوبے: قاہرہ کا شہر دریائے نیل اور سمندر کے درمیان واقع ہے اور جنوب سے شمال کی سمت بہتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔ قاہرہ سے سکندریہ تک تیس فرسنگ کا فاصلہ ہے۔ سکندریہ بحیرۂ روم کے ساحل پر دریائے نیل کے کناروں پر واقع ہے۔ یہاں سے پھل بکثرت قاہرہ بذریعہ کشتی لایا جاتا ہے۔ سکندریہ میں مجھے ایک روشنی کا مینار نظر آتا تھا جس کی چوٹی پر ایک آتشی آئینہ لگا ہوا تھا۔ جب کبھی بھی کوئی بحری جہاز استنبول سے آتے ہوئے اس آئینے کے بالمقابل پہنچتا تھا تو اس سے آگ گرتی تھی اور جہاز کو جلا دیتی

تھی۔ بازنطینیوں نے بڑی کوشش کر کے سارے حربے استعمال کیے تب جا کر انھوں نے کسی ایک شخص کو بھیجا جس نے اس آئینے کو توڑ دیا تھا۔ مصر کے سلطان الحاکم کے عہد میں ایک شخص ایسا آیا جس نے دعویٰ کیا کہ اس شیشے کو اپنی اصلی حالت میں دوبارہ وہاں لگا سکتا ہے مگر سلطان نے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کی اس لیے ضرورت نہیں کیونکہ حالات اس کے کنٹرول میں تھے۔ یونانی اسے سونا اور سامان بھیجتے تھے اور مطمئن تھے کہ مصر کی افواج ان سے دور رہتی تھیں......

جس کسی کو مصر سے مکہ جانا ہو مشرق کی سمت چلا جائے۔ قلزم سے دو راستے جاتے ہیں، ایک بری دوسرا بحری۔ خشکی کے راستے 15 روز کا سفر ہے مگر تمام صحرائی راستہ ہے اور تین سو فرسنگ کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ مصر سے زیادہ تر قافلے اسی راستے جاتے ہیں۔ سمندری راستے سے سمندر کے کنارے حجاز میں واقع جار پہنچنے میں بیس روز لگتے ہیں۔ جار سے مدینے تک تین روز لگتے ہیں۔ مدینے سے مکے کا فاصلہ ایک سو فرسنگ ہے۔ جار سے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے آپ یمن پہنچتے ہیں اور عدن کا ساحل آ جاتا ہے۔ اس سمت چلتے رہیں تو بالآخر آپ انڈیا اور چین میں مڑ جاتے ہیں۔ عدن سے جنوب کی سمت سفر کرتے ہوئے تھوڑا سا مغرب کو مڑ جائیں تو آپ ظنظبار اور اتھوپیا آ جاتے ہیں، جس کا ہم اس وقت ذکر کرنے والے ہیں۔ مصر سے نیوبیا میں سے گزر کر آپ مسموڈس کے صوبے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں وسیع چراگاہیں، بے شمار جانور او بھاری بھر کم مضبوط اور صحت مند جسموں کے مالک سیاہ جلد مرد ہوتے ہیں۔ مصر میں ایسے بہت سے سپاہی ملتے ہیں......

کچھ ذکر قاہرہ شہر کا: شام سے جنوب کو آتے ہوئے جو پہلا شہر راستے میں آتا ہے وہ نیا قاہرہ ہے، پرانا قاہرہ کا شہر مزید جنوب میں واقع ہے۔ قاہرہ کو القاہراۃ المعز یہ کہتے ہیں اور فوجی چھاؤنی کا نام فسطاط ہے...... میرے اندازے کے مطابق قاہرہ میں ایک ہزار دکانیں تھیں جو سب کی سب سلطان کی ملکیت ہیں۔ ان میں سے زیادہ دکانوں کا کرایہ دس دینار ماہانہ ہے اور کم از کم کرایہ دو دینار تک ہے۔ کارواں سرائے، حمام اور دوسری عوامی عمارات کا کوئی شمار نہیں ہے۔ ساری جائیداد سلطان کی ہے کیونکہ کسی اور کے پاس سوائے ان مکانوں کے یا جس جائیداد کو وہ خود تعمیر کرتا ہے کوئی دوسری جائیداد نہیں ہے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ نئے قاہرہ اور قدیم قاہرہ میں آٹھ ہزار عمارات ہیں جو سلطان کی ملکیت ہیں جس نے انہیں کرایے پر دے رکھا ہے اور ماہانہ کرایہ وصول کرتا ہے۔ انہیں کرائے اور پٹے پر دیا جاتا ہے اور کسی طرح کی سختی نہیں کی جاتی۔

سلطان کا اپنا محل شہر کے وسط میں ہے جس کے چاروں طرف کافی جگہ چھوڑ دی گئی ہے تاکہ سلطان کے محل کے قریب کوئی عمارت نہ بن سکے۔ رات کو یہاں ایک ہزار محافظ 500 گھوڑوں پر سوار اور 50 پیدل ڈیوٹی دیتے ہیں۔ نماز مغرب کے وقت یہ بگل اور ڈھول بجاتے ہیں اور پھر سورج نکلنے تک گھومتے رہتے ہیں۔ شہر کے باہر سے سلطان کے محل پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایک پہاڑ نما نظر آتا ہے کیونکہ بہت اونچائی پر ہے۔ البتہ شہر کے اندر سے باہر کچھ بھی نظر نہیں آتا کیونکہ دیواریں بہت اونچی ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اس محل کے اندر کل افراد کی تعداد 30 ہزار بتائی جاتی ہے جو 12 عمارات پر مشتمل محل میں رہتے ہیں۔ سطح زمین پر حرم کے دس گیٹ ہیں اور ان میں سے ہر گیٹ کا ایک نام ہے......

نہر کے کھلنے کا بیان: جب دریائے نیل کا پانی بڑھ جاتا ہے اور موسم سرما کی نسبت پانی کی سطح 27 فٹ بلند ہو جاتی ہے تو خشکی پر دریا کے سارے سرچشمے اور نہریں بند کر دی جاتی ہیں۔ پھر وہ نہر جس کا نام الخلیج ہے اور جو قدیم قاہرہ سے شروع ہو کر قاہرہ جدید میں سے گزرتی ہے جو سلطان کی ذاتی ملکیت ہے، سلطان مُستنصر کی موجودگی میں کھول دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ملک بھر میں دوسری نہریں اور آبی راستے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اس روز سال کی سب سے بڑی تقریب منائی جاتی ہے، اسے رکب فتح الخلیج (نہر کھولنے کے لیے سوار ہو کر آگے بڑھنا) کہتے ہیں۔ جب یہ موسم آتا ہے تو کمخواب کے لباس میں ملبوس، جس کو سونے اور ہیروں سے مزین کیا گیا ہوتا ہے بازنطینی نہر کے سرے پر شامیانے کے نیچے جمع ہوتے ہیں اور سلطان کا انتظار کرتے ہیں۔ اس شامیانے کے سامنے ایک دھاری دار خیمہ نصب کیا جاتا ہے۔ اس تقریب سے تین روز قبل ڈھول اور بگل شاہی اصطبلوں میں بجائے جاتے ہیں تاکہ گھوڑے ان آوازوں سے مانوس ہو جائیں۔ جب سلطان گھوڑے پر سوار ہوتا ہے تو دس ہزار گھوڑے جن کی زینیں اور لگام سونے کی ہوتی ہیں اور لگاموں میں ہیرے موتی ٹنکے ہوتے ہیں تیار رہتے ہیں۔ ان سب کے گھوڑوں کی زینوں پر بازنطیہ کے کمخواب اور بقلامون کا کپڑا چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ کپڑے کے بارڈر پر مصر کے سلطان کا نام کڑھا ہوا ہوتا ہے۔ ہر گھوڑوں پر ایک نیزہ یا زرہ بکتر اور ایک ہیلمٹ اور ہر قسم کے دوسرے ہتھیار زین کے باہر نکلے ہوئے حصے میں رکھے ہوتے ہیں۔ بہت سے اونٹ اور خچر بھی ہوتے ہیں جن کی پیٹھ پر ہودے ہوتے ہیں جن میں سونا اور موتی لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے غلافوں پر بھی موتے ٹنکے ہوئے ہوتے ہیں۔

میں اگر نہر کے کھلنے کی اس تقریب کی تفصیل بتانا چاہوں تو یہ بہت طویل ہو جائے گی...... مختصر یہ کہ

اس صبح جس روز سلطان اس تقریب کے لیے روانہ ہونے لگتا ہے، دس ہزار افراد کو ان گھوڑوں کو تھامنے پر مامور کیا جاتا ہے جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ سو سو کے جتھوں میں پریڈ کرتے ہیں۔ ان کے آگے آگے بگل، ڈھول اور نقارے ہوتے ہیں اور پیچھے پیچھے فوجی دستے، جو حرم کے دروازے سے لے کر نہر کے منبع تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک گھوڑے کو تھامنے والے کو تین درہم ادا کیے جاتے ہیں۔ اب گھوڑوں اور اونٹوں کی باری آتی ہے جن پر زین اور ہودے ڈالے ہوئے ہوتے ہیں، ان سب کے آخر میں کچھ فاصلے پر سلطان آتا ہے، ایک خوبصورت، صحت مند، کلین شیو نوجوان جسے حضرت حسینؓ ابن علیؓ کے شجرۂ نسب سے بتایا جاتا ہے وہ جس اونٹ پر سوار ہوتا ہے اس پر سادہ سی زین ہوتی ہے اور اس کی باگ میں کوئی سونا چاندی نہیں مڑھا ہوا ہوتا۔ وہ سفید چوغے میں ہوتا ہے جو عرب ملکوں میں پہنا جاتا ہے، اس کے ساتھ بڑا سا کمر بند بھی ہوتا ہے...... اس کی قیمت دس ہزار دینار بتائی جاتی ہے۔ اس کے سر پر اسی رنگ کی پگڑی ہوتی ہے اور ہاتھ میں ایک بڑی، قیمتی چابک ہوتی ہے۔ اس کے آگے آگے تین سو دیلماتی بازنطینی سونے کے دھاگوں سے بُنے ہوئے کپڑے، مع کمر بند اور کھلے بازوؤں والی قمیصیں پہنے ہوئے ہوتے ہیں جیسا کہ مصر میں فیشن ہے۔ ان سب کے ہاتھوں میں نیزے اور تیر ہوتے ہیں اور یہ چرمی پائجامہ پہنتے ہیں۔ سلطان کے ساتھ ایک چھتری بردار سوار چلتا ہے جس کی طلائی پگڑی میں موتی ٹنکے ہوتے ہیں اور وہ ایسا سوٹ زیب تن کیے ہوتا ہے جس کی قیمت دس ہزار دینار ہوتی ہے۔ یہ چھتری موتیوں ہیروں سے مزیّن ہوتی ہے۔ سلطان کے ساتھ کوئی دوسرا سوار نہیں ہوتا۔ اس کے دائیں بائیں اگر بردار ہوتے ہیں جو عنبر جلاتے جاتے ہیں۔ سلطان جب یہاں سے گزرتا ہے تو لوگ اس کے لیے دعا مانگتے ہیں۔ سلطان کے پیچھے پیچھے وزیرِ اعلیٰ، چیف جسٹس اور دیگر مذہبی علماء اور سرکاری افسروں کا گروہ پہنچتا ہے۔ سلطان نہر کے منبع پر پہنچتا ہے جہاں دربار کی جگہ وقتی طور پر ایک شامیانے کے نیچے پہلے سے مخصوص کر دی جاتی ہے۔ اسے ایک تیر تھما دیا جاتا ہے جسے وہ ڈیم پر پھینکتا ہے۔ لوگ کدال اور دوسرے اوزار لے کر ڈیم کو گرانے میں لگ جاتے ہیں، دوسری طرف سے پانی اپنا راستہ بناتا ہوا نہر میں داخل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس روز قدیم اور جدید قاہرہ کی پوری آبادی کے لوگ نہر کے کھلنے کا منظر دیکھنے آتے ہیں۔ ان کے لیے اور بھی بہت سے حیرت انگیز کھیلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس میں ان کے لیے اور بھی بہت سے حیرت انگیز کھیلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پہلا بحری جہاز جو اس نہر میں داخل ہوتا ہے اس میں قوت گویائی سے محروم افراد سوار ہوتے ہیں جسے ایک نیک شگون تصور کیا جاتا ہے اس روز سلطان ان میں خیرات تقسیم کرتا ہے۔

سلطان کے پاس 21 کشتیاں ہوتی ہیں جنھیں عموماً اصطبل میں بندھے ہوئے جانوروں کی طرح سلطان کے محل سے کچھ دور مصنوعی جھیل کے اندر باندھ کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ان میں سے ہر کشتی پچاس گز لمبی اور 20 گز چوڑی ہوتی ہے۔اسے سونے، چاندی، موتیوں اور کمخواب سے اس طرح مزین کیا جاتا ہے کہ اس کی تفصیل کے لیے مجھے بہت سے صفحات درکار ہوں گے۔

شہر مکہ کے بارے میں: شہرِ مکہ نشیب میں پہاڑوں کے درمیان گھرا یوں کھڑا ہے کہ آپ کسی بھی سمت سے شہر میں داخل ہوں جب تک آپ شہر میں پہنچ نہ جائیں شہر نظر نہیں آئے گا۔ مکے کے قریب سب سے اونچا پہاڑ ابوقبیس ہے، یہ گنبد نما ہے اور اگر آپ پہاڑ کے دامن سے تیر چلائیں تو یہ اس کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے۔ابوقبیس شہر کے مشرق میں ہے تاکہ آپ اگر بُرج جدی کے مہینے میں مسجد الحرام میں ہوں تو سورج پہاڑ کی اوٹ سے طلوع ہوتا دیکھ سکیں گے۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک پتھر کی سِل ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے ابراہیمؑ نے کھڑا کیا تھا۔یہ شہر پہاڑوں کے درمیان ایک میدان میں آباد ہے۔ مسجد الحرام میدان کے وسط میں ہے اور شہر کے بازار گلیاں اس کے چاروں طرف تعمیر کیے گئے ہیں۔ پہاڑ میں جہاں کہیں کوئی راستہ کھلا ہوا ہے وہاں دفاعی مورچہ بنا کر اس میں دروازہ لگا دیا گیا ہے۔شہر میں درخت صرف مسجد الحرام کو جانے والے مغربی دروازے پر ہیں، جسے بابِ ابراہیم کہتے ہیں۔ یہاں ایک کنویں کے گرد بہت سے درخت ہیں۔ مسجد الحرام کے مشرق میں ایک بڑا بازار جنوب تا شمال پھیلا ہوا ہے۔ مغربی حصے کے آخر میں ابوقبیس ہے۔اس پہاڑ کے دامن میں صفا کی پہاڑی ہے جس کی شکل ایک زینے کی سی ہے۔ چٹانوں میں سے راستہ اس طرح بنا دیا گیا ہے کہ لوگ آسانی کے ساتھ اوپر عبادت کے لیے جاسکتے ہیں۔اسے صفا و مروہ کی سعی کہتے ہیں۔بازار کے آخر میں شمال کی جانب مروہ کی پہاڑی ہے، جو کم اونچی ہے اور اس پر بہت سی منزلیں تعمیر کی گئی ہیں کیونکہ شہر کے وسط میں واقع ہے۔صفا و مروہ کے درمیان دوڑتے وقت لوگ اس بازار کے اندر دوڑتے ہیں۔ وہ لوگ جو دور دراز سے عمرہ ادا کرنے آتے ہیں، ان کے لیے مکے سے نصف فرسنگ کے فاصلے پر مساجد اور سنگِ میل موجود ہیں، جہاں پہنچ کر وہ احرام باندھ لیتے ہیں۔احرام باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے سلے ہوئے کپڑے اتار کر دو اَن سلی چادریں، ایک کمر کے گرد اور دوسری جسم کے اوپر والے حصے کے گرد لپیٹ لی جائیں۔پھر بہ آواز بلند کہا جائے: ''لبیک اللھم لبیک'' اور یوں مکے پہنچا جائے۔اگر کوئی ایسا شخص جو مکے کے اندر موجود ہے اور عمرہ ادا کرنا چاہتا ہے تو وہ شہر سے باہر کسی مارکیٹ میں پہنچ کر وہاں احرام باندھ لیتا ہے اور

''لبیک'' کہتا ہوا عمرہ ادا کرنے کی نیت سے مکے میں داخل ہو جاتا ہے۔شہر میں داخل ہونے کے بعد مسجد الحرام میں پہنچ کر کعبہ کے نزدیک جانا ہوتا ہے۔ پھر طواف اس طرح کیا جاتا ہے کہ کعبہ بائیں کندھے کی طرف رہے۔ پھر حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے اس کے قریب جاتے ہیں۔حجر اسود کو بوسہ دینے کے بعد ایک چکر اور لگایا جاتا ہے اور دوسری بار بوسہ دینے پر یوں ایک طواف مکمل ہو جاتا ہے۔سات بار طواف کرنا ضروری ہے، تین بار تیز تیز چل کر اور چار بار آہستہ آہستہ سات بار طواف کرنے کے بعد کعبہ کے بالمقابل مقام ابراہیم پر جائیں اور اس کے پیچھے کھڑے ہو جائیں یہاں دو رکعت نماز طواف مکمل کریں۔ پھر زم زم کے کنویں پر جائیں ،یہاں سے پانی پیئیے یا چہرے پر مَل لیں۔اب صفا گیٹ سے مسجد الحرام سے باہر آ جائیں۔اس گیٹ سے باہر اب آپ کا چہرہ کعبہ کی سمت ہوگا اور آپ مقررہ دعا پڑھ رہے ہوں گے۔دُعا پڑھ چکنے کے بعد آپ صفا سے نیچے آ جاتے ہیں اور جنوب سے شمال کی جانب بازار میں سے گزر کر مروہ پہنچ جاتے ہیں۔ بازار میں سے گزر کر آپ دروازوں میں سے گزرتے ہوئے مسجد الحرام میں پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی دوڑے تھے اور دوسروں کو بھی دوڑنے کا حکم دیا تھا۔لمبائی پچاس قدم ہے اور ہر دو جانب دو مینار ہیں۔ جب صفا سے آنے والے لوگ پہلے دو میناروں کے پاس پہنچتے ہیں تو یہ دوڑنے لگتے ہیں یہاں تک کہ وہ بازار کے دوسرے سرے پر دیگر دو میناروں کے پاس سے گزر جاتے ہیں۔اب وہ آہستہ آہستہ مروہ کی جانب چل پڑتے ہیں۔کنارے پر پہنچ کر وہ مروہ پر جا کر مقررہ دُعا پڑھتے ہیں۔اب وہ بازار میں سے واپس آتے ہیں اور دوبارہ دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ صفا سے مروہ تک چار بار اور مروہ سے صفا تک تین مرتبہ جا چکے ہوں۔بازار کی لمبائی میں وہ سات بار دوڑ چکے ہوں گے۔آخری بار مروہ سے نیچے آتے ہوئے آپ کو ایک بازار ملے گا جس میں حجاموں کی بیس دکانیں، ایک دوسرے کے بالمقابل ملیں گی۔ یہاں آپ سر منڈوائیں گے اور اس طرح آپ کے عُمرے کی ادائیگی تکمیل کو پہنچے گی۔اب آپ مسجد الحرام سے باہر آ جائیں گے۔ مشرقی سمت والے بازار کا نام سوق العطارین ہے۔اس میں بڑی بڑی عالیشان عمارتیں ہیں اور تمام دکانیں دواؤں کی ہیں۔مکہ میں دو عوامی حمام ہیں۔ ہر ایک میں سبز پتھر لگا ہوا ہے جس میں سے چقماق بنایا جاتا ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ مکے کے شہریوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہ تھی جبکہ 500 غیر ملکی اور مجاور تھے ان دنوں قحط کے پھیلنے کی وجہ سے 16 من گندم کی قیمت ایک دینار تھی جس کی وجہ سے بہت سے لوگ

یہاں سے بھاگ گئے تھے۔

مکہ شہر کے اندر ہر خطے کے لوگوں کے لیے مسافر خانے ہیں، مثلاً خُراسان، عراق وغیرہ۔ تاہم ان میں سے زیادہ تر ملبے کا ڈھیر بن گئے ہیں۔ بغداد کے خلفاء نے بڑی خوبصورت عمارتیں تعمیر کرائیں تھیں مگر جب ہم یہاں پہنچے اس وقت ان میں سے بہت سی گر چکی تھیں اور جو بچ گئی تھیں وہ حکومت نے ضبط کر لی تھیں۔
مکے میں پانی نمکین ہے اور پینے کے قابل نہیں۔ تاہم بہت سے تالاب اور پانی کے ذخیرے ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک پر 10 ہزار دینار خرچ ہوتے ہیں۔ عدن کا ایک شہزادہ جسے پسر شیدل کہتے تھے، ذاتی خرچ سے زیرِ زمین پانی کو مکے تک لے آیا تھا۔ یہ پانی کو عرفات کی زراعت پر استعمال کرتا تھا اور وہیں تک محدود تھا۔ پانی کے پائپ تھے جن کی مدد سے کچھ پانی مکے تک پہنچ گیا تھا مگر یہ شہر کے اندر تک نہیں پہنچا تھا۔ اس لیے پانی کے حصول کے لیے ایک تالاب تعمیر کیا گیا تھا۔ سقے اسے بیچنے کی خاطر شہر میں لے آتے تھے۔ شہر سے باہر بورقہ روڈ پر نصف فرسنگ کے فاصلے پر ایک کنواں ہے جسے ایک عابد کا کنواں کہتے ہیں۔ یہاں ایک خوبصورت مسجد بھی موجود ہے اور پانی بھی اچھا ہے۔ سقے اس جگہ سے بیچنے کے لیے پانی لے آتے ہیں۔

مکے کی آب و ہوا بے حد گرم ہے۔ میں نے برج دَلو کے مہینے کے اختتام پر تازہ کھیرے اور بینگن دیکھے تھے۔ مکہ میں یہ میرا چوتھا چکر تھا۔ اس بار میں پانچویں مرتبہ مکہ میں آیا تھا۔ 19۔ نومبر 1050ء تا 5۔ مئی 1051ء میں مکے میں مجاور تھا۔ بُرجِ حمل کی 15 تاریخ کو انگور پک جاتے تھے اور دیہات سے شہر میں لا کر اسے بازار میں بیچتے ہیں۔ برج ثور کی پہلی تاریخ کو تربوز کی کثرت ہوتی تھی۔ موسم سرما میں ہر قسم کے پھل دستیاب ہوتے ہیں اور بازاروں میں ان کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔

حج: یہ نویں ذی الحجہ، 442ھ (24۔ اپریل 1051ء) کی بات ہے کہ میں خدا کے فضل سے چوتھی بار حج ادا کر چکا ہوں۔ غروب آفتاب کے بعد حجاج اور مبلغ عرفات سے روانہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہر شخص مشعر الحرام جسے مزدلفہ کہتے ہیں تک ایک فرسنگ کا سفر طے کرتا ہے۔ یہاں ایک خوبصورت جگہ لوگوں کی عبادت کے لیے بنادی گئی ہے۔ منیٰ میں جو کنکریاں ماری جاتی ہیں وہ یہاں سے جمع کی جاتی ہیں۔ یہاں ایک دن ٹھہر کر اگلے روز علی الصبح منیٰ کے لیے نماز فجر کے بعد روانہ ہونے کی روایت ہے تاکہ وہاں پہنچ کر قربانی دی جاسکے۔ یہاں ایک بڑی مسجد ہے مگر یہاں ٹھہرنے یا وعظ کی روایت نہیں ہے کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مثال نہیں چھوڑی تھی۔

دسویں روز منیٰ میں ٹھہرا جاتا ہے، کنکریاں ماری جاتی ہیں جسے حج کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔

بارھویں تاریخ کو جو شخص بھی جانا چاہے منیٰ سے براہِ راست جا سکتا ہے اور جو مزید کچھ وقت مکہ میں گزارنا چاہتے ہوں مکہ چلے جاتے ہیں۔ میں نے لحسہ تک کے 13 روزہ سفر کے لیے ایک عرب سے اونٹ کرایے پر لے لیا تھا چنانچہ میں نے خدا کے گھر کو الوداع کہا۔

مکہ سے طائف تک: جمعہ 4۔ مئی 1051ء کو، جو قدیم برجِ جوزا کا پہلا دن ہے، میں نے مکے سے سات فرسنگ کی مسافت طے کر لی تھی۔ مجھے راستے میں ایک میدان ملا جس سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑ نظر آ رہا تھا۔ اس پہاڑ کی سمت جاتے وقت ہمیں راستے میں کھیت اور دیہات ملے۔ ایک کنواں بھی تھا جسے برالحسین ابنِ سلامہ (حسین بن سلامہ کا کنواں) کہتے تھے۔ سخت سردی تھی اور ہم مشرق کی سمت سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ ہم پیر کے روز طائف پہنچے جو مکے سے 12 فرسنگ کے فاصلے پر ہے......

جاز: ہم اس مقام سے آگے بڑھے تو ہمیں ایک چھوٹا سا قلعہ نظر آیا جس کا نام جاز تھا۔ نصف فرسنگ کے اندر اندر ہمیں چار چھوٹے قلعے ملے۔ ان میں سے جو سب سے بڑا تھا اس کا نام قلعہ بنو نصیر تھا، ہم اس میں ٹھہر گئے تھے۔ اس میں چند کھجور کے درخت بھی تھے۔

جس شخص سے میں نے اونٹ کرایے پر لیا تھا وہ جاز کا تھا۔ میں یہاں پندرہ روز ٹھہرا۔ اس سے آگے لے جانے کے لیے کوئی بدرقہ نہیں تھا۔ اس علاقے کے عرب قبیلوں کا ایک خاص علاقہ ہوتا ہے جس میں وہ اپنے ریوڑ چراتے ہیں۔ ان علاقوں میں کوئی اجنبی داخل نہیں ہو سکتا اور جس کسی کے ساتھ اس کا بدرقہ ہو اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے ہر قبیلے کا ایک بدرقہ ہوتا ہے جو ایک خاص علاقے سے گزر سکتا ہے۔

اتفاق سے عربوں کا وہ لیڈر جس کے ہمراہ ہم نے سفر کیا تھا، بنو سواد جاز آیا ہوا تھا۔ ہم نے اسے اپنے بدرقہ کے طور لے لیا تھا۔ اس کا نام ابوغنیم عبص ابن البائر تھا۔ ہم اس کی حفاظت میں یہاں سے روانہ ہوئے۔ عربوں کے ایک گروہ نے یہ سمجھتے ہوئے کہ انہیں ''شکار'' مل گیا ہے (وہ اجنبیوں کو شکار کہتے تھے) ہمارے قریب آ گیا تھا۔ مگر چونکہ ان کا لیڈر ہمارے ساتھ تھا وہ کچھ کہے بغیر گزر گئے۔ اگر ہم تنہا ہوتے تو یہ لوگ ہمیں ضرور مار ڈالتے۔

اب اس سے آگے جانے کے لیے کیونکہ کسی اور بدرقہ کی ضرورت تھی اس لیے ہم یہاں ٹھہر گئے

تھے۔ بالآخر ہمیں بدرتے مل گئے تھے ہم نے ان میں سے ہر ایک کو دس دس دینار دیئے کہ وہ ہمیں اگلے قبیلے تک لے جائیں۔

ایک قبیلہ کے ستر سالہ چند افراد نے مجھے بتایا کہ انہوں نے پوری زندگی میں سوائے اونٹنی کے دُودھ کے کچھ نہیں پیا تھا۔ صحرا میں اونٹوں کو کھانے کے لیے تلخ جھاڑیاں ملتی ہیں، وہ سمجھتے تھے کہ پوری دنیا ایسی ہی تھی۔

میں ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے کی تحویل میں دے دیا جاتا تھا اور یوں مجھے پورے سفر میں خطرہ لاحق رہا مگر خدا کو یہ منظور تھا کہ ہم صحیح سلامت وہاں سے واپس آ جائیں۔

راستے میں ایک مقام ایسا بھی آیا جہاں گنبد نما پہاڑ تھا، اسے سربا کہتے تھے۔ میں نے ایسے پہاڑ اور کہیں نہیں دیکھے تھے۔ یہ اتنے اونچے نہیں تھے اور ان کی چوٹی تک تیر پھینکا جا سکتا تھا۔ ان پر کوئی سبزہ درخت نہیں تھے بلکہ یوں کہیے کہ یہ انڈے کی طرح ملائم تھے، ان میں کہیں کوئی دراڑ یا خلا نظر نہیں آتا تھا۔

میرے ساتھیوں کو راستے میں جہاں کہیں گرگٹ ملتا یہ اسے پکڑ کر کھا جاتے تھے۔ عرب جہاں کہیں بھی آباد ہیں وہ اونٹنیوں کا دودھ دوہتے اور اسے شوق سے پیتے ہیں۔ میں نہ تو گرگٹ کھا سکتا تھا نہ اونٹنی کا دودھ پی سکتا تھا۔ مجھے جہاں کہیں ایسی جھاڑیاں نظر آتیں جن پر بیروں کی شکل کا پھل نظر آتا، میں توڑ لیتا اور ان پر گزارہ کرتا تھا۔

فلاج: راستے کی صعوبتیں برداشت کرتے، مشکلات سے لڑتے ہم 6۔ جولائی کو فلاج پہنچے جو مکہ سے 180 فرسنگ دور تھا۔ یہ صحرا کے وسط میں واقع ہے، یہ کسی زمانے میں بہت اہم علاقہ تھا مگر داخلی جھگڑوں نے اسے تباہ کر دیا تھا۔ جب ہم یہاں پہنچے اس وقت یہاں صرف نصف فرسنگ لمبا اور ایک میل چوڑا علاقہ ایسا تھا جہاں آبادی تھی۔ اس علاقے میں چودہ چھوٹے قلعے تھے جن میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ رہتا تھا۔ یہ چودہ قلعے دو مخالف گروپس کی تحویل میں تھے جن کے درمیان دشمنی برسوں چلتی تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یہ الرّقیم کے سردار تھے جن کا ذکر قرآن پاک کی سورۃ الکھف (18:9) میں آیا ہے۔ ان کی چار نہریں تھیں جو ان کے کھجوروں کے باغ کو سیراب کرتی تھیں۔ ان کے کھیت بلندی پر تھے جنہیں کنوؤں سے سیراب کیا جاتا تھا۔ یہ کھیتوں میں ہل چلانے کے لیے اونٹ نہیں گائیں استعمال کرتے ہیں۔ مگر مجھے وہاں کوئی گائے نظر نہیں آئی تھی۔ زراعت میں انہیں بہت کم فصل ملتی ہے، ان میں سے ہر شخص ہر روز دو سیر غلہ استعمال کرتا ہے۔ اسے وہ روٹی کی شکل میں

کر ایک شام نماز کے بعد سے لے کر اگلی صبح تک کھاتے ہیں۔ البتہ رمضان المبارک کے مہینے میں یہ کھجوریں ہی کھاتے ہیں۔ مجھے یہاں بصرہ اور دیگر مقامات سے زیادہ اچھی کھجوریں ملیں۔ یہاں کے لوگ بہت غریب ہیں مگر یہ اپنا دن ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے میں گزارتے ہیں۔ ان کی ایک کھجور کا نام میدون ہے جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ یہ بیس برس تک رکھی رہے تب بھی خراب نہیں ہوتی۔ ان کا سکہ رائج الوقت نیشاپوری اشرفی ہے۔

میں نہایت غیر مساعد حالات میں چار ماہ فلاج میں مقیم رہا۔ میرے پاس سوائے کتابوں کے دو بستوں کے کچھ بھی نہ بچا تھا۔ وہاں کے لوگ بھوکے، ننگے اور بے علم تھے۔ ان میں سے کوئی بھی عبادت کے لیے آتا تو اس کے پاس وہاں کے رواج کے مطابق ایک تلوار اور ایک ڈھال ہوتی تھی۔ ان کے پاس مجھ سے کتابیں خریدنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

ہم ایک مسجد کے اندر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میرے پاس سرخ نیلا رنگ تھا۔ میں نے اس سے دیوار پر ایک مصرع لکھا اور تحریر کے درمیان ایک ٹہنی پتوں سمیت بنا دی۔ انہوں نے اسے دیکھا تو بے حد حیران ہوئے۔ ان میں سے ہر کوئی جو صحن مسجد میں موجود تھا میرے اردگرد آ کر کھڑا ہو گیا اور دیکھنے لگا کہ میں نے کیا کیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر میں مسجد کے محراب کو رنگ کر دوں تو وہ مجھے اس کے عوض ایک سو من کھجور دیں گے۔ ایک سو من کھجور کو وہ اپنا کل سرمایہ سمجھتے تھے۔ میری وہاں موجودگی کے دوران ایک موقعہ پر عرب سپاہیوں کا ایک جتھہ وہاں آیا اور ان سے پانچ سو من کھجوریں مانگیں۔ ان لوگوں نے انکار کر دیا اور لڑائی چھڑ گئی جس میں صحن مسجد میں دس افراد قتل ہو گئے تھے۔ کھجور کے ایک ہزار درخت کاٹ ڈالے گئے تھے مگر انہوں نے دس من کھجوریں دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے ان کی پیشکش قبول کرتے ہوئے محراب کو رنگ دیا تھا اور وہ ایک سو من کھجوریں ہماری دُعاؤں کا جواب تھا کیونکہ ہم خوراک حاصل نہ کر سکے تھے۔

ہم ناامید ہو گئے تھے کہ اب ہم اس صحرا میں سے کبھی باہر نہ نکل سکیں گے۔ ہم جس طرف سے بھی نکلتے قریب ترین کی تہذیب دو سو فرسنگ کے فاصلے پر تھی اور راستے میں خوفناک، تباہ کن صحرا حائل تھا۔ اُن چار مہینوں کے دوران میں نے کسی ایک جگہ پانچ من گندم نہیں دیکھی تھی۔ بالآخر یمامہ سے ایک قافلہ بکریوں کا چمڑا الاحسہ لے جانے کے لیے یہاں پہنچا تھا۔ بکری کا چمڑا یمن سے براستہ فلاج لا کر تاجروں کے ہاتھ فروخت کیا جاتا تھا۔ ایک عرب نے مجھے پیشکش کی کہ وہ مجھے بصرہ تک ساتھ لے جا سکتا ہے مگر میرے پاس کرایے کے

لیے پیسے نہیں تھے۔ وہاں سے بصرے تک کی مسافت 200 فرسنگ تھی۔ اونٹ کا کرایہ ایک دینار تھا جبکہ اونٹ دو تین دینار میں خریدا جا سکتا تھا۔ میرے پاس نقد ادا کرنے کو کچھ نہ تھا لیکن وہ مجھے اس شرط پر بصرہ لے جانے پر رضامند ہو گئے تھے کہ میں وہاں پہنچ کر 30 دینار انہیں دے دوں۔ مجھے بحالت مجبوری ان کی شرط منظور کرنی پڑی حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ بصرہ پہنچنے کے بعد اتنی رقم میرے پاس کہاں سے آ جانی تھی۔

ان عرب تاجروں نے میری کتابیں اکٹھی کیں، انہیں بنڈلوں میں باندھا اور میرے بھائی کو ایک اونٹ پر بٹھا دیا۔ میں ساتھ پیدل چل رہا تھا۔ زمین ہموار تھی، کہیں پہاڑ یا پہاڑیاں نظر نہیں آ رہی تھیں البتہ کہیں کہیں زمین بہت سخت تھی جہاں بارش کے پانی کے تالاب بن گئے تھے۔ یہ لوگ دن رات سفر کرتے ہیں، سڑک کا کہیں نشان تک بھی نظر نہیں آتا مگر ان کا سفر فطری مہارت کی مدد سے جاری رہتا ہے۔ میں حیران تھا کہ بغیر کوئی اشارہ دیئے یا خبردار کیے وہ اچانک کسی کنویں پر آ کر رک جاتے تھے۔

میں اپنی طویل کہانی کو یوں مختصر کرنا چاہوں گا کہ چار دن اور چار راتوں میں ہم یمامہ پہنچ گئے تھے جس کے اندر ایک قدیم بڑا سا قلعہ تھا۔ ایک بازار تھا جس کے اندر تمام قسم کے ہنرمند اور ایک خوبصورت مسجد تھی۔ یہاں کے جو امیر تھے وہ اپنے آپ کو حضرت علیؓ کے شجرۂ نسب سے ملاتے تھے اور کوئی بھی حکمران کبھی ان سے یہ علاقہ چھین نہیں سکا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہاں کوئی بادشاہ یا سلطان کبھی اس علاقے کو فتح کرنے نہیں آیا اور دوسرا سبب اس کا یہ تھا کہ یہ لوگ اس قدر طاقتور تھے کہ یہ تین سے چار سو گھوڑ سواروں پر چڑھائی کر سکتے تھے۔

ان کا تعلق زیدی فرقے سے ہے۔ یہ جب نماز ادا کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور علیؓ بنی نوع انسان میں بہترین ہیں'' اور ''بہترین کام کی طرف آؤ''۔ اس شہر کے باسی حکمران ''شریف'' خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ضلع کے اندر ان کے پاس بہتا پانی، زراعت کے لیے نہریں اور کھجوروں کے باغات ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ کھجوروں کی جب بہتات ہوتی ہے تو ایک ہزار من کھجور صرف ایک دینار کی ہوتی ہے۔

یمامہ سے لاحسہ کا فاصلہ چالیس فرسنگ ہے۔ موسم سرما کے دوران تو سفر کرنا ممکن ہے کیونکہ پینے کے قابل بارش کا پانی تالابوں میں جمع ہو جاتا ہے مگر موسم گرما میں سفر کرنا ممکن نہیں رہتا۔

لاحسہ کا محل وقوع: آپ کسی بھی سمت سے لاحسہ پہنچ سکتے ہیں جس کے لیے آپ کو وسیع صحرا

کوعبور کرنا پڑتا ہے۔لاحسہ کے بالکل قریب اسلامی شہر بصرہ ہے۔ یہ 150 فرسنگ کے فاصلے پر ہے۔ بصرہ میں کبھی کوئی ایسا حکمران نہیں رہا جس نے لاحسہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہو۔

شہر کے اردگرد مٹی کی اینٹوں کی مضبوط فصیل ہے۔ چاروں طرف کی دیواروں کے درمیان فاصلہ تقریباً ایک فرسنگ ہے اور شہر میں کنویں بہت ہیں۔ان میں سے ہر ایک گولائی میں چکی کے پانچ پاٹوں کے برابر ہے۔ضلع کا سارا پانی استعمال کرلیا جاتا ہے تاکہ اس میں سے تھوڑا سا پانی بھی دیواروں کے باہر نہ جا سکے۔ان دیواروں کے اندر ایک بے حد خوبصورت شہر واقع ہے جس میں کسی بڑے شہر کی ساری چیزیں موجود ہیں اور سپاہیوں کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ ہے۔

لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہاں ''شریف'' خاندان کا ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا جو لوگوں کو اسلام پر عمل کرنے سے روکتا تھا اور انہیں نماز روزے سے بھی اس لیے یہ کہہ کر آزاد کر رکھا تھا کہ اس معاملے میں وہ ہر حکم دینے کا مجاز تھا۔اس کا نام ابوسعید تھا۔اگر آپ اس شہر کے لوگوں سے سوال کریں کہ ان کا تعلق کس فرقے سے ہے تو وہ آپ کو جواب دیں گے کہ وہ ''بوسعیدی'' ہیں۔ یہ نہ نماز ادا کرتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں مگر یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے مشن میں یقین رکھتے ہیں۔ابوسعید نے ان سے کہہ رکھا ہے کہ وہ اپنی موت کے بعد ایک بار پھر ان لوگوں کے درمیان آئے گا۔اس کا مزار شہر کے اندر تعمیر کیا گیا ہے اس نے ہدایت کی تھی کہ اس کے بعد اس کے چھ روحانی بیٹے اس کی حکومت اس وقت تک عدل وانصاف اور مساوات کے اصولوں پر بغیر کسی آپس کے جھگڑے کے چلائیں گے جب تک کہ وہ دوبارہ ان میں نہیں آ جاتا۔اب ان کے پاس ایک محل ہے جہاں تختِ سلطنت رکھا ہوا ہے اور چھ بادشاہ ایک جگہ اکٹھے ہیں، امورِ سلطنت بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیے جا رہے ہیں۔ چھ وزراء ان کے مقابل بیٹھتے ہیں۔جب چھ بادشاہ تخت پر بیٹھ جاتے ہیں تو ان کے سامنے چھ وزراء علاحدہ نشست پر بھی بیٹھ جاتے ہیں۔تمام معاملات باہمی مشاورت سے سرانجام دیے جاتے ہیں جن دنوں میں وہاں تھا ان دنوں ان کے 30 ہزار زنزباری اور اپنی سینیائی غلام تھے جو کھیتوں اور باغوں میں کام کرتے تھے۔

یہ کسانوں سے کوئی ٹیکس وصول نہیں کرتے۔ جب کبھی کوئی کسان غربت کا شکار ہو جاتا ہے یا مقروض ہو جاتا ہے تو یہ چھ بادشاہ اس کی ضروریاتِ زندگی پوری کرتے اور اسے قرضے سے نجات دلاتے ہیں۔ جب کبھی کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا مقروض ہو جاتا ہے تو اصل زر سے زیادہ رقم کا مطالبہ نہیں کیا

جا سکتا۔ جب کبھی کوئی ہنر منداس شہر میں اجنبی کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے تو اسے اوزار خریدنے کے لیے کافی روپیہ دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی روزی کما سکے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ تاہم اسے یہ رقم واپس بھی کرنی ہوتی ہے۔ اگر کسی کی جائیداد کو کوئی نقصان پہنچتا ہے اور جائیداد کا مالک مرمت نہیں کرا سکتا تو بادشاہ اپنے غلاموں کو حکم دیتے ہیں کہ بلا معاوضہ یہ مرمت کر دی جائے۔ ان حکمرانوں کی لاہسہ میں بہت سی آٹا پیسنے کی چکیاں ہیں جہاں سے شہری گندم مفت پسوا سکتے ہیں۔ جن عمارات میں یہ چکیاں نسب ہوتی ہیں ان کی مرمت اور دیکھ بھال پر حکمران خرچ کرتے ہیں۔ ان حکمرانوں کو ''لارڈ'' اور وزیروں کو ''مُشیر'' کہتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ لاہسہ میں جامع مسجد کوئی نہ تھی جہاں خطبے کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھائی جا سکے۔ پھر ملک فارس کے ایک متمول باشندے علی بن احمد نے، جو مسلمان اور حاجی تھا، ایک مسجد تعمیر کرا دی تھی تاکہ شہر میں پہنچنے والے حاجیوں کو سہولت ہو جائے۔

یہ بادشاہ خود تو نماز ادا نہیں کرتے مگر دوسروں کو نماز پڑھنے سے منع نہیں کرتے۔ جب کبھی کوئی شخص بادشاہ سے بات کرتا ہے تو وہ اسے بڑی نرمی اور عجز وانکساری سے جواب دیتا ہے اور شراب نوشی نہیں کی جاتی۔

ابوسعید کے مزار کے قریب ایک گھوڑا ہر وقت تیار کھڑا رہتا ہے جس کے گلے میں پٹہ اور سر پر تاج سجا ہوتا ہے۔ دن رات ہر لحظہ یہ انتظار کیا جاتا ہے کہ نہ جانے وہ گھڑی کب آ پہنچے جب ابوسعید دوبارہ مزار سے نکل آئے اور اسے اس گھوڑے پر سوار ہونے کی ضرورت پیش آ جائے۔ ابوسعید نے اپنے روحانی بیٹوں سے کہا تھا: ''میں جب دوبارہ تمہارے درمیان آؤں گا تو تم مجھے پہچان نہ سکو گے۔ میری پہچان کی علامت یہ ہوگی کہ تم میری گردن کو میری تلوار سے چھوؤ گے۔ اگر یہ میں ہی ہوا تو میں فوراً دوبارہ زندہ ہو جاؤں گا'' ابن نے یہ شرط اس لیے رکھی تھی تاکہ کوئی دوسرا اس کی جگہ یہ دعویٰ نہ کر سکے۔

بغداد کے خلفاء کے عہد میں ایک حکمران نے مکّے پر حملہ کر کے بہت سے لوگوں کو اس وقت مار ڈالا تھا جب وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ انہوں نے حجرِ اسود کو اتار لیا اور اسے لاہسہ لے آئے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ پتھر ''انسانی مقناطیس'' ہے جو لوگوں کو کھینچتا ہے۔ انہیں یہ علم نہ تھا کہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و بزرگی کے طفیل تھا کہ لوگ وہاں کھچے چلے آتے تھے ورنہ یہ پتھر تو اس جگہ زمانوں سے رکھا ہوا تھا اور کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ حجرِ اسود کو وہاں سے واپس لا کر اسی جگہ رکھ دیا گیا تھا جہاں سے اسے اتارا گیا تھا۔

لاہسہ کے مشرق میں سات فرسنگ کے فاصلے پر سمندر ہے۔اس سمندر میں بحرین کا جزیرہ واقع ہے جو پندرہ فرسنگ لمبا ہے۔اس میں ایک بڑا شہر اور کھجوروں کے بہت سے باغات ہیں۔سمندر میں موتی پائے جاتے ہیں، غوّاص ان موتیوں میں سے نصف لاہسہ کے سلطان کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔

لاہسہ کے جنوب میں اومان ہے جو جزیرہ نما عرب میں واقع ہے مگر اس کی تین اطراف کا رُخ صحرا کی جانب ہے جسے عبور کرنا ناممکن ہے۔اومان کا خطہ 80 مُربع فرسنگ ہے اور منطقہ حارہ میں واقع ہے۔اس میں ناریل اُگایا جاتا ہے۔اومان کے بالکل مشرق میں سمندر سے پار کش اور مکران ہے۔اس کے جنوب میں عدن جبکہ دوسری سمت میں فارس کا صوبہ ہے۔

لاہسہ میں کھجوروں کی بہت سی قسمیں وہ ہیں جن پر جانور پلتے ہیں۔ان کی قیمت کسی کسی وقت ایک ہزار من فی دینار ہوتی ہے۔اس کے شمال میں سات فرسنگ کے فاصلے قاطف کا علاقہ ہے جہاں ایک بڑا شہر آباد ہے اور کھجوریں بکثرت پیدا ہوتی ہیں۔یہاں کے امیر نے ایک بار لاہسہ پر حملہ کر دیا تھا۔اس نے ایک برس تک محاصرہ جاری رکھا۔اس نے شہر کی دیواروں میں سے ایک دیوار کو فتح کر لیا تھا اور بڑی تباہی پھیلائی تھی۔مگر اسے حاصل کچھ نہ ہوا۔اس نے جب مجھے دیکھا تو مجھ سے پوچھا کہ اس کے ستارے کیا بتا رہے ہیں کہ وہ لاہسہ کو فتح کر لے گا یا نہیں۔اس نے یہ سوال اس لیے کیا تھا کیونکہ یہ لوگ لامذہبیت کا شکار تھے۔میں نے مصلحت آمیز جواب دیا کیونکہ میری رائے میں بدو اور لاہسہ کے لوگ لامذہبیت کے بہت قریب تھے۔ان میں وہ لوگ بھی تھے جو سال گزر جانے کے باوجود ایک بار بھی وضو نہیں کرتے تھے۔یہ بات میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر بتا رہا ہوں۔یہ کسی افواہ کی بنیاد پر نہیں لکھ رہا ہوں۔میں ایسی باتیں وثوق کے ساتھ اس لیے ریکارڈ پر لا سکتا ہوں کیونکہ میں وہاں وقفوں وقفوں کے ساتھ مقیم نہیں رہا تھا بلکہ مجھے وہاں مسلسل نو ماہ رہنے کا موقع ملا تھا۔

بصرہ کا ذکر: اس شہر کے گرد بڑی سی دیوار ہے، سوائے اس حصے کے جس کا رُخ سمندر کی طرف ہے۔یہاں تمام پانی دلدلی ہے۔ضلع بصرہ کے بالکل شروع میں دریائے دجلہ و فرات دونوں مل کر بہتے ہیں۔جب ان کے سنگم میں حویزا کا پانی آ کر مل جاتا ہے تو اس کا نام شط العرب ہو جاتا ہے۔اس میں سے دو بڑی رود بار کاٹ لی گئی ہیں جن کے دہانوں کے درمیان ایک فرسنگ کا فاصلہ ہے۔یہ قبلہ کی سمت چار فرسنگ تک بہتی ہیں۔اس کے بعد ان کا رُخ بدل جاتا ہے اور یہ مڑ کر ایک فرسنگ مزید جنوب کی سمت بہنے لگتی ہیں۔

ان رودباروں میں سے بہت سی نہریں تمام سمتوں میں کھود دی گئی ہیں اور یہ کھجوروں کے جُھنڈوں اور باغات میں سے گزرتی ہیں۔ ان دو رُودباروں میں سے جو زیادہ اونچائی پر ہے اور شمال مشرق میں ہے، اسے نہر میکائل جبکہ جنوب مغرب والی نہر کو نہر ابولا کہتے ہیں۔ یہ دونوں رُودبار ایک بڑے سے مستطیل نما ''جزیرے'' کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کے تنگ حصے کی طرف بصرہ واقع ہے۔ اس شہر کے جنوب مغرب میں کھلا میدان ہے جو نہ تو آبادکاری کے لیے موزوں ہے نہ زراعت کے لیے۔

میں جب یہاں پہنچا اس وقت اس شہر کا زیادہ حصہ کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نصف فرسنگ تک آبادی والے حصے بہت بکھر گئے تھے۔ تاہم دیواریں مضبوط تھیں اور ان کی دیکھ بھال اچھی طرح کی جاتی تھی۔ حکمران کی آمدنی کافی تھی۔ اس زمانے میں امیر بصرہ ابا کالجار کا بیٹا بادشاہ فارس تھا۔ اس کا وزیر فاری تھا جس کا نام ابو منصور شاہ مردان تھا۔ بصرہ میں ہر روز تین بازار لگتے ہیں: صبح کے وقت سوق الخوضہ (خوضہ قبیلے کا بازار) دن کے درمیانی وقت میں سوقِ عثمان (عثمان کا بازار) اور دن کے ختم ہونے پر سوق القداہن (چقماق بنانے والوں کا بازار) دن کے درمیانی وقت میں سوقِ عثمان (عثمان کا بازار) اور دن کے ختم ہونے پر سوق القداہن (چقماق بنانے والوں کا بازار) بازار میں یہ طریقہ رائج تھا: آپ کو کسی کرنسی تبدیلی کرنے والے کے پاس جانا ہوگا جو آپ کو کرنسی کے عوض ڈرافٹ دے گا، اب آپ اپنی ضرورت کی چیزیں خرید سکتے ہیں۔ اس ڈرافٹ میں سے خریدی گئی شے کی قیمت منہا ہوتی جائے گی۔ کسی کو اس شہر میں جتنا عرصہ بھی ٹھہرنا ہو اسے کرنسی تبدیل کرنے والے کے ڈرافٹ کے علاوہ کچھ اور درکار نہ ہوگا۔

جب ہم وہاں پہنچے اس وقت ہم دیوانوں کی مانند بے لباس اور بری حالت میں تھے۔ اس لیے کہ تین ماہ گزر جانے کے باوجود ہم نے اپنے بال نہیں کھولے تھے۔ میں کسی حمام میں داخل ہو کر جسم کو گرمائش پہنچانا چاہتا تھا۔ موسم سرد تھا اور ہمارے جسم پر برائے نام لباس تھا۔ میں نے اور میرے بھائی نے پرانی لنگیاں پہن رکھی تھیں، ہماری کمر پر کھدر کے ٹکڑے ہمیں سردی سے بچانے کے لیے ٹانکے ہوئے تھے۔ ہماری اس حالت کو دیکھ کر ہمیں حمام میں کون گھسنے دیتا۔ میں نے اپنا پرانا بستہ بیچ دیا تھا جس میں، میں نے اپنی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے چند بوسیدہ درہم کاغذ کے ٹکڑے میں لپیٹے ہوئے تھے تاکہ حمام کے مالک کو دے سکوں۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ ہمیں حمام میں زیادہ وقت دے گا تاکہ ہم اپنے جسموں پر سے غسل کے دوران میل کچیل اتار سکیں۔ میں نے اسے جب ریزگاری دی تو اس نے میری طرف ایسی نگاہ سے دیکھا جس سے معلوم ہوتا تھا

جیسے ہم پاگل تھے اور وہ ہم سے کہہ رہے ہوں: ''یہاں سے چلے جاؤ حمام میں سے لوگ باہر آ رہے ہیں''۔ اس نے ہمیں حمام میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ ہم پر پیچھے سے پتھروں کی بارش ہوئی اور ہم جلدی میں تھے کیونکہ ہمیں پریشان کر دیا گیا تھا۔ ہم ایک کونے میں چلے گئے اور دنیا کی حالت پر ہمیں بے حد رنج ہوا تھا۔

اب چونکہ ہمیں اونٹ کے مالک کو تیس دینار دینے تھے اس لیے ہمارے پاس اہواز کے بادشاہ ابوالفتح علی ولد احمد کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے ایک فارسی سے رابطہ قائم رکھا جو ایک پڑھا لکھا انسان تھا اور جس سے میری معمولی سی جان پہچان تھی اور جسے وزیر تک رسائی حاصل تھی مگر میں نے بھی کام کرنا چھوڑا نہ تھا۔ اس نے وزیر سے میرے بارے میں بات چیت کی جس نے میرے بارے میں سنتے ہی ایک آدمی کو گھوڑا دے کر روانہ کیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ اس کے پاس لے جائے۔ میں اپنی بے لباسی اور بیکسی پر بے حد نادم تھا۔ میں نے معذرت نامہ لکھ کر بھیج دیا کہ میں اس حالت میں سر دست اس کے پاس نہ جا سکتا تھا، البتہ بعد میں آ جاؤں گا۔ میرے پاس ایسا کرنے کے دو عذر تھے: ایک میری غربت اور دوسرا میرا یہ دعویٰ کہ میں پڑھا لکھا تھا۔ مجھے یہ خیال گزرا کہ میری تحریر دیکھتے ہی وہ میری قدر و قیمت سے آگاہ ہو جائے گا اور میں جب اس کے پاس بعد میں جاؤں گا تو مجھے ندامت نہ ہو گی۔

اس نے فوری طور پر مجھے 30 دینار بھیجے کہ میں کپڑے بنوا لوں۔ اس رقم سے میں نے دو خوبصورت سوٹ خرید لیے تھے۔ میں تیسرے روز وزیر کے دربار میں حاضر ہوا۔ میں نے اسے نرم، علم و فضل سے آراستہ انسان اور دیکھنے میں خوش شکل پایا۔ اس میں عجز و انکساری تھی اور وہ مذہبی اور معقول نوجوان تھا۔ اس کا نام رئیس ابو عبداللہ احمد بن علی بن احمد تھا۔ وہ شاعر بھی تھا، اچھا منتظم بھی، دانشمند بھی اور اپنی جوانی کے عہد میں بھی اپنی عمر سے بڑھ کر زاہد و عابد لگتا تھا۔ ہمیں اندر لے جایا گیا جہاں ہم یکم شعبان سے رمضان کے وسط تک ٹھہرے۔ جس عرب کے میں نے اونٹ کے کرایے کے 30 دینار دینے تھے وہ اسے اس وزیر نے ادا کیے۔ یوں مجھے اس بوجھ سے نجات ملی کہ یہ رقم میں کہاں سے ادا کروں گا۔ (میری دعا ہے کہ اللہ ہر کسی کو قرض کی ادائیگی سے اسی طرح آزاد کرے)۔

میں نے جب رخصت چاہی تو اس نے مجھے بہت سے تحائف اور قیمتی اشیاء دے کر سمندری راستے سے سفر کی اجازت دے دی تھی۔ میں بحفاظت اور آرام کے ساتھ فارز پہنچ گیا تھا۔ میں اس عظیم انسان کا ممنونِ احسان ہوں (اللہ ایسے عظیم انسانوں کو خوش و خرم رکھے، آمین)

اب ہماری ظاہری حالت بدل گئی تھی، جسم پر خوبصورت لباس تھا۔ ہم ایک روز اس حمام میں گئے جہاں ہمیں داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ جونہی ہم اندر داخل ہوئے، حمام کا مالک اور خادم ہماری تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہم غسل کے بعد باہر نکلنے لگے تو یہ لوگ پھر کھڑے ہو گئے اور جب تک ہم رخصت نہ ہو گئے، مؤدب کھڑے رہے۔ اس دوران ایک خادم نے اپنے ایک دوست سے مخاطب ہو کر کہا: ''یہ وہی نوجوان ہیں جن کو ہم نے ایک روز اس حمام کے اندر داخل ہونے سے روک دیا تھا''۔ ان کا خیال تھا کہ ہم ان کی زبان نہیں سمجھتے لیکن میں نے عربی میں کہا: ''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ ہم وہی ہیں جنہوں نے اپنے پرانے موزے اپنی کمر پر باندھ رکھے تھے''۔ وہ شخص بے حد شرمندہ ہوا اور معافی مانگنے لگا تھا۔ بیس روز کے اندر یہ دو واقعات ہمارے ساتھ پیش آئے تھے، میں نے انہیں اپنی داستان میں شامل کر لیا ہے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ بُرے حالات میں افسردہ و غمگین نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سب کچھ تو مقدر کی باتیں ہوتی ہیں...... انسان کو اپنے خالق کے رحم و کرم سے کبھی مایوس نہ ہونا چاہیے، وہ بیشک بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔

☆☆☆

2۔ ابنِ جبیر......اسپین

1183ء

مہینوں کا سفر، ہزاروں میل کی مسافت، درجنوں زبانیں اور علاقائی ثقافتیں، یہ سب خسرو کے خراسان کو ابنِ جُبیر کے غرناطہ سے جدا کرتے ہیں اور قاری کے لیے یہاں ایک وقفہ ہے۔ جس زمانے میں درج ذیل سفرنامہ لکھا جا رہا تھا اسلامی سلطنت کی سرحدیں دور دور تک ایک دوسرے سے جا کر مل رہی تھیں۔ انڈیا سے مراکش تک بشمول آئبیریا تا پائرینیز تجارتی راستے اور دارالخلافے اسلامی ممالک کی زد میں تھے۔

ابوالحسین ابن جبیر غرناطہ، اسپین میں 1145ء میں پیدا ہوا۔ وہ بارھویں صدی کے نصف آخر میں مسلم گورنر کا فرسٹ سیکرٹری تھا۔ نصر خسرو کی طرح ابن جبیر بھی ایک درباری سکالر اور شاعر تھا مگر ہم جب اُسے ترتیب زمانی میں پڑھتے ہیں تو خسرو کا کام تشنہ و سطحی لگتا ہے۔ اُس حج کے ریکارڈ کے علاوہ جو صلیبی جنگوں کے دوران ادا کیا گیا، ابن جبیر اس سفرنامے کو نقش اول کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یہ عرب کے عہدِ وسطیٰ میں ایک مقبول صنفِ ادب تھی۔ اسے مسلمانوں کے عہدِ وسطیٰ کے سفرناموں میں ادبی لحاظ سے ایک خوبصورت اسلوب میں لکھی ہوئی کتاب سمجھا جاتا ہے۔ یہ سفرنامہ جب 1189ء میں پہلی بار چھپ کر سامنے آیا اس وقت ابنِ جبیر کا غرناطہ یورپ کے پہلے اسلامی خطے، مسلم اسپین کے دارالخلافے کے طور پر اُبھر رہا تھا۔

مُسلم اسپین کی ابتدا ماضی میں ساتویں صدی کے آخری برسوں اور مغربی بحیرۂ روم کے اس حصے تک جا پہنچتی ہے جہاں یورپ اور افریقا تقریباً ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ مسلمان حملہ آور جو شام، عرب اور مصر سے یہاں آئے بڑے محنتی اور مستقل مزاج سپاہی تھے۔ انہیں اپنی روشن تقدیر پر پورا اعتماد تھا۔ براعظم سے باہر نکل کر انھوں نے شمال کی سمت نگاہیں دوڑائیں۔ ایک بربر جرنیل نے جو موسیٰ ابن نصیر کی فوج میں تھا 711ء میں ایک بہت بڑی مراکشی بربری فوج کے ساتھ جبرالٹر کو عبور کر لیا تھا۔ ایک فیصلہ کن جنگ کا آغاز ہوا اور عرب شمال کی سمت طلیطلہ تک پہنچ گئے تھے۔ دو سال بعد آئبریا جزیرہ نما کا زیادہ حصہ ان کے قبضے میں آ چکا تھا۔

ابن جبیر کا خاندان اس فوج کے ساتھ مکہ سے آیا جسے دمشق کے خلیفہ نے 740 میں روانہ کیا تھا۔ جنوبی اسپین میں جسے وہ اندلس کہتے تھے وہ ایک مسیحی دنیا میں پہنچے جس کی جڑیں رومیوں سے ملتی تھیں۔ یہ ایڈرین اور ٹراجن بادشاہوں کی جنم بھومی تھی۔ رواقی فلسفی سینیکا (اس فلسفے کا پیرو جوزینو نے 208ق م میں ایتھنز میں قائم کیا تھا) اور شاعر لوقا بھی یہیں پیدا ہوئے تھے انہوں نے تھیٹر، آب ریزیں، پُل بنوائے اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جس پر وسیگوتھک مجموعہ قوانین کے مطابق حکومت کی جاتی تھی۔ ان قیمتی بنیادوں پر انہوں نے مشرق کی ثقافتی نشانیاں نصب کی تھیں: مُوری محراب جس کا تعلق ساسانی فارس سے تھا، بازنطینی خاص سٹائل کا روشن فن، سکندریہ کے بطلیموئی سکول کی نئی سائنس، اور بیشک اسلام کی بھی ...... مراکش کے چٹانی ساحل کے شمال میں ایک دن کے (بحری) سفر پر اندلس کی بحیرہ رُوم کی سرسبز وادیوں میں ان نو آبادوں نے تہذیبوں کے ادغام کو تقابلی صورت میں پیش کیا جس نے آٹھ سو سال تک یورپ کو منور کر دیا تھا۔

مثال کے طور پر 756ء کے آغاز میں قرطبہ میں پہلے امیر عبدالرحمٰن اوّل کی حکومت تھی جس کی سلطنت میں وادی الکبیر کے کنارے ایک شہر آباد تھا، جس کی منصوبہ بندی، فصیل شہر، محلات اور مضافاتی علاقوں کو دیکھ کر دمشق کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ اسپین میں کھجور کا پہلا درخت اس کے محل کے صحن میں اُگا تھا۔ عبدالرحمٰن اسپین سورج کی روشنی کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ اسے تو عباسی انقلاب کے دوران شام سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کے ہمراہ اس کا خاندان اور پورا اُمیہ دربار ترکِ وطن پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ قبائل کی باہمی جنگ میں بچ جانے والا یہ سلطان نہیں چاہتا تھا کہ اسپین میں ویسا ہی واقعہ پیش آئے۔ اس سلسلے میں اسے اسلام کے ایک مکتب فکر کی حمایت حاصل تھی جس نے مذہبی اور نسلی معاملات میں صبر و تحمل سے کام لینے کے لیے اس کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ ایک ڈوبتے ہوئے ستارے کی روشنی کی مانند بنوامیہ کی روایت دمشق میں ختم ہوتی جا رہی تھی مگر اس کی کرنیں اسپین کے دور دراز حصے پر پڑ رہی تھیں۔ عبدالرحمٰن اور اس کے جانشینوں نے اسپین کو ایک مہذب مسلم ریاست بنا دینے کے لیے بڑی جدوجہد کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی اس نے اعلان کیا کہ تمام عقائد اور نسلوں کے لوگوں سے غیر جانبدارانہ سلوک کیا جائے گا اور ہر ایک سے اس کے قوانین کے مطابق معاملہ ہوگا۔ اگلے تیس برسوں میں اس نے مارکیٹوں اور عدالتوں میں عدل و انصاف قائم کر دیا تھا۔ یوں آنے والے سو برسوں کے لیے ایسی سماجی برداشت کے لیے بنیادی کام کر دیا گیا تھا جس کی مثال نہ یورپ میں ملتی تھی نہ مشرقِ وسطیٰ میں۔ اسپین میں برداشت کے حوالے سے سنہری عہد کا آغاز عبدالرحمٰن کے دورِ حکومت سے ہوتا

ہے۔ اس کے جھنڈے تلے عرب، عیسائی اور یہودی ثقافتیں صدیوں تک ایک دوسرے کے ساتھ پروان چڑھتی رہیں۔ 788 میں اپنی وفات سے قبل عبدالرحمٰن نے ایک ایسے خطہ زمین کو فتح کر کے وہاں انتظام و انصرام کی بہترین مثال قائم کردی تھی، جو پرتگال سے جنوبی فرانس تک پھیلا ہوا تھا۔

آئندہ تین صدیوں کے دوران یکے بعد دیگرے کئی باصلاحیت حکمران اور ان کے دربار سے وابستہ فلسفی، سکالرز، شعراء، ماہرین تعمیرات، موجدین اور موسیقاروں نے اپنے عہد کے لیے ثقافتی معیارات کا تعین کر دیا تھا۔ ابن جبیر کے دور میں سولا کے اندر پانچ سو عوامی حمام تھے اور ایک ہزار مساجد تھیں۔ قرطبہ مغربی یورپ کا سب سے بڑا شہر تھا جس کی آبادی سات لاکھ تھی۔ یہاں ٹیکسوں کی مدد سے قائم یونیورسٹیوں میں مسلمان اور یہودی سکالر، دونوں تدریسی فرائض سرانجام دیتے تھے۔ ایسی مثال بمشکل ہی ملتی ہے جب ہم کسی ایک ایسی تہذیب کی نشاندہی کر سکیں جو دوسری تہذیب سے سیکھنے گئی ہو۔ مگر مسلم اسپین اس کی واضح اور روشن مثال پیش کرتا ہے۔ یہ وہ شہر تھا جس میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے درمیان طویل دوستانہ مناظرے ہوتے تھے۔ اس عہد میں جس فلسفیانہ فکر کا آغاز ہوا اس میں ارسطو، افلاطون، بطلیموس اور اقلیدس کو یورپ میں عربی تراجم اور مسلمان فلسفیوں اور سکالرز کے ذریعے از سر نو متعارف کرایا گیا تھا۔ تراجم کی اس دولت سے مکمل طور پر کہاں تک فائدہ اٹھا گیا اس کی تفصیل تو شاید کبھی سامنے نہ آئے مگر دو نکات ایسے ہیں جہاں جدید علم و دانش متفق ہیں: مسلم اسپین میں جن کتابوں کو از سر نو متعارف کرایا گیا۔ اس نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کو قریب لانے میں بڑی مدد دی۔ معلومات کی ایک یکطرفہ سفر طے کرتی قاہرہ اور بغداد کے کتب خانوں سے اسپین کے کتب خانوں تک پہنچی تھی جو وہاں سے بقیہ یورپ تک جا پہنچی تھی۔ مسیحی سکالرز نے جنوب کی سمت کافی تعداد میں سفر کیا۔ صرف ابن جبیر کی پیدائش کی دہائی میں صرف طلیطلہ میں انگریز رابرٹ آف کیٹن، اطالوی گرارڈ آف سریمونا، اور آسٹریائی ہرمن آف کیرنتھیا سینکڑوں یونانی کلاسیکی کتب کا ترجمہ یورپی سکالرز کے لیے عربی سے لاطینی زبان میں کر رہے تھے۔ حاکم دوئم (عہد حکومت 976۔ 961ء) کی ایک مثال کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس نے مصر اور شام میں جاسوس مقرر کر رکھے تھے جن کے ذمے سونے یا باندیوں کے بارے میں اسے باخبر کرنا نہ تھا بلکہ نادر کتب اور تراجم کے بارے میں بادشاہ کو اطلاع دینا تھا۔ اس کے صرف قرطبہ کے کتب خانے میں ہزاروں نادر کتب تھیں۔ یہ ثقافتی لہر ابنِ جبیر کی پیدائش کے عرصے تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے آئبیرین معاصرین میں بت شکن مسلم صوفی ابن عربی (1240۔ 1165ء) ابن رشد

(1126-1198ء) اور قرطبہ کے موسیٰ مامون (موسیٰ ابنِ مامون 1135-1204ء) شامل تھے۔ مامون کا ابتدائی کیریئر بطور یہودیت کے دورِ وسطیٰ کے عظیم مفکر کے اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مُسلم اسپین میں صدیوں تک کثیر ثقافتی ماحول پھلتا پھولتا رہا۔ اس سے نہ صرف اسلام بلکہ مُسلم دورِ اقتدار کے دوسرے مذاہب کو بھی فائدہ پہنچا ابن جبیر کا غرناطہ مشرق بعید کے بہت سے شہری مراکز کی نسبت زیادہ مہذب تھا۔ جیسا کہ اس کی کتاب وضاحت کرتی ہے اسے مسیحی یورپ اور عربی حجاز کے حرص اور ناانصافی نے اکثر دکھ دیا۔

درج ذیل انتخابات میں ابن جبیر کی مصر میں آمد، بحیرۂ احمر سے بحری جہاز کے ذریعے اس کی عرب روانگی اور جدہ میں اس کا قیام شامل ہیں۔ ان میں اس کے مکّے میں آٹھ ماہ قیام کے عرصے سے متعلق اقتباسات بھی شامل ہیں۔ وہ فروری 1183ء کے اوائل میں غرناطہ سے روانہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اس سفر میں ایک معالج بھی تھا۔ وہ جنیوا کے بحری جہاز پر سبتہ پہنچا تھا جہاں سے اسے ایک بحری جہاز کے مسیحی عملے کے ساتھ مصر جانا تھا۔ راستے بھر جہاز طوفانوں کی زد میں رہا اور اس سفر میں تیس روز لگ گئے تھے۔ اسے خرابیِ موسم نے بہت پریشان کیا۔ ایک تیسری صلیبی جنگ میں، جس کا منصوبہ فلسطین میں بن رہا تھا، قیدیوں کو غلاموں کی شکل میں ہر طرف فروخت کیا جا رہا تھا۔ ابن جبیر لکھتا ہے کہ اس نے ایسے مسلمان قیدیوں کو دیکھا جو مارکیٹ میں نیلام ہونے کے لیے کھڑے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ "دشمن" اسی وقت ان کے ساتھ مُسلم ساحل سے واپس لوٹا تھا"۔ مصر میں جہاں سے ہمارا پہلا اقتباس شروع ہوتا ہے، مقابلہ کرنے والوں کا مقدر الٹ جاتا ہے۔ اسکندریہ میں بحری جہاز سے اترنے کے بعد ابنِ جبیر قاہرہ نے مسیحی سپاہیوں کو دیکھا جنہیں اونٹوں کی ایک قطار کے ساتھ جیل کی طرف ہانکا جا رہا تھا۔ یہ عام سپاہی نہ تھے بلکہ وہ افسانوی کردار تھے جن کا ذکر صلیبی جنگوں کے ریکارڈ میں چھپتا تھا اور جو حج قافلوں پر حملہ کر کے انہیں لوٹ لیا کرتے تھے۔ اس بار مدینہ سے صرف ایک روز کے پیدل سفر کی مسافت پر انہیں اس فوج نے روک لیا تھا جو قاہرہ سے بھیجی گئی تھی جن قیدیوں کو ابنِ جبیر نے دیکھا تھا وہ اس ناکام مہم سے پکڑے جانے والے قیدی تھے، جنہیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

اِن حالات میں حج ادا کرنا آسان نہ ہوگا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ مصر سے مکے جانے والا اہم راستہ جو سنائی میں سے گزرتا تھا رینلڈ کے حملہ آوروں کے علاقے کے راستے میں پڑتا تھا ابن جبیر قاہرہ کی طرف بڑھا جو ان دنوں سنّی مسلم سلطنت کا دارالخلافہ تھا جہاں مشہور سلطان صلاح الدین کی حکومت تھی۔ اس کُرد سلطان نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے طفیل حجاج کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ وہ انہیں اس شاہراہ

کے بیٹے بیٹیاں کہتا تھا۔ وہ انہیں کھانا مہیا کرتا اوران پر عائد حج ٹیکس بھی اُس نے معاف کر دیا تھا۔ البتہ جوں جوں حجاج اس کی سلطنت کی حدود سے دور ہوتے جاتے تھے خطرات میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اگر سنائی راستہ ناقابل عبور تھا تو متبادل راستہ بالائی مصر میں دریائے نیل تک جنوب کی سمت نوروز کے سفر پر مشتمل تھا۔ پھر خشکی پر سفر کے دوران تپتی ہوئی ریت پر سے گزر کر بحیرۂ احمر کی بندرگاہ عیذاب تک جانا ہوتا تھا اور یہ راستہ بالکل محفوظ نہ تھا۔ ایک ہی برس قبل صلیبیوں نے قوس سے باہر حاجیوں کے ایک قافلے پر حملہ کر کے ان میں سے کئی افراد کو شہید کر دیا تھا۔ ابن جبیر کے پاس کوئی متبادل حل نہیں تھا۔ وہ جنوب کی سمت قاہرہ سے ایک اونٹوں کے قافلے کے ہمراہ روانہ ہوا۔ وہ ساحل تک زندہ وسلامت پہنچ تو گیا تھا مگر عیذاب کی بندرگاہ جہنم سے کم نہ تھی اور بحیرۂ احمر کو عبور کر کے سفر حجاز پہنچنا خطرات سے خالی نہ تھا۔

عرب میں حالات بدتر ہو گئے تھے۔ بیشک ابن جبیر کا سب سے زیادہ پُرخطر سفر حجاز میں ساحل کے ساتھ ساتھ تھا جو مکے اور مدینے پہنچتا تھا۔ اسلام سے بہت پہلے مقامی قبائل کی دولت کا زیادہ حصہ وہ ہوتا تھا جو وہ مسافروں کو لوٹ کر حاصل کرتے تھے۔ پھر بارھویں صدی کے آخر میں شام کے سالانہ قافلے نے ان قزاق قبیلوں پر سخت تنقید کی جس کا آغاز انہوں نے دمشق کے دروازوں پر کیا۔ انہوں نے مکے تک ایک ہزار میل کے فاصلے کو اپنا حق سمجھ کر طے کرنا جاری رکھا۔ حج کا تقدس آخری شے تھی جو ان قزاقوں کے ذہنوں میں بٹھانی ضروری تھی۔ ان کا خیال تھا کہ حج کے قافلوں کو بغیر ان سے ٹیکس وصول کیے اپنی زمینوں میں سے گزرنے دینا سوائے ڈکیتی کو دعوت دینے کے اور کچھ نہ تھا۔ حجاج کے لیے ان کے خیال میں یہ بات نہایت احمقانہ تھی کہ حجاز سے وہ بغیر کسی تحفظ کے گزر جائیں۔ عموماً ان کا لباس تک اتار کر ان کے اُونٹ چھین لیے جاتے تھے۔ ہم اس بارے میں نصر خسرو کے سفرنامے میں پہلے بھی پڑھ چکے ہیں کہ اس قسم کے سفر کا نتیجہ کیا نکلتا تھا۔

مسلمانوں نے ہمیشہ حج کو ایک ایسا موقعہ جانا ہے جس میں وہ ہر رکاوٹ کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ حج کے پورے ریکارڈ میں قبولیت، برداشت اور ساتھی حجاج کے لیے باخبر رہتے ہوئے امدادی کوششیں کرنا روحانی انعامات کی وعید سناتے ہیں۔ اس کے باوجود ابنِ جبیر جیسا دیندار اور خدا پرست اللہ کی مرضی کی خاطر ان حجازی قزاقوں کے ظلم وستم کو سہنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ان قزاقوں کی ظالمانہ کارروائیوں سے مشتعل ہو کر ایک جگہ وہ سفارش کرتے ہیں کہ اس پورے علاقے کو ''بزورِ تلوار پاک کیا جانا چاہیے''۔ وہ اپنی بات اس طرح ختم کرتا ہے کہ حج کی قدر وقیمت محض اتنی سی نہیں ہے کہ وہ فقہاء زیادہ دانا و بینا تھے جنہوں نے

بُرے وقتوں اور مشکلات میں مستقبل کے حجاج کو اپنا یہ فریضہ ادا کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ہمارے لیے بعد ازاں یہ پڑھ کر حیران ہونے کی کوئی بات نہیں کہ چار سو برسوں میں کسی بھی خلیفہ نے حج پر اپنی گردن کو خطرے میں نہیں ڈالا تھا۔

تاہم مکہ مکرمہ کے دروازوں سے شہر کے اندر ایک بار داخل ہو جانے کے بعد ابن جبیر کا لہجہ بالکل بدل جاتا ہے۔ یہاں مقدس قانون کی حکمرانی ہے، یہ شہر زمین پر جنت کا ٹکڑا نظر آتا ہے۔ امن وسلامتی کی ایک قلمرو ہے کہ جو روحانیت اور نظم وضبط میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہاں آنے والا ہر فرد کسی قسم کی ظلم وزیادتی، تشدد میں شریک ہونے سے اجتناب کرتا ہے۔ مجمع کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو، ایک دوسرے کو دھکا دینے سے حتی الوسع بچا جاتا ہے۔ مذہبی رسوم ادا کرتے وقت ایک دوسرے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ نمازوں کے اوقات مقرر ہیں جو دن کو تقسیم کر دیتے ہیں، جس کا اعلان اذان سے ہوتا ہے۔ سرزمین حجاز کے بقیہ علاقوں کے مقابلے میں حرم پاک کا ضلع مکمل تحفظ فراہم کرتا ہے جو بے حد متاثر کرتا ہے۔ بازاروں میں دودھ اور شہد وافر مقدار میں ملتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دودھ شہد کی نہریں جاری ہیں۔ یمنی مسلمانوں کا ہمیں شکرگزار ہونا چاہیے جو سال بھر اس شہر میں مفت اشیاء بھیجتے ہیں۔

جب حج کا زمانہ آ جاتا ہے اس وقت ابن جبیر اس کی تفصیل جزیات کے ساتھ بڑی احتیاط اور باریک بینی سے قلمبند کرتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک باہر سے آئے ہوئے مشاہد یا ناظر کی نہیں رہ جاتی بلکہ ایک ایسے شخص کی طرف سے جو اس فریضۂ حج کی ادائیگی میں خود شامل تھا گہری نظر سے دیکھے گئے اور محسوس کیے گئے واقعات کو ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ وہ عرفات میں لگ جانے والے خیموں اور ان کے باسیوں کے بارے میں بڑی واضح تصویر پیش کرتے ہیں جو ایک اوّل درجے کی حج گائیڈ ثابت ہوتی ہے۔ وہ اسپین میں بیٹھے ہوئے قارئین کے لیے دور دراز واقع مقامات مقدسہ کے بارے میں اور حج سے متعلق مذہبی رسوم کی ادائیگی کا ذوق وشوق پیدا کرتے ہیں۔ وہ پہلے حج مصنف ہیں جنہوں نے حج کی ادائیگی سے متعلق کی جانے والی بہترین پیشرفت کا ڈھانچہ پیش کیا جس میں پانی کے نظام سے لے کر ان اقدامات تک کا ذکر ہے جن میں کافی رقم خرچ کر کے جبل الرحمت تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں بنادی گئی ہیں۔ حج کے سفر کے دوران پیدل چلنے والے مسافروں کے جذبات واحساسات اور امیر افراد کے اُونٹوں کے عمدہ اور قیمتی ہودوں کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے جن پر حفاظتی چھتر ہوتے ہیں جو دھوپ اور تیز ہوا سے بچاتے ہیں۔ ان مسافروں کی

سونے کے لیے مستعمل چٹائیوں، شطرنج اور مطالعے کے لیے ساتھ رکھی جانے والی کتابوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

حج کے اختتام پر ابن جبیر واپس اسپین کو روانہ ہو گیا تھا۔ اس سفر کے دوران وہ میسوپوٹیمیا، شام اور سسلی میں سے گزرا۔ وہ اپریل 1185ء میں غرناطہ پہنچ گیا تھا اور اس کا سفرنامہ چار سال بعد شائع ہوا۔ اسے وہ ڈائری کی شکل میں لکھتا رہا تھا اور کتابی شکل میں اسے لانے کے لیے اس نے بڑی احتیاط سے کام لیا۔

اس سفرنامے کے 27 ابواب ہیں۔ ہر باب میں اس ایک مہینے کا ذکر ہے جس میں مصنف سفر میں رہا۔ مصنف اہل ایمان سے مخاطب ہے اور یہ ایک زاہد و عابد مسلمان کی تصنیف ہے جس میں مشکلات و مصائب کے لمحات میں مشیت ایزدی کو سامنے رکھتے ہوئے بے اطمینانی پر قابو پانے کا ذکر بھی ہے۔ اس سفر نامے میں مصنف کی فہم و فراست اور بے لاگ اظہار خیال بھی شامل ہے۔ خسرو نے زیادہ ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے مگر ابنِ جبیر نے ایک ایک صفحے پر اپنے ذہن کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ اسے ہمیشہ خوشی نہیں ہوتی مگر جب کبھی اسے کوئی شہر دکھائی دیتا ہے اسے پتا چل جاتا ہے کہ یہ اچھا شہر ہے۔ سفرناموں کی خوبیوں میں سے یہ سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ حج پر لکھے گئے لٹریچر میں مقاماتِ مقدسہ میں تحفظ اور اس مقام کی روح جس وضاحت و شگفتگی سے ابنِ جبیر نے قلمبند کی ہے اس کی مثال کسی اور سفرنامے میں نہیں ملتی۔

☆☆☆

ابنِ جُبیر کے سفر نامے سے اِقتباس

مصر سے مکّے تک

اپریل تا اگست 1183ء۔ سکندریہ میں اترنے پر ہم نے سب سے پہلے جو چیز دیکھی وہ سڑک کے کنارے جمع لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ یہ لوگ ان یورپی قیدیوں کو دیکھ رہے تھے جنھیں اونٹوں پر سوار کرانے کے بعد انھیں شہر کے اندر سے گزارا جارہا تھا۔ قیدیوں کے چہرے اونٹوں کی دُموں کی طرف تھے ان کے گرد نرسنگھے اور جانجھ بجائے جارہے تھے۔ ہم نے جب پوچھا کہ یہ کیا معاملہ تھا تو ہمیں ایک بڑی دردناک کہانی بتائی گئی۔ اس سال بحیرہ احمر کے قریب شامی صلیبیوں نے اس ملک کے ایک حصے میں بحری جہاز تیار کئے تھے۔ مقامی عربوں سے انھوں نے کچھ اونٹ کرائے پر لئے اور بحری جہازوں کے ٹکڑے انھوں نے ان اونٹوں پر لادے اور یوں ان جہازوں کو سمندر تک لے گئے۔ وہاں ان ٹکڑوں کو جوڑ کر انھیں سمندر میں داخل کر دیا گیا تھا۔ ان بحری جہازوں میں بیٹھ کر یہ لوگ مکے آنے جانے والے حاجیوں کو پریشان کرتے تھے۔ یمن کے سمندر میں انھوں نے مسلمانوں کے سولہ بحری جہازوں کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔ پھر یہ عیذاب پہنچے اور جدّہ سے کشتی میں سوار ہوکر آنے والے حاجیوں پر حملہ کر دیا تھا۔ مصر کی طرف انھوں نے حاجیوں کے ایک بڑے قافلے کو پکڑ لیا تھا جو قوس سے عیذاب جارہے تھے۔ ان ظالموں نے تمام حجاج کو شہید کر دیا تھا۔ پھر انھوں نے ان دو بحری جہازوں کو پکڑ لیا تھا جن میں یمن سے سامانِ تجارت آرہا تھا۔ سعودی عرب کی جانب کچھ پیچھے، ساحلوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے بہت سے ایسے اسٹیشنوں کو جلا دیا تھا جن پر خدا کے مقدس شہروں، مکہ و مدینہ کو سامانِ خورد و نوش بھیجا جاتا تھا۔ یہ وہ مظالم تھے جن کی مثال نہیں ملتی۔ کوئی بھی یورپی اُن مقاماتِ مقدسہ کے اس قدر قریب کبھی نہیں آیا تھا۔ مسلمانوں میں غم و غصے کی لہر اُس وقت دوڑ گئی تھی جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ مدینہ طیبہ نبی پاک ﷺ کے شہر میں داخل ہوکر روضہ مبارک کو لوٹنا چاہتے تھے۔

انھوں نے اپنے اس منصوبے کو صیغہء راز میں نہیں رکھا تھا بلکہ اس خبر کو دور و نزدیک پھیلا دیا تھا تاکہ لوگوں میں خوف و ہراس پھیل جاوے مگر اللہ نے ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ ابھی

مدینے سے ایک روز کی مسافت پر ہی تھے کہ قاہرہ اور سکندریہ سے روانہ کئے گئے بحری جہازوں نے ان کا رخ موڑ دیا تھا۔ شاہی منتظم حسام الدین اور بہت سے بہادر ملاحوں نے پہاڑیوں میں دشمن کا پیچھا کیا اور ایک ایک کو گرفتار کر لائے۔ ہم نے اس واقعہ میں پنہاں خدا کی طرف سے ایک نشانی دیکھی کیونکہ جب یہ روانہ ہوئے تھے اس وقت مصر سے روانہ ہونے والے بحری جہاز ڈیڑھ ماہ کی مسافت پر تھے اور آخری ممکنہ لمحے کو وہ یہاں پہنچ بھی گئے تھے۔ تمام حملہ آور یا تو موقع پر ہلاک کر دیئے گئے تھے یا انھیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ گرفتار ہونے والوں کو بعد میں مختلف ملکوں میں سزائے موت دی گئی تھی تا کہ دوسروں کے لیے عبرت کی مثال قائم ہو جائے۔ چند ایک کو مکہ و مدینہ بھیج دیا گیا تھا۔ اللہ اسلام کا نگہبان ہے..... ساری تعریفیں خالقِ کائنات کے لیے ہیں۔

بحیرہ احمر کے پار

وہ بحری جہاز جو بحیرہ احمر میں عیذاب سے جدّہ تک چلتے ہیں وہ کسی ایک بھی میخ کے بغیر آپس میں سلے ہوئے ہوتے ہیں۔ انھیں ناریل سے تیار شدہ ایک رسی سے باندھا دیا جاتا ہے جسے جہاز بنانے والے اس وقت تک کوٹتے رہتے ہیں جب تک یہ دھاگے کی شکل اختیار نہیں کر جاتا۔ بحری جہازوں کی درزوں کو ناریل کے درخت کی باریک پرتوں سے بند کیا جاتا ہے اور جب جہاز بن کر تیار ہو جاتا ہے تو اس پر چکنائی لگا دی جاتی ہے۔ شارک مچھلی کا تیل بھی بہترین تصور ہوتا ہے۔ لکڑی اور ناریل کے ریشے دونوں انڈیا سے منگوائے جاتے ہیں۔ بادبان گوند کے درخت کے پتوں سے بنے جاتے ہیں لیکن ان کی شیٹیں کمزور جوڑوں سے یکجا کی جاتی ہیں اور ان کی بناوٹ بھی اتنی اچھی نہیں ہوتی۔

عیذاب سے جدہ تک کا سفر منگل اور بدھ کے روز عام دنوں کی نسبت زیادہ وقت لیتا ہے کیونکہ ہوائیں تیز نہیں چلتیں۔ پھر جمعرات مغرب کی نماز کے بعد ہم نے دیکھا کہ سعودی عرب سے آنے والے پرندوں نے ہوا میں چکر لگانے شروع کر دیئے ہیں۔ مشرق میں پہاڑوں پر بجلی کی کڑک سنائی دی اور آنے والے طوفان نے آسمانوں کو سیاہ کر کے ہر شے کو چھپا لیا تھا۔ طوفان تیز ہوتا گیا اور جہاز ڈولتے ڈولتے آخر کار پیچھے کی طرف مڑ گیا تھا۔ تیز و تند ہواؤں میں مزید شدت پیدا ہو گئی تھی۔ تاریکی نے ہر شے کو اس طرح چھپا دیا تھا کہ ہم اپنے راستے پر سفر جاری نہ رکھ سکتے تھے۔ بالآخر چند ستارے دوبارہ نمودار ہوئے تا کہ ہماری رہنمائی کر سکیں۔ بادبان نیچے مستول تک اتار لئے گئے تھے۔ ہم نے یہ رات طوفان میں گزاری جس نے ہمیں مایوس

کر دیا تھا۔ فرعون کا سمندر اس طرح کے طوفانوں کے لیے مشہور ہے مگر صبح ہوتے ہی خدا نے ہمیں اطمینان و سکون بخش دیا تھا۔ ہوا کی تیزی و تندی میں کمی واقع ہوگئی تھی' بادل چھٹ گئے تھے اور مطلع صاف ہوگیا تھا۔ کچھ فاصلے پر سرزمینِ حجاز ہماری نظروں کے سامنے تھی۔ ہمیں پہاڑ صرف جدہ کے مشرق میں نظر آ سکتے تھے۔ ہمارے کپتان نے کہا کہ یہ دو روز کے سفر کی مسافت پر ہیں۔

دن بھر ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چلتی رہی' راستے میں ہمیں بہت سے پتھریلے ساحل ملے جس سے پانی کی لہریں ٹوٹ جاتی تھیں اور یہ ہمارے اردگرد ہنستی کھیلتی محسوس ہوتی تھیں۔ ہم بڑی احتیاط کے ساتھ آبی تنگ راستوں سے گزر رہے تھے۔ کپتان تجربہ کار اور ماہر تھا۔ خدا نے ہمیں ان تنگ آبی راستوں سے دور رکھا یہاں تک کہ ہم ساحل کے قریب ایک چھوٹے سے جزیرے میں پہنچ گئے تھے جسے بحری جہازوں کا سنگ راہ کہتے تھے۔ خدا نے ہمیں اس کے بدصورت نام سے دور رکھا۔ ہم یہاں بحری جہاز سے اتر گئے تھے اور جمعہ کی رات یہاں گزاری تھی۔ صبح بڑی پرسکون تھی مگر ہوا کسی ناموزوں سمت سے چلنی شروع ہوگئی تھی اور ہمیں دن بھر وہاں رکنا پڑا۔ سنیچر کے روز ہلکی ہلکی ہوا چل پڑی تھی اور ہم جہاز کو خاموشی کے ساتھ ایک خاموش اور ٹھہرے ہوئے پانیوں والے سمندر میں لے گئے تھے جو نیلے رنگ کے بلوریں تھال سے مُشابہ تھا۔

پیر کی شام ہم جدہ کے نزدیک لنگر انداز ہوئے۔ شہر ایک میدان میں نظر آ رہا تھا۔ اگلی صبح ہوا تیز ہو گئی تھی اور ہم بندرگاہ پر نہ رک سکے تھے۔ ساحلی چٹانوں اور تنگ و کم گہرے راستے نے ہمارا داخلہ بند کر دیا تھا۔ ہم نے حجاج کو لے جانے والے ان بحری جہازوں کے کپتانوں کی مہارت کی تعریف کی جنھوں نے اپنے ملاحوں کے ساتھ مل کر چٹانوں میں سے اپنے بحری جہازوں کو صحیح سلامت نکالا تھا۔ یہ بلاشبہ بے حد قابلِ تعریف بات تھی۔ یہ کپتان اپنے جہازوں کو تنگ راستوں میں سے یوں نکال لے جاتے ہیں جس طرح کوئی گھوڑ سوار اڑیل گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔

جدہ پہنچ کر ہم علی نامی گورنر کے گھر میں ٹھہرے تھے' جو اس بندرگاہ پر صلاح الدین کے نام سے حکومت کرتا ہے۔ یہاں زیادہ تر گھر سرکنڈے کے اور سرائیں پتھر اور گارے کی بنی ہوئی ہیں جن کے سائبان ناریل کے پتوں سے بنائے جاتے ہیں جن کے نیچے لوگ گرمی سے بچنے کے لیے رات کو سوتے ہیں۔ ہم ان میں سے ایک کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ شہر کی قدیم باقیات اس کے عہدِ قدیم کی تصدیق کرتی ہیں۔ زمانہ

قبل از تاریخ کی دیواروں کے نشانات اب بھی شہر کے گرد موجود ہیں۔ایک مقام ایسا ہے جہاں ایک قدیم اور بلند گنبد ہے'اسے بنی نوع انسان کی ماں حضرت حوا کا گھر کہا جاتا ہے جو اس وقت ان کا تھا جب یہ مکہ جارہی تھیں۔ایسی باتوں کے بارے میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اس شہر'صحرا اور اردگرد کے پہاڑوں میں بسنے والے زیادہ لوگ پیغمبر خداﷺ اور آپﷺ کے چچازاد اور داماد حضرت علیؓ کی اولاد میں سے یا یہ حضرت جعفرؓ کی اولاد میں سے ہیں۔جدہ میں بسنے والے لوگو ں کی زندگی دل ہلا دینے والی ہے۔ان کے کئی ذرائع معاش ہیں'اونٹ رکھتے ہوں تو انھیں کرائے پر دیتے ہیں' دودھ اور پانی بیچتے ہیں' کھجوریں مل جائیں تو کھجوریں فروخت کرتے ہیں یا ساحلوں سے اکٹھی کی گئی پانی میں بہہ کر آنے والی لکڑی بیچتے ہیں۔بعض اوقات ان کی خواتین بھی کام کرتی ہیں۔بلاشبہ ان لوگوں کا خاندان ایک ایسا خاندان ہے جس کا مستقبل تو خدا نے بنایا ہے حال نہیں بنایا۔۔۔۔

ان لوگوں کی اکثریت مختلف فرقوں سے تعلق رکھتی ہے جن کے مختلف عقائد ہیں۔یہ کسی ایک حقیقی مذہب کے پیروکار نہیں ہیں۔یہ غیر ملکی حجاج کو عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں اور ان سے برا سلوک کرتے ہیں۔یہ حاجیوں سے ان کا ساز وسامان چھین لیتے ہیں اور واپس پہنچنے تک ان کے پاس کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں رہتا۔اگر صلاح الدین اس علاقے کی صورت حال کو ان کے لیے بہتر بنانے کی کوشش نہ کرتا تو حجاج کے لیے ان لوگوں کے ظلم وستم کبھی ختم نہ ہوتے۔اس نے ان پر لگائے گئے ٹیکس ختم کر دیئے تھے اور امیر مکہ کو روپے پیسے کے ساتھ ساتھ دوسری اشیاء بھی ارسال کرنی شروع کر دی تھیں۔مگر جونہی ان کی ادائیگی میں معمولی سی بھی تاخیر ہو جاتی امیر ان حاجیوں کو ڈرانا شروع کر دیتا اور جو ٹیکس ادا نہ کر سکتے انھیں جیل بھیج دیا جاتا تھا۔

چنانچہ ہم جب جدہ پہنچے تو ہمیں امیر مکہ نے گرفتار کر لیا تھا۔اس سال اس نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ جب تک صلاح الدین کی طرف سے مالی اور اشیاء کی مدد نہیں پہنچتی۔حجاج ایک دوسرے کی ضمانت دیں کہ وہ تھمیں گے۔تب جا کر ہمیں مکہ کی مسجد الحرام میں داخل ہونے کی اجازت ملی تھی۔اگر امداد بروقت پہنچ جاتی تو سارا معاملہ صحیح رہتا ورنہ حاجیوں سے ٹیکس طلب کر لیا جاتا تھا۔وہ اس طرح تقریر کرتا تھا جیسے خدا کے مقدس شہر اس کی وراثت تھے جنھیں وہ حاجیوں کو پٹے پر دینے کا قانونی حق رکھتا تھا۔

صلاح الدین نے امیر مکہ کو دو ہزار دینار نقد اور کافی مقدار میں گندم دی تھی جو بالائی مصر اور یمن کی

اس زمین کے کرائے کے علاوہ تھی جو امیر کو ٹیکس کی جگہ دیا گیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اگر صلاح الدین شام میں صلیبی جنگوں میں مصروف نہ ہوتا تو امیر ایسی حرکت کبھی نہ کرتا۔

سرزمین حجاز کے کچھ حصے کو بزور تلوار صاف کرنے کی ضرورت ہے، جہاں حاجیوں کو لوٹ لیا جاتا ہے اوران کا خون بہانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ اسپین کے جن ججوں نے یہ کہا تھا کہ مسلمانوں کو حج فریضہ نہ ادا کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ انھوں نے اسی سبب سے یہ کہا تھا جو صحیح تھا۔ جو حاجی بھی اس راستے سے آتا اسے ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑتا اور اس کی جان تک خطرے میں ہوتی تھی۔ حالانکہ خدا ان سے کچھ چاہتا تھا جو اس مقام میں اپنا حصہ ڈالنے آتے۔ خدا کا گھر ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں کیسے جا سکتا ہے جو اسے غیر قانونی طور پر استعمال کرتے ہیں، اسے اپنی آمدنی کا ذریعہ بناتے ہیں، اسے جائیداد پر قبضہ کرنے کا ذریعہ بناتے اور حاجیوں کو نظر بند کر کے انھیں تنگ کرتے اور انھیں مفلس ومحتاج بنا دیتے ہیں؟

جدّہ سے مکہ مکرّمہ تک

2 اگست، منگل کی شام ہم جدہ سے روانہ ہوئے۔ ایسا صرف اس وقت ممکن ہوا جب ہر حاجی نے ایک دوسرے کا ٹیکس ادا کرنے کی ضمانت دے دی تھی۔ جدہ کے گورنر نے صرف ان کے نام ریکارڈ کر لئے تھے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں پہنچ کر حجاج ٹھہر جاتے ہیں اور احرام باندھتے ہیں۔ عموماً یہ دن بھر یہاں قیام کرتے اور شام کے وقت پھر چل پڑتے ہیں۔ رات بھر سفر کرنے کے بعد یہ صبح کے وقت مسجد الحرام میں پہنچ جاتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ اس کی حرمت میں اور اضافہ فرمائے۔ واپسی پر بھی حجاج القرائین میں ٹھہرتے ہیں۔ یہاں میٹھے پانی کا کنواں ہے اس لیے حاجیوں کو ایک رات قبل پہاڑوں سے بہہ کر آنے والے پانی کے استعمال کی ضرورت نہیں رہتی۔ مکہ پہنچ کر ہم نے بدھ کا پورا دن وہاں آرام کیا۔ شام ہوتے ہی ہم احرام میں ملبوس عمرہ ادا کرنے نکلے اور رات بھر مذہبی رسوم ادا کرتے رہے۔ چودھویں کا چاند تھا اور چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے رات نے نقاب الٹ دیا ہو۔ ''لبیک اللہم لبیک'' کی آوازیں آرہی تھیں۔ عمرہ ادا کرنے والے اللہ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ یہ رات ان کی زندگی کی بڑی ہی مبارک رات تھی، تمام راتوں میں اسے ایک دلہن اور وقت کی دوشیزہ کی حیثیت حاصل تھی۔

ہم صبح کے وقت مسجد میں پہنچے تھے۔ ہم جب پہاڑی سے نیچے اتر رہے تھے تو اس وقت روشنی پھیلی

چکی تھی۔ ہم نے اپنی نگاہوں کے سامنے حرمِ پاک کو دیکھا جہاں اللہ کے دوست حضرت ابراہیمؑ ٹھہرے تھے اور جہاں انھیں کعبہ ملا تھا' مقدس گھر' حاجیوں سے گھرا ہوا' وہ حاجی جو خدا کے سفیر تھے۔ ہم نے طواف کعبہ کیا تاکہ اپنی آمد پر یہ مذہبی رسم ادا کر سکیں' پھر مقامِ ابراہیم پر نفل ادا کئے۔ ہم نے غلاف کعبہ کو تھام رکھا تھا اور حجر اسود اور دروازے کے درمیان وہاں کھڑے تھے جہاں بتایا جاتا ہے کہ لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ پھر ہم زم زم کے چشمے پر گئے اور پانی پیا جو پیغمبر خدا ﷺ کے ارشاد کے مطابق ہر مرض کا علاج ہے۔ اب ہم نے ''سعی'' کی مذہبی رسم ادا کی جس میں ہمیں صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا تھا۔ آخر میں ہم نے اپنے سر منڈوا لئے تھے اور پاکیزگی کی حالت میں داخل ہو گئے تھے۔

مکہ میں ہم نے ایک گھر میں قیام کیا جو مسجد الحرام سے قریب تھا۔ جو کمرہ ہمیں ملا تھا اس میں بہت سی سہولیات تھیں، اس میں سے ہمیں حرم اور کعبہ نظر آتے تھے۔

مکہ مکرمہ:

ماہِ جمادی الاوّل۔ اگست۔ ستمبر 1183ء۔ اس شہر اور اس کے لوگوں نے زمانہ قدیم سے خدا کے دوست حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں سے فائدہ اٹھایا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہوا:

> ''کیا ہم نے انھیں امن و امان اور حرمت والے حرم میں جگہ نہیں دی؟ جہاں تمام
> چیزوں کے پھل کھچے چلے آتے ہیں'' (القصص۔57 : 28)

مکہ میں اس آیت کا ثبوت نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور یہ تا قیامت ایسا ہی رہے گا کیونکہ دور دراز بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل یہاں پہنچنے کے لیے تڑپتے ہیں۔

جو سڑکیں اور راستے یہاں ہیں وہ ان کے ملنے کے مقام ہیں جن تک اسلام کی روشنی پھیل چکی ہے۔ ہر طرح کی اشیاء ہر جگہ سے یہاں آتی ہیں۔ پھلوں اور دوسری اشیاء کی تجارت کے حوالے سے یہ سب سے زیادہ خوشحال علاقہ ہے۔ گو یہاں حج کے موسم کے علاوہ یہاں کوئی اور خاص تجارت نہیں ہوتی پھر بھی چونکہ لوگ مشرق و مغرب سے یہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہاں ایک ایک روز میں موتی' لعل و گوہر دوسرے قیمتی پتھر' قسم قسم کے عطر' زعفران' انڈین دوائیں اور دوسری اشیاء جو ایتھوپیا' عراق' یمن' خراسان' شمالی افریقہ اور نہ جانے کن دور افتادہ ممالک سے آتی ہیں' یہاں فروخت ہوتی ہیں۔

جہاں تک پھلوں کا تعلق ہے ہمارا خیال تھا کہ دنیا بھر میں اسپین اس لحاظ سے سب سے آگے تھا اور

پھر ہم نے یہاں پہنچتے ہی دیکھا بھی کہ یہاں انجیر' انگور' انار' آڑو' لیموں' ناریل' کھجور' تربوز' کھیرے اور دیگر بہ سی سبزیاں مثلاً بینگن' شلجم' گاجر' گوبھی اور خوشبودار بوٹیاں بک رہی تھیں۔ ہم نے جو بہترین پھل کھائے ان میں تربوز اور بہی شامل تھے۔ سارے پھل ہی عمدہ تھے مگر تربوز خاص طور پر بہت عمدہ اور خوشبو والے تھے۔ اگر کوئی آپ کے پاس تربوز لے کر آ رہا ہوں تو اس کے پہنچنے سے پہلے تربوز کی خوشبو آپ تک پہنچ جاتی ہے اور میٹھا اس قدر ہوتا ہے کہ اس کا جواب نہیں۔ اس کی مٹھاس خالص شہد اور قندی سے کم نہیں ہوتی۔ قاری کو ہو ہے کہ شک گزرے کہ میں مبالغے سے کام لے رہا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ میں جتنا بتا رہا ہوں یہ اس سے زیا میٹھے ہوتے ہیں۔ جہاں تک خالص شہد کا تعلق ہے مکے کا شہد اس قدر عمدہ ہوتا ہے کہ اسے محاوروں میں استعما کیا جانے لگا ہے۔ لوگ اسے ''المسعودی'' کہتے ہیں۔ قسم قسم کے دودھ بہترین کوالٹی کے دستیاب ہیں۔ ان سے تیار کردہ مکھن اور شہد میں بمشکل فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مکہ۔ ماہِ رجب۔ 20 اکتوبر 1183ء

مکہ کے لوگ اس مہینے کو حاجیوں کے آپس میں ملنے کا ایک مبارک موقعہ سمجھتے ہیں۔ یہ ایک طرح مقامی تہوار بن جاتا ہے جو حضرت ﷺ کے دور سے اب تک اسی طرح دیکھا جا رہا ہے۔ اس مہینے میں کم و بیش اتنے ہی لوگ عمرہ ادا کرنے آتے ہیں جتنے حج کے دنوں میں عرفات میں ہوتے ہیں۔ ہمسایہ ممالک کے لو مکہ میں عمرہ ادا کرنے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

چاند کی پہلی تاریخ کی رات کی سرگرمیاں اور ایک روز بعد کی سرگرمیوں کو زبان و بیان کا جامہ پہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس روز بعد از دوپہر مکے کے گلی کوچے ان اونٹوں سے بھر جاتے ہیں جن پر گنبد نما کی ہودے رکھے ہوتے ہیں' ان پر ریشمی کپڑا ڈال دیا جاتا ہے۔ اس بناؤ سنگھار پر ہر اونٹ کا مالک حسب توفی خرچ کرتا ہے مگر ہر ایک اس پر پوری توجہ دیتا ہے کہ کوئی کمی نہ رہ جائے۔ یہ ہجوم کی شکل میں اس مقام کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں جہاں سے عمرے کی ادائیگی کے لیے لوگ مذہبی رسوم ادا کرنا شروع کرتے ہیں۔ اس مق کو تنعیم کہتے ہیں۔ یہ اونٹ اب وادیوں' پہاڑوں میں سے لدے پھندے گزرتے نظر آتے ہیں۔ ان پر بان سوار نہیں ہوتے اور ہودوں کے ریشمی کپڑے بعض اوقات زمین پر لٹک رہے ہوتے ہیں۔ اس شام ا میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس نے عمرہ ادا نہ کیا ہو۔ سڑکوں کے دونوں کناروں پر روشنی کا اہتمام کیا گیا تھا او خواتین کے ہودوں کے آگے آگے مشعلیں روشن تھیں۔ جب ہم تمام مذہبی رسوم ادا کر چکے' کعبہ کے گرد

چکر لگا لیے صفا و مروہ کی سعی مکمل ہو گئی تو ہم نے دیکھا کہ سڑک مشعلوں' لائٹوں سے پوری طرح روشن ہو گئی تھی۔ مرد اور عورتیں اپنے اونٹوں پر رسم ادا کر رہے تھے۔ یہ بے حد خوبصورت منظر تھا۔ لوگ احرام میں تھے اور "لبیک الھم لبیک" کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ پہاڑ ان کا جواب گونج کی شکل میں دے رہے تھے۔ ہر کوئی یوں محسوس کر رہا تھا جیسے یومِ محشر لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ لوگ چیخ رہے تھے' رو رہے تھے' آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے اور اس منظر ماحول کو دیکھ کر دل پگھلے جا رہے تھے۔

جمعہ کے روز سڑک پر ایک روز پہلے کی طرح گھوڑ سواروں اور پیدل چلنے والوں کے ہجوم کی وجہ سے ٹریفک معطل تھی۔ مرد اور عورتیں اس توقع پر جا رہے تھے کہ اللہ انھیں اپنے انعام سے نوازے گا۔ اس سارے سفر میں جب بھی آپس میں ملتے' مصافحہ کرتے' دعائیں مانگتے اور اللہ سے ایک دوسرے کے لیے خطاؤں کی معافی مانگتے خواتین بھی یہی کچھ کرتیں۔ ہر فرد اپنے وطن اور قبیلے کے رواج کے مطابق بہترین لباس پہنے ہوئے تھا۔ مکہ کے لوگ اِس مذہبی تہوار اور خوشی کے دن کے لیے پہلے سے تیاریوں میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ لوگ جمع ہو کر صحت و تندرستی اور شکل و صورت میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس تقریب کو کامیاب بناتے ہیں۔ بازاروں میں رونق بڑھ جاتی ہے' خرید و فروخت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور مہینوں پہلے ریڑھی بان مکہ میں ان چند دنوں کے دوران اپنی اشیاء فروخت کرنے کی تیاریاں ادا کرنے لگتے ہیں۔

یمن کے ایک قبیلے سارُو کے لوگ اس تہوار سے دس روز پہلے یہاں آ جاتے ہیں تاکہ عمرہ بھی ادا کریں اور مکہ کو گندم اور دوسری اشیائے خوردنی' مکھن' شہد' کشمش' بادام اور پھل مہیا کر سکیں۔ اس سال یہ ہزاروں کی تعداد میں آئے۔ ان کے اونٹ سامان سے لدے ہوئے تھے اور یہ بہت سی اشیاء اس مقدس شہر اور ان لوگوں کے لیے جو یہاں آباد ہیں لائے تھے تاکہ ان کے خورد و نوش کا انتظام ہو جائے۔ اس موقع پر اشیائے صرف کی قیمتیں کم ہو جاتی ہیں اور ہر شے وافر مقدار میں دستیاب ہوتی ہے۔ بیشمار لوگ سارو قبیلے سے آئندہ سال بھر کے لیے ضروری اشیاء حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر مکہ کے لوگ ایسا نہ کریں تو ان کے لیے زندگی اجیرن ہو جائے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ سارو قبیلے کے لوگ اپنی اشیاء درہموں اور دیناروں کے عوض نہیں بیچتے بلکہ ان کے بدلے میں کپڑے لے جاتے ہیں۔ مکے کے لوگ ان کے لیے یہ کپڑے مثلاً عبائیں اور شال تیار کرتے ہیں جن میں خواتین کے لیے حجاب' بھاری رضائیاں اور ایسی چیزیں جو بدوؤں کے استعمال میں ہوتی

ہیں'بطور خاص بناتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اگر کبھی سارو قبیلے کے لوگ اس مقدس شہر میں سامان نہ لائیں تو ان کے ہاں یمن میں قحط پڑ جاتا ہے اوران کے ریوڑ مر جاتے ہیں اور جب وہ یہاں آ جائیں تو ان کی زمینیں زیادہ پیداوار دیتی ہیں اوران پر اللہ کی بڑی عنایات ہو جاتی ہیں۔جب مکے آنے کا وقت آتا ہے یا اس وقت اگر اس قبیلے کے مردوں کی تیاری مکمل نہ ہواور وہ سستی کا مظاہرہ کریں تو اُن کی عورتیں سامان جمع کر کے اپنے شوہروں کو گھروں سے چل پڑنے پر مجبور کرتی ہیں ان کی زمینیں زرخیز ہوتی ہیں' جن میں انجیر اور انگور بہت ہوتا ہے۔ وسیع کھیتوں میں فصلیں بڑی پیداوار دیتی ہیں۔سارو قبیلے کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کی خوشحالی کا راز اس بات میں ہے کہ وہ اشیائے خوردونوش لے کر مکّے آتا ہے اور یہ کہ وہ یہ تجارت اہلِ مکہ سے نہیں خدا سے کرتے ہیں۔یہ بھی مکہ کی دیکھ بھال کا اللہ کا اپنا طریقہ ہے۔

مکہ مکرمہ۔ماہِ شعبان۔نومبر' دسمبر 1183ء

شعبان کے وسط میں آنے والی رات کا اہلِ مکہ بے حد احترام کرتے ہیں کیونکہ ایک بہت مقدس روایت اس کے بارے میں ہم تک پہنچی ہے کہ شعبان کی 15 تاریخ سے پہلی رات اس درخت کو جھنجوڑا جاتا ہے جس کے پتوں پر زندہ لوگوں کے نام لکھے ہوئے ہوتے ہیں جو پتے گر جاتے ہیں ان پر تحریر ناموں والے افراد آنے والے برس مر جاتے ہیں۔حدیث میں آتا ہے کہ اس شب اللہ سب سے نچلے عرش پر آ جاتا ہے جہاں سے وہ فانی انسانوں کو پکارتا ہے اور انکے گناہوں کی انھیں معافی دے دیتا ہے۔وہ عمرہ اور طواف کی مقررہ رسوم کی ادائیگی میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں۔وہ انفرادی اور اجتماعی عبادات بھی کرتے ہیں۔اس مہینے کے وسط میں جو اس سال سنیچر کے روز آیا' نمازِ مغرب کے فوراً بعد ہم نے حرم میں ایک بہت بڑا ہجوم دیکھا۔مردوں نے گروہ در گروہ خصوصی نمازیں ادا کرنی شروع کر دی تھیں۔وہ قرآن پاک کے پہلے پارے کی تلاوت کر رہے تھے اور بار بار دہرا رہے تھے کہ ''اللہ ایک ہے''۔ہر نماز کی ایک رکعت میں وہ اللہ کی واحدانیت کا ذکر دس مرتبہ کر رہے تھے یہاں تک کہ وہ رکعت ادا کر چکے تھے۔ہر گروہ نے اپنا ایک امام چن لیا تھا' چٹائیاں بچھا دی گئی تھیں' موم بتیاں اور مشعلیں روشن کر دی گئی تھیں۔اس کے علاوہ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند نے اپنی چاندنی زمین پر بکھیر دی تھی۔چاند کی کرنیں اس حرم میں پھیلی ہوئی تھیں جو اپنی جگہ خود ایک روشنی ہے۔ایک منظر تھا کہ جسے بیان کرنا بس میں نہ ہو ہمارے خوابوں سے ماورا پر شکوہ و پُر جلال و پُر جمال!!

اس رات میرے ہمسفر ساتھی احمد ابن حسن نے ایک حیرت انگیز چیز دیکھی۔ایک ایسا واقعہ جو

ناقابلِ فراموش بن جاتا ہے۔ ہوا یہ کہ رات کے تیسرے پہر اسے تھکن سی محسوس ہوئی زم زم کے کنوئیں کے قریب ایک بنچ پر آرام کے لیے لیٹ گیا۔ یہ بنچ کنویں کے گنبد کو گھیرے ہوئے تھا۔ وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کا چہرہ حجرِ اسود اور کعبہ کے دروازے کی جانب تھا۔ اچانک ایک غیر ملکی مرد آیا اور اس بنچ پر حسن کے سر کی جانب بیٹھ گیا۔ اس نے قرآن پاک کی تلاوت بے حد خوش الحانی کے ساتھ شروع کر دی تھی۔ وہ قرآنی آیات اس قدر خوبصورتی کے ساتھ تلاوت کر رہا تھا کہ ان کا احساس اور معانی روح میں اترتے جا رہے تھے۔ میرے ساتھی نے سونے پر اس آواز سے محظوظ ہونے کو ترجیح دی۔ جذبات اور تڑپ میں ہر لحہ اضافہ ہو رہا تھا اس اجنبی نے تلاوت ختم کرتے ہوئے کہا:

> ''اگر میرے بُرے کاموں نے مجھے آپ سے دور کر دیا تھا تو میرے دیانتدارانہ اور راستبازی پر مشتمل خیالات نے مجھے دوبارہ آپ کے قریب کر دیا ہے''۔

اس شخص نے اپنے الفاظ اس قدر شیرینی اور خوش الحانی کے ساتھ دہرائے کہ جو دلوں کو ہلا دینے والے تھے۔ وہ اپنے الفاظ بار بار دہراتا جاتا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس کی آواز تھر تھرا اٹھی تھی اور مدھم ہو گئی تھی۔ حسن نے ڈر محسوس کیا کہ وہ شخص بے ہوش نہ ہو جائے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ غیر ملکی زمین پر گر گیا' وہ بے حس و حرکت' بے سدھ پڑا تھا۔ اس خوفناک منظر کو دیکھ کر ابن حسن فوراً اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ شخص کچھ فاصلے پر گرا تھا اس لیے ابھی کچھ کہا نہ جا سکتا تھا کہ وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ بنچ زمین سے کافی اونچا تھا۔ ایک اور شخص جو قریب ہی سویا ہوا تھا وہ بھی جاگ گیا تھا۔ اب یہ دونوں حیران تھے اور گرے ہوئے آدمی کے قریب جانے سے خوفزدہ تھے۔ بالآخر ایک غیر ملکی عورت وہاں سے گزری اس نے ان دونوں سے چلا کر کہا: ''کیا آپ لوگ کسی انسان کو اس حالت میں چھوڑ دیتے ہیں جس طرح آپ نے اس گرنے والے شخص کو چھوڑ دیا ہے؟'' وہ دوڑ کر گئی اور کنویں سے پانی لا کر اس شخص کے چہرے پر چھینٹے مارے۔ اب ابن حسن اور دوسرا شخص بھی قریب آیا اور گرنے والے غیر ملکی کو اٹھا کر بٹھا دیا تھا۔ اس نے انھیں دیکھا تو اپنا چہرہ چھپا لیا اور اس ڈر سے کہ یہ اسے بعد میں پہچان نہ لیں وہ محافظین کے گیٹ کی طرف تیزی سے دوڑ کر چلا گیا تھا۔ دونوں آدمی حیرت کی تصویر بنے بیٹھے تھے کہ انھوں نے کیا دیکھا تھا۔ ابن حسن کو جلد ہی یہ افسوس ہوا کہ وہ اس شخص کی دعاؤں سے محروم ہو گیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ساری باتیں اتنی تیزی سے ظہور پذیر ہوئیں کہ اسے کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ وہ اس شخص کا چہرہ بھی بھول گیا تھا۔ غیر ملکی حجاج واقعی اپنے احساسات و جذبات کے حوالے سے اور عبادت کے

لیے اپنی گہری لگن کے لحاظ سے عجیب ہوتے ہیں۔ یہ حسن وخوبصورتی بیشک اللہ کی دین ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔

مکّہ حج کا مہینہ۔ مارچ' اپریل 1184ء

اس ماہ کا نیا چاند جمعرات کی رات نظر آ گیا تھا' عیسوی سال کے لحاظ سے یہ 15 مارچ کا دن تھا۔ یہ تیسرا اسلامی مہینہ ہے اس کے ابتدائی دس دنوں کے دوران لوگ جمع ہوتے اور حج ادا کرتے ہیں۔ یہ حج کا مہینہ ہے جس میں لبیک اللھم لبیک کی آواز گونجتی ہے۔ یہ قربانی کا وقت ہوتا ہے جب اللّٰہ کے سفیر ہر ملک سے یہاں آ کر جمع ہوتے ہیں۔ حجاج کا ہدف اللہ کی رحمت اور اس کی عنایات کا حصول ہوتا ہے۔ میدانِ عرفات میں یہ مہینہ مذہبی لحاظ سے شب بیداری کا مہینہ ہوتا ہے۔

ان دنوں حجاج یمن اور بہت سے دوسرے ممالک سے اس شہر میں آ کر جمع ہو جاتے ہیں' ان کی تعداد اتنی ہوتی ہے کہ اللہ ہی انھیں شمار کر سکتا ہے۔ مکہ ایک وادی میں واقع ہے اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی جہاں تک پہنچ ہوتی ہے اتنی اس کی چوڑائی ہے۔ اس شہر کی وسعت اور لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کو اپنے اندر ٹھہرنے کی گنجائش مہیا کرنا اللّٰہ کے معجزات میں سے ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے میں یہ شہر رحم مادر کی مانند ہے جو معجزانہ طور پر بچے کے لیے اپنے اندر جگہ بناتی ہے۔ اگر یہی اجتماع روئے زمین پر واقع کسی سب سے بڑے شہر میں ہوتا تو وہ شہر انھیں اپنے اندر نہ ٹھہرا سکتا تھا۔

اس مہینے کے شروع ہوتے ہی امیر شہر کے نقارے صبح وشام اور نماز کے اوقات پر بجائے جاتے ہیں تا کہ اس دورانیے کی مذہبی حیثیت کا اظہار کیا جا سکے۔ یہ نقارے اس وقت تک بجتے رہے جب تک ہم عرفات کے میدان میں نہیں پہنچ گئے تھے۔

اس روز دن اور رات بھر لوگ مکہ سے باہر نکلتے رہے۔ جمعہ کے روز ان کا یہی معمول رہا تھا کہ یہ لوگ شہر سے باہر 5 میل کے فاصلے پر اور رات منٰی کے مقام پر رکتے تھے۔ پھر مزید پانچ میل کا سفر طے کر کے وہ مزدلفہ پہنچتے اور 5 میل اور آگے عرفات پہنچ جاتے تھے تا کہ بالآخر یہ سب لوگ عرفات کے میدان میں جمع ہو سکیں۔ مزدلفہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک وادی ہے جس کا نام ہے وادی محصر' یہ منٰی اور مزدلفہ کے درمیان حدّ فاصل بنتی ہے۔ حجاج کو اس میں سے تیز تیز قدموں کے ساتھ گزرنا ہوتا ہے۔ مزدلفہ خود دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع خطہ زمین ہے۔ اس کے گرد پانی کے وہ حوض اور تالاب ہیں جنھیں ملکہ زبیدہ کے عہد

حکومت میں (809-786ء) میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اللہ اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اس میدان کے درمیان میں ایک احاطہ ہے جسے مشعر الحرام (مقدس زیارت) کہتے ہیں۔ اس احاطے کے مرکز میں ایک گول ٹیلہ ہے جس کی چوٹی پر ایک مسجد ہے جس تک دو طرف سے سیڑھیاں جاتی ہیں۔ حجاج اس کے اندر نماز ادا کرنے کے لیے یہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہ لوگ رات مزدلفہ میں گزارتے ہیں۔

عرفات کا میدان بھی بہت وسیع ہے۔ یہ اتنا وسیع و عریض ہے کہ یومِ حشر تمام بنی نوع انسان یہاں جمع ہو سکیں گے۔ اس میدان کے اردگرد بہت سے پہاڑ ہیں۔ اس کے انتہائی مشرق میں جبل الرحمت ہے۔ حاجیوں کی شب بیداری کے لیے چاروں طرف کھلی زمین ہے۔ یہ دوسرے پہاڑوں سے جدا کی گئی میدان کے درمیان میں ابھری ہوئی ہے۔ یہ سنگ خارا کے جدا جدا حصوں سے مل کر بنی ہے اور اس پر چڑھنا مشکل ہے۔ جمال الدین نے (جس کا انتقال 1164ء میں ہوا) جس کی کتابوں کا ذکر پہلے ہی آ چکا ہے' سیڑھیاں چاروں طرف اتنی قریب قریب بنوائی تھیں کہ سامان سے لدے ہوئے جانور آسانی سے اس پر چڑھ سکیں۔ ان کی تعمیر پر بڑی رقم خرچ ہوئی۔ اس کی چوٹی پر ایک گنبد ہے جس کا نام امّ سلمٰی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ گنبد کے نیچے ایک مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ حجاج اس کے اندر نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے گرد ایک مسطح چھت ہے' جو کافی چوڑی ہے جہاں سے عرفات کا میدان نظر آتا ہے۔ جنوبی دیوار پر حاجیوں کے لیے نماز ادا کرنے کی جگہ بنا دی گئی ہے۔ پہاڑ کے دامن میں ایک قدیم مکان ہے جس میں گنبد نما کمرہ اوپر والی منزل پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اسے حضرتِ آدمؑ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے بائیں طرف مکہ کے رخ وہ چٹان ہے جس کے قریب پیغمبر خدا ﷺ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑے ہوتے تھے۔ اس پہاڑ اور گھر کے گرد بہت سے کنویں اور حوض ہیں۔ مکان کے بائیں طرف ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ وہ سنگ میل جو مقدس علاقے کی نشاندہی کرتے ہیں ان کے قریب ایک بہت بڑی مسجد کے کھنڈرات ہیں۔ اس مسجد کی جنوبی دیوار کا نام حضرت ابراہیمؑ کے نام پر رکھا گیا ہے جو اب تک موجود ہے۔ شب بیداری کے دن امام یہاں وعظ کرتے ہیں۔ پھر وہ ظہر اور عصر کی نماز پڑھاتے ہیں۔ مکہ کے رخ ان سنگ میل کے بائیں جانب وادی شجر خاردار ہے جس کے سبز نوک دار حصے میدان کے پار تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اگلی صبح حاجیوں کے ایک بہت بڑے ہجوم نے میدان کو بھر دیا تھا۔ اتنا بڑا ہجوم آج تک کسی نے نہ دیکھا تھا۔ چند ایسے حجاج نے جن کا تعلق عذلیہ سے تھا' اور جو مکہ میں مقیم تھے' بتایا کہ انھوں نے بلا مبالغہ اتنا بڑا

ہجوم اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہارون الرشید' جو حج ادا کرنے والے آخری خلیفہ تھے' کے عہد سے لے کر اب تک مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد حج کی ادائیگی کے لیے نہیں آئی تھی۔ اللہ انھیں اپنی حفظ و اماں میں رکھے اور ان پر رحم فرمائے کی آواز ہوا میں بلند ہو رہی تھی۔ گریہ وزاری' توبہ استغفار میں آج کے دن کی مثال نہیں مل سکتی تھی' جب اللہ کے حضور سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ حجاج اس راستے پر رواں دواں تھے جب سورج کی تمازت سے ان کے چہرے جھلسے جا رہے تھے یہاں تک کہ نمازِ مغرب کا وقت آن پہنچا تھا۔

امیر حج بھی اس اثنا میں پہنچ گئے تھے جن کے ہمراہ بہت سے مسلح سپاہی تھے۔ ان سپاہیوں نے چھوٹی سی مسجد کے قریب چٹانوں پر مورچہ سنبھال لیا تھا۔ سارو قبائل نے جو یمن سے آئے ہوئے تھے جبل الرحمت پر مقررہ چوکیاں سنبھال لی تھیں۔ یہ وہ چوکیاں تھیں جو انھیں آنحضورؐ کے عہد سے ورثے میں ملی تھیں۔ کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلے کی چوکیوں پر زبردستی قبضہ نہ کر سکتا تھا۔ امیر عراق بھی بہت بڑے ہجوم سمیت آ گئے تھے۔ ان کے ہمراہ خراسان کی معزز شخصیات' شہزادیاں اور دیگر بہت سی خواتین بھی تھیں۔ امراء کی اپنی بیٹیاں بھی ساتھ آئی تھیں۔ لوگوں کا یہ جمِ غفیر اچھا لگ رہا تھا' خوبصورت خیمے اور سائبان نصب کیے گئے تھے۔ سب سے زیادہ خوبصورت کیمپ امیر کا تھا جو لنن کے پردوں سے گھرا ہوا تھا اس کے اندر خیمے نصب کیے گئے تھے' سیاہ اور سفید رنگ کے جن کا پس منظر سفید تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی صحنِ چمن میں رنگ برنگے پھول بہار دکھا رہے ہوں۔ لنن کے پردوں پر ڈھالیں رنگوں سے بنائی گئی تھیں جو اس قدر اصلی لگتی تھیں کہ پاس سے گزرنے والوں کو یہ گمان گزرتا جیسے یہ گھوڑوں پر سوار بہادر اور جری نوجوانوں کے ہاتھ میں سچ مچ کی ڈھالیں ہوں۔ ان پردوں کو اونچے دروازوں سے چھید دیا گیا تھا' جو کسی محل کے دروازے لگتے تھے۔ ان میں سے گزرنے والا ہال کمروں کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا تھا۔ اس سے آگے خیمے اور سائبان کھلی زمین پر نصب تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے امیر کسی فصیل والے شہر کے اندر رہتا تھا جو اس کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا تھا اور جب وہ رک جاتا تو پورا شہر ساکن ہو جاتا تھا۔ شاہی شان و شوکت کا ایسا منظر مغربی بادشاہوں کے ہاں بھی نہ دیکھا گیا ہوگا۔ دروازوں کے پار امیر کے خدام' نوکر چاکر اور دوسرے پیروکار اور کارندے تھے۔ دروازے اتنے اونچے رکھے گئے تھے کہ ایک گھوڑسوار علَم سمیت سر جھکائے بغیر ان میں سے گزر سکتا تھا۔ اس ساری تعمیر کو بڑی خوش اسلوبی سے ترتیب دی گئی ہے اور اسے ریشمی رسیوں اور چوبی

کھونٹیوں سے زمین پر مضبوطی کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا تھا۔ دوسرے امیر جن کے کیمپ چھوٹے تھے مگر ان کی کروفر بھی ایسی ہی تھی۔ ان کے شاندار سائبان تھے جو بڑے بڑے تاجوں سے مشابہ تھے۔ سازوسامان دیکھ کر ان امراء کی دولت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

ان کیمپوں میں رہنے والے اونٹ پر سفر کرتے ہیں تو ان کے لکڑی کے ہودوں کے اوپر شامیانوں کا سایہ ہوتا ہے جن کے نیچے یہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ ہودے جھولوں کی طرح ہوتے ہیں اور سفر کرنے والے ان میں اس طرح سوار ہوتے ہیں جس طرح کوئی بچہ پلنگ پر بیٹھتا ہے۔ سفر کرنے والے کے منہ کی طرف منہ کر کے دوسرے نصف ہودے ہیں۔ اس کا دوسرا ساتھی مرد یا عورت سوار ہوتی ہے اور ان کے سروں کے اوپر شامیانہ ہوتا ہے جو ان کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ سفر جاری رکھتے ہیں انھیں راستے میں کوئی پریشان نہیں کرتا۔ یہ یا تو سوتے ہوئے سفر کرتے ہیں یا قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف رہتے ہیں یا دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو شطرنج کھیل کر وقت گزارتے ہیں۔ جب یہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں اور شامیانے اپنی اپنی جگہ نصب کر دیئے جاتے ہیں تو یہ اونٹوں سے اترے بغیر شامیانے کی چھتری کے سایے تلے سے باہر نکل آتے ہیں۔ خیمہ انھیں مل جاتا ہے اور حجاج غروب آفتاب کے بعد عرفات سے چل پڑتے ہیں۔ حجاج غروب آفتاب کے بعد شامیانے سے نکل کر کمروں پر مشتمل رہائش میں آجاتے ہیں۔ مسجد میں روشنی کر دی گئی تھی۔ جبل الرحمت میں بھی یہی کچھ پیش آیا۔ خراسان سے آئے ہوئے لوگ اور کچھ غیر ملکی باشندوں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ان مزارات پر زیادہ سے زیادہ موم بتیاں لائیں گے۔ ان کے قیام کے دوران مسجد الحرام ویسی ہی نظر آتی تھی کیونکہ ہر مرتبہ جب یہ اس میں داخل ہوتے تو اپنے ہاتھ میں ایک موم بتی لے کر داخل ہوتے۔ ہمیں ایک بڑی مشعل نظر آئی۔ یہ ایک صنوبر کے درخت کا سائز تھا، جسے انھوں نے حنفی امام کے سامنے بنایا تھا کیونکہ عراقیوں کی اکثریت اس روایت کی تقلید کرتی ہے۔

اس شب حجاج مزدلفہ میں ٹھہرے تھے۔ یہاں ان میں سے زیادہ لوگوں نے کنکریاں جمع کر لی تھیں تاکہ آئندہ تین روز میں وہ یہ کنکریاں جمارت کے ستونوں کو مار سکیں۔ (ان کنکریوں کو یہاں جمع کرنے کی روایت زیادہ مقبول ہے حالانکہ دوسرے حجاج انھیں منیٰ میں مسجد خیف کے گرد سے جمع کرتے ہیں) تہجد پڑھ کر یہ منیٰ کی طرف چل پڑے تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد انھوں نے جلدی جلدی پہلی سات کنکریاں سب سے

بڑے ستون پر پھینکیں۔ پھر انھوں نے قربانی کا جانور ذبح کیا۔ اس کے بعد حج کے قوانین کے مطابق یہ اب آزاد تھے کہ زندگی کے عام معمولات کی طرف لوٹ آتے۔ تاہم مباشرت کی اجازت نہ تھی نہ ہی خوشبو لگائی جا سکتی تھی۔ یہ دو کام وہ مکہ پہنچ کر طواف کعبہ کے بعد کر سکتے تھے۔ زیادہ لوگوں نے قربانی کے دن سورج نکلنے پر سب سے بڑے ستون کو کنکریاں ماریں تھیں۔ پھر یہ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے تھے تا کہ طواف کعبہ کر سکیں۔ کچھ اگلے روز تک ٹھہر گئے تھے اور مزید کچھ نے تیسرے روز تک یہاں قیام رکھا۔ تیسرا روز ہی سرکاری طور پر شہر کو واپسی کا دن تھا۔ قربانی کے بعد جب سورج غروب ہونے والا ہو اس وقت حجاج تینوں ستونوں پر کنکریاں پھینکتے ہیں۔ پہلے دو مقامات پر وہ دعا مانگتے جاتے ہیں۔ یہ سب سنتِ رسول مقبول ﷺ پوری کرتے ہیں۔ اللہ کی ان پر رحمت ہو اور اللہ ان کا نگہبان ہو۔ ان دو ایام میں بڑے ستون کو آخر میں کنکریاں ماری جاتی ہیں مگر قربانی کے دن یہ پہلا اور واحد ستون ہوتا ہے جس پر کنکریاں پھینکی جاتی ہیں۔

سنیچر کو قربانی کے دن کسوئی یا غلاف کعبہ کو چار اونٹوں پر لاد کر امیر عراق کے کیمپ سے مکہ لایا گیا تھا۔ شہر کا نیا مقرر کیے جانے والا جج اس کے آگے آگے چل رہا تھا اس نے وہ سیاہ جُبہ پہن رکھا تھا جو اسے خلیفہ نے عطا کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پرچم اور خانہ خدا کے سرپرست اور محافظ پوری عمارت کو اس سے آراستہ کر رہے تھے۔ اس کا خوبصورت گہرا سبز رنگ آنکھوں کو چکا چوند کر رہا تھا۔ اس کے اوپر والے حصے میں سرخ رنگ کا فیتہ چاروں طرف لگا ہوا تھا۔ وہ حصہ جو سامنے کی طرف سے مقامِ ابراہیم کی سمت میں تھا' وہ سمت جس کے اندر دروازہ ہے اس طرف فیتے پر لفظ بسم اللہ لکھا ہوا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہی ہے جو مکہ میں ہے' جو تمام دنیا کے لیے برکت و ہدایت والا ہے'' (آلِ عمران۔ (3:96

دوسری طرف خلیفہ کا نام اور اس کے لیے کچھ دعائیں لکھی ہوئی تھیں۔ سرخ فیتے کے گرد دوسرخی مائل حصے ایسے تھے جہاں چھوٹی سفید رنگ کی ٹکیاں بنی ہوئی تھیں جن پر قرآنی آیات اور خلیفہ کے دیگر حوالے لکھے ہوئے تھے۔ جب کعبہ کو غلاف سے پوری طرح ڈھانپ دیا گیا تو پھر غلاف کعبہ کی جھالر کو ٹانگ دیا گیا تھا تا کہ اسے حاجیوں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔ ایسا اس لیے ضروری تھا کیونکہ یہ حجاج کرام غلاف کعبہ کو پورے زور سے کھینچتے ہیں اور جذبات سے مغلوب ہو کر اس پر گر جاتے ہیں۔ اس وقت خانہ خدا کا منظر بے حد خوبصورت تھا' جیسے کوئی حجاب میں ایسی دلہن ہو جس نے بہترین سبز ریشمی کمخواب کا لباس پہن رکھا ہو۔ میری

ولی دعا ہے کہ جس کسی مسلمان کے دل میں بھی اسے دیکھنے کی آرزو ہو اللہ اسے پورا کر دے اور اسے زیارت کعبہ نصیب فرمائے۔

جمعرات کی شب جب 15 تاریخ ہو گئی تھی' نمازِ عشاء کے بعد مقامِ ابراہیم کے سامنے منبر لا کر رکھ دیا گیا اور خراسان کے ایک مبلّغ جو بے حد خوش شکل تھے اور جن کے نورانی چہرے کو نظر بھر کر دیکھا نہ جا سکتا تھا منبر پر آئے اور عربی' فارسی زبانوں میں بڑی روانی اور فصاحت سے تقریر فرمائی۔ جب وہ فارسی بولنے والوں سے مخاطب ہوتے تو انھیں اس قدر جذباتی کر دیتے کہ وہ کانپنے لگتے اور آہوں سسکیوں سے پگھلے جاتے تھے۔ اگلی شام منبر حنفی حصے کے سامنے رکھا گیا تھا۔ نمازِ مغرب کے بعد ایک باوقار شیخ جن کی سفید مونچھیں تھیں منبر پر آئے۔ انھوں نے بے حد خوبصورت وعظ فرمایا۔ انھوں نے قرآن پاک کی 2:256 آیت کا حوالہ دیا:

> ''دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں' ہدایت' ضلالت سے روشن ہو چکی ہے اس لیے جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ سننے والا' جاننے والا ہے'' (البقرۃ۔ 2:256)۔

وہ بھی دونوں زبانوں میں وعظ فرما رہے تھے اور علم کی ہر شاخ کو اپنی گفتگو کا حصہ بنایا تھا۔ پھر جب وہ انھیں بے حد جذباتی کر چکے تو سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ سوالات تھے کہ تیروں کی مانند آ رہے تھے اور جوابات' بہت مفصل تھے جو وجد میں لانے کے لیے کافی ہوں۔ مجھے تو یوں لگا جیسے یہ کوئی الہامی گفتگو ہو۔ سامعین میں سے کبھی کبھی چند ایک نے ان مبلغین کو اپنے سوالات کے ذریعے موضوع سے ہٹانے کی بھی کوشش کی مگر ان کے جوابات بجلی کے کوندے سے بھی تیز تر تھے...... عظمت و فضیلت' عزت و احترام اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے چاہے عطا کر دے۔ قرآن پاک کی تلاوت کرنے والے مبلغین کے سامنے کھڑے تھے' وہ قرآن کی تلاوت جس لحن کے ساتھ کر رہے تھے وہ حضرت داؤدؑ پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب زبور کے مقدس گیتوں کی مانند چٹانوں تک کو پگھلا سکتی تھی۔ اس اجتماع میں موجود لوگ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کس کی زیادہ تعریف کریں' مبلغین کی یا قرات کرنے والوں کی۔ پیغمبر خدا ﷺ کے بارے میں بیان کیے گئے ایک قصے کو یقین اور عقیدے کی پختگی عطا کرنے کے لیے مذکورہ بالا شیخ نے اپنے آباؤ اجداد میں سے کیے

بعد دیگرے پانچ نام گنوائے جن کا شمار شیخ کے والد محترم سے پیچھے کی طرف ہوتا تھا ان میں سے ہر نام ایک بڑا نام تھا' جس کا شمار عالمی شہرت کے مالک سکالرز میں ہوتا تھا اور جو علم کے محافظوں میں سے تھا۔ وہ اس عزت و عظمت کا ذکر فرما رہے تھے جو موروثی ہوتی ہے۔

اس حرمت والے شہر میں ہمارا قیام 4 اگست 1183ء سے 5 اپریل 1184ء تک رہا۔ یہ کل سوا آٹھ قمری مہینے بنتے تھے یا 245 متبرک' فیض رسانی کے ایام۔ اس عرصے میں کعبہ صرف تین روز ہماری نظروں سے اوجھل رہا۔ کاش اللہ میری یہ دُعا قبول فرمالے کہ اس مقدس سرزمین پر میری موجودہ آمد آخری نہ ہو...... پھر یہاں سے بلاوا آئے اور میں "لبیک اللھم لبیک" کہتا حاضر ہو جاؤں۔

☆☆☆

3۔ابن بطوطہ...... مراکش

(1326ء)

ابن بطوطہ ایک ایسا سیاح تھا جس سے پہلے کسی ادیب نے اتنا طویل سفرنامہ کیا تھا۔ اُسے بلا شبہ دورِ وسطیٰ کا وہ عظیم سیاح تصور کیا جاتا ہے جس نے سب سے زیادہ بحری سفر کیا۔ وہ مراکش سے حج ادا کرنے مکہ کے لیے روانہ ہوا تھا۔ پھر وہ بیس برس تک مشرق کا سفر کرتا رہا۔ وطن واپس لوٹنے سے قبل اس نے شمالی افریقا سے چین تک زیادہ تر جانی پہچانی دنیا دیکھ لی تھی۔ واپسی کے بعد اس نے یک نوجوان محرر کو اپنی کتاب املا کروائی شروع کی۔ وہ خسرو کی طرح سفرنامے کو تصویریہ بنانے والا نہ تھا نہ ابن جُبیر کی مانند گنجلک بنا کر پیش کرنے والا۔ ابن بطوطہ فطرت کی طاقت تھا' اختلاف پیدا کرنے والا' اپنی رائے رکھنے والا' افسانہ طراز' دوررس نظر رکھنے والا' معاملات کو تیزی سے سمجھنے والا اور بنی نوع انسان کا زیرک مشاہد تھا۔ اس نے مارکوپولو کی نسبت سفر بھی زیادہ کیا اور لکھا بھی زیادہ۔ اس کی کتاب' جس کی ضخامت ہزار صفحات سے زیادہ ہے' بڑی واضح تفصیلات اور مہمات کا ذکر لیے ہوئے ہے۔ یہ عربی میں سب سے زیادہ گنجلک سفرنامہ ہے جس میں عہدِ وسطیٰ زندہ رہے گا۔

ابن بطوطہ 1303ء یا 1304ء میں وکلاء کے ایک خاندان میں طنجہ' مراکش میں پیدا ہوا تھا جو مسلم اسپین سے آبنائے کے دوسرے کنارے آباد ہے۔ جوانی میں اس نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور پھر 1325ء میں تنہا مکہ کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ اس نے شمالی افریقا کو آہستہ آہستہ گھوڑے' لدو' گدھے اور اونٹ پر عبور کیا۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ خشکی کے راستوں سے سفر کر رہا تھا۔ اس سفر میں وہ ہمیشہ اجنبیوں کے ہمراہ رہا۔ لیبیا میں وہ حجاج کے ایک سالانہ قافلے میں شامل ہو گیا تھا۔ مصر' فلسطین اور شام سے گزر کر اس نے 1326ء میں اپنا پہلا حج ادا کیا۔ اس وقت اس کی عمر 23 برس تھی۔ غالباً وطن سے روانہ ہوتے وقت اس کا ارادہ یہ تھا کہ حج سے واپسی پر وہ ترکی کے سلطان کے دربار میں ملازمت اختیار کر لے گا۔ مگر سفر کے دوران یہ

پروگرام تبدیل ہو گیا تھا۔ اُسے سیر و سیاحت کا اس قدر شوق تھا کہ مستقبل میں اس بارے میں مواقع کی توقع کے ساتھ وہ سفر کو جاری رکھتا تھا۔ مدینہ طیبہ سے وہ میسو پوٹیمیا اور فارس پہنچا۔ پھر دوبارہ مکہ واپس آیا اور وہاں ایک برس تک مقیم رہا۔ اب اس کی منزل افریقا پھر خلیج فارس تھی۔ اس نے دوبارہ حج ادا کیا اور غالباً 1332ء میں وہ انڈیا کی طرف نکل پڑا تھا۔ اس نے شام اور ایشیائے کوچک کا طویل راستہ اختیار کیا اور یوں قسطنطنیہ اور ایشیائی مسطح میدانوں میں پہنچ گیا تھا۔ انڈیا میں وہ کم و بیش آٹھ برس رہا اور دہلی میں اُس نے جج کے عہدے تک ترقی کر لی تھی۔ پھر اسے چین کے منگول بادشاہ کے دربار میں سفیر مقرر کر دیا گیا تھا۔ ایک بحری جہاز کی تباہی کے بعد اور سیلون اور جزائر مالدیپ میں کئی برس زندگی گزارنے کے بعد وہ مشرق کی سمت روانہ ہوا اور نیپال، برما، ساٹرا اور غالباً چین گیا۔

1347ء مغرب کی طرف واپسی پر ابنِ بطوطہ مکہ میں آخری بار ٹھہرا۔ وہ 1350ء کے اوائل میں اپنی جنم بھومی طنجہ پہنچ گیا تھا۔ تین برس بعد ترکی کے سلطان نے اسے مہمات جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ اس وقت تک ابن بطوطہ 25 برس سفر میں گزار چکا تھا اور اس دوران وہ 50 جدید ممالک دیکھ چکا تھا۔ اس سارے سفر کی مسافت پچھتر (75) ہزار میل بنتی تھی۔ وہ لکھتا ہے:

''میری انتہائی آرزو یہ تھی کہ میں دنیا بھر کا سفر کروں اور آج میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری یہ آرزو پوری ہو گئی ہے اور میرے علم کے مطابق کسی دوسرے شخص کے نصیب میں یہ بات نہ تھی''۔

ابن بطوطہ کے بیرونی ممالک کے تجربات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ایک ایسی واحد ثقافت ہے جس کے درمیان رابطہ ہے اور جو بحرِ اوقیانوس سے جنوبی چینی سمندر تک پھیلی ہوئی ہے۔ مشرق و مغرب کے چند ایسے تجارتی راستے بھی نہ تھے جن پر مراعات یافتہ سرکاری شخصیات سفر کرتی ہوں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پوری دنیا ایک میدان ہے اور افریقا، ایشیا، یورپ کے خطوں سے لوگ جو پیشہ ور تاجر تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کر کے جاتے اور جہاں جی چاہتا مستقل رہائش اختیار کر لیتے تھے۔ اس سارے معاشرتی ماحول میں ابن بطوطہ بے مثال نہ تھا...... وہ نمائندہ تھا۔ اس کے عہد کے راستے، شاہراہیں ایسی تھیں جن پر صوبائی سکالرز، قانون دان، اساتذہ، تاجر زمین کے ہر کونے سے سفر پر رہتے تھے۔ ان کا تعلق زیادہ تر شمالی افریقہ، مصر، فارس، ہندوستان اور انڈونیشیا سے ہوتا تھا۔ اس تجارتی جال سے نہ صرف مسلمان بلکہ عیسائی اور یہودی بھی فائدہ

اٹھاتے تھے۔ یہ ان راستوں پر سفر کرتے تھے جن پر متحرک پیشہ وروں کی ایک بہت بڑی جماعت کو حقیقی مدد فراہم کی جاتی تھی۔ ابن بطوطہ ان کے ہمراہ سفر کرتا تھا۔ وہ سفر بھی کرتا اور کام بھی کرتا جاتا تھا۔ وہ جدید آزاد مارکیٹ سرمایہ داری کے سماجی بہاؤ کو بھی قلمبند کرتا جاتا تھا۔ اسے سلیکون وادی میں بنگلہ دیشی کام کرتے ملے' ایرانی خاندان جاپان میں خوشحال زندگی گزار رہے تھے' جس سے ابن بطوطہ کو حیرت بالکل نہیں ہوئی۔ چودھویں صدی کے دمشق میں' وہ ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اگر کوئی مراکشی کسی مالی مشکل میں پھنس جائے تو وہ زادِ راہ کے لیے یہاں کام کر کے اس مشکل سے نکل سکتا ہے۔ وہ خود جب وہاں بیمار پڑ گیا اور اس کا ہاتھ تنگ ہو گیا تو لکڑی کا کام کرنیوالے مربی اور سرپرست سامنے آئے۔ بعدازاں ہندوستان میں جب وہ دہلی میں تھا تو اسے وہاں دنیا بھر کے قانون دان ملے جو اس شہر میں سلطان کے دربار میں کام کر رہے تھے اور انھیں معقول معاوضہ ادا کیا جاتا تھا اور طبقہ امراء میں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ کچھ اور عرصہ گزرا تو ابن بطوطہ جب چین میں ہانگ چاؤ کے خوشحال مصریوں کا مہمان بنا تھا۔ ان کی وساطت سے اس کی ملاقات گردونواح کے ان مسلمانوں سے ہوئی جو اس کے ہم وطن تھے اور طنجہ میں اسی گلی میں بھی رہتے تھے جس میں یہ رہتا تھا۔

ابن بطوطہ کے سفرنامے کی خوبی یہ ہے کہ وہ کہیں بھی اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتا اور سماجی مواقع بھی حاصل ہوتے تھے۔ جن دروازوں سے ابن بطوطہ گزرا تھا کوئی غیر مسلم مصنف ہوتا تو ان میں سے زیادہ دروازوں سے پہلے ہی بہت دور رک جاتا۔ بہت سے مسلمان تاجر بھی ایسے تھے جن کو متمول اور بڑے خاندانوں کی سرپرستی حاصل نہ تھی۔ ابن بطوطہ میں کوئی مقناطیسی قوت ایسی تھی جو اسے بڑی بڑی جگہوں پر متعارف کرانے کے لیے کافی تھی' جس میں علم قانون اور نظریہ تصوف سرفہرست تھے۔ اس خصوصی علمی قابلیت اور اسلامی اقدار نے سے عزت بخشی تھی۔ اس سے اس کا ہزاروں میلوں کا سفر آسان ہو جاتا تھا اور اکثر و بیشتر اسے اس کا مالی فائدہ بھی پہنچتا جب اُسے شاہی درباروں میں ملازمت مل جاتی یا راستے میں مختلف شہروں میں اسے بڑے بڑے لوگوں کی میزبانی حاصل ہو جاتی تھی۔

ابن بطوطہ کا سفرنامہ ہمیں چودھویں صدی کے درباروں کی زندگی کی تفصیلات فراہم کرتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ مسلم ایشیاء کے گلی کوچوں سے بھی متعارف کراتا ہے۔ بطور مصنف کے اس نے نہایت غیر اہم مناظر کو بھی اپنے سفرنامے کے صفحات کی زینت بنایا ہے۔ مثال کے طور پر دمشق کی گلیوں میں اسے ایک ایسا لڑکا نظر آیا جس نے پلیٹ توڑ دی تھی۔ ابن بطوطہ نے اس چھوٹے سے واقعہ پر بھی روشنی ڈال کر اس شہر کی

سماجی زندگی کی روایات کو اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ ہیروڈوٹس کی طرح وہ بھی سود مند گپ شپ لگاتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو مسجد اور دربار کی سازشوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ وہ مقامی اہم شخصیات اور معززین شہر سے اپنی مفاہمت کا ذکر بھی کرتا ہے۔ یہ سب کچھ وہ اس لیے کرتا ہے تاکہ اپنے ریکارڈ کو زیادہ سے زیادہ اہم اور قیمتی بنا سکے۔ اس مقصد کے لیے وہ کسی بھی موضوع پر بات چیت کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس میں دہلی میں دربار کے نظام سے لے کر جزائر مالدیپ کے رہنے والوں کی جنسی رسوم تک کا ذکر شامل ہے۔

ابن بطوطہ نے جس دنیا کا سفر کیا' اُس نے اسے ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ سماجی طور پر وہ تبدیلی کو کافی حد تک قبول کر لیتا تھا اور مذہبی لحاظ سے وہ پر استقلال تھا۔ وہ متصوفانہ رمزیت اور سُنی کٹرپن کے درمیان کبھی کبھی حریف بن جاتا تھا۔ وہ بیک وقت مسلم قانون کا معاوضے پر کام کرنے والا عالم بھی تھا اور تصوف کے کئی سلاسل کا ماننے والا بھی تھا اسکا ان میں سے کسی بھی سلسلے کے لیے معذرت خواہانہ رویہ نہ تھا۔ شمالی افریقا میں کئی بار اسے جب کسی صوفی کا آستانہ یا ٹھکانہ ملاتو اس نے ایک لمحے میں سڑک چھوڑ کر اس طرف کا رُخ کر لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ دن بھر گھوڑے کی سواری کے بعد کسی مشہور بزرگ یا استاد کی خدمت میں پہنچتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس طرح کے سفر روحانی سرمایے میں اضافہ کرتے ہیں۔ بیشک مغرب کے حج کے راستے بڑے پر پیچ ہیں اور جدید دور کا مسافر انھیں دیکھ کر حیران رہ جائے۔ ابن بطوطہ کے حوالے سے اس کے سفر کے متبادل راستوں نے ایک غیر یقینی کے شکار نوجوان کو اپنی دور افتادہ منازل کو تحریر میں لانے میں مدد کی۔ مغربی سکلرز اکثر اس بات کو نظرانداز کر جاتے ہیں کہ پوری مسلم دنیا میں یہ روحانی معاشروں کے درمیان ایک ایسی قوت ہے جو انھیں آپس میں جوڑتی ہے۔ ابن بطوطہ اسے ہر جگہ قابل عمل دکھاتا ہے۔

قانون دان' ایک عام صوفی' سیاح جج' سکالر' درباری اور کبھی کبھی ایک جاسوس یہ بھی رُوپ ابن بطوطہ کے روپ تھے۔ اس کی پیشہ ورانہ زندگی نے اپنے عہد کے ہر سماجی مقام کو چھوا۔ وہ نصر خسرو اور ابن جبیر کی طرح ایک کامیاب سرکاری افسر نہ تھا۔ اس نے درمیانی عمر میں درباری کا لباس اُتار کر مکے کا رُخ کیا تھا۔ اس کے اپنے وسائل ایسے نہ تھے جن پر وہ انحصار کر سکتا۔ مکہ پہنچنے سے قبل ایک بار وہ مالی بحران کا شکار ہو گیا تھا۔ وہاں اور دمشق میں اس نے بڑی مختصر سی مدت میں ڈپلومے حاصل کر لیے تھے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اسے

ہ میں مسلسل کام کرنا ہوگا۔ یوں لگتا ہے جیسے چودھویں صدی کا مکہ اس طرح کے نوآموز قانون دانوں کے لیے ایک ایسا مدرسہ تھا جو انھیں مستقبل کے لیے تیار کردے۔ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں ایسے لوگوں سے رابطہ کیا جا سکتا تھا جو آئندہ کام دے سکتے ہوں اور روزی کمانے کے لیے یہاں اپنی علمی استعداد بڑھائی جا سکتی تھی۔ تمام بڑے اسلامی مکاتب فکر کے یہاں مدارس موجود تھے جہاں ایسے بااثر سکالرز تھے جو دنیا بھر کے طلبہ کو پڑھاتے تھے۔ ان نوجوان باصلاحیت افراد کے لیے مکہ ایک بااثر مرکز کی حیثیت رکھتا تھا' یہ ان کے لیے ایسا مقام نہیں تھا جہاں سے سفر کا آغاز کیا جا رہا ہو۔

نصر خسرو کے لیے حج ایک ایسا پن دھارا تھا جس تجربے سے گزرنے کے بعد انسان میں نمایاں تبدیلی آ جاتی ہے۔ ابن جبیر کا خیال تھا کہ حج عقیدت کا سفر ہے۔ ہر دو حوالوں سے راستہ مدور اور چکردار ہے۔ حج کے بعد یہ دونوں حضرات وطن واپس لوٹ آئے تھے۔ ابن بطوطہ کے لیے مکہ ایک طویل سفر کے پہلے قدم کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا حج ایک ایسا عمل انگیز واقعہ تھا جس نے اسے دنیا بھر کا سفر کرنے والا بنا دیا تھا۔ اس دور میں اس کی ملاقاتوں اور دوستی نے اس کی آنکھیں ایک ایسے خطے کی جانب کھول دی تھیں جو مشرق بعید میں واقع تھا اور جہاں اس کے لیے بڑے مواقع منتظر تھے۔ حضرت محمد ﷺ کی ایک مشہور حدیث مبارکہ ہے کہ "علم حاصل کرو خواہ تمہیں (اس کے لیے) چین تک جانا پڑے"۔ ابن بطوطہ نے اس پر مکمل یقین کر کے عملاً ایسا کر دکھایا تھا۔ مکہ سے آنے کے بعد اس نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا 1328ء میں وہاں ایک سال گزارنے کے بعد اس نے یہ عہد کیا کہ وہ جہاں تک ممکن ہو سکا ایک ہی راستے پر دوسری بار سفر نہ کرے گا۔ وہ ہندوستان کے لیے ترکی اور روس کے طویل راستے سے روانہ ہوا۔

ابن بطوطہ نے مارکو پولو کے انتقال کے ایک سال بعد اپنی سیاحت کا آغاز کیا۔ مارکو پولو نے دنیا کے زیادہ ممالک دیکھے اور نسبتاً سفر بھی زیادہ کیا مگر دونوں سیاحوں کے سفرناموں میں سوال فاصلے یا مدت کے کم یا زیادہ ہونے کا نہیں ہے بلکہ نقطہ نظر کی بات زیادہ اہم ہے۔ مارکو پولو ہمیشہ باہر کی دنیا میں سفر کرتا رہا جبکہ ابن بطوطہ نے اپنے سفر کو اسلام کی سرحدوں کے اندر تک محدود رکھا۔ طنجہ اور دہلی کے درمیان موسیقی اور لباس درجن بھر تبدیل ہوئے مگر نظام تقویم اور آداب مجلس کم و بیش ایک جیسے رہے یہاں تک کہ کنٹین میں بھی مسلمان پنج وقتی نماز ادا کرتے ہیں۔ سال میں مقررہ مہینے میں ایک ماہ کے روزے رکھتے ہیں۔ ابن بطوطہ کو ہمیشہ گارڈ جاتا تھا کیونکہ عالمی سطح پر اسلام اس کے لیے ایک نیٹ ورک مہیا کرتا ہے۔ وہ بعض اوقات برسوں مکہ

دمشق' بغداد اور دہلی میں مقیم رہا' چھ شادیاں کیں' بچے ہوئے' ملازمت کی اور روزی کمائی اور کئی بار م... عہدوں پر فائز رہا جو مسلمان تھے اور عربی بولتے تھے' ان کی ثقافت ایک تھی' ان کا کھانا پینا' غسل کرنا' م... انصاف اور خیالات ایک جیسے تھے۔ مارکو پولو ہمیشہ پردیسی اور اجنبی رہا مگر ابن بطوطہ تمام دنیا کے سفر میں ... محسوس کرتا رہا جیسے وہ اپنے گھر میں ہے۔

جب 1353ء میں ابن بطوطہ ترکی میں قیام پذیر ہوا تو سلطان ابوعنان نے اس سے اپنا سفرنامہ لکھنے کو کہا۔ ایک نوجوان سیکرٹری ابن جوزی کو اس کی مدد کے لیے مقرر کیا گیا' جو شاعر بھی تھا اور سیاح سکالر بھی۔ ابن جوزی اس سفرنامے کے بارے میں جسے ان دونوں نے مل کر لکھا تھا' ایک سیاح کے ''اشارات'' اور ''ا... کا خلاصہ قرار دیا جس کی تلخیص اس نے کی تھی۔ اس مواد میں وقت کی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے ابن جوزی کبھی کبھی پرانے سیاحوں کی کتابوں سے اقتباسات شامل کر دیتا تھا۔ دمشق' مکے اور مدینے کی طبعی تفصیلات کے لیے ابن بطوطہ کے سفرنامے میں زیادہ انحصار ابن جبیر پر کیا گیا ہے۔ اپنی خوبصورت نثر میں یہ اقتباسات شامل کرنے کے بعد ابن جوزی نے ایک ایسا سفرنامہ متعارف کرایا جو ابن بطوطہ کی براہ راست آواز سے واضح طور پر مختلف ہے۔ اس سفرنامے کے مصنف نے جہاں کہیں ابہام کو جگہ دی تھی اسے سیکرٹری نے منطق و دلیل کا رنگ دے کر بدل دیا تھا۔ دو برس تک ان دونوں نے مل کر یہ کام جاری رکھا۔ اس عمل کے بارے میں ابن جوزی لکھتا ہے: ''میں نے اس سفرنامے کو اس زبان میں لکھا ہے جس سے مفہوم زیادہ واضح ہو گیا ہے اور ا... سے جو مقاصد مصنف کے ذہن میں تھے انھیں نہایت موزوں انداز میں پیش کیا ہے۔ میں نے اکثر و بیشتر مصنف کے الفاظ اور زبان استعمال کی ہے اور کوشش یہ کی ہے کہ مادہ و منبع حذف ہونے سے بچ جائے''۔ پھر بھی ابن بطوطہ نے واضح احکام دیئے تھے کہ مسودے کی نوک پلک درست کی جائے' اسے زیادہ خوبصورت شکل دی جائے کیونکہ یہ قابل تدوین تھا اور ایک سیاح کی ان یادوں اور تذکرے کو بہتر اسلوب دیا جائے' جو خود ادیب نہیں تھا۔

کئی صدیوں تک تو یہ سفرنامہ گمشدہ تصور کیا جاتا رہا تھا۔ پھر 1800ء کی دہائی کے آغاز میں سوئٹزرلینڈ کے ایک مہم جو جے ایل برکات (جس کے سفرنامہ حج کا ذکر آگے چل کر آئے گا) نے ابن بطوطہ کے سفرنامے کے عربی اقتباسات قاہرہ میں تلاش کر کے بھیجے تھے۔ اس کا انگریزی ترجمہ 1829ء میں ہوا۔ تیس برس بعد الجزائر میں فرانسیسی قبضے کے بعد پانچ مسودے ڈھونڈ نکالے گئے تھے۔ ان میں سے ایک جا...

فرانسیسی ایڈیشن 1858ء میں تیار کیا گیا۔ یہ ایڈیشن قبول کر لیا گیا اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ دورانِ مطالعہ یہ مسودی ایڈیشن لگتا ہے۔ ہمیں یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کیا اسے ابن بطوطہ کی طرف سے پسندیدگی کی سند حاصل تھی یا نہیں نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابن جوزی نے بعدازاں اس میں کس قدر اضافہ کیا۔ نہ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نقل کرنے والوں نے اس میں کہاں تک اپنا حصہ شامل کر دیا ہے۔

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس کتاب میں ابن بطوطہ کے سفرنامے سے جتنا حصہ لیا گیا ہے اس میں ابنِ جوزی کے ایڈیشنوں سے کچھ بھی شامل نہیں کیا گیا۔ یہ مکمل سفرنامے کا مختصر سا حصہ ہے مگر ہم نے چند صفحات میں بڑی حیرت انگیز باتیں پیش کی ہیں۔ مثلاً چودھویں صدی میں شمالی افریقا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی حالت، دریائے نیل کے کنارے شہری اور مذہبی زندگی، صلیبی جنگوں کے نتائج، دمشق کا سماجی ڈھانچہ، شام سے مدینے جانے والا قافلہ اور مکے کے پُراسرار اہلِ ایمان۔

☆☆☆

ابن بطوطہ کے سفر نامے سے لیا گیا حصہ

طنجہ سے تیونس تک۔ جون' جولائی 1325ء

میں اپنی جائے پیدائش طنجہ سے جمعرات کے روز 2 رجب کو روانہ ہوا تھا۔ میرا ارادہ مکے میں خ
خدا کا حج کرنا اور مدینے میں روضہ رسول مقبول ﷺ پر حاضری دینے کا تھا۔ میں کسی ایسے ساتھی کا انتخاب کیے
بغیر جو مجھے مدینے میں دورانِ سفر خوش رکھتا' اکیلا اس سفر پر چل پڑا تھا۔ ایک آرزو تھی کہ جس نے مجھے م
مقاماتِ مقدسہ کی زیارت اور حج کی ادائیگی کے لیے کئی برس سے تڑپانا شروع کر رکھا تھا۔ میں نے اپنے فیصلے
اعلان کرتے ہوئے عزیز و اقارب کو چھوڑنے اور ان پرندوں کی طرح گھر چھوڑنے کا عہد کر لیا تھا' جو ا
آشیانوں سے اُڑ جاتے ہیں۔ اس زمانے میں میرے والدین بقیدِ حیات تھے اور میرے لیے انھیں چھوڑ کر جا
ایک مشکل کام تھا۔ دم رخصت میری امی ابو اداس تھے۔ میری عمر اس وقت بائیس برس تھی۔

میں تلمسان پہنچا جہاں کا سلطان ابن زیان تھا۔ جس دن میں وہاں پہنچا تھا اس روز اتفاق سے
افریقا کے بادشاہ کے دو ایلچی بھی وہاں موجود تھے۔ یہ دونوں تیونس میں امن کے جسٹس تھے۔ ان کے نام
النفزوی اور محمد الزبیدی (ایک بربر شیخ) تھے' مؤخر الذکر کا تعلق مہدیہ کے قریب واقع ایک قصبے سے تھا۔
الزبیدی اپنے دور کا بہت مشہور سکالر تھا جو 1340ء میں فوت ہوا۔

جس روز میں وہاں پہنچا اس روز وہ دونوں وہاں سے جا رہے تھے۔ ایک تیسرے شخص نے مجھے
مشورہ دیا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں۔ میں نے اس معاملے میں قرآن پاک سے استخارہ کیا اور تین راتیں
وہاں گزارنے کے بعد میں نے سامان لیا' اور اس شہر سے روانہ ہو گیا۔ میں ان کے پیچھے پیچھے تیز رفتار گھوڑے
پر سوار سفر کر رہا تھا۔ میں ملیانہ کے قصبے میں ان سے جا ملا تھا۔ یہ موسم گرما کا گرم ترین حصہ تھا۔ دونوں ایلچی
بیمار پڑ گئے تھے جس کی وجہ سے ہمیں وہاں دس راتوں تک رکنا پڑ گیا تھا۔ جونہی ہم روانہ ہوئے محمد النفزوی کی
حالت پہلے سے بھی بگڑ گئی تھی۔ ہم شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک نہر کے کنارے رک گئے مگر چوتھی صبح
شیخ چل بسا تھا۔ اس کا بیٹا اور الزبیدی واپس ملیانہ گئے اور اسے وہاں دفن کر دیا گیا۔ یہاں سے ہم ایک

دوسرے سے جدا ہو گئے تھے اور میں نے تیونس کے چند تاجروں کے ہمراہ اپنا سفر جاری رکھا۔ جب ہم الجیریا (الجزائر) پہنچے تو ہم نے شہر کے باہر کئی روز تک قیام کیا یہاں تک کہ الزبیدی اور متوفی کا بیٹا وہاں پہنچ گئے تھے۔ اب ہم نے دوبارہ مل کر سفر شروع کیا اور میتجا کے سپاٹ میدانوں میں سے گزرتے ہوئے مشرقی کوہستانی سلسلۂ قبائل میں داخل ہو گئے تھے۔

بجائیہ پہنچ کر میں بیمار پڑ گیا تھا۔ الزبیدی کا مشورہ تھا کہ میں وہاں رک جاؤں اور روبصحت ہونے پر دوبارہ سفر جاری رکھوں۔ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا:

''اگر میرا خدا یہ چاہتا ہے کہ میں راستے میں مر جاؤں تو پھر بہتر ہو گا کہ میں اس وقت جان دے دوں جب مکہ میری نظروں کے سامنے ہو''۔ اس نے جواب دیا: ''ٹھیک ہے اگر تمہارا واقعی یہ مطلب ہے تو اپنا گھوڑا اور بھاری سامان فروخت کر دو۔ میں تمہیں ایک خچر اور خیمہ مستعار دے دوں گا۔ اس طرح تمہارے لیے یہ ممکن ہو گا کہ تم ہمارا ساتھ دے سکو۔ ہمیں تیزی سے سفر کرنا ہے۔ ان سڑکوں پر ڈاکے پڑتے ہیں'' میں نے اس کی تجویز مان لی تھی۔ ہم نے کنطائن (بلادالحوی) تک سفر جاری رکھا اور وہاں پہنچ کر باہر ٹھہر گئے تھے۔ رات کو موسلا دھار بارش ہوئی جس نے ہمیں اپنے خیموں سے دور پھینک دیا تھا۔ ہم پناہ لینے کے لیے قریب کی عمارات کی جانب دوڑے۔ صبح کے وقت شہر کا گورنر ابوالحسن جو آنحضورﷺ کی لڑی سے تھا' ہمیں خوش آمدید کہنے آیا۔ اس نے دیکھا کہ میرے کپڑے گیلے ہیں اور بارش میں کیچڑ سے بھی لت پت ہیں تو اس نے یہ کپڑے دھلوانے کے لیے اپنے گھر بھیج دیئے تھے۔ میرا چوغہ اتنی خستہ حالت میں تھا کہ اس نے نئے اور عمدہ بالبیکی کپڑے کا بھجوا دیا تھا۔ اس کے ایک کونے کے ساتھ دو سونے کی اشرفیاں بندھی ہوئی تھیں' اس سفر کے دوران مجھے یہ پہلی امداد ملی تھی۔

کینسٹنطائن سے ہم عنابہ پہنچے اور شہری فصیل کے اندر ٹھہر گئے۔ چند روز بعد سڑکوں پر موجود خطرات کی وجہ سے ہم تاجروں سے الگ ہو گئے۔ اب ہم کم اور ہلکے سامان کے ساتھ زیادہ تیز سفر کر رہے تھے۔ ہم دن رات رکے بغیر چلتے رہے۔ مجھے پھر بخار ہو گیا تھا اور میں اس قدر کمزوری محسوس کر رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو پگڑی سے زین کے ساتھ باندھا دیا تھا تاکہ گر نہ جاؤں۔ خطرے کی وجہ سے خچر سے نیچے اتر آنا بھی ممکن نہ تھا۔ جب ہم بالآخر تیونس شہر پہنچے تو لوگ شیخ زبیدی کو خوش آمدید کہنے باہر نکل آئے تھے۔ انھوں نے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا تھا اور خوش آمدید بھی کہتے جاتے تھے اور سوالات کی بھی بوچھاڑ کر دی تھی۔ مجھ سے کوئی بھی

بات نہ کر رہا تھا کیونکہ ان میں سے مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اس قدر تنہا اور بے یارومددگار محسوس کیا کہ میں اپنے آنسو نہ روک سکا۔ ایک شخص کی نظر مجھ پر پڑی اور اس نے مجھ سے بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ وہ مجھے تسلی دیتا رہا اور باتیں بھی کرتا رہا یہاں تک کہ ہم شہر میں داخل ہو گئے تھے۔ یہاں مجھے کتب فروشوں کے کالج میں رہنے کو جگہ مل گئی تھی۔

سکندریہ سے عیذاب' مصر تک۔ اپریل' جولائی 1326ء

میں فرعون کے لائٹ ہاؤس کو دیکھنے گیا تو پتہ چلا کہ اس کا ایک حصہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے۔ یہ ایک مستطیل شکل میں بنی ہوئی فلک بوس عمارت ہے جس کا زمین سے کافی بلندی پر ایک ہی دروازہ ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لیے ان لکڑی کے تختوں پر سے گزرنا پڑتا تھا جو دروازے اور ایک متصلہ عمارت کے درمیان رکھے ہوئے تھے۔ دروازے کے اندر بلڈنگ کے محافظ کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی اور اس لائٹ ہاؤس کے اندر بہت سے کمرے تھے۔ اس کے اندر کا راستہ تقریباً سات فٹ چوڑا تھا۔ اس لائٹ ہاؤس کے چاروں طرف والے حصے 105 فٹ چوڑے تھے۔ یہ شہر سے تین میل دُور ایک اونچے ٹیلے پر ہے اور تین اطراف سے پانی کے اندر تک چلا گیا ہے۔ شہر کا قبرستان اسی جزیرہ نما میں ہے۔ میں 1349ء میں مراکش آتے وقت ایک بار پھر اس لائٹ ہاؤس کو دیکھنے گیا تھا۔ اس بار میں نے دیکھا کہ یہ گر چکا ہے اور میں نہ اس کے اندر جا سکتا تھا اور نہ اوپر چڑھ کر دروازے تک جا سکتا تھا۔

سکندریہ میں اپنے قیام کے دوران میں نے ایک بزرگ شخصیت کے بارے میں سنا جن کا اسم گرامی المرشدی تھا۔ وہ دنیا سے بالکل کٹ کر زندگی گزار رہے تھے اور ان کی تمام ضرورتیں غیب سے پوری ہوتی تھیں۔ وہ یقیناً ایک سچے بزرگ تھے جن کی ان دیکھی چیزوں پر نظر تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ ایک گاؤں میں خلوت میں تنہا زندگی گزار رہے تھے' جس گاؤں کا نام منیات بنی مرشد تھا۔ وہ وہاں ایک زاویہ میں نوکروں اور ساتھیوں کے بغیر رہتے تھے۔ سلطنت کے وزراء نیازمندی کے طور پر ہمیشہ ان کی تلاش میں رہتے تھے۔ ہر روز ان کے پاس مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لوگ حاضری دیتے تھے اور آپ ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ لوگوں کے لیے ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا تبرک تصور ہوتا تھا۔ ان سے ملنے جو بھی آتا وہ گوشت' پھل یا قندی کھانے کی خواہش کرتا تھا۔ وہ جو کچھ طلب کرتے یہ بزرگ وہی پیش کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات بے موسمی پھل تک فراہم کر دیتے تھے۔ علم معرفت رکھنے والے افراد وقت مانگتے تھے اور یہ کچھ سے مل لیتے تھے

کچھ سے ملنے سے انکار کردیتے تھے۔

شیخ المرشدی کا گوشہ تنہائی فاوا کے بالکل قریب تھا جسے ایک نہر شہر سے جدا کرتی تھی۔ میں شہر سے گزر کر بعد از نماز ظہر شیخ المرشدی کے ہاں پہنچا تھا۔ ان کے پاس اس وقت سلطان کے باڈی گارڈ کا ایک افسر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اور سپاہی بھی تھے۔ میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھے ملنے کے لیے اُٹھے، گلے لگایا اور مجھے کھانے کی دعوت دی۔ انھوں نے ایک سیاہ اونی چوغہ پہن رکھا تھا۔ نماز کا وقت ہوا تو مجھے امامت کے لیے فرمایا اور میں جب تک وہاں تھا نمازوں میں یہ فریضہ میں ہی انجام دیتا رہا۔ رات کو سونے سے قبل انھوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اس کمرے کی چھت پر جا کر سو جاؤ'' سخت گرمی تھی اور وہ مجھے آرام وسکون کی نیند کا موقع فراہم کر رہے تھے۔ میں نے سلطان کے افسر کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اسے چھت پر بھیج دیا جائے مگر آپ نے قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا: ''ہر ایک کا مقام مقرر ہوتا ہے۔ میں نے چھت پر جا کر دیکھا کہ پیال کا بستر ہے جس پر چمڑے کی چٹائی بچھی ہوئی ہے اور پانی کے جگ پینے اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔ میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔

اس رات میں خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک بہت بڑے پرندے کے پروں پر سوار ہوں جو مجھے اڑا کر مکے کی طرف جا رہا ہے۔ وہ جنوب میں یمن کی سمت مڑ گیا تھا۔ پھر وہ مشرق اور دوبارہ جنوب کی طرف مڑا۔ اب اس نے ایک لمبی اڑان مشرق کی سمت لی۔ وہ ایک تاریک اور سبز ملک میں اتر گیا تھا جہاں اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں حیران ہو کر اٹھ بیٹھا اور اپنے آپ سے کہا: ''اگر محترم شیخ مجھے اس خواب کے بارے میں بتا دیں کہ انھیں اس بارے میں معلوم ہے تب مجھے یقین آ جائے گا کہ لوگ اُن کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ درست ہے''۔ نمازِ فجر کی امامت میں نے ہی کرائی اور اس کے بعد سلطان کا افسر چلا گیا۔ بزرگ نے لوگوں کو کیک کھانے کے لیے دیئے جب وہ وہاں سے چلے گئے۔ نماز کے بعد انھوں نے مجھے اندر بلایا اور مجھ سے پوچھا کہ میں نے کیا خواب دیکھا تھا؟ میں نے بتا دیا تو فرمانے لگے: ''تم حج ادا کرنے مکہ جا رہے ہو اور تم مدینہ طیبہ میں آنحضور ﷺ کے روضہ مبارک پر بھی حاضری دو گے۔ پھر تم یمن، ترکی اور ہندوستان عراق، جاؤ گے۔ ہندوستان میں تمہارا قیام طویل مدت کے لیے ہو گا۔ تم وہاں میرے بھائی دلشاد سے ضرور ملنا۔ وہ تمہیں ایک مشکل سے نکال لے گا''۔ پھر انھوں نے مجھے کیک اور چاندی کے کچھ سکے عنایت فرمائے اور میں اجازت لے کر وہاں سے چل پڑا۔

میں ایک صحرائی خطے سے گزر کر دمیاط پہنچا' ایک ایسے شہر میں جس کے گردونواح میں پھل بہت ہوتے تھے۔ یہ دریائے نیل کے کنارے واقع ہے اور دریا کے کنارے جو مکانات تعمیر کیے گئے ہیں ان کے مکین بالٹی ڈال کر دریا میں سے پانی نکال لیتے ہیں۔ بہت سے گھروں کی سیڑھیاں ساحل تک چلی گئی ہیں۔ اس شہر میں کیلا بہت ہوتا ہے اور پھل کشتیوں میں لاد کر قاہرہ لے جاتے ہیں۔ یہاں بھیڑ بکریاں آزادی کے ساتھ دن رات چرتی پھرتی ہیں۔ اس شہر کے بارے میں کہاوت مشہور ہے کہ ''اس کی دیواریں میٹھے پھلوں کی بنی ہوئی ہیں اور اس کے کتے بھیڑیں ہیں''۔ ایک بار اس شہر میں جو داخل ہو جاتا ہے پھر وہ اس سے باہر اسی صورت میں نکل سکتا ہے جب اس کے پاس گورنر کا پروانہ اجازت ہو۔ معتبر لوگوں کے پاس کاغذ کے ایک ٹکڑے پر مہر لگی ہوئی ہوتی ہے جسے وہ شہر کے دروازے پر دکھا کر باہر آ جاتے ہیں۔ دوسروں نے یہ مہر اپنے بازوؤں پر لگا رکھی ہوتی ہے جسے دکھا دیتے ہیں۔

سمندری پرندے بازار میں کثرت سے بکتے ہیں۔ بھینسوں کا دودھ یہاں اس قدر میٹھا ملتا ہے کہ اس کی مثال نہیں جسے صرف قاہرہ ہی نہیں بلکہ شام اور اناطولیہ کو بھی برآمد کیا جاتا ہے۔ شہر سے باہر سمندر اور دریا کے درمیان ایک جزیرہ واقع ہے جسے خاکنائے کہتے ہیں۔ یہاں ایک مسجد اور ایک زاویہ ہے جس کے شیخ سے میری ملاقات ہوئی۔ ان کا اسمِ گرامی ابن قفیل ہے' ان کے گرد درویشوں کی ایک بڑی تعداد جمع رہتی ہے۔ میں نے ایک جمعرات ان کے ساتھ گزاری ان کی دعائیں بھی سنتا رہا اور روحوں کو جگانے کے الفاظ بھی۔

دمیاط کا موجودہ شہر نیا آباد ہوا ہے۔ پرانا شہر دوسری بار الملک الصالح کے عہد میں صلیبیوں سے آزاد ہونے کے بعد (50-1249) تباہ کر دیا گیا تھا۔ یہاں شیخ جمال الدین الساوی کا زاویہ ہے جو اب وفات پا چکے ہیں۔ انھوں نے جہاں گشت درویشوں کے ایک سلسلے کو قائم کیا تھا جسے قلندریہ کہتے تھے۔ قلندریہ مسلک کے درویش اپنی ڈاڑھیاں اور بھنویں منڈوا دیتے ہیں۔ کہانی کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ شیخ الساوی نوجوانی میں بہت خوبصورت اور صحت مند تھے اور یہاں ایک فارسی عورت آپ پر عاشق ہو گئی تھی۔ وہ انھیں نام و پیام بھجواتی اور بعض اوقات راستے میں روک لیتی اور دعوت دیتی تھی کہ آپ اس کے پاس جا کر اس سے ملیں۔

آپ کے انکار سے تنگ آ کر اس عورت نے ایک دوسری عورت کو اس راستے میں بٹھا دیا جس

راستے پر شیخ الساوی مسجد کو جاتے تھے۔ جوں ہی آپ وہاں سے گزرے وہ عورت سامنے آ گئی اور ایک خط دیتے ہوئے پوچھا: ''کیا آپ پڑھ سکتے ہیں؟ یہ خط میرے بیٹے کی طرف سے ہے کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ اس میں اس نے کیا لکھا ہے''۔ اس سے قبل کہ شیخ وہ لفافہ کھولتے اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''میرے بیٹے کی بیوی (میری بہو) اس مکان کی ڈیوڑھی میں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ دروازے میں کھڑے ہو کر یہ خط اسے پڑھ کر سنا دیں تاکہ وہ سن لے؟''

وہ رضامند ہو گئے مگر ابھی وہ اندر اور باہر والے دروازے کے درمیان ہی پہنچے تھے کہ اس عورت نے پہلا دروازہ مقفل کر دیا اور وہ فارسی عورت اپنے نوکروں کے ساتھ دوسرے دروازے کے ذریعے باہر نکل آئی۔ شیخ الساوی کو پکڑ کر وہ گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔ اس عورت نے انھیں بدکاری پر آمادہ کرنا چاہا۔ شیخ نے پوچھا ''غسل خانہ کس طرف ہے؟'' عورت نے دکھا دیا۔ وہ پانی کا ایک جگ اپنے ساتھ اندر لے گئے اور اپنی ڈاڑھی اور بھنویں بلیڈ سے مونڈ ڈالیں۔ اب وہ واپس اس کے پاس آئے۔ وہ اس قدر خوفزدہ ہوئی اور غصے میں آئی کہ اس نے اپنے آپ کو فراموش کرتے ہوئے شیخ کو باہر نکال دیا۔ اس واقعہ کے بعد وہ خود اور ان کے پیروکار اپنی ڈاڑھیاں اور بھنویں منڈواتے رہے۔

دمیاط میں المحسنی نام کا ایک گورنر تھا۔ وہ ایک اچھا انسان تھا اور صدقہ خیرات کیا کرتا تھا۔ اس نے دریا کے کنارے ایک کالج تعمیر کرایا تھا۔ میں وہاں قیام کے دوران اس کالج میں ٹھہرا تھا۔ ہمارے درمیان گہری دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ میں جب اس شہر سے روانہ ہوا اور فارس کر کی طرف جا رہا تھا تو ایک سوار جسے المحسنی نے بھیجا تھا' میرے پاس پہنچا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''آج امیر نے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔ یہ سن کر کہ تم شہر چھوڑ چکے ہو اس نے مجھے تمہارے پیچھے روانہ کیا اور تمہارے لیے کچھ بھیجا ہے''۔ یہ کہہ کر اس نے مجھے سکوں کی ایک تھیلی پیش کی۔ اللہ اسے اس کا اجر دے۔ میں نے اخمیم سے ھُوتک کا سفر جاری رکھا' جو دریا کے کنارے ایک اور بڑا شہر ہے۔ میں یہاں ابن السراج کے کالج میں ٹھہرا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نماز فجر کے بعد ہر روز ان کے پیروکار قرآن پاک کے ایک پارے کی تلاوت کرتے تھے۔ اس کے بعد الشاذلی سے عقیدت کا اظہار ہوتا تھا۔ الشاذلی مراکش کے صوفی بزرگ تھے (1258-1196) جنھوں نے مصر میں قیام کے دوران شاذلیہ سلسلے کی بنیاد رکھی۔ جو بعد ازاں مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقا کا نہایت مقبول مکتب تصوف بن گیا تھا اور 15 دیگر سلاسل وجود میں آئے۔ عبداللہ الحسنی آنحضور ﷺ کی آل میں سے تھے۔

ان کی روحانیت اور بزرگی کا ھُو میں بڑا چرچا تھا۔ میں ان کی دعائیں حاصل کرنے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب انھوں نے مجھ سے مستقبل کے پروگرام کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتایا کہ میں براستہ جدہ بحیرہ احمر کے راستے حج کی ادائیگی کے لیے مکہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا ''اس مرتبہ تمھیں اس میں کامیابی نہیں ہوگی۔ واپس چلے جاؤ۔ تمہارا پہلا حج دمشق سے خشکی کے راستے ہوگا''۔ ان کے مشورے پر عمل کیے بغیر میں نے اپنا سفر جاری رکھا اور پندرہ روز صحرا سے گزرنے کے بعد میں عیذاب پہنچ گیا تھا۔ وہاں کا موجودہ بادشاہ مصر کے سلطان سے برسرِ پیکار تھا۔ اس کے نتیجے میں اس نے وہ تمام بحری جہاز غرق آب کر دیئے تھے۔ جو ہمیں جدہ پہنچا سکتے تھے۔ سمندر عبور کرنا ہمارے لئے ممکن نہ تھا۔ ہم نے سفر کے اخراجات کے لیے اپنا سارا سامان بیچ دیا تھا۔ ہم عربوں کے ساتھ بالائی مصر واپس چلے گئے تھے۔ انھوں نے ہمیں اپنے اونٹ کرائے پر دے دیئے تھے۔ قوس سے ہم نیل کی زیریں سمت (جس میں سیلاب آیا ہوا تھا) واپس روانہ ہوئے۔ ہم آٹھ راتیں گزارنے کے بعد واپس قاہرہ پہنچ گئے تھے۔ شام کے لیے روانہ ہونے سے قبل میں ایک رات وہاں ٹھہرا تھا۔

دمشق۔ اگست 1326ء

جمعرات کو نویں رمضان المبارک کو میں دمشق میں تھا۔ میں وہاں مالکی کالج میں مقیم رہا۔ (ابن بطوطہ کے اپنے وطن مراکش میں مالکی مسلک کے لوگ زیادہ تھے) خوبصورتی کے لحاظ سے دمشق جیسا کوئی دوسرا شہر میں نے نہیں دیکھا۔ تین طرف سے یہ شہر مضافاتی علاقے سے گھرا ہوا ہے جن کے اضلاع شہر کے مرکز سے جہاں گلیاں بہت تنگ ہیں' زیادہ دلکش ہیں۔ شمال کی جانب صالحہ کا مضافاتی علاقہ ہے' یہ اپنی جگہ خود ایک شہر ہے جس میں خوبصورت بازار' ایک جامع مسجد اور ایک شفاخانہ ہے۔ ایک کالج بھی ہے جس کا نام ابن عمر کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اسمیں خالصتاً ایسے معمر لوگ آتے ہیں جنھیں قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ یہاں طلبہ اور پروفیسروں کے لیے کھانا اور یونیفارم فری ہیں۔ دمشق میں بھی ایسا ہی ایک کالج ہے۔ میں ایک روز دمشق کی ایک تنگ گلی سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک نوکر کو دیکھا جس کے ہاتھ سے ایک چینی قیمتی پلیٹ گر کر ٹوٹ گئی ہے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے اور تماشائیوں کا ایک ہجوم اس نوکر کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ پھر ان تماشائیوں میں سے ایک نے اس لڑکے کو مشورہ دیا: ''ان ٹکڑوں کو چُن لو اور انھیں ''برتنوں کے فنڈ'' کے دفتر لے جاؤ''۔ لڑکے نے ایسا ہی کیا اور مشورہ دینے والا اس کے ساتھ دفتر گیا۔ یہاں انھوں نے پلیٹ کے ٹکڑے

ایک کسٹوڈین کو دکھائے۔ اس لڑکے کو کافی رقم مل گئی تھی تا کہ وہ اس ٹوٹی ہوئی پلیٹ کی جگہ ایک اچھی سی نئی پلیٹ خرید لے۔ دمشق میں یہ فنڈ ایک بہترین چیز تصور ہوتا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو اس نوکر کے آقا نے اسے پلیٹ توڑنے پر یقیناً مارا ہوتا۔ یہ فنڈ اس لیے قائم کیا گیا ہے تا کہ انسانی دل کو ٹوٹنے سے بچایا جا سکے۔ اللہ انھیں اس کا اجر دے جنھوں نے یہ فنڈ قائم کیا۔

متمول اور اصحاب ثروت مساجد' کالجوں اور مقدس جگہوں کے لیے عطیات دینے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اہلِ دمشق مراکشی باشندوں کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے ہیں۔ اگر میرے ہم وطنوں میں سے کسی کو مالی پریشانی لاحق ہو جائے تو اسے دمشق میں کام کرنے کے مواقع فراہم کر دیے جاتے ہیں تا کہ وہ اس پر قابو پا سکیں۔ اسے کسی مسجد کا امام مقرر کر دیا جاتا ہے' یا کسی کالج میں بطور اُستاد تعینات کر دیا جاتا ہے جہاں رہائش فری مہیا کی جاتی ہے۔ بطور قاری یا کسی مقدس مقام کے نگران کے طور پر مصروف کر دیا جاتا ہے۔ وہ کسی صوفی کے زاویے یا آستانے پر بھی رہ سکتا ہے جہاں کھانا اور کپڑے فری ملتے ہیں۔

مزید یہ کہ یہاں جو کوئی بھی کسی خیراتی ادارے یا محتاج خانے میں مقیم ہو اسے روزگار کی فکر نہیں رہتی اور عزت نفس بھی مجروح ہونے سے بچ جاتی ہے۔ اس طرح ہاتھ سے کام کرنے والے اور گھریلو ملازمین کسی باغ کی نگرانی' پن چکی پر کام کرنے' بچوں کی نگہداشت کرنے' انھیں صبح کے وقت مدرسے لے جانے اور شام کو واپس لانے کی مشقت سے بچ جاتے ہیں۔ وہ اگر تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں یا مذہبی زندگی میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں ان کی ہر ممکنہ مدد کی جاتی ہے۔

جب میں یہاں پہلی بار آیا تھا تو ایک مالکی پروفیسر نورالدین السخوی سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ رمضان المبارک کے مہینے میں اس نے مجھے افطاری اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے دی تھی۔ میں چار روز تک مسلسل افطاری اس کے ساتھ کرتا رہا' پھر میں بیمار پڑ جانے کی وجہ سے نہ جا سکا تھا۔ اس نے کسی کو میری تلاش میں بھیجا۔ میری حالت بتا رہی تھی کہ میں بیمار تھا مگر اس نے میری بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ میں واقعی بیمار تھا۔ میں نے افطاری جاری رکھی اور رات کو وہاں رہتا تھا۔ صبح کے وقت جب میں اس کے گھر سے نکلتا تو وہ مجھے ہمیشہ یہ کہہ کر ممنونِ احسان کر لیا کرتا تھا کہ "میرے اس گھر کو اپنے ابو یا بھائی کا گھر سمجھو"۔ اس نے ڈاکٹر کو بلا کر میرا طبی معائنہ کرایا' دوائیں منگوائیں اور ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق خاص خوراک کا

اہتمام کر دیا تھا۔ میں نے رمضان کا پورا مہینہ اس کے ساتھ گزارا۔ رمضان المبارک کا مہینہ گزر گیا تو میری صحت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ میں نے عید الفطر کی نماز اس کے ساتھ ادا کی تھی۔ میرے اپنے پاس جو حج کے لیے رقم تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ نور الدین کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے میرے لیے کرائے پر اونٹوں کا انتظام کیا۔ مجھے زادِ راہ کے طور پر نقد رقم کے علاوہ سامان بھی دیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''یہ رقم تمہاری مطلوبہ ضرورت پوری کرے گی''۔

میرا اللہ اسے اس کا اجر دے گا۔

دمشق کا مکے جانے والا قافلہ۔ ستمبر/اکتوبر 1326ء

جس روز شوال کا چاند نظر آیا تھا اس روز قافلہ حجاز شہر کے جنوب کی سمت چل پڑا تھا۔ یہ قافلہ ایک گاؤں میں رکا جس کا نام قصوہ تھا۔ میں ان کے ہمراہ چل پڑا۔ یہ بدوؤں کا ایک قبیلہ اجریہ تھا جس کا امیر محمد الرفیع تھا۔ ہم قصوہ سے ایک بڑے گاؤں ثنا میں آ گئے تھے۔ وہاں سے آگے ہم ایک چھوٹے سے شہر زرعہ پہنچ گئے تھے جو ضلع حاؤرن میں واقع تھا۔ زرعہ میں رکنے کے بعد ہم نے سفر جاری رکھا اور بصرہ شہر پہنچ گئے۔ عموماً قافلے یہاں چار راتیں گزارتے ہیں تاکہ دمشق سے آنے والے جو پیچھے رہ گئے تھے ان کا انتظار کر سکیں۔ جب حضرت محمد ﷺ جوان تھے اور حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لے کر جاتے تھے آپ ﷺ کو ان دنوں ایک عیسائی پادری بحیرہ ملا تھا جس نے آنحضور ﷺ کو مستقبل میں آپؐ کے بطور پیغمبر خدا مشن کے بارے میں پیشگوئی کے طور پر بتایا تھا۔ جہاں آپؐ کا اونٹ رکا تھا اس جگہ آج ایک عالی شان مسجد کھڑی ہے۔ حاؤرن کے ضلع سے لوگ اس شہر میں بڑی تعداد میں آتے ہیں اور حجاج کے ہاتھ ان کے سفر کے لیے اپنا مال بیچتے ہیں۔ بصرہ سے یہ قافلہ جب زیزا کے تالاب پر پہنچا تو ایک روز کے لیے وہاں رک گیا تھا۔ وہاں سے یہ قافلہ لجون کی طرف روانہ ہوا جہاں بہتے پانی کی بہتات تھی۔ یہاں سے ہماری اگلی منزل کرک کا قلعہ تھا۔

کرک ایک نہایت قابلِ ذکر، ناقابل رسائی مشہور سنائی قلعہ ہے۔ اسے کبھی کبھی راون کا قلعہ بھی کہتے ہیں۔ دریا اسے چاروں جانب سے گھیرے ہوئے ہے۔ اس کا صرف ایک گیٹ ہے جس میں داخل ہونے کے لیے چٹان کو کاٹ کر راستہ بنایا گیا ہے۔ آج کل یہ قلعہ قرب و جوار کے بادشاہوں کی پناہ گاہ ہے جو کسی مصیبت میں ہوں تو اس میں پناہ لے لیتے ہیں۔ ہم کرک کے باہر چار روز تک ٹھہرے، اس مقام کا نام ثانیہ تھا۔ یہاں ہم نے اصل صحرا میں داخل ہونے کی تیاری کی۔ ثانیہ سے ہم شام کے آخری شہر مان پہنچے اور

ہاں سے سنگ چقماق کے ایک درے سے نیچے اترے اور ایک بیابان میں پہنچ گئے تھے۔لوگ کہتے ہیں کہ جو کوئی ایک بار اس درے میں داخل ہو جائے اسے اس سے باہر نکلنا نصیب نہیں ہوتا وہ اس میں کھو جاتا ہے او جو کوئی اس میں سے صحیح سلامت گزر جائے اسے گویا حیات نو ملی۔دو روز کے سفر کے بعد ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے تھے جہاں پانی کے تالاب تھے مگر آبادی کوئی نہ تھی۔وہاں سے آگے ہماری منزل وادی بلدہ ایک خشک دریا تھی اور اس سے آگے ہمیں تبوک پہنچنا تھا۔یہ وہی جگہ ہے جس پر آنحضورؐ نے 631ء میں حملہ کیا تھا۔

یہ بڑا قافلہ چشمے کے قریب پڑاؤ ڈالتا ہے تاکہ ہر کوئی پیاس بجھا سکے۔حجاج یہاں چار روز ٹھہرتے ہیں تاکہ تازہ دم ہو جائیں۔اپنے اونٹوں کو پانی پلا سکیں اور تبوک اور یولہ کے درمیان کے خوفناک سفر کے لیے پانی ساتھ لے جا سکیں۔بہشتی چشمے کے قریب اپنے وہ مشکیزے لے جاتے ہیں جو بھینس کے چمڑے سے بنائے جاتے ہیں۔وہ ان میں پانی ذخیرہ کر لیتے ہیں۔وہ اونٹوں کو پانی پلا کر قافلے کے لیے پانی کے مشکیزے بھر لیتے ہیں۔انفرادی سطح پر پانی فراہم کرنے کے لیے چھوٹے چرمی مشکیزوں میں پانی بھر لیا جاتا ہے۔

ہر امیر اور بڑے عہدیدار کا ایک پرائیوٹ ٹینک ہوتا ہے جبکہ بقیہ حجاج سقوں کو مقررہ رقم دے کر پانی حاصل کرتے ہیں۔پھر یہ قافلہ تبوک سے روانہ ہو جاتا ہے اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا جاتا ہے۔رات دن بغیر رکے سفر کیا جاتا ہے کیونکہ بیابان کا یہ حصہ بڑا پر خطر ہے۔نصف مسافت طے کرنے کے بعد اخیدر کی وادی آتی ہے جسے جہنم کی وادی کہا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ایک سال ایسا بھی آیا تھا جب حاجیوں کو اس مقام پر بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ بادِ سموم چلنے لگی تھی۔پانی کے مشکیزے خالی ہو گئے تھے اور پانی کا ایک گلاس ایک ہزار دینار تک پہنچ گیا تھا۔بیچنے اور خریدنے والے دونوں تباہ ہو گئے تھے۔وادی سے گزرتے ہوئے یہ کہانی ایک چٹان پر لکھی ہوئی پڑھی جا سکتی ہے۔

تبوک سے پانچ روز کی مسافت کے بعد ثمود کا کنواں آ جاتا ہے جو پانی سے بھرا ہوا ملتا ہے۔پیاس کی شدت کے باوجود قافلے میں سے کوئی بھی اس کنویں سے ایک بالٹی پانی بھی نہیں لیتا اس لیے کہ جب پیغمبر خدا ﷺ یہاں سے گزرے تھے تو آپؐ نے منع فرما دیا تھا کہ اس کنویں کا پانی کوئی نہ پیے۔(چند ایک نے پہلے ہی پانی استعمال کر لیا تھا تاکہ اس سے خمیر بنایا جا سکے بعد میں انھوں نے اسے اپنے اونٹوں کو کھلا دیا تھا)۔یہاں قدیم قوم ثمود کے مکانات پہاڑوں کے اندر کھدے ہوئے نظر آتے ہیں۔انھیں سرخ چٹان میں سے کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ان کے معماروں کی ہڈیاں ان کے اندر پیوند خاک ہو کر پڑی ہوئی ہیں۔"یقیناً اس میں آنکھوں

والوں کے لیے بڑی عبرت ہے"۔(آل عمران۔3:13)۔

ثمود سے یولہ تک نصف دن کا سفر ہے۔ یہ ایک خوبصورت بڑا سا گاؤں ہے جہاں کھجور کے درختوں کے جھنڈ اور چشمے ہیں۔حجاج یہاں چار راتیں گزارتے ہیں تا کہ سامان لے لیں اور کپڑے دھولیں۔ یہاں کے مقامی لوگ دیانتدار ہیں۔وہ اپنے ساتھ صرف اتنا ہی سامان رکھتے ہیں جس کا مدینہ لے جانا بہت ضروری ہو۔یولہ ایک حدِ فاصل کا کام کرتا ہے۔اس کے جنوب کی طرف عیسائی تاجر نہیں جاسکتے۔ یہ لوگ حجاج کے خریدنے کے لیے مختلف اشیاء لاتے ہیں۔

اس شہر سے قافلے کے روانہ ہو جانے کے بعد حجاج دوسرے روز وادی اطاس میں پڑاؤ کرتے ہیں۔گرمی سے جان نکل رہی ہوتی ہے اور بادِسموم بہت مہلک ثابت ہوتی ہے۔گذشتہ بار جب یہ ہوا اس موسم میں چلی تھی تو چند ایک حجاج ہی بچ سکے تھے۔اس وادی کے بعد پھر یہ لوگ ہدایہ میں ٹھہرے تھے جہاں ایک وادی میں زیرِ زمین پانی بہت ہے۔ یہاں تھوڑی سی کھدائی کے بعد پانی نکل آتا ہے لیکن کھاری ہوتا ہے۔ تیسرے روز مدینہ طیبہ کا مقدس شہر ہمیں نظر آ رہا تھا۔شہر نبی پاک ﷺ کو دیکھتے ہی آنکھیں پُرنم ہو گئی تھیں اور دلوں کی بیقراری بڑھ گئی تھی۔ جب مدینے سے مکے جانے کا وقت آیا تو ہم ذوالحلیفہ مسجد کے نزدیک رکے تھے۔ یہ وہی مسجد تھی جہاں آنحضورؐ نے حجۃ الوداع کے لیے حج کے کپڑے پہنے تھے۔ یہ مسجد مدینہ سے پانچ میل دور ہے اور نہر عقیق کے نزدیک ہے۔ یہ مدینہ کی مقدس حدود کا تعین کرتی ہے۔ میں نے بھی یہاں اپنے کپڑے احرام سے بدل لیے تھے' غسل کر کے احرام کی ان سلی چادریں پہن لی تھیں اور نفل ادا کیے تھے۔اب میں یہاں سے ایک حاجی کی زندگی میں داخل ہو چکا تھا۔ میں نے عمرے سے الگ حج کی ادائیگی کی نیت کر لی تھی۔ میں بے حد جذباتی ہو گیا تھا اور قافلے کے باقی افراد کے ساتھ مل کر یہ الفاظ دہرا رہا تھا: "لبیک اللھم لبیک" (میں حاضر ہوں۔میرے مالک میں آپ کے حضور حاضر ہوں)۔

میں ہر پہاڑی اور ہر وادی میں سے گزرتے وقت انھیں دہرا رہا تھا یہاں تک کہ ہم درہ علی پہنچ گئے تھے جہاں ہمیں ایک رات ٹھہرنا تھا۔

مکہ مکرمہ۔اکتوبر' نومبر 1326ء

جب میں مکہ پہنچا تھا اس وقت امیرِ مکہ کا خطاب دو بھائیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا' رمیثہ اور عطیفہ جو ابونعمان قتادہ کے بیٹے تھے۔ان سب کا شجرہ نسب حضرت امام حسنؓ سے ہوتا ہوا پیغمبر خدا ﷺ تک پہنچتا تھا۔

...عمر میں بڑے تھے لیکن وہ اس بات پر مُصر تھے کہ جمعہ کے خطبے میں عتیفہ کا نام پہلے لیا جائے جس کی وجہ یہ ہی کہ مؤخرالذکر کی شہرت عدل و انصاف کے لیے دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی۔ عتیفہ کا گھر مروئی پہاڑی کے دائیں طرف ہے جبکہ رمیثہ باب شعب کے نزدیک الشربی کے حجرے میں رہتا ہے۔ ہر صبح ان کے دروازوں کے سامنے نقارے بجائے جاتے ہیں۔

اہلِ مکہ کے اعلیٰ عادات و اطوار اور فیاضی کے بڑے چرچے تھے۔ یہ نہ صرف کھانا شروع کرنے سے قبل غرباء کو کھانا دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات انھیں گھر کے اندر مدعو کر کے انھیں کھانا خود پیش کرتے ہیں۔ اہلِ مکہ معمول کے مطابق اپنی روٹی کا تیسرا حصہ دوسروں کو دے دیتے ہیں۔ خوش لباس ہیں اور اکثر سفید لباس پسند کرتے ہیں۔

مرد خوشبو اور سرمہ لگاتے ہیں ان کے ہاتھوں میں اکثر مسواک ضرور ہوتے ہیں جو عموماً مقامی درختوں کی شاخوں سے تیار کئے جاتے ہیں۔ خواتین خوبصورت ہیں۔ یہ کبھی عطر اور خوشبویات کا استعمال بہت کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض تو کھانے سے زیادہ ترجیح خوشبو کو دیتی ہیں کھانے سے پیسے بچالیں گی تا کہ خوشبو خرید سکیں۔ یہ جب جمعرات کی رات کو طواف کعبہ کے لیے جاتی ہیں تو مسجد الحرام خوشبو سے مہک اٹھتی ہے اور ان کے چلے جانے کے بعد بھی بہت دیر یہ خوشبو مسجد میں پھیلی رہتی ہے۔

ہفتے بھر چاروں آئمہ میں سے پہلے امام جن کا شافعی مسلک سے تعلق ہے نمازیں پڑھاتے ہیں اہلِ مکہ کی اکثریت اسی مسلک سے تعلق رکھتی ہے جس کا تقرر وہ کرتے ہیں جو اس کے مجاز ہوں اور جنھیں اس کی اتھارٹی حاصل ہو۔ وہ مقامِ ابراہیم کے پیچھے نماز ادا کرتا ہے جو بالخصوص اس کے لیے ایک خوبصورت جنگلے میں بنایا گیا ہے۔ اس کو بناتے وقت شہتیروں سے جوڑ دیا گیا ہے جو دو سیڑھیوں کی شکل میں ہیں۔ پھر ان کو ایک منبر کے ساتھ پیوستہ کیا ہے۔ سب سے اوپر والے شہتیر سے شیشے کے بہت سے چراغ کھونٹیوں سے لٹک رہے ہیں۔ جب شافعی امام نماز پڑھا چکے تو مالکی امام کعبہ کے جنوبی کونے کی طرف منہ کر کے الگ سے نماز ادا کرتا ہے۔ حنبلی مسلک کا امام اس کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے جس کا چہرہ کعبہ کی مشرقی دیوار کی سمت میں ہوتا ہے۔ سب سے آخر میں حنفی امام نماز ادا کرتا ہے جس کا منہ کعبہ کی چھت کے پرنالے کی جانب ہوتا ہے۔ یہ بھی اسی طرح کے جنگلے میں کھڑا ہوتا ہے جس طرح کے جنگلے میں شافعی امام کھڑے ہوئے تھے۔ نمازیں ادا کرنے کی یہ ترتیب پانچ میں سے چار نمازوں میں یہی رہتی ہے۔ نماز مغرب سب مل کر ادا کرتے ہیں جسمیں ہر امام اپنے

مسلک کے مقتدیوں کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ان اوقات میں مختلف مسلک کے نمازیوں کی نمازوں کی ادائگی میں تھوڑا سا فرق دکھائی دیتا ہے۔مالکی نمازی شافعی نمازیوں کے ساتھ ایک ہی وقت میں رکوع میں جاتے ہیں جبکہ حنفی،حنبلیوں کے ساتھ سجدے میں جاتے ہیں۔لوگ اپنے مخصوص مؤذن کی آواز بہت توجہ سے سنتے ہیں تا کہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

جمعہ کے وعظ کے لیے امام بالکل سیاہ لباس میں آتے ہیں۔ان کے سر پر پگڑی ہوتی ہے اور ایک ململ کے کپڑے کا ٹکڑا ان کی کمر پر لٹکا رہتا ہے جو شاہِ مصر کی طرف سے عطا کردہ ہوتے ہیں۔امام صاحب بڑی پروقار چال کے ساتھ قدم رکھتے ہوئے ان دو سیاہ جھنڈوں کے درمیان سے گزر کر آتے ہیں جنھیں ان دو مؤذنوں نے اٹھا رکھا ہوتا ہے جو اذان دیں گے۔ایک خادم ان کے آگے آگے ایک چھڑی اٹھا کر چلتا ہے جسے فرقع کہتے ہیں جس کے ساتھ کنارے پر ایک پتلی پیچدار رسی بندھی ہوتی ہے جسے وہ اس طرح تڑاق سے جھٹکا دیتا ہے جس سے یہ پتا چل جائے کہ امام صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

امام سب سے پہلے حجرِ اسود کو بوسہ دینے جاتے ہیں۔ان کے ساتھ سینئر مؤذن سیاہ لباس اور کندھے سے تلوار لٹکائے چلتا ہے۔پھر دونوں جھنڈوں کو منبر کے دونوں طرف ایک ایک کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔یہ منبر کعبہ کے بالکل نزدیک حجرِ اسود اور کعبے کے شمالی (عراقی) گوشے کے درمیان ہے۔جب امام منبر کی سیڑھیاں چڑھنے لگتے ہیں تو مؤذن انھیں تلوار تھما دیتا ہے یوں امام اس تلوار کے ساتھ پہلا قدم سیڑھیوں پر رکھتے ہیں۔اس سے سارا مجمع متوجہ ہو جاتا ہے۔وہ قدم بہ قدم اسی طرح چلتا ہوا سب سے اوپر پہنچ کر چوتھی بار تلوار کے ساتھ اپنا قدم رکھتے ہیں۔اس کے بعد وہ دھیمی آواز میں کعبہ کی جانب منہ کر کے دُعا کرتے ہیں پھر دائیں بائیں جھکتے ہیں۔اس اجتماع میں شامل تمام لوگ جواباً یہی عمل کرتے ہیں۔جس وقت امام صاحب بیٹھ جاتے ہیں،مؤذن (زم زم کے کنویں کے گنبد پر کھڑا ہو کر) اذان دیتا ہے۔

امام اللہ کے پیغمبر ﷺ کے لیے متعدد مرتبہ دعا کرتے ہیں۔پھر وہ آپؐ کی آل اولاد،چچاؤں، حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ نواسوں،حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ آپ کی بیٹی اور اپنے نواسوں کی والدہ محترمہ حضرت فاطمہؓ اور حضورؐ کی پہلی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ کے لیے دعا کرتے ہیں۔پھر ملک کے الناصر کے لیے سلطان نورالدین علی اور مکے کے دو امیروں اور عراق کے سلطان کے لیے دعا کرتے ہیں۔ وعظ فرمانے کے بعد وہ دوبارہ دعا کرتے ہیں پھر جس طرح آئے تھے اسی طرح واپس تشریف لے جاتے

ہیں۔مگر واپسی کی ترتیب آمد کی ترتیب کے بالکل الٹ ہوتی ہے۔

مکہ میں جنھوں نے قیام طویل کرلیا تھا: ان میں سے چند افراد مکہ میں زیادہ عرصے کے لیے ٹھہر گئے تھے جو حج کی ادائیگی کے لیے آئے تھے۔وہ درج ذیل ہیں:

ایک دانشمند اور متقی و پارسا امام جوالیافعی کے نام سے مشہور تھے۔آپ ایک صوفی اور درویش تھے۔ یہ رات بھر طوافِ کعبہ میں مصروف رہتے تھے اور انھیں دن کے وقت بھی ہمہ وقت مسلسل کعبہ کے طواف میں مصروف دیکھا جاتا تھا۔انھیں قرآن حکیم کی سورۃ طٰہٰ کی یہ آیت یاد دلاتی تھی کہ ''پس ان کی باتوں پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی تسبیح اور تعریف بیان کرتا رہ، سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے، رات کے مختلف وقتوں میں بھی اور دن کے حصوں میں بھی تسبیح کرتا رہ۔بہت ممکن ہے کہ تو راضی ہو جائے''۔

(20:130-(طٰہٰ) طٰہٰ)

وہ شام کو طوافِ کعبہ سے فارغ ہو کر مظفریہ کالج کی چھت پر چڑھ جاتے اور وہاں سے اس وقت تک کعبہ کو اپنی نظروں کے سامنے رکھتے جب تک انھیں نیند نہ آجاتی۔وہ ایک پتھر اپنے سر کے نیچے رکھ لیتے اور تھوڑی دیر ستا لیتے تھے۔پھر وضو تازہ کر لیتے اور طواف میں مصروف ہو جاتے یہاں تک کہ نماز فجر کا وقت ہو جاتا۔ان کی شادی شہاب ابن برہان کی بیٹی سے ہوئی تھی جو ایک قانون دان اور ان کے ہمعصر صوفی تھے۔یہ خاتون اکثر اپنے والدِ محترم سے یہ شکایت کرتی کہ اس کی طرف اس کے خاوند کی توجہ کم ہے۔والد اپنی بیٹی کو صبر کی تلقین کرتے اور یوں چند برس تک تو وقت گزرتا گیا مگر حالات بدستور وہی رہے تو اس خاتون نے انھیں طلاق دے دی۔

شیخ ابوالعبّاس ابنِ مرزق

آپ اکثر مکے میں ہی رہتے تھے۔میں نے انھیں 1328ء میں وہاں دیکھا تھا جب وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ کعبہ کا طواف کرتے نظر آتے تھے۔سخت گرمی میں بھی انھیں طواف کرتے دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی۔صحنِ کعبہ میں سیاہ پتھر استعمال ہوا تھا جو اس وقت سرخ گرم پلیٹوں کی مانند گرم ہو جاتا تھا جب سورج نصف النہار پر ہوتا تھا میں نے کئی سقے ایسے دیکھے تھے جو فرش پر پانی چھڑکتے رہتے تھے لیکن جونہی پانی پتھروں کو چھوتا تھا اس جگہ کا رنگ تبدیل ہو جاتا تھا اور ان میں سے بھاپ نکلنی شروع ہو جاتی تھی۔ زیادہ تر لوگ جب دن کے اس حصے میں طواف کرتے تو سینڈل پہن لیتے تھے مگر یہ حضرت برہنہ پا طواف

کرتے تھے۔ ایک روز جب وہ طواف کر رہے تھے مجھے خیال گزرا کہ کیوں نہ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں مگر جب میں صحن عبور کر کے حجرِ اسود کو بوسہ دینے پہنچا تو مجھ سے تپتا ہوا فرش برداشت نہ ہو سکا۔ میں پہلا چکر مکمل کیے بغیر تیزی سے واپس آ گیا۔ میں بار بار اپنا سر کا سکارف زمین پر رکھتے ہوئے اس پر چل کر واپس پہنچ سکا تھا۔

نجم الدین السفونی

آپ بالائی مصر میں جج تھے۔ پھر ملازمت چھوڑ دی اور مذہب کی طرف اس قدر مائل ہوئے کہ مکے آئے تو اپنے قیام کو طویل کر دیا۔ وہ ہر روز عمرہ ادا کرتے اور رمضان المبارک کے مہینے میں دن میں دو عمرے کرتے تھے۔ ایسا کرتے وقت انھیں آنحضورؐ کی یہ حدیث مبارکہ یاد آتی کہ رمضان کے مہینے میں عمرہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی نے حج کیا ہو۔

عزیز الدین الواسطی

ان کے پاس دولت کے انبار تھے۔ انھیں ہر سال اپنے آبائی شہر سے رقم موصول ہوتی تھی۔ اس رقم سے وہ غلہ اور خشک کھجوریں خرید لیتے تھے جسے وہ غربا و مساکین اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ وہ سامان ان کے گھروں تک خود پہنچاتے تھے۔ وہ اسی کام میں لگے رہے یہاں تک کہ مالکِ حقیقی کے ہاں سے بلاوا آ گیا۔

ابوالحسن الانجری

آپ قانون دان تھے اور ضلع طنجہ کے رہنے والے تھے۔ آپ نے بھی مکہ میں اپنا قیام کئی برس کے لیے طویل کر لیا تھا اور یہیں وفات پائی تھی۔ میرے والد محترم اور ان کے درمیان گہری دوستی کا رشتہ استوار رہا۔ وہ جب کبھی طنجہ آتے ہمارے گھر میں قیام فرماتے تھے۔ مکے میں ان کے پاس مظفریہ کالج میں ایک کمرہ تھا جہاں وہ دن کے اوقات میں دینیات پڑھاتے تھے۔ رات کو وہ ربی کے زاویے میں چلے جاتے تھے (حجاز کے لوگ اس زاویے کا بے حد احترام کرتے تھے اور یہاں نذر و نیاز لے کر آتے تھے۔ طائف کے لوگ یہاں پھل بھیجتے ہیں۔ طائف کا ہر وہ شخص جس کے پاس کھجوروں، انگوروں، آڑوؤں اور انجیروں کا باغ ہے اس نے برسوں سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ وہ اپنی پیداوار کا ایک حصہ اس زاویے کو دے گا اور اپنے اونٹوں پر خود پہنچائے گا۔

طائف کا فاصلہ مکہ سے دو روز کے سفر پر مشتمل ہے)۔

حسن کی کہانی' جسے لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں: میں نے خود اپنا قیام مکہ میں طویل کر لیا تو یہاں اپنے آخری دنوں 1328ء میں ایک شخص کے بارے میں اطلاع ملی جس کا نام حسن تھا اور جو مغرب کا حسن کہلاتا تھا۔ وہ دیوانگی کے عالم میں پھرتا رہتا تھا اور عجیب وغریب کردار کا مالک تھا۔ اس کا یہ دیوانہ پن پیدائشی نہیں تھا بلکہ وہ کسی زمانے میں بزرگ نجم الدین الاسپاہانی کی خدمت کرتا تھا۔ جن دنوں یہ بزرگ مکے میں تھے' تو حسن کعبے کے گرد رات کو چکر لگایا کرتا تھا اسے ایک صوفی طالب علم بھی نظر آتا جو طواف کر رہا ہوتا تھا مگر عجیب بات تھی کہ دن کے وقت وہ اسے کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک روز وہ صوفی اس کے پاس آیا اور کہا: ''حسن! تمہاری امی تمہارے لئے روتی ہیں اور تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ کیا تم ماں سے ملو گے؟'' حسن نے جواب دیا: ''ہاں مگر ایسا ممکن نہیں ہے وہ اب ہم میں نہیں ہے''۔ اس صوفی طالب علم نے اس سے کہا: ''کل رات اسی جگہ مجھ سے ملنا دیکھتے ہیں اللہ کیا کرتا ہے''۔ اگلی رات جمعرات کی رات تھی حسن اس شخص سے ملا اور دونوں کافی دیر تک طواف کرتے رہے۔ پھر طالب علم مسجد سے باہر نکل آیا اور حسن اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ باب معلّی کے باہر اس شخص نے حسن سے آنکھیں بند کرنے اور اس کی قمیص کو پکڑ لینے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے حسن سے پوچھا: ''تم اپنے آبائی شہر کو پہچان لو گے اگر اسے دیکھ لیتے ہو؟''۔ حسن نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ وہ اپنی ماں کے گھر کے دروازے پر کھڑا ہے (غالباً اس کے شہر کا نام اصفی تھا)۔ وہ اندر چلا گیا اور تین ہفتے اپنی والدہ کے پاس رہا۔ بالآخر وہ ایک روز گھر سے نکلا اور قبرستان پہنچ گیا اور اس صوفی طالب علم کے ساتھ راستے طے کرتا رہا۔ اس نے حسن سے پوچھا: ''تم کیسے ہو؟'' حسن نے جواب دیا: ''میں شیخ نجم الدین کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں'' میں نے اس کے گھر کو عام حالات میں چھوڑا تھا مگر اب میں کئی روز سے دور ہوں اور آپ سے میری درخواست ہے کہ مجھے ان کے پاس واپس لے جائیں''۔ طالب علم نے کہا: ''یقیناً۔ ضرور لے جاؤں گا'' اور انھوں نے رات کو ایک دوسرے سے ملنے کا وعدہ کیا۔ جب حسن قبرستان واپس پہنچا تو صوفی طالب علم نے اس سے آنکھیں بند کرنے اور اس کی قمیص کا دامن پکڑ لینے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس مکے پہنچ چکے تھے۔ حسن سے وعدہ لیا گیا کہ وہ اس واقعہ کا ذکر شیخ نجم یا کسی اور سے نہیں کرے گا۔ جب شیخ نے حسن سے پوچھا کہ وہ کہاں رہا تو اس نے انھیں کچھ نہ بتایا۔ جب مجبور کیا تو اس نے شیخ کو پوری کہانی سنا دی۔ کہا گیا مجھے وہ آدمی دکھاؤ۔ حسن شیخ کو رات کے وقت خانہ خدا میں لے گیا۔

طالب علم وہاں موجود تھا۔ حسن نے اشارہ کر کے شیخ نجم کو بتایا کہ وہ شخص یہ ہے۔ طالب علم نے سن لیا اور اس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا: ''خاموش رہو''۔ اسی لمحے حسن کی زبان بند ہو گئی اور اس کی عقل اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ وہ اب مسجد میں دن رات موجود رہتا اور طواف کرتا رہتا تھا' نہ ہاتھ منہ دھوتا تھا نہ کپڑوں کو نہ نماز پڑھتا تھا۔ جب بھوک لگتی تو مارکیٹ میں آ جاتا۔ لوگ اسے کھانا کھلاتے' کپڑے پیش کرتے اور دعا کی درخواست کیا کرتے تھے۔ مارکیٹ سے جو چاہتا اٹھا کر کھا لیتا کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ لوگوں کا اس بات میں یقین تھا کہ اس کی خدمت کرنے سے ان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی تھیں اور ان کے کاروبار میں برکت ہوتی تھی۔ اس کا یہی معمول 1329ء تک رہا پھر سلطان کا وہ گارڈ جسے میں نے مصر میں المرشدی کے زاویے میں دیکھا تھا حج کے لیے آیا اور حسن کو واپس مصر لے گیا تھا۔ پھر مجھے اس کے بارے میں کبھی کوئی اطلاع نہ ملی۔

☆☆☆

دوسرا حصہ

یورپی سیاحوں کی آمد

یورپی مفاد کا احیاء

مرتدین، مدعیانِ کاذب، غلام اور سکالر

(1503 - 1814ء)

مشرق نہ صرف یورپ سے متصل ہے بلکہ یہ تو یورپ کی عظیم امیر ترین اور قدیم ترین نوآبادیوں کی سرزمین ہے، اس کی تہذیبوں اور زبانوں کا یہ سرچشمہ رہا ہے اور ثقافتی حریف بھی۔ یہ اکثر گہرے اور بار بار ابھرنے والے عکس کا آئینہ بھی تھا۔ (ایڈورڈ سعید، استشراق)

1500ء کی پہلی دہائی سے آغاز کرتے ہوئے سیاحوں کی ایک نئی نسل نے بحیرہ احمر کے علاقے میں آنا شروع کر دیا تھا۔ یہ تجارتی قافلوں کے ساتھ شامل ہو جاتے اور ضرورت کے مطابق عربی زبان کافی حد تک سیکھ لی تھی۔ ان میں سے چند جہاں گشت کے پہنچ گئے تھے اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اس سفر کے بارے میں لکھا بھی۔ ان کا تعلق اسلامی دنیا کی بین الاقوامی برادری سے نہ تھا۔ بہت سے تو ایسے بھی تھے جو غیر مسلم تھے بلکہ وہ یورپی عیسائی تھے جنھوں نے اپنی شناخت اور تعارف چھپا لیا تھا۔ بطور مصنفین ان کے تخاطب مغربی قارئین اور سامعین تھے۔ بطور سیاحوں کے انھیں جن قوموں نے مختلف سمتوں میں دھکیل دیا تھا وہ نصر خسرو یا ابن جبیر کو دھکیلنے والی قوتوں سے مختلف تھیں۔ اس سے قبل کہ ہم ان کی کتابوں کا جائزہ لیں اور انھیں سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ جانیں کہ اس جہاں گردی کے پیچھے ان کے کیا مقاصد پنہاں تھے، ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جس وقت نے انھیں جنم دیا اس نے یورپ کو نئی شکل کیسے دی اور اسلام کے بارے میں یورپ کس طرح کی سیاسی بصیرت رکھتا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے ہمیں اپنے پچھلے تناظر کے برعکس رُخ پر چلنا ہو گا اور اسلام اور خودحج کا مغربی سوچ کے نقطہ نظر سے ازمنۂ وسطیٰ کے اختتام پر جائزہ لینا ہو گا۔

جس زمانے میں ابن بطوطہ اپنا سفرنامہ لکھنے کے لیے ترک گیا ایک جیئے ڈکٹی پادری اتھریڈ آف بولڈن نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک نئی تجویز پیش کی تھی۔ اس نے تجویز دی کہ موت کے وقت تمام انسانوں کو خواہ وہ مسلمانوں ہو یا عیسائی یا دنیا کے کسی بھی مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں انھیں براہ راست خدا کا واضح تصور حاصل ہوتا ہے اور اس تجربے کے جواب کی روشنی میں وہ دائمی حسن شعور رکھتے ہیں۔ اوتھریڈ ہر دیگر لحاظ سے ایک پرعزم قدامت پسند تھا۔ اس کے باوجود اس کی تجویز منکرین خدا کو ایک فائدہ عطا کرتی ہے جو اس سے قبل صرف عیسائیوں کے لیے مخصوص تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے بظاہر یہ اس کی اپنی اختراع تھی اگرچہ بعد ازاں اس قسم کے خیال کو مسترد کیے جانے اور واپس لے لینے اس کے تصور اور اشاعت کو روک دینے کے عمل نے اس کے ثقافتی ماحول کے اضافی کھلے پن کی وضاحت کر دی تھی۔ آئندہ 150 برسوں میں مسیحی یورپ نے کیسے اس

سے انکار کر دیا تھا کہ ایک ایسی دنیا سے جس میں اکثر قبل از جدید تحقیق ظلم و تشدد کے ماحول میں نئے تصورات اب بھی ممکن تھے یہ ایک بڑی گنجلک کہانی ہے۔

راجر بیکن کی 1220ء میں پیدائش اور 1370ء میں اوتھریڈ کے انتقال کے درمیانی سال ازمنہ وسطیٰ کے عروج کے آخری سال نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد یورپ کا ایک طویل عہد تاریک شروع ہو گیا تھا۔ اس دوران کفر و الحاد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے مستعمل مشینری ظلم و ستم پر مبنی نے روشن خیالی پر مبنی مکالمے کو مکمل شکست دے دی تھی۔ ولیم اوکہام، جانز ایکھارٹ روحانی فرانسسکیوں اور دانتے نے مغربی فکر کی دیانت داری میں تنزل کے آغاز کا اشارہ دے دیا تھا۔ اس بہت بڑی مداخلت کے دوران غیر ملکیوں سے نفرت نے تجسس، اسلام میں دلچسپی اور کلاسکس کے مرجھا جانے کی جگہ لے لی تھی اور مسلم فکر کا یا تو مقاطعہ کر لیا گیا یا اسے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ پچاس برس بعد یہ کوئی دانشمندی نہیں رہی تھی کہ عربی، عبرانی یا یونانی سیکھی جائے۔ سیگو دیہ کے جان نے 1453ء میں جب قرآن کے ایک نئے ترجمے کی تجویز پیش کی تو اسے پورے یورپ میں عربی کا ایک بھی عیسائی سکالر نہ مل سکا۔ آئبیریائی مسلمانوں اور عیسائیوں کو وسیع تعداد میں یا تو جلاوطن کر دیا گیا تھا یا وہ سزا کے خوف سے کثرت وجودی مسلم اسپین سے شمالی افریقا، بوسنیا اور ترکی کی طرف فرار ہو رہے تھے۔ اس آٹھ سو سالہ ثقافت کا مکمل خاتمہ یورپ کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ تراجم کے عظیم عہد نے ظلم و تشدد، عسرت و مفلسی اور خوف و ہراس کے لیے راستہ کھول دیا تھا۔

مؤرخین عموماً اس تخفیف اور کمی کے تین اسباب بیان کرتے ہیں۔ اولاً یہ کہ تیرھویں اور چودھویں صدی کے ایشیاء سے منگول حملوں نے دنیا کی معلوم آبادی کو کئی گنا بڑھا دیا تھا اور رومن کیتھولک اچانک یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کی تعداد پچاس گنا بڑھ گئی ہے۔ ثانیاً یہ امید کہ اسلام مٹ جائے گا، ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بجائے مٹنے کے، کیونکہ یہ ایک چھوٹی قوت تھی، اسلام تو زیادہ پھیل رہا تھا۔ چودھویں صدی کے آخر میں زیادہ تر بلقانی ترکوں کی مدد کرنے والے تھے اور ہندوستان کی تجارت کی دولت تک رسائی کا نقصان یورپ کی معیشت کو بہتر بنا رہا تھا۔ تیسرا یہ کہ طاعون کی وباء پھیل گئی تھی جو ابن بطوطہ کے پیچھے پیچھے شام اور مصر سے ہوتا ہوا اس کے وطن پہنچ گیا تھا۔ اس نے دمشق اور قاہرہ کا بہت نقصان کیا تھا اور 1350ء میں اس نے یورپ کی ایک تہائی آبادی کو نگل لیا تھا۔ طاعون کے پھیلنے کی سائنسی وجہ سے ناواقف لوگ اسے گناہوں کی سزا تصور کرتے تھے۔ کیتھولک یورپ ایک طویل الہامی شفق میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ تین عناصر یعنی منگولوں کے

حملے'اسلام کی مغرب کی ترویج' طاعون کی بیماری کا پھیلنا ایسے اسباب تھے جنھوں نے مغربی یورپ کو بری طرح پریشان کر دیا تھا۔

دور دراز کی ناکام صلیبی جنگوں کی جگہ ایک نئی تنہائی پسندی کی حکمت عملی نے لے لی تھی۔ اپنے گھر کو منظم کیا جائے کفر الحاد کو مٹا دیا جائے' چھوٹے بڑے کی درجہ بندی کو ختم کیا جائے۔ ایک ایسا براعظم جسے گلٹی دار طاعون اور نمونیہ نے گھیر لیا تھا اور رومن کیتھولک چرچ نے اپنے اندر دشمنوں کا سراغ لگا لیا تھا۔ نجات پاک کر دینے والے عدل وانصاف کی شکل میں آئی تھی۔ کتب خانوں کو آگ سے صاف کیا گیا۔ جس طرح ہزاروں خانہ بدوش ''زندیق وملحد''، کیتھولک، مسلمان اور یہودی تھے۔ ملعون و مردود کو سزا دی گئی، نکال باہر کیا گیا۔ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ مسلم سوال نے کلمہ کفر کے خلاف جنگ کے لیے کئی فیصلہ کن طریقے تشکیل دے دیئے تھے۔ خالصتاً علم دین کے حوالے سے اسلام نے ہمیشہ چرچ کو ناراض کیا ہے۔ یہاں ایک ایسا عقیدہ تھا جو ایک خدائے واحد کو علیم وخبیر خالق مانتا تھا جس کے نزدیک روح لافانی تھی۔ جو عہد نامہ جدید وعتیق دونوں کو مقدس تصور کرتا ہے' جو حضرت عیسیٰ کو کنواری مریمؑ کے بطن سے پیدا ہونے کو مانتا ہے اور انھیں بطور خدا کے پیغمبر کے گہری عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے مگر اسے خدا نہیں مانتا' اس میں پادریت کی کوئی گنجائش نہیں' اپنی آخری آسمانی کتاب (قرآن) کی پیروی کرتا ہے جس کے نزدیک جنسی کشش اور دولت دونوں خدا کی نعمتیں ہیں۔ پھر اسلام بہت حد تک کامیاب بھی ہے۔

اپنے ابتدائی ایام ہی سے اسلام یورپ کے لیے ایک پیمانہ رہا کہ کفر الحاد دراصل کیا تھا تاہم جب پندرھویں اور سولہویں صدی میں مسلمانوں کی اکثریت کو اسپین سے نکال دیا گیا تھا تو ان کے اصل علوم بتدریج گھٹ گئے تھے۔ اسلام کی یورپی تصویر زیادہ مسخ ہوتی گئی اور یہ کیتھولک عقیدے کی بہت بڑی نقالی بن کر رہ گیا۔ اس کا دوہرہ چہرہ بنا کر پیش کیا گیا جو اپنی تمام اچھائی میں عیسائیت کی الٹی تصویر تھی قربانی کے بکرے کا چہرہ۔ یہ کوئی اس لیے نہیں تھا کہ اس موضوع پر نئے طریقے سے سوچا جا رہا تھا بلکہ صرف صلیبی جنگوں کا ثقافتی پروپیگنڈہ سامنے آ گیا تھا اور اس کا اطلاق اس احتسابی عدالت پر ہونے لگا تھا جو ملحدین کو سزا دینے کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ مغرب کی دانشورانہ تاریخ میں اسلام کو واپس وہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ جہاں رولینڈ کی قدیم فرانسیسی رزمیہ میں کسی خانقاہ میں بھوت پریت کی تصویریں رکھ دی گئی تھیں۔ ایک مسلمان ہر وہ شے بن گیا جو ایک اچھا عیسائی نہیں تھا۔ اسلام کو گھٹا کر چند خود حوالہ جاتی اشارات وعلامات بنا دیا گیا تھا۔ ہم دیکھیں گے کہ

اس ثقافتی فریب نظر نے ازمنۂ وسطیٰ کے مغرب کے سفرناموں میں خیالی کہانی (فکشن) کے مددگار کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

مغربی سفرناموں کا ارتقاء

یورپی سفرنامے جو سفر مکہ پر لکھے گئے ان کی ابتدا نشاۃ ثانیہ سے ہوتی ہے مگر ان میں قدیم ادبی پس منظر بھی شامل ہوتا ہے۔ مارکوپولو تک مغربی سفرنامے جو مشرق قریب کے بارے میں لکھے گئے ان میں سے زیادہ تر تخیل کی پیداوار تھے۔ پورے عہدِ تاریک میں جب یورپی لکھاریوں نے مشرق پر کتابیں لکھیں، اس منصوبے تک رسائی اس کیکڑے کی مانند تھی جو پیچھے کی طرف یا طرفین میں رینگتا ہے۔ انھوں نے سرزمینِ مقدس کی وہ صورت دکھائی جو بائبل میں درج تھی یا انھوں نے ایک ایسی بدیسی دنیا کا خوفناک خواب دکھایا جس میں ایسے غضبناک عفریت ہوں جو یروشلم کے دروازوں سے چین تک پھیلے ہوئے تھے۔ پہلا نقطہ نظر مؤثر زہد وتقویٰ والا تھا۔ دوسرا نظریہ زیادہ سیکولر تھا جس نے سائنسی لہجے کو متاثر کیا تھا اور مضحکہ خیزی پر زور دیا تھا۔ پارسا زجانور اور تخیلاتی ذخیرے اور انبار۔ دونوں کا حقیقی زندگی کی معرکہ آرائیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مذہبی کتب حج کے لیے جانے والے راہبوں اور راہبات نے لکھیں۔ ان میں اصل جگہ کا تذکرہ تو ہوتا ہی نہیں ہے جب ان مصنفین نے یروشلم کو دیکھا تو انھیں نہ مسلمان نظر آئے، نہ یہودی اور نہ ہی مشرقی عیسائی نہ ان کی مارکیٹیں، نہ گند، نہ گاؤں، نہ قلعے بلکہ ان میں تو صرف دائمی مقام نگاری تھی جسے انھوں نے بائیبل سے ''نقل'' کیا ہے۔ انھوں نے لازمانی ادبی ارضی مناظر میں غلط جغرافیہ پیش کیا ہے۔ ان کے صفحات میں سفر کے بارے میں کوئی حوالہ ہی نہیں ملتا نہ کوئی طبعی علم شامل کیا گیا ہے۔ پورے ادب میں مثالیں کثرت سے ہیں۔ مثال کے طور پر سینٹ جیروم (347-419/20) کی ابتدائی تصویر کشی میں دریائے اُردن بھی کچھ بے کرتر اور گیلا نہیں پُر آب نہیں ہے۔

''ابھی رات بمشکل گزری تھی کہ وہ بڑے اشتیاق کے ساتھ دریائے اُردن پر آئی۔ وہ کنارے دریا کھڑی تھی آفتاب طلوع ہوا تو اسے نیکی و راستبازی کا وہ سورج یاد (عیسیٰ) آ گئے کہ کس طرح پادری دریائے اُردن کے بالکل وسط میں اس کی خشک زمین پر کھڑے تھے اور خدا نے کیسے ان کا پتا کر کے ان پانیوں کو صاف کردیا جنھیں سیلاب نے گندا کردیا تھا۔ سفرناموں کے حوالے سے صدیاں گزر جانے کے بعد تبدیلیاں اور اشتیاقی صورت حال ضرور پیدا ہوئی ہے مگر جہاں تک اس مقدس سفر کے ریکارڈ کا تعلق ہے وہ اصل مشرق کی

سمت سکڑ کر روحانی موضوع کے مقام پر آ کر رُک گیا ہے۔ ان راستبازی پر مبنی منتخب مشقوں میں گیتھس مین (یروشلم کے قریب وہ باغ جس میں عیسیٰ علیہ السلام کو دھوکہ دیا گیا تھا) کے درختوں کے پتے تک سیاہ روشنائی اور لاطینی حروف میں تبدیل ہو گئے تھے۔

ایسے سفرناموں کا ریکارڈ کم معلومات فراہم کرتا تھا جو زیادہ سیکولر تھے۔ یہ ایک قسم کی کتاب عجائبات بن گئی تھی جس میں اٹلس اور قصصِ حیوانات شامل ہوں یا یہ رپلے کی کتاب ''اس پر یقین کریں یا نہ کریں'' بن گئی ہو۔ اس کی مقبولیت کی تعریف کرنے کے لیے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سوائے تجارت اور حج کے یورپی مصنفین نے 1250ء سے قبل مقدس سرزمین پر جانے کے بعد اس کے بارے میں بہت کم لکھا۔ ان کا طریقہ واردات یہ تھا کہ وہ ''مشرق'' کے عنوان سے کچھ مقامات الگ کر لیتے اور پھر ان کو دیو مالائی باشندوں سے آباد کر دیتے تھے۔ ایک خاص قسم کی کتاب عجائبات میں ماورائی چیزوں کا مختصر اذکر ہوتا تھا' پراسرار مقامات ہوتے تھے جن میں ایسی مخلوق آباد کی جاتی تھی جو سرے سے وجود ہی نہ رکھتی ہو۔ ایسی کتب کے متن نقشوں اور ڈراؤنے جانوروں اور عجیب و غریب مخلوق سے مزین ہوتے تھے۔ 2 سروں کے بغیر انسان جن کی چھاتیوں پر آنکھیں ہوتی تھیں۔ انسان آٹھ فٹ لمبے اور آٹھ فٹ چوڑے ہوتے تھے۔ بکری کے پاؤں والی برہنہ عورتیں ہوتی تھیں جن کے بال ان کے پاؤں کو چھو رہے ہوتے تھے۔ عفریت اور کتے کے سروں والے انسان ہوتے تھے۔ دو سروں والے بچے ہوتے تھے' دھات کی بڑی بڑی دیگیں ہوتی تھیں جو جہنم کے ٹھکانے کی صحیح صحیح نشاندہی کرتے ہوئے دکھائی جاتی تھیں۔ یہ خوفناک ایجادات انسانوں کی تفریح طبع اور انھیں خبردار کرنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ انسان کرسی پر نیم دراز ہو کر انھیں پڑھتا اور محظوظ ہوتا تھا اور یورپ کو اس دنیا کے مرکز میں دکھایا جاتا تھا' جو اس طرح دکھائی جاتی تھی جبکہ خوفناک مشرق کو حاشیوں پر دکھایا جاتا تھا۔ جوئل پیٹر وٹکنز کی فوٹوگرافی کے برابر ایک ازمنہ وسطیٰ کے تحریری کام کی ان کتب عجائبات کو تمثیلی قصوں کے طور پر پڑھا جاتا ہے۔ یہ مسیحی یورپ کو یاد دلاتی تھیں کہ ہر وہ شے جو فطرت کی ضد تھی وہ مشرق میں ملتی تھی۔

تیرھویں صدی اور چودھویں صدی کے ابتدائی دور میں صلیبی جنگوں کے خاتمے اور ایشیائی راستوں کے کھل جانے سے عالمگیر سطح پر سفر میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس مختصر سے عرصے میں ان چند اصل سفر کرنے والے سیاحوں نے مشرق کے بارے میں وہ صحیح صحیح معلومات فراہم کیں جو مختلف مقامات پر خود جا کر انھوں نے حاصل کی تھیں' یہ محض تصوراتی یا تخیلاتی نہیں تھیں۔ ان مصنفین میں سرفہرست مارکو پولو اور ولیم ربرک

ہیں(1324 - 1254)۔انھوں نے مضحکہ خیز دیومالائی قصوں کے بجائے وہ لکھا جو سچ تھا اور قابلِ یقین تھا۔ مارکو پولو نے یورپ کو مشرق کے بارے میں وہ معلومات فراہم کیں جو ان سے بالکل مختلف تھیں جو چرچ اب تک سمجھتا اور جن کا پروپیگنڈہ کیا کرتا تھا۔منگولوں کے حملوں کے بعد' طاعون پھیلنے کے بعد بھی عدالت احتساب نے ایک بار پھر مشرق کے خلاف محاذ آرائی شروع کردی تھی۔متجسس تاجروں' قانون دانوں' سکالرز اور یورپ بھر کے عام قارئین نے اس سفرنامے کے کئی ایڈیشنوں اور اس کے تراجم کو مقبولیت بخشی۔

جب مارکو پولو کا سفرنامہ دنیا بھر میں مقبول ہوا تو اس کی ''حقیقت پسندی'' نے بعد میں آنے والے مصنفین کو حقیقت اور افسانے کے درمیان نئی آمیزش سے آگاہ کردیا تھا۔ان مصنفین کا ایک قدم کتاب عجائبات کے دور میں اور دوسرا نشاۃ ثانیہ میں ہوتا تھا اور انھوں نے ''سچائی اور حقیقت پر مبنی'' اسلوب اپنالیا تھا۔ وہ اس کا انطباق سنی سنائی باتوں اور مشاہدات دونوں پر کرتے تھے۔آج ان کا ذکر بعض اوقات جھوٹے سفرنامہ نگاروں کے طور پر کیا جاتا ہے اس لیے کہ انھیں ''حقیقت'' پر زور دینے کی عادت تھی' جو ان مقامات کے بارے میں حقیقت آمیز معلومات فراہم کرتے تھے جہاں وہ ابھی گئے نہیں تھے۔اس عہد کے ایک کنارے پر سرجان منڈیویلے (1356ء) کی کتاب ہے' جو انسائیکلو پیڈیا نگار تھا اور جس کی بہت سی اختراع کی ہوئی کہانیاں آج بھی سچ معلوم ہوتی ہیں۔ہم اس کے ممنون ہیں کہ اس نے پیٹرونیس کے بعد پہلی بار حقیقت پر مبنی مغربی کہانیاں لکھیں۔ہم نہیں جانتے کہ یہ شخص کون تھا اور اس نے اپنی تحریروں کے لیے زبان کون سی استعمال کی لیکن جدید تجزیہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس نے مطالعہ کبھی نہیں چھوڑا تھا۔سفرنامے کے علاوہ اس نے دوسروں کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا اور ان کی دریافتوں پر مبنی نثر کو بہتر بھی بنایا۔اس عہد میں جب براعظمی تنہائی کا دور تھا' منڈیولے نے یورپ کی پیاس بجھانے کے لیے انھیں ایسی خبریں فراہم کیں جو مشرق کے بارے میں حقیقت پر مبنی تھیں۔اس کے سفرنامے کے کئی تراجم اور کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور اس کا سفرنامہ ''وائج اینڈ ٹریولز'' عہدِ وسطیٰ کی نثر میں لکھی جانے والی مقبول ترین کتاب قرار دی گئی گو یہ داستانی انداز میں لکھی گئی مگر اس نے یورپی قارئین کے لیے مشرق کی پراسراریت ختم کردی تھی اور ایسا اس لیے ممکن ہوا کیونکہ اس کی تحریر میں وہ سب شامل تھا جو قابلِ یقین تھا۔یہ ایک سیکولر سیاح کی آواز تھی جس کا آمنا سامنا ایک ممنوعہ حقیقی دنیا سے تھا۔

اس عہد کے اختتامی ایام میں کذب وجھوٹ سے کام لینے والوں کی ایک خاص قسم سامنے آئی۔یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے دنیا کے دور دراز علاقوں کا سفر کیا تھا' انھوں نے مکے پہنچنے کا دعویٰ تو ضرور کیا مگر

درحقیقت وہاں پہنچ کبھی نہ پائے تھے۔ فلیکس فیبری (1484ء) کا سفرنامہ اسی قسم کا ہے۔ اس میں یروشلم کے بارے میں حقیقت پر مبنی ایک رپورٹ کے بعد جب مکے کا ذکر آتا ہے تو محض تخیلاتی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں جن سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ مصنف خود وہاں نہیں گیا۔ حجرِ اسود کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ یہ شیطان کے بت کے پیچھے ہے جہاں اسے آنحضور ﷺ نے نصب کیا تھا۔ فیبری اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے لکھتا ہے کہ حجاج جمرات کی رسم ادا کرتے وقت کنکریاں اپنی رانوں کے درمیان میں سے پیچھے کی جانب گزار کر شیطان کو مارتے ہیں۔

> ''بہت سے حجاج مکے اس لیے آتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کے تابوت کی زیارت کر سکیں جو ہوا میں بغیر کسی رسی یا زنجیر کی مدد کے لٹک رہا ہے' حالانکہ درحقیقت مکہ سے دو سو میل شمال میں مدینہ طیبہ میں آپ کا روضہ مبارک ہے۔ اس سفرنامے کے اختتامی پانچ صفحات میں وہ اس بات کا خود اعتراف کر لیتا ہے کہ ''میں نے یہ حج تصور میں کیا تا کہ میں یہ دکھا سکوں کہ ہمارے اور اُن کے حج میں کیا فرق ہے''۔

دو برس بعد آرنلڈ وان ہارف' ایک متمول جرمن نوجوان کولون سے حج کے لیے روم روانہ ہوا۔ وہ پھر مصر پہنچا۔ مکے کے سفر کے حالات جو ایک صفحے پر مشتمل ہیں' عربوں کے سفر کے ایک حصے کو اس قدر خلط ملط کر دیتا ہے کہ اس سے قاری کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ اس نوجوان جرمن کا کہنا ہے کہ اسے ایک عیسائی مملوک سپاہی ''مرتد'' نے مکے کے اندر داخل ہونے میں مدد دی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ اسے یہ شہر بے حد خوبصورت نظر آیا جس میں نایاب پھلوں کے باغات تھے۔ اس شہر کے نزدیک، جنوب کی سمت ایک دریا بہتا ہے جو بحرِ احمر میں جا گرتا ہے''۔ (اگر یہاں کوئی دریا ہوتا تو کیا یہ اگست کے مہینے میں صحرا میں بہہ رہا ہوتا)۔ اسے یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ مکے میں حضرت محمد ﷺ کے روضہء مبارک پر بھی گیا۔ مدینے کا محلِ وقوع بیان کرتے وقت وہ اسے جنوب کی سمت میں دکھاتا ہے جسے ٹرپا کہتے تھے۔ یہ اسلام سے قبل اس شہر کا نام تھا جو ایک ہزار سال ہوئے اب نہیں رہا تھا۔ عدن پہنچنے پر وہ اس شہر کو مداچ کہتا ہے' یہ ایک اور غلط بیانی ہے کیونکہ یہ اس نے دوسری صدی کے یونانی مصری جغرافیہ دان ٹولمی کے ہاں سے لیا ہے۔

مکہ کے یہ سفرنامے اور اس شہر میں آنے والے لوگوں کا ذکر ساتھ ساتھ چلتا ہے اور یہ اس وقت بڑھ جاتا ہے جب مشرق میں تجارتی قافلوں کا رجحان بڑھ گیا تھا۔ یہ یورپ میں 1490ء کی دہائی میں ابھرا۔

جب کولمبس، اسپین جانے کے لیے مغربی سمت بحری جہاز میں گیا تو پرتگالی جو قدیم اندلس کا دوسرا بازو تھے۔
متبادل بحری راستوں کی تلاش میں مشرق کی سمت سفر کر رہے تھے۔ یہ کوئی حادثہ نہیں ہے کہ دو مغربی بادشاہتیں
جو عربوں کے بحری جہاز بنانے اور اس تکنیک کے تجربے سے واقف تھیں ان سمندری راستوں کو سب سے
پہلے آگ لگانے والوں میں شامل ہوں۔ مشہور مؤرخ ڈی جے بورسٹن کا یہ خیال درست ہے کہ ''وہ تکونا
بادبان'' جسے عرب بحیرہ روم میں لائے تھے' تیز و تند ہواؤں کے بالمقابل چلنے میں اس قدر عمدہ تھا کہ اس نے
پرتگالیوں کے لیے بحری سفر کو آسان و ممکن بنادیا تھا۔ عربوں نے ہی سب سے پہلے مضبوط پتوار بنائے تھے جس
سے کسی بھی بحری جہاز کا چلانا آسان ہو گیا تھا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ واسکو
ڈے گاما جب اپنے پہلے سفر پر مشرق کی جانب جارہا تھا تو اس کی رہنمائی ایک عرب کپتان ابن مجید نے کی تھی۔
اتفاق سے یہ عرب خود بھی مشرقی افریقا سے بحیرہ ہند کے پار جانے میں ناٹیکل ڈائریکٹری (بحری ڈائریکٹری۔
1490ء) کا مصنف تھا جو معاصر بحری سائنس میں ایک مقبول عربی خلاصہ ہے۔ اس میں وہ تمام معلومات
موجود تھی جو اس زمانے میں بحیرہ احمر اور بحرِ ہند میں سمندری سفر کے لیے ضروری تھی۔

1498ء کالی کٹ کو کھل جانے والے ایک راستے سے ایک نئی قسم کا سیاح بحیرہ احمر میں آنے لگا
تھا۔ ہارف پہلا آدمی تھا جس نے لفظ ''مرتد'' استعمال کیا جو بنیادی طور پر پرتگالی زبان کا تھا اور وہ بجا طور پر
انھیں قاہرہ اور دمشق کی مملوک افواج کے ساتھ جاملاتا ہے۔ سولہویں صدی کے بعد ان نئی مہمات کی کثرت ہو
گئی تھی۔ عنفوان شباب میں گھروں سے بھاگے ہوئے مرچنٹ نیوی کے بھگوڑے' نچلے طبقے کے کمی کمین' ڈاکو
لٹیرے' کہیں کہیں پادری بھی۔ کبھی کسی نئی دولت یا مہم کی تلاش میں مسلم دنیا میں داخل ہو رہے تھے۔
یہ گھریلو مشکلات سے بھاگ کر یا تو تباہ شدہ جہازوں کے ساتھ بہہ جاتے تھے یا غلام بنالئے جاتے
تھے۔ لفظ ''مرتد'' فرائد کے ان الفاظ کی گواہی دیتا ہے کہ ''اگر سفر کا ایک مقصد تجسس ہے تو اس سے بھی زیادہ
بڑا مقصد وہ ہے جو عنفوانِ شباب میں نوجوانوں کو بھاگ جانے پر اکساتا ہے''۔ ہر ایک فرد کے ساتھ اس کے
اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ اطالوی' یونانی' اسپینی' پرتگالی' فرانسیسی' جرمن' انگریز' آئرش' سکاٹس اور ولندیزیوں
(ہالینڈ کے) کی مثالیں سامنے رکھی جائیں تو یہ سب کے سب غیر متوقع مقامات سے آئے تھے۔ یہ وہ منفعت
پسند تھے جنھیں گولے بارود اور جنگی جہازوں کا تجربہ تھا۔ ان میں سے اکثر مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ مملوک
فوج میں شامل ہونے کے لیے بھی برائے نام سا مذہب تبدیل کرنا ضروری تھا۔ انگریزی اصطلاح ''ترک ہو

جانا' سلطنتِ عثمانیہ میں یہی معنی رکھتی تھی۔ ان میں سے چند ایک بہت اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے تھے۔ بہت سے ایسے تھے جو بے نام جنگوں میں' اکثر یورپی افواج کے خلاف مارے گئے تھے۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب ان کرداروں میں سے کوئی ایک مکے پہنچ گیا تھا۔ غالباً چند ایسے تھے جو غلاموں کے طور پر آ گئے تھے یا جنھوں نے اپنی شناخت تبدیل کر لی تھی۔ لیوڈووکوڈی ورتھما' ایک اطالوی مرتد تھا جس کا تعلق بولوگنہ سے تھا۔ اس نے 1503ء میں پہلا سفرنامہ حج لکھا تھا۔ ایک طویل سفرنامے میں پہلے پچاس صفحات اس سفر کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔ اس کا مکے جانے کا مقصد کوئی بھی ہو سکتا تھا سوائے مذہبی کے۔ وہ لکھتا ہے:

"8 اپریل کو دمشق کا قافلہ مکہ جانے کے لیے تیار تھا۔ میں چونکہ بہت سے مقامات اور وہاں کے مناظر دیکھنے کا خواہاں تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں تک کیسے پہنچا جائے' اس لیے میں نے قافلے کے مملوک گارڈ کے ساتھ دوستی گانٹھ لی تھی۔ وہ ایک عیسائی مرتد تھا۔ اس نے مجھے مملوک جیسے کپڑے پہنائے' مجھے ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا دیا اور مجھے دوسرے مملوکوں کے ہمراہ کر دیا۔ اس کے لیے میں نے روپیہ اور دوسری اشیاء اسے دی تھیں۔ یوں ہم اس سفر پر روانہ ہوئے۔

ورتھما کے ہمراہ جو پکے مسلمان حج کے لیے جا رہے تھے ان کے مقابلے میں ہمارا یہ سفر بہت حد تک مختلف تھا۔ مگر اس کے باوجود ہم حجاز میں تھے اور ہمارا شمار بے اصول تماشائیوں میں ہوتا تھا جن کا کوئی دین ایمان نہ ہو۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں جن پانچ سفرناموں کا ذکر شامل ہے وہ سب کے سب یورپی مصنفین نے لکھے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک ایسا تھا جو مسلمان فوت ہوا۔ البتہ خسرو' ابن جبیر اور ابن بطوطہ میں سے ہر ایک' جانے پہچانے مرکز کی جانب سفر کر رہے تھے۔ ان کے بعد کے سفرناموں کے مصنفین وہ بدیسی اور بیگانے تھے جو ایک ایسی منزل کی جانب جا رہے تھے جو ان کے لیے ممنوع تھی۔ ایک صاحبِ ایمان و عقیدہ فرد کو اس سفر کی کوششوں کا روحانی فائدہ ملتا ہے مگر دوسرے افراد وہ ہیں جو کسی مجبوری کے تحت اس موقعہ سے فائدہ اٹھا رہے تھے جس کا ان کے عقیدے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ حصہ ورتھما کے سفرنامے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ حج سے متعلق ایک فرد کی مفصل رپورٹ ہے جو صحیح ہے مگر بدقسمتی سے گمنام ہے۔ 1575ء کی اس مختصر سی سرگزشت کے ساتھ کتبِ عجائبات اور ان کے ابلیسی مشرقی مناظر ارضی زیادہ واضح اور غیر مبہم رپورٹنگ

کے لیے راستہ کھول دیتی ہیں۔ یہ دور ایک خالی جیب، نیم خواندہ سپاہی (ورتھما) سے شروع ہو کر 1814ء میں جان لیوس برکات پر ختم ہو جاتا ہے، جو کیمبرج یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ایک کلاسیکی ادبیات کا عالم تھا۔ دو نہایت جامع رپورٹر علی بے العباسی (1807ء) اور برکات ہیں جو انیسویں صدی کی عرب دنیا میں آزادی کی تحریکوں کے آغاز کے بارے میں درست اور چشم دید تصدیق فراہم کرتے ہیں۔ اس میں حجاز میں رونما ہونے والی سعودی بغاوت کا بطور خاص ذکر شامل ہے۔

ورتھما، علی بے اور برکات تینوں نے مسلمانوں کی حیثیت سے اپنی مرضی سے سفر کیا جبکہ جوزف پٹس کا مکے تک کا سفر جبر اور زبردستی کا تھا جہاں اسے ایک حاجی کے غلام کی حیثیت سے جانا تھا۔ مسلمان قارئین کو ان میں سے چند ایک کے سیکولر مقاصد کے ذکر سے صدمہ پہنچے گا، جو ایک طرح سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھے کہ اجازت نہ ہونے کے باوجود یہ افراد مکہ میں داخل ہوئے اور غیر مسلم قارئین انھیں روحانی طور پر خالی یا خفیہ طور پر نسل پرست سمجھیں گے۔ وہ انھیں پسند کریں یا نہ کریں یہ چند افراد اس خستہ حال گروہ کو تشکیل دیتے ہیں جو آنے والے مغربی افراد کے لیے اس موضوع پر کچھ لکھنے کے لیے ایک بنیاد مہیا کرتا ہے۔

☆☆☆

4۔ لیوڈووکوڈی ورتھما

بولوگنہ۔ 1503ء

جب لیوڈوکوڈی ورتھما 1502ء میں دمشق پہنچا تو اسے وہاں ایک ایسے یورپی کی موجودگی نظر آئی جس نے وہاں خوب قدم جمائے تھے۔ تیرھویں صدی سے اس علاقے میں وینس کے باشندے بہت فعال اور سرگرم تھے اور ہندوستانی تجارت پر مغرب کی اجارہ داری تھی۔ یہاں یونانی تاجر بھی تھے اور بہت سے یورپی سپاہی بھی۔ مملوک عسکری غلام جن کا تعلق جارجیا اور سرکیشیا سے تھا وہ سلطان کے خدام میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی گرفتار ہونے والے آسٹریائی یا روسی قیدی بھی تھے جن کو جنگ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ بہت سے مغربی مرتدین بھی یہاں موجود تھے۔ ورتھما کی جلد ہی ان میں سے کئی ایک کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک ایسا یورپی کپتان بھی تھا جو رسالے کی ایک یونٹ کا انچارج تھا اور جس کے ذمے مکی قافلوں کی حفاظت تھی۔ اس کے ساتھ دوستی بڑھا لینے اور اسے روپے پیسے دینے کے بعد یہ برائے نام مسلمان بن گیا تھا۔ یوں ورتھما مملوک فوج میں شامل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب اسے فوج سے تنخواہ ملتی تھی اور اس کے تحفظ میں رہتے ہوئے نئے نئے ارضی مناظر سے لطف اندوز ہونے کی آرزو پوری ہونے کی اُمید بندھ گئی تھی۔ اسے عربی زبان سیکھنے میں قطعاً کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی اور وہ ایک منفعت پرست سپاہی کے طور پر کے جا پہنچا تھا۔

بطور ایک مملوک کے اس کا یہ آغاز حیران کن نہیں تھا۔ یہ 1169ء کی بات ہے جب مصر میں غلام سپاہیوں کو متعارف کیا گیا تھا۔ مملوکوں نے ایک ایسی سلطنت میں ایک قابلِ بھروسہ عسکری طبقے کی ضرورت کا مسئلہ حل کر لیا تھا جس سلطنت میں کئی دھڑے اور گروہ تھے۔ نصر خسرو کے عہد کے سلجوقوں کی طرح انھوں نے حکمران کے پرائیویٹ محافظ کے طور پر آغاز کیا تھا اور رفتہ رفتہ یہ شہری علاقے کے سرکردہ افراد میں شمار ہونے لگے تھے۔ جب منگولوں نے 1258ء میں بغداد کو تاراج کیا تو پھر یہ مغرب کی سمت لوٹ مار کرتے بڑھ گئے تھے۔ مملوکوں نے انھیں روکا تھا۔ اپنی فتح کے بعد انھوں نے مصر اور شام کی ایک بڑی سلطنت کو سنبھالنے کے لیے وہاں مستقل قیام کر لیا تھا۔ اپنے دارالخلافہ قاہرہ میں بیٹھ کر انھوں نے حجاز میں اپنا ایک سیاسی کارندہ مقرر کر

کے مکہ میں رسالہ تعینات کر دیا تھا۔ انھوں نے جدہ کے رسم و رواج کو بھی اپنا لیا تھا اور شریف خاندان سے حاصل میں سے اپنا حصہ وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ ورتھما کے دور میں حجاز میں مملوکوں کی تعداد کافی تھی، اسی لیے انھوں نے ورتھما جیسے عیسائی مہم جو کو ایک ایسا بہروپ دے دیا تھا جو معتبر اور قرینِ عقل تھا۔

عرب میں ورتھما کا تجربہ یقیناً براہ راست حاصل کیا گیا تھا۔ پھر 350 برس بعد رچرڈ برٹن یہ لکھ سکتا تھا: ''مشاہدے کے درست ہونے کے حوالے سے وہ قدیم مشرقی سیاحوں کی صفِ اول میں شمار ہوتا ہے''۔

دوسری طرف اسے حج پر لکھنے والے مصنفین کا نمائندہ بمشکل تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے سفرنامے کے صفحات میں ہمیں جو تبدیلی لہجے کی نظر آتی ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نقطہ نظر میں نمایاں ردوبدل ہے۔ خسرو، ابن جبیر اور ابنِ بطوطہ کے ہمراہ ہم مکہ میں اہلِ ایمان کی رہنمائی میں داخل ہوتے ہیں۔ جب ہم ورتھما کے ساتھ ہوتے ہیں تو ہم اچانک ممنوعہ علاقے میں ہوتے ہیں اور حرم کو ہم اس شخص کی نظروں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں جو بہروپ دھار کر مداخلت بے جا کا مرتکب ہوا ہے۔ اس سفر میں مکہ پہنچنے پر یہ شخص کوئی مذہبی فریضہ سرانجام نہیں دے رہا بلکہ وہ تو ایک ایسا کام سرانجام دے رہا ہے جس کی اجازت ہی نہیں، جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں؟

ورتھما نے مشرق میں تقریباً پانچ برس تک سفر کیا۔ شروع میں وہ دمشق میں تھا اور اس سے پہلے ہی ''مختلف مناظر ارضی دیکھنے کی آرزو تھی''۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ یہ آرزو کیسے پوری کرے۔ پھر اسے ایک ترکیب سوجھی جو اسے مکے تک لے جا سکتی تھی۔ اس کی اپنی کتاب کے مطابق اگر ایسے ممالک ہیں جنھیں اس نے دیکھنا تھا تو یہ سب کے سب بحرِ ہند کے علاقے میں واقع تھے۔ یہ علاقہ مصالحوں کی تجارت کے لیے مشہور تھا جسے پرتگالی بحریہ مسلم بندرگاہوں اور اس علاقے کے پار سمندری راستوں میں حاصل کرنے میں مصروف تھا۔ ورتھما چند مہینوں کے اندر عرب سے گزرا۔ اس نے ہندوستان تک کا سفر بھی کیا اور ان جزائر میں بھی چار برس گیا جو مصالحوں کی تجارت کے لیے مشہور تھے۔ واسکوڈے گاما نے 1498ء میں یورپ کولزبن سے ہندوستان تک ایک ایسا سمندری راستہ دیا تھا جس میں بحری جہاز چل سکتے تھے۔ اب مصالحوں کی تجارت کے لیے مشہور جزائر کو ایک سلطنت کے زیرِ نگین لانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ورتھما نے ایک مسلمان کا روپ دھار رکھا تھا وہ ایک ایسے وقت میں اس نئی سلطنت کے آخری کنارے تک جا سکتا تھا جب مغربیوں کے لیے وہاں زندگی بڑی پُرخطر تھی۔

یوں لگتا ہے جیسے جاسوسی کا پیشہ ورتھما کے مزاج اور افتادِ طبع کے عین مطابق تھا۔ وہ ایک ایسا نوجوان تھا جو سفر کے نشے میں سرمست تھا' ان کے تجسس کی تسکین نہیں ہوتی تھی اور اس کی قدرتی دورنگی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے راستے میں بے شمار اجنبی افراد کو فریب دیا تھا۔ پوری کتاب میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں وہ بال بال بچا اور ایسے معصوم افراد بھی اسے ملے جن پر ورتھما غالب آیا۔ اس دیدہ دلیری میں نشاۃ ثانیہ کے قارئین کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کہاں تک شامل ہے؟ اس بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کی مثال اس بلی کی سی ہے جس کو نو زندگیاں دی گئی ہوں۔ ایک ایسا اپنی خدمت آپ کرنے والا بدمعاش جسے سفر کا بہت شوق تھا اور خواب یہ دیکھا کرتا تھا کہ وطن میں اس کے انعامات اس کے منتظر ہیں۔ پھر بھی اس کی پرفریب چالوں کے باوجود ورتھما کے بارے میں کسی شے نے مسلمانوں کو اس جیسا بنا دیا تھا۔

مکہ میں ایک مقامی تاجر نے اس کی مدد کی تھی تا کہ وہ مملوک فوج چھوڑ دے۔ عدن میں سلطان کی بیگم نے اس کی جیل سے رہائی میں مدد دی تھی۔ ورتھما بلاشبہ ایک بدمعاش تھا مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ پسندیدہ بھی تھا۔

ورتھما بطور ایک مصنف کے مغرب میں قدیم اور جدید سفرنامہ نگاری میں تقسیم کے دوران دو طرفہ پالیسی اختیار کرتا ہے۔ ایک طرف تو جہاں ہجوم اور لڑائیاں ہیں وہ ان میں شامل افراد کی تعداد میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتا ہے۔ وہ کتب عجائبات کی مارکیٹ کی طرف اثبات سے سر کو ہلا دیتا ہے اور مسجد الحرام میں توہماتی عہد کی دلدل میں پھنس جاتا ہے مگر اس کے باوجود ''سائنسی'' بھی ہو سکتا تھا جو اس حد تک درست اور صحیح کا قائل ہو کہ جو اُسے جھوٹے سفرنامہ نگاروں سے بالکل الگ تھلگ کر دے۔ وہ آنحضورؐ کے روضہ مبارک کو صحیح طور پر مدینے ہی میں دکھاتا ہے مکے میں نہیں اور دیگر دیو مالائی داستانوں اور پراسرار باتوں کے غبارے میں سے ہوا نکال دیتا ہے۔ اس کے سفرنامے میں مجموعی طور پر ثقافتی مسخ شدگی پائی جاتی ہے مگر اس نے تعصبات پر کافی حد تک کنٹرول کرتے ہوئے حج کی رسومات کو بغیر کسی ملاوٹ اور خود ساختہ بات کے پیش کیا۔

حج پر ورتھما کا سفرنامہ مغربی سفرنامہ نگاروں کے لیے ایک متجسس تمہید کا درجہ رکھتا ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے حج کے بارے میں صدیوں پر محیط مشاہداتی رپورٹوں کے بعد ہم یہ چند ابتدائی صفحات ایک ایسے سفرنامہ نگار کی کتاب سے پیش کر رہے ہیں جو ایک کاذب اور فریبی تھا۔ تاہم یہ بہتر ہوا یا بہت برا ہوا وہ اس مقدس سرزمین پر تھا۔ اس نے پوری دلچسپی اور بامقصد اور برمحل پابندی کے ساتھ لکھا اور مشرق کے بارے میں

جو قدیم غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں کسی حد تک انھیں بھی دور کیا۔ اس حوالے سے ورتھما کی تصنیف نے مغربی سفرنامہ نگاری میں ایک کٹھن بہتری کا آغاز کیا ہے۔ اس کی تحریر میں بے لگام تخیل کی تخلیق سے ہٹ کر زیادہ درست اور صحیح صحیح رپورٹنگ کی گئی ہے۔ اس کا سفرنامہ یورپ میں چھپنے والی پہلی کتاب تھی جسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے پہلے ایڈیشن (1510ء) نے جو روم میں چھپا قارئین کی فوری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔ چھ ماہ بعد اس کا لاطینی ترجمہ شائع ہوا' پھر جرمن' اسپینی' فرانسیسی' ڈچ اور انگریزی میں اس کے تراجم چھپے۔ وہ خود لکھتا ہے کہ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ''دس افواہوں کے مقابلے میں ایک عینی گواہ کافی ہوتا ہے''۔ میں اس کے سفرنامے سے چند اقتباسات اس حصے میں پیش کر رہا ہوں۔

☆☆☆

لیوڈووِکوڈی ورتھما کے سفرنامے سے اقتباسات

مکہ کی تعمیر کیسے ہوئی اور مور (Moors) وہاں کیوں جاتے ہیں: اب ہم شہر مقدس مکہ کا ذکر کریں گے۔ یہ کیسا ہے، یہاں سلطنت کس کی ہے اور حکمران کون ہے۔ شہر بے حد خوبصورت ہے' آبادی بہت ہے اور یہاں تقریباً چھ ہزار خاندان بستے ہیں۔ مکانات بہت عمدہ ہیں' ہمارے مکانوں کی طرح اور ہر مکان کی قیمت تین یا چار ہزار ڈیوکٹ (طلائی سکہ جو 9 شلنگ کے برابر تھا) ہے۔ اس شہر کے گرد فصیل نہیں ہے' شہر سے ایک چوتھائی میل دور ہمیں ایک پہاڑ نظر آیا جس پر سڑک انسانی ہاتھوں نے پتھر کاٹ کر بنائی تھی۔ پھر ہم میدان میں اتر گئے تھے۔ شہر کی دیواریں ان پہاڑوں پر مشتمل ہیں اور اس کے اندر داخل ہونے کے چار راستے ہیں۔ گورنر شہر ایک سلطان ہے یعنی چار بھائیوں میں سے ایک اور اس کا تعلق حضرت محمد ﷺ کے خاندان سے ہے۔ یہ قاہرہ کے سلطانِ اعظم کے زیرِ نگین ہے اس کے تین بھائی ہمیشہ اس کے خلاف برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ہم 18 مئی کو مکہ میں داخل ہوئے۔ ہمارا داخلہ شمالی سمت سے تھا۔ اس کے بعد ہم میدانی علاقے میں اتر گئے تھے۔ جنوب کی طرف دو پہاڑ ہیں جو ایک دوسرے کو تقریباً چھو رہے ہیں۔ یہاں سے مکہ کے گیٹ تک درّہ ہے۔ دوسری طرف جہاں سورج طلوع ہوتا ہے ایک اور پہاڑی درّہ ہے جہاں ایک وادی سی بن جاتی ہے۔ یہاں سے ایک سڑک اس پہاڑ تک جاتی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی دینی چاہی تو خدا نے اسے قبول کر کے ایک مینڈھا بھیج دیا تھا۔ یہ جگہ شہر سے آٹھ دس میل دور ہے۔ اس پہاڑ کی اونچائی دو تین پتھروں کے پھینکنے (ہاتھ سے) تک کی ہے۔ یہ ایک قسم کے پتھر کا ہے سنگ مرمر کا نہیں مگر اس کا رنگ اور ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر ان کی رسم کے مطابق ایک مسجد ہے جس کے تین دروازے ہیں۔ پہاڑ کے دامن میں دو بہت خوبصورت پانی کے ذخیرے ہیں۔ ایک قاہرہ سے آنے والے قافلے کے لیے ہے تو دوسرا دمشق سے پہنچنے والے قافلے کے لیے۔ یہ پانی بارشی ہوتا ہے اور کافی فاصلے سے بہہ کر یہاں جمع ہوتا ہے۔

آیئے اب شہر کو واپس چلتے ہیں (وقت آنے پر ہم قربانی کا ذکر کریں گے جو پہاڑ کے دامن میں دی گئی تھی) ہم جب شہر میں داخل ہوئے تو ہمیں قاہرہ سے آنے والا قافلہ ملا۔ یہ ہم سے آٹھ روز قبل پہنچا تھا' اس

لیے کہ یہ اسی راستے سے نہیں آیا تھا جس راستے سے ہم نے سفر کیا تھا۔ اس قافلے میں چونسٹھ (64) ہزار اونٹ اور ایک سو مملوک تھے۔ میری رائے میں اس شہر پر خدا کا قہر نازل ہوا ہے کہ یہاں نہ گھاس اُگتی ہے نہ درخت نہ کوئی اور شے۔ پھر پانی کی اس قدر قلت ہے کہ اگر بیک وقت تمام لوگ اپنی پیاس کے مطابق پانی پینا چاہیں تو چار (4) قویطرینی (وینس کا مائع کے لیے ایک پیمانہ) کا پانی روزانہ ان کے لیے کافی ہو۔

میں آپ کو بتاؤں گا کہ یہاں کے لوگ زندگی کیسے بسر کرتے ہیں۔ ان کے کھانے پینے کے سامان کا زیادہ حصہ قاہرہ سے آتا ہے یعنی بحیرہ احمر سے۔ یہاں ایک بندرگاہ ہے جس کا نام جدّہ ہے جو شہر سے چالیس میل دور ہے۔ خوراک کا کچھ حصہ یمن سے بھی آتا ہے اور کچھ ایتھوپیا سے۔ کچھ انڈیا کلاں سے اور کچھ انڈیا خورد سے۔ اس کے علاوہ خورد و نوش کا کچھ سامان فارس اور شام سے بھی آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہاں اپنے بیس روزہ قیام کے دوران میں نے اتنے زیادہ لوگوں کا ہجوم کسی ایک جگہ نہیں دیکھا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگ تو تجارت کی غرض سے یہاں آئے تھے، کچھ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی کے لیے حج کی ادائیگی کے لیے۔ اس معافی کے بارے میں آپ کو جلد معلوم ہوگا کہ اس کے لیے وہ کیا کرتے ہیں۔

مکہ میں مالِ تجارت

سب سے پہلے ہم اس مالِ تجارت کی بات کریں گے جو دنیا کے بہت سے حصوں سے آتا ہے۔ انڈیا کلاں سے بہت سے ہیرے جواہرات اور ہر قسم کے مصالحے آتے ہیں۔ کچھ سامانِ تجارت ایتھوپیا سے کچھ بنگلہ (بنگالہ) سے جس میں روئی، ریشم کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ موم اور عطریات بھی انڈیا سے آتے ہیں۔

مکہ میں گناہوں کی بخشش اور معافی سے متعلق بیان

آیئے ہم حجاج کی طرف سے مانگی گئی بخشش اور معافی کا ذکر کرتے ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک خوبصورت معبد ہے جو روم کے کولوسیم (بڑا تھیٹر، جلسہ گاہ) کی طرح کا ہے مگر یہ بہت بڑے پتھروں سے تعمیر نہیں کیا گیا بلکہ اس کی تعمیر میں بھٹے کی پکی اینٹوں کا استعمال ہوا ہے مگر یہ اسی طرح گول ہے اس میں چاروں طرف ایک سو دروازے ہیں اور یہ محراب دار ہے۔ (برٹن اور برکات نے دروازوں کی تعداد کم لکھی ہے، ممکن ہے ورتھما نے مبالغے سے کام لیا ہو)۔ معبد کے اندر داخل ہونے کے بعد آپ سنگ مرمر کی دس یا بارہ سیڑھیاں نیچے اترتے ہیں اور آپ کو یہاں وہ افراد کھڑے ملیں گے جو ہیرے اور قیمتی پتھر بیچ رہے ہوں گے۔ سیڑھیاں

اترنے کے بعد آپ کو چاروں طرف معبد ملے گا۔ دیواریں ہوں گی جن پر سونا جڑا ہوا ہے اور محرابوں کے نیچے چار یا پانچ ہزار نفوس' عورتیں' مرد کھڑے ملیں گے جو قسم قسم کے عطریات فروخت کر رہے ہوں گے۔ ان میں زیادہ تر خوشبودار پاؤڈر ہوں گے جو انسانی جسم پر چھڑکتے ہیں۔ پورا معبد اس قدر خوشبویات کی مہلک کی لپیٹ میں ہوگا جن کا ذکر ممکن نہ ہو۔

23 مئی کو اس معبد میں بخشش یا معافی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بخشش یا معافی یہ ہے: معبد کے اندر جس پر چھت نہیں اور اس کے مرکز میں ایک بلند و بالا عمارت ہے جو ہر طرف سے پانچ چھ قدموں کے سائز کی ہے جس کے گرد سیاہ ریشمی غلاف ہے۔ اس کا ایک دروازہ بھی ہے جو پورا چاندی کا ہے اور اس کی اونچائی انسانی قد کے برابر ہے اس کے ذریعے آپ کعبے کی عمارت کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ دروازے کے دونوں طرف ایک ایک مرتبان رکھا ہوا ہے جوان کا کہنا ہے کہ خوشبو سے بھرے ہوئے ہیں اور یومِ خمیس کو دکھائی جاتی ہے (ورتھما کے ذہن میں ایسٹر اور گڈ فرائی ڈے ہوگا جب اس نے یومِ خمیس کا ذکر کیا) لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ خوشبو سلطان کے خزانوں کا ایک حصہ ہے۔ خانہ کعبہ کے ہر طرف کونے میں ایک چھلے دار رسی ہے جس سے غلافِ کعبہ کے نچلے حصے کو باندھا جاتا ہے۔ 24 مئی کو لوگ طلوع آفتاب سے قبل خانہ کعبہ کے گرد طواف شروع کر دیتے ہیں۔ وہ طواف کے دوران سات چکر لگاتے ہیں۔ ہر بار وہ ہر کونے کو چھوتے اور اسے بوسہ دیتے ہیں۔ اس عمارت سے دس بارہ قدم کے فاصلے پر ایک اور ٹاور ہے جس کی شکل معبد سے ملتی جلتی ہے۔ اس میں تین یا چار دروازے ہیں۔ اس ٹاور کے مرکز میں ایک خوبصورت کنواں ہے جو ستر (70) فیدم (ایک فیدم چھ فٹ لمبا ہوتا ہے) گہرا ہے اور اسکا پانی نمکین ہے۔ اس کنویں پر چھ یا آٹھ آدمی لوگوں کے لیے پانی نکالنے پر مامور ہوتے ہیں۔ جب لوگ پہلے ٹاور کے گرد سات چکر لگا لیتے ہیں تو وہ اس کنویں پر جاتے ہیں' ان کی کمر کنویں کی منڈیر کی جانب ہوتی ہے اور وہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم استغفرلنا'' پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے ''اللہ کے نام سے' جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ اے اللہ ہمیں بخش دے''۔ جو افراد پانی کھینچ رہے ہوتے ہیں وہ ہر شخص پر پانی کی تین بالٹیاں یوں انڈیلتے ہیں کہ پانی سر سے پاؤں تک چلا جائے اور وہ نہلا دیئے جائیں خواہ ان کے جسم پر ریشمی لباس ہی کیوں نہ ہو۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس طرح ان کے تمام گناہ دھل جاتے ہیں۔ یہ لوگ بتاتے ہیں کہ معبد کی پہلی عمارت جس کے گرد انھوں نے طواف کیا اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کرایا تھا۔ اس غسل کے بعد یہ لوگ اس پہاڑ پر جاتے ہیں جس کا ذکر ہم

اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ یہ وہاں دو دن اور ایک رات بسر کرتے ہیں۔ یہ جب پہاڑ کے دامن میں آ جاتے ہیں تو یہاں قربانی کا جانور ذبح کرتے ہیں۔

مکہ میں قربانیاں دینے کا طریقہ

ہر فیاض اور سخی ذہن ان عظیم کاموں پر بہت خوش ہوتا اور ترغیب پاتا ہے جو انوکھے واقعات کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ وہ ان سے ترغیب پا کر انھیں خود بھی سرانجام دینے پر ایک تسلی اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ میں مختصراً اس رسم کا ذکر کروں گا جس کے مطابق یہ لوگ قربانیاں دیتے ہیں۔ ہر مرد اور عورت کم از کم دو یا تین اور بعض چار اور چھ بھیڑیں قربان کرتے ہیں (یہ تعداد اس مذہبی رسم کی تعداد سے زیادہ بتائی گئی ہے)۔ میرے خیال میں قربانی کے پہلے روز تیس ہزار سے زیادہ بھیڑیں ذبح کی جاتی ہیں۔ قربانی کے وقت جانور کا منہ مشرق کی سمت کیا جاتا ہے۔ ہر شخص یہ ذبح شدہ بھیڑیں خدا کی خوشنودی کی خاطر غریبوں میں بانٹ دیتا ہے۔ وہاں اس وقت تیس ہزار غرباء و مساکین موجود تھے۔ انھوں نے زمین میں گڑھا کھود کر اونٹوں کا گوبر اس میں ڈال دیا تھا۔ پھر انھوں نے آگ جلائی اور گوشت کو معمولی سا گرم کیا اور اسے کھا لیا۔

میری ذاتی رائے میں یہ غریب لوگ بخشش کے لیے نہیں بلکہ زیادہ تر اپنی بھوک کی وجہ سے یہاں آئے تھے۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ ہمیں یمن سے کھیرے آئے تھے، کھیرے تو ہم نے کھائے تھے البتہ ان کے چھلکے پھینک دیئے گئے تھے، جن پر ریت لگی ہوئی تھی۔ چالیس پچاس غریب لوگ جو ہمارے خیمے کے سامنے کھڑے تھے انہوں نے یہ چھلکے اٹھا کر کھانے شروع کر دیئے تھے۔ دوسرے روز ان کا ایک قاضی، جو ہمارے مبلغ کی طرح ہوتا ہے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا اور تمام حاضرین سے مخاطب ہوا۔ اس کا وعظ ایک گھنٹے کا تھا اس نے لوگوں کو توبہ کی تلقین کرتے ہوئے کہ اپنے گناہوں کی بخشش رو رو کر، گڑگڑا کر مانگیں۔ اس نے خُدا کے برگزیدہ اور پسندیدہ دوستوں ابراہیمؑ اور اسحقؑ کا ذکر کیا اور پیغمبر خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتیوں کی بخشش کے لیے خدا سے استدعا کی۔ لوگ گڑگڑا کر معافی مانگ رہے تھے اور فضا میں ان کی سسکیوں، آہوں اور فریادوں کی آواز گونج رہی تھی۔

قاضی اپنا وعظ مکمل کر چکا تو پورا قافلہ تیزی سے مکے کی طرف واپس چل پڑا تھا کیونکہ صرف چھ میل کے فاصلے پر بیس ہزار سے زائد عرب اس قافلے کو لوٹنے کے لیے ان کے منتظر تھے (ورتھما ایسے موقعوں پر تعداد بتانے میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتا ہے) ہم (مملوک گارڈ) مکہ کی حفاظت کے لیے آ گئے تھے۔ (یہ ہوسکتا

ہے کہ چند بدو انہیں لوٹ لینے کے در پے رہتے ہوں اور نہ تیزی سے واپسی کی وجہ اور تھی۔ آنحضورؐ نے مثال یہ پیش کی تھی کہ غروب آفتاب سے کچھ دیر بعد کی نماز (نمازِ عشاء) مزدلفہ کی مسجد میں ادا کی جائے جو تین گھنٹے کی مسافت پر تھی)

مگر جب ہم نصف فاصلہ طے کر چکے تو مکے اور پہاڑ کے درمیان جہاں قربانی دی جاتی ہے۔ ہمیں ایک چھوٹی سی دیوار نظر آئی جو چار فیدم بلند تھی۔ مذکورہ دیوار کے سایے میں کنکریوں کی ڈھیری لگی ہوئی تھی۔ یہ وہ کنکریاں تھیں جو وہاں سے گزرنے والے لوگ اس مقصد کے لیے پھینکتے تھے جس کا ذکر آپ بعد میں سنیں گے۔

مجھے بتایا گیا کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو خدا نے حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے کی قربانی دیں تو وہ اپنے بیٹے کے پاس گئے اور بیٹے سے اس بات کا ذکر کیا۔ بیٹے نے جواب دیا: ''مجھے خوشی ہوگی اگر میں خدا کے حکم کی تعمیل میں اپنی جان کی قربانی دے دوں''۔ جب اسمٰعیل علیہ السلام مذکورہ بالا چھوٹی سی دیوار والی جگہ پر پہنچے تو بتایا جاتا ہے کہ شیطان ان کے پاس ایک دوست کی شکل میں آیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: ''میرے دوست اسمٰعیل کہاں جا رہے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا: ''میرے والد محترم فلاں مقام پر میرا انتظار کر رہے ہیں''۔ شیطان نے کہا: ''وہاں مت جاؤ تمہارے والد تمہاری قربانی دینا چاہتے ہیں اور یوں تمہیں قتل کر دیں گے'' اسمٰعیل نے جواب دیا: ''ایسا ہو جانا چاہیے اگر یہ خدا کی مرضی ہے''۔ شیطان غائب ہو گیا اور کچھ فاصلے پر پھر کسی اور دوست کی شکل میں نمودار ہوا اور مذکورہ بالا الفاظ دہرائے۔ کہا جاتا ہے کہ اسمٰعیلؑ نے غصے میں آ کر فرمایا: ''ایسا ہو جائے'' اور یہ کہتے ہوئے ایک پتھر اٹھایا اور شیطان کے منہ پر دے مارا۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوگ یہاں پہنچتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک اس دیوار پر پتھر مارتا ہے اور پھر وہ لوگ شہر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ (ورتھما کا اشارہ شیطان الکبیر کی طرف ہے مگر شیطان کے نمودار ہونے کا ذکر بالکل درست نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے شیطان کو پتھر مارا تھا، اسمٰعیلؑ نے نہیں)۔

مکہ کی فاختائیں: ہمیں شہر کی ایک گلی میں پندرہ بیس ہزار فاختائیں نظر آئیں جو ان لوگوں کے خیال میں اس فاختہ کی نسل میں سے ہیں جس فاختہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جبریلؑ کی شکل میں گفتگو کی تھی (دراصل یہ کہانی عیسائیوں کے ہاں مشہور ہے کہ ایک سفید فاختہ اس وقت حضورؐ کے کندھے پر آ کر بیٹھ گئی تھی جب آپؐ وعظ فرما رہے تھے اور ان کے کان میں کوئی سرگوشی کی تھی، جس کا حقیقت سے دور کا بھی

کوئی واسطہ نہیں)۔ یہ فاختائیں ضلع بھر میں آزادانہ اڑتی پھرتی ہیں اوران دکانوں پرآ جاتی ہیں جہاں اجناس بکتی ہیں۔ان دکانوں کے مالکان کو یہ اجازت نہیں ہے کہ انہیں مارڈالیں یا پکڑلیں۔اگر کوئی ان میں سے کسی فاختہ کو مارڈالے تو اسے ڈر رہتا ہے کہ اس کا ملک تباہ ہو جائے گا۔آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہ معبد کے اندر بھی ادھر سے ادھر اڑتی پھرتی ہیں۔

مکے کے مَعبد میں عجیب وغریب جانوروں کے ذکر کے بارے میں: اس معبد کے ایک اور حصے میں ایک بند جنگلا ایسا ہے جس میں دو زندہ عجیب وغریب جانور ہیں اوران کی بڑی نمائش کی جاتی ہے میں آپ کو بتاتا ہوں انہیں کیسے بنایا گیا ہے۔ان میں سے بڑے کو ایک 30 ماہ کا بچھیرا بنایا گیا ہے جس کی پیشانی پر ایک 80-75 انچ لمبا سینگ ہے دوسرا جانور ایک برس کے بچھیرے کی شکل کا ہے۔اس کا بھی ایک 16 انچ لمبا سینگ ہے۔اس جانور کا رنگ لاکھی گھوڑے کا سا ہے اوراس کا سر ایک بارہ سنگھے کے سر جیسا ہے۔اس کی گردن زیادہ لمبی نہیں جس پر ایک جانب پتلے اور چھوٹے چھوٹے بال لٹک رہے ہیں۔اس کی ٹانگیں بکری کی طرح پتلی ہیں،اور پاؤں سامنے سے تھوڑا سا مڑا ہوا لمبا ہے۔اس کی ٹانگوں کے پچھلے حصے پر کچھ بال ہیں یقیناً یہ اژدہا بہت خوفناک اور عجیب وغریب ہوگا۔ یہ دو جانور سلطانِ مکہ کو تحفے کے طور پر پیش کیے گئے تھے، جو اپنے زمانے میں دنیا کے نایاب جانور تھے۔یہ انمول خزانے کے طور پر ایتھوپیا کے بادشاہ یعنی مُور بادشاہ کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔یہ تحفہ بھیج کر اس نے سلطان مکہ سے اتحاد کا رشتہ جوڑا تھا۔

مکہ اور جدّہ کے درمیان پیش آنے والے چند واقعات: میں یہاں یہ بتانا چاہوں گا

کہ انسانی عقل کس طرح مختلف حالات میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ میں اسے استعمال کرتے ہوئے مکہ کے قافلے سے علاحدہ ہو جاؤں۔میں اپنے جہاز کے کپتان کے لیے کچھ چیزیں خریدنے گیا ہوا تھا۔ مجھے ایک مُور نے پہچان لیا تھا۔اس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے مجھ سے کہا:''تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟''میں نے جواب دیا:''میں مُور ہوں۔''اس نے کہا: ''تم سچ نہیں بول رہے ہو''۔میں نے اس سے کہا:''مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کی قسم میں مسلمان ہوں''۔اس نے کہا: ''میرے ساتھ گھر چلو''۔میں اس کے ساتھ گیا (یہ بات چیت عربی میں ہوئی)۔اپنے گھر پہنچ کر اس نے مجھے اطالوی زبان میں بتایا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور یہ کہ اسے مَعلوم تھا کہ میں مُور نہیں ہوں۔اس نے مجھے بتایا کہ وہ جنیوا اور وینس میں تھا اور اس کا ثبوت پیش کیا میں نے یہ سن کر اسے بتایا کہ میں رومن تھا اور میں قاہرہ میں

مملوک بن گیا تھا۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا اور میری بڑی عزت اور خاطر و مدارت کی۔ میں چونکہ مزید آگے جانا چاہتا تھا اس لیے میں نے اس سے پوچھنا شروع کیا کہ اگر یہ شہر مکہ تھا جو دنیا میں اس قدر مشہور تھا تو وہ ہیرے موتی اور مصالحے کہاں تھے، سامانِ تجارت کہاں تھا جو کہتے ہیں کہ وہاں لایا جاتا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ اس سے اس لیے پوچھا تھا تاکہ وہ مجھے یہ بتا سکے کہ وہ معمول کے مطابق کیوں نہیں آئے تھے۔ میں چونکہ اس سے یہ نہیں پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کا سبب پرتگال کا بادشاہ تو نہیں تھا جو اٹلانٹک، خلیج فارس اور خلیج عرب کا حکمران تھا۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر مجھے بتانا شروع کیا کہ مذکورہ چیزیں معمول کے مطابق کیوں نہیں آئی تھیں۔ جب اس نے مجھے بتایا کہ اس کا سبب پرتگال کا بادشاہ تھا تو میں نے مصنوعی غم و غصے کا اظہار کیا۔ میں نے مذکورہ بادشاہ کو برا بھلا کہا تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اس بات پر خوش تھا کہ عیسائیوں کو اس سفر پر آنا چاہیے۔ (ورتھا کے مکے آنے سے قبل پرتگالیوں نے انڈیا اور خلیج فارس کے درمیان مسلمانوں کے سات بحری جہاز اپنے قبضے میں کر لیے تھے اور ان کے عملے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا) اس نے جب دیکھا کہ میں عیسائیوں کے خلاف اپنی دشمنی کا اظہار کر رہا ہوں تو اس نے مجھے مزید زیادہ عزت دی۔ اب اس نے ہر بات ایک ایک کر کے مجھے بتا دی تھی۔

جب میں نے تمام معلومات حاصل کر لیں تو میں نے اس سے کہا: ''میرے دوست مجھے بتاؤ کہ میں اس قافلے سے کیسے فرار ہو سکتا ہوں کیونکہ میں ان لوگوں کا سراغ لگانا چاہتا ہوں جو عیسائیوں کے دشمن ہیں کیونکہ یہ میں تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ اگر وہ یہ جان لیں کہ مجھ میں کتنی صلاحیت ہے تو وہ میری تلاش میں مکہ بھی کسی کو بھیج سکتے ہیں۔ اس نے جواب دیا: ''اللہ تمہیں اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر قائم رکھے۔ بتاؤ کہ تم کیا کر سکتے ہو؟'' میں نے اسے بتایا کہ میں دُنیا بھر میں سب سے بڑی توپیں بنانے کا ہنر جانتا ہوں'' یہ سنتے ہی وہ خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا: ''خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ بلند فرمائے، جس نے ہمارے پاس ایک ایسا شخص بھیجا ہے جو مُوروں اور خدا کی خدمت کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے گھر میں، جہاں اس کی بیوی بھی رہتی تھی مجھے چھپ جانے کو کہا۔ اس نے مجھ سے التجا کی کہ میں اپنے کپتان کو اس بات پر آمادہ کروں کہ وہ اسے 15 اونٹوں پر مصالحے لاد کر مکہ سے نکل جانے دے۔ اس نے ایسا اس لیے کیا تاکہ اسے سلطان کو محصول نہ ادا کرنا پڑے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ مجھے اپنے گھر میں چھپا لیتا ہے تو میں اسے ایک سو اونٹ لے کر نکل جانے میں مدد دوں گا، اگر اس کے پاس اتنی تعداد میں اونٹ موجود ہیں اس لیے کہ مملوکوں

کو یہ مراعات حاصل ہیں۔ یہ سن کر وہ بے حد خوش ہوا۔ بعد ازاں اس نے مجھے بتایا کہ مجھے کیا کرنا ہے پھر اس نے مجھے انڈیا کبیر کے ایک حصے کے بادشاہ کے پاس بھیجا جسے دکن کا بادشاہ کہتے تھے۔ اس بادشاہ کے بارے میں ہم مزید معلومات آگے چل کر دیں گے۔

جس روز قافلہ وہاں سے روانہ ہوا اس دن مجھے اس نے اپنے گھر کے ایک خفیہ حصے میں چھپا لیا تھا۔ صبح ہونے سے دو گھنٹے قبل شہر میں نقارے بجنے شروع ہو گئے تھے، ان کی آواز وہاں کے رسم و رواج کے مُطابق تھی۔ ساتھ ہی یہ اعلان ہوا کہ تمام مملوک اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر شام کی سمت سفر پر روانہ ہو جائیں۔ یہ اعلان سن کر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں اس تاجر کی بیوی کے سامنے رویا اور خدا سے اپنی سلامتی کی دُعا مانگی کہ وہ مجھے ظلم و تشدد سے محفوظ رکھے۔

منگل کی صبح مذکورہ قافلہ روانہ ہو گیا تھا۔ اس تاجر نے مجھے اپنی بیوی کے ساتھ اپنے گھر پر چھوڑا اور خود قافلے کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہ جاتے ہوئے اپنی بیوی سے کہہ گیا تھا کہ وہ مجھے آئندہ جمعہ کے روز ہندوستان کے اس قافلے کے ساتھ روانہ کر دے جو مکے کی بندرگاہ جدہ جا رہا تھا جو چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ خاتون مجھ سے اس قدر مہربانی سے پیش آئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کی ایک بھتیجی جو پندرہ سال کی تھی وہ بھی میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں وہاں ان کے پاس رہ جاؤں تو وہ مجھے مالدار بنا دیں گی۔ مگر جو خطرہ مجھے درپیش تھا اس کی وجہ سے میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جمعہ کے دن پروگرام کے مطابق میں دوپہر کے وقت قافلے کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ دونوں خواتین نے میری روانگی پر رنج کا اظہار کیا تھا۔ نصف شب کو ہم عرب کے کسی شہر میں پہنچ گئے تھے۔ ہم نے وہ رات وہاں گزاری اور اگلے روز دوپہر تک وہاں ٹھہرے۔ سنیچر کے روز ہم وہاں سے چلے اور آدھی رات کے وقت ہم جدہ شہر کی بندرگاہ پر پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

5۔ایک بے نام حاجی

اٹلی۔1575ء

''کچھ نے عقیدت کے ساتھ سفر کیا، کچھ نے تجارت کی غرض سے اور کچھ نے صرف وقت گزاری کے لیے۔'' (گمنام)

یہ 1575ء کے آس پاس کی بات ہے کہ ایک نہایت باریک بین یورپی قاہرہ، سنائی اور مکہ جانے والے قافلے میں شامل ہوا۔اس کے سفر کی روداد پینتیس صفحات پر مشتمل الزبیتھن انگریزی میں ہے۔ وا... غائب میں بات کرتے ہوئے اسے ایک جغرافیائی مضمون کا درجہ دیا جاتا ہے۔مگر اس کا مطالعہ کرتے وقت یہ جغرافیہ کی طرح کی تحریر نظر نہیں آتی۔مصنف نخلستانوں کے درمیان کے فاصلے کو ماپنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا اور سماجی تفصیل اور انسانی رویّے پر اس نے بڑے واضح انداز میں قلم اٹھایا ہے۔سفر کی یہ روداد رچرڈ ہکلیت کی تصانیف ''دی پرنسپل نیوی گیشنز''، ''وائے جز''، ''ٹریفکس'' اینڈ ڈسکوریز آف انگلش نیشن جو ٹیوڈر مہم جویان کی رپورٹوں کا جامع مجموعہ ہے جسے ٹیوڈر مہم جویان نے لکھا (1599ء) میں شائع ہوئی۔

ایسا لگتا ہے کہ اس سیاح کے مقابلے میں ورتھا مکے جاتے ہوئے سفر کے دوران نصف معلومات رکھتا ہے۔اس سے قبل کہ یہ قافلہ سفر پر روانہ ہو، ہمارے سامنے بین الاقوامی سکندریہ کی بڑی واضح تصویر ہے جہاں وینس، فرانس، پرتگال اور جنیوا کے باشندوں کی تعداد عربوں سے کہیں زیادہ ہے جو بڑے امن وسکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔قاہرہ میں جہاں اہرام مصر ہیں وہاں وہ ڈاکو بھی ملتے ہیں جو قبروں میں ڈاکہ ڈالتے ہیں، ان دواؤں کا ذکر بھی ہوتا ہے جو ممیوں کی خاک سے بنتی ہیں اور اس دیوہیکل مجسمے کا بھی جسے ایک عرصے سے نظرانداز کیا جاتا رہا، جس کا صرف سر اور گردن ریت سے باہر ہے۔دریا کے بالائی حصے میں کافی فاصلے پر ہم ان فیل قامت مجسموں کو دیکھتے ہیں جو ایک ایسے مقام پر کھڑے ہیں جس کا نام ابوسمبل سے ملتا جلتا ہے حالانکہ ابوسمبل کو آئندہ دو صدیوں سے بھی زیادہ عرصے تک ''دریافت'' نہیں کیا جا سکے گا۔

جب قافلہ چل پڑتا ہے تو سفر کا ذکر کئی لوگوں کی زبانی ہوتا ہے اور اس روداد سفر کا مرکز ذکر حج ہے۔اس وقت عثمانی سلطان نے جو استنبول میں تخت نشین ہوا تھا مملوک قافلے پر کنٹرول پا لیا تھا۔وہ اسے

وسعت دینے اور علاقے میں تجارت پر توجہ دینے میں مصروف تھا۔ 1575ء میں اس کی وسعتیں ایک عروس البلاد کے طور پر مزید بڑھ رہی تھیں۔ قافلے کی روانگی، رفتارِ سفر اور میرِ کارواں کے بارے میں طے کیا جا چکا ہے۔ یہ بھی طے ہو گیا ہے کہ سامانِ تجارت پر ٹیکس عائد نہیں ہوگا جب قافلہ قاہرہ سے سوئز کی سمت روانہ ہوتا ہے تو ہزاروں افراد اسے الوداع کہتے وقت گل پاشی کرتے ہیں۔ سب سے آگے آگے جو اونٹ ہے اس پر محمل ہے جو تیرھویں صدی سے اب تک حج کی فضیلت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اس کے پیچھے غلاف کعبہ اونٹ پر رکھا ہوتا ہے جسے کسوئی کہتے ہیں اور اسے ہر سال تبدیل کیا جاتا ہے۔ یہ روایت بہت پرانی ہے جس کا ذکر بار بار ہوتا ہے۔ قافلے کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ کسی تجارتی میلے میں جا رہا ہے، جس میں فوجی مہم بھی شامل ہے۔ مکے میں اس سال فروخت کرنے کے لیے بہت سی چیزیں لپیٹ کر تیار کر لی گئی تھیں۔ ایک محافظ قافلے کے ساتھ ساتھ اونٹ پر سوار چلتا ہے تاکہ بدو ڈاکوؤں کے حملوں کو روک سکے۔ چند صفحات اور الٹنے کے بعد ہم امیر کاروان کو دیکھتے ہیں جو کسی قبیلے کے سرداروں کو رشوت دے رہا ہے تاکہ سفر بخیر و خوبی طے ہو۔ ہم گورنر مکہ کو بھی اس کے خیمے میں دیکھتے ہیں جو قاہرہ کی اتھارٹی کو تسلیم کر رہا ہے۔ ہمیں یونیفارم، ساز و سامان اور محافظوں کے پرچم دکھائی دیتے ہیں۔

حج کی مذہبی رسوم کے ذکر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ایسے قارئین جو ان رسوم کی شکل اور ترتیب کو سمجھنے میں اب تک دِقت محسوس کر رہے تھے اب اس رودادِ سفر کو پڑھنے کے بعد انہیں آسانی سے سمجھ لیں گے۔ اس میں مسجد کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا تھا۔ اس کی ان بیرونی دیواروں کا ذکر بھی ہے جو تمام اطراف میں نصف میل لمبی ہیں۔ اس کے علاوہ حج کی مذہبی رسم کی ادائیگی کے ہر مقام کا ذکر بھی بڑی وضاحت سے ہوا ہے۔ حجاج کا جو جلوس مکے سے عرفات تک جاتا ہے اس کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کے پیچیدہ راستے کی منزل کو ہم منیٰ کی وادی میں سے دیکھتے ہیں۔ عرفات میں شب بیداری، قافلوں کے مختصر انتظامات، وعظ کے دوران دیا گیا پیغام، مجمع کے موڈ اور حرکت کو بھی قلمبند کیا جاتا ہے۔ ورتھا کی نسبت ہم زیادہ مطمئن مسلمان کی کہانیاں بھی سنتے ہیں۔ یہاں جو کہانیاں حجر اسود اور جبل الرحمت کے بارے میں بیان کی گئی ہیں وہی ہیں جو آج بھی حجاج سنتے ہیں۔ حج کی لذت اور احساس کی لہر اس ریکارڈ میں دوڑتی نظر آتی ہے یہ ایک ایسے مشاہد کی نظر سے گزرنے والی سرگزشت ہے۔ جس کی نگاہ سے کچھ بھی اوجھل نہ رہا، جس نے حج کو مکمل طور پر ادا ہوتے دیکھا اور جس نے یہ چاہا ہے کہ اسے اپنے قارئین کو بھی دکھائے۔

مُسلمانوں، تُرکوں اور مُوزوں کے عرب کے لیے سالانہ سفر یا حج کے بیان میں سے لیے گئے اقتباسات

مکہ مکرمہ کے لیے عازم سفر ہونے والے قافلے کی تیاری

مسلمان سال کے ایک مہینے کے روزے رکھتے ہیں۔ اس مہینے کو رمضان کہتے ہیں۔ ماہِ رمضان کے اختتام پر عیدالفطر منائی جاتی ہے۔ اس مہینے کے دوران وہ لوگ جو مکہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں قاہرہ میں رُکتے ہیں۔ عیدالفطر کے بیس روز بعد قافلہ اپنے سفر پر روانہ ہونے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ پھر لوگوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ایشیا، یونان اور بربری حصے سے اُمڈ آتا ہے تاکہ اس سفر پر روانہ ہو سکے۔ ان میں سے کچھ تو عقیدت کے ساتھ سفر کرتے ہیں، کچھ تجارت کی غرض سے اور کچھ محض وقت گزاری کے لیے۔

عیدالفطر کے کچھ روز بعد وہ لوگ جنہوں نے سفر پر جانا ہوتا ہے وہ شہر سے باہر برقہ کے مقام پر اکٹھے ہو جاتے ہیں جہاں انہیں قافلے کے کپتان کا انتظار ہوتا ہے۔ یہاں دریائے نیل میں طغیانی کے باعث جو پانی آ کر تالاب کی شکل اختیار کر جاتا ہے اس سے اونٹ اور دوسرے جانور اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ ان میں چالیس ہزار خچر، اونٹ اور سانڈنیاں ہوتی ہیں اور قافلے کے پیچھے پیچھے سفر کرنے والوں کی تعداد پچاس ہزار کے قریب ہوتی ہے۔ یہ تعداد تھوڑی بہت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ہر تین برس بعد یہ لوگ اپنا نیا کپتان مقرر کرتے ہیں جسے یہ اُمیرالحج کہتے ہیں۔ انہیں پاشا کی طرف سے ہر سفر کے لیے جو تھیلیاں ملتی ہیں ان میں ہر تھیلی میں 625 سونے کی اشرفیاں ہوتی ہیں تاکہ وہ اس قافلے پر انہیں خرچ کر سکے۔ اس میں سے ہی وہ ضرورت مند حجاج کو خیرات بھی کرتا ہے۔

اس کپتان کے ملازمین میں دیگر کئی افراد کے علاوہ چار افسر بھی ہوتے ہیں جو اس کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں۔ قافلے کی حفاظت کے لیے چار سو سپاہی بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ دو سو کا رسالے کا دستہ سانڈنیوں پر اور دو سو ترک سپاہی اونٹوں پر سوار ہوتے ہیں جنہیں قاہرہ سے مقرر کیا جاتا ہے۔ رسالے کا دستہ ٹوپیاں پہنتا ہے جو سارجنٹوں کی ٹوپیوں سے ملتی جلتی ہیں جبکہ ترک سپاہی ایک دوسری قسم کی ٹوپی پہنتے ہیں جو پیچھے کی طرف پٹی کی مانند فرانسیسی کلاہ کی شکل میں لٹک رہی ہوتی ہے اور سر پر چاندی کا ایک ٹکڑا رکھا ہوا نظر آتا

جسے خوشنما بنایا گیا ہو پورا قافلہ اس امیر کی کمانڈ میں ہوتا ہے۔ کپتان کو گائیڈز کے طور پر آٹھ پائلٹ بھی دیے جاتے ہیں جو قافلے کے آگے آگے چلتے ہیں تاکہ قافلے کی رہنمائی کر سکیں۔ ان کے تقرر کی تجدید سال بہ سال ہوتی رہتی ہے۔ یہ بہت تجربہ کار ہوتے ہیں اور راستوں کی بھی پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ رات کے وقت یہ قافلے کی رہنمائی ان ملاحوں کی طرح کرتے ہیں جو ستاروں سے مدد لیتے ہیں۔ چار یا پانچ آدمی قافلے کے آگے آگے جلتی ہوئی لکڑیاں لے کر چلتے ہیں تاکہ روشنی کا انتظام ہو جائے اور قافلہ کہیں بھٹک نہ جائے۔ اگر کبھی قافلہ بھٹک جائے تو ان کی سختی آ جاتی ہے اور انہیں سزا کے طور پر پاؤں کے تلووں پر چھڑیوں سے مارا جاتا ہے تاکہ آئندہ انہیں یاد رہے۔

قافلے کے کپتان کا ایک لفٹیننٹ ہوتا ہے جس کے ہمراہ ہر وقت رسالے کے 15 سپاہی رہتے ہیں۔ اس کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ قافلے کو سفر کے دوران وقت پر ٹھہرنے اور روانہ ہونے میں کنٹرول کرے۔ قافلے کے ساتھ 12 اونٹوں پر لدا ہوا اسلحہ بھی ہوتا ہے جس سے عربوں کو ڈرایا جاتا ہے۔ قافلے کے پیچھے آنے والے تاجروں نے سامان تجارت ریشمی کپڑا، مونگے، مرجان، گندم، چاول اور دوسری اجناس خچروں پر لاد رکھا ہوتا ہے۔ ان میں کچھ تاجر تو سامان راستے ہی میں بیچ دیتے ہیں کچھ مکے پہنچ کر فروخت کرتے ہیں۔ یہ کافی منافع کماتے ہیں کیونکہ خشکی کے راستے سامان لے جانے پر محصول نہیں دینا پڑتا جبکہ سمندری راستے سے لے جانے والے سامانِ تجارت پر دس فیصد محصول لگ جاتا ہے۔

سفر کا آغاز: قافلے کا کپتان، اس کے ملازمین اور افسران تمام پاشا کے سامنے قاہرہ میں اس کے محل میں کھڑے ہوتے ہیں جہاں وہ ان میں سے ہر ایک کو ایک لباس دیتا ہے۔ کپتان کے لباس پر طلائی کڑھائی کی ہوئی ہوتی ہے جبکہ دوسرے ملازمین کو ان کے مقام و مرتبے کے مطابق لباس ملتا ہے۔ وہ انہیں کسوۃ النبوی بھی عطا کرتا ہے جسے عربی زبان میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس سمجھا جاتا ہے۔ یہ ریشمی کپڑے سے بنا ہے جس کے مرکز میں سنہری لفظوں میں لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ لکھا ہوا ہوتا ہے، جس کے معانی ہیں: "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں" اسے مسجد الحرام کے مرکز میں واقع کعبہ کی عمارت پر غلاف کے طور پر چڑھایا جاتا ہے، جسے کہا جاتا ہے کہ ابراہیمؑ نے یا ان کے بیٹے اسمٰعیل نے تعمیر کرایا تھا۔ پھر وہ کپتان کو خانۂ ابراہیمؑ کے لیے ایک گیٹ دیتا ہے جس پر سونے کا کام کیا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں فنی مہارت اپنے کمال کو پہنچی ہے اور یہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ وہ اسے حرم کی شکل کا مخروطی سبز مخملیں غلاف بھی دیتا ہے۔ اس

پر بھی طلائی کڑھائی کی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ مدینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر کے لیے ہے۔ جو ہرم کی شکل کا مخروطی ہے۔ اس کے علاوہ بھی روضۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تزئین کے لیے اور غلاف بھی دیئے جاتے ہیں جو قیمتی بھی ہوتے ہیں اور جن پر دستکاری کے بہترین فن کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

قافلے کا کپتان آخر میں پاشا سے اپنے افسروں اور سپاہیوں کے ہمراہ سفر کی اجازت طلب کرتا ہے۔ قاہرہ کے شہریوں کا ایک جمِ غفیر اس قافلے کو جلوس کی شکل میں الوداع کہتا ہے۔ نقارے اور ساز بجائے جاتے ہیں اور گا گا کر خوشی و مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

پاشا کے محل سے نکل کر وہ قاہرہ کے اس گیٹ کی جانب چل پڑتے ہیں جسے باب الناصر کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مسجد آتی ہے۔ جہاں یہ اپنی اپنی پوشاک لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ اونٹوں کو خوب سنگھارا جاتا ہے ان پر ریشمی کپڑا ڈالا ہوا ہوتا ہے، چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں ان کے گلے میں لٹک رہی ہوتی ہیں۔ لوگ قافلے پر گل پاشی کرتے ہیں جس کی وجہ سے راستہ رنگ برنگے پھولوں سے اٹ جاتا ہے۔ لوگ تولیے اور عمدہ کپڑا لاتے ہیں اور شاہی خلعتوں کو چھوتے ہیں۔ یہ پوشاک بعد میں بڑی عزت کے ساتھ نوادرات کے طور پر محفوظ کر لیتے ہیں۔

پھر یہ پوشاکیں اور خلعتیں اس مسجد میں رکھ دی جاتی ہیں۔ وہ خود دوبارہ شہر کو واپس لوٹ جاتے ہیں اور وہاں بیس روز تک قیام کرتے ہیں۔ اب کپتان دوبارہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسجد میں جاتا ہے پوشاک اور خلعتیں مسجد سے اٹھائی جاتی ہیں۔ وہ اب انہیں برقہ لے جاتے ہیں کپتان اپنا خیمہ پاشا کے پرچم لہرا کر گیٹ پر نصب کرتا ہے اور دیگر اہم خیمے اس کے خیمے کے گرد لگا دیئے جاتے ہیں وہ یہاں دس روز ٹھہرتا ہے۔ اس دوران مکے کے لیے قافلے کے ہمراہ جانے والے تمام لوگ یہیں ٹھہرتے ہیں۔ ان میں آپ کو کچھ ایسی خواتین بھی نظر آئیں گی جو اپنے والدین اور دوستوں کے ساتھ اونٹوں پر سوار ہو کر قافلے کے ساتھ جانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ روانگی سے ایک رات قبل یہ بہت پر تکلف ضیافت کا اہتمام کرتے ہیں، آتش بازی سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔ ترک سپاہی اس دوران کپتان کے خیمے کے گرد موجود رہتے ہیں وہ خوشی و مسرت کے اظہار کے لیے چیختے چلاتے ہیں جس سے چاروں طرف ایک گونج سنائی دیتی ہے۔ اس شب وہ اپنے توپوں کو چار سے چھ مرتبہ ضرور چلاتے ہیں طلوع آفتاب کے ساتھ نقارے کی آواز سن کر یہ قافلہ چل پڑتا ہے۔

قافلے کے سفر اور آرام کے اوقات: قاہرہ سے مکّے تک کے سفر میں یہ چالیس روز لیتے ہیں، دن لمبے ہوتے ہیں۔ قافلے کے اس سفر میں زیادہ چلتے رہنا اور کم آرام کرنا شامل ہوتا ہے۔ عموماً سفر کے اوقات یہ ہوتے ہیں: سحری کے وقت دو بجے اپنا سفر شروع کر کے اسے طلوع آفتاب تک جاری رکھا جاتا ہے۔ اب دوپہر تک یہ آرام کرتے ہیں اور پھر چل پڑتے ہیں اور رات تک سفر جاری رکھتے ہیں۔ پھر یہ رات کے پچھلے پہر، دو بجے تک آرام کرتے ہیں۔ یہی نظام الاوقات پورے سفر میں دہرایا جاتا ہے اور اس میں کبھی تبدیلی نہیں کی جاتی۔ سوائے ایسے مقامات کے جہاں پانی کی وجہ سے انہیں بعض اوقات ڈیڑھ روز تک اپنے آپ کو تازہ دم کرنے کے لیے رُکنا پڑتا ہے۔ اگر یہ ایسا نہ کریں تو انسان اور جانور دونوں مر جائیں۔

قافلہ کس ترتیب سے سفر کرتا ہے: قافلہ اپنے سفر کے دوران جو طریقہ اور ترتیب پیشِ نظر رکھتا ہے وہ یہ ہے: یہ تین حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے...... اگلا حصہ، درمیانی حصہ اور پچھلا حصہ۔ اگلے حصے میں آٹھ پائلٹ آگے آگے چلتے ہیں ان کے ساتھ کپتان اور چار نوکر ہوتے ہیں۔ رات کو سفر کے دوران وہ ان نوکروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ روشنی کے لیے جلتی ہوئی لکڑیوں کے ٹکڑے اٹھا کر چلیں۔ چھ مذہبی افراد بھی قافلے کے اسی حصے میں چلتے ہیں، ان کے سروں پر سرخ پگڑیاں ہوتی ہیں، ان کی سواری اور خورد و نوش کا انتظام کپتان کے ذمے ہوتا ہے۔ جب قافلہ کسی ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں پڑاؤ کیا جا سکے تو یہ لوگ خوشی سے بیک زبان چلا اٹھتے ہیں: ''ایک خوشخبری سنو۔ خوشخبری سنو ہم منزل کے قریب پہنچ گئے ہیں''۔ اس اچھی خبر پر قافلے کی ہر کمپنی کا سردار انہیں انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔ اس سب سے اگلے حصے کے بعد قریب ہی قافلے کا تیسرا حصہ ہوتا ہے جس کے عقب میں رسالے کے پچیس سپاہی تلواروں، کمانوں اور تیروں سے لیس قافلے کو چوروں اور ڈاکوؤں سے بچانے کے لیے چلتے ہیں۔

سب سے اگلے حصے کے بالکل پیچھے ایک چوتھائی میل کے فاصلے پر قافلے کا اہم حصہ سفر کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے آگے آگے، توپچی اپنے گولے بارود کے ساتھ اور رسالے کے پندرہ تیر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے بعد معالج اعلیٰ ہوتا ہے جو ایک معمر شخص ہوتا ہے جس کے پاس بڑا اختیار ہوتا ہے۔ اس کے پاس دوائیں، مرہم اور بیماروں کے لیے خورد و نوش کا سامان ہوتا ہے۔ اس کے پاس اونٹ بھی ہوتے ہیں تاکہ بوقت ضرورت اگر گھوڑے اور دوسرے جانور نہ ہوں تو بیماروں کو ان پر سوار کرایا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک تنہا

اونٹ بھی ہوتا ہے جو بہت ہلکے بھورے رنگ کا ہوتا ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ پاشا کی سلطنت کا سب سے خوبصورت اور ہلکے بھورے رنگ کا اونٹ ڈھونڈ کر اس مقصد کے لیے قافلے کے ہمراہ بھیجا جائے۔ اس پر رکھے محمل کو ریشمی اور طلائی کپڑے سے نہیں سجایا جاتا کیونکہ اسے عہد نامہ عتیق کے سفینے کی شکل دی جاتی ہے۔ محمل میں قرآن کا نسخہ رکھا ہوا ہوتا ہے جو بڑے بڑے سنہری حروف میں لکھا ہوا ہوتا ہے اور اس کی سونے کی جلد ہوتی ہے۔ سفر کے دوران اس محمل کو قیمتی ریشمی کپڑے سے سجایا جاتا ہے اور مکہ و مدینہ میں داخل ہوتے وقت اسے ہیرے موتیوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ وہ اونٹ جس پر قرآن محمل میں رکھا ہوتا ہے اس کے گرد بہت سے عرب مغنی اور موسیقار گاتے اور اپنے ساز بجاتے ہوئے چلتے ہیں۔ اب پندرہ خوبصورت ہلکے بھورے رنگ کے اونٹ آتے ہیں جن پر پوشاک اور خلعتیں لدی ہوئی ہیں۔ یہ سر سے پاؤں تک ریشمی کپڑے میں چھپے ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے بیس اور اونٹ ہوتے ہیں جن پر نقد رقم اور کپتان کی خلعت اور سامانِ خورد و نوش لدا ہوتا ہے۔ ان کے پیچھے پاشا کا شاہی پرچم ہوتا ہے جس کے ساتھ کپتان کے موسیقار اور 25 رسالے کے تیر انداز اور ایک افسر مسلسل رہتے ہیں۔ ان خوبصورت اور عمدہ چیزوں کے ساتھ ساتھ وہ تمام لوگ اور اونٹ چلتے ہیں جو قافلے کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں۔

ان کے پیچھے نصف میل سے کم فاصلے پر قافلے کا سب سے پچھلا حصہ ہوتا ہے۔ ان میں زیادہ تر حجاج ہوتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کیونکہ تاجر اپنے سامان تجارت کو حفاظتی نقطۂ نظر سے سامنے والے حصے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ حجاج جن کے پاس ایسا کوئی سامان نہیں ہوتا جس کے لٹ جانے کا خطرہ ہو اس لیے سب سے پچھلے حصے میں سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے پیچھے ہمیشہ 25 پوری طرح مسلح رسالے کے سپاہی اور ایک افسر ہوتا ہے جو کپتان کے طور پر فرائض سرانجام دیتا ہے اور چالیس عرب تیر انداز اس حصے کی حفاظت کرتے ہیں۔

قافلے نے ہمیشہ بحیرۂ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرنا ہوتا ہے۔ ان کے دائیں طرف 200 ترک سپاہی ہوتے ہیں جو تین کمپنیوں میں بٹ جاتے ہیں ان میں سے ایک ان کے بائیں طرف مسلح اونٹوں پر سوار چلتا ہے۔ چونکہ اس طرف ڈاکوؤں کا خطرہ زیادہ رہتا ہے اور دوسری طرف کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اس دوران قافلے کا کپتان ہمیشہ اپنے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، وہ کبھی ان کے ایک طرف تو کبھی دوسری طرف ہوتا ہے۔ وہ مستقل کسی ایک جگہ نہیں چلتا اس کے ساتھ رسالے کے 25 سپاہی اور ایک افسر رہتا ہے جو مسلح

ہوتے ہیں اور سانڈنیوں پر سوار ہوتے ہیں۔ان کے ساتھ آٹھ موسیقار ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں میں سارنگی ہوتی ہے جو وہ اس وقت تک بجاتے رہتے ہیں جب تک کپتان آرام کے لیے نہیں چلا جاتا۔ یہ ان کی خدمت میں اس وقت تک موجود رہتے ہیں جب تک وہ اپنے خیمے میں نہیں چلا جاتا۔اب وہ نوکروں اور ملازمین کو چلے جانے کا حکم دیتا ہے جو اپنے اپنے خیموں میں چلے جاتے ہیں۔

اس سفر کے دوران جو غیر معمولی اور قابل ذکر چیزیں نظر آئیں: قافلے کے کپتان کی یہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہ سفر کے دوران تھیلی میں ہاتھ ڈالتا جائے اور عربوں کے بعض سرداروں کو تحائف، مطبوعات، پگڑیاں دیتا جائے تاکہ وہ اس کے عوض اس کے قافلے کو بغیر محصول وصول کیے سفر جاری رکھنے کی اجازت دے دیں اور یہ وعدہ بھی کریں کہ وہ خود اور ان کے کارندے قافلے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور اگر کبھی یہ قافلہ لوٹ لیا جائے تو یہ سردار اپنا عہد پورا کرتے ہوئے لٹے ہوئے سامان کا معاوضہ ادا کریں گے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی قافلہ لوٹ لیا جائے تو یہ عرب سردار کوئی معاوضہ نہیں دیتے۔

قافلہ اب ایک ایسی جگہ پہنچتا ہے جسے جہیر کہتے ہیں جو شریف خاندان سے تعلق رکھنے والے مکے کے بادشاہ کی سلطنت کی سرحد کے آغاز کو ظاہر کرتا ہے۔یہاں کا گورنر قافلے کو خوش آمدید کہنے کے لیے اپنے تمام لوگوں کے ساتھ باہر آجاتا ہے۔اس موقعہ پر جس قدر خوشی ومُسرت کا اظہار یہاں ہوتا ہے اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔قافلہ یہاں ایک روز ٹھہرتا ہے یہاں تازہ اور صاف پانی بلند و بالا پہاڑوں سے بہہ کر آنے والے چشموں سے آتا ہے۔اس کے علاوہ یہاں کھجوروں اور گوشت کے بڑے سٹور بھی ہیں، جو کم نرخوں پر دستیاب ہیں۔

اگلے روز کچھ ستانے اور تازہ دم ہو جانے کے بعد قافلہ اپنے سفر پر چل پڑتا ہے۔اب جو قابل ذکر پہلا مقام آتا ہے اسے بَدرِ حُلیم کہتے ہیں۔یہاں چھوٹی چھوٹی ایسی جڑی بوٹیاں اگتی ہیں جن سے خوشبو آتی ہے۔سورج نکلنے پر جب حجاج یہاں پہنچتے ہیں تو عورتیں اور مرد یہاں منہ ہاتھ دھوتے ہیں۔پھر ہر مرد اپنے لباس کی جگہ دو اَن سلی سفید چادریں پہن لیتا ہے۔ایک چادر جسم کے گرد اور دوسری کندھوں پر۔یہ ہر دوسرے لباس سے زیادہ بہتر اور قیمتی تصور کی جاتی ہے۔جو لوگ اس کی استطاعت نہیں رکھتے وہ یہ عہد کرتے ہیں کہ ایک مینڈھا قربان کریں گے۔

اب یہ قافلہ چلتے چلتے مکے سے دو میل دور پہنچ جاتا ہے۔یہاں یہ اس رات کو قیام کرتا ہے۔صبح کو

سورج نکلنے پر یہ ممکنہ دھوم دھام سے مکہ کی جانب بڑھتے ہیں۔ جب یہ قافلہ شہر کے قریب پہنچتا ہے تو شریف مکہ اپنے گارڈ اور بیشمار دوسرے لوگوں کے ساتھ شہر سے باہر آتا ہے۔ یہ لوگ خوشی و مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک ایسے میدان میں جہاں میلہ لگتا تھا اور جو شہر سے ایک تیر کی پہنچ کے فاصلے پر تھا لاتعداد خیمے نصب کر دیے گئے تھے۔ ان کے درمیان کپتان کا خیمہ تھا۔ شریف مکہ سے ملنے کے بعد اور دونوں جانب سے سلام دعا کے بعد وہ اپنے اپنے گھوڑوں سے اترے اور خیمے میں داخل ہو گئے۔ اب مکے کا بادشاہ اپنے اختیار اور اقتدار سے خود کو دستبردار کرنے کے بعد کپتان کو پورے اختیارات دے دیتا ہے تاکہ جب تک وہ مکے میں ہے حکم دے سکے، عدل و انصاف کا مظاہرہ کر سکے۔ دوسری جانب کپتان مکے کے بادشاہ کی فیاضی اور سخاوت سے متاثر ہو کر اسے کپڑے اور سونے سے تیار کردہ ایک قیمتی خلعت دیتا ہے جس میں قیمتی موتی جڑے ہوتے تھے۔ پھر یہ دونوں قالینوں پر بیٹھ گئے، جن پر جانوروں کی کھالیں بھی بچھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کھانا بھی مل کر کھایا۔ وہ وہاں سے جب اٹھے تو ان کے ساتھ کچھ اور سردار بھی تھے۔ اب ان کے پاس غلاف کعبہ اور وہ گیٹ تھا جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ وہ سیدھے مسجد الحرام کے اندر گئے، اس وقت ان کے ہمراہ چند ایک لوگ تھے۔

مسجد کے اندر پہنچ کر انہوں نے پرانا غلاف اتار کر خانۂ خدا کو نیا غلاف پہنانے کا حکم دیا۔ پرانا غلاف ان خدام میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جو مسجد کے اندر خدمت سرانجام دیتے ہیں جو اسے حجاج کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ جس کسی کے ہاتھ اس کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی آ جائے وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہے اور اسے ایک نہایت قیمتی اور مقدس تبرک کے طور پر سنبھال لیتا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جس کسی مرنے والے کے سر کے نیچے اس کا ایک ٹکڑا رکھ دیا جائے اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔ پرانا دروازہ نئے دروازے سے تبدیل سے کر دیا جاتا ہے۔ پرانا دروازہ رسم کے طور پر شریف مکہ کو دے دیا جاتا ہے پھر مخصوص دعاؤں کے بعد شریف مکہ تو شہر کے اندر موجود رہتا ہے جبکہ حجاج کے قافلے کا کپتان واپس اپنے خیمے میں چلا جاتا ہے۔

کچھ شریف مکہ بادشاہ مکہ کے بارے میں: شریف مکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ نسب سے بتایا جاتا ہے، جس کی اولاد کا سلسلہ پیغمبر خدا کی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ اور حضورؐ کے داماد اور چچا زاد حضرت علیؓ سے شروع ہوتا ہے۔ بڑے بیٹے کو تخت و تاج جانشینی میں ملتا ہے۔ اس سلطنت کو حاصل ہونے والا سالانہ محصول نصف ملین کا سونا ہوتا ہے۔ آنحضورؐ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے اور آپؐ

خونی رشتے کے تمام افراد (جن کی تعداد بیشمار ہے) ''شریف'' یعنی سردار کہلاتے ہیں۔ان سب کا لباس سبز ہوتا ہے یا کم از کم پگڑی ضرور سبز ہوتی ہے اور یہی ان کی پہچان ہوتی ہے۔ان کے ملک کے اندر رہنے والے یا باہر سے وہاں جانے والے عیسائیوں میں سے کسی کو سبز کپڑے پہننے کی اجازت نہیں ہوتی۔یہ لباس کا کوئی ایک حصہ بھی سبز نہیں پہن سکتے۔کہا جاتا ہے کہ کفار کے لیے یہ رنگ ممنوع ہوتا ہے کیونکہ سبز لباس خدا کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پہنتے تھے۔

مکے کا بیان: عرب کے ایک مشہور شہر کا نام مکہ ہے۔اس کے گرد اونچے اونچے خشک پہاڑ ہیں۔ میدانی علاقے میں جو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے بہت سے باغات ہیں جن میں انجیر، انگور، سیب اور تربوز ہوتا ہے۔صاف پانی اور گوشت کی بھی بہتات ہے لیکن روئی کی نہیں......اس شہر کے گرد فصیل نہیں ہے اور یہ پانچ میل کے دائرے میں واقع ہے مکانات خوبصورت اور کشادہ ہیں، ان کی تعمیر اٹلی کے مکانوں جیسی ہوئی ہے۔شریف کا محل بہت عالیشان اور آراستہ ہے۔

شہر کے وسط میں مسجد الحرام ہے جس کے عین مرکز میں خانۂ خُدا ہے۔یہ مسجد اس زمانے میں تعمیر ہوئی تھی جب پیغمبرؐ خدا بقید حیات تھے۔یہ چوکور ہے اور اس قدر کشادہ ہے کہ اس کی گولائی دو میل ہے۔یہ ہر جانب سے نصف میل ہے اور اس کے محراب ہیں۔بالکل وسط میں بقیہ حصے سے علاحدہ خانۂ خدا ہے۔ چاروں طرف غلام گردشیں چار گلیوں کی شکل میں ہیں وہ ستون ان گلیوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں جو سنگ مرمر، چونے اور پتھر کے بنے ہوئے ہیں اس عالیشان مسجد کے 99 دروازے اور پانچ مینار ہیں جہاں سے مؤذن اذان دیتے ہیں۔

خانۂ خدا: خانۂ خُدا بھی چوکور ہے جسے پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے جو بیس قدم اونچا اور چالیس قدم گول ہے۔اس خانۂ خُدا کے ایک سمت دیوار کے اندر ایک پتھر ہے جو بالشت بھر لمبا اور نصف بالشت چوڑا ہے۔روایت مشہور ہے کہ اس کی تعمیر سے قبل یہ پتھر جنت سے گرا تھا اور ایک آواز سنائی دی تھی کہ جس جگہ یہ گرا ہے وہاں خانۂ خدا تعمیر کیا جائے اس جگہ خدا گنہگاروں کی فریاد سنا کرے گا۔ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جب یہ پتھر جنت سے گرا تھا اس وقت یہ سیاہ نہیں تھا بلکہ یہ برف کی مانند سفید تھا۔گنہگار چونکہ اسے اتنے طویل عرصے سے بوسہ دیتے چلے آرہے ہیں اس لیے یہ سیاہ پڑ گیا ہے اور اسے حجر اسود کہا جاتا ہے۔تمام حجاج پر

لازم ہوتا ہے کہ اسے بوسہ دیں۔

خانہ خدا کے اندر جانے کا راستہ بہت تنگ ہے جو ایک کھڑکی کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ یہ زمین سے اتنی اونچی ہے کہ انسان اس تک آسانی سے پہنچ جائے۔ اس میں داخل ہونا مشکل ہے اندر جانے کے راستے پر دونوں جانب دو سنگ مرمر کے ستون کھڑے ہیں۔ درمیان میں ایک خاص قسم کی لکڑی کے تین ستون ہیں جو موٹائی میں زیادہ نہیں۔ ان پر انڈیا سے آئی ہوئی ٹائلیں لگی ہوئی ہیں جن کے ایک ہزار رنگ ہیں ان پر پچی کاری کی گئی ہے۔ روشنی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندر اس قدر اندھیرا ہوتا ہے کہ اندر دیکھنا ممکن نہیں رہتا۔ دروازے سے باہر پانچ قدم کے فاصلے پر زم زم کا کنواں ہے۔ یہ وہ مقدس کنواں ہے جو خدا کے فرشتے نے حضرت حاجرہ کو اس وقت دکھایا تھا جب وہ اپنے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں تھیں۔

حجاج کی مذہبی رسوم: ہم پہلے یہ بتا چکے ہیں کہ مسلمان سال میں دو عیدیں مناتے ہیں، ایک کو یہ عید الفطر اور دوسری کو عید الاضحیٰ کہتے ہیں۔ ایک رمضان کے مہینے کے اختتام پر منائی جاتی ہے تو دوسری پر یہ لوگ قربانی دیتے ہیں۔ جس طرح حجاج کا قافلہ عید الفطر کے تیس روز بعد قاہرہ سے روانہ ہوتا ہے اسی طرح یہ عید الاضحیٰ سے پانچ چھ روز قبل یہاں پہنچتے ہیں تاکہ حجاج کے پاس اس عید سے قبل اتنا وقت ہو کہ وہ اپنی مذہبی رسوم کی ادائیگی مکمل کر لیں، جو یہ ہیں:

قافلے سے الگ ہو کر اور ایک تجربہ کار شخص کی رہنمائی میں یہ بیس یا تیس کی تعداد میں مل کر شہر جاتے ہیں۔ ایک ایسی گلی میں سے گزرتے ہوئے جو رفتہ رفتہ اونچی ہوتی جاتی ہے یہ ایک ایسے دروازے پر پہنچتے ہیں جس کے دونوں طرف سنگ مرمر پر باب السلام (امن وسلامتی کا دروازہ) لکھا ہوا ہے۔ اس دروازے سے اس عظیم مسجد کا اندرونی حصہ صاف صاف نظر آتا ہے۔ یہ خانہ خدا کے گرداگرد ہے جسے یہ عزت واحترام کے ساتھ دو مرتبہ سلام کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ کہتے ہیں: ''اے خدا کے سفیر تجھ پر سلامتی ہو''۔ جب یہ آگے بڑھتے ہیں تو ان کے دائیں جانب انہیں ایک محراب نظر آتا ہے۔ اب وہ مزید پانچ سیڑھیاں اترتے ہیں جہاں انہیں پہلے محراب کی مانند ایک اور محراب دکھائی دیتا ہے وہ ایک ایک کر کے سات محرابوں تک پہنچتے ہیں۔ اس دوران وہ کچھ دعائیں بھی دہراتے جاتے ہیں جو ان کا کہنا ہے کہ حضرت حاجرہ نے اس وقت کی تھیں جب انہیں اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے تلاش کے باوجود پانی نہیں مل رہا تھا۔ اس رسم کے بعد حجاج مسجد کے

اندر داخل ہوتے ہیں اور خانہ خدا کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ وہ سات مرتبہ طواف کرتے ہیں جس میں ہر بار یہ کہتے جاتے ہیں: ''یہ خدا کا گھر ہے اور اُس کے بندے ابراہیمؑ کا''۔ اس کے بعد وہ حجر اسود کو بوسہ دینے جاتے ہیں۔ پھر زم زم کے کنویں پر جا کر سر سے پاؤں تک اپنے آپ کو دھوتے ہیں اور کہتے ہیں: ''اے ہمارے مالک ہماری توبہ قبول کر لے۔ ہمارے آقا ہمیں معاف کر دے''۔ اس کے بعد ان میں سے ہر شخص اپنی رہائش گاہ پر پہنچ جاتا ہے۔ ان میں سے ہر رسم کم از کم ایک بار ضرور ادا کی جاتی ہے۔ مگر وہ جو دوسروں پر سبقت لے جانے کی خواہش رکھتے ہیں اور ان سے پہلے جنت میں جانا چاہتے ہیں۔ دن میں یہی عمل ایک بار ضرور کرتے ہیں جب تک قافلہ وہاں ٹھہرتا ہے۔

مکہ میں آرام کر لینے کے بعد قافلہ کیا کرتا ہے: (مکہ میں پانچ روز گزارنے کے بعد) عیدالاضحیٰ کی شام سے ایک روز پہلے کی رات، اپنی پوری کمپنی کے ہمراہ کوہ عرفات کی طرف چل پڑتا ہے۔ یہ پہاڑ مکہ سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ درمیان میں ایک مقام منیٰ کا بھی پڑتا ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور چار بڑے بڑے سنگ میل ہیں جن کے بارے میں ہم آگے چل کر بات کریں گے۔ آیئے پہلے عرفات کا ذکر ہو جائے جو چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ یہ زیادہ اونچی نہیں اور بے حد خوبصورت ہے جو گولائی میں دو میل ہے۔ اس کے گرد ایک ایسا میدان ہے کہ اس جیسا انسانی نظروں نے شاید ہی کہیں اور دیکھا ہوگا۔ یہ میدان بھی پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے مگر یہ بہت اونچے اونچے پہاڑ ہیں اور یہ صورت حال ایسی ہے جیسی دنیا میں کم کم ہی نظر آتی ہے۔ انسان کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے فطرت نے یہاں اپنی صناعی کا کمال دکھایا ہے کہ کوہ عرفات کے نیچے اس قدر بڑا اور دلکش میدان پیدا کر دیا ہے۔

مکہ کی طرف پانی کے بہت سے پائپ ہیں، جن میں صاف و شفاف اور تازہ پانی ملتا ہے جو بے حد صحت بخش ہوتا ہے۔ ان پائپوں سے یہ پانی ان ٹینکوں میں گرتا ہے جو اس مقصد کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ لوگ اس پانی سے یہاں تازہ دم ہوتے اور اس سے غسل بھی کرتے ہیں اور ان کے جانور بھی اسی پانی سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ جب آدمؑ اور اماں حوا کو خدا کے فرشتے کے ذریعے جنت سے نکل جانے کا حکم ملا تھا تو وہ دونوں اس چھوٹے سے پہاڑ پر آ گئے تھے اسی لیے اسے ''کوہ بخشش'' بھی کہتے ہیں۔ روایت یہ ہے کہ آدم و حوا ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے اور ہجر و فراق کی یہ مُدت چالیس برس بتائی جاتی ہے۔ پھر دونوں اس مقام پر ملے تو بے حد خوش تھے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر انہوں نے ایک چھوٹا سا گھر تعمیر کر

لیا تھا جسے آج ''آدم کا گھر'' کہتے ہیں۔

دیگر قافلے: جس روز قاہرہ سے آنے والا قافلہ یہاں پہنچتا ہے دو اور قافلے بھی یہاں پہنچ چکے ہوتے ہیں، ایک دمشق سے اور دوسرا عرب سے۔ اس طرح ایک وقت میں یہاں دو لاکھ افراد جمع ہوتے ہیں اور جانوروں کی تعداد تین لاکھ سے بڑھ جاتی ہے۔ یہ سب یہاں عیدالاضحیٰ سے ایک رات پہلے اکٹھے ہوتے ہیں۔ تینوں میزبان ایک مثلث کی شکل اس طرح اختیار کر لیتے ہیں کہ پہاڑ ان کے درمیان ہو۔ اس رات سوائے فائرنگ کی آواز کے دوسری کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ آتش بازی کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیا۔ لوگ خوشی سے چیختے چلاتے، گاتے ہیں اور یوں ایک حیرت انگیز منظر رات بھر آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

عیدالاضحیٰ کے روز بالکل خاموشی ہوتی ہے، لوگ آرام کرتے ہیں اس دن لوگ نماز عید ادا کرتے اور قربانی کے جانور ذبح کرتے ہیں۔ شام کو وہ لوگ جن کے پاس گھوڑے ہوتے ہیں وہ ان پر سوار ہو کر پہاڑ کے جس قدر قریب پہنچ سکتے ہوں پہنچ جاتے ہیں۔ دوسرے پیدل پہاڑ کی سمت چل پڑتے ہیں جہاں قاہرہ کے قافلے کے کپتان کو پہلی جگہ، دمشق کے کپتان کو دوسری اور عرب کے قافلے کے کپتان کو تیسری جگہ دی جاتی ہے۔ جب سب وہاں پہنچ جاتے ہیں تو ایک اشراف زادہ ایک ایسے اونٹ پر سوار پہنچتا ہے جسے خوب سجایا گیا ہو۔ پہاڑ کی ایک جانب وہ پانچ سیڑھیاں چڑھ کر ایک ایسے منبر پر جا کر بیٹھتا ہے جو اس مقصد کے لیے بطور خاص بنایا جاتا ہے اور جہاں اسے ایک مختصر سا وعظ کرنا ہوتا ہے۔ وہ انہیں بتاتا ہے کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں، جنہوں نے انہیں بت پرستی اور گناہ آلود زندگی سے نجات دلائی تھی، خدا نے مسلمانوں کو ان گنت انعامات اور عنایات سے نوازا ہے۔ وہ انہیں یاد دلاتا ہے کہ خدا نے انہیں خانۂ ابراہیم بھی دیا جہاں وہ ان کی آواز سنتا ہے، پھر انہیں عرفات (کوہ بخشش) دیا جہاں انہیں ان کے گناہوں کی معافی ملتی ہے۔ وہ انہیں خدا کے سیکرٹری ابراہیم کی یاد دلاتا ہے جنہیں خدا نے مکہ میں ایک گھر کی تعمیر کا حکم صادر فرمایا تھا جہاں ان کے جانشین اس خدائے وحدہ لاشریک کے حضور دعائیں مانگیں گے اور ان کی دعائیں سنی جائیں گی۔ اس وقت دنیا بھر کے پہاڑوں نے اپنے پتھر اس جگہ بھیج دیئے تھے تاکہ اس گھر کی تعمیر ہو سکے، سوائے اس چھوٹی سی کم اونچی پہاڑی کے جو اپنی بے بضاعتی کے باعث یہ قرض ادا نہ کر سکی۔ اس غم میں یہ پہاڑی تیس برس تک روتی رہی۔ پھر خدا کو اس پہاڑی پر رحم آیا اور اس نے فرمایا: ''رومت تمہاری فریاد مجھ تک پہنچ گئی ہے۔ خوشیاں مناؤ کہ مستقبل میں جو کوئی بھی میرے دوست ابراہیم کے گھر کی زیارت کے لیے آئے گا اس کے گناہ

اس وقت تک معاف نہیں کیے جائیں گے جب تک وہ عزت و احترام کے ساتھ پہلے تیرے پاس نہیں آئے گا اور اپنی مقدس ضیافت کا اہتمام یہاں نہیں کرے گا۔ اس کا حکم میں نے اپنے بندوں کو اپنے محبوب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی دیا ہے''۔ پھر وہ مبلّغ اور واعظ ہر شخص کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ خدا سے مُحبت، عبادات اور صدقہ وخیرات کی فکر کرے۔

وعظ اس وقت اختتام کو پہنچتا ہے جب سورج غروب ہو رہا ہوتا ہے۔ حجاج اب تین دعائیں کرتے ہیں، پہلی شریف مکہ کے لیے، دوسری سلطان اور اپنے میزبان کے لیے اور تیسری لوگوں کے لیے، جس پر سب بیک آواز دہراتے ہیں: ''اے ہمارے پروردگار ایسا ہو جائے، ایسا ہو جائے''۔ پھر واعظ کی نیک تمنائیں حاصل کرنے کے بعد اور کوہ بخشش (عرفات) کو سلام کہنے کے بعد یہ واپس منیٰ آ جاتے ہیں، اُسی راستے جس راستے سے وہ یہاں آئے تھے۔ میدان کے ختم ہونے کے بعد وہ چار سنگ میل نظر آئے جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ راستے کے ہر ایک طرف دو دو تھے۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہر شخص ان کے درمیان سے گزرے۔ جو ان کے باہر سے گزر جائیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حج کے دوران انہوں نے جو کچھ کمایا تھا وہ ضائع کر دیا ہے۔ کوہ بخشش سے لے کر ان سنگ میلوں تک کوئی بھی اس ڈر سے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی جسارت نہیں کرتا کہ جو گناہ وہ پہاڑوں میں چھوڑ آیا ہے دوبارہ اس کے اندر واپس آ جائیں گے۔

ان سنگ میلوں سے آگے گزرنے کے بعد ہر شخص سواری سے اتر آتا ہے اور اس ریتلے میدان میں سے پچاس ساٹھ کنکریاں جمع کر کے انہیں ایک رومال میں منیٰ لے آتا ہے یہاں حجاج پانچ روز رکتے ہیں۔ یہاں اس دوران ایک میلہ لگتا ہے جس میں سامانِ خرید پر کوئی محصول کوئی کسٹم ڈیوٹی نہیں ہوتی۔ منیٰ میں تین ستون ہیں، یہ ایک جگہ نہیں بلکہ مخالف سمتوں میں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں تین بار شیطان ابراہیمؑ، حاجرہ اور اسمٰعیلؑ کے سامنے نموذار ہوا تھا۔ حجاج اپنے یہاں قیام کے دوران ان تین ستونوں کے پاس جاتے ہیں اور وہ کنکریاں جو وہ اپنے ساتھ جمع کر کے لائے تھے، انہیں ان پر پھینکتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت یہ وہی الفاظ دہراتے ہیں جو اسمٰعیلؑ نے شیطان سے اس وقت کہے تھے جب آپ اس کے ورغلانے میں نہیں آئے تھے۔

پانچ روز کے بعد کپتان قافلے کے لوگوں کے ہمراہ اُٹھتا اور مکے واپس آ جاتا ہے جہاں وہ مزید پانچ روز قیام کرتے ہیں۔

☆☆☆

6۔ جوزف پٹس...... برطانیہ
1685ء

موسم سرما کے ایک روز 1678ء میں جب کھلے سمندروں میں ڈاکے اتنے ہی عام تھے جتنی آج فلوریڈا میں گاڑیاں اٹھالی جاتی ہیں۔ایک الجیریائی بادبانی جہاز کا اسپینی ساحل سے کچھ دُور ایک مچھلیاں پکڑنے والے انگلستان کے جہاز سے آمنا سامنا ہوا۔جس نے الجیریائی جہاز کے عملے کو قید کر کے ان کے جہاز کو غرق آب کردیا تھا۔جن افراد کو قیدی بنایا گیا تھا ان میں ایک پندرہ سالہ لڑکا جوزف پٹس بھی تھا۔اس کی تعلیم زیادہ نہ تھی اور وہ پریسبٹرین کلیسا کا پیرو تھا۔اسے الجزائر میں لاکر بطور غلام فروخت کردیا گیا تھا۔آئندہ پندرہ برسوں کے دوران اس نے تین آقاؤں کی غلامی کی تھی۔اس کا پہلا آقا ظالم تھا۔دوسرے نے اسے مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جو خود بہت خودسر تھا۔تیسرا جو رحمدل اور مہربان تھا وہ اسے مکے ساتھ لے آیا اور وہاں لاکر آزاد کردیا تھا۔واپس آکر پٹس نے اپنے پندرہ برس کے سفر کی سرگزشت لکھی۔اس کا سفرنامہ انگریزی ادب میں ایک حیرت انگیز اور بیحد تجسس آمیز سفرنامہ تصور ہوتا ہے۔ایک طرف تو یہ بربری ساحل پر قید و بند اور فرار ہونے کی پراسرار داستان ہے تو دوسری جانب ایک سرگرم اور مستعد عیسائی نوجوان کی طرف سے اسلام کو مسترد کرنے کی کوشش ہے۔یہ ایک عام انسان کی سادہ سی سرگزشت ہے جسے مقدر نے ایک تجربہ کار شاہد بنادیا تھا۔سفرنامہ کا وہ طویل حصّہ تو حذف کردیا گیا ہے اور اس کتاب میں شامل نہیں کیا جارہا جس میں حج کے بارے میں وہ مکمل رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔سفرنامے کے دوسرے ابواب میں بحیرہ روم کے ڈاکے اور غلامی کی طرف ایک روشن کھڑکی کھلتی ہے۔داستان در داستان اس سب میں ایک انگریز ملاح کے حج کی تفصیل بھی موجود ہے۔

جب ہم یہ اقتباسات اس کتاب میں شامل کرتے ہیں تو آغاز جوزف پٹس کی الجزائر میں گزرنے والی غلامانہ زندگی سے ہوتا ہے۔پھر اس سفر کی روداد آتی ہے جو اس نے مکے تک کیا۔اس میں شہر مکہ کا ذکر بھی ہے اور حج کا بھی۔اس بات کا تذکرہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ پٹس کا 1680ء کی دہائی کا مکہ وہ نہیں تھا جو بعد

کے سفرناموں میں دکھایا گیا ہے کیونکہ اس وقت یہاں سہولیات کا فقدان تھا۔دوسری وجہ شاید یہ تھی کہ پٹس نے جب مکے کا ذکر کیا تو وہ اسے لندن کے تقابلی تناظر میں دیکھ رہا تھا۔اس کے سامنے لندن کی پرآسائش زندگی تھی۔

وہ مکہ میں چار مہینے ٹھہرا تھا اور اس کا جو ذکر وہ کرتا ہے وہ قابل یقین ہے اور مفصل بھی۔اس کے سفرنامے سے منتخب کیے گئے اختتامی حصے وہ ہیں جن میں اس کی مصر واپسی کی تفصیلات ہیں جب وہ قاہرہ کے سرکاری قافلے کے ہمراہ تھا۔

اس بات کو حیرت کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا کہ پٹس کے سفرنامے میں جابجا غلامی کی تفصیلات قلمبند کی گئی ہیں۔دراصل اس کے دور میں غلامی ایک منافع بخش تجارت تھی اور بحیرہ روم کا کلچر اس میں رچا بسا ہوا تھا۔نئی دنیا (امریکہ) میں اس تجارت کو متعارف کرانے کے لیے صرف پرتگال نے 1650ء میں اپنی نوآبادیوں میں سے صرف ایک موجودہ انگولا سے ڈیڑھ ملین غلاموں کو تجارت کی غرض سے نکالا تھا۔انگریز بھی اس تجارت میں گولڈ کوسٹ تا میری لینڈ اور جمیکا برابر سرگرم تھے۔اسپینی، فرانسیسی اور ڈچ بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے اور چھوٹے جزائر غرب الہند اور جنوبی امریکہ تک پہنچ گئے تھے۔بظاہر تمام غُلامی ایک جیسی نظر آتی ہے۔پٹس نے الجزائر میں غلاموں کی جس منڈی کا ذکر کیا ہے وہ نارفوک اور ورجینیا کی نمائندگی کرتی ہے۔مگر دونوں نظاموں میں عملاً بہت فرق تھا۔الجیریا میں غلام اکثر یورپی ہوتے تھے جبکہ ان کے مالک افریقی تھے۔اس کے علاوہ الجیریا میں ترک، عرب، بربر، عیسائی اور یہودی سب غلام رکھ سکتے تھے اور سب کے پاس غلام تھے۔ان غلاموں کو گھروں، فارم ہاؤسز، محلات، دکانوں میں کام کرنے کے لیے رکھا جاتا تھا اور مقامی فوج اور نیوی میں بھی ان پر انحصار کیا جاتا تھا۔قزاقوں کے وہ بحری جہاز جن میں غلاموں کی تازہ کھیپ کو لایا جاتا تھا ان کے کپتان اکثر و بیشتر یورپی ہوتے تھے۔یہ منڈی کے بدلے اور محفوظ بندرگاہ کے لیے اپنے منافع کا 1/8 حصہ عثمانی گورنر کو دیتے تھے۔مثال کے طور پر وہ بحری جہاز جس نے جوزف پٹس کو پکڑا تھا اس کا کپتان ڈچ، جہاز کا افسر انگریز اور تیس چالیس چپو چلانے والے غلام تھے۔پٹس جب کپتان کا ذکر کرتا ہے تو اسے مرتد بتاتا ہے۔

مسلم الجیریا میں غلام کی حیثیت یورپی نظام کے غلام سے بالکل مختلف تھی۔ایک ناتجربہ کار اور بے ہنر غریب غلام کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جاتا تھا اس لیے کہ غلام کی قیمت کا تعین دو باتوں پر ہوتا تھا: اسے

آزاد کرتے وقت کیا ملے گا اور وہ کمانے کی قوت کتنی رکھتا ہے۔ غلاموں کو آزاد کراتے وقت جو رقم ملتی تھی اس کا انحصار اس کے خاندان کی دولت، وطن میں اس کے میل جول روابط اور الجیریا میں زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانے کے لیے اس کے پاس ہنر پر تھا۔ مالکوں کے لیے تو غلام نقد رقم وصول کرنے کے چیک ہوتے تھے۔ غلام کے چلے جانے سے چونکہ مزید منافع اور آمدنی کا ذریعہ ختم ہو جاتا تھا اس لیے مالکان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ انہیں کرائے پر دے دیں...... کسی دُکان، کارخانے، فوج یا بحری جہاز پر نگران چھوٹی موٹی ملازمتوں کے عوض غلام کی آمدنی برائے نام ہوتی تھی۔ پٹس کا پہلا آقا اسے قزاقوں کے ایک بحری جہاز کو دے کر اس کی اُجرت اور مزدوری وصول کرتا رہا تھا۔

ایسے غلام جنہیں کوئی ہنر آتا تھا مثلاً چمڑے کا کام کرنے والوں، لوہاروں وغیرہ کو عوامی دُکان پر ملازم کرا دیا جاتا تھا۔ ان کے مالکوں کی خواہش ہوتی تھی کہ یہ غلام اپنے اپنے پیشے اور ہنر سے وابستہ رہیں اور یوں آقا و غلام کا رشتہ تجارت کا رشتہ بن جاتا تھا۔ بہت سے اسپینی لوہار یا اطالوی الماریاں بنانے والے اپنی رہائی کے لیے کچھ رقم جمع کرتے جاتے تھے کچھ ساتھ ساتھ مالکوں کو دے دیتے تھے۔ اس طرح کچھ عرصے بعد وہ ایک خاص رقم مالک کو ادا کر کے آزادی حاصل کر لیتے تھے۔ ایک ہنرمند غلام سے آقا بدسلوکی بھی کم کرتا تھا۔ جو غلام تعلیم یافتہ ہوتا تھا اسے جب کام پر لگایا جاتا تو اس میں مالک اور غلام دونوں کا فائدہ ہوتا تھا۔ ایسی صورت حال میں زندگی آسان اور آرام دہ تو ہو جاتی تھی مگر اس میں ایک غلام کی رہائی کے امکانات کم ہو جاتے تھے۔ جن دنوں پٹس اپنے رحمدل مالک کے پاس تھا تو اس نے ایک ترک سکول میں بہترین کارکردگی دکھانے کا خیال محض اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ زیادہ نمایاں کامیابی مستقبل میں اس کی رہائی کے راستے میں رکاوٹ بن جائے گی۔ ایک طرف تو وہ ہمیں بتاتا ہے کہ "الجیریا میں اسے انگلستان سے کہیں زیادہ عزت ملی تھی" تو دوسری طرف وہ آزادی کا بھی خواہش مند تھا۔

ہنری فیلڈنگ کے ناول کے کسی آوارہ گرد ہیرو کی مانند پٹس الجیریا میں دس برس تک غلامی کی زندگی گزارتا رہا جب اس کے ساتھ نہایت ذلت آمیز سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اس کا پہلا مالک تو صرف اس کے ساتھ کبھی کبھی بدسلوکی کرتا اور اسے چابک سے پیٹتا تھا مگر اس کا دوسرا مالک جو بے حد ظالم تھا اور میلوڈراما کی قدرتی مہارت کے ساتھ وہ رات رات بھر پٹس کو پیٹتا رہتا تھا اور پھر اسے اس نے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ پٹس اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ الجیریا میں ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ اس کی کئی مثالیں دوسرے غلاموں کی

کہانی سامنے آئیں جن کے مالک ان سے اس طرح کا کبھی سلوک نہ کرتے تھے۔ ہمیں یہ سن کر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ پٹس کے اس مالک کو چند ماہ بعد قتل کر دیا گیا تھا۔ پٹس کا تیسرا مالک ایک معمر کنوارا تھا جس نے اسے متبنیٰ بنالیا تھا۔ وہ اسے حج کے لیے مکہ بھی لے گیا تھا۔

پٹس ایک سنجیدہ عیسائی تھا۔ اسے جب اسلام لانے پر مجبور کیا گیا تو وہ اس بات پر بہت ناراض اور رنجیدہ ہوا تھا۔ اس کی فرار ہو جانے کی خواہش میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جب واپس الجیریا آیا اور اسے آزادی کی پیشکش ہوئی تو اس نے اسے قبول کر لیا تھا۔ مگر عثمانیہ معاشرے کی بندھنوں سے فرار آسان نہ تھا۔ اس میں کئی برس لگ گئے تھے۔ دو برطانوی قونصلوں کی مدد سے پٹس فرار ہو جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے مختصر راستے سے الجیریا پہنچنے کی کوشش کی اسے فوج سے آٹھ ماہ کی تنخواہ بھی مل گئی تھی۔ وہ اس غیر یقینی کے عرصے کو "رنج و غم کی بھول بھلیوں" کا نام دیتا ہے۔ ایک ماہ بعد وہ سمرنا سے ایک فرانسیسی بحری جہاز میں سوار ہو گیا تھا۔ یوں وہ انگلستان واپس پہنچا تھا جہاں وہ 1730ء کی دہائی تک زندہ رہا۔

جوزف پٹس کئی برس تک پہلا انگریز تھا جس نے مکے تک کا سفر کیا اور اس بارے میں لکھا بھی۔ مگر وہ واحد یورپی غلام نہیں تھا جس نے یہ سفر کیا۔ ایسی ہی مہمات کا ذکر اس سے قبل بھی ریکارڈ پر ہے۔ عربی میں لکھی گئی ایک کتاب کے حاشیوں میں رمزیہ انداز میں ایک گمنام رپورٹ ایک پرتگالی غلام نے لکھی جو ویٹکن لائبریری میں 1565ء میں ملی تھی۔ اس کے علاوہ 1612ء میں ایک جرمن نوجوان ہینز وائلڈ کی سرگزشت بھی ملی، جسے ترکوں نے ہنگری میں گرفتار کر لیا تھا اور اسے نوکر کی حیثیت سے حج پر ساتھ لے گئے تھے۔ چند برس بعد ہم مارکو ڈی لمبارڈو سے سنتے ہیں جس لڑکے کا تعلق وینس سے تھا اور جسے بحری سفر کے دوران گرفتار کر کے مصر میں بطور غلام بیچ دیا گیا تھا۔ اسے بھی پٹس کی طرح حج کے لیے بدرقہ کی حیثیت سے ساتھ لے جایا گیا تھا۔ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کے بارے میں چشم دید حالات کی تفصیلات لے کر یہ سب لوگ واپس آئے تھے۔ جو چند ایک سفرنامے دستیاب ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ بہت سے ایسے دوسرے یورپی قیدی بھی تھے جنھوں نے حج کیا مگر اس بارے میں یا تو لکھا کچھ نہیں یا جو لکھا وہ ضائع ہو گیا۔ پٹس کی زندگی میں کسی مغربی عیسائی کے لیے مکہ جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ ایک سو میں سے نہیں بلکہ ایک ہزار میں سے صرف ایک ایسا مصنف ہوتا ہوگا جو وہاں تک پہنچتا ہوگا۔ ایسے سفرنامے جو گم ہونے سے بچ گئے، محفوظ ہیں ان کی تعداد کتنی ہوگی؟

پٹس کا سفرنامہ ان تجسس آمیز تحریروں میں سب سے بہترین معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی سرگزشت ہے جسے اس کے ظالم آقا نے مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا تھا مگر اس کے بغیر وہ غیر جانبدار رہا۔ جس معاشرے نے اسے نقصان پہنچایا اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے وقت اس شخص نے درست اور صحیح معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ پاپائیت کے خلاف تھا اور کٹر مذہب پرست ہونے کے باوجود اسے اسلام اس لیے پسند تھا کہ اس میں پاپائیت نہیں ہے۔ وہ اس بات کو صیغۂ راز میں نہیں رکھتا کہ وہ عیسائی عقیدے میں کٹرپن نہیں رکھتا تھا۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے وہ اسلام کے بارے میں کچھ جاننے کا ارادہ رکھتا ہے۔ حقیقت پر مبنی معلومات حاصل کرنے کی خواہش میں گرفتار تھا کہ اس دنیا کو جان سکے جس کا اس قدر منفعت کے ساتھ اس نے استحصال کیا تھا۔ یہ اسلام کی ترویج کا دور بھی تھا جب سلطنتِ عثمانیہ واقعی مغربی یورپ کے دروازوں تک پہنچ چکی تھی۔

یورپی جہاز رانی میں وسعت نے تمام غیر ملکی چیزوں کی دلچسپی میں اضافہ کر دیا تھا اور اسلام نے جو مغرب کا پرانا حریف اور ہمسایہ تھا اسے اس عہد میں زیادہ توجہ حاصل ہوئی۔ چھاپے خانے کے فروغ سے اور اسپینی تحقیق میں کمی آ جانے کے باعث مسلم اسپین کی قدیم کتب دوبارہ سامنے آنے لگی تھیں۔ 1542ء میں قرآن کا ایک لاطینی ترجمہ بیسل میں سامنے آیا جو کینٹن کے رابرٹ نے 1143ء میں ٹولیڈو میں کیا تھا، اور اس کا پیش لفظ ایک پروٹسٹنٹ مارٹن لوتھر نے لکھا تھا۔ انگلستان کی آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں قدیم تراجم پر سے گرد جھاڑ لی گئی تھی جو علوم شرقیہ کے سنگ بنیاد ثابت ہوئے۔ پٹس کی پیدائش کے وقت مسلمانوں پر لکھی گئیں یورپی تصنیفات کی تعداد تمام افریقی اور امریکی قبائل پر مطبوعہ کتابوں سے کہیں زیادہ تھی۔ پٹس جیسا مصنف جس کی تعلیم بھی واجبی سی تھی اپنے موضوع پر تنقید کی خاطر بہت پڑھتا تھا۔ اس میں کچھ کتابوں کے پاورقی حاشیوں (فٹ نوٹس) میں دی گئی اسلام پر مستند رائے بھی شامل ہوتی تھی جو مسلم سکالرز کے قلم سے ہو۔ پٹس لکھتا ہے ''اور میں جب اپنے وطن واپس لوٹا تو مجھے بہت سی کتابیں پڑھنے کو ملیں ان میں سے چند ایک میں الجیریا کا ذکر بطور خاص کیا گیا ہے، دوسری کتابوں میں اسلام کا ذکر بھی کیا گیا ہے مگر ان میں بہت سی غلطیاں ہیں''۔

1704ء میں جب یہ سفرنامہ شائع ہوا تو اس میں جو حقائق سے پُر بیان اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ہے اسے بے حد پسند کیا گیا اور اس کا ذکر کئی ایڈیشنوں میں ہوا، ان میں سے ایک ایڈیشن

سرقے پر مشتمل تھا۔ سفرنامے کے پیش لفظ میں پٹس اپنی معمولی سی نثر اور علمیت پر معذرت خواہی کرتا ہوا ملتا ہے۔ پھر تجربے پر قلم اٹھانے کو اپنا حق تصور کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''میرا سوال یہ ہے کہ کیا آج انگلستان میں کوئی ایسا انسان ہے جو کبھی مکّہ گیا ہو؟'' ۔ اپنی کتاب کے بارے میں وہ لکھتا ہے: '' مجھے اس بات کا احساس ہے کہ مجھ میں قابلیت نہیں جو کسی ایسے شخص میں ضرور ہونی چاہیے جو اس قسم کی تاریخ لکھتا ہے۔ تاہم میں ایک بات صاف صاف اور پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے پاس کسی مؤرخ کی نہایت قیمتی استعداد موجود ہے یعنی سچائی اور حقیقت''

جوزف پٹس نے ایک عام آدمی کے سیدھے سادے اسلوب میں انگریزی نثر لکھی۔ تاہم وہ براہ راست تجربے کا ذکر بغیر الفاظ کی شعبدہ بازی کے ضرور کرتا ہے۔ اس اسلوب کو پہلے ہی ڈینیل ڈیفو نے بہت مقبول بنا دیا تھا۔ جس وقت پٹس کی کتاب شائع ہوئی اس وقت ڈیفو اپنے جریدے ''دی ریویو'' کی تدوین میں مصروف تھا۔ اسے بحری جہازوں کی تباہی اور جلاوطنی کی کہانیاں بہت پسند تھیں اور اسے زیادہ شہرت معاوضے پر دوسروں کے نام سے لکھنے پر حاصل ہوئی۔ اس موضوع پر سرقہ پر اس کی کتاب کو اپنے دور کی بہترین کتاب قرار دیا گیا تھا۔ اس نے مغربی سفرناموں کے طرز جمع کر کے اس آمیزش سے ایک نئی شے تخلیق کی جسے سفرنامہ، سیاحت نامہ، مہم جُو کی سرگزشت، کسی سیاح کی داستانِ سفر کہتے ہیں۔ ڈیفو کے پاس سیاحوں کے سفرناموں کا انگریزی مجموعہ تھا جن میں سے وہ نئے نئے پلاٹ لے کر کہانیاں لکھتا تھا۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ اس کے پاس پٹس کی کتاب نہیں تھی۔ مگر یہ بات ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پٹس کی نظر سے ڈیفو اوجھل نہیں رہا ہوگا۔

☆☆☆

جوزف پٹس کے دُرست اور حقائق پر مَبنی سفر نامے سے

الجیریائی مجھے گرفتار کر لیتے ہیں۔ جب میری عمر تقریباً چودہ پندرہ برس تھی، میرے اندر کی صلاحیت نے مجھے ملاح بن کر غیر ملکوں کو دیکھنے کا شوق دلایا تھا۔ میری ماں کو یہ بات پسند نہ تھی مگر میرے والد میرے اس مزاج کے سامنے لاجواب ہو گئے تھے۔ دو تین چھوٹے چھوٹے سمندری سفر کر چکنے کے بعد میرا دل چاہتا تھا کہ کسی دور دراز ملک کو دیکھنے جاؤں۔ میری اس آرزو نے مجھے پریشان بھی بہت کیا جیسا کہ میری کہانی آگے چل کر بتائے گی۔

میں نے ایسٹر کے منگل کو 167ء میں مسٹر جارج ٹیلر کے ساتھ بحری سفر پر روانہ ہونے کے لیے اپنے آپ کو اس کے بحری جہاز "سپیڈویل" پر بک کیا تھا۔ یہ بحری جہاز مغربی جزائر کو جا رہا تھا۔ وہاں سے اسے کنیری جزائر جانا تھا اور اگر خدا نے چاہا تو پھر وطن واپسی۔ ہم بخیر و عافیت نیو فاؤنڈ لینڈ پہنچ گئے تھے۔ ہمارا تجارتی سفر یہاں ختم ہو گیا تھا مگر ہوا موافق تھی اور ہم بلباؤ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ نیو فاؤنڈ لینڈ سے چالیس روز باہر رہنے کے بعد ہم اسپین کے ساحل کے قریب پہنچ گئے تھے، ہم جانتے تھے کہ یہ وہ مقام تھا جہاں الجیریائی مغرب کی طرف سے آنے والے چھوٹے چھوٹے بحری جہازوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ ہم نے جہازوں کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن ہمیں صبح کے طلوع ہوتے سورج کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا اور شام کو ہماری نظر غروب آفتاب پر تھی۔ جس روز ہمیں پکڑ لیا گیا تھا۔ اس روز ہمارے جہاز کا افسر مسٹر جان ملٹن مستول کے سب سے بلند سرے پر تھا جب اس نے چلا کر کہا: "وہ دیکھو کوئی جہاز آ رہا ہے۔" مالک نے اس سے پوچھا: "کہاں؟"۔ افسر نے جواب دیا "جہاز محفوظ رُخ پر ہے ہم سے تقریباً نو دس کوس کے فاصلے پر"۔ مالک نے کہا: "اب ہماری بھاگ جانے کی ساری کوششیں رائیگاں جائیں گی کیونکہ ایک دو گھنٹے میں دشمن ہمیں آ لے گا"۔

جب قزاقوں کا بحری جہاز ہمارے قریب پہنچا تو ہمیں معلوم ہوا کہ اس کا کپتان ایک ڈچ مرتد ہے۔ وہ انگریزی بول سکتا تھا، اس نے ہمیں حکم دیا کہ بادبان کو بلند کرو۔ ہم یہ اتنی آسانی سے نہ کر سکتے تھے

کیونکہ چند روز قبل ہمارا ایک ساتھی طوفان کی نذر ہو گیا تھا اور مجھے ابلتے ہوئے پانی نے کام کرنے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ اس سے قبل کہ ہم بادبان بلند کرتے وہ ہمارے جہاز کے اندر گھس آئے تھے۔ میں سب سے کم عمر تھا اور دشمن کو دیکھ کر سہم گیا تھا۔ میں نے اپنے مالک کو چلا کر کہا: ''مجھے ڈر ہے کہ یہ ہمیں قتل کر کے کھا جائیں گے۔''
میرے مالک نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''نہیں نہیں بچے یہ ہمیں ماریں گے نہیں بلکہ ہمیں پکڑ کر الجیریا لے جائیں گے جہاں ہمیں فروخت کر دیا جائے گا۔''

ہم اس سفر میں ان کا پہلا انعام ثابت ہوئے تھے حالانکہ انہیں سمندر میں گھومتے چھ ہفتے گزر گئے تھے۔ انہیں ہمارے جہاز میں سے جو کچھ بھی کام کا ملا انہوں نے نکال لیا تھا اور ہمیں بھی اپنے جہاز میں منتقل کرنے کے بعد ہمارے جہاز کو غرقِ آب کر دیا تھا۔ اس میں چونکہ مچھلی لدی ہوئی تھی اس لیے انہوں نے اسے ہمراہ لے جانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

چار پانچ دن گزر گئے تو انہیں ایک اور چھوٹا برطانوی جہاز ملا۔ یہ بھی نیوفاؤنڈ لینڈ سے آیا تھا اور اس میں پانچ چھ آدمی سوار تھے۔ مزید دو تین دن گزر گئے تو انہیں ایک اور چھوٹا سا برطانوی جہاز ملا۔ اس پر بھی اتنے ہی افراد تھے۔ اس میں مچھلی لدی ہوئی تھی اور یہ نیوانگلینڈ سے آ رہا تھا۔ یہ ابھی کچھ فاصلے پر تھا مگر اس تک پہنچنے کی امید اس لئے کم تھی کیونکہ ہوا موافق نہیں تھی۔ انہوں نے ایک چال چلی۔ انہوں نے اپنے بادبان بلند کر کے برطانوی جھنڈا لہرا دیا تھا۔ یوں اسے اپنے دامنِ فریب میں پھنسا کر انہوں نے اس جہاز کو بھی غرق کر دیا تھا۔

دو تین روز اور گزر گئے تو انہیں ایک اور چھوٹا برطانوی جہاز ملا جس پر چار پانچ افراد سوار تھے اور مچھلی لدی ہوئی تھی۔ انہوں نے مچھلی کی کافی مقدار نکال لی اور پھر اسے غرق کر دیا۔ سب سے آخر میں انہیں ایک ڈچ جہاز ملا جس پر سات افراد سوار تھے۔ اس پر کچھ پائپ کے ٹکڑے لدے ہوئے تھے۔ اسے بھی انہوں نے غرق آب کر دیا تھا۔ اسے ڈبونے کے لیے بھی انہوں نے ڈچ جھنڈے لہرا دیے تھے مگر جب اس جہاز کے عملے نے قریب آ کر دیکھا کہ سامنے والے جہاز میں ڈچ نہیں بلکہ ترک تھے تو اس نے جہاز کو دور لے جانے کی پوری کوشش کی مگر بے سود۔ رات کا وقت تھا اور اس جہاز کو قبضے میں لے لیا گیا تھا۔

الجیریا میں غلام: ہم جلد ہی الجیریا پہنچ گئے تھے جو ایک ایسی جنت تھی جس کی ہم نے خواہش نہ کی تھی۔ ہمیں ساحل پر واقع کپتان کے گھر پر لے گئے اور اس رات ہمیں تھوڑی سی ڈبل روٹی اور پانی کے سوا

کچھ نہ دیا گیا تھا۔ اگلی صبح وہ ہمیں الجیریا میں عثمانیہ فوج کے کمانڈر یا بادشاہ کے گھر لے گئے تھے جس نے اپنی
مرضی سے غلاموں کی کل تعداد میں سے 1/8 حصہ عوامی استعمال کے لیے لینا تھا اور سامان میں سے بھی اتنا ہی
حصہ وہ وصول کرتا تھا۔ اس کے بعد ہم سب کو مارکیٹ لے جایا گیا جہاں عیسائیوں کو نہیں بیچا جاتا۔ ہم وہاں
آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک کھڑے رہے تھے۔ اس دوران ہمیں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں دیا گیا تھا۔ ہمیں
جب بیچا جا رہا تھا اس وقت بہت سے لوگ ہمیں دیکھنے آتے اور حیرت واستعجاب کا اظہار کر رہے تھے۔ ان میں
وہ بھی شامل تھے جو ہمیں خریدنے آئے تھے اور کسی قربانی کے جانور کی طرح ہمارا جائزہ لے رہے تھے کہ ہم
تندرست وصحت مند تھے یا نہیں اور کیا ہم خدمت کرنے کے لیے موزوں تھے۔ غلاموں کی عموماً بولی لگتی تھی اور
انہیں نیلام کیا جاتا تھا۔ بیچنے والے کی کوشش ہوتی تھی کہ اسے زیادہ سے زیادہ قیمت وصول ہو۔ جس وقت بولی
دہندگان وہاں آ کر کھڑے ہو جاتے تھے اس وقت غلام کا مالک آواز لگاتا تھا: ''یہ دیکھو کس قدر صحت مند اور
توانا انسان ہے یہ ہر کام سرانجام دے سکتا ہے! اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے والدین بہت امیر ہیں اور اس
کے لیے بھاری تاوان ادا کر کے اسے آزاد کرا لیں گے''۔ اس قسم کی متاثر کرنے والی تقریروں کے ذریعے وہ
اپنے غلام کی قیمت بڑھانے کی کامیاب کوشش کرتا ہے۔ جب بولی دہندگان اپنی اپنی بولی دے چکے ہوتے
ہیں تو اس کے بعد غلاموں کو دوبارہ کمانڈر، عثمانیہ فوج، جس کے پاس سول حاکم کی اتھارٹی بھی تھی، لے جاتے
ہیں۔ یہاں اگر کوئی بولی کی رقم میں اضافہ کرنا چاہے تو اس کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ تاہم بولی میں اضافے کی
رقم کمانڈر اور حاکم کی جیب میں جاتی ہے قزاقوں کے ہاتھ نہیں لگتی۔

میرے تین مالک: یہاں انگلستان میں عموماً ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ جب کبھی کسی عیسائی کو
الجیریائی پکڑ کر لے جاتے ہیں تو اسے وہ سخت اذیت دیتے ہیں تا کہ اسے مسلمان کیا جا سکے۔ مگر میں اپنے قارئین
کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ بالکل جھوٹ ہے کسی غلام کو اس بنا پر اذیت کبھی نہیں دی جاتی کہ وہ اسلام قبول کر
لے۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میرے مالک نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ورنہ غلاموں کے مالک کسی عیسائی کو
زبردستی مسلمان نہیں بناتے۔

الجیریا میں میری ملاقات کچھ ایسے ترکوں سے بھی تھی جن کے غلام جونہی اسلام قبول کرنے کی
طرف خود مائل ہوتے یہ انہیں فوراً بیچ دیتے تھے۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جب کبھی کوئی عیسائی غلام
مسلمان ہو جاتا ہے تو اس کا تاوان نہیں ملتا اور اسلام لانے کے کچھ برس بعد اسے ایک مالک بیکار اور فالتو

سے تصور کرنے لگتا ہے۔ وہ نہ تو اسے آزاد کرتا ہے نہ ہی انہیں آزاد زندگی گزارنے کا موقعہ دیتا ہے۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے میں ترک مذہب کے بعد کئی برس غلام رہا اور اس دوران مجھ پر بڑا ظلم ہوا اور پھر مجھے دوبارہ بیچ دیا گیا تھا۔

میرا پہلا مالک مجھ پر تشدد کرتا تھا کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ خلوصِ دل سے یہ چاہتا ہے کہ میں اسلام قبول کر لوں۔ وہ ایسا غالباً اس لیے کرتا تھا تاکہ اسے یہ خیال رہے کہ وہ مجھے مسلمان کرنے کی کوشش کے وقت اپنا کوئی مذہبی فریضہ انجام دے رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے مسلمان بنا کر اپنا اتنا بڑا مالی نقصان نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے قبل اس کا نقصان تو پہلے ہی ہو چکا تھا کہ اس نے ایک غلام لڑکا خریدا تھا جس نے جلد اپنا مذہب تبدیل کیا اور مر گیا تھا۔ میں اس ظالم انسان کے ساتھ دو تین مہینے رہا تھا کہ اس نے مجھے ایک بحری جہاز میں بڑے توپچی کی خدمت کے لیے بھیج دیا تھا۔

انہوں نے بتایا کہ ہم نے بڑی بے دلی سے سفر کیا کیونکہ ہم صرف ایک پرتگالی جہاز پکڑ سکے تھے جس پر اٹھارہ غلام سوار تھے تو میرا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ میں کہیں پھر پہلے والی مصیبت میں گرفتار ہونے تو نہیں جا رہا تھا مگر سوائے صبر کے میں کر بھی کیا جا سکتا تھا۔ خدا کا شکر ہے اس نے مجھے چند روز بعد بیچ دیا تھا اور اس طرح میری اس درندے سے جان چھوٹ گئی تھی۔

میرا دوسرا مالک ملک کے اندر رہتا تھا لوگ اسے خوبصورت ابراہیم کہتے تھے۔ اس کے پاس بہت سے غلام تھے، عیسائی اور حبشی دونوں۔ الجیریا میں اس کے دو بھائی بھی رہتے تھے اور تیسرا بھائی تیونس میں تھا۔ منجھلے بھائی نے تیونس جانے کا ارادہ کر لیا تھا تاکہ وہاں اپنے بھائی سے ملاقات کر سکے۔ یوں لگا جیسے مجھے اس لیے خریدا گیا تھا تاکہ مجھے اس کو تحفے میں دیا جا سکے۔ مجھے نیا خوبصورت لباس زیب تن کرایا گیا تاکہ میں زیادہ اچھا لگوں اور مجھے قبول کر لیا جائے۔ اسی بحری جہاز پر ایک اور انگریز غلام اور اس کا مالک بھی تھا جو تیونس جا رہے تھے۔ اسے وہاں ایک برطانوی قونصل نے واجبی سی قیمت دے کر آزاد کرانا تھا۔ دوسرے روز میرے مالک کا بیٹا، ایک عیسائی غلام کو اپنی خدمت پر مامور پا کر فخر سے مجھے اپنے پیچھے پیچھے چلنے کی تلقین کر رہا تھا۔ میں رضا و رغبت اور خوشی خوشی اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ مجھے شہر دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ راستے میں مجھے ایک ایسا شخص نظر آیا جو دیکھنے میں ایک شریف انسان نظر آتا تھا اور لباس سے عیسائی لگتا تھا۔ اس نے متجسس نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا: ''کیا تم انگریز ہو؟''۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا مالک مجھے وہاں لایا تھا۔ اس نے

حیرت سے پوچھا: ''کیا؟ کیا تم غلام ہو؟''۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے اگلا سوال یہ کیا کہ میرا تعلق کس جگہ سے تھا۔ میں نے بتایا کہ میرا تعلق الجیریا سے تھا۔ وہ سڑک پر مجھ سے کوئی لمبی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ اس نے اس نوجوان سے جس کی خدمت پر میں مامور تھا مخاطب ہو کر کہا کہ وہ مجھے فلاں وقت اس کے پاس لے جائے جہاں وہ میرا منتظر رہے گا اور ہمارا استقبال کرنے میں خوشی محسوس کرے گا۔ نوجوان نے اسے یقین دلایا کہ وہ مجھے ضرور اس کے گھر لے جائے گا۔ یہ نوجوان ایسا اس لیے کر رہا تھا کیونکہ یہ شراب کا رسیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس انگریز کے ہاں اسے من پسند شراب پینے کو ملے گی۔

میرے نئے مالک نے مجھے بتایا کہ سر راہے یوں ملنے والا شخص انگریز قونصل تھا۔ یہ سن کر مجھے خوشی محسوس ہوئی تھی۔ ہم حسب وعدہ مقررہ وقت پر اس قونصل کے گھر پہنچے اس نے ہمارا استقبال کیا اور مجھے اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی میرا نوجوان مالک دوسرے کمرے میں خورد ونوش میں مصروف کر دیا گیا تھا۔ قونصل نے میرے وطن اور میرے والدین کے بارے میں مجھ سے کئی سوالات کیے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں لکھ پڑھ سکتا تھا اور کیا میں ریاضی سمجھتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں دونوں کام کسی حد تک جانتا تھا۔ قونصل نے مجھے بتایا اگر میں تیونس میں رہ گیا تو وہ میری مکمل تسلی اور اطمینان کے مطابق چند احکامات جاری کرے گا اور اگر میرا مالک مجھے دوبارہ الجیریا واپس لے جانے کا ارادہ رکھتا ہو تو میں قونصل کو اس بارے میں آگاہ کر دوں۔ اس دوران اس نے مجھ سے یہ پوچھ لیا تھا کہ کیا میرے لیے یہ ممکن تھا کہ میں بلاناغہ اس کے گھر آ سکوں جہاں میرا استقبال ہوا کرے گا۔ اس شریف النفس انسان کا نام بیکر (شاید چارلس بیکر) تھا جو الجیریا کے قونصل تھامس بیکر کا بھائی تھا۔

میرے دوسرے مالک کے انتقال کے بعد: میں اب یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ میرا مالک یا مالکہ اب مجھے آزاد کر دیں گے۔ مگر وہ مجھے آزاد نہیں کرنے والی تھی اس لیے کہ وہ تو مجھے دوبارہ مضافاتی علاقے میں فروخت کر دینے کا ارادہ کیے بیٹھی تھی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو مجھے عمر بھر غلام رہنا پڑتا کیونکہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں وہاں سے فرار کیسے ہو سکوں گا۔ میں نے اسی لیے بڑی شدت سے یہ چاہا تھا کہ مجھے الجیریا میں فروخت کیا جائے۔ ایسا ہی ہوا اور میری دعا میرے خدا نے سن لی تھی۔ وہاں کی رسم کے مطابق مجھے تین روز تک گلیوں میں گھمایا گیا اور تیسری بار ایک معمر کنوارے نے مجھے خرید لیا تھا۔ میرے ذمہ کام یہ تھا کہ میں اس کے گھر کی دیکھ بھال کروں، گوشت صاف کروں اور اس کے کپڑے دھو دیا کروں۔ یہ کم وبیش سارا کام وہی تھا

جو انگلستان میں کوئی نوکرانی کرتی تھی۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ مجھے اس سے معاوضے میں کسی شے کی طلب نہ تھی۔ میرے پاس کھانے پینے اور پہننے کو بہت کچھ تھا۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے جب ایک برس کا عرصہ گزر گیا تو اس نے حج کی ادائیگی کا فیصلہ کیا اور مجھے ساتھ لے لیا۔ وہ مجھے اکثر بیٹا کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس نے گھر کے کام کاج کے لیے ایک ڈچ لڑکا خرید لیا تھا۔ جو اس کے احکامات کے ساتھ ساتھ میرا حکم بھی مانتا تھا اور میری بہت خدمت کرتا تھا۔ میرا موجودہ مالک مجھے پڑھنے کی تاکید کرتا تھا اور یوں میں نے اس میں کافی استعداد پیدا کر لی تھی۔ اس کی طرف سے اس بات پر بڑا زور دیا جاتا تھا کہ میں لکھنے کی مشق ضرور کرتا رہوں۔ میں نے توقع سے بڑھ کر تر کی حروف لکھنے سیکھ لیے تھے۔ جس سکول میں، میں پڑھتا تھا وہاں میری بڑی تعریف ہوتی تھی۔ مجھے اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ بہت جلد میں اچھا لکھاری بن جاؤں گا۔ مجھے ایک اچھا اکاؤنٹنٹ بننے کی بھی پوری امید تھی۔ میرے مالک کا خیال تھا کہ وہ چونکہ حاکم وقت کا رشتہ دار تھا اس لیے وہ اس سے کہہ کر مجھے ترقی دلا دے گا۔ میں ڈر گیا تھا کہ کل تک معلوم نہیں کیا ہونے والا تھا۔ میں اکثر اپنے مالک کے روپوں سے بھرے ہوئے تھیلے دیکھتا تھا جن کے بارے میں وہ کہا کرتا تھا کہ ان میں سے زیادہ حصہ وہ میرے لیے چھوڑ جائے گا۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا: ''گو میں نے شادی نہیں کی مگر تمہاری شادی جلد کر دوں گا پھر تمہارے بچے میرے بچے ہوں گے جن کو اس میں سے ورثہ ملے گا''۔ ایسی ایک پیشکش مجھے ہوئی بھی مگر خدا کا شکر ہے میں نے اس طرف توجہ نہ دی۔ اگر میں لالچ میں آ کر وہاں اپنی حالت بدلنے کا فیصلہ کر لیتا تو میں اس خیال سے کانپ اُٹھتا ہوں کہ پھر کیا ہوتا۔ اس میرے آخری مالک کے مجھ پر اور بے شمار احسانات تھے، جن کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اس سے بہت محبت کرتا تھا اور اسے اپنے باپ کا درجہ دیتا تھا۔ مگر میری مشکل یہ تھی کہ میں انگلستان کو نہیں بھول پا رہا تھا اور یہ انگلستان نہیں تھا جہاں میں اتنی ڈھیر ساری محبتوں، مہربانیوں اور شفقتوں میں گھرا ہوا تھا۔ میں اپنے وطن جانا چاہتا تھا۔

چار حج قافلے: ہر سال چار قافلے مکے آتے ہیں جن میں لوگوں کی تعداد کا شمار نہیں ہو سکتا۔ پہلا قافلہ مغرب قافلہ ہوتا ہے جو مغرب سے آتا ہے، ترکی کے سلطان کی طرف سے اور مراکش کے ملک کی طرف سے۔ یہ لوگ خشکی کے راستے سفر کرتے ہیں اور مصر کو جا چھوتے ہیں۔ وہاں سے یہ خورد و نوش کا وہ سامان لیتے ہیں جو مکہ کے لیے کافی اور واپس مصر پہنچنے تک پورا ہو جائے۔

دوسرا قافلہ قاہرہ کبیر، مصر سے جاتا ہے، اس کے ساتھ کئی قافلے آ ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ مسلح محافظ ہوتے ہیں اس لیے اس کے تحفظ میں یہ لوگ زیادہ حفاظت کے ساتھ سفر کر سکتے ہیں۔ یہ قافلہ زیادہ خوبصورت ہوتا ہے کیونکہ نظم وضبط کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے اور ہر کوئی اپنے مقام سے واقف ہوتا ہے۔ حفظ مراتب یا ترتیب کا ان میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اسی قافلے کے ساتھ غلاف کعبہ بھیجا جاتا ہے جس کا ذکر میں اپنے اپنے مقام پر کروں گا۔

تیسرا قافلہ شامی قافلہ کہلاتا ہے جو ملک شام سے آتا ہے۔ اس کے ساتھ تاتاری ہوتے ہیں اور قرب وجوار کے دوسرے لوگ بھی۔ اس کے علاوہ ترکی، اناطولیہ اور سرزمین کنعان کے حجاج بھی اس قافلے کے ساتھ سفر کرتے ہیں جو مصر کو چھوئے بغیر گزرتے ہیں۔

چوتھا ہندی قافلہ کہلاتا ہے جو جزائر شرق الہند سے آتا ہے۔ اس کے پاس بڑی قیمتی اور منتخب چیزیں ہوتی ہیں، جنہیں یہ ان تمام لوگوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں جو عازم مکہ ہو چکے ہوں۔

یہ چاروں قافلے بیک وقت مکے میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کی وہاں آمد میں تین چار یوم سے زیادہ کا فرق نہیں ہوتا جو عموماً عید قربان سے چھ سات روز پہلے کا زمانہ ہوتا ہے۔

الجیریا: جب کبھی کوئی بحری جہاز اسکندریہ کے لیے روانہ ہونے والا ہوتا ہے تو الجیریا شہر میں، جہاں میں رہتا تھا، یہ اعلان کرادیا جاتا ہے کہ جہاز فلاں روز سفر پر روانہ ہوگا پھر ہر وہ شخص جو اُس سال کے جانے کا ارادہ رکھتا ہو اس موقعہ سے خوشی خوشی فائدہ اٹھاتا ہے کیونکہ بحری سفر میں خشکی کے راستے کی نسبت انہیں تکلیف بھی کم ہوتی ہے اور اخراجات بھی کم ہوتے ہیں۔

وہ ترک جو کمانڈر یا حاکم وقت کی ملازمت میں ہوتے ہیں ان کی اجازت کے بغیر حج پر نہیں جا سکتے۔ اگر کسی کو اس سفر میں سال سے زیادہ عرصہ لگ جائے تو واپسی پر ایک سال کی تنخواہ سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔

اس سال میں الجیریا سے مکے گیا۔ ہم تیس سے چالیس روز کے اندر اندر اسکندریہ پہنچے تھے۔ اسے اچھا سفر تصور کیا جاتا ہے۔ اس سفر کے دوران ہمیں ایک صبح ایک چھوٹا سا جہاز نظر آیا تو ہم نے رات تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ ہم نے فرانسیسی پرچم لہرائے تو جواباً اس جہاز نے بھی یہی پرچم لہرا دیئے تھے مگر وہ ہماری پہنچ سے دور نکلنے کی مسلسل کوشش میں رہا جس کی وجہ سے ہم نے بھی اس کا تعاقب جاری رکھا۔ بالآخر ہم اس کے

قریب پہنچ گئے تھے۔اس پر ہمیں تمام افراد ترک اور مور ملے تھے، جو ایک فرانسیسی بحری جہاز پر سفر کر رہے تھے وہ انہیں مالٹا سے لیگارن بیچنے کے لیے لے جا رہے تھے۔انہوں نے ہمیں بتایا کہ اسی صبح جب ان کا جہاز ایک بندرگاہ پر لنگر انداز تھا اور فرانسیسی عملے کے زیادہ افراد جب کشتی میں بیٹھ کر ساحل پر چلے گئے اور جہاز پر دو افراد ایک لڑکے سمیت رہ گئے تو غلاموں نے ان دونوں فرانسیسیوں کو قتل کر کے اس جہاز پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہماری طرف سے فرانسیسی پرچم لہرانے پر وہ پہلے تو بہت خوفزدہ ہوئے مگر جب انہیں پتہ چلا کہ ہم ترک ہیں تو وہ جس قدر خوفزدہ ہوئے تھے اسی قدر خوش بھی ہو گئے تھے۔ان میں سے کچھ مرد، عورتیں اور بچے ہمارے جہاز میں آ گئے اور انہیں پوری ترغیب دی گئی تھی کہ وہ دوبارہ فرانسیسی جہاز میں لوٹ جائیں۔ وہ سیدھے تیونس کی طرف روانہ ہو گئے تھے جہاں ہماری اطلاع کے مطابق وہ بخیر و عافیت پہنچ گئے تھے۔ہم نے اسکندریہ میں بیس روز قیام کیا تھا۔

بحیرۂ احمر کا سفر: اس سمندر میں ہم تقریباً ایک ماہ سفر کرتے رہے۔سوئز سے اپنے سفر پر روانہ ہونے کے بیس روز بعد ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے تھے جہاں ایک ایسے بزرگ کا مدفن تھا۔جنہیں اس دار فانی سے رخصت ہوئے کئی سو سال گزر گئے تھے۔ جب ہم یہاں پہنچے تو عملے کے ایک شخص نے باقی اشخاص کی اجازت سے ایک چھوٹا سا جہاز بنایا تھا جس کی لمبائی تقریباً دو فٹ تھی۔پھر وہ ہر ایک حاجی کے پاس گیا اور ان سے اس بزرگ کے نام پر کچھ رقم بطور نذرانہ طلب کی۔ سب نے بڑی فیاضی سے اس مقصد کے لیے نذرانہ پیش کیا۔اب انہوں نے کچھ موم بتیاں اور تیل کی ایک چھوٹی سی بوتل لے کر جہاز کے اندر رکھ لی تھی۔ وہ رقم بھی ان کے پاس تھی جو تھوڑی دیر پہلے جمع ہوئی تھی۔ (میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس رقم میں سے کچھ حصہ انہوں نے اپنی جیبوں میں ڈال لیا تھا) اب انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اس بزرگ کے وسیلے سے اپنے سفر کی عافیت کے ساتھ تکمیل کے لیے دعا مانگی اور جہاز کو سمندر میں سفر جاری رکھنے کی جانب دھکیل دیا گیا تھا۔انہیں بخیر و خوبی اپنی منزل پر پہنچنے کا اب یقین کامل ہو گیا تھا۔ کس قدر ضعیف الاعتقاد تھے یہ لوگ! یہ بزرگ ان کے خیال میں چونکہ مکے جاتے ہوئے راستے میں انتقال فرما گئے تھے اس لیے ان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انہیں ایسے بزرگوں پر اس قدر زائد ھا یقین ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر کے فرار ہو جائے اور ان مزارات میں سے کسی میں آ کر چھپ جائے تو اسے اتنا ہی محفوظ سمجھا جاتا ہے جتنا وہ کسی کانوینٹ میں محفوظ ہو کیونکہ کسی میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ اسے وہاں سے پکڑ لے۔

مزید کچھ روز گزرنے کے بعد ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے تھے جس کا نام رابغ تھا یہ مکہ سے اس جانب چار روز کے بحری سفر کے فاصلے پر تھا جہاں تمام حاجی (عورتیں نہیں) احرام باندھ لیتے ہیں۔ یہ دو ان سلی چادروں پر مشتمل ہوتا ہے ایک چادر اس طرح باندھ لی جاتی ہے کہ یہ ٹخنوں تک پہنچ جائے دوسری سے یہ لوگ جسم کا اوپر والا حصہ سوائے سر کے ڈھانپ لیتے ہیں۔ ان کے جسموں پر اور کوئی کپڑا نہیں ہوتا ان کے پاؤں میں سینڈل ہوتے ہیں۔ ان سے ان کے پاؤں کا پنجہ ڈھک جاتا ہے جبکہ پاؤں کی پشت کھلی رہتی ہے۔ احرام باندھے ہوئے یہ حجاج رابغ سے مکہ مکرمہ پہنچتے ہیں۔ ان کے جسم کا وہ حصہ جو چلچلاتی دھوپ میں ڈھانپا ہوا نہیں ہوتا وہ سورج کی تمازت سے جھلس جاتا ہے۔ اگر خرابی صحت کی وجہ سے وہ احرام نہ باندھ سکیں یا مزید بیمار ہو جانے کا خطرہ ہو تو دوسرے کپڑوں میں انہیں حج کرنے کی صرف اس شرط پر اجازت ہوتی ہے کہ وہ جب مکے آئیں تو بھیڑ کی قربانی دیں اور اسے غرباء میں تقسیم کر دیں۔ سات روز تک اس احرام کی موجودگی میں انہیں نہ ناخن کاٹنے نہ کسی جوں یا پسو تک کو مارنے کی اجازت ہوتی ہے حالانکہ وہ ان کا خون چوس رہے ہوتے ہیں۔ البتہ اگر یہ زیادہ پریشان کریں تو صرف جسم پر ان کی جگہ بدل دیں، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہوتی۔

حج کے دنوں میں اپنے جذبات اور غصہ واشتعال پر قابو پانے کا حکم ہوتا ہے۔ زبانوں پر کنٹرول کرنا ہوتا ہے اور عجز وانکساری اور عقیدت کا بھرپور اظہار ضروری ہوتا ہے۔ دشمن تک کو معاف کرنے، درگزر سے کام لینے اور امن وامان سے یہ وقت گزارنے کی پابندی پر سختی سے عمل کرنا ہوتا ہے۔ کسی کے لیے بھی دل میں کینہ رکھنا گناہ تصور ہوتا ہے۔ اس دوران شیو کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

اس کے بعد ہم جدہ آتے ہیں جو مکے کی قریب ترین بندرگاہ ہے۔ یہ مکہ سے ایک روز سے کم کے سفر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں بحری جہازوں سے سامان اتارا جاتا ہے۔ یہاں ہماری ملاقات اس معلم، گائیڈ یا رہنما سے ہوتی ہے جو مکے سے اس مقصد کے لیے یہاں آتا ہے تاکہ حجاج کو مذہبی رسوم کی ادائیگی میں مدد دے سکے (اس لیے کہ حجاج کی اکثریت اس بارے میں بالکل کوری ہوتی ہے)۔ ان میں سے زیادہ رسوم وہ ہیں جو انہیں خانہ کعبہ میں ادا کرنی ہوتی ہیں۔ اسے بیت اللہ بھی کہا جاتا ہے یعنی اللہ کا گھر۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اسے ابراہیمؑ نے تعمیر کرایا تھا۔

مکہ میں آمد: ہم جونہی مکہ پہنچے ہمارا گائیڈ ہمیں اس شاہراہ پر لے آیا تھا جو شہر کے بالکل وسط

میں ہے اور معبد جس کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جب اونٹوں پر سے سامان اتار لیا گیا تو وہ ہمیں سب سے پہلے وضو کے لیے لے گیا۔ پھر ہم اپنے جوتے اتار کر باب السلام یعنی امن و سلامتی کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ چند قدم چلنے کے بعد ہمارے گائیڈ یا معلّم نے رک کر اپنے ہاتھ بیت اللہ کی جانب کھڑے کیے۔ تمام حاجیوں نے اس کی نقل کرتے ہوئے ہاتھ بلند کیے۔ وہ جو کہتا جاتا تھا یہ اس کے پیچھے پیچھے دہراتے جاتے تھے۔ بیت اللہ پر پہلی نظر پڑتے ہی حجاج کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آتا ہے۔ ہمارا گائیڈ اب ہمیں بیت اللہ کے قریب لے جاتا ہے ہم اب بھی گائیڈ کے پیچھے پیچھے اس کے الفاظ دہرا رہے تھے۔ ہم نے خانہ کعبہ کے گرد سات مرتبہ طواف کیا۔ پھر دو رکعتیں ادا کیں۔ اس کے بعد ہمیں دوبارہ باہر گلی میں لایا گیا۔ یہاں ہم نے ایک جگہ دوڑ کر تو دوسری جگہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے گائیڈ کے ساتھ گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سعی کی۔ یہ صفا و مروہ کے پہاڑوں کے درمیان ادا کی گئی مذہبی رسم تھی۔ دونوں کے درمیان ایک تیر کی پہنچ کا فاصلہ تھا۔ یہاں میں ان غریب انسانوں کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا جو اس قدر عقیدت اور محبت کے ساتھ یہ ساری رسمیں ادا کر رہے تھے۔ یہ خوف سے کانپ رہے تھے۔ ان کے اس جذبۂ ایمانی کو دیکھ کر میں اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر ہم اس جگہ پہنچے جہاں ہم نے اپنے اونٹوں پر سے سامان اتارا تھا۔ اب ہمیں اپنے ٹھہرنے کے لیے جگہ کی تلاش تھی۔ ایک ایسی جگہ جہاں جب ہم اپنا احرام اتار دیں تو ایک بار پھر اپنے عام لباس کو زیب تن کر سکیں۔

تمام حجاج کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ جب تک مکے میں ہیں۔ یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ اپنے وقت کا بہترین مصرف سامنے رکھیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت طواف کرنے میں گزاریں۔ بیت اللہ کے ایک کونے میں ایک سیاہ پتھر نصب ہے یہ چاندی کی پلیٹ میں مڑھا ہوا ہے۔ حجاج ہر بار جب اس کونے میں پہنچتے ہیں تو حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں۔ سات بار طواف مکمل کرنے کے بعد ہر حاجی دو رکعتیں ادا کرتا ہے۔ دن ہو کہ رات بیت اللہ کے گرد طواف جاری رہتا ہے اور کسی وقت بھی نہ رکتا ہے نہ حجاج سے خالی ہوتا ہے۔ بہت سے حجاج کو ہفتوں بلکہ بعض اوقات مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے کہ انہیں بھی یہ موقعہ نصیب ہو ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کسی شخص کو یہ موقعہ مل جائے وہ طواف کعبہ کے وقت اپنے خدا سے جو دعا بھی مانگے گا اس کا جواب اسے ضرور دیا جائے گا۔ بہت سے حجاج تو اس وقت تک طواف کرتے رہتے ہیں جب تک وہ تھک کر چُور نہ ہو جائیں۔ پھر تھوڑی سی دیر کے لیے آرام کر لینے اور ستا لینے کے بعد دوبارہ طواف کرنے لگتے ہیں۔ انہیں یہ یاد رہتا ہے

کہ سات چکر پورے ہو چکے ہیں کیونکہ اس کے بعد ان کو دو رکعتیں ادا کرنی ہوتی ہیں۔

شہر مکہ اور معبد: اَب میں آپ کو شہر مکہ اور اس کے وسط میں واقع معبد کے بارے میں تفصیلات فراہم کروں گا۔

پہلے ذکر ہو جائے مکے کا۔ یہ شہر ایک بنجر زمین پر آباد ہے (بحیرۂ احمر سے اس تک ایک دن کے سفر کا فاصلہ ہے) یہ ایک وادی میں واقع ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ بہت سی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ اس شہر کے اندر کوئی فوج نہیں ہے۔ شہر کے گرد نہ فصیل ہے نہ دروازے۔ اس کی عمارات، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، عام سی ہیں اگر ہر سال اتنی تعداد میں حجاج نہ آتے تو یہاں کوئی تفریح کا مقام نہ تھا۔ اس شہر کا سارا انحصار ان حجاج پر ہے ورنہ بہت کم ایسی دُکانیں ہوں گی جو سال بھر کھلی رہتی ہیں۔

یہاں بسنے والے لوگ غریب، بہت دُبلے پتلے اور سانولے رنگ کے ہیں۔ میلوں تک یہ شہر ہزاروں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے جو ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا ملائے کھڑی ہیں۔ جو پہاڑیاں مکے کے قریب تھیں میں ان کی چوٹیوں پر جا کر حد نظر تک دیکھا کرتا تھا مگر اس کے باوجود مجھے سب سے آخر والی پہاڑیاں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ یہ سب پتھریلی چٹانوں کی بنی ہوئی ہیں۔ ان کا رنگ سیاہ ہے اور دُور سے سوکھی گھاس کے مخروطی ڈھیروں کی طرح نظر آتی ہیں۔ سب کا رُخ مکہ کی طرف ہے۔ ان میں سے چند ایک کا قطر نصف میل ہے تاہم تمام کی تمام تقریباً ایک ہی جتنی بلند و بالا ہیں۔

ان میں سے ایک کی چوٹی پر ایک غار بھی ہے (جسے برٹن کے بیان کے مطابق اب جبل نور کہتے ہیں) جسے یہ لوگ غار حرا کہتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عموماً اس کے اندر بیٹھ کر اپنے اللہ کا ذکر کرتے اور روزہ رکھا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی جگہ آپؐ پر قرآن نازل ہونا شروع ہوا تھا اور پہلی وحی فرشتہ جبریل لے کر آیا تھا۔ میں بھی اس غار میں گیا ہوں اور میں نے دیکھا کہ اسے مصنوعی طور پر خوبصورت بنانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی، جو مجھے بہت اچھا لگا اور میں نے اس کی تعریف کی۔

مکہ سے تقریباً نصف میل دور ایک ڈھلوان پہاڑی ہے جس کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے سیڑھیاں بنا دی گئی ہیں۔ یہ ایک پیالے کی شکل میں ہے جس کے نیچے ایک ٹکڑوں میں بٹی ہوئی چٹان ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چار سال کی عمر میں یہاں آیا کرتے تھے کہ ایک روز جبریلؑ آئے اور آپؐ کا سینہ

کھولا، دل باہر نکالا، اس میں سے چند سیاہی مائل خون کے دھبے نکالے اور اسے پھر ان کے سینے میں اپنی جگہ رکھ کر سینہ سی دیا تھا۔ اس آپریشن نما عمل میں حضورؐ کو کسی قسم کا کوئی درد یا تکلیف محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں اس جگہ بھی گیا تھا۔ میرے ساتھی بھی گئے تھے جہاں انہوں نے کچھ رکعتیں ادا کی تھیں۔

جہاں تک مکہ کا تعلق ہے یہاں کھانے پینے کی چیزیں بالکل نئی ملتی ہیں یا بہت کم دستیاب ہیں۔ گرمی اس قدر ہوتی ہے کہ لوگ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے گلی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سایے میں پہنچنے کے لیے دوڑ کر جاتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والے بالخصوص مرد گھروں کی چھتوں پر کھلی ہوا میں آسمان تلے یا دروازوں کے سامنے گلیوں میں سوتے ہیں۔ کچھ اپنے بستر زمین پر بچھائی ہوئی پتلی چٹائی پر ڈال کر سو جاتے ہیں۔ کچھ کے پاس ہلکی پھلکی چارپائیاں ہوتی ہیں جن پر بستر بچھائے جاتے ہیں۔ گلی میں سونے سے قبل یہ اسے جھاڑو دے کر صاف کر کے پانی چھڑک لیتے ہیں۔ میں زیادہ تر چھت پر بغیر بستر کے سویا کرتا تھا۔ میں لنن کا کپڑا بھگو کر اسے رات کو اوڑھ لیتا تھا۔ میری رات کو جتنی بار آنکھ کھلتی یہ خشک ہو گیا ہوتا تھا میں اسے ہر بار گیلا کر لیا کرتا تھا۔ رات کو مجھے ایسا دو تین بار کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔

اب میں آپ کو مکہ کے معبد کی کچھ تفصیلات بتاتا ہوں۔ اس کے اندر داخل ہونے کے لیے اس کے 42 دروازے ہیں۔ ان سب کے استعمال کی ضرورت کم ہی پیش آتی ہے اور ان میں سے کئی تو بند ہوتے ہیں۔ اس کی عمارت کی شکل لندن کے رائل ایکسچینج سے بہت ملتی جلتی ہے مگر یہ اس سے دس گنا بڑی ہے۔ یہ تمام کھلی ہوئی اور درمیان میں پتھر کی بنی ہوئی ہے سوائے چند راستوں کے جو مختلف دروازوں میں سے آتے ہوئے بیت اللہ تک چلے گئے ہیں۔ ان پر بھی چوڑے چوڑے پتھر لگے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے یا کوٹھڑیاں ہیں۔ جن میں وہ لوگ رہتے ہیں جو مطالعہ میں یا عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کا حلیہ درویشوں جیسا ہوتا ہے۔ یہ وہ درویش ہوتے ہیں جو زیادہ تر زاہدانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ملک کے اندر سفر کرتے رہتے ہیں اور دوسروں کے صدقہ و خیرات پر گزارہ کرتے ہیں۔ ان کے جسم پر ایک سفید اونی چونہ اور سر پر لمبی سفید اونی ٹوپی ہوتی ہے (ایسی ٹوپیاں کسی زمانے میں رُومی کلیسا کے پادری پہنتے تھے) ان کی کمر پر بھیڑ یا بکری کی کھال لٹک رہی ہوتی ہے اور ان کے ہاتھ میں ایک لمبا ڈنڈا ہوتا ہے۔ پڑھتے وقت وہ عموماً یوں بیٹھ جاتے ہیں کہ ان کے گھٹنے زمین سے اوپر ہوں۔ ان کی تسبیح ان کے بازوؤں میں یا گردنوں میں لٹکتی رہتی ہے جبکہ دیگر لوگ اپنی تسبیح جیب میں رکھتے ہیں۔ بہت سے ترک اپنی اصلاح کے بعد درویشانہ زندگی

گزارنے لگتے ہیں۔مثال کے طور پر میرے دوسرے مالک کا چھوٹا بھائی جس نے بڑی عیاشانہ زندگی گزاری تھی مگر پھر اس میں اچانک ایک بہت بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔اس نے ڈاڑھی رکھ لی تھی،سر پر وہ سبز پگڑی اوڑھتا تھا(جو صرف وہی لوگ پہنتے ہیں جنہیں یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل سے ہیں)اس نے پڑھائی کی طرف توجہ دی اور جلد ہی وہ بڑی روانی سے پڑھ لیتا تھا۔اب اس کا زیادہ وقت مطالعہ میں گزرتا تھا۔اس کے چند پرانے ساتھی،جو اس کے عیاشی کے ایام کے لنگوٹیے تھے،اب اس پر ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔وہ اپنی دھن کا اب پکا نکلا اور اپنی نئی ڈگر پر ثابت قدمی سے چلتا رہا۔

بیت اللہ مسجد الحرام کے بالکل وسط میں ہے۔یہ ایک چوکور چھوٹی سی عمارت ہے اس کا ہر کونا تقریباً 24 قدم ہے اور اس کی اونچائی بھی تقریباً 24 قدم ہی ہے۔یہ پتھر کی بنی ہوئی بہت صاف وشفاف عمارت ہے جس پر کچھ بھی کندہ نہیں ہے۔یہ اوپر سے نیچے تک ایک ریشمی غلاف میں لپٹی ہوئی ہے۔درمیان سے ذرا اوپر یہ غلاف طلائی حروف سے کڑھا ہوا ہے۔کیا لکھا ہوا تھا یہ مجھے اب یاد نہیں آ رہا۔غالباً یہ کوئی مقدس الفاظ تھے۔ہر حرف دو فٹ لمبا اور دو انچ چوڑا تھا۔بیت اللہ کے نچلے حصے میں پیتل کے چھلے بندھے ہوئے ہیں جن کے اندر سے ایک بڑی سی رسی گزرتی ہے جس کے ساتھ غلاف کا نچلا حصہ بندھا ہوا ہے۔

بیت اللہ کا دروازہ اتنا اونچا ہے کہ وہاں تک انسان نہیں پہنچ سکتا۔جب کبھی کسی کو اندر جانا ہوتا ہے سیڑھی لگا دی جاتی ہے۔دروازے پر چاندی کا کام کیا گیا ہے جس کے اوپر ایک غلاف لٹک رہا ہے جو زمین کو چھو رہا ہے۔اسے ہفتہ بھر سوائے جمعرات کی رات اور جمعہ کے اوپر اٹھا دیتے ہیں۔مذکورہ دروازے کا غلاف بہت بھاری ہوتا ہے کیونکہ اس پر سونے سے کشیدہ کاری کی گئی ہوتی ہے۔کعبہ کی عمارت کی چھت چپٹی ہے جس پر چونے اور ریت کی تہ لگا دی گئی ہے۔بارش جب برستی ہے تو اس کا پانی ایک پرنالے کے ذریعے کعبے کی چھت پر سے نیچے آ جاتا ہے۔اس وقت حجاج دوڑ کر بارش کے اس پانی سے اپنے آپ کو بھگو لینے کی کوشش کرتے ہیں۔سبھی کی کوشش ہوتی ہے کہ پرنالے کے نیچے رہیں۔اس کا ایک ایک قطرہ بڑا متبرک تصور کیا جاتا ہے۔اگر وہ کسی طرح اس پانی کے چند گھونٹ پینے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ ان کے لیے انتہائی خوشی اور سعادت کی بات ہوتی ہے۔بہت سے غریب تو یہ پانی حاصل کر کے حاجیوں کو پیش کرتے ہیں اور معقول پیسے کماتے ہیں۔

بیت اللہ کا دروازہ چھ ہفتوں میں دو دن کے لیے کھلتا ہے،ایک روز مردوں کے لیے اور ایک روز

مردوں کے لیے۔ میں مکے میں اپنے چار ماہ کے قیام کے دوران دو بار اس دروازے سے کعبے کے اندر گیا تھا۔ یہ موقعہ خوش قسمتی سے کم حاجیوں کو ہی ملتا ہے۔ وہ لوگ جو خشکی کے راستے آتے ہیں ان کا مکہ میں قیام سولہ سترہ روز سے زیادہ نہیں ہوتا۔ جو بیت اللہ کے اندر جاتے ہیں وہ وہاں بہت کم وقت کے لیے رک سکتے ہیں، بمشکل پندرہ منٹ کے لیے اس لیے کہ دوسرے حجاج اپنی باری کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ کچھ جس وقت اندر داخل ہو رہے ہوتے ہیں اسی وقت کچھ باہر نکل رہے ہوتے ہیں۔ جب یہ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے تو مکے کا سلطان جو خاندان شریف سے تعلق رکھتا ہے، خود چند پسندیدہ افراد کے ساتھ مل کر بیت اللہ کو غسل دیتا ہے۔

پہلے اسے زم زم کے مقدس پانی سے دھویا جاتا ہے اور اس کے بعد میٹھے پانی سے۔ وہ سیڑھی جس کے ذریعے بیت اللہ کے اندر داخل ہونا تھا۔ اسے وہاں سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ لوگ دروازے پر جمع ہو جاتے ہیں تاکہ جس پانی سے بیت اللہ کو غسل دیا جا رہا تھا۔ اس کے چھینٹے ان کے جسموں کو بھی چھو لیں۔ جن جھاڑوؤں سے بیت اللہ کو صاف کیا جاتا ہے۔ ان کے تنکے لوگوں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں جس کسی کے ہاتھ کوئی چھوٹا سا تنکا بھی لگ جاتا ہے وہ اسے تبرک کے طور پر سنبھال کر رکھ لیتا ہے۔

بیت اللہ کا غلاف ہر سال قاہرہ کبیر میں سلطان اعظم کے حکم سے تیار کیا جاتا ہے اور جب ہر سال حجاج یہاں سے مکے جاتے ہیں تو نیا غلاف کعبہ دو اونٹوں پر لاد کر مکے لے جاتے ہیں۔ ان دو اونٹوں سے سال کے دوران کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ مصر سے روانگی کے وقت غلاف کعبہ کو ایک خاص جشن کی صورت میں بھیجا جاتا ہے اور مکے میں اس کے پہنچنے پر خوشی و مسرت کا حیرت انگیز مظاہرہ ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ تو خوشی سے رو رہے ہوتے ہیں کچھ ان اونٹوں کو چومتے ہیں جن پر غلاف کعبہ لدا ہوا ہوتا ہے۔ یہ کوشش کرتے ہیں کہ غلاف تک ان کے ہاتھ پہنچ سکیں تو یہ اسے چھونے کی سعادت بھی حاصل کر لیں۔ غلاف کعبہ کے لیے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار بڑی جذباتیت سے کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ابھی اسے خانہ کعبہ پر چڑھایا بھی نہیں گیا ہوتا۔ آپ خود اندازہ لگا لیں کہ ان لوگوں کو بیت اللہ سے کس قدر محبت ہے۔ اب میں آپ کو مکے کے معبد کے بارے میں مزید کچھ بتانا چاہوں گا۔ میں ان باتوں کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا جنہیں کچھ لوگوں نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

بیت اللہ کے گرد جہاں حجاج طواف کرتے ہیں وہاں کا فرش سنگ مرمر کا ہے جس کی چوڑائی تقریباً 50 فٹ ہے اور اس سنگ مرمری راہ گزر کے گرد پیتل کے ستون کھڑے ہیں جن کی اونچائی پندرہ فٹ اور ایک دوسرے سے فاصلہ بیس فٹ ہے۔ اس کے مرکزی حصے میں لوہے کی سلاخیں نصب ہیں جن میں ہر ایک کے ساتھ شیشے

کے چراغ لٹک رہے ہیں۔ دن کی نسبت رات کو یہاں زیادہ حجاج موجود رہ کر عبادت میں معروف رہتے ہیں۔ ان چراغوں میں تیل جلتا ہے۔ ہر روز انہیں صاف کر کے ان میں تیل، پانی اور روئی کی بتی رکھی جاتی ہے جو اس وقت تک جلتی رہتی ہے جب تک تیل ختم نہیں ہو جاتا۔

حج کا جلوس: عید قربان یا عید الاضحیٰ، ماہ رمضان کے روزوں کے دو ماہ اور دس دن کے بعد آتی ہے۔ ان دو مہینوں کے بعد آٹھویں روز یہ لوگ احرام باندھ لیتے ہیں اور اس حالت میں عرفات کے پہاڑ پر پہنچ جاتے ہیں اسے کوہ علم (یا کوہ بخشش) بھی کہا جاتا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ بنی نوع انسان کے جدِ امجد حضرت آدمؑ اور اماں حوا جنت سے نکالے جانے کے بعد اسی جگہ پہلی بار ایک دوسرے سے ملے تھے۔

کیا خوبصورت منظر تھا۔ ہزاروں حجاج عجز و انکساری کے ساتھ برہنہ سر، رخساروں پر آنسوؤں کے موتی سجائے، روتے، سسکیاں لیتے اپنے گناہوں، اپنی غلطیوں کی معافی اور بخشش کے لیے گڑگڑاتے جا رہے تھے اور اپنے خدا سے آئندہ نیکی کی زندگی گزارنے کا عہد بھی کرتے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ نمازِ مغرب تک جاری رہتا تھا جو غروبِ آفتاب کے بعد ادا کی جاتی ہے۔

اس پہاڑ پر اس مذہبی رسم کی ادائیگی کے بعد ان لوگوں میں سے ہر ایک کو امام کی طرف سے ''حاجی'' کا خطاب مل جاتا ہے جو عمر بھر ان کے نام ساتھ موجود رہتا ہے۔ اس خطاب کے مل جانے کے فوراً بعد یہ لوگ عرفات سے واپس مکہ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ راستے میں دو تین میل کے بعد یہ لوگ ایک جگہ رات گزارنے کے لیے ٹھہر جاتے ہیں۔ نمازِ عشاء کے بعد اور سونے سے قبل ان میں سے ہر شخص 49 چھوٹی چھوٹی کنکریاں جمع کرتا ہے جو بادام کی گری کے برابر ہوتی ہیں۔

اگلی صبح حجاج منیٰ پہنچ جاتے ہیں۔ وہ یہاں ایک وسیع میدان میں اپنے خیمے نصب کر دیتے ہیں۔ عید الاضحیٰ کے تین دن وہ یہیں قیام کرتے ہیں۔ خیمے نصب ہو جائیں اور ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ رکھ دی جائے تو پھر ہر حاجی پہلے روز سات کنکریاں ایک چھوٹے سے ستون یا چھوٹی سی پتھر کی بنی ہوئی چوکور عمارت کو مارتے ہیں۔ ان کا یہ عمل اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ انہوں نے ایسا شیطان کے وار سے اپنی مدافعت اور حفاظت کے لیے کیا ہے۔ ایسا کرتے وقت یہ درج ذیل الفاظ بھی ادا کرتے ہیں: ''ارجم الشیطان وحزبہ'' یعنی شیطان کو اور جو اس کے ساتھی ہیں انہیں پتھر مارو۔ ایسے ہی دو اور ستون بھی وہاں موجود ہیں جو ایک دوسرے کے بالکل قریب کھڑے ہیں۔ دوسرے روز حجاج انہیں سات سات کنکریاں مارتے ہیں۔ برٹن لکھتا ہے کہ

یہ ستون اس مقام کو ظاہر کرتے ہیں جہاں شیطان ایک معمر شخص کی صورت بنا کر آدمؑ، ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے سامنے آیا تھا اور اس ملعون کو بھگانے کے لیے کنکریاں مارنے کی ترکیب انہیں جبریل علیہ السلام نے بتائی تھی۔ میں جس وقت کنکریاں مارنے کی رسم ادا کرنے جا رہا تھا اس وقت مجھے ایک بذلہ سنج حاجی ملے اور فرمایا: "اگر تم چاہو تو اس وقت کی دقت سے بچ سکتے ہو کیونکہ میں تو پہلے ہی شیطان کی آنکھیں پھوڑ آیا ہوں۔"

پہلے روز شیطان کو سات کنکریاں مارنے کے بعد وہ لوگ جو اپنے ساتھ بھیڑیں ریوڑوں کی شکل میں برائے فروخت لائے ہوئے تھے ان میں سے ہر حاجی ایک بھیڑ خرید کر اس کی قربانی دیتا ہے۔ کچھ حجاج تو قربانی کے بعد ان کا گوشت دوستوں کو دے دیتے ہیں کچھ ان غریبوں میں بانٹ دیتے ہیں جو مکہ سے اور گرد و نواح کے علاقوں سے باہر آ جاتے ہیں اور جو باقی بچ جاتا ہے وہ خود کھا لیتے ہیں۔ اب یہ لوگ اپنے سر منڈواتے، احرام کھولتے اور دوسرے کپڑے پہن کر ایک دوسرے کو بوسہ دیتے اور عید مبارک کہتے ہیں۔

عید کے تین روز خوشی خوشی گزارے جاتے ہیں۔ رات کو روشنیوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ بندوقوں سے فائر کیے جاتے ہیں، آتش بازی سے فضا میں روشنی ہو جاتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ان کے تمام گناہ بخش دیے گئے ہیں اور اگر ان کا اسی وقت انتقال ہو گیا تو وہ سیدھے جنت میں جائیں گے۔ اگر وہ مستقبل میں بے دین نہ ہو گئے، انہوں نے خدا سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا اور نیک عمل کرتے رہے تو خدا انہیں ایک کے بدلے میں دس نیکیاں عطا کرے گا۔ اسی طرح ان کے ایک بُرے عمل کے دس بن جائیں گے۔ حج کی ادائیگی کے بعد جو شخص پھر سے بداعمالیوں میں پھنس جاتا ہے اسے لوگ بری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حج سے واپسی کے بعد کچھ حجاج ایسے بھی ہوتے ہیں جو سرخ تپتی ہوئی اینٹوں پر چلتے ہیں تا کہ ان کی بینائی جاتی رہے اور بیت اللہ کی زیارت کے بعد اب وہ کسی بری شے پر نظر ڈالنے کے قابل ہی نہ رہ جائیں۔ مگر یہ میں نے سنا ضرور تھا دیکھا کبھی نہ تھا نہ ایسا کوئی شخص کبھی مجھ سے ملا۔

منیٰ میں اپنے تین روزہ قیام کے دوران شاید ہی کوئی ایسا حاجی ہو گا، سوائے اس کے جو بہت کمزور، ضعیف اور بیمار ہو، جو ہر روز کم از کم دن میں ایک بار مکے جا کر بیت اللہ میں حاضری نہ دیتا ہو۔ ان کے دلوں میں ہر وقت یہ آرزو مچلتی رہتی ہے کہ وہ کب مکے جا کر ایک بار پھر زیارت بیت اللہ سے سرفراز ہوں۔ وہ وہاں

پہنچ کر طواف کرتے چند رکعتیں ادا کرتے اور پھر منیٰ واپس آ جاتے ہیں۔ عید الاضحیٰ کے تین روز گزر جانے کے بعد یہ لوگ اپنے خیمے وغیرہ اکھاڑ کر واپس مکہ پہنچ جاتے ہیں۔

مکہ واپسی کے بعد انہیں ایک مخصوص مدت تک ہی یہاں قیام کرنا ہوتا ہے اس سے زیادہ عرصے کے لیے یہ یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ یہ عرصہ دس بارہ یوم پر مشتمل ہوتا ہے جس میں یہاں ایک میلہ لگتا ہے۔ اس میں مشرقی ہندوستان کا سامان، قیمتی پتھر اور انگوٹھیوں کے نگینے، کنگن اور چوڑیاں بکتی ہیں جو یمن سے آتی ہیں۔ چین کے برتن اور خوشبویات کی بھی بڑی مانگ ہوتی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب حجاج کو خریداری کرنی ہوتی ہے کیونکہ جب تک وہ حج ادا کر کے حاجی کا خطاب حاصل نہ کر لیں، درمیان میں خرید و فروخت اچھی نہیں لگتی۔ ہر حاجی یہاں سے اپنے کفن کا کپڑا بھی ساتھ لے کر جاتا ہے جس میں اسے انتقال پر دفن کیا جاتا ہے۔ یہ کفن الجیریا، یا کسی اور ملک میں بھی نسبتاً سستا خریدا جا سکتا تھا مگر وہ اسے یہاں سے خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے آبِ زم زم میں بھگو کر لے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ یہ کفن خرید لیا جائے تو پھر ہر سفر میں یہ لوگ اسے اپنے ساتھ رکھتے ہیں، خواہ سفر بحری ہو یا بری کیونکہ موت تو کہیں بھی کسی بھی وقت معینہ پر آ سکتی ہے۔

مکے سے روانہ ہونے سے ایک روز قبل شام کو ہر شخص بیت اللہ جاتا ہے تا کہ رخصتی کی اجازت طلب کر سکے۔ یہ باب السلام سے داخل ہوتے ہیں اور جتنی دیر طبیعت چاہے طواف کرتے رہتے ہیں۔ بہت سے حجاج تو اس وقت تک طواف جاری رکھتے ہیں جب تک تھک نہ جائیں ان الوداعی لمحوں میں آنسوؤں کا سیلاب روکنا ممکن نہیں رہتا۔ مکہ چھوڑنے اور بیت اللہ کو نظروں سے اوجھل کرنے کو دل نہیں مانتا۔ یہ لوگ آبِ زم زم سیر ہو کر پیتے ہیں، بیت اللہ کے اس دروازے کی جانب جاتے ہیں جو باب الوداع یعنی رخصتی کا دروازہ کہلاتا ہے۔ یہ دروازہ خوش آمدید کہنے والے دروازے کے بالکل سامنے ہے۔ دو رکعتیں ادا کرنے کے بعد یہ لوگ کھڑے ہو کر ہاتھ بیت اللہ کی سمت کر لیتے ہیں۔ فراق کے جذبات سے مغلوب ہو کر خدا سے عاجزانہ دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ باب الوداع سے نکلتے وقت اپنی پیٹھ بیت اللہ کی جانب نہیں ہونے دیتے کہ اسے وہ بے ادبی تصور کرتے ہیں۔ نکلتے نکلتے بار بار التجا کرتے ہیں ہاتھ کھڑے کیے رہتے ہیں، نظریں خانہ کعبہ پر گڑی رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یوں روتے روتے یہ اپنی اپنی رہائش گاہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔

قافلہ مکے سے چل پڑتا ہے: ہم نے اونٹ کرایے پر لیے اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ چالیس یوم کے سفر کے لیے جو مکے سے مصر تک کا تھا ہم نے پانچ چھ سٹرلنگ پونڈ کرایہ ادا کیا تھا جو بہت مناسب تھا۔ معاہدہ یہ طے پاتا ہے کہ اگر راستے میں اونٹ سفر کے دوران مر جائے تو ہمیں دوسرا اونٹ فراہم کر دیا جائے گا۔ مصر سے مکہ آنے والے اونٹوں کے مالکوں کے پاس بہت سے زائد اونٹ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایک رات بھی مشکل سے گزرتی ہے جب ایک اونٹ مر جاتا ہے اس طرح سفر کے دوران بہت سے اونٹ سڑکوں پر مر جاتے ہیں۔ جو اونٹ ایک بار چلتے چلتے گر جائے پھر اس کے اٹھنے کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ اگر کبھی یہ اٹھ بھی جائے تو یہ امید بہت کم رہ جاتی ہے کہ اب یہ سامان اٹھانے کے قابل رہ گیا ہوگا۔ عموماً جب ایک اونٹ گر جاتا ہے تو اس کی پیٹھ پر سے وزن اتار لیا جاتا ہے۔ سامان دوسرے اونٹ پر لاد کر گرنے والے اونٹ کو گولی مار دی جاتی ہے۔ اس کا گوشت قافلے کے ہمراہ سفر کرنے والے غریب لوگ کھا لیتے ہیں۔ میں نے ایک بار اونٹ کا گوشت کھایا تھا یہ بے حد لذیذ اور غذائیت سے پُر ہوتا ہے۔

پہلے روز جب ہم مکے سے چلے تھے تو ہمیں کوئی باقاعدہ حکم نہیں ملتا تھا۔ کبھی چل پڑے تھے مگر اگلے روز ہر شخص کی کوشش تھی کہ وہ آگے بڑھے۔ ایسا کرنے میں کئی بار لوگوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ البتہ جب ایک بار قافلے میں ہر شخص کو اس کی جگہ مل گئی پھر قاہرہ کبیر تک پہنچنے میں ہر کسی نے امن سے سفر کیا تھا اور اپنی اپنی جگہ قائم رکھی تھی۔ گویا ایک ایسا نظم و ضبط، ایک ڈسپلن قائم ہو گیا تھا جو منزل تک پہنچنے تک برقرار رہا۔ چار اونٹ آگے پیچھے سفر کرتے ہیں جنہیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے جس طرح کہ کسی ٹیم میں کیا جاتا ہے۔ پورا اجتماع جس میں انسان اور جانور دونوں شامل ہوتے ہیں قافلہ کہلاتا ہے۔ یہ بہت سی قطاروں یا کمپنیوں میں منقسم ہوتا ہے۔ ہر ایک کا اپنا ایک نام ہوتا ہے جس میں کئی ہزار اونٹ ہوتے ہیں۔ چلتے وقت ایک قطار کے پیچھے دوسری قطار ہوتی ہے، ہر دستہ دوسرے سے ممیز اور منفرد۔ ہر قطار کے آگے آگے ایک افسر ہوتا ہے جو گھوڑے کی زین قسم کی کسی شے میں اٹھا لیا جاتا ہے جسے دو اونٹ اٹھا کر چلتے ہیں، ایک آگے اور ایک پیچھے۔ اس پر کپڑے کا غلاف ہوتا ہے جس پر موم لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے اوپر پھر ایک چوڑا کپڑا ہوتا ہے جو بے حد خوبصورتی سے سجا کر ڈالا جاتا ہے۔

اگر اس افسر کے ہمراہ اس کی بیوی بھی ہو تو اس کے لیے ایسا ہی انتظام الگ سے کیا جاتا ہے۔ ہر قطار میں آگے آگے ایک لدا ہوا اونٹ ہوتا ہے جس پر اس افسر کا خزانہ لدا ہوا ہوتا ہے۔ اس اونٹ کے گلے میں

دو گھنٹیاں ہوتی ہیں جو ہماری مارکیٹ کی گھڑیوں کے برابر بڑی ہوتی ہیں۔ یہ دونوں ایک ایک طرف لٹک رہی ہوتی ہیں۔ ان کی آواز بہت دور سے آ جاتی ہے کچھ دوسرے اونٹوں کی گردنوں کے گرد گول گھنٹیاں تو کچھ کی ٹانگوں کے گرد گھنٹیاں بندھی ہوتی ہیں۔ یہ کم وبیش ویسی ہی گھنٹیاں ہوتی ہیں جیسی ہمارے قافلوں کے سامنے والے گھوڑوں کی گردنوں کے گرد لٹک رہی ہوتی ہیں۔ یہ اپنے نوکروں کے ساتھ رات بھر گانے گاتے سفر میں رہتے ہیں۔ ان کی آواز بڑی اچھی لگتی ہے اور یوں سفر خوشی خوشی منزل کے قریب لے آتا ہے۔ ان لوگوں کے خیال میں اس موسیقی سے اونٹ خوش ہو کر تیز چلتے ہیں۔ یوں ایک خاص نظم وضبط کے ساتھ چلتے چلتے یہ قافلہ قاہرہ کبیر پہنچ جاتا ہے۔ اگر یہ نظم وضبط نہ رہے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اتنے بڑے قافلے میں کیسی افراتفری پھیل جائے۔

رات کو سفر کے دوران روشنی کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے کیونکہ دن کے وقت سورج کی اس قدر گرمی ہوتی ہے کہ رات ہی پرسکون سفر کے لیے موزوں سمجھی جاتی ہے۔ حجاج کو اپنی صحیح سمت میں سفر کرنے میں مدد دینے کے لیے یہ روشنی لکڑیوں کے ٹکڑوں کو جلا کر پیدا کی جاتی ہے اور لمبے لمبے بانسوں کے سروں پر انہیں باندھ دیا جاتا ہے۔ لکڑی کے یہ ٹکڑے اونٹوں پر لدے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہیں بڑی بڑی بوریوں میں ڈال لیا جاتا ہے۔ ان کے اندر سوراخ ہوتا ہے جس میں سے نوکر انہیں حسب ضرورت نکال لیتے ہیں۔ ہر قطار کے پاس اس قسم کے بانس ہوتے ہیں، کسی کے پاس دس، کسی کے پاس بارہ اور ان کے سروں پر روشنی کے لیے لکڑی کے جلتے ہوئے ٹکڑے بندھے ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد اور شکل مختلف ہوتی ہے کچھ دروازے کی مانند بیضوی ہوتی ہیں۔ دوسری مثلث نما یا انگریزی کے حروف ''این'' اور ''ایم'' وغیرہ کی مانند۔ اس سے ہر کسی کو پتا چلتا رہتا ہے کہ اس کی قطار کون سی ہے۔ یہ آگے آگے ہوتی ہیں اور جہاں قافلے نے آ کر پڑاؤ ڈالنا ہو وہاں پہلے سے انہیں یوں نصب کر دیا جاتا ہے کہ ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ رہے۔ دن میں انہیں جلاتے تو نہیں مگر پھر بھی قافلے کے ساتھ انہیں لے کر چلا ضرور جاتا ہے تا کہ ان کی تعداد سے حجاج کو یہ رہنمائی مل سکے کہ ان کا تعلق کس قطار سے ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے سپاہیوں کو پرچم کے ذریعے پتہ چلتا ہے کہ انہیں کہاں جا کر آپس میں ملنا ہے اگر یہ انتظامات نہ کیے جائیں تو اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کے سفر کے دوران بڑی ہڑبونگ مچ جائے۔ ہر صبح یہ لوگ اپنے خیمے نصب کر کے کئی کئی گھنٹے آرام کرتے ہیں۔ جب اونٹوں پر سے سامان اتار لیا جاتا ہے تو ان کے مالک انہیں پانی پلانے لے جاتے ہیں اور کھانے کو چارہ دیتے ہیں۔ ہمارا کام صرف اس قدر ہوتا تھا

انہیں لادتے وقت ان کی مدد کریں۔

جب ہمارے خیمے نصب ہو جاتے تو میرے ذمے آگ جلانا اور کافی کے لیے برتن لانا ہوتا تھا۔ جب ہم کچھ کھا پی کر، کافی سے لطف اندوز ہو جاتے تو سونے چلے جاتے تھے پھر گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ہم رات کے کھانے کے لیے کچھ اُبالتے اور کھا کر پھر سو جاتے اور بعد دوپہر چار بجے اٹھ جاتے تھے۔ نقارہ بجتا کہ خیمے اتار کر لپیٹ لو اور اپنا سامان باندھ لو۔ اونٹوں پر سامان لادنا شروع کر دو تا کہ سفر کے لیے کوچ کیا جا سکے۔ دو گھنٹوں میں فارغ ہو کر ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر ہوتا تھا۔ شام کی دو نمازوں کے اوقات میں یہ لوگ ٹھہر جاتے ہیں تا کہ نماز ادا کر سکیں (یہ لوگ اپنی عبادات کے لیے پابندیٔ وقت کا بہت خیال رکھتے ہیں) پھر اگلی صبح تک سفر جاری رہتا ہے۔ اگر پانی دستیاب نہ ہو تو یہ لوگ تیمم کر لیتے ہیں، جس میں خشک مٹی یا ریت سے مدد لی جاتی ہے۔ زمانہ قدیم کے لوگوں کے لیے اپنے اونٹوں سے اترنا اور دوبارہ ان پر سوار ہونا تکلیف دہ ہوتا تھا۔ اس لیے ان کو مذہب نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ اگلے روز تک ان دو نمازوں کو ملتوی کر لیں۔ مگر یہ نمازیں انہیں قضا کر کے ادا ضرور کرنی ہوتی تھیں۔

جہاں تک سامان خورد و نوش کا تعلق ہے ہم مصر سے روانہ ہوتے وقت کھانے پینے کی اتنی مقدار ساتھ لے لیتے تھے جو واپس مصر تک پوری ہو جائے۔ مکّہ میں اپنے قیام کے دوران ہم یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ ہماری یومیہ ضرورت کیا تھی یوں ہمیں مصر تک پہنچنے کے لیے چالیس روز کے سامان خورد و نوش کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ اگر ہمیں یہ پتا چل جاتا کہ ہماری ضرورت سے زیادہ سامان ہمارے پاس ہے تو ہم زائد سامان بیچ دیتے تھے۔ ایک خیرات ایسی تھی جس کا انتظام بڑے جاگیردار کے پاس ہوتا تھا یہ وہ پانی تھا جس سے پیدل سفر کرنے والے غریب غربا تازہ دم ہوتے تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو خالی جیب حج کے سفر پر پیدل روانہ ہوتے تھے۔ یہ لوگ اپنے گزارہ کے لیے حجاج کی خیرات پر انحصار کرتے تھے۔ انہیں اس بات کا علم ہوتا تھا کہ حجاج ایسے موقعہ پر اس میں کمی نہیں آنے دیتے تھے۔

ہر حاجی اپنے کھانے پینے کا سامان، پانی اور بستر وغیرہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ عموماً تین یا چار آدمی مل کر کھانا کھاتے تھے۔ جو غریب آدمی سفر کے دوران ان کی خدمت کرتا تھا یہ لوگ اس کے سفر کے اخراجات برداشت کر لیتے تھے۔ ایک آئرش مرتد ایسا بھی تھا جسے کم عمری میں قیدی بنا لیا گیا تھا۔ وہ نہ صرف اپنا مذہب (عیسائیت) کھو بیٹھا تھا بلکہ اپنی علاقائی زبان بھی بھول گیا تھا۔ اس شخص نے بعد ازاں اسپین اور فرانسیسی جیل

میں تیس برس کی غلامی کاٹی تھی۔ اسے بعد میں آزاد کرا لیا گیا تھا اور وہ واپس اپنے وطن الجیریا آ گیا تھا۔ اسے ترکی کے تمام لوگ نیک اور پارسا سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ وہ دین اسلام سے نہیں پھرا تھا حالانکہ اسے اس کے لیے بڑا لالچ دیا گیا تھا۔ میرے چند ہمسایے اسی سال مکہ جانے کا ارادہ رکھتے تھے میں اپنے مالک کے ساتھ ان کے پاس گیا اور اس مرتد کو پیش کیا کہ اگر یہ سفر کے دوران ان کی خدمت کرے تو وہ اس کے سفر کے تمام اخراجات برداشت کریں گے۔ اس نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم مکے پہنچے تو اس نے بہت جذباتی ہو کر مجھے بتایا کہ خدا نے اسے زمین پر موجود جہنم سے بچا کر جنت دے دی ہے، یہ جہنم اسپین اور فرانس میں اس کی سابقہ غلامی تھی۔ اس جنت سے مراد مکہ تھا۔ میں نے اس کے جذبے کی بہت تعریف کی مگر مجھے اس کی حالت پر بڑا رحم آیا تھا۔

پینے کا پانی وہ مشکیزوں میں بھر کر، انہیں اپنے اونٹوں پر ایک طرف باندھ دیتے ہیں۔ کبھی کبھار تو دو

س سے بھی زیادہ مدت تک پانی نہیں ملتا۔ تاہم اونٹ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک ایسا جانور ہے جو کئی کئی روز تک پانی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ خدا جانتا تھا کہ اگر اونٹ کو اس طرح کا جانور نہ بنایا گیا تو صحرا کی جھلسا دینے والی گرمی میں یہ کئی کئی دنوں اور مہینوں کے سفر میں پانی کے بغیر کیسے زندہ رہ سکے گا۔ ہر خیمے کی کمپنی کے افراد نے حوائج ضروریہ کے لیے علاحدہ علاحدہ انتظام کر رکھا تھا۔ چار لمبے بانسوں کو جوڑ کر مربع شکل دے دی جاتی تھی یہ ایک دوسرے سے تین چار فٹ کے فاصلے پر ہوتے تھے اور ان کے گرد کینوس لپیٹ دیا جاتا تھا۔

اس سفر کے دوران کئی بار ڈاکو عربوں نے حجاج کو لوٹ لیا تھا۔ یہ رات کو ان پر ڈاکہ ڈالتے تھے خصوصاً وہاں جہاں یہ حاجی قافلے سے دور ہوتے تھے۔ یہ دراصل اونٹوں کے مالکوں کے نوکروں کی حرکت ہوتی تھی جن کو کوئی شک کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ جب کبھی کسی حاجی کو گہری نیند سوتا دیکھتے (یہ عموماً سڑک پر ہی سو جاتے تھے) تو یہ کسی اونٹ کو کھول دیتے تھے اور ڈاکو حاجی کو اس پر سوتا لے جاتا تھا اسی دوران ایک دوسرا نوکر ایک اور اونٹ کھول کر اسے اس اونٹ کی جگہ باندھ دیتا تھا جہاں سے ایک اونٹ ڈاکو چرا لے گیا تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو پورے قافلے کو رکنا پڑتا تاکہ چوروں کا سراغ لگایا جا سکے۔ جب وہ یہ سمجھتے کہ اب چرایا گیا اونٹ اور اس کا سوار دور پہنچ گئے ہیں اور خطرے کی کوئی بات نہ تھی تو وہ ڈاکو حاجی کو جگا دیتے تھے۔ بعض اوقات یہ ڈاکو اسے فوراً مار ڈالتے تھے اور کبھی کبھار اس پر رحم کھا کر یہ اس کے کپڑے اتار کر حاجی کو واپس قافلے میں بھیج

دیتے تھے۔

قاہرہ کے قریب پہنچ کر: جب ہم قاہرہ سے صرف سات روز کے سفر کی مسافت پر رہ گئے تو ہمیں بے شمار لوگ آ کر ملے تھے۔ یہ چند سو کی تعداد میں تھے اور اپنے عزیز واقارب اور دوستوں کو خوش آمدید کہنے آئے تھے۔ رات کا وقت تھا اس لیے پہچاننا تو مشکل تھا مگر چلتے ہوئے قافلے میں موجود اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو یہ لوگ آوازیں دے رہے تھے اور اس طرح یہ ان تک پہنچ گئے تھے۔ جب یہ فاصلہ صرف تین روز کے سفر کا رہ گیا تو دریائے نیل سے ہمیں بہت سا پینے کا پانی اونٹوں پر لاد کر لانا پڑا تھا۔ قاہرہ پہنچنے میں ایک دن اور رات کا سفر ابھی باقی تھا کہ ہزاروں افراد ہمیں ملنے شہر سے باہر آ گئے تھے۔ ان لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مکہ سے قاہرہ کا سفر 37 یوم کا تھا لیکن ہمیں مزید تین روز لگے کیونکہ ہم راستے سے بھٹک گئے تھے۔ اس طرح ہمیں واپس قاہرہ پہنچنے میں پورے چالیس دن لگ گئے تھے۔ راستے میں نہ کہیں سبزہ دیکھا، نہ جنگلی جانور یا پرندہ، سوائے ریت اور پتھروں کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ البتہ ایک گاؤں مختلف تھا جہاں ہم رات کو ٹھہر گئے تھے۔ یہاں درخت بھی تھے اور باغات بھی۔ ہم ایک وادی میں سے بھی گزرے جسے آتش الویت یعنی آگ کا دریا کہتے ہیں۔ یہ وادی اس قدر گرم تھی کہ مشکیزوں کے اندر پانی بعض اوقات خشک ہو جاتا تھا۔ ہم بے حد خوش تھے کہ جس دوران ہم اس میں سے گزر رہے تھے اس وقت بارش ہو رہی تھی۔ یوں گرمی کی شدت کم ہو گئی تھی۔ حجاج اسے خدا کا کرم سمجھ کر اپنے مالک کا شکر بجالائے تھے۔

ہم قاہرہ پہنچے تو یہاں طاعون کی وبا پھیل چکی تھی جس میں پندرہ روز کے اندر اندر ساٹھ ہزار نفوس لقمۂ اجل بن چکے تھے۔ ہم تیزی کے ساتھ روزیتا (مصر) کی جانب بڑھ گئے تھے جہاں سے ہم اسکندریہ چلے گئے تھے جہاں ہمیں الجیریا جانے والا ایک بحری جہاز تیار ملا جو ہمیں وہاں لے جا سکتا تھا۔

اس وقت طاعون کا اسکندریہ میں بھی زور تھا۔ یہاں سے کچھ لوگ جو اس وباء سے متاثر ہو چکے تھے ہمارے جہاز پر الجیریا جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ یوں طاعون ہم میں بھی پھیل گیا تھا۔ ان متاثرہ افراد کے علاوہ جو تندرست ہو گئے ہم نے بیس ایسے افراد کو سمندر میں پھینک دیا تھا جو اس بیماری سے جاں بحق ہو گئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس وباء سے بالکل خوفزدہ نہ ہوا تھا اور میری یہ آرزو تھی کہ میں بخیریت الجیریا پہنچ جاؤں۔ مجھے یہ امید تھی کہ اگر میں ایک بار خیریت سے الجیریا پہنچ گیا تو بچ جاؤں گا۔ جلد ہی ہم ساحل پر اُتر گئے تھے۔ مجھے بیماری تو لاحق ہو گئی تھی لیکن خدا نے مجھے موت سے بچا لیا تھا۔ طاعون کا پھوڑا میری بغل میں نکل

آیا تھااور وہ آبلہ جو عموماً طاعون کی حالت میں ابھر آتا ہے میری ٹانگ پر نمودار ہو گیا تھا۔ جب یہ بہت پھول گیا تو میری خواہش تھی کہ اسے چھدوالیا جائے لیکن میرے مالک نے مجھے بتایا کہ یہ ابھی اتنا نرم نہیں ہوا اس لیے یہ ممکن نہ تھا۔ میرے پڑوس میں ایک اسپینی تھا جس نے مجھے مشورہ دیا کہ پیاز بھون کر اس کا ایک ٹکڑا آبلے پر باندھ دوں جس سے سوجن ختم ہو جائے گی۔ میں نے ایسا ہی کیا اور دوسرے روز یہ آبلہ نرم ہو گیا تھا اور میرے مالک نے اسے چھید دیا تھا۔ میں اپنے مہربان خدا کے فضل سے تندرست ہو گیا تھا۔ یہ رحم و کرم کا ایک ایسا کرشمہ تھا جسے میں زندگی بھر نہ بھلا سکوں گا۔ میری روح اس رحم اور مہربانی کو زندہ رکھے گی۔ میں چونکہ حال ہی میں مکہ سے واپس لوٹا تھا اور یہ رحم مجھ پر کر دیا گیا تھا میں سمجھتا ہوں اس میں یقیناً خدا کی خاص مہربانی شامل تھی اور میں اس کا ہمیشہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔

☆☆☆

7۔علی بے العباسی......اسپین
1807ء

ورتھما اور جوزف پٹس کے برعکس اسپینی ڈومینگو بادیہ لے بلش ایک یورپی مسلمان تھا۔ وہ علی بے العباسی کے قلمی نام سے لکھتا تھا۔ اسے عربی زبان کئی لہجوں میں بولنے پر دسترس حاصل تھی۔ وہ قرآن ایک خوبصورت لحن میں پڑھتا تھا۔ وہ اسپینی اور اطالوی زبانیں بڑی روانی سے بول سکتا تھا اور اس کا جھکاؤ روشن خیالی کی طرف تھا۔ یورپ اور مکّے کے درمیان اس کا پانچ سالہ سفر ایک سائنسی مہم تھی۔ بعدازاں اس نے اپنے سفر پر انسٹی ٹیوٹ ڈی فرانس میں لیکچر بھی دیئے۔ اس مغربی سائنس کا اسلام کے ساتھ امتزاج اس کا ایک بے حد مسحور کن پہلو ہے۔ جہاں تک اس کی سیاسی وفاداری کا تعلق ہے یہ ایک معمّا ہی رہے گا۔

بیشک وہ یوں لگتا ہے جیسے کسی مغربی طاقت کے لیے سراغ رسانی کا کام کررہا تھا مگر کوئی بھی پورے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس کے مفادات کے لیے کام کررہا تھا۔ بہت سے مبصرین کے خیال میں وہ نپولین کا تنخواہ دار تھا مگر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ انگلستان کے لیے بھی کام کررہا تھا۔ اس نے 1802ء میں اپنے سفر کے آغاز کے قریب ماہر نباتیات سرجان بینکس سے لندن میں ملاقات بھی کی تھی۔ افریقی ایسوسی ایشن اور رائل سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے اُس نے متعدد دوسرے افریقی مہم جویاں کی مالی مدد بھی کی۔ ان میں مشہور منگو پارک اور بعدازاں برکات بھی شامل تھے، جس کا سفرنامہ حج اس مجموعے میں العباسی کے بعد شامل کیا گیا ہے۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ آیا انگلستان نے العباسی کی طرف سے مہیا کردہ معلومات سے سائنسی یا سیاسی طور پر فائدہ اٹھایا یا نہیں مگر ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ دونوں کے اس کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے اور وہ اپنی تصویر سرجان کے مطالعے کے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ پھر جلد ہی وہ مراکش جارہا تھا جہاں سے اسے مشرق کی طرف جانا تھا۔

العباسی کا سفرنامہ دو جلدوں پر مشتمل ہے اور یہ ان بڑے شہروں اور خطوں کا ایک انوکھا اور جزئیات سے آراستہ سفرنامہ ہے جس میں سے یہ اپنے سفر کے دوران گزرا تھا۔ درج ذیل اقتباسات اس کے مراکش

اور شمالی مصر میں قیام کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد سرزمین حجاز کے بارے میں طویل پیراگراف شامل ہیں۔

العباسی سفر کے شاہانہ سٹائل کے ساتھ شمالی افریقا میں پہنچا۔ اس کے پاس ایک گاڑی اور بیرا تھا۔ یہ ایک ایسی سہولت تھی جو عام انسانوں اور کم درجے کے لوگوں کو حاصل نہ تھی۔ طنجہ میں اس نے ایک مسجد کے لیے پانی کا چشمہ وقف کر رکھا تھا پھر جلد ہی اسے امور مملکت میں ایک اہم حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

گورنر نے اسے ایک مکان مہیا کر دیا تھا جس میں اس نے اپنے تھرمامیٹر، بیرومیٹر، رطوبت پیا، بے رنگ دوربین، ساعت پیا، قطب نما آلہ سدس، نمونوں کو محفوظ کر لینے کے لیے مستعمل آلات اور کیمیا کے آلات رکھے تھے جن میں ایک کمرہ بھی شامل تھا۔ طنجہ میں وہ ہفتوں اپنے آپ کو مصروف رکھتا تھا۔ اس کی مصروفیت میں علم ارضیات، مقام نگاری اور موسمیات اور سورج گرہن، چاند گرہن کے بارے میں صحیح صحیح پیش گوئی کے مسائل شامل تھے۔ وہ ایک معزز شخص شمار ہوتا تھا۔ وہ سلطان سے ملا اور بہت جلد اس کی نظر کرم جیتنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

فض شہر کے سکالر، جہاں اس نے بعد میں سفر کیا، اس روشن خیال سیاح کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ابن بطوطہ کے عہد میں ان کا شہر علوم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ العباسی کا یہاں دل نہ لگا تو وہ شاہی حفاظت میں جنوب کی سمت سفر پر نکل پڑا تھا۔ مراکش میں سلطان نے اسے ایک عالیشان گھر دے دیا تھا جہاں اس نے چند ماہ گزارے، ان کا ذکر ہم نے یہاں اقتباسات میں شامل کیا ہے۔ آخری دنوں میں اس نے اپنے قیام میں سلطان کی مرضی کے خلاف غیر معمولی اضافہ کر لیا تھا۔ اس کا سبب کیا تھا اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ یا تو سلطان اس سے ناراض ہو گیا تھا یا کسی نجومی نے اس کے خلاف سازش کی ہو گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ کچھ ذرائع سے پتہ چلا کہ اس نے انگلستان کے ساتھ سائنسی تعلقات استوار کر لیے تھے، جس میں فرانس کے ساتھ سیاسی تعلقات بنا لینا شامل تھا۔ وہ مراکش اور الجیریا کے درمیان ایک نو آبادی کی بنیاد رکھنے کا منصوبہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اسباب کچھ بھی ہوں مگر دو ہی برس بعد العباسی کو اچانک نکال دیا گیا تھا۔ اسے زبردستی ایک شاہی بحری جہاز میں سوار کرا کے لیبیا کی جانب دھکیل دیا گیا تھا تاکہ وہ بادشاہوں کے تلون مزاج اور غیر مستحکم قوت ارادی کے بارے میں سوچتا ہی رہ جائے۔

سلطنت عثمانیہ میں وسعت ہو رہی تھی اور مسائل کو سلجھایا جا رہا تھا جبکہ 1807ء کا سال حج کی

ادائیگی کے لیے مشکلات کا سال ثابت ہوا تھا۔ الجیریا سے سوڈان تک مقامی قبیلے اپنے کمانڈروں اور گورنروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس سے مصر تک کے خشکی کے راستے غیر محفوظ ہو گئے تھے۔ العباسی طرابلس میں طویل عرصے تک مقیم رہا تاکہ شاہی دربار تک رسائی حاصل کر سکے۔ وہ بحریہ کے ایڈمرل سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ اسکندریہ میں اس نے شمالی افریقہ کے منصب داروں اور امیر لوگوں سے راہ و رسم بڑھائے اور اس طرح وہ حجاز کے لیے تعارفی خطوط حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ قاہرہ گیا لیکن یہاں کے نئے پاشا، محمد علی سے فاصلے پر رہا جس نے عرصہ دراز سے قدم جمانے والے مملوکوں کو طویل جھڑپوں کے بعد تخت و تاج سے محروم کر دیا تھا اور دریا کی بالائی طرف ان کا تعاقب کیا۔ مصر کا پہلا حکمران محمد علی جو ملک کو جدید بنا رہا تھا خود البانوی تھا جو فرانسیسی انجینئرنگ کا بڑا مداح تھا۔ وہ مغرب سے آئے ہوئے ایک مسلمان سائنس دان سے بخوشی ملتا مگر العباسی کو جس طرح مراکش سے نکالا گیا تھا اس سے وہ محتاط ہو گیا تھا۔ چند ہفتوں کے بعد اس نے قاہرہ کو ایک ہجو یہ تحریر میں نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے اس کا اظہار یوں کیا: ''سپاہی ظلم و ستم ڈھاتا ہے، لوگ پریشان ہیں، قوت برداشت کوئی برائی نہیں لاتی، مشین جس قدر چل سکتی ہے چلتی ہے''۔ رمضان کے بعد وہ پانچ ہزار حجاج کے ایک قافلے کے ہمراہ سوئز سے حجاز تک کے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔

مکہ پہنچ کر العباسی نے تعارفی خطوط شریف غالب کو پیش کیے، جو قدیم قتادہ کی لڑی میں سے پچاسواں حکمران پورے علاقے میں امیر ترین شخص تھا۔ غالب کا دور حکومت یہاں اس لیے اہم ہے کیونکہ بہت سے لکھنے والوں نے اس پر اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ اس نے ترکوں کے ساتھ مل کر مکہ پر کسی زمانے میں بیس برس تک حکومت کی تھی۔ وہ اپنے لوگوں پر تو بہت سختی کرتا تھا مگر انگریزوں کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آتا تھا۔ جدہ میں ہندوستان کی تجارت میں اس کی آواز بڑی آواز تھی اس لیے وہ ان اشیائے تجارت کے نرخ مقرر کرتا تھا جو مغرب کی طرف یورپ کو جاتی تھی۔ تاہم اس وقت شریف غالب کی حکومت کو (دیگر بہت سی حکومتوں کی طرح) ایک اندرونی انقلاب سے واسطہ تھا۔ اس میں سعودیوں (جن کا تعلق مشرقی عرب کے ایک مشہور قبائلی خاندان سے تھا) اور ایک مذہبی مصلح مُحمد ابن عبدالوہاب (انتقال 1792ء) کے پیروکاروں کے درمیان الحاق ہو گیا تھا۔ اس سیکولر مذہبی الحاق کی منزل پورے جزیرہ نما کو ترکوں سے آزاد کرانا تھا۔ اس کے موجودہ لیڈر یا امیر سعود السعود نے مکہ اور مدینہ کو ہزاروں لاکھوں مسلح حامیوں سے پہلے ہی بہت تنگ کر دیا

تھا۔ اب یہ 1807ء کے حج کے لیے واپس آ رہے تھے اور غالب اور ترک دستے موقعہ پر موجود تھے۔ العباسی کی آمد ایک بے حد نازک لمحے ہوئی تھی، جو حجاز کے لیے ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا سفرنامہ سعودیوں اور ان کی مسلم فوج کی سرگزشت کا پہلا عینی شاہد سفرنامہ ہے۔

شریف غالب نے العباسی کے خطوط قبول کر لیے تھے اور اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ حرم کی پیمائش کر لے۔ یہ بڑی ہمت اور حوصلے کی بات تھی کہ اس نے پینتالیس ہزار وہابی سپاہیوں کی داخلی تحفظات لی ہوئی نگاہ کے نیچے اپنے آلات استعمال کیے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی نظر میں اسلام سائنس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور لکھنا جاسوسوں کا کام تھا۔ العباسی کا کمال یہ تھا کہ وہ بالکل گھبرایا نہیں تھا۔ عرفات پر اس نے اپنے گائیڈ کے مشورے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے السعودی خیموں کے باہر متعین دستوں کے ذاتی انٹرویو لیے تھے۔

العباسی کی مدینے پہنچنے کی ناکام کوشش ان اقتباسات سے باہر رکھی گئی ہے۔ قارئین کے لیے یہ بات دلچسپ ہوگی کہ کچھ عرصے بعد الیپو میں اس نے غیر متوقع طور پر سوئٹزرلینڈ کے مہم جُو برکات کے راستوں کو کاٹا تھا۔ یہ وہی سوس سیاح ہے جس کے خطوط میں اس شخص کے بارے میں باقی رہنے والی واحد تفصیل ملتی ہے۔ وہ لکھتا ہے: ایک تیونسی جو متوسط قد و قامت رکھتا تھا، جس کا سر پتلا اور لمبا، آنکھیں سیاہ تھیں، چھوٹی چھوٹی سی ڈاڑھی تھی، ناک چہرے پر بہت نمایاں تھی اور اس کے پاؤں یہ ظاہر کرتے تھے کہ ان میں یہ شخص کبھی یورپی جوتا پہنتا تھا۔ العباسی نے مشرقی یورپ کے راستے گھر پہنچنے کے لیے سفر جاری رکھا۔ فرانسیسی حملے کے وقت وہ اسپین پہنچا تھا۔ اُس نے اعلان کیا کہ وہ بونا پارٹ کا حامی ہے اور نپولین کے بھائی جوزف کے ماتحت ایک عہدے پر فائز تھا۔ فرانسیسی جب 1813ء میں اسپین سے نکال دیئے گئے تو یہ پیرس کی طرف مراجعت کر آیا تھا اور اس نے اپنی کتاب کی اشاعت دیکھی۔ اس کی دو جلدیں تھیں، جنہیں نقشوں اور پلیٹوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ یہ بہت تیزی کے ساتھ انگریزی میں شائع ہوگئی تھی۔ اس کا بے حد نفیس ایڈیشن 1816ء میں فلاڈلفیا سے چھپا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ العباسی نے سفر کے دوران چار اصول سامنے رکھے: (1) جونہی کسی نئے علاقے میں داخل ہوتے ہو فیاضی سے روپیہ بانٹنا شروع کر دو۔ (2) حکمران طبقے کے افراد کو ہمیشہ اپنی سطح پر اپنے برابر سمجھ کر مخاطب کریں (3) جو ذہن میں ہو وہ کہہ ڈالو۔ (4) رخصت ہوتے وقت تعارفی خطوط جتنے ساتھ لے جا

[illegible] جاؤ۔ ان اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے اور وہ مراعات جو ان کی پابندی سے اسے حاصل ہوئیں، کی مدد سے وہ مسلم معاشرے کے معزز افراد سے ملاقات کر لیتا تھا۔ اپنے سفر کے دوران اس خود پسند شریف انسان نے حقیقی لوگوں کے ساتھ حقیقی تعلقات استوار کیے۔ اسے اگر کوئی شے ناپسند ہوتی تو یہ اس پر نہ مسکراتا تھا نہ صاحبانِ اقتدار کی کبھی خوشامد کرتا تھا۔ ان یورپی سیاحوں کے برعکس جو مشرق کا سفر کر رہے تھے اس نے عربوں کو ارتقا کے ابتدائی مراحل میں سمجھ کر انہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا نہ ہی قدیم صلیبی پروپیگنڈے کا ان پر [illegible] ڈالا۔ سفر کے ان چار زمینی اصولوں نے اسے تحفظ، عزت و احترام اور تحائف جیتنے میں مدد دی۔ آخر میں ان اصولوں نے اس کی زندگی کو بھی یقیناً انمول بنایا ہوگا۔ العباسی 1818ء میں دوبارہ مکے کے لیے روانہ ہوا لیکن راستے ہی میں شام پہنچ کر انتقال کر گیا تھا۔ وہ اسہال سے مرا تھا یا شاید اسے انگریزوں نے زہر دے کر مار ڈالا تھا۔

☆☆☆

علی بے العبّاسی کے سفرنامے میں سے

مصنف کی رائے: عیسائی ریاستوں میں برسوں زندگی گزارنے کے بعد، جہاں میں نے قدرتی سائنسز اور معاشرے میں زندگی گزارنے والے ایک انسان کے لیے نہایت مفید فنون کا مطالعہ کیا (خواہ وہ کسی بھی عقیدے یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو) میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب مجھے اسلامی ممالک میں بھی جانا چاہیے۔ میں مکہ میں حج کی ادائیگی کے دوران مختلف ملکوں کے حجاج کی عادات و اطوار، رسم و رواج اور ان ممالک کی حالت کے متعلق جاننے میں مصروف تھا تا کہ جب میں ان ملکوں میں سے اپنے سفر کے دوران گزروں تو یہ ساری معلومات مجھے پہلے سے حاصل ہوں۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ جب میں کٹھن سفر کے بعد کسی ملک میں کچھ دنوں کے لیے ٹھہر جاتا ہوں تو میرے اس سفر کا اس ملک کو کوئی تو فائدہ پہنچ سکے۔

طنجہ میں میری مصروفیات: 1803ء میں طنجہ واپسی کے فوراً بعد میری حالت کافی حد تک موزوں تھی۔ سب سے پہلا شخص جو مجھ سے ملنے آیا وہ قاضی عبدالرحمان مفراش تھا۔ میں نے سورج گرہن کے بارے میں پیشینگوئی کی تھی جو 17۔ اگست کو لگ رہا تھا۔ یہ اپنی انتہائی تاریکی میں کیسا نظر آئے گا میں نے اس کی وہ شکل معلوم کی تھی؛ میری گاڑیوں اور میرے آلات کا نظر آنا جو یورپ سے ایک بحری جہاز میں آئے تھے؛ قاضی، قائد اور سرکردہ شخصیات کے لیے میرے تحائف اور دوسروں کے لیے میری فیاضی؛ یہ ساری باتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے میں لوگوں کی نظر میں آ گیا تھا اور پھر بہت مختصر سے عرصے میں، مجھے تمام اجنبیوں کے درمیان ایک ممتاز مقام حاصل ہو گیا تھا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میں ممتاز شخصیات میں بھی ایک خاص مقام پر کھڑا تھا۔

طنجہ کی توپوں نے 5۔ اکتوبر کو سُلطان مولائی سلیمان، شاہ مراکش کی آمد کا اعلان کیا۔ وہ جس شہر کے محل میں اترا تھا اسے القصبہ کہتے تھے۔ مجھے چونکہ ابھی تک شاہ کے سامنے حاضر ہونے کا موقعہ نہیں ملا تھا اس لیے میں باہر نہیں نکلا تھا۔ میں گھر پر ہی شاہی احکامات کا منتظر تھا۔ میں قائد اور قاضی کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ یُوں میں شاہ کی آمد کی اس تقریب کو نہ دیکھ سکا تھا۔

اگلی صبح قائد نے مجھے اطلاع دی کہ میں روایتی تحائف اگلے روز پیش کرنے کے لیے تیار رکھوں۔ میں نے فوراً ان کا انتظام کرلیا تھا۔ چنانچہ مقررہ دن کی صبح کو میں نے قائد اور قاضی کے ساتھ ملاقات کی تاکہ مجھے شاہی دربار میں پیش کرنے کی تیاری کی جاسکے۔ قائد نے مجھ سے ان تحائف کے بارے میں پوچھا جو مجھے سلطان کو پیش کرنے تھے۔ میں نے تحائف اسے دے دیئے تھے جلد ہی اس موضوع پر ہمارے درمیان اتفاق رائے پایا جاتا تھا۔

آج جمعہ تھا، میں نماز جمعہ ادا کرنے جامع مسجد گیا۔ یہ ضروری تھا کیونکہ یہ ایک ایسا فریضہ تھا جس کی ادائیگی ضروری تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ سلطان بھی وہاں موجود ہوگا۔

مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک مور (Moore) میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ سلطان نے ابھی ابھی ایک خادم کو بھیجا ہے کہ وہ مجھے یہ بتادے کہ میں چار بجے القصبہ پہنچ جاؤں تاکہ مجھے حاضری کا موقعہ فراہم کیا جاسکے۔

سلطان کی آمد سے پہلے کچھ حبشی سپاہی مسجد میں داخل ہوئے، وہ سب مسلح تھے پھر بھی وہ دونوں جانب بلاامتیاز، کھڑے ہوگئے تھے اور کسی عہدے، مرتبے یا مقام کا خیال نہ رکھا تھا۔

سلطان زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ جب مسجد میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ افسروں اور منصب داروں کی مختصری تعداد تھی۔ یہ سب اس قدر سادہ لباس میں تھے کہ ان کے درمیان فرق نظر نہیں آرہا تھا۔ مسجد نمازیوں سے بھر گئی تھی اور اس میں کم وبیش دو ہزار افراد موجود تھے۔ میں جتنی دیر مسجد میں رہا میں نے اپنے آپ کو فارغ رکھا۔

نماز ہر جمعہ کے دن حسب معمول ادا کی جاتی تھی۔ وعظ کی اجازت صرف سلطان کے فقیہہ کو حاصل تھی۔ اس نے دورانِ تقریر بتایا کہ عیسائیوں کے ساتھ تجارت کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ گناہ ہے اور انہیں کوئی چیز بیچنا یا دینا خواہ وہ خوراک یا کھانے پینے کی کوئی بھی شے ہو منع ہے اس طرح کے کئی اور موضوعات فقیہہ کی تقریر کا حصہ تھے۔

جوں ہی نماز ادا ہوگئی میرے نوکروں نے میرے لیے راستہ کھول دیا تھا اور میں مسجد سے باہر آ گیا تھا تقریباً ایک سو سیاہ فام سپاہیوں نے مسجد کے دروازے کے باہر نیم دائرہ بنا رکھا تھا۔ ان کے گرد بُہت سے تماشائی جمع تھے۔ میں گھر پہنچا تو سلطان کا ایک نوکر مجھے اپنے آقا کا ایک ذاتی حکمنامہ پہنچانے اور تحائف

وصول کرنے آیا تھا۔

دوپہر کے تین بجے میرے پاس قائد نے کچھ افراد بھیجے تھے تا کہ وہ تحائف اُٹھانے میں میری مدد کر سکیں، جن میں درج ذیل چیزیں شامل تھیں:

- 20 بندوقیں سنگینوں کے ساتھ
- 2 بڑے سائز کی پرانی بندوقیں
- 15 جوڑے پستول ساختہ انگلستان
- کئی ہزار بندوق چقماق
- 2 تھیلیاں بندوق کی گولیوں کی شکار کے لیے اور شکار کا سارا سامان
- بہترین انگلش بارود کا ایک ڈرم
- قیمتی ململ سادہ اور بیل بُوٹوں والی
- کچھ زیورات، ہیرے
- ایک خوبصورت چھتری
- میٹھی گولیاں، ٹافیاں اور عطریات

آتشیں اسلحہ صندوقوں میں بند تھا جو مقفل تھے جبکہ دوسری تمام چیزیں بڑی بڑی طشتریوں میں رکھی ہوئی تھیں جو خوبصورت کپڑے سے ڈھانپ دی گئی تھیں۔ صندوقوں کی چابیاں ایک گچھے کی شکل میں ایک رکابی میں رکھی ہوئی تھیں۔

میں ان نوکروں اور چند دوسرے افراد کے ہمراہ جنہوں نے میرے تحائف اٹھا رکھے تھے القصبہ پہنچا۔ قائد دروازے پر میرا انتظار کر رہا تھا، اس نے میرا پرجوش استقبال کیا۔ ہم ایک ایوان میں سے ہو کر گزرے جہاں دربار سے منسلک بہت سے افسران جمع تھے۔ ہم قریب کی ایک چھوٹی سی مسجد میں داخل ہوئے جہاں ہم نے نماز ظہر ادا کی۔ سلطان نے اس میں مدد دی۔

نماز کے بعد ہم مسجد سے باہر آئے، دروازے پر ایک تیار خچر سلطان کے انتظار میں تھا۔ اس کے گرد بہت سے نوکر اور افسران تھے جن کا دربار سے تعلق تھا۔ آگے آگے دو افراد تھے جو 14 فٹ لمبی برچھیوں سے مسلح تھے۔ یہ ایک دوسرے کے بالکل قریب قریب تھے اور عہدہ و رتبے کا کوئی امتیاز نہ تھا۔

قائد اور میں دونوں برچھیوں سے لیس سپاہیوں کے درمیان تھے۔ ہماری دونوں طرف تحائف تھے جنہیں میرے نوکروں اور ان افراد نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا جن کو میری طرف بھیجا گیا تھا۔

سلطان جلد ہی باہر آ کر اپنے خچر پر سوار ہو گیا تھا۔ جب وہ اس دائرہ کے مرکز میں پہنچا تو میں اور قائد چند قدم آگے بڑھے۔ سلطان نے خچر کو روکا اور قائد نے مجھے سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ میں نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے اپنے سر کو اس کی جانب کر کے جھکایا۔ سلطان نے بھی جواباً ایسا ہی کیا اور کہا: ''میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں'' پھر اس نے اپنا سر وہاں موجود مجمع کی طرف موڑتے ہوئے انہیں ہدایت کی کہ وہ سب مجھے سیلوٹ کریں۔ اس نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: ''اس سے کہو کہ اسے خوش آمدید کہا جاتا ہے''۔ یہ سنتے ہی پورے مجمع نے بیک آواز کہا: ''خوش آمدید''۔ میں نے اس حاکم کو بہت مہربان پایا جبکہ میں نے تو ابھی اپنے کسی وصف یا خوبی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

سلطان نے مجھ سے پوچھا کہ میں کن ممالک کو دیکھ چکا ہوں، میں زبانیں کون کون سی بول لیتا ہوں اور ان میں کس کس زبان میں لکھ سکتا ہوں۔ میں نے مسیحی اداروں میں کون کون سی سائنسز کی تعلیم حاصل کی ہے اور یورپ میں میرا قیام کتنی مدت کے لیے تھا؟ اس نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے کفار کا ملک چھوڑ دینے کا موقعہ فراہم کیا۔ اس نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مجھ سا انسان مراکش اس قدر دیر سے کیوں پہنچا تھا۔ اس نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ میں نے اس کے ملک کو الجیریا، تیونس یا طرابلس پر ترجیح دی تھی۔ اس نے مجھے تحفظ اور دوستی کا یقین دلایا۔ اب اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میرے پاس مشاہدات کے لیے کوئی آلات تھے۔ میں نے جب اثبات میں جواب دیا تو سلطان نے انہیں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں ان آلات کو اس کے پاس لے آؤں۔ یہ سنتے ہی قائد نے مجھے بازو سے پکڑا اور گھر لے آیا۔ میں نے جاتے جاتے سلطان کو بتایا کہ میں کل تک لے آؤں گا کیونکہ اتنی جلدی ان آلات کو مشاہدہ کے لیے تیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قائد نے حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا کیونکہ کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ سلطان کی بات سے اختلاف کرتا۔ مگر سلطان نے بڑی مہربانی سے کہا: ''ٹھیک ہے، کل لے آنا''۔ میں نے وقت کا پوچھا تو جواب ملا: ''صبح آٹھ بجے''۔ میں نے یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا اور سلطان سے اجازت لے کر میں قائد کے ساتھ چلا آیا۔

محل میں چائے کی دعوت: اگلے روز میں وقت مقررہ پر محل میں گیا۔ سلطان اپنے فقیہہ

اعظم یا مفتی اعظم کے ہمراہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور مصاحب تھا۔ چائے سے تواضع ہوئی۔

چائے کے برتنوں میں سونے کا چینی دان، ایک چائے دانی، دودھ دان اور تین سفید چینی کی مُطلا پیالیاں تھیں۔ ان سب برتنوں کو ایک مطلہ طشتری میں رکھا گیا تھا۔ چینی کو چائے دانی میں ڈالا گیا جو اس ملک کا رواج تھا۔ اس میں ایک قباحت تھی کہ اکثر یا تو آپ کو زیادہ میٹھی چائے پینی پڑتی تھی یا بہت کم میٹھی۔

سلطان نے بار بار اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ وہ مجھے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اب اس نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے آلات دکھاؤں۔ اس نے ایک ایک کر کے سب کا جائزہ لیا۔ جو بات بھی اس کے لیے نئی ہوتی وہ اس کے متعلق مجھ سے پوچھ لیتا۔ اس نے جو کچھ دیکھا بڑے انہاک سے اس میں گہری دلچسپی دکھائی۔ مجھے حکم ملا کہ میں سلطان کی موجودگی میں کچھ فلکیاتی مشاہدات پیش کروں۔ میں نے اس کی تسلی کے لیے سورج کی دو بلندیوں کو پیش کیا۔ میں نے اسے بہت سے فلکیاتی جدول اور لوگارتھم دکھائے جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں دراصل اسے یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ یہ آلات کسی بھی ایسے انسان کے لیے بیکار ہیں جو ان کتابوں اور بہت سی ایسی ہی دوسری کتابوں کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو۔ وہ اتنے سارے اعداد دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے جب اسے اپنے آلات کی پیشکش کی تو اس نے جواب دیا کہ انہیں میں اپنے پاس ہی رکھوں۔ کیونکہ صرف میں ہی جانتا تھا کہ انہیں کیسے استعمال کرنا ہے۔ اس نے کہا کہ ہمارے پاس بہت سی راتیں اور دن ہوں گے جن میں ہم آسمان اور اجرام فلکی پر غور و فکر کر کے اپنے آپ کو خوش کر سکیں گے۔ ان سب باتوں سے میں سمجھ گیا کہ سلطان مجھے اپنی قربت میں رکھ کر وہ مجھے کوئی خدمت سونپنا چاہتا ہے۔ اس نے میرے دوسرے آلات دیکھنے کی خواہش کی۔ میں نے دوسرے روز لانے کا وعدہ کیا اور اجازت طلب کی۔

دوسرے روز جب میں سلطان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ ایک چھوٹی سی چٹائی پر گاؤ تکیہ رکھ کر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے مفتی اعظم اور دو دوسرے مصاحبین اُس کے سامنے ایک چھوٹی سی قالین پر براجمان تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھا اور ایک نیلا مخملی گاؤ تکیہ میرے لیے بھی منگوالیا۔ اسے اس نے اپنے قریب رکھ لیا اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔

دونوں جانب سے سلام دعا کے بعد میں نے اپنی برقی مشین اور قدیم کیمرہ اندر لانے کا حکم دیا۔ میں نے یہ دونوں اسے پیش کیں تا کہ وہ ان سے لطف اندوز ہو سکے کیونکہ یہ سائنسی طور پر کسی اور کام کے نہ تھے۔ میں نے کیمرے کو کھڑکی کے قریب رکھ دیا تھا۔ سلطان اٹھا اور دو مرتبہ کیمرے کے پاس گیا۔ میں نے

اسے موٹے اونی کپڑے سے ڈھانپ دیا تھا اور وہ ان اشیاء پر غور و فکر کر کے لطف اندوز ہو رہا تھا جن کی ترسیل پہ کیمرہ کر رہا تھا۔ اس نے مجھے ایسا کرنے کی اجازت دے کر مجھ پر انتہائی بھروسے اور اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ پھر اس نے اس برقی مرتبان سے لطف اٹھایا جس سے بجلی کا اخراج ہو رہا تھا۔ اس نے اسے بار بار دہرانے کی فرمائش کی تھی۔ اسے جس شے نے سب سے زیادہ حیران کیا تھا وہ برقی جھٹکے کا تجربہ تھا۔ اسے اس نے کئی مرتبہ دیکھا۔ ہم سب نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال رکھے تھے تا کہ اس طرح ایک زنجیر بن سکے۔

سلطان نے مجھ سے ان مشینوں کے بارے میں کئی سوالات کیے تھے۔ وہ بجلی کے عمل دخل کے بارے میں بھی جاننے کا خواہش مند تھا۔

میں نے ایک روز قبل سلطان کو جو دوربین دی تھی، میں نے اس سے یہ مانگ لی تھی تا کہ میں اسے اس کی نظر کے مطابق بدل دُوں۔ میں نے ایسا کرنے میں بہت تھوڑا وقت لیا تھا میں نے ٹیوب پر صحیح جگہ و مقام کی نشاندہی کر دی تھی۔

میری بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ سلطان نے مجھ سے پوچھا کہ میں دوسرے مُوروں کی مانند انہیں کٹوا کر چھوٹا کیوں نہیں کرا لیتا۔ میں نے اسے بتایا کہ مشرق میں یہ رواج ہے کہ مونچھیں پوری لمبائی کے ساتھ رکھی جائیں۔ اس نے کہا: ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، مگر یہ یہاں کے فیشن کے مطابق نہیں ہے''۔ اس نے قینچی منگوا کر اپنی مونچھیں تھوڑی سی کاٹ کر پھر مجھے بتایا کہ میں اپنی مونچھیں کتنی لمبی رکھوں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ میری مونچھیں اپنے ہاتھ سے کاٹنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مگر جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو سلطان نے قینچی نیچے رکھ دی تھی۔

بات چیت کا سلسلہ پھر شروع ہوا تو سلطان نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میرے پاس کوئی ایسا آلہ تھا جس سے میں حرارت کو ماپ سکوں۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں ایسا آلہ بھیج دوں گا اور پھر اجازت لے کر اپنے آلات ساتھ لے آیا۔ میں نے اسے اسی روز ایک تھرمامیٹر بھیج دیا تھا۔

شام کو جب میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ گھر پر ہی تھا، سلطان کا ایک نوکر آیا اور مجھے سلطان کی طرف سے بھیجا گیا ایک تحفہ دیا۔ اسے پیش کرتے وقت وہ مؤدب ہو کر اپنے گھٹنوں تک جھک گیا تھا۔ یہ تحفہ ایک ریشمی کپڑے کے ساتھ ڈھکا ہوا تھا۔ میرا اشتیاق بڑھ گیا تھا کہ بھلا دیکھوں تو سہی سلطان نے کیا شے تحفے میں بھیجی ہے۔ میں نے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو یہ دو سیاہ روٹی کے لقمے تھے۔ میں اس قسم کے تحفے کی بالکل توقع نہ

رکھتا تھا اسی لیے میں فوری طور پر اپنے جذبات کا اظہار بھی نہ کر سکتا تھا۔ میں وقتی طور پر اس قدر حواس باختہ ہو گیا تھا کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کہوں۔ مگر جو دوست وہاں موجود تھے سب خوش ہوئے اور مجھے مبارکباد کہتے ہوئے بتایا کہ سلطان نے مجھے اپنا بھائی بنالیا ہے جو میرے لئے کس قدر خوش قسمتی کی بات ہے۔ مجھے یاد آیا کہ عربوں کے ہاں یہ رسم ہے کہ وہ اگر کسی سے اخوت و بھائی چارے کا اظہار کرنا چاہیں تو ایک دوسرے کو روٹی کا ٹکڑا پیش کرتے ہیں جو دونوں کھا لیتے ہیں۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ سلطان کی طرف سے مجھے بھیجے گئے روٹی کے دو لقموں کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ یہ لقمے سیاہ اس لیے تھے کیونکہ سلطان کے لیے جو روٹی پکائی جاتی تھی وہ لوہے کے ہلکے تنور میں بنتی تھی۔ اس سے اس کا باہر کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے مگر اندر سے یہ روٹی سفید اور بہت عمدہ پکتی ہے۔

فض میں 1804ء میں کیا حالات تھے: فض کے گرد زنجیروں کی دیواریں ہیں جو بہت قدیم ہیں۔ اسی وجہ سے آج ان کی حالت بے حد خستہ و ناگفتہ بہ ہے۔ اس چار دیواری کے اندر نیا فض آباد ہے جس میں باغات کی بہتات ہے۔ مشرقی اور مغربی سمت دو ابھرے ہوئے مقامات پر دو مضبوط قدیم محلات ہیں ان کے بالکل سامنے ساٹھ ساٹھ فٹ کی مربع دیواریں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں ایسے زمین دوز راستے ہیں جو محلات اور شہر کے درمیان مواصلاتی رابطہ قائم رکھتے ہیں جب کبھی لوگ سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں تو ان محلات پر توپیں نصب کر کے ایک سو سپاہی بطور گارڈ تعینات کر دیئے جاتے ہیں حالانکہ یہ کوئی اتنا مضبوط دفاع نہیں بنتا۔

اس شہر میں بہت سے مدارس ہیں جن میں سے زیادہ اچھے اور مشہور قرائن اور مولائی ادریس کی مساجد میں قائم کیے گئے ہیں۔ مسجد یا چھوٹے سے گھر کے اندر قائم ہونے والا اسکول، مدرسہ یا اکادمی کہلاتا ہے۔

اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان مدارس میں تدریس کا طریقہ کیا ہوگا تو ذرا چشم تصور وا کیجیے اور ایک اُستاد محترم کو فرش پر دونوں ٹانگوں کو چلیپائی شکل دے کر بیٹھا دیکھیے۔ گانے یا چیخنے کے انداز میں پڑھایا جا رہا ہوگا۔ استاد کے گرد پندرہ بیس شاگرد بیٹھتے ہیں۔ کتابیں یا تو ان کے ہاتھوں میں ہوں گی یا چھوٹے چھوٹے سٹولوں پر۔ وہ استاد کے پیچھے اسی شد و مد کے ساتھ اسباق دہراتے ہیں۔ سر تال کوئی نہیں ہوگی، ایک بے ہنگم شور و غل آپ کا استقبال کرے گا۔ یہاں تدریس کی یہی روایت برسوں سے جاری ہے۔ ان مُورش مدارس کی

بھی شکل ہر طرف ملتی ہے۔ جہاں تک ان تدریسی مضامین کا تعلق ہے جو یہاں پڑھائے جاتے ہیں تو انہیں مختلف نام دے دیئے گئے ہیں...... اخلاقیات اور اصول قانون۔ عبادت اور عقائد تمام موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی تعلیم قرآن، اس کی تفسیر وتشریح، صرف ونحو کے اصولوں اور منطق پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو کچھ میں نے دیکھا اس کی رُو سے تو میرے خیال میں بہت سے مبصرین وشارحین خود بھی ان مضامین کا علم نہیں رکھتے۔ معانی ومفہوم اور مطالب کو نکتہ رسی، پُراسراریت اور ماورائی بحث وتمحیص کے سمندر میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ یوں آپ خود بھی اس قدر الجھ جاتے ہیں کہ اپنے آپ کو اس مشکل اور دشواری سے نہیں نکال سکتے۔ وہ پھر تقدیر کے لکھے اور خدا کی مرضی کا مسئلہ اٹھا کر ہر بات سے مصلحت کر لیتے ہیں۔

یہ صاحبانِ علم وفضل پڑھے لکھے لوگوں میں دائمی جھگڑے پیدا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جس مسئلے کا یہ دفاع کرتے ہیں اسے خود بھی نہیں سمجھتے۔ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسری بنیاد نہیں ہوتی جس کا سہارا لے کر یہ اپنے آپ کی مدد کرسکیں۔ ان کے پاس لے دے کر ایک ہی لفظ اُستاد یا کتاب رہ جاتا ہے جس کا یہ حوالہ دیتے ہیں خواہ وہ غلط ہو یا صحیح۔ اس اصول سے ہٹ کر انہیں یقین دلانا ممکن نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ اپنے استاد کے کسی لفظ یا کتاب کے کسی جملے کے علاوہ کسی دلیل کو تو ذہنوں میں جگہ دینے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔

فض شہر کے بہت سے صاحبانِ علم وفضل میرے حلقہ احباب میں شامل رہے ہیں اور میں ان مشکل اور کبھی نہ ختم ہونے والے جھگڑوں کا عینی گواہ ہوں۔ اکثر اوقات میں نے اپنے مقام ومرتبے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی بحثوں کو ختم کرانے کے لیے انہیں چپ ہو جانے کی تلقین کی۔ مگر بہتر طور پر اثر انداز ہونے کے لیے میں نے انہیں اس طرف مائل کیا کہ وہ کبھی کبھی اپنے اساتذہ اور کتابوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھ لیا کریں۔ دراصل جب میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا تو میں نے ان لوگوں کے ذہنوں میں ایک نیا کیریئر کھول دیا تھا۔ یہ بلاشبہ وہ لوگ تھے جن کی صلاحیتیں اور علمی استعداد بہتر بنائی جاسکتی تھی مگر یہ رُوحانی جمود کی وجہ سے مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے جب یہ منصوبہ بنالیا تو پھر میں ان کی بحث وتمحیص میں اکثر شامل ہو جایا کرتا تھا۔ پھر چند ایسی دلائل پیش کرنے کے بعد جن کو وہ مسترد نہ کرسکتے تھے، میں انہیں خاموش کرا دیا کرتا تھا۔ جب ان کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا تو وہ مجھے وہ کتاب دکھاتے تاکہ میں وہ جملہ پڑھ سکوں جو ان کے حق میں جاتا تھا۔ میں

ان سے سوال کرتا اس کتاب کا مصنف کون تھا؟ وہ بتاتے کہ فلاں فلاں۔ میں پوچھتا وہ کون تھا۔ کیا وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح کا ایک انسان نہ تھا۔ جب یہ تسلیم کرلیا جائے تو پھر میں اسے دوسرے سے زیادہ بہتر نہیں سمجھوں گا۔ جب وہ منطق اور دلیل سے ہٹ جاتا ہے تو میں اسی وقت اسے چھوڑ دیتا ہوں جب وہ دلیل کو چھوڑ کر قدیم یونانی سوفسطانیوں کا نظریہ پیش کرنے لگتا ہے۔

گفتگو کا یہ انداز ان لوگوں کے لیے اس قدر نیا تھا کہ آغاز میں تو وہ حیرت سے میرا منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ کبھی وہ ایک دوسرے کو دیکھتے کبھی ان کی نظریں مجھ پر آ کر رک جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ میں نے انہیں دلیل کے ساتھ بات کرنے کا عادی بنالیا تھا۔ یہ بات انہوں نے اپنی تدریسی مدت کے دوران کبھی نہ سوچی تھی۔ اب وہ اس طرح کے احمقانہ جواب نہیں دیا کرتے تھے جن کے وہ پہلے عادی رہ چکے تھے۔ مگر مجھے پھر یہ احساس ہوا کہ یہ پڑھے لکھے افراد جن کی حیثیت معالجین کی تھی ایک اور مشکل میں پھنس گئے تھے جو کم تکلیف دہ نہ تھی۔ وہ یہ کہ اب جب کہیں وہ بات کرتے وہ میری رائے اور الفاظ کا حوالہ دیتے تھے۔ گویا اب ان کا رنگ بدل گیا تھا ان کا حربہ وہی پرانا تھا۔

میں بار بار انہیں یاد دلاتا کہ وہ کسی بات پر اس لیے یقین نہ کرلیں کہ وہ ان سے علی بے العباسی نے کہی ہے بلکہ جب کہیں بحث کرنے لگیں تو پہلے اپنے نقطہ نظر کے لیے دلیل ضرور تلاش کرلیں کہ کیا جو کچھ وہ کہنے جا رہے ہیں ایسا ممکن ہوتا ہے کیا ایسا کبھی پہلے ہو چکا تھا، کیا ایسا ممکن تھا۔ بالآخر اس کا نتیجہ وہ نکلا جس کی مجھے امید تھی۔ مجھے اب یقین ہو گیا تھا کہ روشنی کی کوئی کرن ضرور بروقت ان لوگوں کے اندر اچھے نتائج پیدا کرے گی۔

یہاں علم فلکیات کو علم نجوم کے ساتھ گڈمڈ کردیا گیا ہے۔ جو کوئی بھی آسمانوں پر دن کا وقت یا نیا چاند دیکھنے کے لیے نظر ڈالتا ہے لوگ اسے ماہر نجوم یا پیغامبر سمجھنے لگتے ہیں یہ وہی شخص ہے جو بادشاہ کو اس کے مستقبل، اس کی سلطنت اور رعایا کے بارے میں بتا سکتا ہے۔ ان کے پاس علم نجوم پر چند کتب ہوتی ہیں جن کا یہ مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور یہ ایک ایسا ہنر یا صلاحیت ہے جس کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ اس سے ایسے لوگوں کے لیے شاہی دربار تک پہنچنے کے راستے کھل جاتے ہیں کیونکہ سرکاری اور عوامی حلقوں میں ان نجومیوں کی بڑی کہانیاں گردش کرتی ہیں جن میں داستان کم اور زیب داستان کا حصہ زیادہ ہوتا ہے۔ میں نے علم نجوم اور کیمیاگری (معمولی دھات کو سونا بنانے کا عمل) کے خلاف ایک محاذ کھول دیا تھا اور مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ

دلائل سے میں ان میں سے چند ایک کو نجومیوں اور کیمیا گروں کی مضحکہ خیز شعبدہ بازیوں کے بارے میں یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ انہوں نے علم فلکیات اور علم نجوم کو گڈ مڈ کر دیا تھا۔ جب فض شہر کے ماہرین فلکیات میں سے ان کے ماہر اعلیٰ نے ہر سیارے کا سال کے پہلے روز طول و عرض بتانے کو کہا تا کہ اس سے ایک حساب لگا کر یہ بتایا جا سکے کہ یہ سال اچھا ثابت ہو گا یا برا تو میں نے پورے یقین کے ساتھ اسے جواب دیا کہ فلکیات کی سائنس بیشک دین کی رُو سے صحیح ہے مگر اسے خوابوں اور خوابوں کی تعبیر بتانے والوں کی بیاری کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی ان لوگوں کی وجہ سے اس الٰہیاتی علم کو نفرت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ سال کے آغاز کو اپنی خواہش کے مطابق مختلف جنتریوں میں جس طرح بیان کیا جاتا ہے اس کا فطرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس سے نہ موسموں پر اثر پڑتا ہے، نہ فصلوں پر، نہ انسانوں پر اور نہ ہی ان کے حالات پر۔ میں نے اپنی گفتگو کا اختتام کرتے ہوئے اسے قرآن کی وہ آیت دکھائی جس میں علم نجوم کو پیشہ بنانے کی ممانعت کی گئی ہے کہ یہ گناہ ہے۔ اس بات کی تصدیق بہت سے علماء نے بھی کی ہے اور مجھے یہ لوگ ان ہی علماء میں سے تصور کرنے لگے تھے۔

مراکش میں جائیداد: میری مراکش میں آمد پر سلطان بے حد مطمئن تھا۔ ایسا ہی اطمینان شہزادہ مولائی عبدالسلام اور میرے تمام درباری دوستوں کو حاصل تھا۔ میری آمد کے فوراً بعد سلطان نے اپنی میز سے مجھے دودھ بھیجا جو اس کی محبت کی علامت تھی اور شہزادے نے بھی ایسا ہی کیا۔ دوسرے روز میں جب ان دونوں کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اپنی دوستی اور عزت و تکریم کی یادگار کے طور پر نئے تحائف دیئے جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

چند روز اور گزر گئے تو سلطان نے مجھے کچھ جائیداد تحفے میں عنایت کی۔ میں اُپنے فنڈز میں سے اس جائیداد کی دیکھ بھال کے اخراجات برداشت کر سکتا تھا۔ میں گھر پر ہی تھا جب سُلطان کے وزراء میں سے ایک کو متعارف کرایا گیا تھا اور ایک فرمان جاری کرتے ہوئے مجھے ایک شاندار مکان عطیے میں دیا گیا تھا جسے سلالیہ کہتے تھے اس کے ساتھ اور املاک بھی تھی جس میں اراضی، کھجوروں کے درخت، زیتون کی شجر کاری اور سبزیوں کے چھوٹے باغات شامل تھے۔ اس کے علاوہ شہر میں ایک گھر بھی اس کے ساتھ منسلک تھا جسے سدی بن احمد دُکالا کہتے تھے۔

قلعہ نما گھر اور سملالیہ کی شجر کاری اور کاشت کا انتظام سلطان سدی محمد نے کیا تھا جو مولائی سلیمان کے والد تھے۔ انہوں نے اسے ایک دل پسند رہائش گاہ بنایا تھا۔ پھل دار درخت لگائے گئے تھے اور باغات دیکھنے کے قابل تھے۔ کوہ اطلس سے پانی وافر مقدار میں لایا گیا تھا۔ یوں اس املاک کی دلکشی بڑھ گئی تھی، جو ایک میل میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے چاروں طرف دیوار تھی۔ کھجوروں کے درختوں کے گرد کوئی دیوار نہیں تھی اور ہر باغ کو ایک الگ احاطے میں تقسیم کیا گیا تھا۔

شہر کے اندر والا مکان بہت بڑا تھا۔ اس کی تعمیر بن احمد ڈکالا نے کرائی تھی جو ایک مقبول وزیر تھے اور جنہوں نے سلطنت کے اقتدار میں طویل عرصہ گزارا تھا۔ گھر کا ایک حصہ اور غسل خانے بہت خوبصورت تعمیر کیے گئے تھے۔ البتہ بقیہ حصہ وسیع تو ضرور تھا مگر دیکھنے میں بدصورت تھا۔ یہ عطیات آج بھی میری جائیداد ہیں۔

سلطان کو چند روز بعد مکینز جانا تھا، وہ چاہتا تھا کہ سلطنت میں میرا قیام زیادہ سے زیادہ میرے اطمینان کے مطابق ہو۔ اس کی خواہش تھی کہ میں ایک خوشی و مسرت کی محفل میں عیساؤ ریہ یا موگا در چلا جاؤں۔ اس نے تین صوبوں حاحا، شرما اور ساؤس کے پاشاؤں کو حکم دیا کہ وہ اپنے دستے موگادر میں اکٹھے کر دیں۔

جن دس دنوں تک میں وہاں مقیم رہا موسم تبدیل ہوتا رہا تھا۔ میں نے البتہ کچھ مشاہدات ایسے کیے تھے جن سے میں نے 31°، 32، 40 شمال کے عرض البلد اور 45، 55، 11° مغربی طول البلد کی تحقیق رصدگاہ سے کر لی تھی۔

ان دس دنوں کے دوران تینوں صوبوں کے پاشا اور ان کے فوجی دستے میرے لیے ایک ایسا منظر پیش کر رہے تھے جس میں کچھ گھوڑ دوڑیں ہو رہی ہوں، نقلی جنگیں دکھائی جا رہی ہوں اور کچھ ایسی مشقیں دکھائی جا رہی ہوں جن میں اسلحہ استعمال ہو رہا ہے اور ان میں اس قدر گولہ بارود استعمال ہوا ہو جس سے شور و غل پیدا ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک دن انہوں نے مجھے بہت پر تکلف کھانا سلطان کے ایک محل میں کھلایا تھا۔ یہ محل پہاڑوں پر ایک جنگل میں واقع تھا۔ جب ہم وہاں سے واپس آئے تو ہمارے ساتھ ایک ہزار سے زائد گھوڑ سوار تھے جنہوں نے گھوڑ دوڑوں اور نقلی جنگوں سے بے حد لطف اٹھایا تھا۔ پھر ہم ایک ایسے محل میں گئے جسے سلطان سدی محمد ایک صحرائی میدان میں تعمیر کرا رہا تھا۔ اس کے ایک کمرے میں مجھے ایک عقاب نظر آیا جو چھپ رہا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب ہم ایک کم پانی والے دریا کو عبور کر رہے تھے تو ایک سپاہی نے جو مجھ سے زیادہ دور نہ تھا ایک اڑھائی فٹ لمبی مچھلی دیکھی۔ یہ مچھلی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سے سہم گئی تھی۔ اس سپاہی کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ اسے اپنی تلوار میں پرو کر مجھے پیش کرے۔ اس عقاب اور اس مچھلی کے ہاتھ آ جانے پر میرے ساتھی اس قدر خوش تھے کہ ان کی خوشی و مسرت کو الفاظ کا جامہ پہنانا میرے لیے ممکن نہ تھا۔

سملالیہ میں قیام کے دوران مجھے ایک موذی مرض لاحق ہو گیا تھا جس سے میری زندگی خطرے میں تھی۔ تین مہینوں کے دوران میں مایوسی کی حالت میں پہنچ کر پانچ بار صحت یابی کی طرف لوٹا تھا۔ میں تین ماہ تک بہت کمزور رہا، صحت اس قدر خراب رہی کہ میں نہ کوئی سائنسی مشاہدات کر سکتا تھا نہ کوئی اور کام میں اس سارے عرصے میں سملالیہ والے اپنے محل میں رہا۔ کوئی معالج نہ تھا جو میرا علاج کرتا کیونکہ میں اس ملک کے کسی معالج سے رجوع نہ کرنا چاہتا تھا اور یورپی معالجین وہاں تھے نہیں۔ میں اپنے لیے دوائیں خود ہی تجویز کرتا رہا اور جو دوائیں بہتر سمجھتا استعمال کر لیتا تھا۔ میں خوش تھا کہ دوائیں بہت تھیں جن میں سے انتخاب کرنا آسان تھا۔ میں اِس لئے خوش تھا کہ میرے ہوش و حواس برقرار تھے۔ جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو میں نے چند فلکیاتی مشاہدات کیے۔

اگست کا مہینہ ختم ہوتے ہی سارس عموماً سوڈان نقل مکانی کر جاتے ہیں۔ میرے پاس موسم گرما کے باغ میں تین سارس تھے جن کے پر کٹے ہوئے تھے۔ یہ بہت خاموش اور سدھائے ہوئے لگتے تھے۔ میں جب کبھی باہر لان میں کھانا کھاتا تو یہ ہمیشہ میرے پیچھے پیچھے آ جاتے تھے۔ ان کے پر دوبارہ نکل آئے تھے اور اب یہ اڑ جانے کے قابل تھے مگر پھر بھی میرے پاس رہے، یوں لگتا تھا جیسے اب نقل مکانی کی کوئی آرزو نہیں رکھتے تھے۔

میرے باغ میں چار آہو بھی تھے جو مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ جب یہ جانور آزادی اور خوشی سے کھیلتے ہیں تو بے حد اچھے لگتے ہیں۔ یہ ادھر سے ادھر پھدکتے اور قلیلیں بھرتے نظر آتے اور میرے مالی ان سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہتے تھے کیونکہ یہ پودوں کے دشمن تھے مگر میں نے انہیں اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ یہ بھی سارسوں کی طرح مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے اور دوپہر اور رات کے کھانے پر میرے قریب آ جاتے تھے۔ یہ سات ساتھی میرے بہترین دوست بن گئے تھے۔

میں اپنی اقلیم میں کوئی خون خرابہ نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے حکم دے رکھا تھا کہ کوئی گولی نہیں

چلے گی۔ نہ کسی جانور کو مارا جائے گا...... میں دراصل ان پرندوں کو ایک مقدس پناہ گاہ فراہم کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان پرندوں اور جانوروں نے میرے گھر کو جنت بنا رکھا تھا۔ میں جب کبھی ٹہلنے نکلتا تو تیتروں کے غول میرے قریب آ جاتے تھے اور خرگوش تو میرے پاؤں پر دوڑتے پھرتے تھے۔ میں پوری کوشش کرتا تھا کہ یہ پرندے اور جانور سدھا لیے جائیں اور وہ بھی میرے دوستانہ روّیے کا بڑا مثبت جواب دیتے تھے۔ یہ تو ان بہت سے انسانوں سے بہتر تھے جو اپنے آپ کو مہذب تو کہتے ہیں مگر عملاً اس کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اب تو آہو سینکڑوں کی تعداد میں میرے گھر کی حدود میں داخل ہو جاتے تھے اور یہ اس طرح حرکات کرتے تھے جس سے مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔

میرے پاس اچھے پودے تھے، اور فوسلز بھی جو سملالیہ میں دستیاب تھے، کچھ اپنے سائز کے لحاظ سے نایاب کیڑے مکوڑے بھی تھے جن کو پہلی بار تو دیکھ کر میں ڈر جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ میرے سینے پر چڑھ آئیں گے۔ فوسلز میں سے کچھ سنگ ساق کے مجموعے پر مشتمل بہت نادر اور قیمتی تھے جو کوہ اطلس سے حاصل کیے گئے تھے۔

میں یہ پیشگوئی کر چکا تھا کہ چاند گرہن 15۔ جنوری 1805ء کی رات کو ہوگا اس لیے بہت سے پاشا اور دوسرے سرکردہ افراد میرے گھر میں جمع ہو گئے تھے تاکہ چاند گرہن دیکھ سکیں۔ مگر اس رات بدقسمتی سے موسم خراب تھا اور اس قدر بارش ہوئی، آندھی چلی کہ کوئی شے نظر نہ آتی تھی۔

بالآخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے مکّے کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے۔ اس موضوع پر میری سلطان، مولائی عبدالسلام اور اپنے دوستوں سے کئی بار بات چیت بھی ہو چکی تھی۔ ان سب نے مجھے متفقہ طور پر اس سفر پر جانے سے روکا۔ ان کا خیال تھا کہ سلطان تو خود بھی اس سفر پر کبھی نہیں گئے اور یہ کہ ان کا مذہب اس بات کو ضروری قرار نہیں دیتا کہ اسے ذاتی طور پر اختیار کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی حاجی میری جگہ یہ سفر اختیار کرے اور یوں حج بدل ادا ہو جائے گا اور مجھے وہی ثواب مل جائے گا جو مجھے ذاتی طور پر حج ادا کرنے پر ملنا تھا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود میں عزم مصمم کر چکا تھا کہ میں نے جانا ہے۔

آج جب میں نے سلطان سے اجازت طلب کی تو اس نے ازسرنو مجھے روکنے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے اس سفر کی تھکان اور خطرناک حادثات سبھی سے باخبر کیا۔ جب ساری تدابیر رائیگاں گئیں تو سلطان نے مجھے گلے لگایا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مولائی عبدالسلام سے الوداع ہونے کا اس پر بھی اثر تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ اس شہزادے کی اس وقت جو حالت تھی اس کی تصویر عمر بھر میرے دل میں رہے گی۔

سلطان نے مجھے تحفے میں ایک بے حد خوبصورت اور قیمتی خیمہ پیش کیا۔ اس میں سرخ رنگ کی لکیریں تھیں اور اس کی جھالریں ریشمی تھیں۔ مجھے بھیجنے سے قبل اس نے اسے اپنے سامنے نصب کروا کے دیکھا اور 12 فقیہانِ محترم نے اس کے اندر نماز ادا کی۔ جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ میرے لیے باعث برکت رہے اور میں آفات ارضی و سماوی سے محفوظ سفر کر سکوں۔ اس کے ساتھ پینے کے پانی کے لیے کچھ چرمی مشکیزے بھی پانی سے بھر کر رکھ دیئے گئے تھے۔ ان کی سفر میں بڑی ضرورت تھی۔

مشرق کی سمت سفر کرنے کی ایک ناکام کوشش: یہ 1805ء کا ذکر ہے کہ اُوجدہ آمد پر گاؤں کے سردار اور تمام سرکردہ افراد نے مجھے منع کیا کہ میں رک جاؤں کیونکہ انہیں اسی روز یہ خبر ملی تھی کہ الجیریا کی سلطنت میں بغاوت پھوٹ پڑی تھی اور تلمسان میں جہاں مجھے جانا تھا۔ ترکوں اور عربوں میں خونریز لڑائی ہوئی تھی۔

میں نے گاؤں کے سردار سے التماس کی کہ میرے ساتھ کوئی حفاظتی دستہ روانہ کرے۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے پاس افواج نہیں تھیں تاہم وہ کوشش ضرور کرے گا کہ میرے لیے کوئی مناسب انتظام کر دے۔

دو روز بعد گاؤں کے سردار اور اہم لوگوں نے شیخ البعانانی سے درخواست کی، جو ایک بڑے قبیلے کا سردار تھا کہ وہ مجھے تلمسان لے جائے۔ اسی افہام و تفہیم میں کئی روز گزر گئے تھے۔ باغی اوجدہ کی فصیل تک پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے گاؤں والوں پر فائر بھی کیے جس سے دو افراد کی موت واقع ہو گئی تھی۔ یوں حالات بدتر ہوتے گئے۔ ایک طرف تو زادِ راہ ختم ہو رہا تھا دوسری طرف میرے مخالفین نے سلطان کے کان بھرنے شروع کر دیئے تھے تاکہ میں اس کی نظر میں مشکوک ہو جاؤں۔ اس کا سبب میرا فض میں طویل قیام تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جو افسران میرے ساتھ تھے وہ مخبری کر رہے ہیں مگر وہ چونکہ میری بہت عزت کرتے تھے اس لیے میں ان سے اس بارے میں کوئی بات بھی نہ کر سکتا تھا میں ان کی خفیہ گفتگو کو شک کی نظر سے دیکھ سکتا تھا۔ راستے میں سفر کے دوران مجھے جو قبائل ملتے سبھی عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔ وہ مجھے غذائی اشیاء اور مویشیوں کے لیے چارہ بھی مہیا کرتے تھے۔ میں نے چھتری استعمال کرنی شروع کر دی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ میں شاہی خاندان سے ہوں۔ مجھے اب ہر کوئی سلطان کا بھائی سمجھتا تھا۔ مگر یہ

صورت حال زیادہ طویل مدت تک نہ رہ سکتی تھی۔

سنیچر، 17۔ اگست: آج مجھ پر اپنے افسروں کی پر اسرار حالت واضح ہو گئی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ہم بجائے طنجہ کے لراشے جا رہے تھے۔ مجھے اس بات پر بے حد رنج ہوا۔ تاہم میں نے سوچا کہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم دو میں سے کس مقام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس بحث و تمحیص کے بعد صبح کے چھ بجے ہم مغرب کی سمت روانہ ہوئے۔ ایک گھنٹے بعد ہم شمال و شمال مغربی سمت مڑ گئے۔ ہم اب ایک ایسے گھنے جنگل میں تھے جس میں اونچے اونچے سدا بہار بلوط کے درخت تھے جو سرخس سے گڈمڈ ہو گئے تھے۔ ہم اس کے اندر بھول بھلیوں کی مانند پھرنے کے بعد بارہ بجے اس جنگل سے باہر نکلے۔ ایک دریا عبور کر کے ہم بعد دوپہر لراشے پہنچے تھے۔

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس میں تقریباً چار سو گھر تھے۔ یہ ایک پہاڑی کی ڈھلوان پر شمال کی جانب واقع ہے۔ یہاں بسنے والوں نے دریا کے کنارے تک گھر تعمیر کر لیے ہیں۔ اس دریا کا دہانہ بڑے جہازوں کے لیے بندرگاہ کا کام دیتا ہے۔ ایسے بحری جہاز جو دو سو ٹن سے تجاوز نہ کرتے ہوں دریا میں داخل ہو سکتے ہیں لیکن پانی کے اندر ریت کے پشتے کو عبور کرنے کے لیے انہیں سامان اتارنا پڑتا ہے۔ سلطان کے حکم سے اس قصبے کے پاشا سِدی محمد سلانی نے مجھے یہاں سب سے اچھا گھر مہیا کیا۔ یہ جامع مسجد کے قریب مارکیٹ میں تھا۔

ان مراعات کے باوجود میں قمری مشاہدات نہ کر سکا تھا کیونکہ میں گھر کی چھت پر نہ چڑھ سکا تھا۔ تاہم میں نے سیارچوں کے گرہن سے اپنا طول البلد معلوم کر لیا تھا۔ یہ پیرس رصد گاہ سے "45 '21 °8 مغرب میں تھا اور عرض البلد "15 '13 °35 شمالی تھا۔ میرا مقناطیسی انحراف "15 39 °21 مغربی تھا۔ آب و ہوا بہت معتدل تھی بالکل ویسی ہی جیسی اندلس میں تھی۔

اوجدہ سے تکلیف دہ سفر کے نتیجے میں، میں بیمار پڑ گیا تھا اور دس روز تک نہ اٹھ سکا۔ میرے لوگ اور مویشی بھی بیمار سے تھے۔ مویشی تو صحیح چل بھی نہ سکتے تھے۔ تاہم صرف ایک خچر مرا تھا۔ میں سمندر میں نہایا مگر اس موقعہ پر بھی میں اپنے مشاہدات کو بھولا نہ تھا کیونکہ میں نے بہت سی سمندری اشیاء جمع کر لی تھیں۔

طرابلس سے آیا ہوا ایک جنگی جہاز یہاں کئی ماہ سے بندرگاہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ سلطان کے حکم سے اس کے خرچ پر اسے مرمت کیا گیا اور مشرق کی سمت سفر کے لیے اس کا عقبی حصے کا ایک کیبن میرے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ میں نے اس جہاز کو جا کر دیکھا، یہ طرابلس جارہا تھا اور اس طویل سفر کے لیے میرا کیبن تمام سہولتوں سے آراستہ کر دیا گیا تھا۔

اتوار، 13۔دسمبر 1805ء کا دن میری روانگی کا دن مقرر ہو چکا تھا۔ میں صبح کے وقت پاشا سے ملنے گیا اور اس کی اجازت طلب کی۔ اس نے میری بڑی عزت کی اور چاہا کہ 3 بجے تک اپنی روانگی کو مؤخر کر دوں تاکہ اس موقعہ پر وہ خود بھی موجود ہو۔ میں اس قدر مخلصانہ پیشکش کو بھلا کیسے مسترد کر سکتا تھا۔ میرا سامان جہاز پر پہنچا دیا گیا تھا اور میں مقررہ وقت پر اپنے دیگر افراد کے ہمراہ پہنچ گیا۔ میں نے جب پاشا کے بارے میں دریافت کیا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ بہت جلد وہاں پہنچنے والے ہیں۔ میں نے کشتی کا انتظار کیا جس پر پاشا نے آنا تھا۔ کشتی تو آ گئی تھی مگر پاشا نہیں آئے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں جہاز پر سوار ہو جاؤں مگر اسی لمحے دو سو سپاہیوں کے دو دستے آ گئے۔ ہمیں تین اطراف سے گھیر کر حکم دیا گیا کہ صرف میں جہاز پر سوار ہو سکوں گا میرے دوسرے افراد نہیں۔ میں نے اس اچانک کارروائی کا سبب جاننا چاہا تو جواب ملا: ''یہ سلطان کا حکم ہے''۔ میں نے پاشا سے بات کرنے کی خواہش کی تو مجھے سختی سے جواب ملا: ''جہاز میں بیٹھ جاؤ اور اکیلے روانہ ہو جاؤ''۔ اس سے مجھے سلطان اور پاشا کے عزائم کا علم ہو گیا تھا۔ مجھ سے آخری لمحے تک ہر شخص نے بے حد اچھا سلوک کیا تھا۔ میں حیران و پریشان تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ مجھے اس لمحے کیا کرنا چاہیے۔

میں شکستہ دل ہو کر کشتی پر سوار ہو گیا۔ مجھے اپنے لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ میں سفر پر روانہ تو ہو گیا تھا مگر بہت جلد سمندری سفر نے مجھے بیمار ڈال دیا تھا۔ مجھے دراصل جسمانی اور ذہنی دونوں صدموں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ میں جہاز تک کشتی میں گیا تھا اور جہاز کے کیبن میں داخل ہوتے ہی میں بستر پر لیٹ گیا تھا۔

میں اس طرح مراکش سے روانہ ہوا تھا۔ ایک روز ایسا ضرور آئے گا جب میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کر سکوں گا۔

قاہرہ۔1806ء: بہت سے سیاحوں نے قاہرہ کی گلیوں کو بہت گندا بتایا ہے جو دیکھنے میں بھی بدصورت تھیں۔ مگر میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے یورپ کے بہت کم ایسے شہر دیکھے

جہاں کی گلیاں اس قدر صاف ستھری ہوں گی جتنی قاہرہ کی تھیں۔ یہاں کی زمین بہت نرم ہے جہاں پتھر کہیں بھی نہیں اور ان گلیوں میں چلتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی پانی پر چل رہا ہے۔ اگر چند گلیاں تنگ ہیں زیادہ گلیاں وہ ہیں جو کشادہ اور کھلی ہیں۔ دراصل کھلی گلیاں بھی تنگ اس لیے نظر آتی ہیں کیونکہ ان کے اندر ہوئے فرش انہیں دیکھنے میں تنگ بنا دیتے ہیں۔ مثلاً اسکندریہ کی گلیوں میں فرش گھروں کے سامنے صرف چند انچ کے فاصلے پر ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جو اس قدر گرم ہے ایسی گلیاں غنیمت ہیں۔

قاہرہ کی گلیاں یورپ کے کئی شہروں کی گلیوں سے کسی طور بھی دیکھنے میں بدصورت نہیں ہیں۔ وہاں میں دوکانیں اور گودام بھی ہوتے ہیں اور ہر وقت لوگوں کا ان میں تانتا بندھا رہتا ہے۔ فرینکس یا یورپین کی رہائش گاہیں تجارتی مراکز سے دور تنگ گلیوں میں ہوتی ہیں شاید اس وجہ سے درج بالا رائے کا اظہار کیا گیا۔ میں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ قاہرہ میں مقیم یورپی باشندوں کے گھر ان کو زیادہ کشادہ اور کھلے محسوس نہیں ہوتے کیونکہ ان کے اپنے ملکوں کی نسبت یہاں کے حالات مختلف ہیں۔ معاشرت مختلف ہے، رسم ورواج جداگانہ ہیں۔ یہ لوگ جب باہر نکلتے ہیں تو مقامی باشندے ان کو بغور دیکھتے ہیں اور یہ یورپی باشندے کچھ ڈرے ڈرے سے رہتے ہیں۔ کیا اس عمل کے لیے عربوں پر الزام دھرا جا سکتا ہے۔ جبکہ لندن کے مہذب گورے ہو سکتا ہے یہی کچھ کر رہے ہوں وہ ہو سکتا ہے اس غریب بدیسی کو عزت کی نگاہ سے نہ دیکھتے ہوں جس کا کوٹ ان کے کوٹ سے دو انگل لمبا یا چھوٹا ہو۔

قاہرہ کا سب سے بڑا مضافاتی علاقہ بالق ہے۔ شہر دریائے نیل سے کچھ فاصلے پر ہے جبکہ بالق بندرگاہ ہے۔ اس میں کچھ اچھی عمارات ہیں اور غزا اور قدیم قاہرہ کی طرح انہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک بڑی جگہ ہے اور اس بندرگاہ پر بہت سے بحری جہاز آتے ہیں جو دریائے نیل کے کنارے تجارت کے کام آتے ہیں، اس طرح بہت سے ہاتھ مصروف ہو جاتے ہیں۔ محصولات سے کافی رقم جمع ہو جاتی ہے۔ بالق سے قاہرہ تک جانے والی سڑک بہت عمدہ ہے، اس کی مرمت اور خوبصورتی فرانسیسیوں کے ہاتھ میں ہے۔

جب ہم بالق کی تجارت کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں خیال آتا ہے کہ اسے جس طرح ہونا چاہیے تھا اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کیونکہ بالائی مصر کی بغاوت کے بعد، جہاں مملوک، ابراہیم بے اور عثمان بے بردی رہتے تھے، قاہرہ نے اندرونی افریقا کی تمام تجارت کھو دی ہے۔ باربری کے انقلابات نے مراکش، الجیریا اور یورپی مغربی دنیا میں آنے والے قافلوں کا راستہ روک دیا ہے۔

صحرائی عرب خانہ بدوش سویز کے گردو پیش میں اُن قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں، جو سعودی عرب اور جزائرِ ہند سے مال و اسباب بحیرۂ احمر لاتے ہیں۔ انگلستان کے ساتھ جنگ کی وجہ سے بحیرہ روم کے ساتھ تجارت میں تعطل آجاتا ہے۔ یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے مصر کی بیرونی تجارت میں کمی واقع ہوئی ہے۔

داخلی تجارت زیادہ چمک نہیں رہی ہے۔ مملکوں کا سارے بالائی مصر پر قبضہ ہے۔ ایلفی بے کی بحیرا کے صوبے پر حکومت ہے جبکہ صوبۂ شرقیہ میں عربوں کی بغاوت ہے۔ ڈیلٹا میں جزوی انقلابات آتے ہیں۔ المختصر یہ کہ مصر میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں۔

میں جب قاہرہ کو ان نامساعد حالات میں بھی اتنے بڑے پیمانے پر تجارت کرتے دیکھتا ہوں تو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مصر ایک عظیم ملک ہے۔ اگر حالات سازگار ہوتے اور ایک سرپرست حکومت ہوتی تو بات کہاں سے کہاں تک پہنچتی!

جدّہ سے مکہ مکرمہ تک، 1807ء: میری طبیعت کچھ سنبھلی تو میں باوجود اپنی نقاہت کے بدھ 21 جنوری کو 3 بجے بعد دوپہر مکے کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

میں درختوں کی ٹہنیوں سے بنائی گئی ایک مشین میں سفر کر رہا تھا جس میں گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور یہ ایک آرام دہ صوفے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اسے اونٹ کی پیٹھ پر لاد دیا گیا تھا۔ اسے یہ لوگ شور یہ کہتے تھے۔ یہ بہت آرام دہ تھی اور میں اپنی مرضی سے بیٹھ سکتا تھا، لیٹ سکتا تھا مگر اونٹ جب چلتا تھا تو اس کی بے ڈھنگی چال سے میں تھک گیا تھا کیونکہ کمزور تو میں پہلے ہی بہت ہو گیا تھا۔ شہر کو چھوڑنے سے قبل میرے عرب ساتھیوں نے آپس میں جھگڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ گھنٹہ بھر آپس میں لڑتے رہے۔ وہ چیخ چلا رہے تھے اور ایک دوسرے کو دم بخود کر رہے تھے۔ جب ہم شہر کی فصیل سے باہر نکلے تو نئے جھگڑوں اور چیخوں کی آوازیں آنے لگی تھیں جو مزید ایک گھنٹے تک آتی رہیں۔ پھر طوفان کے بعد جیسا سناٹا تھا۔ اونٹوں پر سامان لادا جا چکا تھا اور ہم پانچ بجے مشرقی سمت روانہ ہو گئے تھے۔ ہمیں ایک بڑے صحرائی میدان میں سے گزرنا تھا جیسے ایک دوسرے سے فاصلے پر واقع چھوٹے چھوٹے پہاڑ کاٹ رہے تھے۔ اس سے یہ منظر بے حد خوبصورت ہو گیا تھا۔

شام کے ساڑھے آٹھ بجے ہم پہاڑوں پر پہنچ گئے تھے۔ یہ بالکل بنجر اور پتھریلی چٹانوں پر مشتمل تھے جن پر کوئی سبزہ نہ اُگتا تھا۔

پرسکون ماحول میں، ہم نے چاند کو اپنے لہروں کے اوپر آسمان پر چمکتے دیکھا جس سے یہ سفر خوشگوار ہو گیا تھا۔ میرے عرب ساتھی میرے اردگرد ناچ اور گا رہے تھے۔ میری طبیعت ابھی پوری طرح نہیں سنبھلی تھی اور مجھے کچھ اچھا نہ لگ رہا تھا۔ اب سب اپنے ہی شور سے تھک کر خاموش ہو گئے تھے اور میں دو گھنٹوں میں سو گیا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو میں کمزوری محسوس کر رہا تھا اور مجھے خون کی قے بھی آئی تھی۔

میرے عرب ساتھی جب سو گئے تو ہم راستہ بھول گئے تھے۔ نصف رات کو ہمیں پتہ چلا کہ ہم تو موچا کے راستے پر جا رہے تھے۔ ہم نے اپنا رُخ شمال مشرقی سمت موڑ لیا تھا۔ اب ہم کم بلند پہاڑوں میں سے گزر رہے تھے۔ ہمیں وہ سڑک مل گئی تھی جو ہماری منزل کی طرف جاتی تھی۔ ہم صبح کے چھ بجے تک مشرق کی جانب سفر کرتے رہے اور اب ہم ایک چھوٹے سے گاؤں (جھوک) حادہ پہنچے تھے جہاں ایک نمکین پانی کا چھوٹا سا کنواں تھا۔

مجھے صحیح صحیح اندازہ نہ ہو سکا کہ ہم نے فاصلہ کتنا طے کر لیا تھا تاہم مجھے یوں لگا جیسے ہم جدّہ کے مشرق میں 24 میل کے فاصلے پر تھے۔

جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب، 23۔ جنوری 1807ء کو میں خدا کے خاص فضل و کرم سے مقدس شہر مکہ پہنچ گیا تھا۔ اس سفر میں مجھے مراکش سے روانہ ہوئے پورے پندرہ ماہ گزر چکے تھے۔

شہر میں داخل ہوتے وقت مجھے بہت سے شمالی افریقی عرب نظر آئے جو میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مٹی کی چھوٹی چھوٹی صراحیاں تھیں جن میں وہ زم زم لائے تھے۔ انہوں نے یہ پانی مجھے پیش کیا اور انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں کسی اور سے پانی لے کر نہ پیوں۔ انہوں نے مجھے گھر کی پیشکش بھی کی تھی۔ انہوں نے مجھے رازداری سے بتایا کہ میں کنوؤں کے افسر اعلیٰ کا پیش کیا ہوا پانی کبھی نہ پیوں۔

کئی دوسرے افراد نے آپس میں تکرار کی کہ میں کس کے پیش کیے ہوئے مکان میں رہائش رکھوں گا۔ یہاں آنے والے حجاج کے رہائشی مکانوں سے ان لوگوں کو بڑا مالی فائدہ پہنچتا ہے۔ جلد ہی جدہ میں میری رہائش کا انتظام کرنے والے لوگوں نے اس سارے جھگڑے کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ مکہ میں قیام کے لیے انہوں نے میری خاطر سارے انتظامات کر رکھے تھے اس لیے میں کسی اور کی پیشکش قبول نہیں کر سکتا تھا وہ مجھے اس گھر میں لے گئے جو انہوں نے میرے لیے تیار کیا تھا۔ یہ معبد کے بالکل قریب تھا اور اس گھر میں سلطان شریف

رہتا تھا۔

مکہ میں داخل ہونے والے افراد پیدل چل کر شہر میں داخل ہوتے ہیں لیکن میں چونکہ بیمار تھا اس لیے میں اونٹ پر سوار اپنے مکان تک پہنچا تھا۔

مکان کے اندر پہنچ کر میں نے وضو کیا اور اس کے بعد مجھے جلوس کی شکل میں بیت اللہ لایا گیا۔ میرے تمام ساتھی میرے ہمراہ تھے۔ ایک شخص ہماری رہنمائی کر رہا تھا جو بلند آواز سے مختلف دعائیں بھی مانگتا جاتا تھا۔ ہم سب اس کے پیچھے پیچھے ان الفاظ کو دُہرا رہے تھے۔ کمزوری کی وجہ سے مجھے دو افراد نے سہارا دے رکھا تھا۔

ہم باب السلام سے اندر داخل ہوئے۔ اسے یہ لوگ نیک شگون سمجھتے ہیں۔ اپنے جوتے اتار کر ہم اس مقدس دروازے سے مسجد الحرام میں داخل ہوئے تھے۔ یہ معبد کے شمالی کونے میں واقع ہے۔ ہم گیلری عبور کر کے کعبہ کی طرف تیز قدموں کے ساتھ بڑھے۔ ہمارے گائیڈ یا معلّم نے انگلی کے اشارے سے ان الفاظ پر زور دے کر کہا: ''شف شف، البیت اللہ الحرام''۔ (دیکھو، دیکھو اللہ کا گھر عزت والا)۔ کعبے کی عمارت چوٹی سے لے کر نیچے تک سیاہ غلاف سے ڈھکی ہوئی تھی جس کے چاروں طرف چراغ اور لالٹین روشن تھے۔ یہ لمحہ، یہ سعد گھڑی، یہ نیک ساعت، رات کی یہ خاموشی اور یہ گائیڈ جو بڑی متانت سے ایک بے حد سحر کن، لہجے میں یوں بول رہا تھا، جیسے اس پر کوئی الہامی کیفیت طاری ہو............ یہ سب مل کر ایک ایسی تصویر بنا رہے تھے جسے زمانے کا بہاؤ اور میری یادداشت اور حافظہ کبھی دھندلا نہ سکیں گے۔

ہم ایک فٹ اونچے راستے کے ذریعے صحن حرم میں داخل ہوئے جو کعبہ کے شمالی کونے پر قدرتی طور پر متصل جاتا ہے، اور معبد کے بالکل مرکز میں ہے۔ اس پر پہنچنے سے قبل ہمیں ایک جُدا قسم کی محراب میں سے گزرنا ہے جسے باب السلام کہتے ہیں، یہ بھی اسی دروازے کی طرح تھی جس میں سے ہم گزر کر آئے تھے۔ ..را کے گھر میں پہنچنے کے بعد ہم نے چند دعائیں کیں پھر حجر اسود کو بوسہ دیا جسے جبرئیلؑ لائے تھے۔ پھر گائیڈ کے پیچھے پیچھے کعبہ کا طواف کیا۔ ہم طواف بھی کرتے جاتے تھے اور دعائیں بھی پڑھتے جاتے تھے۔

کعبہ ایک چوکور عمارت ہے جس پر سیاہ غلاف تھا البتہ اس کا زمین کی جانب والا تھوڑا سا حصہ غلاف سے باہر تھا۔ حجر اسود بھی غلاف کے باہر نظر آ رہا تھا۔ شمال مغربی سمت ایک جھکاؤ کی طرف مائل چھوٹی سی دیوار ہے جو نصف کرہ کی شکل میں ہے، یہ عمارت سے جدا ہے اور اسے سنگِ اسمٰعیل کہتے ہیں۔

جو میں نے بھی ادا کی تھیں۔

ان مذہبی رسوم کی تفصیل یہ ہے:

حجاج کعبہ کے گرد سات چکر لگاتے ہیں۔ آغاز حجر اسود سے کیا جاتا ہے یا مشرقی کونے سے۔ پھر سامنے کی طرف سے گزرا جاتا ہے جس طرف دروازہ ہے۔ اب مغرب اور جنوب کی طرف سنگِ اسمٰعیل سے باہر مڑا جاتا ہے۔ جنوبی کنارے پر پہنچ کر حجاج اپنا دایاں بازو پھیلا دیتے ہیں، جب یہ لوگ اپنے ہاتھ سے زاویہ بناتے ہوئے سنگِ مرمر چھو لیتے ہیں اور پوری احتیاط ہوتی جاتی ہے کہ ان کے احرام کا نچلا حصہ کعبہ کے اس حصے کو نہ چھوئے جو غلاف سے باہر ہوتا ہے اب وہ شمال مشرقی سمت چلتے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے ہیں: ''اے خدائے بزرگ و برتر! میرے ساتھ رہنا، مجھے اس دُنیا کی اور آخرت کی اچھی چیزیں دینا''۔ جب یہ واپس مشرقی کونے پر پہنچ جاتے ہیں تو پھر ہاتھ بلند کرتے ہیں اور دعا کرتے ہوئے حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں۔ یوں پہلا چکر مکمل ہو جاتا ہے۔

دوسرے چکر کے دوران سارا عمل وہی دہرایا جاتا ہے جو پہلے چکر والا تھا۔ البتہ وہ دعائیں جو حجر اسود والے کونے سے لے کر جنوبی کونے تک پڑھی جاتی ہیں وہ تبدیل ہو جاتی ہیں۔ البتہ جنوبی کونے سے حجر اسود تک والی دعائیں پہلے چکر والی رہتی ہیں اور ساتوں چکروں میں یہی رہتی ہیں۔ روایتی قانون یہ ہے کہ آخری چکر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے لگائے جائیں میں چونکہ بیماری کی وجہ سے کمزوری محسوس کر رہا تھا اس لیے میں طواف کے دوران ان آخری چکروں میں بھی آہستہ آہستہ چلتا رہا تھا۔

آخری طواف پر اور حجر اسود کو بوسہ دینے کے بعد حجاج ایک مختصری دعا کرتے ہیں۔ اس وقت وہ خانہ کعبہ کے دروازے کے قریب کھڑے ہوتے ہیں جہاں سے یہ اس طرف جاتے ہیں جو گہوارہ سا لگتا ہے اسے مقام ابراہیم کہتے ہیں۔ یہ کعبہ اور باب السلام کے درمیان ہے۔ اب وہ زم زم کے کنویں پر جاتے ہیں۔ پانی کی بالٹیاں کھینچتے ہیں اور سیر ہو کر پانی پیتے ہیں۔ اب یہ معبد سے باہر آنے کے لیے باب الصفا استعمال کرتے ہیں پھر یہ لوگ صفا کی پہاڑی پر پہنچ جاتے ہیں۔

اس گلی کے اختتام پر ایک غلام گردش ہے جس پر تین محرابیں ستونوں پر کھڑی ہیں اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں ہیں، اس مقدس جگہ کا نام صفا ہے۔ یہاں پہنچ کر حجاج اپنے چہرے معبد کے دروازے کی سمت کر کے ایک مختصری دعا کھڑے کھڑے مانگتے ہیں۔

حجاج کا جلوس اب اہم گلی میں سے گزرتا ہوا مروئی کی پہاڑی کا ایک حصہ عبور کرآتا ہے۔ گلی کے

اختتام پر حجاج کچھ دعائیں پڑھتے ہیں۔ یہ چند سیڑھیاں چڑھ کر اپنے منہ کعبہ کی سمت کر لیتے ہیں۔ کھڑے کھڑے مختصر سی دعا پڑھتے ہیں اور سات مرتبہ ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر جاتے ہیں۔ چلتے چلتے بلند آواز سے دعائیں بھی پڑھتے جاتے ہیں..... اسے سعی کہتے ہیں۔

اسے مکمل کرنے کے بعد حجاج ان حجاموں کے پاس جاتے ہیں جو ان کے منتظر رہتے ہیں اور یہ ان حاجیوں کے سر مونڈتے ہیں۔ یہ بھی سر مونڈتے وقت دعائیں پڑھتے جاتے ہیں یوں اب مکہ پہنچنے کے بعد حج کی پہلی مذہبی رسومات اختتام کو پہنچتی ہیں۔

صبح ہونے والی تھی جب میں یہ ساری پہلی رسوم ادا کر چکا تھا۔ اب مجھے کہا گیا کہ کچھ دیر آرام کر لو۔ مگر چونکہ نماز فجر کا وقت قریب تھا۔ میں نے واپس بیت اللہ پہنچنا زیادہ بہتر سمجھا۔ میں تھک گیا تھا مگر میرا حوصلہ قائم تھا۔ میں نماز کے بعد 6 بجے گھر واپس آیا تھا۔

سلطان شریف سے ملاقات: بعد دوپہر مجھے حکم ملا کہ میں سلطان شریف سے ملاقات کے لیے تیار ہو جاؤں۔

شریف خاندان کا ایک معاون مجھے محل میں ساتھ لے جانے کے لیے آ گیا تھا۔ وہ تو محل کے اندر داخل ہو گیا تھا لیکن میں احکام کا منتظر تھا۔ کچھ دیر بعد کنویں کا افسر اعلیٰ جو پہلے سے میرا دوست تھا مجھے ملنے آیا۔ ہم زینہ چڑھ کر اوپر پہنچے اور ایک دروازے پر جا کر رک گئے۔ میرے گائیڈ نے دستک دی تو دو مسلح ملازمین نے دروازہ کھولا۔ ہم ایک تاریک گیلری میں سے گزرے۔ یہاں ہم نے اپنے جوتے اتار دیئے تھے۔ ہم ایک بہت عمدہ اور آراستہ کمرے میں داخل ہوئے جہاں سلطان شریف (جس کا نام شریف غالب تھا) ایک کھڑکی کے نزدیک بیٹھا تھا۔ چھ نوکر سلطان کے اور گرد کھڑے تھے۔ میں نے سلطان کو سلیوٹ کیا۔ مجھ سے درج ذیل سوالات پوچھے گئے تھے:

- کیا آپ عربی بول سکتے ہیں"؟
- جناب، بول سکتا ہوں۔
- "اور ترکی بھی؟"
- نہیں، ترکی میں نہیں بول سکتا۔
- "کوئی کرسچین زبان جو آپ بول سکتے ہیں؟"

۔ جی ہاں چند ایک بول سکتا ہوں۔

۔ ''آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟''

۔ حلب یا ایلپ (ایلپو،شام) سے

۔ ''کیا آپ نے وطن اس وقت چھوڑا تھا جب آپ جوان تھے''؟

۔ جناب! آپ کا اندازہ درست ہے۔

۔ ''تو اتنا عرصہ آپ کہاں رہے؟''

میں نے اپنی ساری کہانی سلطان کو سنائی۔ سلطان نے اس شخص سے، جو اُس کے بائیں طرف تھا، کہا: ''یہ شخص تو عربی بہت اچھی بول لیتا ہے، اس کا لہجہ بڑا درست ہے۔'' پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہا: ''میرے قریب آؤ''......میں قریب گیا تو مجھے بیٹھنے کا حکم ملا۔ میں بیٹھ گیا تو سلطان شریف نے اس شخص کو بھی بیٹھنے کو کہا جو سلطان کے بائیں طرف تھا۔ اب سلطان مجھ سے یوں مخاطب ہوا: ''آپ کے پاس عیسائی ممالک کے بارے میں ضرور کچھ خبریں ہوں گی۔ مجھے آخری خبر سنایئے جو آپ کے کانوں نے سنی ہے۔'' میں نے یورپ کی اصل صورت حال بیان کی۔ مجھ سے سوال کیا: ''کیا آپ فرانسیسی لکھ پڑھ سکتے ہیں''؟ میں نے جواب دیا: ''کسی حد تک''۔ سلطان جاننا چاہتا تھا کہ میں کون کون سی زبان عمدہ طریقے سے لکھ پڑھ سکتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں اطالوی اور اسپینی دونوں زبانوں پر عبور رکھتا ہوں۔ ہمارے درمیان اس گفتگو کا سلسلہ ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ میں نے آخر میں کپتان پاشا کا فرمان اور اپنا تحفہ پیش کیا اور زم زم کے افسر کے ساتھ میں اپنے گھر آ گیا تھا۔

مکے کے سلطان شریف کے والد گرامی کا نام شریف مسعد تھا جو اُس کے پیشرو تھے۔ بہت برس گزرے جب ان کے خاندان نے حجاز کو اپنے زیر نگین کیا تھا۔ مراکش میں سلطان کے انتقال پر یہی رسم باقی ہے۔ تخت و تاج کا حق دار کون ہوگا اور جانشین کسے بنایا جائے اس کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا۔

شریف غالب ایک عقلمند، ہوشیار اور چالاک، بہادر، سیاسی سوجھ بوجھ کے مالک انسان تو ہیں مگر بالکل ان پڑھ ہیں۔ جذبات سے مغلوب ہو کر فیصلے کرنے والا یہ انسان خودسر اور خود پسند بن گیا ہے۔ وہ اپنے ملک کے لوگوں، اجنبیوں اور حاجیوں کو ناراض اور رنجیدہ کرنے کا کوئی حربہ ایسا نہیں جو استعمال نہ کرتا ہو۔ وہ [illegible] کو اس قدر پسند کرتا ہے کہ جب کبھی اسے پتا چل جائے کہ وہ اپنے بے تکلف دوستوں یا وفادار

ملازمین تک سے روپیہ حاصل کر سکتا ہے تو وہ انہیں بھی معاف نہیں کرتا۔ اپنے قیام کے دوران میں نے دیکھا کہ سلطان نے جدہ کے ایک تاجر کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کیا جو اس کے بے حد پسندیدہ افراد میں سے تھا۔ اس تاجر کو سلطان کی وجہ سے ایک لاکھ فرانک کا نقصان اٹھانا پڑا تھا جو محصول تجارت پر لگا گیا تھا وہ افراد پر بھی لگا دیا گیا تھا۔ اس میں اضافہ ہوتا گیا کیونکہ سلطان ان لوگوں سے ایک ایک پیسہ چھین کر انہیں کنگال کر دینا چاہتا تھا۔ مجھے اس مقدس سرزمین پر ایک بھی ایسا فرد نہیں ملا تھا جو اسے پسند کرتا ہو۔ البتہ جس تاجر کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس نے ایک بار اس کی تعریف ضرور کی تھی۔

تجارت پر یکطرفہ محصول لگا کر وہ تاجروں کو نقصان پہنچاتا، اس کے اپنے بحری جہاز ہیں اور یہ خود بھی تجارت کرتا ہے۔ جب تک اس کے اپنے جہاز اس کام سے فارغ نہ ہو جائیں نہ کسی دوسرے جہاز پر سامانِ تجارت لادا جا سکتا ہے نہ اتارا جا سکتا ہے۔ اس کے جہاز چونکہ سب سے بڑے اور بہترین جہاز ہیں اور ان پر عملہ بہترین ہے اس لئے بحیرۂ احمر کی زیادہ تجارت پر اس کی اجارہ داری ہے۔ اس سے دوسرے تاجر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ ان کے مقدر میں بالآخر تجارت سے ہاتھ دھو کر غلامی کی سطح پر آ جانا ہو جاتا ہے۔

انگریزوں کو شریف خاندان کا بہترین دوست سمجھا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ خاندان ان کے توسط سے جزائر الہند میں چلنے والے اپنے بحری جہازوں کی مدد سے تجارت میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جہاں موقعہ ہاتھ لگ جائے یہ خاندان انگریزوں کو بھی تنگ کرنے سے نہیں باز آتا۔ گذشتہ برس ایک برطانوی بحری جہاز جو چاول سے لدا ہوا تھا جدہ کی بندرگاہ پر پہنچا۔ اس کا کپتان جب یہاں اترا تو اسے معلوم ہوا کہ چاول تو اس ملک میں بہت سستا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ چاولوں سے لدا ہوا جہاز لے کر اگلی کسی بندرگاہ پر پہنچ جائے۔ مگر شریف نے کہا کہ کپتان کو وہ تمام واجبات ادا کرنے ہوں گے جو اس نے اس صورت میں ادا کرنے تھے جب جہاز سے یہاں چاول اتار کر بیچ دیئے جاتے۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد اس انگریز کپتان کو یہ بندرگاہ چھوڑنی پڑی تا کہ وہ شریف کے ظلم سے بچ سکے جس کا رویہ قزاقوں جیسا ہو گیا تھا۔

وہابی: ایک روز وہابیوں کی فوج کا ایک حصہ حج ادا کرنے مکہ میں داخل ہوا۔ اس نے اس مقدس شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ میں نے اتفاقاً انہیں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

میں اپنی گلی میں تھا، صبح کے نو بجے تھے کہ لوگوں کا ایک ہجوم آتا دیکھا۔ مگر آپ بتا سکتے ہیں یہ کیسے لوگ تھے اور کس حالت میں تھے؟ برہنہ جسم مختصر سا کپڑا جسموں کے نچلے حصے پر موجود، البتہ چند ایسے تھے جن

کے بائیں کندھے پر ایک تولیہ تھا جو ان کے دائیں بازو کے نیچے سے گزرتا تھا۔ باقی ہر طرح سے ان کے جسم ننگے تھے۔ ان کی توڑے دار بندوقیں ان کے کندھوں پر تھیں اور بڑے بڑے خنجر ان کی پینیوں کے ساتھ لٹک رہے تھے۔

انسانوں کے اس سیلاب کو دیکھتے ہی تمام لوگ تتر بتر ہو گئے اور گلی ان کے لیے خالی کر دی تھی میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹوں گا اور میں قطعاً ڈرا ہوا نہ تھا۔ انہیں زیادہ بہتر طریقے سے دیکھنے کے لیے میں قریب ہی موجود کوڑے کے ایک ڈھیر پر چڑھ گیا تھا۔

مجھے پانچ چھ ہزار افراد پوری گلی کی ایک ایک انچ زمین پر اس قدر ایک دوسرے کے قریب نظر آئے کہ ان کے درمیان موجود کوئی فرد اپنے ہاتھ کو بھی حرکت دینا چاہے تو نہ دے سکے۔ تین چار گھوڑ سوار بارہ فٹ لمبے نیزوں سے مسلح پھر رہے تھے۔ ان کے پیچھے پندرہ بیس افراد اور بھی نظر آئے جو گھوڑوں، اونٹوں اور سانڈنیوں پر سوار تھے اور یہ بھی نیزوں سے مسلح تھے۔ مگر اس گشت کے دوران ان کے پاس نہ پرچم تھے، نہ ڈھول نہ کوئی دوسرا آلۂ موسیقی یا ملٹری ٹرانی۔ کچھ نے ایک خاص روحانی کیفیت سے سرشار ہو کر خوشی کا اظہار کیا دوسرے اونچی آواز میں دعائیں کر رہے تھے۔

وہ اسی طرح گشت کرتے شہر کے بالائی حصے کی طرف چلے گئے تھے جہاں انہوں نے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل اختیار کر لی تھی تا کہ باب السلام کے راستے معبد میں داخل ہو سکیں۔

بہت سے بچے جن کا تعلق اس شہر سے تھا اور جو عموماً اجنبیوں کے لیے گائیڈ کی خدمات سرانجام دیتے تھے، انہیں ملنے کے لیے آ گئے تھے۔ انہوں نے باری باری اپنی خدمات ان گروہوں کو پیش کیں تا کہ مقدس مذہبی رسوم کی ادائیگی میں یہ ان کی مدد کر سکیں۔ ان مہربان گائیڈز میں جوان مرد ایک بھی نہ تھا۔ پہلے گروہ نے کعبہ کا طواف شروع کر دیا تھا۔ یہ حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ دوسرے جو انتظار میں تھے بہت بے چین نظر آتے تھے۔ یہ دوڑ کر گئے اور پہلے گروہ کے ساتھ جا کر شامل ہو گئے۔ ان کی تعداد اب اس قدر بڑھ گئی تھی کہ چھوٹے چھوٹے معصوم گائیڈز کی دعاؤں کی آواز اب ان تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ سبھی کی خواہش تھی کہ حجر اسود کو بوسہ دے سکیں۔ بہت سوں نے اپنی چھڑیوں سمیت اپنا راستہ بنا لیا تھا۔ ان کے افسروں نے کوشش کی کہ انہیں منظم کر لیں مگر بے سود۔ افسروں کی بات سننے کو کوئی تیار نہ تھا نہ کوئی منطق اور دلیل اس لمحے انہیں مطمئن کر سکتی تھی۔

رفتہ رفتہ ان افراد کا دائرہ بڑھ رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتے کے گرد اڑ رہی ہوں۔ اسی صورت میں یہ لوگ خانہ کعبہ کے گرد طواف کر رہے تھے۔ انہوں نے اس دھکم پیل میں بہت سے لیمپ توڑ دیئے تھے جو ان کی بندوقوں سے ٹوٹے تھے جو انہوں نے طواف کے دوران بھی کندھوں پر اٹھا رکھی تھیں۔

خدا کے گھر کے گرد کئی مذہبی رسوم کی ادائیگی کے بعد ہر گروہ نے معجزاتی کنویں پر جا کر زم زم پیا۔ یہاں بھی ویسا ہی مظاہرہ کرنے پر ان لوگوں نے بہت جلد زم زم کے کنویں کی رسیاں، بالٹیاں اور چرخیاں توڑ دی تھیں۔ افسر کنواں اور دیگر عملے کے افراد اپنی اپنی جگہ سے ہٹ گئے تھے۔ اس وقت تو ان وہابیوں کا اس کنویں پر قبضہ تھا۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے۔ انہوں نے ایک زنجیر بنائی تھی تاکہ تہ تک اتر جائیں اور جس طرح سے بھی ہو پانی نکال لائیں۔

زم زم کے کنویں پر پیسوں کی ضرورت تھی، خانہ خدا سخاوت و دریا دلی کے اظہار کا طالب تھا۔ گائیڈز کو اجرت چاہیے تھی جس کا وہ مطالبہ کر رہے تھے مگر ان وہابیوں میں سے اکثر اپنے ساتھ کوئی پیسہ ٹکہ نہیں لائے تھے۔ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے وہ بہت ہی بیکار قسم کے بارود کے بیس تیس دانے، سیسے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یا کافی کے چند دانے دینے پر آمادہ ہوئے تھے۔

جب یہ مذہبی رسوم ادا ہو گئیں تو انہوں نے اپنے سر منڈوانے شروع کر دیئے تھے کیونکہ ان سب کے سروں پر ایک ایک انچ لمبے بال تھے۔ یہ کارروائی گلی میں ہو رہی تھی اور انہوں نے حجاموں سے بھی وہی سلوک کیا جو اپنے گائیڈز کے ساتھ کر چکے تھے۔

ان وہابیوں کا تعلق ایک مصلحین کے اہم مقام درعیہ سے تھا اور ان کی رنگت تانبے جیسی تھی۔ یہ گُتھے ہوئے جسم کے مضبوط اور پست قد ہوتے ہیں۔ میں نے بطور خاص ان کے سروں کی طرف دیکھا تو وہ مجھے بہت خوبصورت دکھائی دیئے جن کا مقابلہ اپالو، اینٹینس یا کسی رومی شمشیر زن کے سر سے کیا جا سکتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بڑی چمک ہوتی ہے۔ ناک اور دہن خوبصورت، دانت موتیوں کی لڑیاں اور خد و خال بولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

جب ہمارے سامنے برہنہ جسموں والے ایک ہجوم پر مشتمل لوگ آتے ہیں جن کو دیکھ کر کسی تہذیب و تمدن کا تصور نہیں ہوتا، جو زبان بھی وہ بولتے ہوں جو بربریت کی مظہر ہو تو ایسی تصویر تصوراتی طور پر خوفزدہ کر

دیتی ہے اور مایوس کرتی ہے لیکن اگر اس اولین تاثر پر قابو پالیا جائے تو ان ہی افراد کے اندر ہمیں کچھ قابل تعریف خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ اس وقت تک، کسی سے اس کا مال ومتاع نہیں لوٹتے جب تک انہیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ یہ دشمن کا یا کسی کافر کا ہے۔ یہ جب کوئی شے خریدتے ہیں تو اس کی قیمت ادا کرتے ہیں اور ہر اس خدمت کا معاوضہ دیتے ہیں جو ان کے لیے کی جائے یہ اپنے سرداروں اور افسروں کا احترام کرتے ہیں اور ہر تھکا دینے والا کام بھی خاموشی کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔ انہیں دنیا کے دوسرے کونے میں لے جانے کی کوشش کی جائے تو انکار نہیں کریں گے۔ مختصر یہ کہ اگر ان لوگوں کو مناسب تعلیم مل جائے تو یہ ایسے افراد ہیں جو نہایت مہذب ثابت ہوں گے۔

میں گھر پہنچا تو پتا چلا کہ وہابیوں کے نئے جھتے ابھی تک مسلسل پہنچ رہے تھے تاکہ حج کا فریضہ ادا کر سکیں لیکن سلطان شریف کا اس سارے عرصے میں کیا کردار تھا؟ وہ ان وہابیوں کی قوت سے اس قدر خائف تھا کہ چھپ کیا تھا کہ کہیں اس پر وہ حملہ نہ کر دیں۔ قلعوں میں کھانے پینے کی اشیاء کا ذخیرہ کرلیا گیا تھا اور اپنے دفاع کی تیاری کر لی گئی تھی۔ ان کی چوکیوں پر عرب ترک، مغربی اور حبشی سپاہی تعینات تھے۔ مجھے قلعوں پر بہت سے گارڈ اور سنتری نظر آئے۔ فصیل کے بند دروازے دکھائی دیئے تھے۔ حملے کی صورت میں دفاع کے لیے سارے انتظامات کر لیے گئے تھے مگر وہابیوں کی طرف سے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا اور شریف نے گفت وشنید کے ذریعے ان تمام احتیاطی تدابیر کو بیکار بنا دیا تھا۔

کوہ عرفات کی طرف روانگی: 17۔ فروری منگل کا دن کوہ عرفات پر جانے کا دن طے ہوا تھا۔ میں ایک روز پہلے ہی بعد دوپہر چل پڑا تھا، میرے سفر کے لیے اونٹ پر آرام دہ صوفہ نما شوریہ ڈال دی گئی تھی۔

میں دو بجے حبشی اور مغربی محافظین کی بیرکوں کے قریب سے گزرا جو شہر کے بالکل شمال میں واقع ہیں۔ اس کے بعد مشرق کی طرف مڑنے پر مجھے مضافاتی علاقے میں شریف کا گھر نظر آیا اور پھر جلدی ہی میری نگاہ جبل نور یا روشنی کے پہاڑ پر پڑی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں جبریلؑ انبیاء کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا پہلا پارہ وحی کی شکل میں لائے تھے۔ یہ پہاڑ مصری کی ڈلی کی شکل کا ہے اور اپنے اردگرد کے پہاڑوں سے اونچا ہے۔ کسی زمانے میں اس کی چوٹی پر ایک عبادت گاہ تھی جسے دیکھنے حجاج جایا کرتے تھے مگر وہابیوں نے اسے گرادیا ہے اور پہاڑ کے دامن میں ایک گارڈ بٹھا دیا ہے تاکہ وہ حاجیوں کو اوپر جانے سے روک سکے

اس وہابی تحریک کے بانی محمد ابن عبدالوہاب نے اسے توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی سے تعبیر کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ چٹان کاٹ کر زینہ بنایا گیا ہے تاکہ اوپر چڑھنے میں آسانی ہو۔ میں نے اسے دور سے ہی دیکھا تھا لیکن میں نے اس کا خاکہ بنالیا تھا۔

تین بجے کے قریب سڑک جب مشرق کو مڑ کر پھر جنوب مشرقی سمت چلی گئی تو مجھے تازہ پانی کا ایک چشمہ نظر آیا جہاں ایک حوض بنا ہوا تھا۔ جلد ہی میں منٰی میں داخل ہو چکا تھا جہاں جو شے سب سے پہلے مجھے نظر آئی وہ ایک چشمہ تھا جس کے سامنے ایک شاندار عمارت ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اسے شیطان نے تعمیر کیا تھا۔

منٰی کا قصبہ جسے کچھ لوگ مُنیٰ بھی کہتے ہیں اس میں صرف ایک گلی ہے مگر یہ اتنی لمبی ہے کہ اسے عبور کرنے میں مجھے پورے بیس منٹ لگ گئے تھے۔ اس میں کچھ گھر بڑے شاندار تھے مگر زیادہ تر گھر گرے ہوئے تھے جن کی چھتیں غائب تھیں۔ پانچ پانچ فٹ بلند پتھر کی تعمیر شدہ رہائش گاہیں تھیں جو حجاج کو ٹھہرنے کے لیے دی گئی تھیں۔

چار بجے کے قریب میں نے منٰی کی مشرقی جانب اپنا خیمہ ایک میدان میں نصب کرالیا تھا۔ مجھے ایک مسجد نظر آئی جس کے گرد قلعہ کی طرح فصیل تھی۔

یہ شہر ایک وادی کے اندر واقع ہے۔ دونوں طرف چٹیل پہاڑ ہیں۔ سڑکوں پر اونٹوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ لوگ یا تو پیدل چل رہے تھے یا گھوڑوں پر سوار تھے اور اونٹوں پر اسی طرح کے آرام دہ صوفوں کی مانند گہوارے سے رکھے ہوئے تھے جس طرح کے ایک میں، میں سوار تھا۔

کچھ وہابی سانڈنیوں پر سوار تھے جو مجھے پہلی بار جبلِ نور کے دامن میں نظر آئی تھیں۔ یہ بھی مسجد کے دروازے پر آ کر رک گئے تھے۔ ان کے بعد بے شمار وہابیوں کا ہجوم آ رہا تھا اور یہ میدان بہت جلد ان سے بھر گیا تھا۔ غروب آفتاب کے وقت ان کا سلطان سعود السعود بھی پہنچ گیا تھا۔ جس کے خیمے میرے خیمے سے کچھ دور پہاڑ کے دامن میں نصب کردیئے گئے تھے۔

ایک قافلہ طرابلس سے، دوسرا یمن سے ایک سوڈان یا ابی سینیا سے حبشی حجاج کی ایک بڑی تعداد، سوئز سے آنے والے سینکڑوں ترک اور لاتعداد مغربی جو بحری راستے سے آئے تھے، بصرہ کا ایک قافلہ، دوسرے قافلے مشرق سے، بالائی اور نچلے مصر سے عرب معہ اس ملک کے لوگ جس میں ہم تھے اور بہت سے

وہابی سب کے سب یہاں جمع تھے اور سب نے ایک دوسرے کے قریب ڈیرے لگا لئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس چھوٹے سے میدان میں یہ ایک دوسرے پر جمع ہو گئے تھے۔ حجاج کو یہاں ٹھہرنا پڑتا ہے کیونکہ روایت یہ ہے کہ پیغمبر خدا، صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی عرفات پر تشریف لے جاتے یہاں ضرور قیام فرماتے تھے۔

دمشق سے آنے والا قافلہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ تاہم یہ فوجی دستوں کے ہمراہ روانہ ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ توپ خانہ بھی تھا اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد بھی ساتھ تھی کیونکہ یہ وہ قالین لا رہے تھے جو ہر سال قسطنطنیہ سے مدینہ طیبہ میں آنحضورؐ کے روضۂ مبارک پر بھیجا جاتا تھا۔ اس تحفے کے بارے میں بھی وہابیوں کا خیال تھا کہ یہ گناہ ہے۔ یہ قافلہ مدینے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ وہابی وہاں جا کر قافلے سے ملے۔ انہوں نے قائم مقام امیر الحج، دمشق کے پاشا سے کہا کہ وہ قالین وصول نہیں کر سکتے جو مدینے کے لیے لایا گیا تھا۔ تاہم اگر وہ چاہتا ہے کہ مکے تک سفر جاری رکھ سکے تو سب سے پہلے تو اپنے فوجی دستے واپس کر دے، توپ خانہ واپس چلا جائے، عورتیں واپس ہو جائیں تا کہ حاجیوں کی شکل میں انہیں مکہ تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے۔ پاشا کو یہ شرائط قبول نہیں تھیں اس لیے اس سے یہی کہا گیا کہ وہ ان ہی قدموں پر لوٹ جائے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہابیوں نے اس سے کافی بھاری رقم کا مطالبہ کر دیا تھا لیکن کچھ دوسرے لوگوں کی زبانی پتہ چلا کہ اس بات میں کوئی حقیقت نہ تھی۔

آج منگل، 17۔ فروری 1807ء (9۔ ذی الحجہ) کا دن تھا، صبح کے چھ بجے چکے تھے۔ ہم سب جنوب مشرق کی سمت چل پڑے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ہمیں شریف کا گھر نظر آیا۔ ہم سات بجے مزدلفہ پہنچ گئے تھے۔ ایک چھوٹی سی وادی میں ایک چھوٹی سی عبادت گاہ تھی جس کا ایک ہی اونچا سا مینار تھا۔ یہاں سے روانہ ہونے کے بعد ہم پہاڑوں کے درمیان واقع ایک تنگ راستے سے گزرے اور دوسری وادی میں سے گزرتے ہوئے جنوب مشرق کو چلے گئے تھے جو کوہ عرفات کے دامن میں تھی۔ ہم یہاں نو بجے پہنچے تھے۔

کوہ عرفات مسلمانوں کے حج کی ادائیگی کے دوران ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں حجاج کا ایک ہجوم نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کا تعلق دنیا کی مختلف قوموں سے ہوتا ہے، یہ مختلف رنگ و نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہزاروں خطرناک راستوں سے گزر کر دور دراز ممالک سے یہ سب یہاں پہنچتے ہیں۔ سرکیشیائی باشندہ ایتھوپیا یا گنی کے حبشی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ انڈین اور فارسی، باربری اور مراکشیوں کو گلے لگاتے

ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے ہیں یا ایک ہی خاندان کے ایسے افراد جنہیں مذہب کے مضبوط رشتے نے اکٹھا کر دیا ہو۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ ایک ہی مشترک زبان بولتے ہیں، عربی۔ دنیا کا کوئی اور مذہب ایسا منظر پیش نہیں کرتا جو اس قدر سادہ، متاثر کن اور شاندار ہو۔ اے اس دنیا کے فلسفیو مجھ، علی بے العباسی کو اجازت دو کہ میں اپنے مذہب کا دفاع کر سکوں (اور مخلوق کے وجود کی ضرورت کو) جس طرح کوئی روحانی چیزوں کا مادی چیزوں سے دفاع کرتا ہے، بھری مجلس کو خالی جگہ سے۔ (یہاں، جیسا کہ میں نے اپنے مراکش کے سفر کے حالات میں بیان کیا تھا، انسان اور ذاتِ باری تعالیٰ کے درمیان کوئی وسیلہ یا واسطہ نہیں ہے۔ تمام انسان اپنے خالق کی نظر میں مساوی ہیں۔ ہر ایک کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ اصل اہمیت اس کے عمل کو حاصل ہے، خدا نے اسی کے مطابق فیصلہ کرنا ہے اور کوئی طاقت اس کے عدل و انصاف کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اچھائی اور نیکی کی کس قدر حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور گناہ اور برائی کو کس طرح دبا دیا گیا ہے۔ مگر کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ اس قدر فوائد کے باوجود ہم جان کولون کے مقلدین سے بہتر نہ بن سکے)

عرفات ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جو چقماق کے پتھروں سے تشکیل ہوا ہے۔ یہ بھی اپنے اردگرد کے پہاڑوں کی مانند ہے۔ یہ 150 فٹ بلند ہے اور یہ جنوب مشرق میں ایک زیادہ بلند پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ یہ ایک لیگ کے 3/4 قطر کے برابر میدان میں کھڑا ہے اور اسے چٹیل پہاڑوں نے گھیرا ہوا ہے۔

اس کے گرد ایک فصیل ہے اس پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں استعمال ہوتی ہیں جن میں سے کچھ تو چٹان کاٹ کر بنائی گئی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جن کو معماروں نے بنایا ہے۔ اس کی چوٹی پر ایک عبادت گاہ ہے جسے وہابیوں نے گرا دیا ہے۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاؤں کیونکہ جو لوگ میرے مسلک سے تعلق رکھتے ہیں یعنی مالکی ہیں ان کے لیے اوپر جانا منع ہے اور یہ ہدایات ہمیں حضرت امام مالک سے ملی ہیں جن کے ہم پیروکار ہیں۔ اسی لیے ہم نے ابھی نصف راستہ ہی طے کیا تھا کہ ہمیں روک دیا گیا تھا۔ پہاڑ کے دامن میں ایک چبوترہ بنا ہوا ہے جو اسی مقصد کے لیے ہے، جسے مسجد رحم کہتے ہیں یہاں نماز ادا کی جا سکتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ آنحضورؐ یہاں نماز ادا کیا کرتے تھے۔

پہاڑ کے نزدیک ہی 14 بڑے بڑے پانی کے حوض ہیں جن کی مرمت سلطان سعود نے کرائی ہے۔ یہ بے حد عمدہ پانی مہیا کرتے ہیں، جو پینے کے لیے اور حاجیوں کے غسل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس پہاڑ کے جنوب مغرب میں شریف کا گھر ہے۔ شمال مغربی سمت ایک دوسرا پلیٹ فارم ہے جو نمازوں کی ادائیگی

کے لیے استعمال ہوتا ہے یہ پلیٹ فارم نے ایک لیگ کے 1/4 فاصلے پر ہے۔ اسے جامع ابراہیم یا مسجد ابراہیم کہتے ہیں۔

یہ اسی کوہ عرفات پر ہوا کہ بنی نوع انسان کے جدِ امجد حضرت آدمؑ طویل جدائی کے بعد حضرت حوا سے یہاں دوبارہ ملے تھے۔ اس کا یہ نام بھی اسے اسی لیے دیا گیا: کوہِ بخشش یا کوہ معافی کہا جاتا ہے کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر جو عبادت گاہ ہے اسے خود آدمؑ نے تعمیر کیا تھا۔

اس مذہبی رسم کا تقاضا ہے کہ نماز عصر کی ادائیگی کے بعد جو ہم نے اپنے خیموں میں پڑھی تھی، ہمیں کوہ عرفات کے دامن میں آ جانا چاہیے جہاں ہمیں غروب آفتاب کا انتظار ہو۔ وہابیوں کے خیمے کیونکہ فاصلے پر تھے اس لیے انہوں نے سلطان سعود اور اپنے دوسرے سردار ابونوقطہ کی سربراہی میں یہاں پہنچنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ 45 ہزار افراد میرے قریب سے گزر رہے ہیں۔ تقریباً یہ سارے لوگ اونٹوں اور سانڈنیوں پر سوار تھے۔ ایک ہزار اونٹوں پر پانی خیمے، سوختنی لکڑی اور اونٹوں کے لیے خشک گھاس لدی ہوئی تھی۔ دو سو افراد گھوڑوں پر سوار تھے جنہوں نے مختلف رنگوں اور قسموں کے پرچم اٹھا رکھے تھے۔ رسالے کے یہ سپاہی ابونوقطہ کے تھے۔ اونٹ آٹھ دس رنگوں کے تھے۔ ہجوم میں شامل لوگ جو برہنہ جسم تھے، اسی ترتیب کے ساتھ قدم اٹھا رہے تھے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ سلطان اور دوسرے سردار میں فرق کر سکتا کیونکہ ان کا لباس بھی دوسروں جیسا تھا۔ البتہ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک لمبی ڈاڑھی والا معمر شخص جس کے آگے آگے شاہی پرچم تھا، یہ سلطان سعود تھا۔ یہ پرچم سبز تھا جس پر بڑے بڑے سفید حروف میں ''لا الہ الا اللہ'' لکھا ہوا تھا۔

میں نے سلطان سعود کے بیٹوں میں سے ایک کو پہچان لیا تھا جو سات آٹھ برس کا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال تھے۔ وہ بھی دوسروں کی طرح سانولا تھا اور اس نے ایک لمبی سی سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ یہ ایک اعلیٰ نسل کے سفید گھوڑے پر سوار تھا اس کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ بھی تھا۔

بہت جلد کوہ عرفات اور آس پاس کے علاقے میں وہابیوں کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ قافلے اور فرداً فرداً حجاج بعد میں آنے شروع ہوئے تھے۔ میں چلتے چلتے وہابیوں کے اس ہجوم کے مرکز میں پہنچ گیا تھا جہاں سے میں سلطان کو بہت قریب سے دیکھ سکتا تھا (ان میں سے بہت سے لوگوں نے، جن سے میں نے بات چیت کی، مجھے یقین دلایا کہ یہ ناممکن تھا کیونکہ ایسی ہی ایک موت بدقسمت عبدالعزیز (سعودی امیر دو

(1765-1803) کو اس وقت آئی تھی جب اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ اسی لیے سعود نے اپنے محافظین کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔

جن وہابیوں سے میری گفتگو ہوئی مجھے وہ بہت معقول اور معتدل مزاج کے نظر آئے اور ان کے بارے میں زیادہ معلومات، جو میں نے فراہم کی ہیں ان ہی کی زبانی مجھ تک پہنچی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں حجاج جونہی ان کا نام سنتے ہیں، کانپنے لگتے تھے، خود ان کا نام لیتے تو زیر لب۔ ان سے لوگ دور بھاگتے تھے اور ان سے بات کرنے سے کتراتے تھے۔

سُلطان شریف نے سالانہ رسم کے مطابق اپنی فوج میں سے کچھ حصے پر مشتمل توپ خانے کے سپاہی بھیجے تھے۔ یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ وہ خود بھی آئے گا لیکن مجھے وہ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

رواج کے مطابق شریف خاندان کا امام ہر سال اس پہاڑ پر ضرور آ کر وعظ کرتا تھا۔ آج جو آیا تھا اسے سعود نے واپس بھیج دیا تھا اور اس کی جگہ اس کے ایک اپنے امام نے وعظ کیا۔ مجھے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی کیونکہ میں اس سے بہت دور بیٹھا تھا۔ جب وعظ ختم ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہابی خوش تھے اور وہ رو رہے تھے۔

میں اگر چاہتا تو سلطان سعود کو اپنا تعارف کرا سکتا تھا، اور یہ میری آرزو بھی تھی تا کہ میں اسے اچھی طرح جان جاؤں۔ لیکن سلطان شریف نے کسی سیاسی مصلحت کے تحت مجھے اپنا گرویدہ بنانے کی کوشش کی تھی اس لیے میں نے سلطان سعود کو ملنے سے گریز کیا۔

ہم نے کوہ عرفات پر غروب آفتاب کا انتظار کیا۔ جونہی سورج چھپا ہر طرف سے شور و غل کی آواز آنے لگی تھی۔ ذرا تصور تو کریں جہاں اسّی ہزار مرد اور دو ہزار خواتین جمع ہوں، جہاں چھوٹے بچوں کی تعداد بھی ایک ہزار سے کم نہ ہو، ساٹھ ستر ہزار اونٹ ہوں، بیشمار گدھے ہوں، گھوڑے ہوں جو رات کے وقت ایک تنگ سی وادی کے راستے پر چل پڑتے ہوں، مذہبی رسم کے مطابق ایک کے پیچھے دوسرا قدم اٹھاتا جا رہا ہو، ریت کا بادل چھا گیا ہو، نیزے، برچھیاں، بندوقیں اور تلواریں شمار کرنے کی کوشش ناکام ہو جائے...... مختصر یہ کہ راستہ بنانے کے لیے، اس ہجوم میں سے، بڑی جرأت رندانہ کا کام ہو۔ ہم ایک دھکم پیل میں ڈیڑھ گھنٹے میں مزدلفہ پہنچ گئے تھے۔ صبح یہاں پہنچنے میں ہمیں دو گھنٹے لگے تھے۔ یہ مشق اس لیے ضروری تھی کیونکہ حکم یہ تھا کہ مغرب کی نماز کوئی بھی عرفات میں ادا نہیں کرے گا بلکہ یہ نماز مزدلفہ میں پڑھی جائے گی۔ عشاء کی نماز کی ادائیگی مزدلفہ میں ضروری تھی۔ یہ نمازیں ہر گروپ یا خاندان ذاتی طور پر ادا کرتا ہے۔ یہاں آمد کے فوراً بعد ہم نے خیمے

نصب کرنے کے بجائے نمازیں ادا کرنی ضروری سمجھیں۔ ہم بہت خوش تھے اور کوہ عرفات پر مذہبی رسوم کی ادائیگی پر ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کر رہے تھے۔

منیٰ کو واپسی: اگلے روز ہم سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ ہم صبح کے پانچ بجے منیٰ میں جا کر پڑاؤ کرنے کے لیے چل پڑے تھے۔

ہم منیٰ میں پہنچ کر سیدھے شیطان کو کنکریاں مارنے چلے گئے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں سات سات کنکریاں تھیں جو ہم نے مزدلفہ میں جمع کر لی تھیں۔ مالکی، میری طرح، ایک ایک کر کے کنکری مارتے ہیں۔ ہر کنکری مارنے کے بعد یہ الفاظ زبان سے ادا کیے جاتے ہیں: ''بسم اللہ، اللہ اکبر'' چونکہ شیطان اپنا گھر ایک بہت تنگ جگہ بنانے کا بُغض رکھتا تھا، جو 34 فٹ سے زیادہ چوڑا نہ ہو، اس کا کچھ عرصہ چٹانوں پر بھی مشتمل ہو۔ اسی لیے ہمیں اوپر چڑھ کر کنکریاں مارنے میں پریشانی ہوتی تھی۔ تمام حجاج یہاں پہنچتے ہی چونکہ یہ مذہبی رسم ادا کرنا چاہتے ہیں اس لیے دھکے پہ دھکا لگ رہا تھا۔ مجھے جلد ہی اپنے لوگوں کی مدد سے کامیابی تو حاصل ہو گئی تھی مگر میری بائیں ٹانگ میں دو زخم آئے تھے۔ اس کے بعد میں اپنے خیمے میں چلا گیا تھا تاکہ کچھ تھکن ہو تو دور کر سکوں۔ وہابیوں نے بھی آ کر کنکریاں ماریں کیونکہ آنحضورؐ ایسا کیا کرتے تھے۔ ہم نے اسی روز قربانی بھی دے دی تھی۔

اس قدر کثیر تعداد میں موجود لوگوں میں، جن کا تعلق مختلف قوموں سے تھا نظم وضبط کی موجودگی قابل تحسین تھی۔ دو ہزار خواتین جوان کے درمیان موجود تھیں۔ ان سے ذرہ بھر بدنظمی پیدا نہیں ہوئی۔ چالیس پچاس ہزار بندوقیں تھیں جن میں سے صرف ایک چلی تھی۔ یہ میرے قریب ہوا۔ جس شخص نے فائر کیا تھا، سردار دوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس سے سختی کے ساتھ پوچھا: ''تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا ہم یہاں جنگ لڑنے آئے ہیں؟''

صبح کے وقت میں راستے میں سعود کے بیٹے سے ملا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے پیچھے پیچھے بہت سی سانڈنیاں تھیں، وہ اسی وقت منیٰ پہنچا تھا جس وقت میں آیا تھا۔ میرے قریب سے گزرتے وقت اس نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''آ جاؤ بچو، آؤ ہم بھی پہنچیں''۔ پھر بائیں طرف مڑتے ہوئے اس نے گھوڑے کو ایڑی لگائی، اس کے ساتھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ اب وہ اپنے والد کے خیمے کے پاس پہنچ گیا تھا، جو پہاڑ کے دامن میں پہلے کی طرح نصب کیا گیا تھا۔ میرے خیمے شریف کے دستوں کے بالمقابل نصب

ہے۔

میں 19 تاریخ کو جمعرات کے روز صبح جب اٹھا تاکہ نماز فجر ادا کرسکوں تو میں نے دیکھا کہ میرا ڈیسک، کتابیں، کاغذ اور کچھ کپڑے کوئی چرا کر لے گیا ہے۔ میرے رائٹنگ ڈیسک کے اندر میرا ساعت نُما، کچھ جواہرات میری مُہر اور کچھ اجرام فلکی کی مشاہداتی رپوٹیں اور تصویریں تھیں۔

میرے نوکروں نے ہر طرف بہت تلاش کیا، انہیں اس چوری کے نتائج سے بڑا ڈر لگ رہا تھا کیونکہ انہوں نے میری خواہش کے مطابق گارڈ کا انتظام نہیں کیا تھا۔ لیکن چونکہ پچھلے چند روز کی تھکن زیادہ تھی اور ترک اور مغربی گارڈ میرے خیموں کے بہت قریب تھے اس لیے انہیں آرام سے سلا دیا گیا تھا۔

نماز فجر کے بعد میرے تمام لوگ میرے گرد جمع ہو گئے تھے۔ دن کی روشنی ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ تمام کاغذات پہاڑ پر بکھرے پڑے ہیں۔ وہ دوڑ کر وہاں پہنچے جہاں میرا رائٹنگ ڈیسک کھلا ہوا تھا۔ تالا کسی نے توڑ دیا تھا اور کاغذات، کتابیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں ساعت نما، جواہرات اور لوگارتھم کے جدول، جنہیں مجلد ہونے کی شکل میں دیکھ کر چوروں نے اندھیرے میں قرآن سمجھا، غائب تھے۔

مدینہ طیّبہ پہنچنے کی ناکام کوشش: مجھے مدینے جانے کی بڑی آرزو تھی تاکہ وہاں روضۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرسکوں حالانکہ وہابیوں کا عقیدہ کچھ اور تھا۔ کام مشکل اور پُر خطر تھا مگر میں بہت سے ترک اور عرب حجاج کو اپنے ساتھ اس سفر پر لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

چونکہ کپتان کے اہل خانہ یانبو میں تھے جہاں پورے عملے نے کئی روز ٹھہرنا تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم آٹھ نو دن میں لوٹ آئیں گے، جس پر وہ رضامند ہو گیا تھا۔

میں نے فوراً چند سانڈنیاں منگوائیں تاکہ جتنی جلدی ہو سکے اس سفر پر روانہ ہو سکیں مگر باوجود کوشش کے اگلی شام سے پہلے روانہ ہونا ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنے ساتھ صرف ایک چھوٹا صندوق رکھا جس میں میرے آلات تھے۔ کُل تین ملازمین میرے ہمراہ تھے۔ میں نے تمام ملازمین کو اپنے سامان کے ساتھ جہاز کے اندر چھوڑ دیا تھا۔

ہمیں سفر پر روانہ ہوئے ابھی صرف دو گھنٹے گزرے تھے کہ پہاڑوں کی طرف سے آتے ہوئے دو وہابیوں نے میرے اونٹوں کو روک کر مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جا رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں مدینے جا رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میں اپنا سفر جاری نہ رکھوں اور واپس چلا جاؤں۔ پھر ایک سردار نے، دو افسروں

کے ساتھ جو اونٹوں پر سوار تھے، مجھ سے از سر نو سوالات کیے۔ سردار نے سمجھا میں ترک ہوں اس لیے اس نے مجھے قتل کر دینے کی دھمکی دی۔ میں نے صبر و تحمل اور نرمی سے اس کے سوالات کے جواب دیئے۔ میرے جوابات کی تصدیق میرے نوکروں نے بھی کی۔ مجھے خیال آیا کہ جدہ میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ مکے سے جانے والے تمام ترکوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے جو رقم میرے پاس تھی دے دینے کو کہا۔ میری جیب میں جو اسپینی کرنسی تھی میں نے نکال کر انہیں دے دی۔ وہ مزید کا مطالبہ کر رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس اور کچھ نہ تھا وہ چاہیں تو میری جامہ تلاشی لے لیں۔ انہوں نے کہا کہ انہیں یہ شک ہے کہ میں نے مزید کرنسی اپنی پیٹی میں چھپا رکھی ہے (مشرق میں لوگ اس طرح کرتے ہیں) میں نے کہا ان کا شک بے بنیاد ہے۔ وہ بضد تھے اور میں نے تنگ آ کر اپنا چغہ اتار کر زمین پر پھینک دیا تھا اور ان کی تسلی کے لیے اپنا لباس اتارنے پر تیار ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا۔ ان کی نظر اچانک میری کلائی کی گھڑی کی زنجیر پر آ کر ٹک گئی تھی۔ انہوں نے زبردستی یہ اتروالی تھی۔ مجھے لوٹ لینے کے بعد انہوں نے اجازت دے دی تھی کہ ہم اپنا سفر جاری رکھ سکتے تھے مگر جلدی ہی انہوں نے اونٹ پر سوار شخص کو اشارہ کیا کہ وہاں جا کر سب لوگ اونٹوں سے اتر جائیں اور ان کے اگلے احکامات کا انتظار کریں۔

مقررہ جگہ پہنچنے کے بعد میں نے فوراً وہ تمام کیڑے مکوڑے ضائع کر دیئے جو میں نے عرب میں جمع کیے تھے، میں نے وہ ڈبیہ دور پھینک دی تھی جس میں یہ بند تھے۔ میں نے یانبو کے سفر کے دوران جو پودے اور فوسلز جمع کیے تھے وہ بھی ضائع کر دئے تھے۔ میرے پاس ایک تعارفی خط شہزادہ مولائی عبدالسلیم کی طرف سے تھا میں نے وہ نگل لیا تھا کہ اس سے مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ کچھ کرنسی میں نے گھریلو ملازم کو دے دی تھی جو میرے چھوٹے سے صندوق میں تھی۔ اب میں پورے سکون کے ساتھ بالکل خاموش بیٹھ گیا تھا۔ میرے نوکروں کے پاس جو تمباکو تھا اسے انہوں نے پتھروں کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اب ہمیں ان وہابیوں کے احکامات کا انتظار تھا۔

ایک لمحے بعد دو وہابی ہمارے قریب آئے تاکہ ہم پر نظر رکھ سکیں۔ ہم نے ہر شے ٹھکانے لگا دی تھی۔ انہیں دیر اس لیے لگی تھی کہ وہ ہم سے لوٹے ہوئے مال غنیمت کو آپس میں بانٹتے رہے تھے۔

دو گھنٹوں کے بعد دو اور وہابی آئے اور بتایا کہ انہیں امیر نے بھیجا ہے جو چاہتا ہے کہ مجھ سے میری آزادی کے عوض 500 فرانکس کا مطالبہ کیا جائے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس کچھ نہ تھا اور وہ واپس

چلے گئے۔

جلد ہی ایک اور وہابی آیا اور ہمیں یہ حکم سُنایا کہ وہ ہمیں اور جگہ لے جانا چاہتا ہے۔ ہم قریب کے ایک پہاڑ کے عقب میں اس کے ساتھ گئے تو دیکھا کہ ہمارا قافلہ قیدی بنالیا گیا ہے۔

میرے تمام ساتھیوں کو گھیرے میں لے کر ایک مضبوط گارڈ کھڑا تھا۔ وہ سب زرد پڑ گئے تھے اور کانپ رہے تھے۔ انہیں اپنی بدقسمتی پر رنج بھی تھا اور انجام کا ڈر بھی۔ میں عربوں کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ وہ اُن کو ہم سے دور لے گئے تھے۔

ایک وہابی آیا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ ہر حاجی کو خواہ وہ ترک ہو یا مغربی عرب، اسے پانچ سو فرانکس دینے ہوں گے۔ اس مطالبے پر میرے تمام ساتھی چیخ اٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں میں آنسو لیے ان سے رحم کی بھیک مانگی۔ میں نے کہا میں تو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرے پاس کچھ نہیں، تاہم میں نے اپنے ساتھیوں کے حق میں ضرور ان سے بات کی۔

سورج غروب ہو رہا تھا کہ عین اس وقت ایک قاصد یہ پیغام لے کر آیا کہ امیر نے ہر حاجی سے دو سو فرانکس لینے کا نظرثانی شدہ حکم بھیجا ہے۔ اس سے میرے ہمسفروں کی آنکھوں میں تازہ آنسو اُمڈ آئے تھے جن کے پاس واقعی کچھ نہ تھا۔

سورج غروب ہونے کے بعد وہ ہمیں ایک کھوہ میں لے گئے۔ ہمیں دو علاحدہ علاحدہ گروہوں میں تقسیم کر کے بٹھا دیا گیا تھا۔ جلد ہی بہت سے وہابی وہاں پہنچ گئے تھے، میرے ساتھیوں کے خوف اور خدشات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں خود بھی بہت خوفزدہ تھا اور لگتا تھا بہت جلد ایک خونی منظر دیکھنے کو ملے گا جس میں بیچارے ترک سب سے پہلے مارے جائیں گے۔ مجھے اپنا زیادہ ڈر اس لیے نہ تھا کہ میں مغربی عرب سمجھا جاتا تھا تاہم میرے مقدر میں کیا لکھا تھا اس بارے میں پورے وثوق سے اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ غریب لوگ میری وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہوئے تھے اور میں بے بس تھا، میرا کوئی اختیار نہ تھا کہ انہیں اس بلائے ناگہانی سے نجات دلا سکتا۔

اس پریشانی میں ایک گھنٹہ گزرا تھا کہ کچھ سپاہی آن پہنچے۔ انہوں نے ہمیں اونٹوں پر سوار ہونے کا حکم دیا تا کہ دوسری جگہ لے جا سکیں۔ ہمیں یہ بتایا گیا کہ امیر ہم میں سے ہر ایک سے الگ الگ ملنا چاہتا ہے۔ سیاہ رات تھی ہماری حالت ہر لمحہ بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ہم جدیدہ سے گزرے اور پھر جلد ہی ایک جگہ ٹھہر گئے

جہاں اس دکھ بھری رات کا بقیہ حصہ گزارنا تھا۔

اگلی صبح، جمعہ، 3۔ اپریل کو سورج طلوع ہونے سے کچھ دیر قبل ہمیں حکم ملا کہ اونٹوں پر سوار ہو جائیں۔ تین وہابی سپاہی ہمیں اپنی تحویل میں لے کر چلے جا رہے تھے۔

دو گھنٹوں کے بعد میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر دیکھا جہاں خوبصورت خیمے نصب تھے۔ میں سمجھا ہمیں شاید امیر کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ مگر جلد ہی مجھے پتا چلا کہ یہاں جو لوگ جمع تھے وہ پادری، نوکر اور مدینہ میں روضۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام شامل تھے۔ ان کو سعود نے عرب سے باہر بھیج دیا تھا۔

اس پڑاؤ پر آمد کے بعد انہوں نے ہمیں حکم دیا کہ ہم ایک عمدہ چشمے سے پانی کی صراحیاں بھر لیں۔

ہم جس وقت پانی حاصل کر رہے تھے اُس وقت میرا شتربان اس قدر خوفزدہ ہوا کہ اس نے مجھے ساتھ لے کر بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مجھے اور اپنے آپ کو اس قافلے کے لوگوں کے تحفظ میں دے دینا چاہتا تھا جو روضۂ رسولؐ کے غلام تھے۔ ایک وہابی ہمارے پیچھے دوڑا اور میرے نوکر کو زمین پر گرا دیا تھا۔ اس نے اسے بڑی ٹھوکریں ماریں اور ایک لفظ بھی کہے بغیر مجھے واپس قافلے میں لے آیا تھا۔ ہم ایک چھوٹے سے گاؤں حمرا اور جدیدہ کے پاس سے گزرے۔ یہاں چاروں طرف ایک وسیع وادی میں باغات، کھجوروں کے درخت تھے۔ تھوڑی دور وہ چشمہ تھا جس سے ہم نے پانی حاصل کیا تھا۔ یہ چشمہ گرم پانی کا ہے مگر اس سے وافر مقدار میں عمدہ پانی پھوٹتا ہے۔

نصف گھنٹے کے بعد ہم سڑک سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں پہاڑوں میں اتار دیا تھا۔ اب ایک بار پھر بحث چھڑ گئی تھی کہ ہم سے انہوں نے کیا وصول کرنا ہے۔ اسی بحث و تمحیص میں تین بج گئے تھے۔ وہابیوں نے ہمارے سامان کی تلاشی لی اور آخرکار فیصلہ یہ ہوا کہ ہر ترک 20 فرانکس ادا کرے گا جبکہ مغربیوں سے بسکٹوں کی ایک بوری طلب کی اور تین اسپینی پیاسٹر جو میں اپنے رائیٹنگ ڈیسک میں بھول گیا تھا، قبضے میں لے لئے تھے۔ میرے باورچی سے انہوں نے ترکی چغہ لے لیا تھا۔ انہوں نے ہر شتربان سے علیحدہ پندرہ فرانکس وصول کیے۔ میرے شتربان نے انکار کیا اور امیر کو بتانے کے لیے چل پڑا پھر وہ مجھے کہیں نہ مل سکا۔ پھر ہمیں سعود کا مثبت حکم ملا کہ حجاج میں سے کوئی بھی مدینے نہ جائے اور انہیں واپس اس پڑاؤ میں لایا جائے جہاں روضۂ رسولؐ پر جانے والے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ لوگ بھی بہت جلد ہمارے ساتھ مل گئے

سپاہیوں کی نگرانی میں چل رہے تھے۔

یوں یہ آرزو تشنہ رہی اور میں عمر بھر کف افسوس ملتا رہا کہ میں اس دلچسپ سفر کو مکمل کیوں نہ کر سکا تھا۔ مجھے یہ گھڑی بھی یاد آتی ہے جس کی مدد سے میں فلکیاتی مشاہدے کیا کرتا تھا۔ جس وقت وہابی ہم سے فرانکس وصول کر رہے تھے، اس لمحے پانچ چھ بار گرج سی گئی۔ دوپہر کا وقت تھا اور مطلع بھی بالکل صاف تھا۔

وہابیوں کے اس سلوک سے ہم سمجھ گئے تھے کہ ہم مدینے نہ جا سکیں گے اور روضۂ رسولؐ پر حاضری ہمارے نصیب میں نہ تھی۔ پھر بھی ہم نے جان بوجھ کر حکم عدولی کی تھی۔ مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں وہاں تک سفر جاری رکھنے کی کوشش ترک نہیں کروں گا۔ ایک موہوم سی امید حوصلہ دلا رہی تھی کہ شاید مجھے اس میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ وہابیوں نے ہمیں مدینے جانے سے روک کر حکم کی تعمیل کرائی تھی۔

ہم سے جو رقم وصول کی گئی تھی وہ دراصل ایک جرمانہ تھا جو حکم عدولی کی پاداش میں دینا پڑا تھا۔ مگر اس جرمانے کی وصولی کا طریقہ بے حد ظالمانہ تھا۔ غیر مہذب انسانوں کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ان وہابیوں نے مجھ سے میری گھڑی اور دوسری چیزیں لے لی تھیں مگر مجھ سے انہوں نے سب کچھ کیوں نہ لیا؟

یہ عرب، بیشک وہابی ہیں اور سعود کی رعایا ہیں جن کا وطن مالوف حجاز ہے، جو نیا نیا محکوم ہوا ہے۔ اسی لیے یہ مشرق کے ان ذہین نوجوان وہابیوں سے مختلف ہیں جن سے میں مکے میں ملا۔ اسی لیے جب انہوں نے مجھ سے گھڑی اور دوسری چیزیں رکھوا لیں تو میں نے انہیں یہ سمجھ کر معاف کر دیا تھا کہ یہ اپنے ملک کی قدیم برائیوں کی باقیات ہیں اور میں عبدالوہاب کا شکر گزار تھا جس نے ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ یہ اس اصلاح کی وجہ سے تھا کہ انہوں نے میرا دوسرا سامان اور فلکیاتی آلات میرے پاس رہنے دیئے تھے۔ ترکوں سے ان کا برا سلوک اس وجہ سے تھا کہ ترک ان کی بات نہیں مانتے تھے اور ان کی رقوم سے نفرت کرتے تھے۔ اس قوم کا نام سنتے ہی یہ مشتعل ہو جاتے ہیں۔

اس قافلے میں قسطنطنیہ کا نیا قاضی بھی تھا جو مدینے جا رہا تھا۔ مکے میں قیام کے دوران اس سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ اسی وقت میری شناسائی خزانہ دار اور روضۂ رسولؐ کے سرکردہ غلاموں سے بھی ہوئی۔

انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان وہابیوں نے روضۂ مبارک کی تمام زیب و زینت ختم کر دی ہے۔ انہوں نے روضہ مبارک کے دروازے بند کر کے سربمہر کر دیئے ہیں اور صدیوں سے جو خزانہ جمع ہو رہا تھا اس

پر سعود نے قبضہ کرلیا ہے۔خزانہ دار نے مجھے بتایا کہ صرف موتیوں اور قیمتی پتھروں کی لاگت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

سڑک کی طرف سے اس قافلے کو بحفاظت اور بخیر وخوبی سفر کی ضمانت حاصل تھی۔ مقدس شہر سے نکلنے کے بعد یہ قافلہ سڑک چھوڑ دیا کرتا تھا۔اس کے عوض ان سے بھاری رقوم وصول کی جاتی تھی یہاں تک کہ آغا یا حبشیوں کے سردار سے بھی اس کے حصے کے طور پر تین ہزار فرانکس وصول کر لئے جاتے تھے اسی نسبت سے دوسروں سے بھی وصولیاں ہوتی تھیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ مکہ میں ترکوں کا قافلہ مدینے کی جانب جاتے ہوئے لوٹ لیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ کھانے پینے کا سامان تک نہ چھوڑا تھا۔معلوم نہیں یہ لوگ بھوک پیاس سے کیسے محفوظ رہے ہوں گے اور صحرا میں ان پر کیا گزری ہوگی۔

اسی روز 4۔اپریل کو بعد دوپہر تین بجے ہم مغرب جنوب مغرب کی سمت نکل گئے تھے۔کم وبیش ایک گھنٹے کے بعد مجھے کافی فاصلے پر سمندر کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ہم رات بھر چلتے رہے تب دن نکلنے پر یانبو نظر آیا تھا۔میں اپنے قافلے کے سردار کے پاس گیا اور سورج نکلنے پر شہر میں داخل ہوا۔یہ 5۔اپریل اتوار کا دن تھا۔میں فوراً جہاز پر پہنچا جہاں تمام لوگ میرے بارے میں پھیلنے والی خبر سن کر بہت پریشان تھے۔یہ تھا اس سفر کا اختتام، جو یقیناً خوشگوار تھا۔میرے دوستوں کے ساتھ اور میرے ساتھ بدقسمتی نے ایک کھیل کھیلا تھا مگر پھر بھی ہم سب نے ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کی کہ ہم اتنی کم قیمت پر آزاد کردیئے گئے تھے۔

☆☆☆

8۔جان لیوس برکات

سویٹزرلینڈ۔1814ء

ہم نے اس سے قبل جن حجاج کا ذکر کیا ہے ان سب کو ملا لیا جائے تب بھی اس مصنف سے زیادہ ہم ان کے بارے میں نہیں جانتے، جس کا ذکر ہم اب کرنے جا رہے ہیں۔ برکات کے خاندان کے شجرۂ نسب کے بارے میں ورتھما اور العباسی کے برعکس ہر بات صاف اور واضح ہے۔ مزید یہ کہ ہمیں معلوم ہے کہ اس نے حج کیوں ادا کیا تھا اور یہ کہ اس نے اپنے سفر کی روداد کس سے بیان کی تھی۔ وہ 1784ء میں لاسین میں پیدا ہوا اور بیسل میں پروان چڑھا تھا۔ وہ نہایت مہذب اور صاحب علم تھا۔ گوئٹے اس کے والد کے ہاں مہمان کے طور پر آنے والوں میں شامل رہے۔ جب فرانسیسی فوج نے سوئٹزرلینڈ پر دھاوا بولا تو یہ خاندان وطن چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ برکات کو سکول بھیج دیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے اسے بوناپارٹ سے تاحیات نفرت رہی اور اس کے برعکس وہ انگلستان کا وفادار تھا۔ اس نے لیپزگ اور گاٹنجن میں تاریخ اور نئے سائنسی علوم پڑھے۔ اس نے یونانی اور لاطینی زبانیں سیکھیں اور فرانسیسی، جرمن اور انگریزی روانی سے بول سکتا تھا۔

برکات 1807ء میں لندن وارد ہوا تھا۔ اس وقت اس کی عمر 23 برس تھی اور اس کے پاس اسی سرجوزف بینکس کے نام تعارفی خط تھا جس سے پانچ سال قبل العباسی ملنے گیا تھا۔ افریقی ایسوسی ایشن اور رائل سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے بینکس انگلستان کے جغرافیائی انکشافات کا سرپرست اعلیٰ تھا۔ 12 برس قبل وہ منگو پارک سیگاؤ کے بالائی حصے میں دریائے نائیجر پر آیا تھا اور ایک کنارے کے ساتھ ساتھ اس نے ایک سو میل کا سفر طے کیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس دریا کے بارے میں کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔ اندرونی افریقا کا زیادہ حصہ کورا رہا۔ وہ قافلے جو اس براعظم کے مختلف راستوں سے گزرتے تھے ان کا ذکر صیغۂ راز میں تھا سرجوزف نے ایک ایک کر کے چار مہم جو بھیجے تھے، جو ان مہمات میں جاں بحق بھی ہوئے تاکہ وہ نائیجر اور مغرب کو نقشے پر دکھا سکیں۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کا خیال تھا کہ وہ مہم جو دریا تک مخالف سمت سے پہنچیں۔ قاہرہ سے جنوب مغرب کو سفر کرتے ہوئے ہم سوڈان میں سے گزرتے ہیں اور ان

حجاج کے قافلوں کے ہمراہ ہوتے ہیں جو مالے واپس آ رہے تھے، جس کے اندر سے دریائے نائیجر بہتا ہے۔ اس دریا تک پہنچنے کی کلید، جس میں حجاج کے راستوں سے سفر کیا جاتا ہے، ایک تیز نظر مہم جو ہی ہو سکتا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر چل سکنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

یہ مئی 1808ء کی بات ہے جب برکات نے ملازمت کے لیے رضا کارانہ خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ٹمبکٹو یا دریائے نائیجر کے کنارے واقع کسی شہر تک پہنچنے کے لیے، طے یہ ہوا کہ وہ ایک عرب تاجر کے روپ میں سفر کرے گا۔ چونکہ اس کے حلقۂ احباب میں مسلمان زیادہ تھے اس لیے یہ فیصلہ ہوا کہ وہ پہلے ان کی زبان اور طور طریقے الیپو میں رہ کر سیکھے۔ یہ تقرر آٹھ برس کے لیے ہونا تھا۔ طویل المیعاد شرائط کی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ جنگوں، بغاوتوں اور ڈاکوؤں کے حملوں نے حج قافلوں کے راستے میں شورش پیدا کر دی تھی جس کا ذکر العباسی کے سفرنامے میں بڑے واضح الفاظ میں کیا گیا ہے۔ تباہی و بربادی پہلے ہی بینکس کو اعتدال پر لے آئی تھی اس لیے اسے امید تھی کہ وہ برکات کو کافی وقت دے سکے گا۔ قاہرہ میں اس کے نام تھوڑی سی رقم کر دی گئی تھی تاکہ وہ اپنے سفر کے لیے اونٹ اور دوسرا ضروری سامان خرید سکے۔ لندن سے مالٹا تک اس کے کرایے کی ادائیگی پہلے ہی کر دی گئی تھی اور اسے جو پہلا الاؤنس ملا وہ ستر پونڈ تھا۔ برکات نے تجویز کیا کہ جو فنڈز خرچ ہونے سے بچے گئے تھے انہیں عربی مسوّدات کو بذریعہ بحری جہاز برطانوی عجائب گھر بھجوانے پر خرچ کیا جائے اس دوران اس نے ایک شخصیت شیخ ابراہیم البرکات پر اتنی پختگی حاصل کر لی تھی کہ وہ مقامی علماء سے اسلامی فقہ پر بحث کر سکتا تھا۔ اس نے شام، لبنان اور اردن کے راستے سفر بھی کیا جب وہ ہمیشہ عربی لباس میں ہوتا تھا۔ اس کی جیب میں تھوڑے سے پیسے ہوتے تھے اور وہ ہاؤرن کے جغرافیے اور گمشدہ شہر پطرہ کی اپنی دریافت پر مفصل رپورٹیں لندن بھیجا کرتا تھا۔

بینکس جب برکات سے ملا تو اس کے کام کو اس نے بہت سراہا وہ اس کی فطری صلاحیتوں پر بھروسہ کرتا تھا۔ جب اس مہم جو نے جنوبی نبیا سے 1813ء میں بینکس کو تجویز بھیجی کہ وہ بحیرہ احمر کو عبور کر کے حج پر جائے گا تو بینکس نے اس میں دلیل اور منطق کو موجود پایا تھا۔ مکے سے واپس آنے والے کسی حاجی کی نقل کرنے کے بجائے برکات تجویز یہ کر رہا تھا کہ وہ خود حاجی بننا چاہتا تھا۔ جغرافیائی اعتبار سے اس کا مطلب نائیجر کی مہم کے رخ کے برعکس جانب سفر تھا۔ مگر پھر بھی یہ منصوبہ قابل عمل نظر آتا تھا۔ مارچ کے مہینے میں بینکس کی نیک تمناؤں کے ساتھ برکات حجاز کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

اگر العباسی نے مکہ میں وہابیوں کی آمد دیکھی تھی تو برکات نے ان کے انحطاط کا ذکر کیا ہے۔
درمیان کے سات برسوں میں قاہرہ کے پاشا محمد علی نے حجاز پر فوج متعین کر دی تھی تا کہ انہیں وہاں سے نکال دیا جائے جب 1814ء کا حج قریب آیا اس وقت اس کے 16 ہزار فوجی دستوں نے حملے کی تیاری کر لی تھی برکات کی پاشا سے ملاقات پر مشتمل اقتباس کو اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ یہ اس کے بہروپ کی حتمی آزمائش تھی۔ یہاں ہم ہر بہروپیے کے ڈراؤنے خواب کا خلاصہ دیکھیں گے۔ یہ اپنے وقت کی بڑی قوتوں کے ساتھ روبرو آمنا سامنا کرنے کے مترادف تھا۔ برکات اس مڈبھیڑ میں بہت چالاک اور تیز ذہن کا نکلا تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پاشا کا قد کاٹھ ماپ لیا تھا اور بچ نکلنے میں کامیاب ہو کر وہ بلا کسی رکاوٹ کے حج کی ادائیگی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ مکہ میں اس نے ہر شے کا جائزہ لیا۔ مقامی لوگوں کی روزمرہ کی گفتگو، ان کے محاورات، ضرب الامثال، کھانے، پانی کا ذائقہ، صحرائی اراضی، شہر کی آبادی کا ڈھانچہ اور اقتصادی صورت حال سبھی کچھ کے بارے میں وہ مناسب حد تک معلومات جمع کر چکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ حرم کے محصولات معقول رقم پر مشتمل تھے۔ پورے مشرق قریب میں یہ واحد مقام تھا جہاں جائیدادوں سے مناسب آمدنی حاصل ہو رہی تھی جو متقی اور پارسا مسلمانوں نے ٹرسٹ کے طور پر چھوڑی تھی۔ ہر سال امیر حجاج خصوصاً انڈین گورنر بڑے بڑے عطیات بھی دیا کرتے تھے۔ ان انتظامات میں سے کچھ تو صدیوں تک موجود رہے مگر برکات پہلا مغربی تھا جس نے ان کا جائزہ بڑی خوش اسلوبی سے لیا تھا۔

حجاز پر زیادہ طویل عرصے تک مسلط کی جانے والی جنگ کے اثرات کو ان صفحات کی زینت بنایا گیا ہے۔ مکہ، اس کی آبادی اور اس کے راستوں پر تحفظ سب میں یوں لگتا ہے جیسے کمی کر دی گئی ہے اور یہ بھی ایک ساتھ تلے آ گئے ہیں۔ مذہبی رسموں کے درمیان بندوقوں کے چلنے کی آوازیں آتی تھیں اور عرفات میں ہر طرف سپاہی ہی سپاہی نظر آتے تھے۔ برکات کو کسی شے کی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ لوگوں کے ہجوم کے درمیان عرفات کی طرف چل کر جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو گدھے بھی تھے وہ جبل الرحمت پر چڑھ گیا تھا۔ اب وہ تمام کیمپوں میں گھوم رہا تھا۔ مقدس سرزمین کی تفصیل، پڑاؤ ڈالنے کے انتظامات، حجاج کا عمومی مزاج ان صفحات کی زینت بنا ہے جو یہاں شامل کیے گئے ہیں۔

برکات کی کامیابی مجموعی طور پر بے حد متاثر کرنے والی ہے کیونکہ اس کے چاروں طرف فوجی سپاہی تعینات تھے۔ حج کی ادائیگی کے فوراً بعد جنگ چھڑ گئی تھی۔ ہزاروں ایسے حجاج جو گھروں کو واپس جا رہے تھے وہ

مکے میں پھنس گئے تھے۔ برکات نے خود بھی رہائش مسجد الحرام میں رکھ لی تھی اسے یقین تھا کہ جیتنے والا،
حکمران اپنے سیاسی پناہ کے قوانین کا احترام کرے گا۔ چند روز بعد محمد علی کے فوجی دستوں نے حملہ کر دیا تھا۔
برکات کے اندازے کے مطابق بسال میدان میں ایک روز میں پانچ ہزار وہابی قتل کیے گئے تھے۔ بقیہ واپس
صحرائے نجد چلے گئے تھے۔ اب حجاج کو اجازت تھی کہ وہ گھروں کو واپس جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔

حج کی ادائیگی کے بعد اور مدینہ طیبہ میں طویل بیماری کی وجہ سے برکات واپس قاہرہ چلا آیا تھا۔
اسے خیال آیا کہ کیوں نہ طویل عرصے سے منتظر سفر پر نکل پڑے۔ برکات نے واپس مغربی افریقا تک کے سفر کا
اہتمام کر لیا تھا۔ اکتوبر میں اسے اسہال کی بیماری لاحق ہو گئی تھی۔ ایک روز جب وہ قونصلر کے باغ میں ٹہل رہا
تھا اور عظیم دریا تک اپنے سفر کا منصوبہ بنا رہا تھا تو اگلے ہی ہفتے وہ اپنے بستر پر دراز موت کا منتظر تھا۔ نائیجر تک
سفر کا پروگرام بننے کے دس سال بعد 32 برس کی عمر میں اس کا قاہرہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی قبر شہر کے
دروازوں سے جنوب میں واقع ہے اور اس کا رُخ دریائے نائیجر کے ان قافلوں کی طرف ہے جس میں مجھے
ان کے قدموں کے نشانات نظر آ رہے ہوں۔

برکات کی ساتوں کتابیں اس کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔ یہ جب 1820ء کے عشرے میں
ایک ایک کر کے شائع ہوئیں تو اسے بڑی شہرت ملی۔ مسجد الحرام پر جو ابواب اس نے لکھے ہیں، جسے اس نے
خود ایک پورا شہر تصور کیا ہے، انہیں الگ الگ چھاپا گیا تھا اور پڑھنے والوں نے ان کی بڑی تعریف کی۔ یہ اس
قدر درست اور مبنی بر حقیقت تھے کہ سر رچرڈ برٹن نے ان میں سے طویل اقتباسات اپنے اس سفرنامے میں
حوالے کے طور پر دیئے جو چالیس سال بعد آیا تھا۔ تھامس کارلائل نے بھی اپنی تصانیف آن ہیروز۔
ہیرو ورشپ اور ہیرو اِک ان ہسٹری (1841) کے لیے برکات کی طرف رجوع کیا۔ واشنگٹن اروِنگ نے ''محمدؐ
اور آپؐ کے جانشین'' (1849-50) مکمل کرتے وقت اسے پڑھا تھا، یہ کسی امریکی کی پیغمبر خدا، صلی اللہ علیہ
وسلم پر پہلی کتاب تھی۔

☆☆☆

جان لیوس برکات کے سفر نامہ حجاز سے

جدّہ: میں جب حجاز پہنچا تو مجھے کچھ نا مساعد حالات پیش آئے۔ میں 15۔جنوری 1814ء کی صبح جدّہ شہر میں داخل ہوا تو سب سے پہلے ایک ایسے شخص کے گھر گیا جس کے نام مجھے قاہرہ سے روانگی پر ایک خط جنوری 1813ء میں دیا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے عرب کے سفر پر نکلنے کا پختہ ارادہ ابھی نہیں کیا تھا۔ اس شخص نے ملاقات کے دوران بڑی سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور خط کے بارے میں یہ کہہ کر کہ یہ بہت پرانا لکھا ہوا ہے، اسے بھی بہت کم اہمیت دی گئی تھی۔ میری حالت زار دیکھ کر ہر شخص محتاط ہو گیا تھا اور تعارفی خطوط دینے والوں کے نام پر مجھے کوئی بھی مالی مدد دینے کو تیار نہ تھا۔ تاہم ایک شخص نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ مجھے اپنے گھر میں ٹھہرنے کی پیشکش ضرور کر دی تھی۔ میں نے یہ پیشکش ابتدائی دو روز کے لیے قبول کر لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں کسی زیادہ مانوس اور شناسا کو یہ یقین دلا کر کہ نہ تو میں سیاح تھا نہ بہروپیا کہیں اور منتقل ہو جاؤں گا۔ جب ایسا کوئی شخص نہ ملا تو میں شہر کے کچھ عوامی خوانین کے ہاں چلا گیا تھا۔ میرا کل سرمایہ دو ڈالر اور چند سونے کے سکے تھا۔ انہیں میں نے ایک تعویز میں مڑھ کر بازو پر باندھ رکھا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس صورت حال پر رنج وغم کا اظہار کرتا۔ یہاں پہنچنے کے چوتھے روز مجھے شدید بخار ہو گیا تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا تھا کہ میں نے جدہ میں دستیاب پھلوں سے خوب فائدہ اٹھایا تھا اور زیادہ کھا لیے تھے۔ پچھلے بارہ ماہ سے میرا معدہ اس کا متحمل نہیں رہا تھا کہ اس قدر بوجھ اچانک اٹھا سکتا۔ اس موقعہ پر ایک یونانی کپتان، جو میرا ہمسفر رہا تھا میرے کام آیا۔ وہ ایک حجام یا دیہاتی معالج کو بلا لایا تھا جس نے میرا علاج کیا اور میں پندرہ دن کے اندر چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ مگر کمزوری ابھی باقی تھی اور شہر کی گرمی نے بھی پریشان کر رکھا تھا۔ تاہم طائف کی آب وہوا مجھے راس آئی جو مکے کے عقب میں پہاڑی علاقہ ہے اور میں مکمل تندرست ہو گیا تھا۔

حجاز میں اس صورت میں سفر کرنا آسان تھا جب کسی نے بھکاری کا روپ دھار رکھا ہو یا جس کی ظاہری حالتِ زار مجھ جیسی ہو۔ میں جوں جوں تندرست ہوتا گیا میرے اندر آسائشوں کے حصول کی آرزو بیدار ہوتی گئی۔ میں نے فوراً ایک کم مرتبہ مصری شریف انسان کا لباس پہنا اور فوراً قاہرہ لکھا کہ مجھے کچھ

رقم بھجوائی جائے مگر یہ رقم مجھے تین چار ماہ سے قبل وصول نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اگلے سال نومبر تک میں یہیں ٹھہروں گا تا کہ حج ادا کر سکوں۔ مجھے رقم آنے تک زندہ رہنے کے لیے کوئی ذریعۂ آمدن تلاش کرنا تھا۔ اگر مجھے کوئی مایوسی ہوتی تو میں غریب حاجیوں کی مثال پر عمل کرتا جو معزز خاندانوں سے تعلق رکھتے ہوئے بھی محنت مزدوری کر کے حجاز میں اپنے قیام کے دوران دو وقت کے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ کما لیتے ہیں۔

پاشا محمد علی 1813ء کے موسمِ بہار کے اختتام پر حجاز آیا تھا۔ وہ طائف میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جہاں اس نے اپنی فوج کا ہیڈ کوارٹر بنا لیا تھا تا کہ اس کی مدد سے وہابیوں کے ٹھکانوں پر حملہ کر سکے۔ میں قاہرہ میں بالائی مصر کے لیے روانگی سے قبل پاشا کو کئی بار دیکھ چکا تھا۔ میں اس سے سفر کے بارے میں اپنی دیوانگی کی حد تک خواہش کا بھی ذکر کر چکا تھا۔

(اس نے جواباً کہا تھا کہ یہ طائف کا سفر ہو گا)

پاشا یہ سن چکا تھا کہ میں جدہ میں ہوں۔ اس کے ساتھ رہنے والے ایک شخص نے جو طائف میں تھا جب یہ سنا کہ میں پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس پریشان حال گھومتا رہتا ہوں تو اس نے فوراً ایک قاصد کو دو سانڈنیاں دے کر جدے بھیجا کہ وہ وہاں کسٹمز کے کلکٹر سے ملے جس کے ہاتھ میں شہر کے انتظامات تھے، اور اس کو حکم یہ بھیجا تھا کہ میرے لیے کپڑوں کا جوڑا اور کچھ رقم بطور سفر خرچ بھیجے۔ یہ بھی لکھا گیا تھا کہ مجھے اسی قاصد کے ہمراہ بھیج دیا جائے۔

کسی ترک پاشا کی طرف سے دعوت کا مطلب اس کا نرم سا حکم ہوتا ہے۔ میں اس وقت طائف جانے سے ہچکچا رہا تھا مگر ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اس قاصد کے ساتھ طائف آ جاؤں۔ جو بات صیغۂ راز میں رکھی گئی تھی وہ یہ تھی کہ مجھے قرض نہیں بلکہ تحفہ دیا جائے۔ میں کپڑوں کا جوڑا اور نقد رقم وصول کرنے سے انکار نہ کر سکتا تھا۔ میں پاشا کے ارادوں سے بھی واقف تھا جو جتنی رقم دیتا ہے اس سے دوگنی واپس لیتا ہے یا اسے اپنے مقام و رتبے کے مقابلے بہت حقیر سمجھتا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ دوسروں سے یہ بھی کہتا تھا: ''دیکھو! میں نے اس کُتے کے آگے لقمہ ڈال دیا ہے''۔ کسٹمز کا کلکٹر سیّد علی تو اس حقیقت سے واقف نہ تھا مگر میں نے بھی اپنے آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا کر لیا تھا کہ میں بھی پاشا اور اس کے لوگوں کا ہم پلہ ہو جاؤں گا۔

اس دعوت میں اس قدر زور دیا گیا تھا کہ میں اسی روز جدہ سے شام کو طائف کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ میں سیّد علی سے اس وقت ملا جب کئی ممالک کے حجاج اس کے ساتھ تھے۔ رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ اس مہینے میں ہر شخص زیادہ سے زیادہ مہمان نوازی کا ثبوت دینے کی کوشش کرتا ہے۔ بالخصوص رات کے کھانے میں بڑا تکلف کیا جاتا ہے۔ پاشا کے ارادوں پر پورا بھروسہ نہ کرتے ہوئے میں نے ضروری سمجھا کہ رقم کا بھرا ہوا پرس طائف لے جاؤں۔ جس شخص کی جیب میں پیسہ ہو اسے کوئی دوسرا خوف اور ڈر نہیں رہتا سوائے اس ایک کے کہ یہ کم نہ ہو جائے۔

میں نے سوچا مجھے ان پیسوں کی بہت ضرورت ہو گی۔ مجھے طائف چھوڑتے وقت رشوت دینے کے لیے بھی اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور سفر خرچ کے لیے بھی۔ مگر میرے یہ دونوں اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔

طائف میں رہائش گاہ: میں دوپہر کے وقت طائف پہنچا اور پاشا کے معالج بصیری کے مکان پر اترا تھا۔ قاہرہ میں اس سے میری کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور میں اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا جس میں ترک منصب دار یا امیر لوگ ہمیشہ دن کے وقت سوتے ہیں۔ پاشا کو میری آمد کی اطلاع مغرب سے پہلے نہ کی جا سکی تھی۔ اس دوران بصیری نے اپنے خلوص اور دوستی کا یقین دلاتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ میں کس ارادے سے حجاز آیا ہوں۔ جہاں تک مصر کے بارے میں میرے ارادوں کا تعلق تھا اسے یقین نہ آیا تو اس نے مجھ سے ایک دوست کی طرح صحیح صحیح بات بتا دینے پر اصرار کیا۔ اسے دراصل یہ شک ہو گیا تھا کہ میں جزائر شرق الہند جا رہا تھا۔ میں نے اس کا انکار کرتے ہوئے اسے یقین دلایا کہ اس کے شکوک و شبہات غلط تھے۔ اس موضوع پر گفتگو کے دوران اس نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر مجھے واقعی قاہرہ واپس جانا ہے تو میں ان کے ساتھ ہیڈ کوارٹر میں رہوں گا اور جب پاشا خود قاہرہ واپس جائے اس وقت میں اس کے ہمراہ جاؤں۔

شام کے وقت بُصیری پاشا کے پاس اس کی بیوی کے گھر گیا جہاں وہ صرف دوستوں اور قریبی ملنے والوں سے ملاقات کرتا تھا۔ وہ نصف گھنٹے کے بعد واپس آیا تو اس نے مجھے بتایا کہ پاشا مجھے رات کو اپنے مخصوص کمرے میں ملنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ پاشا کے ساتھ قاضیٔ مکہ بیٹھا ہوا تھا جو ان دنوں اپنی خراب صحت کی وجہ سے طائف میں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ پاشا کو جب یہ علم ہوا کہ میں مقامات مقدسہ کی

زیارت کا خواہش مند ہوں تو اسے خوشی ہوئی اور اس نے کہا کہ "ایک اچھا اور سچا مسلمان ہونے کے لیے صرف ڈاڑھی ہی ضروری نہیں ہے"۔ پھر قاضی کی طرف متوجہ ہو کر اس نے کہا: "آپ ان مسائل میں مجھ سے بہتر رائے دے سکتے ہیں۔" قاضی نے بتایا کہ صرف مسلمانوں کو مقدس شہروں میں جانے کی اجازت ہوتی ہے، اس کا خیال تھا کہ اگر میں واقعی مسلمان نہیں ہوں تو میں اس بات کا اعلان نہیں کروں گا۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں نے بُصیری سے کہا کہ وہ اکیلا پاشا سے جا کر ملے اور بتائے کہ میرے جذبات پہلے ہی اس وقت مجروح ہوئے ہیں جب میرے گائیڈ کو یہ احکام ملے تھے کہ وہ مجھے مکے کے اندر نہ لے جائے اور اگر پاشا مجھے مسلمان نہیں سمجھتا تو میں اسے اس کے پرائیویٹ کمرے میں کبھی نہ ملوں گا۔

بُصیری میری زبان سے یہ سن کر چونک گیا اور مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لیے کہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ پاشا نے اسے یہ حکم دیا تھا کہ مجھے ساتھ لے کر آئے اور وہ حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم میں نے جو کہا تھا میں اس پر قائم تھا۔ وہ بادلِ نخواستہ محمد علی کے پاس واپس چلا گیا تھا جو اس وقت اکیلا تھا اور قاضی جا چکا تھا۔ جب بُصیری نے پاشا کو میرا پیغام پہنچایا تو وہ مسکرایا اور کہا کہ وہ مجھے خوش آمدید کہے گا خواہ میں مسلمان ہوں یا نہیں۔ شام کو آٹھ بجے میں محل میں گیا جو شریف غالب کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، یہ نصف گر چکا تھا باقی کا بھی خستہ حالت میں تھا۔ میں نے وہ نیا سوٹ پہن رکھا تھا جو مجھے جدہ میں پاشا کے حکم پر ملا تھا۔ عزت مآب ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں تشریف فرما تھے۔ ان کے ایک طرف قاضی اور دوسری طرف حسن پاشا تھا، جو فوج کا سالارِ اعظم تھا۔ یہ جس صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے اس کے گرد نصف دائرہ میں تیس چالیس سرکردہ افسران کھڑے تھے۔ اس نیم دائرے کے مرکز میں چند بدو شیوخ بھی موجود تھے۔ میں نے پاشا کے قریب جا کر "السلام علیکم" کہا اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں قاضی کے ساتھ بیٹھ جاؤں۔ پھر نہایت نرم لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے مجھ سے میری صحت کا پوچھا اور یہ کہ بیاد سے مملوکوں کے بارے میں کوئی خبر تھی تو سناؤں جہاں میں گیا تھا۔ مگر اس موضوع پر ایک لفظ نہ کہا جو موضوع میری دلچسپی کا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان گفتگو کے وقت اس کے عرب ترجمان کے طور پر امین آفندی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کیونکہ میں ترکی نہیں بولتا تھا اور پاشا عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا۔ پانچ منٹوں میں اس نے بدوؤں کے ساتھ تجارتی گفتگو میں تجدید کر لی تھی جو میرے آنے سے مداخلت کا شکار ہو گئی تھی۔ جب یہ بات چیت ہو چکی اور حسن پاشا چلا گیا تو سوائے قاضی، بُصیری اور میرے سب کو حکم ملا

کر تشریف لے جائیں۔

مجھے توقع تھی کہ مجھ سے ثبوت طلب کیا جائے گا اور میں اس کے لیے پوری طرح تیار تھا مگر میرے ذاتی معاملات کے بارے میں اُس نے ایک لفظ تک نہ کہا تھا۔ نہ ہی محمد علی نے کچھ کہا۔ پاشا نے اس طرف بھی بالکل اشارہ نہیں کیا کہ اسے شک تھا کہ میں جزائرالہند کے سفر پر تھا۔ جب ہم اکیلے ہوئے تو پاشا نے سیاست کے موضوع پر گفتگو شروع کی۔ اسے اسی لمحے یہ خبر ملی تھی کہ اتحادی فوجیں پیرس میں داخل ہوگئی تھیں اور بوناپارٹ ایلبا کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ بہت سے مالٹا کے گزٹ ان واقعات کی خبریں دے رہے تھے جو اس تک قاہرہ سے پہنچ رہی تھیں۔ اسے ان اہم واقعات سے بڑی دلچسپی تھی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے خیال میں بوناپارٹ کے زوال کے بعد انگلستان بحیرہ روم میں طاقت حاصل کر کے مصر پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔

پاشا کے ساتھ دو تین گھنٹوں کی پرائیویٹ گفتگو کے بعد، خواہ یہ عربی میں تھی جس کے لیے ترجمان قاضی تھے، جو قسطنطنیہ سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ زبان خوب جانتے تھے۔ اطالوی میں بات ہوتی تو ترجمان بُصیری ہوتے جو آرمینی ہونے کے باوجود قاہرہ میں قیام کے دوران اس زبان میں دسترس حاصل کر چکے تھے۔ میں نے اجازت طلب کی تو پاشا نے اگلے روز اسی وقت پھر آنے کو کہا۔

29۔ اگست: میں غروب آفتاب سے قبل قاضی سے ملنے گیا۔ اس کے پاس اس وقت دوست اور سیکرٹری بھی تھے۔ یہ قسطنطنیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور پڑھے لکھے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ قاضی صادق افندی ایک سچے مشرقی درباری تھے ان میں وہ سارے اوصاف موجود تھے جو قسطنطنیہ میں اچھے خاندانوں میں پرورش پانے والوں میں پائے جاتے ہیں۔ سلام دعا کے بعد میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ پاشا مجھے ایک پکا مسلمان سمجھنے میں کیوں شک وشبہے کا شکار تھا جبکہ میں اس مذہب پر برسوں سے قائم تھا۔ اس نے جواب دیا کہ محمد علی نے یہ اجازت دے دی ہے کہ وہ (یعنی قاضی) ایسے معاملات میں بہترین منصف تھا۔ اس نے اس امید کا اظہار کیا کہ اسے یہ توقع تھی کہ ہم جلد ایک دوسرے سے بہتر طور پر واقف ہو جائیں گے۔ قاضی نے اب مجھ سے کئی سوال بنیا کے سفر کے بارے میں کیے۔ اس گفتگو کے درمیان ادبی موضوعات پر بھی بات چیت ہوئی۔ مجھ سے یہ سوال بھی پوچھا گیا کہ میں نے عربی کی کون کون سی کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ پھر پوچھا کہ میں نے قرآن پاک کی تفاسیر کون کون سی پڑھی تھیں، فقہ پر میرے مطالعہ میں کیا کیا شامل رہا۔ غالباً اسے میرے جوابات پر مکمل اطمینان حاصل ہوا تھا۔ میں قاضی کی توقعات سے بڑھ کر نکلا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ ہم مذہبی

موضوعات پر زیادہ گہرائی میں نہیں گئے تھے۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ افطاری کا وقت ہو گیا۔ میں نے روزہ افطار کیا اور قاضی کے ساتھ نماز ادا کی۔ میں جہاں تک میرا حافظہ ساتھ دے رہا تھا قرآن کی آیات بلند آواز سے تلاوت کر رہا تھا۔ اس کے بعد ہم دونوں پاشا کے پاس گئے۔ اس روز بھی پاشا اور میں کچھ وقت تنہائی میں باتیں کرتے رہے تھے ہمارا موضوع وہی سیاست، کل والا تھا آج بھی میرے ذاتی معاملات پر پاشا نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔

پھر ہر شام میں پہلے قاضی کے پاس جاتا اور پھر پاشا کے پاس۔ مجھے یوں لگا جیسے ہماری گفتگو کے علاوہ میرے کاموں کو بہت قریب سے دیکھا جا رہا تھا۔ بُصیری نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میرے پاس کوئی رسالہ آتا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ حجاز مصر کی طرح نہیں تھا جہاں بہت سی باتیں قدیم ازمنہ کی تھیں اور مجھے ان چٹیل پہاڑوں میں کوئی بھی ایسی شے نظر نہیں آتی جس کا نوٹس لیا جائے۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑا جاتا تھا اور میرے پاس اس شک میں گرفتار ہونے کا سبب موجود تھا کہ بُصیری دوستی کے تمام دعوؤں کے باوجود جاسوس تھا۔ اس صورت حال میں طائف میں میرا زیادہ لمبے عرصے کے لیے قیام اچھا نہ تھا۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ میرے بارے میں پاشا کے کیا ارادے تھے۔

بظاہر تو مجھے یوں لگا جیسے مجھے صرف اور صرف برطانوی حکومت کا ایک ایسا جاسوس سمجھا جا رہا ہے کہ میں اس ملک کے بارے میں اپنی رپورٹ جزائر شرق الہند بھیجتا رہوں۔ میرے بارے میں یہ فیصلہ پاشا نے خود کیا تھا۔ وہ مجھے بطور ایک انگریز کے جانتا تھا یہ نام میں نے اپنے سفر کے دوران اختیار کیا تھا۔ (اس سے اس ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا) مجھے ایسا اس لیے کرنا پڑا کیونکہ بطور ایک یورپی کے اپنے آپ کو متعارف کرانے کی ضرورت پیش آتی تھی اور مشرق میں صرف انگلستان اور فرانس کے باشندے تحفظ اور دوسری مراعات حاصل کرتے تھے۔ انہیں زیادہ تحفظ ملتا تھا۔ مقامی حکومتوں کی طرف سے بھی اور قسطنطنیہ میں ان کے وزراء کی طرف سے بھی۔ پاشا کا میرے بارے میں یہ خیال بھی تھا کہ میں کسی اہم عہدے پر بھی فائز ہوں۔ شاید اس لیے کہ مشرق میں سفر کرنے والے ہر انگریز کو ''مائی لارڈ'' کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ میں نے دربار ترکی میں اپنے آپ کو جس باوقار طریقے سے پیش کیا تھا (جو میری ضرورت تھی) اس سے پاشا کو میرے بارے میں اس قسم کا گمان رکھنے میں شاید زیادہ مدد ملی تھی۔ وہ خود ان دنوں برطانیہ عظمیٰ سے خوفزدہ تھا اور اسی لیے وہ مجھ سے کوئی بدسلوکی نہیں کرنا چاہتا تھا حالانکہ میرے منصوبوں میں اس نے میری کوئی مدد نہ کی تھی۔ اُسے

اس وقت صرف یہ معلوم تھا کہ میرے پاس صرف وہ رقم ہے جو اس کے حکم پر مجھے جدہ میں دی گئی تھی اور یہ رقم حجاز میں میرے قیام کے طویل ہو جانے پر کسی طور پر بھی کافی نہ تھی۔ پاشا اور بُصیری دونوں نے اس بارے میں مجھے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ میں قاہرہ واپسی پر اپنے بل ادا کر سکوں گا، حالانکہ میں نے ان سے اس کی درخواست بھی کی تھی تاکہ مجھے حجاز میں قیام کے دوران مالی پریشانی نہ ہو۔ تاہم میرے پاس سردست اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے رقم تھی اور مزید کی مصر سے آ جانے کی توقع بھی تھی۔

طائف میں ایک نرم سی قید کی شکل میں کسی بھی مدت کے لیے قیام کرنا میرے مزاج کے خلاف تھا مگر میں زبردستی وہاں سے جا اس لیے نہ سکتا تھا کہ اس سے شکوک میں اضافہ ہوتا۔ یہ بات مجھ پر پاشا اور قاضی کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات پر ہی روشن ہو گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ بُصیری کی رپورٹیں محمد علی کے ذہن پر ضرور اثر انداز ہوں گی۔ میرے لیے بہترین راستہ یہی تھا کہ بُصیری کو اپنے آپ سے بیزار کر دوں اور اسے یوں مجبور کر دوں کہ میرے بارے میں پاشا کو وہی کچھ پہنچائے جو میں چاہتا تھا۔ میں نے روزہ رکھنے کے لیے سحری اور افطاری کا مطالبہ کیا اور یوں روزے پورے رکھ رہا تھا۔ اس کے گھر کا سب سے اچھا کمرہ میں نے اپنے لیے منتخب کر لیا تھا۔ اس کے نوکر میری خدمت میں لگے رہتے تھے۔ یہ مشرقی مہمان نوازی کا تقاضا تھا کہ جب میزبان اس قدر مہربان ہو تو کسی طرح کی ناراضگی کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ پھر مجھے تو ایک عظیم شخصیت تصور کیا جا رہا تھا اور میں پاشا کا مہمان تھا۔ بُصیری سے اپنی گفتگو کے دوران میں نے اسے یقین دلایا کہ میں طائف میں اپنے قیام پر مطمئن تھا۔ یہاں کی آب و ہوا مجھے موافق تھی اور میری صحت بہتر ہو رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا وہاں سے چلے جانے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں تھا۔ طائف میں مجھ جیسا شخص کسی بھی مدت کے لیے آرام سے رہ سکتا تھا کیونکہ مجھے یہاں لندن سے زیادہ آسائشیں حاصل تھیں، حالانکہ کھانے پانی کی اشیاء وہاں کی نسبت بہت مہنگی ملتی تھیں۔ میں اپنی اس چال میں کامیاب ہو گیا تھا کیونکہ بصیری نے پاشا کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ میں ایک بے ضرر سا انسان ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ اب میری جان جلد چھوٹ جائے گی۔

میں طائف میں قیام کے دوران بہت کم باہر نکلتا تھا سوائے شام کو محل میں جانے کے۔ بُصیری نے مجھ سے پوچھا کہ پاشا کی وجہ سے میرے سفر پر کوئی اثر تو نہیں پڑ رہا تھا، اس میں کوئی رکاوٹ تو نہ تھی۔ کیا مجھے اس وجہ سے مکے جانے میں کوئی دشواری پیش آ رہی تھی۔ میں نے جواب دیا میرا پاشا سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں بیشک اس کی خواہش پر طائف آیا ہوں مگر میں اس جیسے میزبان کے ساتھ رہتے ہوئے اس کے دوستانہ رویے

سے بہت مطمئن تھا۔ دوسرے دن اس نے موضوع بدلتے ہوئے مجھ سے کہا کہ سپاہیوں کے ساتھ کوارٹر میں زیادہ عرصہ رہنا تکلیف دہ ہو جائے گا۔ پھر یہ کہ مجھے ترکی زبان آتی نہیں تھی اور میری یہاں واقفیت برائے نام تھی۔ میں نے اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے بتایا کہ میں پاشا کی خواہشات جانے بغیر کوئی فیصلہ نہ کر سکوں گا۔ میرا یہ جملہ اسے اس نکتے پر لے آیا تھا جہاں میں اسے لانا چاہتا تھا۔ ''میں ہز ہائنس سے بات کرتا ہوں اگر تمہاری طرف سے اجازت ہو تو'' بصیری نے مجھ سے پوچھا۔ پھر اسی شام اس نے میرے محل میں جانے سے قبل بات کر لی تھی۔ چنانچہ پاشا نے مجھے بتایا کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ میرے رمضان المبارک کے آخری روزے مکہ مکرمہ میں گزریں (یہ بصیری کی گفتگو کا نتیجہ تھا) اور بہتر ہوگا کہ میں قاضی کی پارٹی میں شامل ہو جاؤں جو وہاں ایک دعوت میں جا رہا تھا اور پاشا نے مجھے بتایا کہ قاضی بھی اس بات سے خوش ہوگا۔ یہ سب کچھ میری خواہشات کے مطابق ہو رہا تھا۔ یہ طے ہوا کہ قاضی 7۔ستمبر کو طائف سے روانہ ہوگا۔ میں نے سفر کے لیے دو گدھے کرایے پر حاصل کر لیے تھے، اس ملک میں سواری کا یہی طریقہ رائج تھا۔

میرا ارادہ یہ تھا کہ میں مکے سے مدینہ جاؤں گا جہاں محمد علی کا بیٹا گورنر تھا۔ میں نے بصیری سے التماس کی کہ مجھے پاشا سے ایک ایسا فرمان یا پاسپورٹ حاصل کر دے جس کی بنیاد پر میں پورے حجاز میں پھر سکوں جس کے ساتھ بیٹے کے نام ایک خط بھی ہو۔ بصیری نے جواب دیا کہ پاشا میرے سفر کے معاملے میں ذاتی طور پر کسی طرح کی مداخلت نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں جس طرح پسند کروں، کرتا رہوں، جہاں جانا چاہوں چلا جاؤں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں چونکہ یہاں کی زبان جانتا ہوں اس لیے میرے لیے یہی پاسپورٹ کا کام کرے گی۔ یہ ایک طرح سے اجازت نامہ تھا کہ جو مرضی ہے کرو اور وہ نہ تو کسی طرح کی مدد کرے گا نہ کوئی مداخلت۔ میرے لیے سر دست یہی بہت کچھ تھا اور یہ میری خواہش سے کسی طرح کم نہ تھا۔

6۔ستمبر کو میں نے پاشا سے اجازت طلب کی۔ اس نے رخصت ہوتے وقت مجھ سے کہا کہ اگر کبھی میرا ہندوستان جانا ہو تو وہاں انگریزوں کو یہ بتاؤں کہ پاشا ہندوستان کی تجارت میں بڑی دلچسپی رکھتا ہے۔

7۔ستمبر کی صبح قاضی نے مجھے پیغام بھجوایا کہ وہ شام سے پہلے روانہ نہ ہو سکے گا اور رات کو سفر کرنے کو ترجیح دے گا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں اسے جبل قرا پر ملوں جو مکے جاتے ہوئے نصف فاصلے پر واقع تھا۔ میں یوں طائف سے اکیلا ہی روانہ ہوا۔ روانگی کے وقت بصیری نے مجھے یقین دلایا کہ اسے میرے مفادات عزیز تھے اور اس شہر سے نکلتے وقت میں اپنے ستاروں کی موافق گردش پر خوش تھا کہ مجھے یہاں سے بخیر و عافیت نکلنے کا موقع ملا

رہا تھا جہاں میرے لیے عبیا کے وحشی بدوؤں کے درمیان رہنے سے کہیں زیادہ خطرات درپیش تھے۔

طائف سے مکّہ مکرمہ تک: میں ابھی طائف سے زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ تین سپاہیوں نے مجھے آلیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک میری طرح گدھے پر سوار تھا۔ طائف میں ان تینوں نے اپنی کرنسی تبدیل کروالی تھی لیکن انہوں نے ایک ہی پرس میں ایک ہزار ڈالر رکھ کر اسے سلائی کے ذریعے محفوظ کر دیا تھا۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ راستے میں انہیں سفر خرچ کے لیے بھی کچھ پیسے درکار ہوں گے۔ وہ میرے ساتھ اس سفر میں شریک ہو گئے تھے اور جہاں کہیں راستے میں کچھ پیسوں کی انہیں ضرورت پڑتی میں دے دیتا تھا مگر یہ اس قدر خوش مزاج اور اچھی حسِ مزاح کے مالک تھے کہ میں نے سوچا میرے پیسے ضائع نہیں ہوئے تھے۔

جب ہم وادی محرم پہنچے تو میں نے احرام باندھ لیا تھا اور میں پہلی بار مکہ میں داخل ہو کر خانہ کعبہ کی زیارت سے مستفید ہونے والا تھا۔ دوپہر کو میں مکے پہنچا۔ میرے ساتھی اپنے اپنے جاننے والوں کو سپاہیوں میں تلاش کرنے نکل گئے اور مجھے اکیلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ شہر میں میرا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ قاضی نے بھی کوئی تعارفی حوالہ نہیں دیا تھا جو میں چاہتا بھی نہیں تھا، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔

مکہ مکرمہ میں جو کوئی بھی داخل ہوتا ہے خواہ وہ حاجی ہو یا نہیں اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ قانوناً پہلے خانہ کعبہ جائے۔ ایسا کرنے سے قبل اسے کوئی دوسرا دنیاوی کام کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہم دکانوں اور گھروں کے قریب سے گزر کر جا رہے تھے یہاں تک کہ ہم مسجد کے دروازے باب السلام پر پہنچ گئے۔ گدھوں کا کرایہ ادا کیا اور ان کے مالک کا شکریہ ادا کیا۔ کوئی نصف درجن گائیڈ یا مطوّف (طواف کرانے میں رہنمائی کرنے والے) ہماری طرف دوڑتے آئے تھے۔ میرے احرام سے انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ میں کعبے کا طواف کروں گا اور مجھے دوسری مذہبی رسوم ادا کرنی ہوں گی۔ میں نے ان میں سے ایک کو اپنا گائیڈ چن لیا تھا۔ میں نے اپنا سامان قریب ہی ایک دکان میں جمع کروا دیا تھا۔ میں باب السلام سے مسجد الحرام میں داخل ہوا، جس سے ہر نئے آنے والے کو مسجد کے اندر داخل ہونے کے لیے کہا جاتا ہے جو مذہبی رسوم یہاں مجھے ادا کرنی تھیں وہ یہ تھیں:۔ 1۔ کچھ مذہبی رسوم کی ادائیگی معبد کے اندر تھی۔ 2۔ صفا و مروہ پہاڑیوں کے درمیان سعی یا دوڑنا تھا۔ 3۔ عمرہ مسجد تک جانا تھا (جو لازمی نہیں تھا)۔ جب کبھی کوئی مسلمان مکہ میں داخل ہوتا ہے اور دو دن سے زیادہ کا سفر طے کرتا ہوا آتا ہے اسے یہ رسوم ادا کرنی ہوتی ہیں۔ پھر جب کوہ عرفات پر حاضری دی جاتی ہے اس وقت بھی انہیں دوبارہ ادا کیا جاتا ہے۔

مکہ مکرمہ: میں نے اپنے قیام کے لیے ایک خوبصورت رہائش گاہ کا انتظام کیا۔ میرے کمرے کی کھڑکی کے سامنے اونچے اونچے درخت تھے۔ سبزے سے محروم پہاڑوں کے درمیان واقع اس شہر میں ان درختوں کی موجودگی میرے لئے ایک نہایت خوبصورت منظر پیش کرتی تھی۔ مجھے یہاں اس آزادی کا احساس ہوا جو صرف قاضی اور اس کے ان پیروکاروں کو حاصل تھی جو بہت جلد وہاں سے چلے گئے تھے۔ پاشا اور اس کا دربار حج کے ایام تک طائف میں رہا۔ مجھے جو لوگ اچھے لگتے میں ان سے جا کر ملتا اور دنیا کے تمام ملکوں سے آئے ہوئے حجاج کے مجمع میں جا کر شامل ہو جاتا تھا۔ نہ کبھی کسی نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں نہ ہی کسی سے مجھے کوئی ناپسندیدہ لفظ سننے کو ملا۔ میں ہر طرح کی تفتیش سے بچا ہوا تھا جو میرے لیے باعث صد اطمینان تھا۔ اگر کبھی مجھ سے کوئی یہ پوچھ لیتا کہ میرا تعلق کس ملک سے ہے تو میں (اجنبیوں کے درمیان ایسا بہت کم ہوا) اپنے آپ کو مصر میں مملوکوں کی فوج کا ایک رکن ظاہر کر دیتا تھا۔ ان لوگوں کا اس ملک کے بارے میں علم اس قدر کم ہوتا تھا کہ وہ میرا جھوٹ پکڑ ہی نہ سکتے تھے۔ اگر کسی کو معلوم ہو بھی جاتا کہ میں نے درست معلومات فراہم نہیں کی تب بھی کسی طرح کا خطرہ درپیش نہ تھا میں مشرق میں، جہاں جہاں بھی گیا جو امن وسکون اور اطمینان مجھے مکے میں حاصل ہوا کہیں اور نہ ہوا تھا۔ مکہ میں اپنی رہائش گاہ کی یاد ہمیشہ میرے حافظے میں محفوظ رہے گی۔ میں اپنی صحت کی حالت کی وجہ سے ان تمام آسائشوں اور نعمتوں سے بہرہ مند نہ ہو سکتا تھا جو مجھے اس شہر امن میں حاصل تھیں۔

مکہ مکرمہ کو ایک خوبصورت شہر کہا جاتا ہے۔ اس کی گلیاں مشرقی شہروں کی گلیوں کے مقابلے میں زیادہ چوڑی ہیں۔ بلند و بالا مکانات پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ گلیوں کی سمت کھلنے والی بیشمار کھڑکیاں انہیں زیادہ خوبصورت بنا دیتی ہیں۔ یہ مصر یا شام کی نسبت جہاں چند ایک کھڑکیاں اندر کی طرف کھلتی ہیں یورپی طرز لیے ہوئے ہیں، مکہ میں جدہ کی طرح تین منزلہ مکانات ہیں۔ چند مکانات میں چونا کیا جاتا ہے ورنہ زیادہ تر گھروں کے رنگ گہرے سلیٹی ہوتے ہیں یعنی پتھر کے اصلی رنگ کے۔ جدہ میں مکانات کا یہ رنگ آنکھوں میں چُبھتا نہیں جبکہ سفید رنگ آنکھوں کو نہیں بھاتا۔ شام اور مصر کے جن شہروں کی گلیاں تنگ ہوتی ہیں وہ ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ دراصل جن شہروں میں پہیوں والی گاڑیاں نہیں چلتیں صرف اتنی ہی جگہ کافی سمجھی جاتی ہے جہاں سے لدے ہوئے دو اونٹ آمنے سامنے سے آسانی سے گزر جائیں۔ مکہ مکرمہ میں چونکہ لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اس لیے یہاں کے راستے اور گلی کوچے کھلے رکھنے پڑتے ہیں۔ گلیوں کی سمت کھلنے والی بہت سی

کھڑکیوں کی موجودگی بھی اس لیے ضروری سمجھی گئی کیونکہ ان گھروں میں زیادہ تر حاجیوں کو ٹھہرایا جاتا ہے جو گلیوں کے خوبصورت منظر کو ان کھڑکیوں سے دیکھتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

شہر چاروں طرف سے کھلا ہوا ہے مگر قریبی پہاڑوں پر اگر دفاعی انتظامات مناسب ہوں تو دشمن کے لیے مضبوط سرحد بن جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں اس کے تین اطراف میں دیواریں تھیں جو اس کی زیادہ سے زیادہ حفاظت کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک تو وادی کے پار تعمیر کی گئی تھی، مُعلّٰی گلی پر دوسری شبیکہ کے مقام پر اور تیسری اس وادی پر جو مصفالہ کی جانب کھلتی تھی۔ ان دیواروں کی مرمت 1413ء اور 1425ء میں ہوئی تھی۔ ایک صدی گزر جانے کے بعد ان کے نشانات ہی باقی رہ گئے تھے۔

شہر میں ایک ہی عوامی جگہ ہے جو جامع مسجد کے درمیان میں چوکور شکل میں ہے۔ نہ کہیں درخت نظر آتے ہیں نہ باغات البتہ حج کے ایام میں سامان سے آراستہ دوکانیں ہر طرف دکھائی دیتی ہیں۔ چار پانچ عالیشان گھر ہیں جو شریف خاندان کی ملکیت ہیں، دو کالج ہیں (آج کل انہیں غلے کے گوداموں میں تبدیل کر دیا گیا ہے) کچھ عمارات ہیں اور چند ایک مدارس۔ مکہ کو کبھی بھی شاندار عوامی عمارات کی موجودگی پر ناز نہیں رہا۔ یہاں اتنے ہی بڑے کسی بھی مشرقی شہر کے مقابلے میں بڑی بڑی عمارات کی کمی ہے۔ نہ تو خوانین کے پاس مسافروں کے لیے اتنی بڑی بڑی عمارات ہیں نہ یہاں کے متمول لوگوں کے پاس، نہ ہی خوبصورت جامع مسجد ہیں جو مشرق کے شہروں کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔ عالیشان عمارات کی کمی کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں کے لوگ خانہ کعبہ کی عمارت کے تقدس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کوئی بلند و بالا اور عالیشان عمارت شہر میں تعمیر ہی نہیں کرنا چاہتے۔ یہ خیال انہیں عالیشان عمارات کی تعمیر سے باز رکھتا ہے جو ہو سکتا ہے بیت اللہ کی مقدس عمارت کے مقابلے میں قصداً نہ تعمیر کی جا رہی ہو۔

عمارت تعمیر کرنے کا طریقہ وہی ہے جو جدہ میں ہے جہاں کھڑکیاں گلی کی طرف کھلتی ہیں۔ یہ سب دیوار کے ساتھ ساتھ تعمیر ہوئی ہیں اور ان کا فریم ورک کافی حد تک مڑا ہوا ہے یا بہت خوبصورتی کے ساتھ اسے رنگ دیا گیا ہے۔ ان کے سامنے پردے پڑے ہوئے ہیں جس سے مکھی مچھر اندر نہیں آ سکتے۔ تاہم تازہ ہوا کا راستہ کھلا رہتا ہے۔ ہر گھر کی ایک چھت ہے۔ اس کے فرش میں معمولی سا جھکاؤ ہے تاکہ پانی کھڑا نہ ہو اور بہہ کر گڑوں کے ذریعے گلی میں چلا جائے۔ یہاں بارشیں کبھی کبھار ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ بارش کا پانی محفوظ کرنے کے لیے حوض بنا لیے جائیں جیسا کہ شام میں کیا جاتا ہے۔ چھتوں پر چھوٹی چھوٹی

پردہ دیواریں تعمیر کی جاتی ہیں تاکہ جب کوئی مرد چھت پر جائے تو ہمسائے کے گھر کی چھت پر کوئی عورت اس کی نظروں سے اوجھل رہے۔ خواتین اپنا زیادہ وقت چھتوں پر گزارتی ہیں جو چھت پر بیٹھ کر کئی گھریلو کام سرانجام دیتی ہیں مثلاً غلہ خشک کرتی ہیں، کپڑے سوکھنے کے لیے رسیوں یا دیواروں پر ڈال رہی ہوتی ہیں۔ اہل مکہ زیادہ تر مکانات کرایے پر دینے کے لیے تعمیر کرتے ہیں سوائے اہم اور متمول لوگوں کے مکانات کے جو اپنی رہائش کے لیے بنتے ہیں۔ کرائے پر دیے جانے والے مکانوں کے بہت سے کمرے ہوتے ہیں جو الگ الگ ہوتے ہیں، ان میں ایک نشست کا کمرہ اور ایک باورچی خانہ ہوتا ہے۔ جب سے حج کی ادائیگی شروع ہوئی ہے اس میں کمی واقع ہوئی ہے (یہ وہابی فتح سے پہلے کی بات ہے) یوں اہل مکہ کو اب کرائے پر اٹھنے والے کمروں سے وہ آمدنی نہیں ہوتی جو پہلے ہوتی تھی۔ اس کے نتیجے میں ان مکانوں کی مرمت کے لیے ان مالکانِ مکانات کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ یوں بہت سی عمارتیں جو شہر کے دور دراز کے علاقوں میں تھیں گر کر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ شہر کی ہر گلی میں کئی مکانات تیزی کے ساتھ گرتے جا رہے ہیں۔ مجھے نیا تعمیر شدہ مکان صرف ایک دکھائی دیا تھا جو شریف خاندان کے کسی فرد کا تھا۔ اس پر 150 پرس لاگت آئی تھی۔ اگر ایسا ہی مکان قاہرہ میں بنوایا جاتا تو اس پر 60 پرس خرچ ہوتے۔

گلیاں تمام تر کچی ہیں۔ موسم گرما میں ان میں مٹی اور ریت سے ویسی ہی پریشانی ہوتی ہے جو موسم برسات میں ان گلیوں میں موجود کیچڑ سے ہوتی ہے۔ ان دنوں ایک بارش ہو جائے تو ان گلیوں کو عبور کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ شہر کے اندرونی حصے میں بارش کے پانی کا بہاؤ نہیں ہے نہ اس کے نکاس کا کوئی انتظام ہے۔ یہ اس وقت تک کھڑا رہتا ہے جب تک یہ کھڑے کھڑے خشک نہ ہو جائے۔ اسے تباہ کن بارشوں سے منسوب کیا جا سکتا ہے جو گرم ممالک کی نسبت کم عرصے کے لیے ہوتی ہیں مگر اس قدر موسلادھار ہوتی ہیں کہ مکہ میں کوئی قدیم عمارت نظر ہی نہیں آتی۔ مختلف سلاطین کے دور حکومت میں مسجد کی کئی مرتبہ مرمت ہوئی کہ یہ اب نئی مسجد لگتی ہے اور جہاں تک مکانوں کا تعلق ہے۔ میرے خیال میں ایک مکان بھی ایسا نظر نہیں آتا جو چار صدیوں سے زیادہ پرانا ہو۔ اس لیے سیاح یہاں آ کر پرانے طرزِ تعمیر کی عمارتوں کے خوبصورت نمونے نہیں ڈھونڈتے۔ نہ ہی انہیں عربی عمارتوں کی خوبصورت باقیات ملتی ہیں جن کی آج بھی شام، مصر، باربری اور اسپین میں بڑی تعریف ہوتی ہے۔ اس حوالے سے قدیم اور قدیم شہرت کے حامل مکہ پر شام یا مصر کے صوبوں کے چھوٹے شہر سبقت لے گئے ہیں۔ یہی کچھ مدینہ کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے اور مجھے یہ شک ہے کہ یمن کے شہر عموماً

میراتی کھنڈرات کے حوالے سے بہت غریب ہیں۔

مشرقی شہروں میں پولیس کے جس قسم کے اصول اور ضابطے اپنی روایت قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا مکہ میں فقدان ہے۔ گلی کوچے رات کو تاریک نظر آتے ہیں۔ نہ کہیں کوئی چراغ جلتا نظر آتا ہے نہ لالٹین شہر کے مختلف حصوں میں دروازے نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے بھی یہ بہت سے مشرقی شہروں سے مختلف ہیں جہاں عشاء کی نماز کے بعد سارے دروازے باقاعدہ بند ہو جاتے ہیں۔ مگر اس شہر میں رات کے کسی حصے میں بھی داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اسی طرح یہاں تاجروں کی حفاظت کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ نہ شوہروں کی طرف (جن کی وجہ سے اصولاً دروازے بند کیے جاتے ہیں) جیسا کہ اتنے ہی بڑے شامی اور مصری شہروں میں دی جاتی ہے۔ گھروں کا کوڑا کرکٹ اور گندگی باہر گلیوں میں پھینک دی جاتی ہے۔ جہاں یہ موسم کے مطابق مٹی یا کیچڑ میں بدل جاتا ہے۔ یہی رسم قدیم زمانے میں پائی جاتی تھی کیونکہ میں نے شہر کے مضافاتی علاقوں میں کہیں بھی گندگی کے ڈھیر نہیں دیکھے تھے جو عموماً ترکی کے بڑے شہروں میں دیکھنے میں آتے ہیں۔

جہاں تک پینے کے پانی کا معاملہ ہے جو بے حد اہم ہے (اور ایشیائی لوگوں میں سب سے پہلے جس کے بارے میں پوچھا جاتا ہے) مکہ میں جدہ کی نسبت بہتر انتظام نہیں ہے۔ بارش کے پانی کا ذخیرہ کرنے کے لیے چند ایک حوض ہیں اور کنوؤں کا پانی اس قدر نمکین ہے کہ اسے صرف برتن دھونے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ البتہ حج کے دنوں میں حاجیوں کے سب سے نچلے طبقے کے لوگ اسے پیتے بھی ہیں۔ مسجد الحرام میں واقع زم زم کا کنواں اس قدر پانی فراہم کرتا ہے کہ یہ پورے شہر کے لیے کافی ہو مگر یہ خواہ جس قدر بھی متبرک ہو، ذائقے میں یہ بھاری ہے اور قبض پیدا کرتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ غریب لوگوں کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ اپنی مرضی سے پانی کے مشکیزے بھر کر لے جا سکیں۔ مکہ کا بہترین پانی عرفات کے علاقے سے، جو چھ سات گھنٹوں کے فاصلے پر ہے، پائپ کے ذریعے لایا جاتا ہے۔ موجودہ حکومت ایسی ہی واٹر سپلائی کے دوسرے منصوبے شروع کرنے کے بجائے اس آب ریز کی صفائی اور مرمت پر بھی بروقت توجہ نہیں دیتی یہ پوری پتھر کی بنی ہوئی ہے اور زمین کے اوپر اس کے جو حصے ہیں ان کو پتھروں کی تہ اور سیمنٹ سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ پچھلے پچاس برس میں اس کی صفائی نہیں کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب کا زیادہ پانی شہر تک پہنچنے سے قبل ضائع ہو جاتا ہے۔ عام دنوں میں پانی کی جو مقدار یہاں سے آتی ہے وہ یہاں کے مقامی لوگوں کی ضرورت بمشکل پوری کرتی ہے لیکن حج کے ایام میں یہ ناکافی رہتا ہے اور پانی کی قلت ہو

جاتی ہے۔پانی کے دو مشکیزے (دو بیک وقت ایک آدمی اٹھا سکتا ہے) ایک شلنگ میں فروخت ہوتے ہیں۔ عربوں میں یہ بہت بھاری قیمت تھی۔

مکہ مکرمہ کے اندرونی حصے میں دو جگہیں ایسی ہیں جہاں یہ آب ریز سطح زمین کے اوپر ہے۔ یہاں پانی کو چھوٹی چھوٹی نہروں اور چشموں میں بہنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے اور شریف خاندان کے چند غلاموں کو تعینات کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ ان لوگوں سے محصول وصول کر سکیں جو پانی کے مشکیزے بھر کے لے جاتے ہیں۔ حج کے دنوں میں یہاں لوگوں کا ہجوم رہتا ہے جو آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں تاکہ پہلے پانی حاصل کر سکیں۔ وہابیوں نے اپنے گذشتہ محاصرے میں پانی کی سپلائی منقطع کر دی تھی اور بڑے عرصے بعد یہ بحال ہوئی تھی۔ اس آب ریز کی لمبائی سات آٹھ گھنٹے کی ہے۔

جب ہم مکہ مکرمہ کے گردونواح کے علاقے سے گزرتے ہیں تو صحرا نظر آتا ہے کیونکہ شہر مکہ کی سمت جاتے ہوئے، درخت، باغات، خوبصورت مکانات کہیں نظر نہیں آتے بلکہ ہر طرف بے آب وگیاہ وادیاں اور چٹیل پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ ایک اجنبی جب طائف جانے والی سڑک پر سفر کرتا ہے تو پہاڑی کے موڑ کی دوسری جانب شریف کے باغ والے گھر کے بالکل قریب پہنچ کر وہ یہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ انسانی معاشرے سے کہیں دور ریتیلے بیابانی صحرا میں ہے۔ مگر اس کی وجہ یہاں کے ان باشندوں کی غفلت و کوتاہی اور زراعت سے عدم دلچسپی ہے۔ شہر بھر میں پھیلے ہوئے بیشمار کنویں ہیں اور یہاں صرف تیس فٹ کی گہرائی پر پانی نکل آتا ہے مگر لوگ اس طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔

عرب میں جہاں کہیں زمین کنوؤں کے پانی سے سیراب ہو سکتی ہے وہاں صحرا کو سرسبز کھیتوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ چند برس سے شروع کی ہوئی انڈسٹری مکہ اور اس کے ارد گرد کو کنوؤں اور شجر کاری کے لیے بہت موزوں بنانے کا موقعہ فراہم کرے گی جس طرح آج وہ بے ثمر زمین مہیا کر رہی ہے۔ ابوالولید محمد الازراقی اس وادی میں باغات کے بارے میں لکھتا ہے کہ مختلف کنویں اور چشمے جن کا اب کوئی وجود نہیں ہے۔ سیلاب اور طوفان کی وجہ سے ختم ہو گئے ہوں گے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کے زمانے میں اس شہر میں 58 سے زیادہ کنویں تھے۔ مگر تاریخ عرب کے ابتدائی زمانے میں یہ سرزمین یقیناً بنجر تھی۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ مکانات کی تعمیر وہ لوگ کرتے تھے جو مضافاتی مکہ میں گھر بناتے تھے اور اس وادی میں ببول اور دوسرے کانٹے دار درخت بہت تھے۔

مشرقی شہروں کی آبادی کا تعین بہت مشکل ہے کیونکہ وہاں نہ کوئی رجسٹر اس مقصد کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں نہ ہی گھروں کی صحیح تعداد کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ صرف دیکھ کر آبادی کا تخمینہ لگانا یا ان شہروں کا یورپی شہروں کے ساتھ موازنہ کر کے آبادی معلوم کرنا ایک بے سود کوشش ہوگی۔ مشرق میں عام طور پر مکانات (حالانکہ حجاز اس اصول سے مستثنیٰ ہے) ایک منزلہ ہوتے ہیں اس لیے یورپی مکانات کی نسبت ان کے مکینوں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ دوسری طرف مشرقی شہروں کی گلیاں بہت تنگ ہوتی ہیں۔ ان میں نہ تو بڑی بڑی منڈیاں ہوتی ہیں نہ عوام کے لیے کھلی جگہ اور ان کے دیہات میں شہروں کی نسبت زیادہ لوگ آباد ہوتے ہیں۔ تاہم سیاح ان شہروں میں سے تیزی سے گزرتے ہوئے دھوکے میں آ جاتے ہیں کیونکہ وہ تو صرف بڑی سڑکیں، بازار اور چند ایک کشادہ گلیاں دیکھ سکتے ہیں جہاں دن کے وقت زیادہ مردوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجاز اتھارٹی نے الیپو کی آبادی 200,000 دمشق کی 400,000 اور قاہرہ کی 300,000 بتائی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تین بڑے شامی شہروں کی آبادی یہ ہے: دمشق 250,000، حامہ (جس کے بارے میں، میں پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا) 60,000 تا 100,000 اور الیپو 800,000 اور 90,000 جہاں تک قاہرہ کا تعلق ہے۔ اس کی آبادی زیادہ سے زیادہ 200,000 ہوگی۔ مکہ، جہاں میں حج سے قبل اور حج کے بعد دو مرتبہ گیا اور اسے میں نے مشرق کے ہر شہر کی نسبت زیادہ قریب سے دیکھا اور اس کی آبادی میرے خیال میں 25,000 اور 30,000 کے درمیان ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شہر اور مضافات میں مستقل رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ 3000 تا 4000 تک ابی سینیا کے باشندے اور سیاہ فام غلام بھی ہیں۔ یہاں موجودہ آبادی سے تین گنا زیادہ آبادی سما سکتی ہے۔ سلطان سلیم اوّل کے عہد میں (قطب الدین کے بیان کے مطابق، 1526ء) مکہ کی آبادی جاننے کے لیے مردم شماری ہوئی تھی۔ اس مردم شماری سے قبل مکہ کے لوگوں میں غلہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ آبادی 12,000 مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھی۔ یہی مصنف لکھتا ہے کہ اس سے قبل کے زمانے میں آبادی بہت زیادہ تھی؛ کیونکہ جب راجہ داہر، قرمطیوں کے سردار نے 926ء میں مکہ میں لوٹ مار کی تو اس کے ظالم سپاہیوں نے 30,000 افراد کو قتل کر دیا تھا۔

عرفات کو جانے والا جلوس: شام اور مصر سے آنے والے قافلے ہمیشہ مقررہ تاریخوں میں پہنچتے ہیں، عموماً حجاج کے عرفات کے لیے روانہ ہونے سے ایک دو روز قبل۔ یہ دونوں قافلے ایک ہی روز مکہ سے گزرتے ہیں یا ان دونوں کی یہاں آمد میں ایک دن کا فرق ہوتا ہے۔ شامی قافلہ مدینے سے آ رہا ہوتا

ہے اور مصری قافلہ یانبُو سے۔ ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر رہ کر یہ بدر تا مکہ تک کا راستہ طے کرتے ہیں۔ ماہ ذی الحجہ کی پانچ تاریخ کو یا نومبر 1814ء کی 21 تاریخ کو اس کے اسکاؤٹوں میں سے ایک نے شامی قافلے کی آمد کا اعلان کیا، جو گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا شہر میں داخل ہو رہا تھا تا کہ وہ انعام حاصل کر سکے جو اس شخص کو دیا جاتا تھا جو اس قافلے کے بخیریت پہنچنے کی سب سے پہلے اطلاع دیتا تھا۔ ہجوم میں سے بہت سے لوگ اس کے ہمراہ گورنر ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔ وہ جونہی گھوڑے سے اترا اس کا گھوڑا مر گیا تھا۔ خبر اس لیے اہم تھی کیونکہ اس حج قافلے کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ یہ افواہیں پھیل چکی تھیں کہ مدینہ کے شمال میں بدوؤں نے راستے میں اس قافلے کو لوٹ لیا تھا۔ دو گھنٹوں کے بعد اس قافلے سے تعلق رکھنے والے بہت سے دوسرے افراد بھی پہنچ گئے تھے اور رات کے وقت پورا قافلہ پہنچ کر دمشق کے پاشا کی سرکردگی میں میدان شیخ محمود میں اتر چکا تھا۔

اگلی صبح مصری قافلہ بھی آ گیا تھا۔ بھاری سامان اور اونٹوں کو اس جگہ بھیج دیا گیا تھا جہاں مصری حجاج ٹھہرے تھے لیکن محمل یا مقدس اونٹ میدان شیخ محمود ہی میں موجود رہا اس لیے کہ اس اونٹ کو اگلے روز وہاں سے جلوس کے ساتھ شہر میں سے گزارنا تھا۔ پاشا محمد علی غیر متوقع طور پر اس صبح طائف سے آ گیا تھا تا کہ حج کے موقعہ پر موجود ہو۔ وہ اس رسالے کے سپاہیوں کا معائنہ بھی کرنا چاہتا تھا جو مصری قافلے کے ہمراہ آئے تھے۔ یہ وہ کمک بھی تھی جس نے وہابیوں کے خلاف اس کی کامیابی کی اُمیدوں کو بڑی تقویت دی تھی۔ اس نے بے حد خوبصورت احرام باندھ رکھا تھا۔ یہ دو سفید کشمیرہ کی چادریں تھیں اس کا سر ننگا تھا لیکن ایک افسر نے اسے چھتری کا سایہ مہیا کر رکھا تھا تا کہ گلیوں سے گھوڑے پر سوار گزرتے وقت وہ دھوپ سے بچ سکے۔ اُسی صبح ان تمام حجاج نے اپنے احرام باندھ لیے تھے، جو مکہ کے رہنے والے تھے۔ عرفات کے لیے روانہ ہونے سے قبل یہ تمام مذہبی رسوم ادا کر لیتے ہیں۔ نصف دن گزرنے پر وہ مسجد میں جمع ہو گئے تھے۔ اس موقع پر ایک مختصر وعظ ہوا۔ وہ حجاج جو قافلے کے ہمراہ آئے تھے انہوں نے عسفان کے مقام پر پہنچنے کے بعد احرام باندھ لیا تھا۔ یہ مقام مکے سے دو پڑاؤ پہلے آتا ہے۔ لیکن نوکروں اور شتربانوں نے ابھی اپنا لباس اتار کر احرام نہیں باندھا تھا مگر پھر بھی یہ عرفات میں اپنے مالکوں کے ساتھ موجود تھے، نہ کسی نے انہیں حیرت سے دیکھا نہ حقارت کی نظر سے دیکھا۔ یہاں کوئی مذہبی پولیس نہیں ہوتی نہ اس حوالے سے کوئی باز پرس کرنے والا۔ ہر شخص اپنے ضمیر کی آواز پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ بات ان پر چھوڑ دی جاتی ہے کہ وہ مذہبی رسوم کی ادائیگی میں مذہبی اصولوں کی

پابندی کریں یا اس میں کسی کوتاہی کے مرتکب ہوں۔
شہر میں آج شام بڑی چہل پہل تھی۔ ہر کوئی عرفات کے سفر پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ شامی حجاج اپنی رہائش گاہوں کا انتظام کرنے آئے ہوئے تھے، مارکیٹوں، بازاروں سے متعارف ہو رہے تھے اور اپنی پہلی حاضری کے لیے بیت اللہ کا رُخ کر رہے تھے۔ کچھ چھوٹے دوکانداروں نے شہر چھوڑ کر پہلے ہی عرفات پہنچ کر اپنے پاؤں جما لیے تھے اور حجاج کی وہاں آمد کے منتظر تھے تا کہ یہ لوگ وہاں پہنچیں اور خریداری کریں۔

شام اور مصر کے بہت سے شتربانوں کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے اونٹوں سے سامان اتار کر انہیں شہر کی گلیوں سے لیے جا رہے ہیں۔ وہ حجاج کو یہ پیشکش کر رہے تھے کہ ان کے ساتھ عرفات چلیں وہ اس طرح کچھ پیسے کمانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس سال چونکہ لوگ باربرداری کے لیے گدھے زیادہ لائے تھے اس لیے کرایے بہت مناسب تھے۔ میں نے عرفات تک کے سفر میں آنے جانے کے لیے چار روز کے لیے دو اونٹ تین ڈالر کرایے پر لے لیے تھے۔

آج مہینے کی آٹھ تاریخ تھی۔ شام سے آنے والے حجاج جلوس کی شکل میں شہر سے گزر رہے تھے، ان کے تمام سپاہی بھی ان کے ساتھ تھے اور ان کے آگے آگے محمل تھا۔ اس اونٹ کا تمام سامان میدانِ شیخ محمود میں اتار دیا گیا تھا صرف خیمے ساتھ تھے جو عرفات میں نصب کیے جانے تھے۔ زیادہ تر حجاج اونٹوں پر رکھے ہوئے صوفہ نما شبریہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دمشق کا پاشا اور متمول افراد ایک قسم کے صندوقوں میں بیٹھے ہوئے تھے جنہیں دو اونٹ اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ بے حد آرام دہ تھے اور ایک آگے اور دوسرا پیچھے رکھا ہوا تھا۔ البتہ ان میں بیٹھنے یا ان میں سے اترنے کے لیے سیڑھی استعمال کی جاتی تھی۔ اونٹوں کو سجایا جاتا تھا اور ان کی گردنوں میں گھنٹیاں لٹک رہی ہوتی تھیں۔ ان کے سر زمین کی طرف جھکے ہوتے تھے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ اس سفر کے دوران بہت تھک جاتے تھے۔ جب یہ گزرتے تھے اس وقت ہر طبقے کے لوگ راستے کے دونوں طرف قطاریں باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور قافلے میں شامل افراد کو خوش آمدید کہتے تھے۔ دمشق کے پاشا کی عسکری موسیقی، ایک درجن عمدہ نسل کے سجائے ہوئے گھوڑے اس کے کھٹولے کے سامنے چلتے تھے اور وہ قیمتی صندوق جن میں بیٹھ کر ان کی خواتین اونٹوں پر سوار سفر کرتی تھیں، ان کی طرف لوگوں کی بڑی توجہ ہوتی تھی۔

شامی حجاج کے گزر جانے کے بعد مصری حجاج کا جلوس گزرتا تھا، اس کے ساتھ بھی محمل ہوتا تھا(ہر قافلے کے ساتھ یہ ہوتا ہے) اور سرکاری افسروں کے صوفہ نما کھٹولے ہوتے تھے جو حجاج کے ساتھ چلتے تھے لیکن ایک بھی پرائیویٹ حاجی اپنے کمرے میں نظر نہ آتا تھا۔ ان کے ساتھ سفر کرنے والے سپاہی بہت خوبصورت ہوتے تھے، محمل شاندار اور امیر حج کا سامان جو ترک گھوڑ سواروں کا کماندار ہوتا تھا، کو اہل مکہ تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے۔ دونوں قافلے بغیر رکے عرفات تک اپنا سفر جاری رکھتے تھے۔

دوپہر سے قبل وہ تمام حجاج جو کچھ دیر کے لیے مکے میں ٹھہرے تھے، اپنے اونٹوں پر سوار ہو گئے تھے اور حج کی رسم ادا کرتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ مکہ کی آبادی کے زیادہ حصے کے لوگ ان کے ساتھ آ کر شامل ہو گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا اصول تھا کہ یہ ہر سال عرفات پر جاتے تھے اور جدہ کی آبادی کا بھی اسی قدر حصہ یہاں کچھ دیر کے لیے جمع ہو جاتا تھا۔ یوں بہت سے لوگ یہاں سے چلے جاتے تھے اور بہت سے لوگ جو یہاں رہ جاتے تھے، یہ اندر بند ہی رہتے تھے۔ میں نے دوپہر کے بعد اپنی رہائش گاہ سے اپنے ایک ساتھی اور ایک غلام کے ہمراہ دو اونٹوں پر سفر کیا جو میں نے ایک شامی شتربان سے کرایے پر لیے تھے۔ عرفات تک کا چھ گھنٹوں کا سفر پیدل کرنا ایک اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کوئی حاجی برہنہ پا یہ سفر کر رہا ہو۔ بہت سے حاجیوں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے اسے پسند کیا کیونکہ پچھلے کئی ماہ سے میں نے نماز پڑھ کر وقت گزارا تھا۔ کئی گھنٹوں کے بعد ہم شہر کے مضافاتی علاقے میں پہنچے تھے۔ اونٹوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ کئی حادثات پیش آئے۔ حجاج کی زیادہ تعداد سفید احرام باندھے ہوئے تھی۔ ان میں سے کچھ تو اپنے اونٹوں پر سوار قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ کچھ بلند آواز سے دعائیں مانگتے جا رہے تھے۔ بقیہ اپنے ان شتربانوں کو کوس رہے تھے جن سے سفر نہیں کٹ رہا تھا۔ شہر سے نکل کر سڑک چوڑی ہو جاتی ہے اور ہم دو گھنٹوں تک وادیوں میں سے بڑی سست رفتاری کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ وادیٔ منیٰ میں پہنچ کر تنگ راستے کی وجہ سے کافی افراتفری پھیل گئی تھی۔ حجاج کو منیٰ میں پانچ نمازیں ضرور ادا کرنی ہوتی ہیں اس لیے کہ آنحضورؐ نے ہمیشہ ایسا ہی کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ دوپہر کو وہاں پہنچیں گے، ظہر کی نماز ادا کریں گے اور پھر اگلی صبح تک عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کریں گے اور پھر نئے دن کی نماز فجر بھی انہیں یہیں ادا کرنی ہوگی۔ راستے میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے حجاج کو جب پریشانی لاحق ہوتی تھی تو وہ اس اصول کی پابندی میں کوتاہی کر جاتے تھے۔ حجاج بغیر رکے عرفات پر پہنچ جاتے تھے۔

منیٰ سے کچھ پہلے ہم مزدلفہ کی مسجد میں پہنچے جو ہمارے دائیں جانب تھی، یہاں بہت سے حاجیوں نے عصر اور مغرب کی نمازیں ادا کیں مگر قافلے نے سفر جاری رکھا۔ مزدلفہ کے بعد ہم ایک اور درے سے گزرے تھے جس کی مشرقی سمت میں عرفات کا میدان ہے۔ یہاں حجاج دو ستونوں کے درمیان میں سے گزرے جن کو عالمین کہتے ہیں۔ جبلِ عرفات پر پہنچ کر سب اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے تاکہ پڑاؤ ڈالنے کے لیے جگہ دیکھ سکیں۔ میں غروب آفتاب کے تین گھنٹے بعد کیمپ میں پہنچا تھا لیکن میرے بعد آنے والے اکا دکا افراد نصف شب تک نہیں پہنچے تھے۔ تین چار میل کی لمبائی میں آگ روشن تھی۔ جہاں لالٹینوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہاں محمد علی سلیمان پاشا اور مصری قافلے کے امیر الحج کے کیمپ تھے۔ حجاج ادھر ادھر خیموں میں پھر کر اپنے ان ساتھیوں کو تلاش کر رہے تھے جنہیں وہ راستے میں کھو بیٹھے تھے۔ اس رات بہت کم لوگ سوئے تھے۔ یہ لوگ شب بھر عبادت میں مصروف رہے۔ شامی قافلے کے کیمپ کی جانب خاص طور حجاج کی گریہ وزاری سنی جا سکتی تھی، جو وہ اپنے خالق حقیقی کے حضور میں کر رہے تھے۔ خوشی ومسرت سے شاداں اہل مکہ نے چھوٹی چھوٹی پارٹیاں تشکیل دے لی تھیں، یہ گا بھی رہے تھے اور تالیاں بھی بجاتے جا رہے تھے۔ کافی ہاؤسز جو عرفات کے میدان میں پھیلے ہوئے تھے وہاں رات بھر کافی پینے والوں کا ہجوم رہا۔

رات سیاہ اور خنک تھی اور بارش کے چھینٹے بھی پڑے تھے۔ میں نے ایک مکی کے خیمے کے پچھلے حصے میں ایک بڑا قالین باندھ کر اپنے لیے آرام دہ جگہ بنالی تھی۔ رات کے زیادہ حصے میں تو میں گھومتا رہا اور پھر میری آنکھ ہی لگی تھی کہ شامی اور مصری حجاج نے دو بندوقیں چلا کر حج کے دن کی تھوڑی دیر بعد آمد کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ ایمان والوں کو بلا رہے تھے کہ وہ نماز فجر کی تیاری کریں۔

ایک غیر مُتحرک دن میں پہرہ: 9۔ذی الحجہ کو طلوع آفتاب کے ساتھ ہی ہر حاجی اپنے خیمے سے نکل کر میدان کی طرف جا رہا تھا۔ وہ وہاں سے حجاج کے جم غفیر کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔ خیموں کی لمبی قطاریں، بازاروں کی مانند نصب، جہاں ہر قسم کے کھانے پینے کی چیزیں دستیاب ہیں۔ شامی اور مصری رسالے کے سپاہیوں کو ان کے کمانڈروں نے صبح صبح ورزش کے لیے صف آرا کر لیا تھا۔ ہزاروں اونٹ کیمپ کے گرد میدان کی خشک بوٹیاں چر رہے تھے۔ میں کوہ عرفات پر چڑھ گیا تھا تاکہ وہاں سے زیادہ واضح اور صاف منظر دیکھ سکوں۔

چقماق کی یہ پہاڑی جبل الرحمت بھی کہلاتی ہے جو پہاڑا سے گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے قریب

واقع میدان کے شمال مشرق میں کھڑی ہے لیکن ایک وادی اسے ان پہاڑوں سے جدا کرتی ہے۔اس کا قطر ایک میل یا ڈیڑھ میل ہوگا۔اس کی اطراف ڈھلوان ہیں اوراس کی چوٹی میدان سے دوسوفٹ بلند ہے۔مشرقی سمت سے پتھر کی بنی ہوئی سیڑھیاں اس کی چوٹی تک جاتی ہیں۔اس تک پہنچنے والا ایک کچا راستہ ہے۔تقریباً چالیس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہمیں بائیں جانب ایک جگہ نظر آتی ہے جسے ہمارے جدامجد حضرت آدمؑ کی جائے نماز کہتے ہیں۔یہاں بتایا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ عبادت کرتے تھے۔یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت جبریلؑ نے حضرت آدمؑ کو یہ سکھایا تھا کہ خالق حقیقی کی عبادت کس طرح کرنی ہے۔ایک سنگ مرمر کی سل لگی ہوئی ہے جس پر جدید حروف میں کچھ لکھا ہوا ہے۔یہ پہاڑ میں ایک جگہ نصب ہے۔ساٹھویں سیڑھی پر پہنچنے کے بعد ہمیں اپنی دائیں طرف ایک پختہ چبوترہ نظر آتا ہے جو پہاڑی کے ہموار مقام پر ہے۔جہاں اس روز بعد دوپہر ایک مبلّغ حجاج سے مخاطب ہوتا ہے۔اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔یہ اونچی اونچی سیڑھیاں اس قدر چوڑی ہیں کہ ان پر گھوڑا اور اونٹ بھی چڑھ سکتا ہے لیکن مزید بلندی پر جا کر یہ عمودی ہو جاتی ہے۔چوٹی پر وہ جگہ دکھائی گئی ہے جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حج کے دنوں میں کھڑے ہوتے تھے۔یہاں کسی زمانے میں ایک عبادت گاہ بھی تھی مگر وہابیوں نے اسے مسمار کر دیا تھا۔یہاں حجاج عموماً دو رکعتیں ادا کرتے ہیں۔سیڑھیوں اور چوٹی پر رومال رکھے ہوئے ہیں تاکہ ان میں مقدس تحائف رکھے جا سکیں۔اہل مکہ اور بدوؤں کا ہر خاندان جس کا تعلق قبیلہ قریش سے ہو، جس کے علاقے میں عرفات واقع ہے، اس مقصد کے لیے مخصوص جگہ پاتا ہے۔

پہاڑ کی چوٹی ایک بہت وسیع اور منفرد سماں پیش کرتی ہے۔میں اپنا قطب نما اپنے ساتھ لاتا تھا تاکہ افقی سمت کا دائرہ کھینچ سکوں مگر حاجیوں کا اجتماع اس قدر بڑا تھا کہ میں اسے استعمال ہی نہ کر سکا۔میدان کی انتہائی مغربی سمت میں بصان کنواں اور (حرم کی زمین کی حد مقرر کرنے والے ستون) جنوب کی طرف بہت قریب نمیرا مسجد ہے اور جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سا گھر ہے جہاں شریف حج کے دوران ٹھہرتا تھا۔وہاں سے آگے ایک ابھری ہوئی چٹانی زمین میدان سے کوہ عرفات تک چلی گئی ہے۔پہاڑ کی مشرقی سمت اوراس کے بالکل دامن میں ایک ایسی چھوٹی سی مسجد کے کھنڈرات ہیں جسے پتھریلی زمین پر تعمیر کیا گیا تھا جہاں آنحضورؐ نماز ادا کیا کرتے تھے۔حجاج یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔پانی کے بہت سے ذخیرے میدان میں پھیلے ہوئے ہیں جن کو پتھروں سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ان سب سے بذریعہ آب ریز پانی مکہ کو سپلائی کیا جاتا ہے۔اس پانی کا منبع یہاں سے ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر مشرقی پہاڑوں میں ہے۔نہر کو حجاج کی

سہولت کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے جو پہاڑوں کی تین اطراف میں جاتی ہے۔اس کا گزر حضرت آدمؑ کی جائے نماز کے قریب سے ہوتا ہے۔

کوہ عرفات کی چوٹی سے میں نے تین ہزار خیمے گنے جو میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ان میں دو تہائی دو حج قافلوں کے تھے اور کچھ محمد علی کے سپاہیوں کے اور بقیہ شریف خاندان کے عربوں کے تھے۔ان کے علاوہ کچھ خیمے بدو حاجیوں اور مکہ وجدہ کے لوگوں کے بھی تھے۔

میری طرح کے اور بہت سے ایسے لوگ تھے جن کے خیمے نہیں تھے۔دو قافلے کسی ترتیب کے بغیر یہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔حجاج کے ہر گروہ اور سپاہیوں نے اپنے خیمے دائرے کی شکل میں نصب کر رکھے تھے جن کے مرکز میں ان کے اونٹ آرام کرتے تھے۔اس میدان میں حجاج کے ساتھ بیس پچیس ہزار اونٹ تھے۔ان میں سے بارہ ہزار اونٹ شامی حجاج کے اور پانچ سے چھ ہزار تک مصری حجاج کے تھے۔ان کے علاوہ تقریباً تین ہزار اونٹ محمد علی نے شام کے صحرائی بدوؤں سے خریدے تھے اور انہیں حجاج کے ہمراہ لے آیا تھا۔ان سے حجاج کو یہاں پہنچانے میں مدد لی گئی تھی۔اس سے قبل یہ اونٹ فوج کے لیے کھانے پینے کا سامان طائف تک بار برداری کے لیے استعمال ہوتے تھے۔

شامی حج قافلہ پہاڑ کے جنوب میں اور جنوب مشرق میں مصری قافلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ شریف کے گھر کے گرد یحییٰ نے اپنے بدو دستوں سمیت کیمپ لگا رکھا تھا۔اس کے قرب وجوار میں حجاز کے تمام لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔یہاں کبھی دو یمنی قافلے ٹھہرا کرتے تھے۔محمد علی اور سلیمان پاشا کے اور ان کے بہت سے افسروں کے بڑے خوبصورت خیمے یہاں نصب تھے۔ان سب میں جو خیمہ سب سے زیادہ خوبصورت تھا وہ محمد علی کی بیوی کا تھا جو کچھ تاخیر سے قاہرہ سے حج کے لیے یہاں پہنچی تھی۔اس کے سامان کو جدہ سے مکہ لانے کے لیے پانچ سو اونٹ ضروری تھے۔اس کے خیمے کے ساتھ ساتھ 12 اور خیمے مختلف سائز کے نصب تھے جن میں خواتین مقیم تھیں۔ان کے گرد لنن کے کپڑے کی ایک چار دیواری تھی۔ان سب کا ایک ہی اندر جانے کا دروازہ تھا جس پر خواجہ سرا عالیشان لباس میں متعین تھے۔اس چار دیواری کے ساتھ ساتھ مردوں کے خیمے نصب تھے۔لنن کے اس محل کے بیرونی حصے پر کشیدہ کاری کا عمدہ کام کیا گیا تھا۔اس کے مختلف رنگ تھے جو اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے۔اسے دیکھ کر مجھے عربی داستانیں یاد آتی تھیں دوسرے حجاج کے پاس قیمتی سامان اگر تھا تو وہ ایک تاجر جیلانی کے پاس تھا جس کے خیمے نیم دائرے میں نصب کیے گئے تھے۔یہ دونوں

پاشاؤں کے خیموں سے اپنی خوبصورتی میں سبقت لے گئے تھے اور شریف یحیٰی کے خیموں سے بھی خوبصورتی میں بڑھ گئے تھے۔ مشرق کے دوسرے حصوں میں کسی پاشا کے مقابلے میں اپنی دولت کی نمائش سے بہتر ایک ایسی رسی لے لینے کو ترجیح دے گا جس کو وہ اپنی گردن کے لیے خرید لے۔ لیکن جیلانی ابھی تک اہل مکہ کی ان رسوم کو نہیں بھولا تھا جو انہوں نے اپنے قدیم حکومت کے دنوں میں سیکھی تھیں۔ خصوصاً شریف غالب کی جو اکثر کسی فرد واحد کا استحصال بالجبر کر لیا کرتا تھا اور وہ اب محمد علی کے وعدوں پر اعتبار کرتے ہیں کہ وہ ان کی املاک کا احترام کرے گا۔

تمام صبح توپوں کے چلنے کی آوازیں آتی رہی تھیں جو دونوں پاشا اپنے ساتھ لائے تھے کچھ حجاج ایسے بھی تھے جنہوں نے کوہ عرفات کی چھوٹی چھوٹی غاروں میں رہائش رکھ لی تھی تاکہ سورج کی گرمی سے محفوظ رہ سکیں۔ مشرق میں عموماً یہ تاثر پایا جاتا ہے اور بہت سے حجاج، حج سے واپسی پر بڑے فخر سے اس کی تصدیق بھی کرتے ہیں کہ اس روز تمام حجاج کوہ عرفات پر پڑاؤ ڈالتے ہیں اور اس پہاڑ کو پھیل جانے کی معجزانہ قوت عطا ہوئی ہے تاکہ یہ اپنی چوٹی پر لاتعداد مومنین کو جگہ فراہم کر دے۔ قانون کا تقاضا تو یہ ہے کہ حجاج کو کوہ عرفات پر ٹھہرنا چاہیے لیکن یہ کسی اس قسم کے ناممکن امکان کے متعلق بھی دانشمندانہ فیصلہ سناتا ہے کہ پہاڑ کے بالکل قریب میدان کو بھی ''پہاڑ'' کی اصطلاح میں شامل کر لیا جائے۔

کوہ عرفات پر جمع افراد کی تعداد کا اندازہ میں نے ستر ہزار لگایا تھا کیمپ کی لمبائی تین سے چار میل اور چوڑائی ایک سے دو میل تھی۔ غالباً دنیا بھر میں کوئی اس قدر چھوٹی سی جگہ نہیں ہوگی جہاں اس قدر مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ چالیس کے لگ بھگ تھیں اور اس میں کوئی شک وشبے کی بات نہیں کہ ہوسکتا ہے ان زبانوں کی تعداد چالیس سے بھی زیادہ ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے میں صرف سیاحوں کی ایک مقدس عبادت گاہ میں ہوں اور مجھے کبھی یہ خواہش پیدا نہ ہوئی کہ میں نے جن لوگوں کو یہاں اپنے سامنے دیکھا ان کے ملکوں کے اندرون تک رسائی حاصل کرسکوں۔ مجھے خیال آیا کہ جس طرح وہ اپنے اپنے ملک سے سفر کر کے یہاں پہنچ گئے ہیں میں بھی اگر چاہوں تو ان کے ملکوں تک پہنچ سکتا ہوں۔

جس وقت اس قسم کی بہت سی چیزیں آپ کی توجہ کا مرکز بن جائیں اُس وقت، گردش دوراں تیز تر ہو جاتی ہے۔ میں کوہ عرفات سے نیچے اتر آیا تھا اور کچھ دیر کیمپ کے اندر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ اس دوران میں نے مختلف حاجیوں سے گفتگو بھی کی (شامی کیمپ میں اپنے کچھ دوستوں کی خیریت، علوم کی اور شامی بدوؤں

کے کیمپ میں ان کے صحراؤں کے بارے میں خبریں جاننے کی خواہش کا اظہار کیا) یوں دوپہر کا وقت ہو گیا تھا۔ ظہر کی نماز یا تو انہیں خیموں کے اندر ادا کرنی تھی یا مسجد نمیرا کے بالکل پڑوس میں جہاں دونوں پاشا اس مقصد کے لیے جاتے تھے۔ بہت سے حجاج یہ نماز خیمے میں ہی پڑھ لیتے ہیں، کچھ چھوڑ بھی دیتے ہیں کیونکہ یہاں کوئی بھی اس بات کی فکر نہیں کرتا کہ اس کے ہمسائے نے پابندی سے نماز ادا کی ہے یا نہیں اور وہ مذہبی رسوم کی ادائیگی پابندی سے کر رہا ہے یا نہیں۔ نصف دن گزرنے کے بعد حجاج غسل کرتے ہیں جو لازمی ہوتا ہے اس مقصد کے لیے میدان میں بیشمار خیمے نصب کر دیئے جاتے ہیں۔ مطلع ابر آلود تھا اور معمولی سی سردی بھی تھی۔ حجاج سردی سے کانپ رہے تھے کیونکہ انہوں نے پتلے کپڑے کے احرام باندھ رکھے تھے۔ بہت سے ایسے تھے جنہوں نے غسل کے بجائے عام وضو کر لیا تھا۔ نماز عصر کا وقت ہو گیا تھا۔ اس وقت حج کی رسم شروع ہوتی ہے جس کے لیے یہ تمام لوگ یہاں آئے ہوئے تھے۔

حجاج نے اب کوہ عرفات کی جانب ایک دوسرے کو دھکیلنا شروع کر دیا تھا اور چوٹی سے دامن تک حاجیوں کا سیلاب نظر آ رہا تھا۔ عصر کے وقت ایک مبلغ نے پہاڑ پر بنے ہوئے چبوترے پر جگہ سنبھالی اور لوگوں سے خطاب شروع کیا۔ یہ وعظ غروب آفتاب تک جاری رہتا ہے۔ اس میں حج کی وہ مقدس مذہبی رسم شامل ہے جسے خطبہ الوقوف کہتے ہیں اور کوئی بھی حاجی خواہ وہ مکے کے تمام مقامات مقدسہ پر جا چکا ہو اس وقت تک حاجی کا خطاب نہیں پا سکتا جب تک وہ اس موقعہ پر یہاں موجود نہ ہو۔ عصر کی نماز کے قریب آتے ہی تمام خیمے خالی ہو گئے تھے، سامان لپیٹ دیا گیا تھا۔ حجاج نے اپنے اپنے اونٹوں پر سوار ہونا شروع کر دیا تھا۔ یہ جلد از جلد مبلغ کی نگاہ میں آنا چاہتے تھے، جہاں سے انہیں وہ نظر آ سکے۔ دونوں پاشا مبلغ کا وعظ بہت انہماک سے سن رہے تھے، ان کے رسالے کے سپاہیوں کے دو سکواڈرن ان کے پیچھے تھے شریف یحیٰی ان دونوں سے کچھ فاصلے پر وعظ سن رہا تھا جس کے ساتھ محدود سی تعداد میں سپاہی تھے۔ اس کی پہچان وہ سبز پرچم تھے جو اس کے سامنے تھے۔ دو محمل یا مقدس اونٹ جن کی پیٹھ پر وہ مخروطی چوبی بلند پشتہ تھا جو متعلقہ قافلوں کے لیے نشان کا کام دیتا ہے، بڑی مشکل سے ان اونٹوں کے درمیان میں سے گزر رہے تھے جنہوں نے مبلغ کے سامنے جنوبی اور مشرقی اطراف سے پہاڑی کو گھیرا ہوا تھا۔ یہ وہاں جا کر کھڑے ہو گئے تھے جہاں اس چبوترے کے نیچے ان کے اردگرد گارڈ کھڑے تھے۔

یہ مبلغ عموماً مکے کا قاضی ہوتا ہے جو ایک عمدہ طریقے سے سجائے ہوئے اونٹ پر سوار ہو کر سیڑھیوں

کی طرف آتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ آنحضورؐ جب اپنے پیروکاروں سے خطاب فرماتے تھے تو ہمیشہ یہاں بیٹھ کران سے مخاطب ہوتے تھے۔ پھر تمام صحابہ کرامؓ بھی جب حج کے لیے آتے تو سامعین سے خطاب کرتے وقت اللہ کے رسولؐ کی تقلید میں ایسا ہی کرتے تھے۔ قسطنطنیہ کا یہ معزز ترک جو اونٹ کی سواری کا عادی نہ تھا، وہ اونٹ پر اس طرح جم کر نہ بیٹھ سکا تھا جس طرح آنحضورؐ بیٹھتے تھے جن کا تعلق اس سرزمین سے تھا۔ اس ترک کا اونٹ جب بے قابو ہو گیا تو اسے فوراً اس کی پیٹھ سے نیچے اترنا پڑا۔ اس نے اپنا وعظ عربی کی ایک کتاب میں سے دیا جو اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ ہر چار پانچ منٹ کے بعد توقف کرتا اور اپنے بازو پھیلا کر عرش سے رحمت خداوندی طلب کرتا تھا جبکہ وہاں حجاج کرام اپنے احرام کے کنارے کو اپنے سروں پر لہراتے تھے اور فضا ''لبیک اللھم لبیک'' کی صداؤں سے گونج اٹھتی تھی۔ یہ احرام کے کونے کو جس وقت لہراتے تھے اس دوران پہاڑ کی اطراف جہاں حجاج جمع تھے ان کے سفید احرام ایک پانی کی آبشار کی شکل بنا لیتے تھے جبکہ وہ سبز چھتریاں جو ہزاروں حاجیوں نے اٹھا رکھی تھیں اور اونٹوں پر سوار تھے ایک سرسبز و شاداب لہلہاتا میدان دکھائی دیتا تھا۔

بالآخر سورج مغربی پہاڑوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا۔ قاضی نے کتاب بند کر کے آخری بار ''لبیک'' کی صدا دی اور پھر یہ سارا ہجوم پہاڑ سے نیچے اتر گیا تا کہ اب عرفات کو چھوڑ دیا جائے۔ اس موقع پر تیز قدموں سے چلنا زیادہ مستحسن سمجھا جاتا ہے اور بہت سے لوگ تو باقاعدہ دوڑنا شروع کر دیتے ہیں جسے عرب عرفات سے دوڑنا کہتے ہیں۔ اگلے زمانے میں جب شامی اور مصری قافلوں میں تقریباً توازن تھا، ان کے درمیان یہاں ہر سال خونی فسادات ہوتے تھے۔ ہر ایک قافلے کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ دوسرے کی نسبت پہلے محمل کو آگے لے جائے۔ وعظ کے وقت بھی یہی کچھ ہوتا جب یہ محمل چبوترے کے قریب پہنچے تھے۔ ایک موقعہ پر قبیلے کی انا کی خاطر دو سو جانیں ضائع ہو گئی تھیں۔ آج کل محمد علی زیادہ طاقتور ہے اس لیے شامی حجاج بڑی عاجزی و انکساری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

متحدہ قافلے اور حجاج کا ایک سیلاب میدان میں آگے کی سمت بڑھ رہا تھا۔ ہر خیمہ پہلے ہی لپیٹ لیا گیا تھا تا کہ سفر کے لیے روانگی میں تاخیر نہ ہو۔ حجاج عالمین ستونوں کے درمیان سے گزر رہے تھے جہاں سے انہیں واپسی پر پھر گزرنا تھا۔ رات ہو گئی تھی اور مشعلیں روشن کر لی گئی تھیں، ہر پاشا کے آگے آگے 24 مشعل بردار چل رہے تھے اور ان کی چنگاریاں میدان میں دور تک پھیل رہی تھیں۔ توپیں مسلسل چل رہی

تھیں، سپاہی اپنی اپنی بندوقوں سے گولیاں چلا رہے تھے۔ دونوں پاشاؤں کے عسکری بینڈ بج رہے تھے۔
پاشاؤں کے افسران بھی ہوائیاں چھوڑ رہے تھے۔ حجاج کی تیز رفتاری سے ایک طرح کی بدنظمی پھیل رہی تھی۔
شوروغل میں کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہم مزدلفہ کی سمت بڑھ رہے تھے جہاں دو گھنٹے کے سفر کے بعد
سب اونٹوں سے اتر گئے تھے۔ یہاں پڑاؤ ڈالتے وقت بھی کسی نظم وضبط کا خیال نہیں رکھا جا رہا تھا۔ جو جہاں
پہنچا وہیں ٹھہر گیا۔ سوائے پاشاؤں کے خیموں کے کسی نے خیمے نصب نہیں کیے تھے۔ ان خیموں کے سامنے
رات بھر چراغاں کا سا سماں رہا اور توپوں کے گولے رات بھر چلتے رہے۔ عرفات سے روانہ ہونے والے حجاج
کی افراتفری میں بہت سے حجاج کے اونٹ گم ہو گئے تھے۔ یہ اپنے شتربانوں کو چلا چلا کر آوازیں دے رہے
تھے اور انہیں ہر طرف تلاش کرتے پھرتے تھے۔ ان میں، میں بھی شامل تھا۔ کوہ عرفات پر پہنچ کر میں نے اپنے
شتربان اور اپنے غلام کو حکم دیا تھا کہ غروب آفتاب کے بعد جب تک میں نہ آؤں یہ دونوں اسی جگہ موجود رہیں
جہاں وہ اس وقت تھے۔ مگر جونہی میں نے انہیں وہاں چھوڑا دوسرے سامان سے لدے ہوئے اونٹ پہاڑ کی
سمت بڑھے تو یہ بھی ان کے پیچھے ہو لئے تھے۔ میں جب وہاں پہنچا جہاں ان کو چھوڑ کر گیا تھا تو وہ وہاں موجود نہ
تھے۔ میں مجبوراً مزدلفہ کی طرف چل پڑا تھا جہاں پہنچ کر میں ریت پر سو گیا تھا۔ میرے جسم پر صرف احرام تھا اور
کوئی شے پاس نہ تھی۔ میں سونے سے قبل کئی گھنٹوں تک اپنے لوگوں کی تلاش میں رہا تھا۔

☆☆☆

تیسرا حصّہ

اُنیسویں صدی تبدیل ہوتی ہے

1853—1908ء

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب مغربی مفادات نے عالمی تجارت پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تو شطرنج پر یورپ کے اثر ورسوخ نے ایک نیا عروج حاصل کرلیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت تھی۔ مصر میں دولت کی تجوریوں کے منہ اس کی مرضی ومنشا سے کھلتے بند ہوتے تھے اور بحیرۂ احمر میں جہاز رانی پر اس کی اجارہ داری تھی۔ وہ سوئز اور بمبئی (موجودہ ممبئی) کے درمیان سامان تجارت کے بہاؤ کو مؤثر طور پر کنٹرول کرر ہا تھا۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں شامل مصنف سیاح رچرڈ برٹن نے یہ بات کوئی مذاق میں نہیں کہی کہ برطانیہ عظمیٰ دنیا کی سب سے بڑی مسلم سلطنت ہے۔ اسی طرح روس نے سلطنتِ عثمانیہ کی بہت سی سرزمین، جو اس کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ تھی اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ ہالینڈ (ڈچ) اور برطانوی جہاز رانی نے مسلم بحری علاقوں میں مثلاً جنوب مشرقی ایشیاء اور چینی سمندر میں برتری حاصل کر لی تھی۔ ان تمام خطوں میں یورپی طاقتوں نے جو تجارتی راستے بنائے تھے یہ حج راستے بھی کہلاتے تھے۔ برکات 1814ء میں پہلے ہی حجاز جانے والے ان بیشمار حجاج کا ذکر کر چکا ہے جن کا تعلق ملایا سے تھا۔ ان میں سے کچھ اپنے آپ کو ڈچ اور برطانیہ کی رعایا سمجھتے تھے۔ پھر ایک صدی گزر گئی تو جوزف کانریڈ نے اپنے ناول ''لارڈ جم'' میں ان کی تعداد کا ذکر کیا ہے۔ اس ناول کا آغاز مشرق بعید کے ان آٹھ ہزار حجاج کے ذکر سے ہوتا ہے جو ایک ایسے دخانی جہاز میں سوار ہو رہے تھے جو مکہ مکرمہ جا رہا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> ''وہ جہاز پر تین اطراف سے سوار ہو رہے تھے۔ اس سفر کے نتیجے میں انہیں بلحاظ عقیدہ جنت کے حصول کی امید تھی۔ وہ برہنہ پا تھے، نہ بولتے تھے، نہ ان کے ہونٹ ہل رہے تھے نہ پیچھے مڑ کر دیکھتے تھے۔ بس کوئی اور ہی انوکھی سی دھن سوار تھی ان سب پر۔ جب یہ لوگ جہاز پر سوار ہو چکے اور جہاز میں کوئی جگہ باقی نہ بچی، تو یوں لگا جیسے جہاز میں لوگ نہیں سوار ہوئے کسی حوض کو پانی سے بھر لیا گیا ہے اور پانی حوض کے کناروں تک آ گیا ہے۔ ایک خاص عقیدہ و مذہب کے ماننے والے آٹھ ہزار افراد، دلوں میں امیدیں، محبتیں اور یادیں لیے اس جہاز پر جمع ہوئے تھے۔ ان میں شمال اور جنوب سے آنے والے بھی تھے اور وہ بھی جن کا تعلق مشرق کے مضافات سے تھا۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے جن کو جنگلوں، دریاؤں، تنگ گھاٹیوں، سے گزر کر آنا پڑا تھا۔ ان میں وہ

بھی شامل تھے جو ایک چھوٹے سے جزیرے سے دوسرے جزیرے تک چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر پہنچے تھے۔ انہوں نے سفر کی مشکلات برداشت کی تھیں اور عجیب و غریب منظر دیکھے تھے جو عجیب قسم کے ڈر اور خوف لیے ہوئے تھے مگر ان لوگوں نے یہ سب کچھ ایک آرزو کی تکمیل کی آس پر برداشت کیا تھا۔ یہ جنگلوں بیابانوں سے تنہا جھونپڑوں کو چھوڑ کر آئے تھے، کچھ ان گنجان آباد دیہات سے آئے تھے جہاں ملائی زبان بولی جاتی تھی اور کچھ ساحل سمندر پر واقع گاؤں سے نکل کر آئے تھے۔ ایک تصور کی پکار اور بُلاوے پر انہوں نے یہ جنگل، دیہات، اپنے حکمرانوں کا حاصل شدہ تحفظ جائیدادیں، اپنی جوانی کا گردونواح اور آباؤاجداد کی قبریں تک چھوڑ دی تھیں۔"

1860ء کے عشرے میں کل حجاج کی نصف سے زیادہ تعداد دنیا بھر کی یورپی نوآبادیوں سے تھی جیسا کہ درج ذیل سرگزشت سے پتہ چلتا ہے۔ فرانسیسی، برطانوی اور ڈچ تمام نے سفرحج کو اس میں متعارف کرایا تھا۔ انہوں نے اپنی اپنی رعایا کو پاسپورٹ، ویزے اور صحت کے تصدیق نامے جاری اور پھر انہیں حجاز کے لیے روانہ کیا۔ ان کا یہ سفر ایسے دخانی جہازوں کے ذریعے تھا جو دنیا بھر کے گرد لگاتے تھے اور پھر 1869ء میں جب نہر سویز مکمل ہوگئی تو جکارتہ سے قاہرہ تک کے حجاج نے یورپی جہاز کے ذریعے جدہ پہنچنا شروع کر دیا تھا۔ یہ 1885ء کی بات ہے کہ بیروت سے یانبو تک کے سفر میں روز لگ جاتے تھے اور مکہ مکرمہ آنے والی حاجیوں کی نصف تعداد سمندری راستے سے آتی تھی۔ ریل گاڑی نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ہماری کہانی کا اہم حصہ سلطنت عثمانیہ کے سرمایے سے چلنے والی وہ ریل تھی جو سے مدینے آتی تھی یہ 1908ء میں بند ہوگئی تھی مگر چھ برسوں میں اس میں لاکھوں حجاج آئے تھے۔ قریب بھر میں سفری کمپنیوں کے نمائندے ریل کاروں کے ذریعے سفرحج کو تیز رفتار سفر قرار دیتے تھے ایک ایسا قافلہ ہوتا تھا جو تیزی سے منزل پر پہنچ جاتا ہو۔ یہ حجاج سے واپسی تک کا کرایہ وصول کر لیتے تھے میں آنے جانے کے کرائے کے علاوہ مکہ و مدینہ میں رہائش کا کرایہ بھی شامل ہوتا تھا۔ جوں جوں ترقی گئی نئی نئی سواریاں آتی گئیں اور ریل کا یہ سلسلہ آہستہ آہستہ ختم ہوگیا تھا۔ 1914ء میں مکے اور مدینے درمیان اندرون ملک چند راستوں پر اونٹ چلتے تھے۔ آیڈ تھرویول نے 09-1908 میں لکھا تھا کہ مدینے نے بدوؤں کی معیشت پر جس کا انحصار لوٹ مار پر تھا ضرب کاری لگائی تھی جس سے حجاز میں طاقت کا توازن

ہو گیا تھا۔

جدید ذرائع نقل و حمل نے حجاج کے لیے پریشان کن ثقافتی مسائل بھی پیدا کر دیے ہیں۔ مشرقی یورپ اور روس کے بڑے حصے میں وہ راستے جو نئی بندرگاہوں اور اسٹیشنوں تک جاتے تھے ان سے روایتی مسلمان پہلی بار ان معاشروں سے متعارف ہوئے جو اسلامی قوانین اور رسم و رواج کی حدود سے باہر تھے۔ سوال یہ ہوا کہ کیا باٹو کے اسٹیشن پر دستیاب پانی سے مسلمان وضو کر سکتا تھا؟ کیا بازار میں دستیاب گوشت، حلال گوشت تھا جسے مسلمان کھا سکتے ہوں؟ شراب نوشی اور مردوں عورتوں کا بے حجابانہ ایک ہی جگہ اکٹھا ہونا بھی روایتی حجاج کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ ان باتوں کا ذکر محمد فارانی کی تحریر کے اقتباسات میں شامل ہے جو 1885-86ء میں شائع ہوئی۔ یہ مسائل بڑے اہم تھے مگر جدید ذرائع نقل و حمل کی دلکشی نے انہیں پس پشت ڈال دیا تھا۔ حجاج سیلاب کی طرح آ رہے تھے۔ کانریڈ کا آبی استعارہ بہت موزوں رہا...... لوگوں کا ایک بہاؤ جس میں ذرہ بھر رکاوٹ نہ ہو۔ دخانی جہازوں اور ریل نے سفر کی رفتار کو تیز کر دیا تھا اور سفر پہلے سے زیادہ آرام دہ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سفر کے اخراجات اور خطرات دونوں میں کمی واقع ہوئی تھی۔

بالآخر سفر حج کی یورپی انتظامیہ نے حجاج کی صحت اور بہبود کو بڑی حد تک بہتر بنایا۔ حج کے راستوں پر اس صدی کے آغاز میں ہیضے کی وبا کے پھیلنے کی روک تھام کے لیے ایسے جدید جبری حراست کے سٹیشن قائم کر دیئے گئے تھے جہاں وبائی امراض کو روکنے کے لیے جبری قید متعارف کرا دی گئی تھی۔ اس کے لیے فیصلہ پیرس میں ایک بین الاقوامی تنظیم نے کیا تھا۔ اس عرصے میں نوآبادیاتی قوتوں نے بھی اپنے اپنے حاجیوں پر مالی شرائط عائد کر دی تھیں تاکہ سفر حج پر صرف وہ لوگ روانہ ہوں جن کے پاس آنے جانے کے اخراجات کے لیے معقول رقم اور وسائل موجود ہوں۔ اس سے بیشک حاجیوں میں احتجاج کی فضا پیدا ہو گئی تھی اور ان لوگوں کو اس شرط پر اعتراض تھا لیکن جب انہیں بتایا گیا کہ قرآن میں بھی بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے کہ حج صرف ان لوگوں پر فرض ہے جو صاحب استطاعت ہوں تو معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ یہ تمام ایسی باتیں ہیں جن کا دنیا کو جواب دیتے ہوئے ان سفرنامہ نگاروں نے جن کو ہم نے اس کتاب میں شامل کیا ہے مفصل اظہار کیا ہے۔

یورپی حج پر اثرانداز تو ہوئے مگر وہ سرزمین مقدس کی طرف خود نہیں گئے۔ جدہ کے لیے برطانیہ کا پہلا وائس قونصل 1838ء میں یہاں آیا تھا۔ اس کے اطالوی، فرانسیسی اور ڈچ ہم منصبوں نے جدہ میں اس کا

استقبال کیا۔ اس کے باوجود یہ شہر مکمل طور پر شریف خاندان کے ہاتھوں میں رہا جس نے ترک پاشا کے ساتھ مل کر ہر طرف اپنی نفع بخش تجارت پر ٹیکس عائد کر دیا تھا۔ یورپیوں کو شہر میں گھومنے پھرنے کی اجازت تھی کئی کئی برسوں تک کے لیے کرایے پر املاک حاصل کر سکتے تھے مگر حجاز کی سمت کھلنے والے دروازے ان پر بند تھے۔ مشرقی دیواروں سے چند میل آگے وہ تنگ پہاڑی گزرگاہیں جو مکے تک جا رہی تھیں، وہاں حرم تا نون کو بڑی فوقیت حاصل تھی۔ مسلمان آج بھی سنگِ گور سے سمت کا اندازہ لگاتے تھے۔ تمام مرد حجاج احرام کے طور پر دو ان سلی چادریں پہنتے تھے۔ حج کے لیے آنے والی عورتیں حجاب نہیں پہنتی تھیں نہ خوشبو لگاتی تھیں۔ یہاں ہر فرد چند اصولوں کی پابندی کرتا تھا اور غیر مسلموں کو ڈر رہتا تھا کہ کہیں ان سے ان اصولوں اور قوانین کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ جیسا کہ ہمارے سفرنامے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ قوانین دونوں ثقافتوں کے لیے واجب العمل تھے۔ کوئی کافر حرم کی حدود میں کبھی داخل نہیں ہوا مگر واپسی پر اس بارے میں اس نے بھی قلم اٹھایا جو سراسر جھوٹ اور کذب پر مبنی تھا۔ مزید یہ کہ مشرق بعید پر اپنی گرفت کے باوجود کسی بھی مغربی قوم کو حجاز پر حکومت کرنے کا موقعہ کبھی نہیں ملا اور مقاماتِ مقدسہ ان سے محفوظ رہے۔

وہ مُستشرقین جو اسلام کو کاغذ پر سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے انہوں نے بھی حج کو ناقابلِ تسخیر سمجھا۔ یہ یورپ کی اخلاقی برتری کے قائل تو تھے مگر حج کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جس میں حج کی مذہبی رسوم کا جذبہ اور مکہ مکرمہ کی حقیقی اہمیت شامل تھی۔ سرکردہ یورپی اہل علم اب بھی جلد بازی سے کام لیتے ہوئے ''عربوں'' کو کم معیار قرار دیتے ہیں۔ جوزف ارنسٹ ریناں نے صرف ایک مثال لے کر عربی کو ایک ادنیٰ زبان سمجھا جس کا صرف ایک ہی فائدہ ہے کہ یہ ایک طالب علم کو قدیم عبرانی پڑھنے کے لیے تیار کرتی ہے۔ دوسروں کے خیالات سے جو اپنی تحقیق سے تشکیل پائے یہ اس ذہنی معذوری کا شکار ہوئے کہ انیسویں صدی کے سکالرز نے مثلاً سلوسٹرے ڈی سیسی، کاؤسن ڈی پرسیول اور ایڈورڈ لین یہ تسلیم کرنے میں متذبذب تھے کہ پیچیدہ سماجی حقائق یورپ سے باہر وجود رکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے ''عرب سرزمین'' کو ایک ٹھہرے ہوئی (یک سنگی) جامد، کمتر اور ادنیٰ، پرشہوت اور استبداد والی کے طور پر پیش کیا۔ ان کے خیال میں پسماندہ علاقے، جہاں کم درجے کے لوگ آباد ہیں انہیں یورپ کا تحفظ اور سرپرستی چاہیے جبکہ دوسری جانب انہوں نے ''مشرق کی پراسراریت'' کو رومانوی رنگ دیا کیونکہ یہ ان کو بطور مصنفین، اتھارٹی اور مراعات یافتہ متخصصین اپنے قبضے میں لینا چاہتے تھے...... ایک آمرانہ مشرق اور ایک پراسرار مشرق ایک ہی سکے کے دو رُخ تھے۔

انیسویں صدی کے وسطی دور سے شروع کر کے بہت سے مغربی سیاحوں نے جو مکے گئے فرانسیسی، انگریزی اور جرمن زبان میں ان طویل مصدقہ نظریات پر بحث کی ہے جن تک یہ تجربے اور سفر کے ذریعے پہنچے تھے۔ ان میں سے جو مکے گئے تھے رچرڈ برٹن سب سے زیادہ معروف ہے لیکن درج ذیل دوسرے بھی تھے:
رچرڈ برٹن، جان کین اور آرتھر ویول۔ یہی تین یورپی ایسے ہیں جن کا یہاں ذکر کیا جائے گا۔ ان سب کا مشرق قریب سے گہرا تعلق رہا۔ انہوں نے جو لکھا وہ بیشک یورپی قارئین وسامعین کے لیے تھا مگر وہ مکمل طور پر "برطانیہ کے" نہ تھے نہ اکثر اس کے اندر تھے۔ برٹن نے جو مزاجاً وطن سے دور رہنا پسند کرتا تھا، اپنے سفر کا ذہنی خاکہ بنایا اور ہندوستان میں بیٹھ کر کتاب لکھ ڈالی۔ کین کی پیدائش کلکتہ (ہندوستان) کی تھی۔ یہ جوانی میں بحری زندگی کی طرف بھاگ گیا تھا۔ ویول نے سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد اپنی زندگی کا زیادہ عرصہ افریقا میں گزارا تھا۔ بطور ایک حاجی کے ان میں سے کسی نے بھی ثقافتی صدمہ برداشت نہیں کیا نہ ہی مکہ مکرمہ کی مسجد کا لندن کے سٹاک ایکسچینج کی عمارت سے مقابلہ کیا۔ یہ تینوں مسلم عادات واطوار سے خوب واقف تھے، ماہرین لسانیات تھے، نوجوان تھے اور عسکری پس منظر رکھتے تھے۔ یہ وہ مُہم جُو تھے جو ایک مشغلے سے اپنے کیریئر کو بنانا چاہتے تھے، ان کے لیے مکہ مکرمہ ایک ایسا مقام تھا جہاں کوئی جا کر نام پیدا کر سکتا تھا۔ ان کے خیال میں مکے میں ہر شے تھی: رومان، پراسراریت، نارسائی اور خطرہ۔ ہندوستان اور مصر کے درمیان رہتے ہوئے جو برطانیہ کی امیر ترین نو آبادی تھی مکے کے محل وقوع میں بڑی دلکشی تھی انگلستان میں بیٹھا ہوا وہ قاری جو پوری دنیا کو جاننا چاہتا تھا اس شہر کے بارے میں جاننے کا تجسس رکھتا تھا اور یہ شہر اس کے داخلے کے لیے "ممنوعہ شہر" تھا۔ سفرنامۂ حج نگاری کی تکنیک کو اس دور میں بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ 1910ء تک کافی یورپی مکہ مکرمہ آئے اور اس موضوع پر اپنے سفرنامے کتابی شکل میں شائع کرا چکے تھے۔ آگسٹس رَلی نے "کرسچینز ایٹ مکہ" (مکہ میں عیسائی) لکھی تھی۔

ان مغربی مصنفین کی کتابوں کے علاوہ ایک ہندوستانی شہزادہ اور ایک فارسی بیوروکریٹ (اعلیٰ سرکاری افسر) کے سفرناموں سے لیے گئے اقتباسات بھی شامل کتاب کیے جا رہے ہیں ان مسلم مصنفین کی کتابوں کو شامل کرنے کا مقصد قدرتی طور پر یورپی مصنفین کے سفرناموں کے مقابلے میں بالکل مختلف تھا۔ بیگم بھوپال (1864ء) کو حج کی نسبت اپنی خود پسندی اور جاہ وجلال سے زیادہ دلچسپی تھی اور وہ شریف خاندان اور پاشاؤں کے زر پرستانہ اور رشوت خوری پر مبنی انتظامی امور کا ذکر زیادہ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بدعنوان

حجازی اداروں کو چیلنج کرتے ہوئے اپنی ہندوستانی رعایا کے لیے حج کے بہتر انتظامات کیے۔ محمد فارانی جس نے بری اور بحری سفر تہران سے شروع کیا تھا 86-1885ء میں ایک سفرنامہ لکھا تھا لیکن اس کا مقصد کوئی اور تھا، وہ اپنے ہمعصر اہل فارس کو جدید ذرائع نقل وحمل اور سماجی انجینئروں کے بارے میں تعلیم دینا چاہتا تھا۔

ان دنوں مسلم سیاحوں نے اپنے لوگوں کے لیے مختلف معاملات میں بہتری پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان دونوں کے مطبوعہ سفرنامے کچھ سرکاری قسم کے تھے۔ بیگم بھوپال ایک ملین رعایا پر حکومت کرتی تھی اور شاہ فارس نے فارانی کی کتاب کی اشاعت کا اہتمام اپنی جیب سے کیا تھا۔ اگرچہ ان دونوں کتابوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی وجہ سے انہیں ادب میں شامل کرنے کی سفارش کی جائے لیکن وہ تیزی سے بدلتے ہوئے حج کے بارے میں جو کچھ بتاتے ہیں وہ بہت معیاری اور معرکے کا کام ہے۔ دوسری طرف برٹن، کین اور دیول تینوں نے اپنے طور پر ٹھوس معلومات فراہم کی ہیں۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو منظرعام پر لانے کی جو کوشش کی ہے وہ ذاتی تجربے پر ایک نئی تاکید ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے طنزیہ مکالمہ اپنایا ہے اور نئے اثرات کی تصویر کشی کو قلمبند اور اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے جیسے جدید قارئین کے لیے حقیقی زندگی کے تصادم زیادہ سے زیادہ اہم ہوتے جاتے ہیں یہ مصنفین انہیں ایسی معلومات فراہم کرتے ہیں جن میں اُن مردوں اور خواتین پر نئی روشنی ڈالی جاتی ہے جو حج کی ادائیگی کے لیے گئی تھیں۔

☆☆☆

9۔ سر رچرڈ برٹن

برطانیہ عظمیٰ۔ 1853ء

رچرڈ برٹن کی ذاتی داستان پہلی بار 1855ء میں شائع ہوئی جو آج بھی مغرب میں دستیاب مکمل اور واحد سفرنامہ حج کے طور پر پڑھی جاتی ہے۔ ہمارے ادب میں جہاں کہیں ہمیں حج سے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ہمیں برٹن کے ذریعے ملتی ہیں۔ اس کی داستانِ حیات نصف مرتبہ شائع ہو چکی ہے اس کے باوجود کوئی بھی دو سوانح نگار اس بات پر متفق نہ ہو سکے کہ اسے سفر کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

جب برٹن مکے پہنچا اس وقت اس کی عمر 32 برس تھی۔ بطور مہم جو کے اس کا کردار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک سپاہی کی حیثیت سے ہندوستان اور سندھ میں اس کے سات سالہ کام (49-1842ء) سے پہلے ہی منظر عام پر آ چکا تھا۔ وہ لسانی تجربے کی بنیاد پر اور کسی جگہ کی مقامی باتوں کے جاننے کے بارے میں اسے جو صلاحیت حاصل تھی اس کی بنا پر اسے خفیہ محکمے کے لیے بہت موزوں سمجھا جاتا تھا۔ رڈیارڈ کپلنگ نے اپنے مشہور ناول کم (Kim) میں ایک کردار کو برٹن اور اس کی کارروائیوں کو سامنے رکھ کر پیش کیا تھا۔ برٹن خواہ ایک تاجر کے روپ میں سفر کر رہا تھا یا درویش کا سوانگ رچا کر اس نے ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے نوآبادیاتی ہندوستان کی رعایا کی خاطر بارہا خدمات سرانجام دیں۔ وہ دنیا کی آٹھ زبانیں بڑی روانی سے بول سکتا تھا۔

بعد میں جب ایک بار برٹن یورپ میں چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ اس نے اپنے مختلف سفر چار کتابوں کی شکل میں شائع کرائے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے ایڈیشن کچھ زیادہ نہ بک سکے مگر انگریز مہم جو اور تلاش و جستجو کرنے والوں کی فہرست میں اس کا نام ضرور شامل ہو گیا تھا۔ برکات کی طرح (جس کو وہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا) برٹن ایک فطری نژاد نامہ نگار تھا...... متجسس، نڈر اور بہادر، انتھک جو اپنی نہیں بلکہ دوسری ثقافتوں کے بارے میں چھٹی حس رکھتا تھا۔ 1851ء میں اس کی شہرت اتنی ہو گئی تھی جو اسے رائل جیوگرافیکل سوسائٹی (افریقی ایسوسی ایشن جس نے العباسی اور برکات کے سفر میں ان کی اعانت کی) سے متعارف کرا سکے

کہ اسے ایک تنہا فرد کے طور پر عرب کی مہم پر روانہ کیا جائے۔

برٹن کو چونکہ اس سے شہرت حاصل ہوئی اس لیے اس کے بہت سے سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ اس کے فیصلے نے حج کو نقل مکانی کی حیثیت سے ایک کیریئر کے طور پر متعارف کرا دیا تھا۔ دراصل اس کے پیچھے برٹن کے اور بھی کئی مقاصد تھے۔ ہندوستان اور سندھ کی زبانیں پڑھنے کے علاوہ اس نے متعدد مذاہب کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اس نے برہمن ازم، بدھ مت اور کیتھولک عقیدے کے بارے میں معلومات جمع کیں، یوگا کا مطالعہ کیا اور آواگون کے بارے میں تحقیق کی تاہم برٹن کوئی کٹر مذہبی مفکر نہیں تھا۔ وہ دراصل روحانیت اور عرفان کا متلاشی تھا۔ اسلام سے وہ پہلی بار مرزا حسین نامی ایک فارسی استاد کی وساطت سے متعارف ہوا تھا جو آغا خان کا بھائی تھا۔ یہ اسی اسمٰعیلی فرقے کے روحانی راہنما تھے جس نے نصیر خسرو کو آٹھ سو سال قبل متاثر کیا تھا۔ ان لوگوں نے برٹن کو اہل تشیعہ کے مسلک سے متعارف کرایا تھا۔ بعد ازاں وہ تصوف کے سلاسل میں سے سب سے بڑے سلسلے قادریہ میں شامل ہو گیا تھا۔ مئی 1847ء میں وہ مکہ مکرمہ حج پر جانے کے بارے میں غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ اس نے دینیات کا مطالعہ شروع کر دیا تھا اور قرآن پاک کا چوتھا حصہ حفظ بھی کر لیا تھا۔ وہ نماز پابندی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ یہ ہمیشہ سے اس کی خواہش رہی تھی کہ وہ حج کے ایام میں مکہ مکرمہ جائے۔ اس نے مختلف زبانوں میں موجود حج کی مذہبی رسوم کے بارے میں مطالعہ کر رکھا تھا۔ سنی سنائی معلومات بھی اس کے پاس کافی تھیں مگر وہ مطمئن تھا کیونکہ اس کے خیال میں عملاً کوئی بھی اس کے بارے میں صحیح معلومات نہ رکھتا تھا۔

چند برسوں کے بعد اس نے رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کو جو تجویز پیش کی اس میں یہ ذاتی مقاصد مذکور نہیں ہیں۔ اس سفر کا مقصد، جہاں تک آر جی ایس کے ڈائریکٹروں کی سمجھ میں آیا سائنسی علم میں اضافہ کرنا اور عرب کے تجارتی راستوں کے بارے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو قیمتی معلومات فراہم کرنا تھا۔ حج کی ادائیگی کا ذکر بہت کم کیا گیا تھا اور جہاں تک برٹن کے اسلام کے حوالے سے مفادات کا تعلق تھا ان کا ذکر تو سرے سے کیا ہی نہیں گیا تھا۔ اس نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کی گئی تجویز کی بنیاد پر سوسائٹی نے اس کی تجویز کی حمایت کی تھی۔

اپریل 1853ء کو برٹن مصر تک کے 13 روزہ سفر کے لیے ساؤتھمپٹن سے ایک دخانی جہاز میں سوار ہوا۔ جہاز پر سوار ہوتے وقت وہ ایک فارسی شیعہ کے لباس میں ملبوس تھا۔ اسکندریہ میں اس شکل میں اس شخص کو

ملی جلی کامیابی حاصل ہوئی۔ سُنّی مسلمانوں کی نظر میں شیعہ زیادہ صاف ستھرے اور کھرے نہ تھے۔ اور مصر میں سنّی مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ان دونوں فرقوں میں پائی جانے والی روایتی رنجش کو برٹن نے قبول نہیں کیا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ اسے ایک مسلمان کی حیثیت سے دیکھا جائے اور فرقہ واریت کے لیبل کو ہٹا کر اس سے سلوک کیا جائے۔ قاہرہ میں اس نے اپنا لباس اور روپ بدل لیا تھا اور مصریوں کے درمیان جو عزت و احترام اسے حاصل ہوا اسے اس نے بہت محتاط ہو کر قلمبند کر لیا تھا۔ ایک ماہ کے اندر اندر اسے ایک شریف سنّی کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا تھا۔ وہ اسے افغان ''پٹھان'' (پختون) سمجھتے تھے جو ہندوستان میں پیدا ہوا تھا اور ایک ڈاکٹر کے طور طب کے شعبے سے منسلک تھا۔ اس حیثیت سے وہ سماجی حلقوں میں بہت جلد رسائی حاصل کر چکا تھا، اور یہی وہ چاہتا تھا۔ درج ذیل اقتباسات دریائے نیل کے کنارے موجود ایک ایسے ڈاکٹر یا طبیب کی زندگی کے ایک عام دن کی تصویر کشی کرتے ہیں جو بیک وقت حسِ مزاح بھی رکھتا تھا اور دوہرے کردار کا مالک تھا۔

برٹن نے حج کے سفر پر روانہ ہونے کے لیے قاہرہ چھوڑنے سے قبل ایک درویش کا حلیہ اپنا لیا تھا تاکہ اسے یوں ایک تحفظ حاصل رہے۔ تاہم جب سرکاری ویزے حاصل کرنے کا موقعہ آیا تو اس کی درویشانہ ظاہری صورت نے اس کے لیے مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ انگریزوں اور مصریوں نے مل کر برٹن کو تنگ کیا۔ وہ اسے ویزا دینے میں پس و پیش سے کام لے رہے تھے۔ انہیں شک گزرتا تھا کہ یہ خالی جیب، بھکاری ہندوستانی برطانوی رعیت کیسے ہو سکتا تھا۔ ایک موقعہ پر برٹن اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ایک انگریز نومسلم کے طور پر وہ مختلف موقعوں پر اپنی بالادستی کا مظاہرہ کر سکتا تھا جبکہ مقامی لباس میں ''آپ کو عجز و انکساری اور بزدلی سے اپنا راستہ بنانا پڑتا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انسان سے جانور کی سطح پر آ کر زخم سہنا پڑتا ہے''۔ اس قسم کے سلوک اور رویے کا ذکر کرتے ہوئے برٹن سفرِ حج کے لیے کیے جانے والے ناقص سرکاری انتظامات پر روشنی ڈالتا ہے (یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے متعلق ہم نے کبھی کچھ نہیں سنا ہوگا)۔

حج سے متعلق جو لٹریچر موجود ہے اس میں برٹن کی طرف سے جو زیادہ سے زیادہ حصہ شامل ہے اس کا تعلق مدینہ سے ہے جہاں تک اس نے اپنا اگلا سفر کیا تھا جبکہ برکات کے سفرنامے کے ابواب ملکی حالات پر مشتمل تھے۔ وہ مدینہ میں بیمار پڑ گیا تھا اس لیے اسے شہر چھوڑنا پڑا تھا۔ برٹن نے نہایت دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی کتاب کے نصف حصہ اوّل کو پیغمبر خدا، صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ کتاب کے اس حصے میں شہر کے طبعی اور روحانی جغرافیے کی تفصیل شامل کی گئی ہے، مسجد نبوی کا ذکر ہے، اس شہر

کی تاریخ اور تجارت، منڈیوں، کتب خانوں، خاندانی زندگی، مذہبی رسومات اور داستانوں کا ذکر ہے۔ اس میں سے زیادہ تر معلومات آج تک یورپ میں منظر عام پر نہیں آئیں۔ صدیوں سے پھیلی ہوئی فرضی اور من گھڑت باتوں کو اس کتاب کے شائع ہونے سے مسترد کر دیا گیا تھا۔ برٹن نے مدینہ منورہ میں ایک ماہ گزارا۔ مگر یوں لگتا ہے جیسے اس نے اپنی نصف زندگی یہاں بسر کی ہے۔

یکم ستمبر کو ایک قافلہ مکے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ ''سات ہزار افراد پیدل، گھوڑوں پر، کھٹولوں، ڈولیوں میں سوار، یا شام کے اعلیٰ نسل کے اونٹوں پر سوار اس سفر پر روانہ ہوئے تھے''۔ برٹن نے ان کے ہمراہ صحرا کا سفر مکمل کیا۔ راستے میں اس کے قریبی ساتھیوں میں چند ایک مدنی اور ایک مکی لڑکا شامل تھا۔ اس کے سفرنامے کے اس حصے میں ان کا بڑا اہم جوابی کردار ہے۔ برٹن نے ان کو تھوڑی بہت رقم دے دی تھی جس سے وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ اس کے بدلے میں انہوں نے دونوں مقدس شہروں میں اس کا بڑا خیال رکھا تھا۔ حج کے دوران چونکہ یہ لوگ تو مقامی تھے اس لیے ان کے بغیر گزارا نہ تھا۔

عرفات کی طرف روانگی سے ایک روز قبل شامی قافلہ مکے پہنچا تھا۔ حج کے دنوں میں برٹن نے حجر اسود کی شناخت حجر شہابی یا سنگ آسمانی بتا کر کی تھی اور خانہ کعبہ کے احاطہ کی پیمائش فیتے کے ذریعے کی لیکن عرفات اور مزدلفہ میں شب بیداری سے متعلق برٹن کی رپورٹوں کو غلط طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ مکہ مکرمہ کے بارے میں اس نے جو کچھ بھی لکھا وہ برکات پر انحصار کرتے ہوئے لکھا گیا تھا۔ دراصل اس نے برکات کے سفرنامے سے بہت سے حصے من وعن لے کر اپنی کتاب کے اوراق کی زینت بنا دیئے تھے۔ یہ بالکل اسی طرح ہوا جس طرح ابن بطوطہ نے ابن جُبیر کی کتاب سے کچھ حصے لے لیے تھے۔ اگلے ہفتے وہ جدہ جا رہا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ شخص جس نے انگریز قارئین کے لیے مکہ کو نقشے پر دکھایا وہ خود وہاں صرف گیارہ روز مقیم رہا تھا۔

برطانوی پریس نے برٹن کے حج کو ایک غیر معمولی جرأت و ہمت کا کارنامہ قرار دیا تھا۔ یقیناً ایک ذاتی داستان جو ایک سفر پر مشتمل تھی اور سفر تھا مدینہ و مکہ کا اور یہ اس کی ان دو درجن کتابوں میں بہترین کتاب تھی، جو اس کے سفر کی روداد تھی۔ اس کتاب کے بعد کے ابواب میں اس نے اپنی ذات سے متعلق متضاد باتیں شامل کی ہیں۔ یہ انگلستان سے باہر بمقابلہ مصر کے اندر کے انسان کی یا ایک برطانوی سپاہی بمقابلہ مشرقی بہروپیے کی یا ایک سامراج پسند بمقابلہ درویش، ایک سکالر بمقابلہ ایک مہم جو وغیرہ تصویریں بنتی تھیں۔ وہ بڑی

کامیابی کے ساتھ قاری کو یہ منوالیتا ہے کہ یہ تمام آوازیں ایک ہی انسان کی ہیں۔ بیشک برٹن کا وہ لہجہ جو وکٹورین عہد کے ایک سامراج پسند کا لہجہ ہے وہ برٹن کی کتاب کے صفحات پر زیادہ نمایاں ہوگیا ہے مگر اس کے باوجود اس کتاب کی دائمی کامیابیوں کے لیے اس میں اور بہت سی باتیں بھی شامل ہیں۔ اس میں پہلی بار مدینہ منورہ کی سچی، درست اور فضیلت سے بھرپور تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس میں ان سیاحوں کے سفرناموں کے اقتباسات بھی شامل کیے گئے ہیں جو برٹن سے پہلے مکے آ چکے تھے (ان میں زیادہ تر ورتھما، پٹس اور برکات کی کتابوں کے اقتباسات ہیں) اس کتاب میں برٹن کے ان ذاتی مشاہدات اور وارداتوں کا بیان ہے جو ان مقامات کو روشن کرتے، ان کی تشریح کرتے اور ان پر طنز کرتے ہیں جہاں سے وہ سفر کے دوران گزرا تھا۔ ان تمام حوالوں سے یہ کتاب جواب ہے اس مغربی عصبیت کا جس سے وہ مشرق کو گونگا اور ''ترقی'' اور ''تہذیب'' کے برعکس یک سنگی علامت ٹھہرا کر پسماندگی کی آخری حد پر کھڑا خیال کرتے ہیں۔ جبکہ انیسویں صدی کے دیگر سکالرز نے اسلام کو چند رُومانوی، سیاسی، یا گھٹیا و حقیر اصطلاحات تک محدود کر دیا ہے۔ برٹن ان کے برعکس ہمیں ان مسلم افراد سے ملواتا ہے جو اپنے ذہن اور عقل سے کام لے کر بات کرتے اور بلا کسی تعصب کے تفصیلات فراہم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسا کتابچہ پیش کرتا ہے جو نقلی اور بناوٹی حاجی کے لیے بھی ہے۔

☆☆☆

سر رچرڈ برٹن کی ذاتی داستان میں سے جو سفرِ مکہ و مدینہ کے ذکر پر مشتمل ہے۔

مجھے حج پر جانے کی خواہش کیوں ہوئی: یہ 1852ء کے موسم خزاں کا زمانہ تھا کہ میں نے اپنے بہترین دوست آنجہانی کرنل مانیٹھ کی وساطت سے اپنی خدمات رائل جیوگرافیکل سوسائٹی، لندن کو پیش کردی تھیں۔ اس پیشکش کا مقصد یہ تھا کہ جدید مہم جوئی کے چہرے پر سے رسوائی کا وہ داغ مٹایا جائے جس سے ہمارے آج کے نقشوں میں مشرقی ممالک اور عرب کے وسطی خطوں کو ایک بہت بڑے سے سفید دھبے کی شکل میں دکھایا گیا ہے مجھے ایک آزمائشی سفر حجاز تک کا کرنا تھا۔ یہ ایک ایسے یورپی کے لیے نہایت کٹھن اور خطرناک مرحلہ تھا جس نے عرب میں داخل ہونا تھا۔ میں نے ارادہ سفر کرلیا تھا، جتنی رخصت کے لیے میں نے درخواست دی تھی، وہ منظور کر لی گئی تھی اور مجھے مسقط پہنچنا تھا۔ ایک ایسا مقام جہاں سے مجھے اپنے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ مجھے رفتہ رفتہ اور یقین کے ساتھ اپنے آپ کو صحراؤں کی وسعتوں کو عبور کرنا تھا۔ مگر موسم گرما کے ان ایام میں مجھے جلدی کرنی تھی۔ مجھے یورپ میں رہتے ہوئے چار سال گزر چکے تھے اور اس دوران مشرق سے متعلق بہت سی باتیں میرے ذہن سے محو ہو چکی تھیں اور مصر کی مشکلات سے گزرنے کے بعد، جہاں کی پولیس روم اور ملان کی پولیس کی طرح متجسس اور باریک بیں ہوتی ہے۔ میں آغاز کرتا ہوں مُسلمانوں کی مقدس سرزمین سے جس کی حفاظت و نگرانی کا ذمہ ہر کوئی لیتا ہے اور جہاں بیت اللہ ہے، عزت و عظمت والا واحد حرم پاک...... تاہم اس سفر کے لیے چونکہ سارے اخراجات رائل جیوگرافیکل سوسائٹی نے برداشت کیے تھے اور میرے کان ''ترقی'' اور ''تہذیب و تمدن'' کے الفاظ سن سن کر پک گئے تھے اس لیے میں بہت متجسس تھا کہ دوسرے جو سن کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ میں وہ سب کچھ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکوں...... میرا اشارہ ایک اسلامی ملک کے اندر کی مسلم زندگی کی طرف ہے...... اور میری یہ دیرینہ آرزو بھی تھی کہ میں اُس پُراسرار سرزمین پر اپنے قدم رکھ سکوں جس کا ذکر کسی چھٹیاں گزارنے آنے والے سیاح نے ابھی تک نہیں کیا تھا۔ نہ

اس سرزمین کی کسی نے پیائش کی تھی نہ اس کا نقشہ یا تصاویر پیش کی تھیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنا پرانا کردار بحیثیت ایک فارسی جہاں گرد کے ادا کروں جو مشرق میں بیک وقت ایک تاجر، فلسفی، سیاح اور درویش ہوتا ہے اور یوں اپنی کوشش کو کامیابی سے ہمکنار کروں۔

میرا اصل مقصد جس کے تحت میں نے یہ سفر شروع کیا یہ تھا: میں انجانے جزیرہ نما عرب کو عبور کروں جس کے لیے میں براہ راست یا تو مدینہ سے مسقط جاؤں یا قُطری سفر طے کر کے مکہ سے مکالہ جاؤں جو بحیرۂ ہند کے کنارے واقع تھا۔ مگر میری منصوبہ بندی میرے کسی کام نہ آئی جس کے بارے میں قاری کو اس کتاب کے مطالعہ کے دوران معلوم ہو جائے گا۔ میرے پیش نظر دیگر مقاصدِ سفر بہت سے تھے۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ کیا گھوڑوں کی تجارت کے لیے کوئی ایسی منڈی ہے جسے عرب اور ہندوستان کے درمیان تجارت کے لیے کھول دیا جائے۔ اس کی ضرورت اس لیے بہت تھی کہ ان دونوں ملکوں میں اچھی نسل کے گھوڑوں کی موجودگی کے بارے میں بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ میں ان مشرقی بیابانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا جن کو ہمارے نقشوں میں خالی زمین کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ میں حجاز کی آب نگاری اور اس کے واٹر شیڈز کے بارے میں تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ میں یہاں کی ڈھلوانی زمین کے بارے میں جو مسئلہ تھا اس سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں سال بھر پانی رکھنے اور نہ رکھنے والی نہروں کی موجودگی سے متعلق معلومات جمع کرنا چاہتا تھا اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ میری کوشش ہوگی کہ میں خود مشاہدہ کر کے اس نظریے کی حقیقت اور سچائی کا پتا لگاؤں جس کی تجویز کرنل ڈبلیو سائیکس نے دی تھی۔ اس تجویز میں کہا گیا تھا کہ اگر یہ روایت درست ہے تو وسیع جزیرہ نما عرب کی آبادی میں چند نفسیاتی امتیازات ہمارے اس سوال کا جواب دینے کے لیے کافی تھے کہ عرب خاندان کے مشترک نسب کی ابتداء کیسے ہوئی۔

میں نے اپنے اس سفر کی داستان کو، جو میں نے موسم گرما میں حجاز تک کیا تھا ''ایک ذاتی داستان'' کا عنوان دیا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کے متن اور عنوان میں ہم آہنگی برقرار رہے۔ یہ اس لیے ضروری تھا کیونکہ صرف ''وہ جو ذاتی ہے بنی نوع انسان کی دلچسپی کا باعث بنتا ہے'' ہوسکتا ہے بہت سے لوگوں کو میری یہ مثال سمجھ میں نہ آئے۔ مگر بہت سے ایسے افراد بھی ہوں گے جو یہ جاننے کے مشتاق ہوں گے کہ میں نے بطور ایک مشرقی کے مشرقی زندگی کے اسٹیج پر نمودار ہونے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل کے مہم جو اسے مفید پائیں گے لیکن مجھے اس داستان کی خود پسندانہ مماثلت کے لیے کوئی معذرت نہیں کرنی۔

نے یہ محسوس کیا ہو کہ اسے ''ایک خاموش دوست'' کی ضرورت تھی جو اسے مشورہ دے سکتا جبکہ مشورہ طلب ہی نہ کیا گیا ہو وہ یقیناً اس کی تعریف کرے گا جو کسی عدم دلچسپی رکھنے والے نقاد کے لیے پیش کر دیا گیا ہے جو ایک ایسے ذہن سے نکلی ہوئی باتیں ہیں جو ایک انفرادیت رکھتا ہے۔

میں 3۔اپریل 1853ء کی شام لندن سے ساؤتھمپٹن کے لیے روانہ ہوا تھا ایک افسر بھائی کپتان (اب کرنل) ہنری گرینڈ لے، جس کا تعلق بنگال رسالہ سے تھا، کے مشورے سے شہر چھوڑنے سے قبل میرے لیے مشرقی لباس منگوایا گیا تھا۔ میرا سارا سامان بھی دیکھنے میں بالکل مشرقی نظر آنا چاہیے تھا۔ اگلی صبح ایک ''فارسی شہزادہ'' جس کے ہمراہ کپتان گرینڈ لے بھی تھا، یہ جزیرہ نما اور اورینٹل کمپنی کے بے حد خوبصورت اور شاندار دو خانی جہاز ''بنگال'' میں مجھے سوار کرانے آئے تھے۔

اسکندریہ: مجھے دعوت دی گئی تھی کہ میں ایک مہربان دوست جان ڈبلیو لارکنگ کے گھر سے سفر کا آغاز کروں۔ میں اس کے ساتھ جہاز سے اتر گیا تھا۔ کیا خوبصورت فرق تھا ایک دُخانی جہاز اور اس شاندار گھر میں جو محمودیہ نہر پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس اچانک حیران کن تبدیلی پر جو تیز دستند سے دھیمے پن کی حامل زندگی کے درمیان نظر آئی میں عش عش کر اٹھا تھا۔ تیرہ دنوں میں ہم کارخانوں کے دھوئیں سے آلودہ فضا سے باہر نکل آئے تھے جس نے ہمیں کافی دیر جزیرہ وائٹ کے ساحل سے دور رکھا تھا۔ اب سمندر کی تازہ ہوا کے جھونکے ہر شے کو مسحور کر رہے تھے اور ہم خاموش اور جامد و ساکت بیٹھے مشرق کی موسیقی سے محفوظ ہو رہے تھے۔ رات کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ستاروں سے مزین آسمانوں اور سرسبز درختوں کو چھو رہے تھے اور ان میں سے ایک بامعنی صدائے افسردگی و دلگیری نکل رہی تھی۔

نوکروں اور ملنے والوں کی متجسس نظروں سے بچنے کے لیے میرے دوست لارکنگ نے مجھے باہر کی ایک عمارت میں ٹھہرایا تھا جہاں میں آزادی سے زندگی گزار سکتا تھا۔ چند آرمینیائی ترجمان میں سے ایک ایسا تھا جو اکثر مجھے شک و شبے کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا مگر سوائے ان افراد کے جو جانتے تھے کہ اصل راز کیا تھا کسی کے علم میں نہ تھا کہ میں کیا کردار ادا کر رہا ہوں۔ مقامی جو پکے مسلمان تھے مجھے ''عجمی'' کہتے تھے، ایک ایسا مسلمان جو ان جیسا نہ تھا مگر پھر بھی اچھا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ایک شیخ کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور ایک بار پھر مذہب کی باریکیوں میں غوطہ زن ہو چکا تھا۔ میں نے شرعی غُسل کرنا از سرِ نو سیکھ لیا تھا، قرآن پڑھتا تھا اور ایک بار پھر سجدہ ریزی کے فن میں ماہر ہو گیا تھا۔ اس ساری کارروائی کے دوران میرا یہ

معمول یہ تھا کہ میں کسی کافی ہاؤس میں بیٹھ کر سگریٹ پیتا، کافی کی چسکی لیتا اور لطف اندوز ہوتا تھا۔ میں نہر کے کنارے آباد ایک چھوٹے سے گاؤں میں سیر کے لیے چلا جاتا تھا..... شہد کی مکھیوں کا چھتہ جو مجھے چند دن پہلے نظر آیا تھا پھر کبھی نظر نہ آیا۔

ایک نیا بہروپ: اسکندریہ میں ایک مہینے کی محنت و مشقت کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے گھومنے پھرنے والے ایک درویش کا کردار اپنا لینا چاہیے۔ اب میں مرزا کے بجائے شیخ عبداللہ تھا۔ فارسی میں مرزا، مسٹر کو کہتے ہیں اور مجھے مصر میں "مرزا" بن کر رہنے سے بڑی تکلیف ہوئی جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ عبداللہ کے معانی ہیں اللہ کا بندہ اور یہ ایک ایسا نام ہے جو عیسائی مسلمان سبھی رکھ لیتے تھے۔ آنحضور فرمایا کرتے تھے کہ خدا کو یہ نام بہت پسند ہے۔ ایک نہایت محترم و مہربان شخصیت نے مجھے اپنے سلسلۂ تصوف قادریہ میں شامل کر لیا تھا، (میں ان کا نام نہیں بتانا چاہتا)۔ اور میرا نام بسم اللہ شاہ رکھا پھر ایک مقررہ مدت کے بعد، جو ایک طرح سے میری آزمائشی مدت تھی (پیرو بیشن) مجھے انہوں نے بڑی شفقت اور فیاضی سے مرشد کے مقام پر فائز کر دیا تھا۔ یہ مشرقی فری میسن تھے جن کے عقیدوں اور عمل سے میں خوب آگاہ ہو گیا تھا۔ اسلامی دنیا میں درویش کے بہروپ سے بہتر کوئی بہروپ اختیار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ بہروپ ہر عہدے، عمر، نسل، قوم، دربار شاہی سے معتوب ہو کر نکالے ہوئے "لوگ" کسان، غوطہ خور، جو زندگی سے تنگ آ گیا ہے، مجذوم جو گھر گھر جا کر بھیک مانگتا ہے، سبھی اختیار کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ یہ عام تصور ہے کہ درویش کو اجازت ہوتی ہے کہ نرمی، مذہبی رسم، آداب مجلس سے جب چاہے کنارہ کش ہو جائے۔ وہ عبادت کرے نہ کرے، نماز پڑھے نہ پڑھے، شادی کر لے تو ٹھیک نہ کرے کنوارہ رہے تو بہتر، جیسے اس کا جی چاہے کرے۔ طلائی لباس پہنے تو اس کی مرضی، ٹاٹ کا بوریہ پہن لے تو واہ واہ..... جہاں چاہے جائے کوئی اس سے یہ نہیں پوچھتا یہاں کیوں آئے ہو۔ پیدل چل رہا ہو تو ٹھیک ہے، عربی النسل گھوڑے پر سوار ہو اور پیچھے پیچھے درجنوں غلام، نوکر ہاتھ باندھے چلے آ رہے ہوں تو درست۔ وہ مسلح نہیں ہوتا، تہی دست گلی کوچوں میں پھرتا ہے مگر اس سے لوگ ایک مسلح شخص کی نسبت زیادہ ڈرتے ہیں۔ وہ لوگوں سے جس غیض و غضب سے پیش آتا ہے لوگ اسی قدر اس سے خوش ہوتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ ایک تنک مزاج سیاح کے لیے اس میں بڑے فوائد مضمر ہیں۔ کوئی فوری خطرہ درپیش ہو تو اسے دیوانہ اور مخبوط الحواس بن کر تحفظ حاصل کر لینے کی سہولت

میسر ہوتی ہے۔ مشرق میں ایک دیوانہ اور مجذوب اور مغرب میں ایک سنکی کردار کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ جو چاہے کہہ ڈالے اور جس بات کی اجازت اسے کوئی رُوح یا بھوت پریت دے وہ کر ڈالے۔ اس کردار میں تھوڑا سا طبی علم، ''جادو کا تھوڑا سا تجربہ'' اور ایسی شہرت کہ وہ سوائے ایک خاص علم پڑھنے اور کتابوں کے کسی کی پرواہ نہیں کرتا'' اور اس کے پاس اتنا سرمایہ ہو کہ وہ اسے فاقوں مرنے سے بچا لے تو پھر مشرق میں اسے خاص قسم کا فائدہ پہنچتا ہے۔ البتہ ''متصوفانہ راستے'' کا ایک خطرہ ضرور ہے کہ ایسے درویش کا پھٹا پرانا کوٹ قاتل کو بہت کم ڈھانپتا ہے اور اگر آپ بھی اس قسم کے ''بھائی'' کی گرفت میں آ جائیں تو آپ کو بادلِ نخواستہ اس کا ساتھی بننا پڑتا ہے خواہ ایسا چھری کے خوف سے ہو یا خطرہ کی وجہ سے!

قاہرہ: مجھے چونکہ کسی کارواں سرائے میں جگہ نہ مل سکتی تھی اس لیے مجھے مجبوراً جمالیہ میں ٹھہرنا پڑا جو ایک یونانی قیام گاہ تھی۔ یہاں شراب کے نشے میں دھت عیسائی رہتے تھے اس لیے یہ اتنی ہی فیشن ایبل تھی جتنی آکسفورڈ سٹریٹ یا کاوَنٹ گارڈن۔ اس کے لیے بھی مجھے ایک ہفتے تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ حجاج کی ایک بڑی تعداد کا رُخ قاہرہ کی جانب تھا۔ ہوٹلوں کے مالکان انہیں ترجیحی بنیاد پر رہائش کے لیے جگہ فراہم کرتے تھے۔ آپ جب کسی کارواں سرائے میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے کچھ رقم، جو 2 سے 5 شلنگ تک ہوتی ہے، ادا کرنی ہوتی ہے تا کہ آپ کو چابی مل جائے یہ عموماً ایک مہینے کے کرایے کے مساوی ہوتی ہے۔ گویا آپ جس قدر جلدی مکان چھوڑ دیں گے کارواں سرائے کے مالک کے لیے فائدہ مند ہو گا۔ مجھے دو نہایت خستہ حال کمرے حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو ایک ترک حاجی ظاہر کرنا پڑا تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ ان کمروں میں ٹھہرنے والے بیمار پڑ جاتے تھے۔ میں نے چابی حاصل کرنے کے لیے الگ اور ماہانہ کرایے کی رقم الگ ادا کی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے کمروں کو صاف کرنے اور دھونے والے شخص کو بھی کچھ پیسے دیئے تھے۔ یوں ایک ماہ تک کے لیے مجھے یہ مکان چار پنیس یومیہ کے حساب سے کرایے پر ملا تھا۔

میں جمالیہ کارواں سرائے میں آنے کو اپنی خوش قسمتی سمجھ رہا تھا کیونکہ یہاں میری ملاقات ایک دوست سے ہو گئی تھی۔ دُخانی جہاز میں سفر کے دوران ایک مسافر نے مجھے جب تنہا دیکھا تو وہ سمجھا میں ضرور اداس تھا۔ وہ میرے قریب آیا اور بڑی محبت سے مجھ سے کچھ سوالات کیے۔ اس مہربان کی عمر 45 برس تھی، قد میانہ، بڑا سا سر جو منڈوایا ہوا تھا، موٹی گردن، جسمانی اعضاء مضبوط، پتلی سرخ ڈاڑھی اور خوبصورت خدوخال، جن سے مہربانی اور شفقت ٹپکتی تھی۔ متجسس خشک مزاحیہ انداز کا مالک یہ شخص سنجیدہ نظر آتا تھا،

تعارف سے قبل ہی ہر اجنبی اس کی طرف کشش سی محسوس کرنے لگتا تھا۔

میرے دوست نے ایک سے زیادہ بار یہ جملہ دہرایا: ''اللہ! تیرا شکر ہے کہ جہاز پر ہمارے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی ہے''۔ یُوں لگتا تھا جیسے اس نے خدا کا شکر میرے بارے میں یہ جاننے کے بعد ادا کیا تھا کہ میں ڈاکٹر ہوں۔ میں اس سے متاثر ہوا اور چند دنوں بعد اس کے کہے ہوئے الفاظ کے معانی مجھ پر منکشف ہوئے۔

ہم جب ایک دوسرے سے زیادہ مانوس ہو گئے تو ایک روز اس نے مجھ سے کہا: ''آپ ڈاکٹر حضرات کیا کرتے ہیں؟ ایک آشوبِ چشم میں مبتلا مریض آپ کے پاس جاتا ہے اس کے لیے اسے آنکھوں میں ڈالنے کے لیے قطروں والی دوا درکار ہوتی ہے۔ اگر بخار کی دوا کی ضرورت ہوتی ہے تو آپ کونین دے دیتے ہیں۔ اسہال کی تکلیف ہو تو افیم کا سَت دے دیتے ہیں۔ واللہ میں اتنا ہی اچھا معالج ہوں جتنے اچھے ڈاکٹر آپ ہیں۔ بس مجھے صرف چند بیماریوں کے عربی نام آنے چاہئیں۔

چنانچہ حاجی ولی نے مجھے بڑی تاکید کے ساتھ کہا کہ میں اپنی روزی دیانتداری کے ساتھ زبانیں سکھا کر کماؤں۔ ''ہم نے ڈاکٹروں کو اپنے اوپر طاری کر لیا ہے''۔ اس نے کہا اور مجھے پتا چلا کہ یہ حقیقت تھی۔ ہم ایک ہی چھت تلے رہتے ہوئے دوست بن گئے تھے۔ دن میں ہم ایک دوسرے سے کئی بار ملتے تھے، ہم کھانا اکٹھے کھاتے۔ ہماری شام مسجد میں گزرتی یا ہم سیر و تفریح کے کسی مقام کی طرف اکٹھے نکل جاتے تھے۔ شروع شروع میں ہم بے تکلف نہیں ہوئے تھے مگر رفتہ رفتہ ہم بھنگ بھی مل کر پی لیتے تھے اور جس دنیا کو میں اس قدر دیکھ چکا تھا اس کے بارے میں ہم طویل باتیں کرتے تھے۔ اس کا وطن مالوف رُدس تھا اور وہ بھی میری طرح ایک سیاح تھا اور اس جہاں گردی کے دوران وہ اپنی قوم کے بہت سے تعصبات سے آزاد ہو چکا تھا۔ ''میں اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہوں اور کسی اور شے میں نہیں''۔ وہ یہ جملہ بڑے پختہ عقیدے کے ساتھ کہا کرتا تھا۔ میں جب کارواں سرائے میں داخل ہوا تو اس نے اپنے آپ کو میرے گائیڈ کے طور پر پیش کیا، وہ مجھے تاجروں کے فریب سے بطورِ خاص محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے مشورے پر میں نے اپنا درویشی کا لبادہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا، وہ نیلی لمبی پتلون اور مختصری قمیض تبدیل کر لی تھی جو میں اس لبادے کے ساتھ پہنا کرتا تھا۔ میں دراصل ملک فارس اور فارس کے باشندے (فارسی) سے اپنا تعلق منقطع کر لینا چاہتا تھا جن کا بہروپ اب تک میں نے بھر رکھا تھا۔ حاجی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''اگر تم اب بھی بضد

ہو کہ تم اپنے آپ کو عجمی ظاہر کرو تو تم اپنے آپ کو مشکل میں گرفتار کر لو گے اور مصر میں تمہیں اس کے لیے طعن کی جائے گی۔ عرب میں تمہیں مارا پیٹا جائے گا کیونکہ تم ایک بدعتی ہو تمہیں دوسرے سیاحوں کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ادا کرنا پڑے گا اور تم اگر بیمار پڑ گئے تو سڑک کے کنارے کہیں چلتے چلتے مر جاؤ گے۔''

میں نے کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ میں اپنے آپ کو ''پٹھان'' ظاہر کروں گا۔ وہ پٹھان جس کے والدین افغان تھے اور جو ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے اور اس کی اپنی پیدائش ہندوستان میں ہوئی (عربی کے فاتحان کو بگاڑ کر شاید پٹھان بنا دیا گیا ہے جس کا مطلب ہے فاتح) تعلیم اس نے رنگون میں حاصل کی اور پھر اسے دنیا کی سیاحت پر بھیج دیا گیا تھا۔ اس نسل کے نوجوان اکثر سیاحت پر نکل پڑتے ہیں۔ میری پوری طرح حفاظت کی گئی تاکہ میں اپنے ہموطنوں کی نظر میں نہ آ جاؤں جس کا خطرہ رہتا تھا۔ اس کردار کے لیے فارسی زبان کا جاننا بہت ضروری تھا۔ میں ہندوستانی اور عربی دونوں زبانیں کافی حد تک جانتا تھا۔ یہ ایک اہم اقدام تھا۔ آپ کسی دکان میں ہوں، اونٹ پر سوار یا مسجد میں، پہلا سوال جو آپ سے کیا جاتا ہے وہ ہے: ''آپ کا اسم گرامی؟'' دوسرا سوال پوچھا جاتا ہے: ''آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟'' یہ سوالات پریشان کرنے کے لیے نہیں پوچھے جاتے۔ تاہم اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ کہیں آپ سے سوال کرنے والا کوئی بری نیت رکھتا ہے تو آپ بھی اس سے سختی کے ساتھ پوچھ سکتے ہیں: ''تمہارے نانا نانی کون تھے''؟ کسی برطانوی سے بھی پوچھنا ہو تو سوال کرتے ہیں: ''تمہاری ممی کی شادی کس چرچ میں ہوئی تھی؟'' اور یوں آپ اس مشکل سے صاف بچ نکلیں گے۔ تاہم اس کی ضرورت بہت کم پڑتی ہے۔ میں نے ایک ہندوستانی معالج کا نرم لہجہ اور دوستانہ رویہ اپنایا تھا۔ میں ایک افندی پٹھان کا لباس پہنتا تھا۔ میں اس سب کے باوجود اب بھی اپنے آپ کو ایک درویش کے طور پر پیش کرتا تھا اور ان مقامات پر ضرور جاتا تھا جہاں درویش جمع ہوتے ہیں۔ حاجی نے مجھ سے سوال کیا: ''یہ بتاؤ ان محترم و معزز انسانوں کا سیاست یا شماریات اور ان معلومات سے کیا تعلق ہے جس کو جمع کرنے تم نکلے ہو؟ اپنے آپ کو تم اگر پسند کرتے ہو تو ایک مذہبی سیاح کہو اور وہ لوگ جو تم سے اس جہاں گردی کے مقصد کے بارے میں پوچھتے ہیں انہیں تم بتا سکتے ہو کہ تم نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ تم مسلمانوں کے تمام مقدس مقامات کی زیارت کے لیے جاؤ گے۔ اس طرح تم انہیں یقین دلا سکو گے کہ تم ایک غیر معروف بہت بڑے انسان ہو اور اس طرح لوگ تم جس کے حقدار ہو اس سے زیادہ ادب و احترام کے ساتھ تم سے پیش آئیں گے۔ میرے دوست نے اپنی بات ایک کھو کھلے قہقہے کے ساتھ مکمل کی۔ اس کی یہ بات درست نکلی اور

مجھے اس کے مشورے پر عمل کرکے کبھی پچھتانا نہیں پڑا۔

معالج: کارواں سرائے میں رہائش پذیر ہونے کے بعد، میرا پہلا مقصد یہ تھا کہ میں دنیا میں ایک ہل مچا دوں۔ یورپ میں آپ کا سفری ڈاکٹر کسی ہیرے کی انگوٹھی کی گمشدگی کا اشتہار دیتا ہے جو کسی روسی مطلق العنان نے آپ کو تحفے میں دی تھی یا وہ کسی اخبار میں پورا کالم چھپواتا ہے جس کے لیے وہ نسخے کے استعمال کے لیے عنوان کے لیے فیس ادا کرتا ہے۔ ایک بڑی سی پیتل کی پلیٹ، طلائی سرے والی چھڑی، کھڑکھڑاہٹ پیدا کرنے والی دو پہیوں والی گاڑی اور وعظ کے ذریعے حاضری اس کام کو تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ یہاں کوئی ایسی راہ سڑک نہیں ہے جو طبی شہرت کی طرف جاتی ہو۔ آپ کو آغاز کسی مزدور کے ساتھ بیٹھ کر کرنا ہوگا جو آشوبِ چشم کے مرض میں مبتلا ہے جن میں آپ سلور نائٹریٹ کے چند قطرے ٹپکائیں گے جبکہ اس کے کان میں یہ خوش کن معلومات پھونکیں گے کہ آپ کسی غریب سے کبھی کوئی فیس نہیں لیتے۔

وہ مریض صحت یاب ہوجاتا ہے اور آپ کو دُور و نزدیک مشہور کردیتا ہے کہ آپ کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے اور پھر آپ کے دروازے پر محتاجوں اور مفلس مریضوں کا ہجوم اکٹھا ہوجاتا ہے۔ وہ آپ کے پاس اس طرح آتے ہیں جیسے آپ ان کے نوکر ہوں مگر جونہی وہ صحت یاب ہوئے پھر کبھی مڑ کر آپ کی طرف نہیں دیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپی ڈاکٹروں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کے مشرقی مریض عموماً بے مروتی اور ناشکر گزاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اگر آپ کسی انسان کی زندگی بچاتے ہیں تو وہ لامحالہ آپ سے پوچھتا ہے۔ اسے محفوظ کر لینے کے ذرائع کیا ہیں۔ مزید یہ کہ کسی بھی مشرقی زبان میں میری نظر سے ایک واحد اصطلاح ایسی نہیں گزری جس سے مراد ہمارے ہاں کا ''تشکر یا ممنونیت'' ہو۔ اور سوائے جرمنوں کے کسی اور کے پاس وہ خیالات نہیں ہیں جنہیں لفظوں میں بیان نہ کیا جاسکتا ہو یا جن کی تشریح ممکن نہ ہو۔ مگر آپ کو اس اچھائی کی عدم موجودگی کو اس کا سبب جانے بغیر برا نہیں کہنا چاہیے۔ ایک مشرقی سمجھتا ہے کہ اس کا آپ کی ہر فاضل شے پر حق ہے۔ ''روزمرہ کی روٹی کو بانٹ لیا جاتا ہے'' وہ اس بات پر زور دیتا ہے اور آپ کا کھا کر وہ اسے اپنا تصور کرتا ہے۔ یہی معاملہ دوسری اشیاء کے ساتھ بھی ہے۔ وہ خالق کی نعمتوں کے لیے اللہ کا شکر گزار ہے مگر اس کا دعویٰ ہے کہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی خدمات پر اس کا حق ہے۔ کسی کی خدمت کرکے آپ نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے اور وہ اس خدمت کے لیے آپ کی تعریف نہیں کرے گا۔ وہ آپ کو اپنا عمر بھر کا محسن سمجھ کر آپ کو درازیٔ عمر کی مختصر سی دعا دے کر چلا جائے گا۔ وہ کہے گا: ''آپ کا شکریہ''..... ''اللہ آپ کو

سکھی رکھے''! یا یہ دعا دے گا کہ اللہ آپ کا سایہ اس کے سر پر قائم رکھے اور یہ غالباً وہ آخری الفاظ ہوں گے جو زندگی میں آپ نے آخری دفعہ سنیں ہوں گے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا ہے۔ جب ان عام لوگوں کی کثیر تعداد آپ کو شہرت کی بلندیوں پر لے جاتی ہے تو پھر متمول اور امیر گھرانوں کے مریض آہستہ آہستہ منظر پر نمودار ہونے لگتے ہیں۔ رکھ رکھاؤ اور آداب مجلس کی بات ہوتی ہے خواہ آپ ان مریضوں کے گھر پر انہیں دیکھنے جائیں یا وہ آپ کے پاس آئیں۔ وہ یہ سوچ لیتے ہیں کہ وہ آپ کو دیکھیں گے اور اپنی آنکھوں سے یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ آپ پر بھروسہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اور آپ اپنی جگہ اس پختہ ارادے کے ساتھ چل پڑتے ہیں کہ اب آپ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ وہ فوراً آپ کی دوا نگل لیں گے۔ جب آپ ان کے گھر جاتے ہیں تو آپ کا اصرار ہوتا ہے کہ مریضوں کے نوکر ہاتھ باندھے آپ کے سامنے کھڑے رہیں اور سواری کے لیے وہ آپ کو گدھا ہی پیش کریں خواہ آپ کو گلی کے پار دوسری طرف ہی کیوں نہ جانا ہو۔

آپ کا بھروسے کا انسان آپ کا رازدان آپ کے ساتھ جاتا ہے تا کہ نوکروں کے پچاسوں تحقیقی سوالات کا جواب دے سکے۔ جب نرسیں آپ کے سامنے عزت واحترام کی خاطر، ادب سے جھک جاتی ہیں جس وقت آپ دروازے پر اترتے ہیں اور ایک شان بے نیازی سے آپ سیڑھیاں چڑھنے لگتے ہیں۔ جب آپ بیماروں کے کمرے میں جاتے ہیں وہاں جو لوگ موجود ہوتے ہیں۔ آپ ان سے خیریت دریافت کرتے ہیں، ان کے لیے صحت وسلامتی چاہتے ہیں تو جواباً وہ بھی آپ کو یہ دعا دیتے ہیں: ''آپ پر خدا کی سلامتی اور اس کا رحم وکرم ہو!'' معذور اور اپاہج سے آپ کہتے ہیں: ''صبر سے کام لو فکر کی کوئی بات نہیں، خدا کو خوش رکھو۔'' البتہ صحت کے بارے میں آپ اس سے کچھ نہیں کہتے وہ آپ کو صحت وتندرستی کی دعا دیتے ہیں۔ پھر آپ بیٹھ جاتے ہیں اور اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے ہونٹوں تک لے جاتے ہیں اور ان سب کی موجودگی کا اعتراف کرتے ہیں اور سر کو ہلکا سا جھکا کر چاروں طرف گھوم جاتے ہیں۔ اسی طرح کا تاثر ہر شخص آپ کو دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اب آپ سے آپ کی صحت کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ مشروبات میں سے کیا پینا پسند فرمائیں گے۔ آپ کسی ایسے مشروب کا نام لے لیتے ہیں جو گھر میں موجود ہی نہیں ہوتا۔ آپ پائپ پینے کے ساتھ ساتھ کافی کی چسکی بھی لیتے ہیں۔ پھر آپ مریض کے پاس جاتے ہیں تو وہ اپنی کلائی آپ کی طرف کر کے نبض دکھانے کی درخواست کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اُسے کیا بیماری ہے۔ آپ اس کی زبان باہر نکلوا کر معائنہ کرتے ہیں، اس کی نبض دیکھتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے

—

آپ نے مرض کی تشخیص کر لی ہے۔ آپ اس مریض کو کئی ایک بیماریوں میں مبتلا ہونے کی خبر سنا دیتے ہیں۔ آپ اس کے لیے اتنی ہی تعریف وصول کرتے ہیں جتنی کوئی ماہر علم وصول کرتا ہے۔

بیماری کو چار مزاجوں میں سے کسی ایک کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے یا چار عناصر میں سے کسی ایک کے ساتھ یا کسی بقراط کے مزاج کے ساتھ۔ مرض سے صحت یاب ہو جانا تو آسان ہے مگر اس میں وقت کافی لگتا ہے اور آپ جو ڈاکٹر ہیں آپ کو توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ مریض کو دوا کی گولی یا پوڈر دینے کے بجائے آپ اس سے تھوڑی سی سختی سے پیش آئیں۔ پیشہ ورانہ عزت و تکریم سے کوئی بھی واقف نہیں رہے گا اور آپ کی ناراضگی کی پرواہ نہیں کرے گا۔ اگر آپ ایک مقامی معالج ہیں تو آپ کسی ایسے مریض کو دیکھنے جائیں جہاں اپنی فیس کے کم یا زیادہ کرنے کے بارے میں آپ مریض سے سودا بازی کر سکیں۔ جب کبھی کسی معالج پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے تو اس سے شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں۔ میں نے ایک بار ایک ایسے امیر تاجر کا علاج کیا تھا جسے گنٹھیے کی بیماری تھی۔ میں نے اس سے علاج کے پیسے لینے میں تھوڑا سا تغافل برتا تو وہ بہت حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے اس سے ایک شلنگ مانگا تو اس نے شلنگ قالین پر دے مارا تھا اور ہندوستانی حرص اور لالچ کو برا بھلا کہنے لگا تھا۔ میرے حاجی دوست نے جب یہ سنا تو کہا ''تم ضرور کوئی دوسری بیماری لاؤ گے''۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی معزز فرد کے گھر جا کر مریض کو دیکھنے کی فیس چار شلنگ ہے مگر آپ اس کے ساتھ فیس کے معاملے میں سودا بازی شروع کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اسہال اور عرق النساء کی شکایت کر رہا ہے۔ آپ اس سے اسہال کے علاج کے لیے دس پاؤنڈ اور عرق النساء کے علاج کے بیس پاؤنڈ طلب کر لیتے ہیں۔ آپ کو اتنے پیسے شاید ہی کبھی ملے ہوں۔ ایک مشرقی اپنے معالج کا بل ادا کرتے وقت اس پر رنج کا اظہار کرتا ہے۔ آپ کا مریض صحت یابی کی علامتیں دکھانے لگتا ہے۔ وہ نصف دن تک ہنستا رہے گا، مذاق کرتا رہے گا مگر جونہی آپ سامنے آتے ہیں وہ کراہنے لگتا ہے اور اس کی عذر بھری شکایات آپ کا استقبال کرتی ہیں۔ اس وقت آپ اس طرح کا اشارہ دیتے ہیں: ''دنیا ایک نعش ہے اور اس کے طالب کتے ہیں''۔ آپ دوسری بیماری کے علاج سے انکار کر دیتے ہیں جو اسے سرکشی کی طرف مائل کر سکتا ہے۔

آپ جو نسخہ بھی تجویز کریں وہ ٹھوس اور مادی ہونا چاہیے۔ اگر آپ نے اس میں کوئی تکلیف دہ شے شامل کر دی ہے مثلاً برش سے کھرچنا تو یہ اور بہتر ہوگا۔ مشرقی ہمارے یورپ کے کسانوں کی مانند ڈاکٹر سے یہ

چاہتے ہیں کہ وہ ''ان کے ادا کردہ پیسے کی قیمت ادا کرے''۔ اس کے علاوہ انداز سے کیے گئے اقدامات
کے تصورات پر مفید اثرات مرتب کرتے ہیں۔ فارس کے بادشاہ کا حکیم بخار کا علاج بید زنی سے کرتا تھا۔ ب
کے روٹیوں والے تنور میں مریضوں کو آگ پر بٹھا دیا جاتا تھا کہ وہ تندرست ہو جائیں گے۔ ایک مرز
اسکندریہ میں علاج گرم لوہے کے داغنے کے ذریعے کیا جاتا تھا جب آپ کسی مرض کے علاج کو اپنے ہاتھ میں
لے لیتے ہیں تو آپ نصف درجن روئی کی گولیوں کو دار چینی کے پانی میں بھگو کر اس میں تھوڑی سی ہینگ ڈال
دیتے ہیں۔ اب آپ بڑی احتیاط کے ساتھ یہ کہتے ہیں: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اور جب مریض دوا کی
خوراک کھا لیتا ہے آپ کہتے ہیں: ''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو صحت و تندرستی دینے والا ہے''۔ اب
آپ قلم دوات اور کاغذ منگواتے ہیں اور اس طرح کا نسخہ لکھتے ہیں:

الف (اللہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ کی ساری رحمتیں ہمارے رسولؐ اور آپؐ کے اہل بیت پر اور ان کے صحابہ
کرامؓ پر ہوں۔ لیکن اس کے بعد اس مریض کو شہد اور دار چینی کا پانی پلایا جائے۔ دونوں کا نصف نصف حصہ ہو
اس کے ساتھ ادرک کا ایک حصہ شامل کیا جائے اور ان سب کو شہد میں ملا کر دیا جائے۔ حُب کلاں، کی شکل دی
جائے اور ہر ایک کا وزن ایک مثقال ہو اور مریض ہر روز ایک گولی پودینے کے ساتھ استعمال کرے۔ یقیناً
افاقہ ہوگا۔ پرہیز میں جو چیزیں لکھی جا رہی ہیں۔ ان میں گوشت، مچھلی، سبزیاں، مٹھائی، بادی اشیاء شامل
ہیں۔ مریض کو سکون چاہیے اس کے کمرے میں شور وغل نہ ہو۔ اس طرح یہ مریض اس بادشاہ، صحت دینے
والے، خدائے بزرگ و برتر کی مدد سے تندرست و توانا ہو جائے گا۔

جہاں تک خوراک کا تعلق ہے مجھے مریضوں کو یہ بات بہت کم کہنا پڑتی تھی کہ غذا قوت بخش ہونی
چاہیے۔ مشرقیوں میں یورپی طبی نظام کے خلاف پائی جانے والی نفرت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم اس
معالجاتی فن کی شاخ کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ جب کبھی ایک ہندی یا ہندوستانی دوا لیتا ہے تو وہ اس کے لیے
اپنے آپ کو بذریعہ غذا تیار کرتا ہے۔ دوا جب ختم ہو جاتی ہے تو وہ دوبارہ پرانی عادات کی طرف لوٹ جاتا
ہے۔ اگر وہ دوا کھانے کے دوران درمیان میں دوا چھوڑ دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ ضرر رساں
نتائج نکلنے شروع ہو جائیں گے۔ ہمیں ہروڈوٹس سے پتا چلتا ہے کہ قدیم مصری ہر ماہ چند دنوں میں متبادل
خوراک استعمال کرتے تھے اور ایسا وہ لگا تار کیا کرتے تھے۔ بلاشبہ دوا کی قوت کو درجہ بندی دینے کے لیے ایسا

کیا جاتا تھا۔ اہل فارس کثرت لعاب کی صورت میں اپنے آپ کو گرم کمرے میں بند کر لیا کرتے تھے۔ پورا لباس بھی نہ اتارتے تھے اور سردی سے اپنے آپ کو اس حد تک بچاتے تھے کہ پانی بھی نیم گرم پیتے تھے۔ جب افغان شہزادوں نے جن سنگ کا استعمال ضروری سمجھا تو اسے ایک ایسا ٹانک تصور کیا جو شہوت انگیز ہوتا تھا۔ وہ موسم بہار کا انتخاب کرتے تھے اور ان دنوں باغات میں چلے جاتے تھے جہاں پھول، اشجار اور ابلتی ہوئی ندیاں انہیں ایک تسکین اور طمانیت بخشتے تھے۔ وہ پوری احتیاط برتتے تھے کہ تھکن ان سے دور رہے اور ہر طرح کی مشکلات سے دامن بچا کر زندگی گزارنے کے خُوگر تھے یہاں تک کہ کسی سے خط نہ پڑھواتے تھے کہ اس میں کہیں کوئی بُری خبر نہ ہو۔

جب نسخہ لکھا گیا ہو تو آپ اس کے شروع اور آخر میں اپنی انگوٹھی کا نشان بطور مُہر لگا دیتے ہیں تا کہ نہ اس کے متن سے کچھ نکالا جا سکے نہ اس میں اضافہ کیا جا سکے۔ آپ جب مریضوں میں دوا کسی اعلیٰ عہدیدار یا بڑے آدمی کو بھیجتے ہیں جس کے سو دشمن بھی ہو سکتے ہیں تو آپ دوا کی ڈبیہ یا بوتل کو کھولتے وقت اسی قسم کی احتیاط برتتے ہیں۔ ایک پاشا جس سے میں ملا تھا ایک بہادر سپاہی تھا جو محمد علی کا چہیتا تھا اس لیے اس کے جانشین نے اس کا مقام و مرتبہ گھٹا دیا تھا۔ لوگ آج بھی یہ نہیں بھولے کہ پرانے زمانے میں وہ لوگ جو ریاست کی نظر میں کھٹکتے تھے ان کے شکم میں اچانک شدید درد ہونے لگتا تھا۔ جہاں تک ڈاکٹر کی بات ہے یہ عام دانائی کی بات ہے کہ وہ یہ احتیاط برتتا ہے۔ اس کی جب شامت آتی تھی تو مریض کا پورا خاندان اس کا دشمن بن جاتا تھا۔

قاہرہ میں اگرچہ ڈاکٹروں کی کمی نہ تھی لیکن اس کے باوجود یہ شہر مزید کی مدد کر سکتا تھا۔ تاہم اگر انہیں خوب روپیہ کمانا تھا تو ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہندوستانی، چینی یا مغربی ہوں۔ مصری باشندے یورپی علاج سے بہت تنگ ہیں جو یہاں بھی اسی قدر اثر انگیز ہے جتنا ہندوستان میں۔ لیکن یہ ہند کی طب سے ناواقف ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستانی جادو ٹونے میں بھی بڑے ماہر ہیں اور یورپی بھی اب ان میں یقین کرنے لگے ہیں۔ بطور ایک ہندی کے میں سائنس کو وسیع مافوق الفطرت شکل دے سکتا تھا۔ حاجی ولی نے اس موضوع میں تجسس کی وجہ سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور مجھے مشورہ دیا کہ میں خالصتاً مسمریزم کو عملاً نہ اپناؤں۔ وگرنہ میں ''شیطان کے ساتھیوں'' میں سے ہو جاؤں گا۔ میرے دوست نے کہا: ''تم اسے ایک ہندوستانی راز کہو کیونکہ یہ بات تو واضح ہے کہ تم کوئی مشیخ (بزرگ ہستی) نہیں ہو..... لوگ تم سے پوچھیں گے: ''آپ کی دوائیں کہاں

ہیں اور جادوٹونے سے آپ کا کیا واسطہ ہے؟'' یہ کہنا بے معنی ہوگا کہ میں نے اس سے شہرت [illegible]
اس کے باوجود مریض مجھے مرشد اور اپنے آپ کو میرے مرید سمجھتے تھے، وہ عقیدت سے [illegible]
تھے۔

مدینہ منورہ: مسجد نبوی سینیارٹی کے لحاظ سے اسلام میں دوسرے نمبر پر آتی ہے اور فضیلت کی بنیاد پر اگر اس کا مقابلہ کعبہ سے کیا جائے تو دوسری یا مزید کچھ اور لوگوں کے خیال میں شان و شوکت سے [illegible] سے پہلے نمبر پر ہے۔ یہ مسجد مدینے میں اس جگہ تعمیر کی گئی تھی جہاں آپ کی اونٹنی قصویٰ اللہ کے حکم [illegible] گئی تھی۔ اس وقت اس جگہ کھجوروں کے درخت تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی تعمیر کا حکم صادر فرمایا تھا تاکہ اس میں اللہ کی عبادت کی جا سکے۔ آپؐ نے ان نوجوانوں کو بلا بھیجا جن کی یہ جگہ ملکیت تھی، آپ نے چند انصار کو بھی بلایا اور اصرار فرمایا کہ وہ یہ زمین خرید کر اس پر مسجد بنائیں گے اور اس کی اصل قیمت سے بڑھ کر ادا کرنا چاہتے تھے۔ اس زمین کو ہموار کر کے، اور درختوں کو گرا کر اسلام کی پہلی مسجد کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

اس زمانے میں اس مسجد کی دیواریں ناتراشیدہ پتھروں اور کچی اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ چھت پر کھجور کے درختوں کے تنے استعمال ہوئے تھے۔ حضرت جبریلؑ اس کی بلندی کے بارے میں حکم الٰہی لے کر حاضر خدمت ہوئے تھے اور یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی بلندی موسیٰؑ کے معبد سے زیادہ نہ ہو۔ مسجد کو بالکل سادہ رکھنے کا فیصلہ ہوا تھا اور کسی طرح کی آرائش کی اجازت نہ تھی۔ انصارین اور مہاجرین مسجد کی عمارت کے لیے پتھر، اینٹ گارا البقیع کے قبرستان سے اٹھا کر لائے تھے۔ یہ حضرت ایوب انصاریؓ کے کنویں اور شمال میں اس مقام کے قریب تھی جہاں اب مسجد ابراہیم کھڑی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کی تعمیر میں ان کی مدد کر رہے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے پڑھتے جاتے تھے:

> ''اے اللہ آنے والے کل کی اچھائی سے کوئی اچھائی اچھی نہیں۔ میرے مولا! میرے انصارین اور مہاجرین پر اپنا رحم و کرم فرما۔''

اس مسجد کی لمبائی شمال سے جنوب تک 54 ہاتھ اور چوڑائی 63 ہاتھ تھی۔ سوائے مغربی سمت کے اس کے ہر طرف مکانات تھے۔ نماز پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی جاتی تھی پھر نئی وحی کے ذریعے مکہ کو قبلہ قرار دے دیا گیا تھا اور اب مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ جبریلؑ نے معجزانہ طور پر پہاڑوں اور جنگلوں کے درمیان سے کعبہ کا منظر سامنے لا کھڑا کیا تھا تاکہ قبلہ کا تعین کرنے میں

کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

628ء میں خیبر کی فتح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پہلے تین خلفاء نے اس مسجد کو بحال رکھا لیکن مسلم مؤرخین اسے دوسری بنیاد نہیں مانتے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی اینٹ خود رکھی تھی اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے آپؐ کو پتھر اور اینٹیں اٹھا کر لاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر خلفاء نے اپنی اپنی باری پر اس اینٹ کے ساتھ ایک اینٹ لا کر رکھی تھی جو اللہ کے رسولؐ نے اپنے دستِ مبارک سے رکھی تھی۔ اس طرح مسجد کی دیواریں بلند ہوتی گئی تھیں۔ طبرانی لکھتا ہے کہ ایک انصار کے پاس مسجد سے متصل ایک گھر تھا جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش ہوئی کہ اسے جائے نماز بنایا جائے۔ اس انصار کو آنحضورؐ نے جنت میں گھر پانے کی بشارت سنائی تھی۔ اس نے اپنی غربت کی وجہ سے بڑی نرمی سے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ آپؐ نے اس کا عذر قبول کر لیا تھا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے یہ جگہ دس ہزار درہم میں خرید کر اللہ کے رسولؐ کو دے دی تھی اور آپؐ نے جو بشارت انصار کو سنائی تھی وہ حضرت عثمان کے حصے میں آ گئی تھی۔

یہ مسجد مربع شکل میں تھی اور چاروں طرف سے ایک ایک سو ہاتھ تھی۔ پہلی عمارت کی طرح اس کے تین دروازے تھے: ایک جنوب میں جس طرف محراب النبی اب ہے دوسرا موجودہ باب الرحمت کی جگہ، تیسرا باب عثمان پر جسے آج کل باب جبریل کہتے ہیں۔ محراب یا جائے نماز کے بجائے پتھر کا ایک بھاری ٹکڑا نماز کی ادائیگی کے رخ کو بتاتا ہے۔ پہلے اسے مسجد کی شمالی دیوار کے ساتھ رکھا گیا تھا پھر جب مکہ قبلہ بنا تو اسے جنوب کی طرف منتقل کر دیا گیا تھا۔

ابتداء میں جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ دیتے تھے تو تھکن کی حالت میں ایک ستون کے ساتھ سہارا لے لیتے تھے۔ منبر مدینہ طیبہ کے بنو بخار کے ایک شخص نے ایجاد کیا تھا۔ اس کا فریم لکڑی کا تھا اور یہ 2 ہاتھ لمبا اور ایک ہاتھ چوڑا تھا اور اس کی تین سیڑھیاں تھیں۔ آپؐ کو جب چند لمحے ستانا ہوتا تو آخری سیڑھی پر بیٹھ جاتے تھے۔ اس منبر کی موجودہ شکل 709ء میں اُموی خلیفہ ولید کے عہد میں بنی تھی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دن کا زیادہ حصہ اپنے صحابہ کرام کے ساتھ اس مسجد میں گزارتے تھے۔ اس دوران باتیں ہوتیں، تعلیم اور ہدایات کا سلسلہ جاری رہتا اور غرباء و مساکین کی دلجوئی کی جاتی تھی۔ آپؐ کی ازواج مطہرات کے گھر، آپ کے خاندان اور اہم احباب کے گھر قریب قریب تھے۔ مسجد کی چھت پر سے

دی گئی اذان کے بعد یہاں نماز ادا کی جاتی تھی۔ یہیں آنحضورؐ مختلف ممالک سے آئے ہوئے وفود اور سفارت کاروں سے ملاقات فرماتے، یہیں اللہ کا فرشتہ جبریلؑ وحی بھی لایا کرتا تھا۔ یہیں چند گز خالی جگہ پر آپؐ کا وصال ہوا اور یہیں روضۂ مبارک بنا۔

خلیفہ اوّل نے چند کھجوروں کے درخت کھڑے کر دیئے تھے جو زمین پر گر گئے تھے۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے آپ کا حُجرہ یا آپؐ کی زوجہ مطہرہ حضرتِ عائشہؓ کے کمرے کے گرد چار دیواری بنا دی تھی جس میں آنحضورؐ کی آخری آرام گاہ بنی تھی۔ یہ چار دیواری گارے کی تھی۔ پھر 638ء میں حضرت عمرؓ نے ہی مسجد کو 120 ہاتھ سے 140 ہاتھ تک وسیع کر دیا تھا۔ انہوں نے سوائے مشرقی سمت کے جہاں اُمہات ملتِ اسلامیہ کے گھر تھے چھوڑ کر تمام زمین ہر طرف سے لے لی تھی۔ شمالی دیوار کے باہر خلیفۂ دوم نے الصفہ یا البطحہ کھڑا کرادیا تھا جو کچھ اونچا لکڑی کا بنچ تھا جس میں مٹی یا پتھر بھی استعمال ہوا تھا۔ اس پر بیٹھ کر لوگ تفریح کے طور پر بات چیت کر سکتے تھے، شعر پڑھ سکتے تھے اس لیے کہ مسجد اب ایک خاص احترام والی جگہ تصور ہوتی تھی۔

دوسری مسجد 649ء میں تعمیر ہوئی جسے تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ نے تعمیر کرایا تھا۔ انہوں نے لوگوں کی مخالفت کے باوجود پرانی دیواریں گرا کر مسجد کی عمارت کے شمال کی جانب اور کچھ مغرب کی طرف توسیع کر دی تھی۔ انہوں نے مشرقی سمت کو بالکل نہیں چھیڑا تھا کہ وہاں پرائیویٹ مکانات تھے۔ چھت ہندوستانی ساگوان کی تھی اور دیواریں تراشیدہ پتھروں کی۔ اس توسیع اور تبدیلی پر کچھ آوازیں احتجاج کے طور پر اٹھیں مگر خلیفۂ وقت نے آنحضورؐ کی ایک روایت کا حوالہ دے کر انہیں خاموش کرا دیا تھا۔ آپؐ کی حدیث مبارکہ یہ ہے کہ ''اگر میری اس مسجد کی وسعت صفا کی پہاڑی تک ہوتی، جو مکہ میں ہے، تو یقیناً یہ پھر بھی میری مسجد ہوتی''۔ کچھ لوگ یہ بیان کرتے ہیں۔

''اگر مسجد نبوی کی توسیع ذوالحلیفہ تک ہوتی (جو مدینے سے پانچ میل دور مکے کے راستے پر ہے) تب بھی یہ مسجد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی''۔ حضرت عثمان نے آنحضورؐ کی یہ حدیث بیان فرما کر مسجد نبوی کی وسعت کرادی تھی حالانکہ آپ کی شہادت کا ایک سبب یہ بات بھی بنی تھی۔ اس کی تکمیل یکم محرم 650ء کو ہو گئی تھی۔

بالآخر اسلام دنیا کے دور دراز علاقوں تک پھیلتا گیا اور اس کی طاقت میں بھی رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا تھا۔ شاندار عمارات کی تعمیر میں بھی اب یہ دنیا کی کسی قوم یا مذہب سے پیچھے نہیں تھا۔ 707ء میں ولید اوّل نے

بنوامیہ خاندان کے بارھویں خلیفہ تھے، جامع الاموی کی دمشق میں تعمیر کرا کے اب اپنی سخاوت اور فیاضی کا مظاہرہ مدینہ میں بھی کرنا چاہتے تھے۔ مدینے کے گورنر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تھے، ان سے کہا گیا کہ وہ پرانی مسجد کی مشرقی سمت میں جمع شدہ کچھ اینٹوں کو سات ہزار دینار کے عوض خرید لیں۔ وہاں اہل بیت میں سے چند ایک کے اور اوّلین صحابہٴ کرام کے عزیز و اقارب کے مکانات تھے۔ کرایہ داروں سے مکانات خالی کرانے میں کچھ مشکل پیش آئی تھی۔ کچھ خواتین نے روپیہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ یونانی شہنشاہ نے خلیفہٴ وقت کے لیے قیمتی تحائف اور اسی ہزار دینار نقد ارسال کیے تھے۔ اس نے اپنے کاریگر اور ماہرین فن تعمیر بھی بھیجے تھے کہ سنگ مرمر کے ستونوں اور دیواروں پر کندہ کاری اور پچی کاری کا کام کرائیں۔ ان عیسائی کاریگروں میں سے ایک نے خانہ کعبہ کی دیوار پر خنزیر کی تصویر بنا دی تھی جس کا سر قلم کر دیا گیا تھا۔ ایک دوسرا چھت کو خراب کرنا چاہتا تھا کہ زمین پر گرا اور اس کا بھیجہ باہر آ گیا تھا۔ باقی کے مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے مگر اس کے باوجود کچھ بوڑھے عرب دبی زبان سے شکایت کرتے تھے کہ ان کی مسجد کو مسیحی بت خانہ بنا دیا گیا ہے۔

آپؐ کے حجرے یا رہائشی کمرے کو جہاں حضرت عزرائیلؑ نے، جو موت کے فرشتہ ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے آپؐ کی رُوح جسم سے اس وقت جدا کی تھی جس وقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک حضرتِ عائشہؓ کی گود میں تھا پہلی بار مسجد کے اندر شامل کیا گیا تھا۔ کچی اینٹوں کی بنی ہوئی دیوار کو، جو تین قبور مبارک کو گھیرے ہوئے تھی، تراشیدہ پتھر سے تبدیل کر دیا گیا تھا۔ یہ دوہری دیواریں دروازے کے بغیر تھیں البتہ شمال میں ایک چھوٹا سا دریچہ موجود تھا۔ مسجد کے ہر کونے پر ایک مینار تعمیر کیا گیا۔ عمارت کو 167 ہاتھ سے 200 ہاتھ تک وسیع کر دیا گیا تھا۔ آنحضورؐ کے وصال کے بعد بھی حضرت عائشہؓ اسی کمرے میں مقیم تھیں اور ان کے اور روضہٴ رسولؐ کے درمیان کوئی پردہ نہ تھا۔ پھر جب روضہٴ مبارک پر زیادہ لوگ آنے لگے تو آپ نے درمیان میں ایک دیوار بنوا دی تھی۔ وہ بلا کسی حجاب کے روضہ مبارک پر جاتی تھیں، جب تک وہاں صرف ان کے والد گرامی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قبر مبارک آنحضورؐ کی قبر مبارک کے پہلو میں تھی۔ جب حضرت عمرؓ کی قبر مبارک کا وہاں اضافہ ہو گیا تو آپ ہمیشہ اپنا چہرہ مبارک پردے میں چھپا کر وہاں جاتی تھیں۔ جب حضرت ولید، خلیفہٴ وقت نے وہاں حاضری دی تو پوچھا کہ ان میناروں کو بنوانے میں زیادہ شان و شوکت کیوں نہیں دکھائی گئی اس پر گورنر نے جواب دیا کہ صرف دیواروں پر جو خرچ آیا تھا وہ 45 ہزار ڈیوکٹ (9 شلنگ کا ایک ڈیوکٹ تھا) تھا۔

چوتھی مسجد کی تعمیر 805ء میں المھدی نے کرائی جو بنوعباس کے تیسرے شہزادہ تھے۔ بغداد کے خلفاء حج پر دل کھول کر خرچ کرنے کے لیے تاریخ میں بہت مشہور ہوئے۔ اس شہزادہ نے عمارت میں توسیع کے لیے شمالی جانب دس خوبصورت سنگ مرمر کے ستون بنوائے تھے جن پر کندہ کاری کی گئی تھی۔ 817ء میں خلیفہ مامون نے اس مسجد میں مزید توسیع کرائی۔ یہ المھدی کی مسجد تھی جس میں سے الحکیم بن امر اللہ، مصر کے تیسرے فاطمی خلیفہ اور دروزی فرقے (ایک مسلم فرقہ جو محمد الدرازی کے نام پر بنا) کے ایک شخص نے آنحضورؐ اور آپؐ کے دو خلفائے راشدین کے جسموں کو چرا کر لے جانے کا ارادہ کیا تھا۔ 1021ء میں اس نے اپنے ایلچی مدینے بھیجے تھے۔ یہ کوشش ناکام ہوگئی تھی اور اس حرکت کے مرتکب ہونے والے اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ الحکیم کا مقصد یہ تھا کہ روضۂ رسولؐ پر حاضری دینے والے اس کے دارالخلافے میں آیا کریں۔ دو عیسائیوں نے مدینے میں مغربی حجاج کی شکل میں رہائش رکھی اور قریب کے ایک مکان میں سے 1155ء میں ایک سرنگ روضۂ مبارک تک کھود ڈالی۔ ان کا پتا چل گیا تھا اور ان کے سر قلم کر کے انہیں جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا۔ 1256ء میں ایک آتش زنی کے نتیجے میں پانچویں مسجد تعمیر ہوئی۔ چند مصنفین لکھتے ہیں کہ شہر کے قریب ہی ایک آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ اس موقعہ پر حجرہ محفوظ رہا اور قرآن پاک کے قدیم نسخے جو وہاں موجود تھے وہ بھی محفوظ رہے۔ یہ قرآن خط کوفی میں لکھے ہوئے تھے اور حضرت عثمانؓ، خلیفہ سوئم نے اسے لکھا تھا۔ مسجد کی تعمیر کا کام اس بار 1289ء میں مکمل ہوا تھا۔ اس عمارت کو مصر کے شہزادوں نے وسیع بھی کرایا اور اس کی خوبصورتی میں بھی اضافہ کیا تھا۔ پھر یہ عمارت 200 برس تک چلی۔

چھٹی مسجد کی تعمیر 1483ء میں مصر کے مملوک بادشاہوں کے انیسویں سلطان نے کرائی تھی۔ اس طرح اس وقت یہ مسجد چار صدیاں پرانی ہے۔ المعتصم کی مسجد پر ایک طوفانِ باد و باراں کے دوران آسمانی بجلی گری تھی جس میں نماز ادا کرتے ہوئے 13 افراد اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ سوائے حُجرے کے اندرونی حصے کے مسجد کے تمام حصے اس سے متاثر ہوئے تھے۔ جنگلے اور روضۂ مبارک دوبارہ اصلی حالت میں لائے گئے تھے، طاقچے اور منبر قاہرہ سے بن کر آئے تھے اور دروازے اور مینار اپنی اپنی جگہ پر رکھے گئے تھے جہاں آج بھی ہیں۔ روضۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خدّام کی بہبود کے لیے پنشن اور دوسری مراعات کا اعلان کیا گیا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی میں سلطان سلیمان نے سفید سنگ مرمر سے روضۂ مبارک کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔

بعد میں آنے والے سلاطین کے عہد حکومت میں اور محمد علی کے دور میں چند تحائف چراغوں، موم بتیوں اور فانوسوں کی شکل میں لگائے گئے۔ چند ایک مقامات پر کچھ معمولی سی ترامیم کی گئی ہیں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اسلام کے موجودہ سربراہ روضۂ مبارک کے شمالی برآمدے اور ایک مینار کو از سر نو تعمیر کرا رہے ہیں۔ یہ تھی مسجد نبوی کی بڑھتی ہوئی خوبصورتی اور توسیع کی تاریخ۔

مسجد نبوی کی حالت، حالیہ دنوں میں: جب وہابیوں نے مدینہ منورہ کا محاصرہ کیا تو ان کے سرکردہ افراد نے روضۂ مبارک کی قیمتی اور نادر اشیاء کو آپس میں بانٹ لیا تھا۔ جب شہر نے ہتھیار ڈال دیئے تو سعود اپنے افسروں سمیت حجرے میں داخل ہوا مگر اس قدر خوفزدہ ہوا کہ نہ روضۂ مبارک پر نظر ڈالنے کی ہمت ہوئی نہ پردے کے پیچھے جھانکنے کا حوصلہ ہوا۔ اس نے راستے میں جو قیمتی چیزیں نظر آئیں لوٹ لی تھیں۔ ان قیمتی اشیاء کو اس نے شریفِ مکہ غالب کے ہاتھ 150,000 ریال میں بیچا تھا۔ بقیہ چیزیں وہ اپنے دارالخلافہ میں لے گیا تھا۔ پھر ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے اس عمارت کے تقدس کو مزید مجروح ہونے سے بچا لیا تھا۔ حریص وہابی طلائی گلوب اور بہت سے چاند گنبد خضرا کے اوپر دیکھ کر اس قدر للچائے کہ انہیں اتار لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کوشش میں ان میں سے دو تو پھسلن والی چھت سے گر کر ہلاک ہو گئے اور باقی کے دلوں میں وہم اور خوف نے اس قدر گھر کر لیا تھا کہ انہوں نے اپنے مذموم ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے ارادے کو ترک کر دیا تھا۔ تاہم انہوں نے اس شہر کے لوگوں پر بھاری ٹیکس لگا کر انہیں پریشان کر دیا تھا۔ روضۂ مبارک کی زیارت کے لیے آنے والوں پر پابندی عائد کر دی تھی۔ لوگوں کی زبان پر ان کے لیے سخت نفرت اور ناپسندیدگی کے الفاظ تھے۔ یہ لوگ ان وہابیوں کے کردار کے ایک بہت برے پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یہ لوگ کسی بھی مذہبی رسم کی ادائیگی میں مدد کے عوض ریال حجر کی جگہ اتنی ہی قیمت کے برابر بارود کے چند ذرے دینے کی عادت کے مالک ہوئے تھے۔

جب 1815ء میں عبداللہ بن سعود نے طوسی پاشا کے ساتھ ایک امن معاہدہ کر لیا تو مصری جنرل نے شہر کے لوگوں سے وہ تمام طلائی جہاز دس ہزار ریال کے عوض خرید لیے تھے جو ابھی پگھلائے نہیں گئے تھے اور یوں اس قیمتی خزانے کو اس کی اصل جگہ واپس لوٹا دیا تھا۔ اگرچہ میں نے اس کی تردید کی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کا قابل یقین ثبوت موجود ہے۔ مشرقیوں میں پچھلی نسل کے واقعات کو عموماً کہا جاتا ہے کہ درست طور پر یاد رکھا جاتا ہے۔ علماء کو بارہ سو سال پہلے کے تاریخی واقعات سے خوب شناسائی ہوتی ہے مگر جو

کچھ ان کے داداؤں نے دیکھا اس سے یہ لوگ بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ میں نے مسجد مدینہ کی موجودہ دولت سے متعلق بہت سی ناقابل یقین کہانیاں سنی ہیں۔ جب مبالغہ آمیزی کو مبالغہ سے کام لینے والے کے لیے عزت واحترام کا سبب قرار دیا جاتا ہے تو اس قسم کی باتوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔

مسجد مدینہ سے وابستہ عملے میں برکات کے دور سے کافی حد تک تبدیلی آ گئی ہے۔ یہ نیم ترک نسل کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کا نتیجہ ہے۔ اب بھی اس میں کافی وسعت ہے کیونکہ اوّل تو تقسیم ہو جانے والی افرادی قوت پورے مشرق میں بہت مقبول ہے اور دوسرا سبب اس امر کا یہ ہے کہ مقدس شہروں کے بیٹوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دیگر شہروں کے بیٹوں سے کم سے کم کام کے عوض جس قدر زیادہ وصول کر سکتے ہیں وصول کر لیں۔ درج بالا مواد مجھے عُمر افندی (مدینے میں برٹن کا میزبان) نے مہیا کیا تھا۔ میں نے اس کا موازنہ دوسروں کی فراہم کردہ قابل اعتماد معلومات کے ساتھ کیا۔

شیخ الحرم اب کوئی خواجہ سرا نہیں مقرر ہوتا۔ موجودہ ایک ترک پاشا، عثمان ہے جس کا تقرر قسطنطنیہ سے 5,000 پیاسٹر ماہانہ پر ہوا تھا۔ اس کا نائب یا ڈپٹی ایک سیاہ فام خواجہ سرا ہے جسے 5,000 پیاسٹر ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ اس کے کالج کا موجودہ پرنسپل ٹی آغا، اسماء سلطانہ کا ایک غلام ہے جو مرحوم سلطان محمود کی بہن ہے۔ خزانہ دار اعلیٰ کو مدیر الحرم کہتے ہیں۔ یہ خزانہ دار پر نظر رکھتا ہے جس کو 2000 پیاسٹر بطور ماہانہ تنخواہ کے ملتا ہے۔ ان کاتبوں کا افسر اعلیٰ مُستسلم ہے جو مسجد کے حسابات طے کرتا ہے۔ اسے 1500 پیاسٹر ماہانہ ملتے ہیں۔ اس کے ماتحت ایک نقیب یا معاون ہوتا ہے جسے 1000 پیاسٹر ماہانہ ملتے ہیں۔ خواجہ سراؤں کے تین شیوخ ہوتے ہیں جنہیں 700 سے 1000 پیاسٹر ماہانہ تک ادا کیا جاتا ہے۔ خواجہ سراؤں کی تعداد 120 ہے جن کے تین درجے ہیں: بوابین یا قُلّی جو مسجد کے دروازے کھولتے ہیں۔ مسجد کے پاک حصوں کی صفائی کرنے والے، اور سب سے نچلے درجے میں وہ افراد ہیں جو ہر طرح کی آلائشیں صاف کرتے اور ان لوگوں کو پیٹتے ہیں جو سو جاتے ہیں۔ اس کام میں چھڑی کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں آنے والا ہر شخص ان خواجہ سراؤں کو اس وقت تحائف پیش کرتا ہے جب یہ اسے مبارکباد کہتے ہیں یا کئی دوسری رعائتوں کے لیے بھی تحائف ملتے ہیں مثلاً جب کسی اجنبی کو چراغ جلانے اور فرش کو جھاڑو سے صاف کرنے کی اجازت مل جاتی ہے تو وہ اس کے عوض میں ان خواجہ سراؤں کو تحائف پیش کرتے ہیں۔ ان کی تنخواہ 250 سے 500 پیاسٹر ماہانہ ہوتی ہے۔ انہیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ عموماً شادیاں بھی کرتے ہیں ان میں سے کچھ کی

تین تین چار چار بیویاں بھی ہوتی ہیں۔آغا کا کردار بڑا حیرت انگیز اور اس کے ظاہر سے مستثنیٰ ہے۔بنی نوع انسان سے اس کا تعلق منقطع ہے، وہ ظالم، خوفناک، بہادر اور کسی بھی دشمنی کے لیے تیار ہو جانے والا انسان ہے۔وہ دراز قد کا دبلا پتلا شخص ہے، خاص طور پر اس کی ٹانگیں اور بازو بہت پتلے ہیں، کندھے اوپر اٹھے ہوئے اور ہڈیوں کے جوڑ باہر کو نکلے ہوئے ہیں، اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر بہت بڑا ہے۔وہ ہتھیاروں کے استعمال میں ماہر ہے، اُس کی آواز گرجدار اور بھاری ہے جس کی وجہ سے اسے کمان کرنے میں آسانی رہتی ہے۔

ان خواجہ سراؤں کے علاوہ بہت سے آزاد نوکر بھی ہیں جن کو فراشین کہتے ہیں اور جو مسجد سے وابستہ ہوتے ہیں۔تمام متوسط اور نچلے طبقے کے شہری اس درجے سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ تیس تیس کی پارٹیوں میں منقسم ہوتے ہیں اور ہر ہفتے ان کی ڈیوٹی تبدیل ہو جاتی ہے۔جو ڈیوٹی پر ہوں انہیں، ان کی خدمات کے عوض 22 پیاسٹر ملتے ہیں۔ان کا کام یہ ہے کہ قالینیں بچھائیں اور انہیں صاف کریں، چراغوں میں بتی اور تیل ڈالیں، جنہیں خواجہ سرا چھت سے نیچے لاتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کوئی زیادہ مصروفیت کا کام بھی نہیں یہ دن بھر فارغ ہی رہتے ہیں۔

مسجد کے دیگر عملے میں شیخ السقہ ہے جس کے زیر نگرانی پینتالیس سے پچاس تک ایسے افراد کام کرتے ہیں جو فرش پر چھڑکاؤ کرتے، باغات کو پانی دیتے اور یہاں حاضری دینے والے ہر شخص کو ایک پیالی نمکین سا محلول پینے کو دیتے ہیں۔

ادبی و علمی عملہ انتظامی عملے اور چھوٹے کاموں پر مامور افراد کی نسبت زیادہ ہے۔ان میں ایک قاضی، یا چیف جسٹس ہوتا ہے جس کا تقرر ہر سال قسطنطنیہ سے ہوتا ہے۔یہ 12 ماہ مدینے میں رہ کر مکے چلا جاتا ہے اور اس دوسرے شہر مقدس میں بھی اتنی ہی مدت گزار کر واپس وطن چلا جاتا ہے۔اس کے ماتحت تین مفتیان کرام بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق حنفی، شافعی اور مالکی مکاتب سے ہوتا ہے۔چوتھے یعنی حنبلی کی نمائندگی یہاں اور قاہرہ میں نہیں ہوتی۔(یہ صرف نجد میں اور مشرق میں ہیں)۔ان میں سے ہر افسر کو 250 پیاسٹر ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔یہاں مؤذن اپنے آپ کو رؤسا کہلاتے ہیں اور دور دراز تک ان کی نمائندگی تسلیم کی جاتی ہے۔سب سے نچلے درجے کے اڑتالیس یا انچاس افراد ہوتے ہیں جن پر چھ آقاؤں کی حاکمیت چلتی ہے اور یہ بھی شیخ الرؤسا کے ماتحت ہوتے ہیں۔صرف ان ہی کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ یہ رئیسہ مینار سے اذان دیں۔شیخ کو 150 پیاسٹر اور ہر چیف کو تقریباً 100 پیاسٹر ماہانہ ملتے ہیں۔البتہ ہر عام مؤذن کو 60 پیاسٹر ادا کیے جاتے

ہیں۔ خطیبوں کی تعداد 45 ہوتی ہے جو جمعہ کے روز وعظ کرتے ہیں انہیں 120 پیاسٹر ماہانہ ملتے ہیں۔ شیخ الخطباء کے ماتحت ہوتے ہیں۔ تقریباً اتنی ہی رقم 75 آئمہ کو دی جاتی ہے جو مسجد میں ہر روز پانچ نماز پڑھاتے ہیں۔ ان میں شیخ الامامت ان کا سینئر ہوتا ہے۔

مدینہ منورہ کے تقریباً تمام شہری جن کے ذمے روضہ مبارک سے متعلق کوئی سرکاری کام نہیں ہوتا اپنے آپ کو مجاورین کے طور پر خدمات سرانجام دینے کے اہل سمجھتے ہیں۔ یہ لڑکپن ہی سے نماز سیکھتے ہیں اور ایسی تربیت بھی ان کی ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے کہ حاضرین کا استقبال کس طرح کرنا ہے، ان سے کیسے پیش آنا ہے۔ کہیں یہ عجز وانکساری سے ان سے کچھ مانگ لیتے ہیں۔ کہیں دھونس اور رعب سے کام لیتے ہیں۔ کم عمری میں ہی یہ اپنی روزی کمانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ مجاور اکثر اجنبیوں کو اپنے گھر لے جاتا ہے جیسا کہ میرے ساتھ بھی ہوا۔ ان کے قیام کے دوران یہ مجاور مذہبی رسوم کے متعلق ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ مہمان کی حیثیت کے مطابق یہ اس خدمت کے عوض اس سے کچھ رقم وصول کرنے کی توقع رکھتا ہے۔ اس فیس سے دونوں کے درمیان تعلق منقطع نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مجاور اپنے مؤکل کے گھر جاتا ہے تو اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ اس کے ساتھ مہمان نوازی سے پیش آئے گا اور جب جائے گا تو تحائف دے کر رخصت ہوگا۔ مذہبی فریضے کی ادائیگی کے لیے یہاں آنے والا شخص اکثر اپنے گائیڈ کو مکے اور مدینے میں سالانہ کچھ رقم بھیجتا ہے کہ وہ اس کے لیے خانہ کعبہ میں اور مسجد نبوی میں جائے نماز خرید رکھے۔ یہ رقم اکثر ایک کاغذ میں لپیٹ کر اسے ایک چرمی تھیلے میں ڈال کر سربمہر کر دیا جاتا ہے، اس پر وصول کنندہ کا نام لکھدیا جاتا ہے پھر یہ کسی قابل اعتماد حاجی کو یا سرکاری خزانہ دار کو دے دیا جاتا ہے جو بڑے قافلوں کے ہمراہ ہوتا ہے۔

قسطنطنیہ اور قاہرہ سے کتنی رقم ہر سال مدینے ارسال کی جاتی تھی اس بارے میں مجھے صحیح معلومات نہ مل سکیں صرف مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ اس سلسلے میں لوگوں کے ساتھ دھوکہ بھی ہو جاتا تھا جس میں ان کی ارسال کردہ نصف رقم ضائع ہو جاتی تھی۔ جب صدقات اور وقف شہر میں پہنچتے ہیں تو انہیں قافلے کے مالیات کے نگران کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے جو یہ رقم مفتیوں، خطیبوں اور قاضی کے محرر کو دے دیتا ہے۔ یہ افسران ایک کمیٹی تشکیل دیتے ہیں اور پنشن کے مستحق خاندانوں کی فہرست بنائی جاتی ہے اور پھر یہ رقم ان میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ایسا کرتے وقت خاندان کے افراد کی تعداد اور پنشنروں کے عہدے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کے پانچ درجات بنا دیئے جاتے ہیں۔

- علماء اور مدرسین جو حرم میں لیکچر دیتے اور بالغوں کو تعلیم دیتے ہیں۔
- آئمہ اور خطیب
- پیغمبر خدا، صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ نسب کے افراد
- فقہاء، اساتذہ اور غریب علمائے دین جو بچوں کو قرآن پڑھاتے ہیں۔
- مقدس شہر کے عوام، شرفاء، مجاورین یا وہ لوگ جو وہاں مستقل آباد ہو گئے ہیں۔

عُمر افندی کا تعلق دوسرے درجے سے تھا اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا حصہ تین سے پندرہ ریال سالانہ بنتا تھا۔

مدینے کی علمی حیثیت: مدینے پر حالانکہ وہابیوں نے حملہ کر دیا تھا اس کے باوجود اس شہر میں کتابیں بہت تھیں۔ حرم کے قریب دو مدارس یا کالج ہیں: محمودیہ جسے سلطان محمود کے نام پر یہ نام دیا گیا تھا اور دوسرا بشیر آغا کا۔ دونوں میں اسلامیات اور دیگر موضوعات پر بے شمار کتابیں ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ چند افراد کے پاس ذاتی کتب خانوں میں کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ ان میں سے ایک صاحب نجیب الاشرف، شریف خاندان کے چیف محمد جمال اللیل تھے جن کے والد ہندوستان میں بہت معروف تھے۔ مسجد کو چند خاندانوں نے کافی کتابیں عطیے کے طور پر دی ہیں۔ ایک مشہور شخصیت محمد بن عبداللہ جن کا تعلق الجبیر یا کے مالکی مسلک سے ہے، نے آٹھ ہزار جلدوں پر مشتمل کتابوں کا ذخیرہ مدینے سے اپنے گھر میں، مکے منتقل کر دیا ہے۔ وہ ایک ولی اللہ کے طور پر بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ یہاں کے لوگ اب اپنے علماء کی ان کے علم و فضل کی وجہ سے تعریف کرتے ہیں اور انہیں سائنسی علوم میں مکے پر فضیلت حاصل ہونے پر فخر ہے۔ اس کے باوجود بہت سے طلبہ دمشق اور قاہرہ چلے جاتے ہیں جہاں الازہر یونیورسٹی میں ہمیشہ طلبہ کی کثیر تعداد موجود رہتی ہے۔ عمر افندی مجھ سے اس بات پر فخر کا اظہار کیا کرتا تھا کہ یہ شہر روایات کے علم سے مالا مال ہے مگر پھر بھی وہ مصری پروفیسروں کے لیکچر سننے کے لیے کم فکر مند نہیں رہتا تھا۔ تاہم میرے علم میں یہ بات کوئی شخص نہ لایا تھا کہ مدینے میں خالصتاً مذہبی علوم کے علاوہ بھی کچھ اور پڑھنے کی سہولیات موجود تھیں۔ یہاں فلسفہ، طب، ریاضی، الجبرا سیکھنے کے کوئی انتظامات نہیں ہیں۔ میں جادو اور نجوم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں بڑا محتاط رہتا تھا۔ مکے کے شریف کا دعویٰ تھا کہ اس نے 1765ء میں مدینے میں کیمیا گری پڑھی تھی مگر یہ دعویٰ بے بنیاد تھا۔ مجھے صرف یہ سراغ ملا تھا کہ وہاں ایک جادو کا شیشہ ہوا کرتا تھا۔ مدینے کے لوگوں کے

ذہنوں میں بازاروں، گلی کوچوں میں مشہور قصوں کہانیوں کی باتیں جمع ہوگئی ہیں جو یقیناً ایک سطحی سا علم ہے۔ مجھے یہاں یہ بات ناممکن نظر آئی کہ سندھ، جنوبی فارس، مشرقی عرب اور ہندوستان کے بہت حصوں میں دکھائے جانے والے جادو کے کھیل اور شعبدے یہاں بھی معجزانہ حیثیت سے پسند کیے جائیں گے۔ غالباً کچھ اطالوی شعبدہ بازوں نے قسطنطنیہ یا اسکندریہ میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا اور اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تھا۔ ماہرینِ لسانیات کے اعتبار سے ان کا مکے کے ماہرینِ لسانیات سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے جو سوائے آرمینیائیوں کے تمام مشرقیوں پر سبقت لے گئے ہیں۔ اکثر مدنی ترکی جانتے ہیں لیکن وہ فارسی اور ہندی بہت کم جانتے ہیں۔ صرف ایسے افراد جنہوں نے مصر میں تعلیم حاصل کی ہے وہ قرآن خوش الحانی سے پڑھ سکتے ہیں۔

شہری اپنی اپنی زبان صحیح تلفظ کے ساتھ بولتے ہیں مگر ان کا مقابلہ جنوبی حجاز کے لوگوں کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا مگر قاہرہ اور مسقط کے خوف و ہراس اور دہشت کے بعد ان کی عربی فرحت بخش محسوس ہوتی ہے۔

کلاسیکی عربی کو اگر ہم ایک وسیع سلطنت کے قائم ہونے کے تناظر میں دیکھیں تو ہمیں پتا چلے گا کہ یہ کئی مقامی بولیوں میں تقسیم ہو چکی ہے جس طرح لاطینی ایسے ہی حالات میں تقسیم ہوئی تھی۔ ہر لفظ میں ترمیم ہوئی ہے اور زبان میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں، صرف ونحو اور جملوں کی ساخت آسان بنا دی گئی ہے۔ ایک سیاح کے کانوں میں یہ آواز آئے گی کہ عرب کے ہر علاقے میں دور دراز کے کسی قبیلے کے ماہرینِ لسانیات اور خالص پن کا کہیں کوئی وجود نہیں ہوگا، تاہم حجاز میں ایک باوقار معمر عرب جب عوامی سطح پر کسی سے گفتگو کرتا ہے تو اس کا جھکاؤ کلاسیکی عربی کی طرف ہوتا ہے۔ مگر جہاں تک نوجوان نسل کا تعلق ہے، اس سطح پر، اسے نمائشی تصنع قرار دیا جائے گا اور اس طرح کے طنزیہ حوالے کو بیکار اور فضول تصور کیا جائے:

''دو چیزیں برف سے زیادہ ٹھنڈی ہیں، ایک نوجوان بوڑھا اور ایک بوڑھا نوجوان''

قافلۂ دمشق: اس قافلے کو 27 ذیقعد (یکم ستمبر) کو دمشق کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میں آخری لمحے تک مدینے میں رہنا چاہتا تھا تاکہ پھر اس ''اڑتے ہوئے قافلے'' کے ساتھ روانہ ہو سکوں جو عموماً 2۔ ذی الحجہ کو قافلۂ دمشق کے روانہ ہونے سے دو روز بعد چلتا تھا۔

اچانک یہ افواہ سننے میں آئی کہ ''طیارہ'' نہیں جا رہا (طیارہ ایک تیز رفتار قافلے کا نام تھا اس میں سامان کم سے کم ہوتا تھا اور یہ زیادہ تر مسلسل چلتا رہتا تھا) حجاج سے کہا گیا تھا کہ وہ یا تو قافلۂ دمشق کے ہمراہ چلے جائیں یا رکب کا انتظار کریں (جو سانڈنیوں پر مشتمل تھا اور اس میں حجاج ایک ہلکے پھلکے تھیلے کے ساتھ سفر کرتے تھے) یہ عموماً الخابط نامی سڑک سے نیچے اترتا تھا) شریف خاندان کے زید نامی شخص نے سعد سے ملاقات کر لی تھی جو رابر کا واحد دوست تھا۔ اس ملاقات کے دوران سعد نے اپنا شیخ جہاز واپس مانگا تھا تا کہ وہ اپنے ملک سے بحفاظت گزر سکے۔

زید 25/ ذیقعد (30/ اگست) کو مدینے واپس چلا گیا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے شیخ حامد بازار سے بہت جلدی میں واپس لوٹا اور کہنے لگا: ''افندی! تم فوراً تیار ہو جاؤ کیونکہ کوئی طیارہ نہیں جا رہا۔ تمام حجاج کل صبح روانہ ہوں گے۔ اللہ تمہارے لیے اس سفر کو آسان بنائے گا۔ کیا تم نے پانی کے مشکیزے تیار کر لیے ہیں؟ تمہیں ضربِ شرقی کی طرف سے جانا ہے جہاں تین دن تک پانی کہیں نہیں ملتا۔''

جس وقت حامد غریب یہ خوفناک اعلان کر رہا تھا اس وقت وہ خود بھی ذرا ڈرا سا اور سہما ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ میں یہ خبر سن کر بے حد خوش تھا۔ جب برکات یہاں آیا تھا تو اس نے ضربِ سلطانی کا ذکر کیا تھا جو ساحل کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ ابھی تک کوئی یورپی ہارون الرشید اور لیڈی زبیدہ نامی معروف راستوں سے ہوتا ہوا صحرائے نجد میں سے نہیں گزرا تھا۔

اَب ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہمیں امید تھی کہ ہم اگلے روز صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔ محمد نامی لڑکا ہمارے لیے اسی پیاسٹر میں شگدف (صوفہ نما سیٹ) اور 15 پیاسٹر میں شبریا (پنگھوڑا نما نشست) لے آیا تھا جو حج کے دوران ہمارے بہت کام آئے تھے۔ شیخ نور چونکہ صندوقوں پر نہیں سو سکتے تھے اس لیے یہ پنگھوڑا نما نشست ان کو دے دی گئی تھی۔ یہ لڑکا دن بھر ہماری خدمت کرتا رہا۔ اس نے آستینیں چڑھا رکھی تھیں اور ایک قلی کی طرح کام کرنے میں جُتا ہوا تھا۔ وہ بکھری ہوئی اشیاء کو اکٹھا کر رہا تھا، قالین اور غلیچے لپیٹ رہا تھا، ٹوٹے ہوئے حصوں کو مرمت کر رہا تھا اور پانی کے مشکیزے تیار کر رہا تھا۔

اس دوران میں اور شیخ نور پانی کے مشکیزوں کا جائزہ لے رہے تھے جن میں سے دو میں چوہوں نے سوراخ کر دیے تھے۔ میں خود بیٹھ کر مرمت طلب اشیاء کی مرمت میں مشغول تھا۔ جبکہ نُور چودہ روز کے لیے راشن کا انتظام کر رہا تھا۔ اس سفر میں تقریباً گیارہ روز لگتے تھے لیکن کھانے پینے کی اشیاء کے خراب ہو

جانے کا احتمال بھی رہتا تھا اور بدو شتر بانوں کے کھانے کا انتظام بھی کرنا ہوتا تھا میں نے اپنے دوست کے مشورے پر آٹا، چاول، ہلدی، پیاز، کھجوریں، دو قسم کی ڈبل روٹی، پنیر، لیمو، تمباکو، چینی، چائے اور کافی ساتھ رکھ لی تھیں۔

حامد خود ہمارے کاموں میں سے سب سے اہم کام میں مصروف تھا۔ وہ سڑکیں جن پر اکثر ڈاکے پڑتے ہیں اور حجاج کو مار دیا جاتا ہے اُن پر فرمانبردار شتر بانوں کی بڑی ضرورت رہتی ہے۔ یہاں کوئی ایسا قانون رائج نہیں جس سے اس قسم کی وارداتوں پر قابو پایا جا سکے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک لڑکے اور ایک بدو کو لے کر واپس لوٹا تھا۔ بدو ایک چھوٹے قد اور مضبوط جسم کا بوڑھا آدمی تھا جس کے عام سے خدوخال تھے۔ اس کی ڈاڑھی سفید اور آنکھیں چمکدار تھیں اور اس کے جسم پر زخموں کے بہت سے نشانات تھے۔ راحلہ کا مسعود جو بنوحرب کے حامدی کے ذیلی خاندان سے تعلق رکھتا تھا بڑے پروقار انداز سے آیا تھا۔ اس نے آتے ہی بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہم سے مصافحہ کیا، بیٹھ گیا، پائپ پینے سے معذرت کرتے ہوئے اس نے کافی پی لینے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ وہ کافی پی چکا تو اس نے ہماری طرف یوں دیکھا جیسے اب وہ ہم سے افہام وتفہیم کے لیے تیار تھا۔ ہم نے اس سے مخاطب ہو کر اپنی بات کا آغاز یوں کیا: ''ہمیں کچھ لوگ درکار ہیں اونٹ نہیں'' اور ہماری بات چیت خالص حجازی بولی میں ہوئی۔ اس گفتگو میں، تین الفاظ میں نے نئے سیکھے تھے۔ کافی دیر کی بحث وتمحیص کے بعد ہم رضامند ہو گئے تھے کہ اگر ہمیں مجبوراً ضرب شرقی کے راستے سفر کرنا تھا تو ہم دو اونٹوں کے لیے بیس ڈالر ادا کریں گے اور کچھ رقم پیشگی بھی ادا کر دیں گے جو کل رقم کا نصف ہو گی۔ شیخ نے ہم سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اچھے جانور مہیا کرے گا اور کسی حادثے کی صورت میں ان کی جگہ دوسرے جانور فراہم کرے گا۔ اپنے جانوروں کے لیے پانی کا انتظام وہ خود کرے گا اور ہمارے ساتھ عرفات تک جائے گا اور واپس بھی آئے گا۔ تاہم اس نے میرا بھاری صندوق اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ شگدف کے نیچے خیمہ ایک اونٹ کے لیے زیادہ بھاری ہو گا اور دواؤں کا سبز صندوق، زین کے ساتھ لٹکانے والے تھیلے اور سامان خورد ونوش کی بوریاں اور نُور کا کھٹولا دوسرے اونٹ کے لیے کافی تھے۔ ہماری طرف سے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم شیخ اور اس کے بیٹے کے کھانے پینے کا انتظام کریں گے، ہم یا تو اَن پکا کھانا فراہم کریں گے یا پکا ہوا اور کوہ عرفات سے مکے واپسی پر بقایا کرایہ بھی ادا کر دیں گے اور اپنی مرضی سے کوئی تحفہ بھی پیش کرنے کے پابند ہوں گے۔

اب حامد نے بوڑھے بدّو کی تعریف میں مجھ سے مخاطب ہو کر بڑی گل افشانی کی تھی پھر وہ مؤخر الذکر کی طرف مڑ کر یوں گویا ہوا: ''اے مسعود حربی! تم اِن دوستوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آ ؤ گے!'' مُعمر شخص نے بڑے باوقار انداز سے جواب دیا، جس میں کوئی تصنع اور بناوٹ نظر نہیں آتی تھی: ''جس طرح کا ابوشوارب ہمارے ساتھ سلوک کرتا ہے ہم بھی اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے!'' پھر وہ اُٹھا، ہم سے رخصت ہوا اور جاتے وقت یہ کہہ گیا کہ ہم تیار رہیں تا کہ جوں ہی روانگی کے لیے فائر کی آواز آتی ہے، ہم سفر پر روانہ ہو سکیں۔ اس نے ہمیں سیلوٹ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا بیٹا تھا جو بظاہر اُونگھ رہا تھا مگر کمرے سے نکلنے سے قبل اس نے تمام چیزوں کی پورے سامان کی فہرست اپنے ذہن میں تیار کر لی تھی۔ اس نے اس میں ہمیں بھی بطور خاص شامل کیا تھا۔

جب بدّو چلا گیا تو شیخ حامد نے اپنا سر ہلا کر مجھے مشورہ دیا کہ میں انہیں کھانے کو دل کھول کر دوں اور 24 گھنٹوں میں کم از کم ایک بار ایک ہی رکابی میں ان کے ساتھ کھانے میں ضرور شریک ہوا کروں۔ ایسا اس لیے ضروری تھا تا کہ نمک خواری کی اصطلاح سے کام لیا جا سکے جس کے مطابق جب کوئی کسی کا نمک کھا لیتا ہے تو اسے اس کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ عربوں اور یونانی مصنفین نے اس کا یکساں طور پر ذکر کیا ہے۔ اس نے اپنی گفتگو کا اختتام بدوؤں کی کمینگی پر کیا اور بتایا کہ وہ کس طرح سیاحوں کا پانی پی جاتے ہیں۔ مجھے کہا گیا تھا کہ میں مشکیزے اپنے اونٹ پر سامنے رکھوں پیچھے نہیں۔ ان کے منہ اچھی طرح باندھ لیے جائیں اور اوندھا کر کے تسلی کر لی جائے کہ پانی کہیں سے رستا تو نہیں ہے۔ نیز یہ کہ پانی کا معقول ذخیرہ ساتھ رکھوں اور رات کو خیمے میں اس کی حفاظت کروں۔ شام کو ایک عجیب افراتفری کا منظر سامنے آیا تھا۔ زمین پر ہر طرف خیمے نصب تھے جس سے ایک پورا شہر آباد دکھائی دیتا تھا۔ اونٹوں پر سامان لادا جا چکا تھا جو کھانے پینے کی اشیاء، کھٹولوں، صندوقوں اور دوسرے بوجھ تلے بلبلا رہے تھے۔ گھوڑے اور خچر اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ لوگ سفر پر روانہ ہونے کے لیے ہر سمت دیوانہ وار لپک رہے تھے، کچھ ایسے تھے جو روضۂ رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم پر الوداعی حاضری کے لیے جا رہے تھے۔ خواتین اور بچے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے یا اِدھر اُدھر منتشر گاڑیوں کی زد میں آنے سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کبھی کبھی فائر کی آواز سب کو چونکا دیتی تھی کہ کہیں یہ الوداع اور کوچ کے اعلان کا فائر تو نہیں تھا۔ بعض اوقات ہمیں ڈاکوؤں کی گولیوں کی آواز پہاڑیوں کی طرف سے آتی تھی۔ حجاج اپنا یہ جملہ ادا کر رہے تھے، 'ہم ڈر اور امید کے درمیان ہیں' اور بالآخر یہ کہتے ہوئے سنے جاتے تھے'' ہم

ابھی کامیابی اور مایوسی، دو میں سے کسی ایک سے بہت دور ہیں''۔ پھر جلد ہی اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی اونچی آواز آنے لگتی تھی۔

غروب آفتاب کے نصف گھنٹے کے بعد ہماری تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں صرف شگدف باقی تھا جس پر وہ لڑکا محمد انتھک محنت کر رہا تھا۔ اسے یہ بات اچھی طرح یاد تھی کہ اسے ڈیڑھ ہفتے میں سے زیادہ حصہ اس میں گزارنا تھا۔ شام بہت گرم تھی اس لیے ہم نے کھانا گھر سے باہر بیٹھ کر کھایا تھا۔ مجھے کہا گیا تھا کہ میں الوداعی حاضری کے لیے حرم کو جاؤں۔ مگر مجھے ایک ہی اعتراض تھا کہ ہم سب رخصت ہو رہے تھے اور کس قدر جلدی بچھڑنے والے تھے اور پھر زندگی میں کبھی ملنا نصیب ہو گا یا نہیں ہم میں سے کسی کو معلوم نہ تھا۔ میرے ساتھی مسکرائے اور حاضری کے لیے اپنی رضامندی دے دی تھی۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ روضۂ مبارک سے کچھ فاصلے پر بھی یہ رسم ادا کی جاسکتی تھی۔

پھر شیخ حامد نے مجھے دو رکعت نفل ادا کرنے کا مشورہ دیا اور بعد میں حرم کی سمت منہ کر کے ہاتھ بلند کر کے عاجزانہ گریہ زاری کی تاکید کی تھی۔

متقی اور پرہیزگار مسلمان ایسے موقعہ پر روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جا کر کوشش کرتے ہیں کہ اشکوں کا نذرانہ پیش کر سکیں۔ انہیں اس بات کا پورا یقین ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر ان کی آنکھوں سے ٹپکا ہوا ایک آنسو بھی قبولیت پا گیا تو ان کے لیے کافی ہو گا۔ یہ لوگ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق صدقہ و خیرات دیتے ہیں، ریاضت و عبادت کا عہد کرتے ہیں، پچھلے گناہوں پر توبہ کرتے ہیں، وفاداری کا عہد کرتے اور روضۂ مبارک سے دور جانے پر، اپنے شفیع، آنحضورؐ سے رخصت ہونے پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ مدینے سے رخصت ہوتے وقت حرم میں ایک رسم یہاں کم از کم ایک رات کے لیے شب بیداری کی بھی ہے اور پڑھے لکھے لوگ اور حفاظ روضۂ مبارک کے سامنے کھڑے ہو کر پورا قرآن پاک پڑھتے ہیں۔

اب چھوٹے چھوٹے بلوں کی ادائیگی کا مرحلہ سر پر آ پہنچتا ہے۔ مشرقی قرض خواہ ہمیشہ مختلف وجوہ کی بنا پر آخری لمحے تک انتظار کرتا اور اپنا دیا ہوا قرض واپس مانگتا ہے۔ شیخ حامد نے اکثر اپنی مشکلات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان سے چھٹکارے کی ایک ہی صورت تھی کہ اللہ پر بھروسہ کیا جائے۔ اس نے اس حسن سلوک اور مہمان نوازی کا مجھ سے مظاہر کیا تھا کہ میں نے اسے سوئز میں جو پانچ پاؤنڈ ادھار دیئے تھے ان میں سے کچھ بھی واپس نہ مانگا تھا۔ اس کے تین بھائیوں میں سے ہر ایک کو ایک یا دو ڈالر ملے تھے۔ اس کے

ایک یا دو خالہ زادوں نے اس کے بارے میں اشارۃً کہا تھا کہ اس کارروائی میں ان کی پسندیدگی بھی شامل تھی۔

پھر سامان کو نیچے لے جایا گیا تھا تا کہ گھر کے سامنے اسے باندھ کر رکھ دیا جائے اور یہ اونٹوں پر لادنے کے لئے تیار ہو۔ حجاج کی ایک بڑی تعداد نے شاہراہ اعظم پر اپنے سفر کا آغاز کر لیا تھا۔ شام کے بعد ایک نئی رپورٹ یہ موصول ہوئی تھی کہ ایک قافلہ نصف شب کو روانہ ہو گا۔ ہم رات گئے دو بجے تک انتظار میں رہے لیکن جب فائر کی کوئی آواز نہ سنائی دی اور نہ ہی اونٹ نظر آئے تو ہم سو گئے تھے۔

پیارے قارئین! مدینے میں میری آخری شب یُوں بسر ہوئی تھی۔ میں بجا طور پر اپنے آپ کو مبارکباد پیش کر سکتا تھا کہ میں پہلے خطرے سے باہر تھا۔ مکہ ساحل سے اس قدر قریب ہے کہ ایک مسافر کا سراغ مل بھی جائے تو وہ چند گھنٹوں میں فرار ہو کر جدہ پہنچ سکتا ہے جہاں اسے ایک انگریز وائس قونصل ملے گا اور اسے ترک اتھارٹی کی طرف سے تحفظ حاصل ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے بندرگاہ پر ایک برطانوی گشتی جہاز بھی مل جائے۔ البتہ مدینہ طیبہ میں اگر کوئی مسافر پکڑا جائے تو اسے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا خطرہ جس سے بچ نکلنے کی ضرورت تھی وہ دونوں شہروں کے درمیان کا سفر تھا۔ یہاں مقامی افسروں کے لیے آسان ہوتا ہے کہ وہ مشکوک شخص کو خاموشی سے چھوڑ دینے کے لیے بدو کو ایک ڈالر دے دیں۔

☆☆☆

10۔ ہر ہائنس سکندر، بیگم بھوپال...... ہندوستان
1864ء

ان حالاتِ سفر میں، جو ہم نے اس سے پہلے شاہی حج پارٹیوں کے بارے میں سن رکھے ہیں، ان کے مصاحبین اور ملکاؤں کو ہم نے دور سے دیکھا۔ مگر درج ذیل وہ پہلی حج رپورٹ ہے جسے ایک خاتون والی سلطنت نے خود لکھا ہے۔ یہ ہندوستانی حج کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے اور اسلام کی بڑھتی ہوئی عالمگیریت کو نمایاں کرتی ہے۔ 1850ء میں دنیا کے اسی فیصد مسلمان عرب مشرق قریب سے باہر رہتے تھے۔

نواب سکندر، بیگم بھوپال 1863ء کے آخر میں مکے کے لیے سمندری سفر سے روانہ ہوئی تھیں ان کے ہمراہ اس سفر میں چچا، والدہ اور کئی سو خدام تھے۔ ان سے پہلے ہندی حکمرانوں کی کئی نسلیں حج کے سفر پر جا چکی تھیں۔ یہ ان کے حامیوں میں شامل تھے۔ اپنے وطن میں یہ بحری جہازوں کی مالی امداد کرتے تھے جو حاجیوں کو بلا معاوضہ حج پر لے کر جاتے تھے۔ مکے اور مدینے میں وہ مساجد کو مالی تعاون پیش کرتے تھے اور اپنے ہندی حجاج کے لیے مسافر خانے اور مدارس تعمیر کراتے تھے۔ اس حوالے سے سکندر کا حج محض ایک عقیدت کا عمل نہیں تھا بلکہ یہ امور سلطنت میں شامل تھا۔

جس سال وہ حج پر گئیں اس وقت وہ نو ہزار مربع میل پر پھیلے ہوئے ایک صوبے کی ایک ملین آبادی پر حکومت کرتی تھیں جو دوسری بڑی اینگلو انڈین ریاست تھی۔ بیگم بھوپال کو اپنے آپ پر بڑا بھروسہ تھا اور وہ افسروں پر کم اعتماد کرتی تھیں۔ انہوں نے برطانیہ کے لیے پوری وفاداری کا ثبوت دیا اور لڑکے لڑکیوں کے لیے بہت سے مدارس کھولے تھے۔ ان کی دوست اور مترجم الزبیتھ ولوبی اوسبورن نے سکندر کو ایک غیر معمولی ذہانت اور مستقل مزاجی کی مالک بیان کیا ہے۔ ان میں تجارت کا ذوق بے پناہ قوت و توانائی کے ساتھ موجود تھا۔ ہندوستان کے طبقہ بالا کی بہت سی خواتین کے برعکس ان کے خاندان کی عورتیں معاشرے میں گھل مل کر رہتی تھیں، یہ پردہ نہیں کرتی تھیں اور مضبوط سیرت و کردار کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ جیسا کہ ان کی کتاب سے پتا چلتا ہے کہ بیگم بھوپال شرمیلی نہیں تھیں۔

وہ جنوری 1864ء میں جدہ پہنچی تھیں۔ ان کے ساتھ پورا جہاز تحائف سے بھرا ہوا تھا جو دونوں

مقدس شہروں کے لیے تھے۔ حجاز میں جہاں غرباء اور مفلس بستے تھے ان کی دولت بد قسمتی کے لیے مقناطیسی ثابت ہوئی۔ بندرگاہ پر ہی تجوریاں کھول دی جاتی تھیں۔ ساحل پر ایک مکان جو بیگم نے محفوظ کرایا تھا اس کو آنے کرایے پر دے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ترک پاشا کے ٹیکس جمع کرنے والے کارندے آئے جنہوں نے بیگم بھوپال کے تمام سامان پر بہت زیادہ ٹیکس عائد کر دیا تھا۔ بیگم نے بہت سے سرکاری مراسلات کا سہارا لیا جس سے معاملات درست ہو گئے تھے۔ ان کے اسی اونٹ جو سامان سے لدے ہوئے تھے جدہ سے ایک ہفتہ بعد نکل سکے تھے۔ راستے میں کئی باران کا بوجھ ہلکا کیا گیا تھا۔ پاشا نے سرکاری لُوٹ کا سہارا لیا تھا اور بقیہ کام مقامی بدو ڈاکوؤں نے پورا کر دیا تھا۔ جادہ اور مکہ کے درمیان ایک اور ناخوشگوار واقعہ یہ پیش آیا کہ چند لوگوں نے سکندر کی والدہ محترمہ کو تاوان کی خاطر اغواء کر لیا تھا یہ تو ابھی آغاز ہی تھا۔ مکہ مکرمہ میں پہلی مذہبی رسوم کی ادائیگی کے بعد ایک تقریب میں بیگم بھوپال کی زندگی خطرے میں ڈال دی گئی تھی۔ اس کا میزبان مکے کا حکمران شریف عبداللہ ابن محمد ابن عون (دورِ حکومت 77-1857) تھا۔ مقاماتِ مقدسہ کے سرپرست کی حیثیت سے اسے یہ حق حاصل تھا کہ دنیا کے جس ملک سے بھی تحائف آتے ان میں سے چوتھا حصہ اس کا ہوتا تھا۔ بیگم بھوپال نے اسے اور پاشا کو کھرے کھرے خطوط لکھے تھے۔ اس کا برطانیہ سے قریبی سیاسی تعلق تھا مگر اس کے باوجود اس نے یہ کبھی نہ کہا کہ حج کے معاملات کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک روز برطانیہ سے فوجیں بھیجنے کی ضرورت پڑے گی۔ اس نے تو بلکہ پاشا کو اس تمام خرابی کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اسے اعتراض یہ تھا کہ حج کے راستوں میں امن و سلامتی قائم کرنے کے لیے عثمان ترک کیوں اقدامات نہیں کر رہے تھے۔

شریفِ مکہ کے بارے میں سکندر کے خیالات یکطرفہ تھے۔ اس کے پاس اس بات کا جواز موجود تھا کہ اس نے بیگم بھوپال کے وفد کی دولت میں سے اتنی کثیر رقم کیوں نہ کسی ٹیکس کی شکل میں وصول کر لی تھی اور یہ جواز اقتصادی تھے۔ ایک سو سال کے اندر اندر وہ حج قافلے جو حجاز آتے تھے ان کی تعداد چھ سے تین رہ گئی تھی اور سب سے بڑا قافلہ جو استنبول (ترکی) سے براستہ دمشق آتا تھا عنقریب برائے نام حجاج کو لے کر آنے والا تھا۔ دخانی جہاز کی ایجاد کی وجہ سے اب زیادہ سے زیادہ حجاج بحری راستے سے آنے لگے تھے اور ان میں زیادہ تعداد ان کی تھی جو بیگم بھوپال کے دُخانی جہاز کے ذریعے ہندوستان سے آتے تھے۔ اس سے شریف کا وہ ٹیکس جو خشکی کے راستے آنے والے قافلوں سے وصول ہوتا تھا گھٹ کر بہت کم رہ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ استنبول میں بیٹھے ہوئے وزیر اعلیٰ کی طرف سے اسے جتنا ٹیکس وصول کرنے کا حکم ملا تھا اس میں کمی ہو گئی تھی

اوراب بڑی حج راستوں کی حفاظت پر خرچ کرنے کے لیے روپیہ نہیں تھا۔ وہ اندرونی راستے جن پر سفر کرکے بیگم نے مدینے پہنچنا تھا وہ بھی محفوظ نہیں رہے تھے اور ان پر ٹریفک بھی بہت کم ہوگئی تھی جس میں ہر سال عزہ کمی واقع ہو رہی تھی۔ اب حجاج نے جدہ سے مدینے تک سمندری راستہ چن لیا تھا جو مدینے کی بندرگاہ یا نبوتک آتا تھا۔ اس سمت العباؔسی کے سفر کی ناکام کوشش کے بارے میں پڑھنے کے بعد، اس قسم کے سفر کے نتیجے کے بارے میں تصور کرنا آسان ہو جاتا ہے، اگر بیگم نے بھی یہ کوشش کی ہوتی تو ایسا ہی ہوتا۔ مالی پریشانیوں میں مبتلا حجازی قبائل نے یقیناً سات سواونٹوں کے ایک ایسے قافلے پر حملہ کیا ہوگا جسے ایک غیر ملکی کی سرکردگی حاصل تھی۔ شریف باوجود اپنے وعدے کے اس کی حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتا تھا۔ بیگم بھوپال کے سفرنامے کے آخری صفحات میں درجن بھر ان اسباب کی تفصیل موجود ہے کہ اس سفر کے دوران مہلک خطرات کیوں درپیش تھے۔

سکندری کی کتاب کا انتساب ملکہ وکٹوریہ کے نام ہے، جو اس کی شریک حکمران تھی۔ یہ اردو میں لکھی گئی تھی اور اس کی دو کاپیاں شائع ہوئی تھیں (ایک ملکہ وکٹوریہ کے لیے اور دوسری بیگم بھوپال کے لیے) بتایا جاتا ہے کہ ملکہ وکٹوریہ نے اپنے نوکر عبدالکریم مُنشی سے اردو سیکھ لی تھی۔ بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ ولوبائی اوسبورن نے کیا تھا جو بھوپال کے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کی بیوی تھی۔ اس کی طباعت 1870ء میں لندن میں ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت میں حکومت برطانیہ کا جو حصہ تھا اس کے مضمرات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب کو سرکاری رپورٹ کی شکل میں لکھا گیا تھا جس کا کچھ حصہ ایسا ہے جس میں بات کہنے کے لیے خطوط نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے خشک مضمون کو شگفتہ و دلچسپ بنانے کے لیے ان عجیب و غریب واقعات کا سہارا لیا گیا ہے جو بیگم بھوپال نے بیان کیے ہیں۔ اس کے خطوط حجاز کے حج راستوں پر گرانقدر روشنی ڈالتے ہیں، نہ صرف ان کی تعداد اور عام حالت بلکہ اس بات کا ذکر بھی کہ انہیں کنٹرول کون کرتا تھا اور ان راستوں پر سفر کے دوران ایک بااثر اور طاقتور غیر ملکی کو کیا کیا خطرات درپیش تھے کی تفصیل موجود ہے۔ ان اقتباسات سے مکہ کے متمول حرم پر بھی پہلی بار اس قدر کھل کر بات کی گئی ہے۔ شادی بیاہ کی رسوم پر بھی ایک پیراگراف شامل کیا گیا ہے جو مسلم عورتوں کے حقوق کے بارے میں حاصل شدہ رائے کو مسترد کرتا ہے بیگم بھوپال کا سفرنامہ دو مختلف کلچرز کے درمیان پائے جانے والے تصادم پر مفصل معلومات فراہم کرتا ہے گو کہیں بھی شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا لیکن اس کے باوجود عزت و وقار کی ایک جنگ اس نثر کی تہ میں چھڑ جاتی ہے۔

مکّے کے لیے سفرِ حج میں سے: نواب سکندر، بیگم بھوپال کے قلم سے

جدہ میں آمد: 13۔شعبان 1280ھ (23۔جنوری 1864ء) کو میں اپنے ہمسفر حجاج کے ساتھ بمبئی سے روانہ ہو کر جدّے پہنچی تھی۔ بندرگاہ پر میری آمد کے فوراً بعد سلطان ترکی کا اس بندرگاہ پر موجود ایڈمرل جہاز پر آیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''آپ آج اس بندرگاہ پر نہیں اُتر سکتیں جب ہم آپ کی آمد کی اطلاع شریف مکہ اور پاشا کو دے دیں گے تو پھر کل صبح آپ آٹھ نو بجے جہاز سے اتر کر شہر میں داخل ہو سکیں گی''۔ ایسا ہی ہوا اور 24 جنوری کی صبح 9 بجے میرا سامان جہاز سے اترنا شروع ہوا تھا۔ میں نواب خورشید بیگم، نواب میاں فوجدار محمد خان (میرے چچا) اور ڈاکٹر چارلس تھامسن (سرجن) کے ہمراہ احمد عربی کے گھر کے لیے روانہ ہوئے جہاں حجاج کا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر تھامسن مجھے یہاں چھوڑ کر خود جدہ کے قونصل سے ملنے چلے گئے تھے۔ احمد عربی نے میرا گرمجوشی سے استقبال کیا اور میرے اعزاز میں ڈنر دیا تھا جس میں اس کے خاندان کی تمام خواتین مدعو تھیں۔ ہم شام کے چھ بجے تک وہاں رہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ مصر کی ایک شہزادی آئی ہوئی تھی جو احمد کے گھر ٹھہریں گی۔ اس لیے مجھے یہ گھر خالی کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ میرے پاس مکان خالی کر دینے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ میں ایک دوسرے گھر میں منتقل ہو گئی تھی جسے خوش شامیان کہتے تھے۔

امیر قافلہ عبدالرحیم یہ معلوم کرنے احمد عربی کے پاس گیا کہ اس کے گھر میں ہم لوگ جتنے گھنٹے ٹھہرے تھے اس کا کتنا کرایہ ہمیں ادا کرنا تھا۔ اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم نے اس کے گھر میں چند گھنٹے قیام کر کے جو عزت اسے بخشی ہے اس کی وجہ سے اس کا وہ کوئی کرایہ وصول نہیں کرے گا۔ میں نے اسے کپڑے کی چند گانٹھیں اور کچھ نقدی تحفے کے طور پر دے دی تھی۔

مصری شہزادی وہاں نہیں آئی تھی کیونکہ اسے کہیں اور قیام کی سہولت فراہم کر دی گئی تھی۔ اس طرح مجھے بھی خواہ مخواہ تکلیف اٹھانی پڑی تھی اور احمد عربی کو بھی نقصان ہوا تھا۔

جس وقت جہاز سے سامان اتارا جا رہا تھا، نواب فوجدار خان نے جو وہاں قدسیہ بیگم کے ساتھ موجود تھا اطلاع دی کہ قدسیہ بیگم کی تجوری ٹوٹی ہوئی تھی اور کچھ سکے زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے غصے

میں بتایا کہ یہ بدولٹیرے ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔

قدسیہ بیگم کا خیال تھا کہ چونکہ صندوق ٹوٹا ہوا تھا اس لیے یقیناً کسی نے چوری کی تھی۔ یہ سن کر میں اپنے سامان کے بارے میں فکرمند ہوگئی تھی میں نے لوگوں سے پوچھا کہ وہ صندوق کیوں کھول رہے تھے۔ ان کا جواب یہ تھا کہ مجھے کسٹم ڈیوٹی ادا کرنی تھی۔ میں نے جدہ بندرگاہ کے ڈپٹی ماسٹر محمد بخش کو خط لکھ بھیجا تھا۔ کسٹم ہاؤس افسر، شمس الدین کی طرف سے مجھے جوابی مراسلہ وصول ہوا جس میں اس نے لکھا تھا کہ ''میں ترکی حکومت کا ملازم ہوں اور اس بندرگاہ پر کسٹم کے قوانین مقرر ہیں، مجھے مقررہ کسٹم ڈیوٹی سے کم پیسے لینے کی اجازت نہیں ہے مگر ہر ہائنس کی یہ مہربانی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائی ہیں اور جس خط کا آپ نے حوالہ دیا ہے کہ وہ گورنر، بمبئی کی طرف سے ہے اور گورنر آپ کے دوستوں میں سے ہے اس لیے اس خیال سے کہ آپ کا ہمارا دینی رشتہ بھی ہے، میں صرف یہ کرسکتا ہوں کہ آپ کے دس صندوقوں میں سے صرف ایک کی پڑتال کروں۔ ازراہ کرم آپ اپنے تمام سامان کی ایک فہرست مجھے عنایت فرمایئے تاکہ میں اس کے دُرست ہونے کی تصدیق کرسکوں اور درج بالا قواعد وضوابط کے مطابق کسٹم ڈیوٹی وصول کرسکوں۔ ایک مہربانی اور یہ فرمایئے گا کہ مجھے یہاں جو آپ کا ایجنٹ ہے اس کا نام بتا دیجیے گا......''۔

شاہی سامان: میرے ایجنٹوں مٹھو خان اور عبدالکریم نے لکھا کہ:

''آج 8۔ فروری 1864ء ہے، ہم نے آپ کا سامان بڑی احتیاط کے ساتھ جہاز سے اتارا ہے، اس میں ہماری مدد انطونیو ڈی سلوا نامی شخص نے کی ہے۔ مگر ہم نے جو کچھ بھی کہا کسٹم افسر نے اس پر توجہ نہیں دی اس نے ساری گانٹھیں کھلوانے پر اصرار کیا اور ہر شے پر یک طرفہ، اپنی مرضی سے کسٹم ڈیوٹی عائد کردی جو تکلیف اور ناراضگی ہمیں ہوئی اس کا کوئی حساب ہی نہ ہوا۔ اس نے ساری چیزیں فرش پر بکھیر دی تھیں۔ اتفاق سے ہی کوئی ایسا صندوق بچا ہوگا جس کا قفل نہیں کھلا۔ مگر اس نے بضد ہوکر وہ قفل بھی کھولنے پر ہمیں زبردستی رضامند کرلیا۔ الغرض یہ کہ اس نے تمام صندوق اور ان کا سامان خراب کردیا۔ اس لمحے تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ہر شے پر کتنا ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ کوئی ایک شے بھی ایسی نہیں بچی جس پر ٹیکس معاف کردیا گیا ہو۔ ہمیں جونہی اس سلسلے میں اطلاع دی گئی ہم آپ کو مطلع کریں گے''۔

یہ سنتے ہی میں نے حکم دیا کہ اس خط کی ایک نقل فوراً حافظ محمد خان کے ذریعے شریف مکہ اور پاشا کو ارسال کردی جائے۔

پاشا اور شریف کا مجھے جواب موصول ہوا کہ یہ بات ان دونوں کے علم میں تھی کہ کپتان مٹھو خان میری املاک کا انچارج مقرر کیا گیا تھا اور انہیں جب بھی اس کی طرف سے کوئی درخواست موصول ہوئی وہ اس پر ضرور کارروائی کریں گے۔ انہوں نے کسٹم ہاؤس افسر کے روّیے پر اظہار تأسف کیا تھا اور وہ اس بارے میں لکھ رہے تھے اور اس کی طرف سے جو جواب انہیں موصول ہوا وہ مجھے روانہ کردیا جائے گا۔

جدّہ میں امّاں حوّا کے مزار پر: قدسیہ بیگم نے اماں حوا کے مزار پر حاضری دی اور خیرات تقسیم کی۔ وہ جب واپس ہونے لگیں تو دو تین سو بھکاری، مرد، عورتیں، بوڑھے، جوان لڑکے، لڑکیاں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ انہوں نے اس قدر پریشان کیا کہ یہ اس ہجوم کے نیچے آکر مرنے والی تھیں۔ وہ بے ہوش ہوکر گرگئی تھیں۔ یہاں کے بھکاریوں کی یہ عادت ہے کہ خیرات بانٹنے والوں کو اسی طرح زِچ کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں یہ بعض اوقات تو کپڑے تک پھاڑ دیتے ہیں۔

جدہ میں اترنے والے ہندوستانی کے پاس ایک یا نصف ڈالر ہوتا ہے جو اس سے جبراً چھین لیا جاتا ہے۔ یہاں کے رہنے والوں میں نرمی بالکل نہیں پائی جاتی بلکہ ان کی طبیعت میں ظلم و تشدد اور سختی پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ ہندوستان کے باشندوں کو تنگ کر کے خوش ہوتے ہیں۔ جس طرح کوئی کافر کسی مسلمان کو، ستا کر خوش ہوتا ہے اسی طرح یہ ہندوستان سے آنے والوں کو ستا کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کا مال و اسباب چرا لینے یا ان سے بدسلوکی کرنے کو جرم سمجھا ہی نہیں جاتا۔

شاہی قافلے کی جدّہ سے مکہ مکرّمہ روانگی: اب میں جدہ سے مکے تک کے سفر کی روداد بیان کرتی ہوں۔ عبداللہ، شریف مکہ نے مجھے لکھا: ''عرصہ ہوا جب ہم نے پہلی بار آپ سے مقامات مقدسہ تشریف لانے کے متعلق سنا تھا۔ سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے آپ کو توفیق بخشی اور آپ اس سفر پر روانہ ہو چکی ہیں۔ اس خبر سے میں بے حد خوش ہوں، آپ جلد ہی مکہ پہنچنے والی ہیں اور میں نے آپ کے استقبال کے لیے پروگرام بنا رکھا ہے جس میں آپ کی حیثیت اور مرتبے کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ میں نے اپنے بھائی کو ایک ترجمان کے ساتھ آپ کی طرف روانہ کیا ہے۔ یہ دونوں آپ کے آرام کا پورا پورا خیال

رکھیں گے۔ مہربانی فرما کر میرے بھائی کو اپنا مخلص دوست تصور کیجیے اللہ کرے آپ آرام کے ساتھ خیریت سے یہاں مکہ میں اللہ کے گھر پہنچیں!۔''

ایسا ہی ایک خط مکہ کے پاشا کی طرف سے مجھے موصول ہوا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے سُلیمان بیگ کو میری ملاقات کے لیے بھیج دیا تھا۔

یہ خطوط موصول ہونے پر میں نے اپنے ایجنٹ عبدالرحیم کو لکھا: ''مکے کے سفر کے لیے 80 اونٹ کرایے پر حاصل کرو اور فی اونٹ ایک ریال ادا کرو، اگر کرایہ زیادہ دینا پڑے تو اس سلسلے میں مجھے مطلع کر سکتے ہو''۔ ایجنٹ نے مختلف مراحل کے لیے اُونٹ کرائے پر حاصل کر لیے تھے: یعنی جدہ تا مکہ اور مکہ تا منیٰ اور منیٰ تا مزدلفہ اور مزدلفہ تا عرفات اور پھر اسی راستے سے واپس جدہ۔

جب اونٹوں کو کرایے پر حاصل کرنے کا انتظام ہو گیا تو عبدالرحیم اونٹوں کو مختلف قافلوں میں تقسیم کرنے کے لیے لے گیا تھا۔ غروب آفتاب پر ہم اپنے اپنے اونٹ پر رکھے ہوئے شکدف میں سوار ہو گئے تھے۔ یوں جدہ سے ہمارا سفر شروع ہوا۔

ہر ہائنس رئیس بیوہ کا اغواء: جدّہ اور حادہ کے درمیان، جو ہماری پہلی منزل تھی، وہاں میرا پر جوش استقبال ہوا۔ اس کے لیے شریف عبداللہ، شریف مکہ کا بھائی اور سلیمان بیگ، مکہ کے پاشا کا بیٹا اور جعفر افندی موجود تھے۔ مؤخر الذکر نے مجھ سے کہا: ''جب شریف آپ کے قریب آ کر ''السلام علیکم'' کہے تو جواباً آپ ''وعلیکم السلام'' کہیں۔ پھر وہ آپ سے کہے گا: ''کیف حالکم'' (آپ کا کیا حال ہے؟) آپ جواباً ''طیب'' (بہت اچھی ہوں) کہیں گی''۔

اس کے بعد شریف مکہ کا بھائی گھوڑے پر سوار آیا۔ اس جلوس کی ترتیب اس طرح تھی: شریف عبداللہ کے پیچھے 50 گھوڑ سوار تھے اور سلیمان بیگ، پاشا کے بیٹے کے پیچھے بھی اتنے ہی ترک سوار تھے۔ شریف کے بھائی کے پیچھے ایک اسپی سینیائی گھوڑے پر سوار تھا جس کے سر پر سمور کا بنا ہوا ہیٹ تھا جو یوں لگتا تھا جیسے کسی لمبے بالوں والے کتے کی کھال کا بنا ہوا تھا۔ اس کے سامنے دو بہت چھوٹے چھوٹے نقارے رکھے ہوئے تھے، گھوڑے کی باگیں اس کے منہ میں تھیں اور دونوں ہاتھوں سے وہ نقارے بجا رہا تھا۔ جب سورج نکلا تو میں نے دیکھا کہ شریف کے بھائی کے سر پر ایک اسپی سینیائی، جو اس کے ساتھ والے دوسرے گھوڑے پر سوار تھا، چھتری کا سایہ کیے ہوئے تھا۔ دونوں گھوڑے، بہت خوبصورت اور صحت مند تھے اور دونوں ساتھ ساتھ

یوں خاموشی کے ساتھ چل رہے تھے جیسے بکری یا بھیڑ کے دو بچوں کو کسی نے اکٹھا باندھ دیا تھا، ان کے ہنہنانے کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

سُلیمان بیگ کے پیچھے بھی شریف کے بھائی کی طرح ایک گھوڑ سوار تھا فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے سامنے دو کے بجائے ایک نقارہ رکھا ہوا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ مشعل بردار تھے اور یہ مشعلیں کسی خاص قسم کی لکڑی کی تھیں۔ یہ بجائے چیتھڑوں کے تیل میں بھگوئی گئی تھیں۔ جب مشعل بردار چلتے تو مشعلوں کی راکھ زمین پر گرتی تھی۔ شریف کا بھائی کچھ دور تک میرے ساتھ ساتھ گھوڑے پر سوار چلا مگر جب میں نے اسے یہ بتایا کہ رئیس بیوہ میرے پیچھے آ رہی ہیں تو وہ اور سلیمان بیگ دونوں مجھے چھوڑ کر اس سے ملنے پیچھے چلے گئے تھے۔

ہم سات بجے صبح حادہ پہنچے تھے۔ یہاں پہنچ کر مجھے منشی سراج الدین نے یہ خبر سنائی: ''آپ کے قافلے کے حجاج جو جدہ سے مکہ کے لیے شام کے سات بجے روانہ ہوئے تھے، ان کے ہمراہ ایک اونٹ پر سوار ہر ہائنس بیگم قدسیہ بیگم بھی تھیں۔ نصف شب کو جب یہ سڑک پر آ رہے تھے تو بیس بدوؤں نے انہیں پکڑ کر قافلے سے الگ کر لیا اور انہیں مختلف سمت میں لے گئے۔ ہر ہائنس نے چیخ کر آواز دی: ''دیکھو یہ لوگ مجھے اور میرے اونٹ کو کہاں لے جا رہے ہیں یہ میری آواز نہیں سن رہے نہ میری بات سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور میرے نوکروں میں سے بھی کوئی میرے ساتھ نہیں...... ارے کوئی ہے تو میرے اونٹ کو سکندر کے اونٹوں کے قریب لے جاؤ!۔ قدسیہ بیگم کے اونٹ کے قریب ایک غلام تھا جسے اس نے حج کے لیے خریدا تھا اور اسے آزاد کر دیا تھا۔ یہ جدہ میں اس کے ساتھ آ کر مل گیا تھا۔ یہ بھاگ کر اونٹ کی گردن سے چمٹ گیا اور اسے چھوڑ نہیں رہا تھا۔ اس دوران آپ کے اردلیوں میں سے بدھو خان نامی اردلی نے قدسیہ بیگم کی آواز سن لی، وہ پیچھے بھاگا اور بندوق کے بٹ سے ان تین چار بدوؤں کو مارنا شروع کر دیا جو اونٹ کو دور لے جانا چاہتے تھے۔ پھر اس نے ان دس بارہ پر بھی حملہ کیا جو اس اونٹ کے اردگرد تھے۔ اس طرح اس نے کئی بدوؤں کو زخمی کر کے زمین پر گرا دیا تھا جب بدوؤں نے دیکھا کہ ان کے چند ساتھی زخمی ہو گئے ہیں تو وہ گھبرا گئے اور اونٹ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس دوران بدھو خان کی مدد کو اسی رجمنٹ کے دو سپاہی غلام حسین اور حسین بخش بھی آ گئے تھے۔ اب یہ تینوں قدسیہ بیگم کے محافظوں کے طور پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے''۔

قدسیہ بیگم نے خود بھی اس ناخوشگوار واقعہ کے بارے میں چند اور باتیں بھی بتائی تھیں۔ وہ بتا رہی

تھیں کہ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ بدو ڈاکو تھے۔ یہ ان سے باتیں کر رہی تھیں اور یہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ ان کی حفاظت کے لیے ساتھ ساتھ تھے۔ انہوں نے ان بدوؤں سے خود کہا تھا کہ وہ ان کے اونٹ کو اکیلا نہ چھوڑیں بلکہ اسے میرے اونٹوں کے قریب لے آئیں۔ حادثہ پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ جن بدوؤں کو وہ اپنا محافظ سمجھ رہی تھیں وہ تو ڈاکو تھے۔

قاسم علی نے جو ریاست بھوپال کا ملازم تھا مجھے درج ذیل رپورٹ پیش کی تھی:

"جب میں جدہ کے بیرونی دروازے پر پہنچا تو شتربان یعنی بدوؤں نے تمام سامان کو الٹنا پلٹنا شروع کر دیا تھا اور اسی شکل میں اسے وہاں سے غائب کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب ہم نصف میل کی مسافت طے کر آئے تو ایک شتربان نے ایک صندوق جو سامان سے بھرا ہوا تھا اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے قبضے میں ایک تھیلا بھی تھا جس میں ہر ہائنس رئیس بیوہ کے نوکروں کی کچھ چیزیں تھیں۔ وہ شتربان ان سمیت بھاگ رہا تھا۔ اونٹ اس کے پیچھے رہ گیا تھا جبکہ قافلے کے لوگ بہت آگے نکل گئے تھے۔ ہم بالکل بے بس تھے اور سوائے جدے واپس لوٹ جانے کے کوئی سبیل نظر نہ آئی۔ وہاں پہنچ کر ہم نے عبدالرحیم سے ایک گدھا لیا اور تین گھوڑ سوار محافظوں کے ساتھ ہم دوبارہ سفر پر روانہ ہوئے۔ یوں ہم آج ہی یہاں پہنچے ہیں۔ راستے میں ہمیں میاں عیداملا جس نے ہم سے کہا کہ ہم آپ کو جا کر بتائیں کہ اس کے شتربانوں نے اونٹوں پر سے سامان اتار کر اسے وہاں چھوڑ دیا تھا جس جگہ وہ ہم سے ملا تھا اور یہ کہ وہ بالکل بے بس اور بے یار و مددگار تھا۔"

میں نے یہ سننے کے بعد ایک خط جعفر آفندی کو لکھا کہ وہ شریف مکہ کو اپنے رابطے کے بعد اس سے پوچھے کہ سامان کو بھجوانے کا کیا انتظام ہو سکتا ہے۔

مکہ مکرمہ: شہر مکہ اونچی اونچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ عظمتوں والا یہ شہر دیکھنے میں اجاڑ اجاڑ اور سنسان نظر آیا۔ کہیں کوئی درخت اور سبزہ دکھائی نہ دیا۔ پہاڑیوں کے درمیان سڑک ہے کہیں کہیں تو یہ اس قدر تنگ ہو گئی ہے کہ تین چار اونٹ ساتھ ساتھ نہیں گزر سکتے۔ جہاں جہاں یہ کھلی ہے وہاں بھی صرف پانچ دس اونٹوں کے ساتھ ساتھ گزرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔

شہر میں بیماری پھیلی ہوئی تھی اور لوگ شدید بخار میں مبتلا تھے۔ میرے ساتھ ٹھہرنے والے نو افراد کو مختلف قسم کی شکایت تھی۔ ان میں سے کچھ اسہال، کچھ بخار میں مبتلا تھے اور کچھ کی ٹانگوں میں رسولیاں تھیں۔ حج کے موقع پر میں ان میں سے اکٹھے آٹھ کو کھو بیٹھی تھی جو موت کا شکار ہو گئے تھے۔ ان میں سے چار جہاز پر اور چار جدہ اور مکہ میں وفات پا گئے تھے۔ وہ قافلہ جو مجھ سے الگ ہو کر مدینہ طیبہ چلا گیا تھا اس کے بہت سے لوگ مر گئے تھے۔ کچھ خشکی پر اور کچھ جہاز کے اندر اللہ کو پیارے ہوئے۔ میرے دو افراد کہیں غائب ہو گئے تھے جو پھر کبھی مڑ کر نہ آئے۔ ان میں سے ایک عورت تھی جو حج کے دوران گم ہو گئی تھی دوسرا سقہ تھا جو مدینے چلا گیا تھا۔ مجھے ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی کہ وہ کیوں لوٹ کر نہ آئے۔

مکہ مکرمہ کے مضافات میں نہ جھیلیں ہیں، نہ دریا نہ ندیاں، صرف چشمے ہیں جن میں مسافروں کو معاوضہ دیئے بغیر نہانے کی اجازت نہیں ہے۔ غرباء و مساکین کو مارا پیٹا جاتا ہے اور انہیں ان چشموں سے دور بھگا دیا جاتا ہے۔ ان پر شریف مکہ اور پاشا کے سنتری تعینات ہیں۔ پانی کے ایک مشکیزے کی قیمت ریال کا بیسواں حصہ ہے۔ کوئی سردار یا امیر اور سرکردہ فرد جس کی شریف اور پاشا سے شناسائی ہے اپنے عملے کے لئے جس قدر چاہے پانی حاصل کر سکتا ہے۔ مجھے اجازت تھی کہ میں اپنی خوشی سے جتنا پانی لینا چاہوں لے سکتی ہوں۔

شہر کے اندر اچھے اچھے حمام اور غسل خانے، مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ ہیں۔ مکہ کی عمارتوں کی بنیادیں اور دیواریں بہت مضبوط رکھی جاتی ہیں، جو پتھروں یا اینٹوں کی ہوتی ہیں لیکن چھتیں اور فرش یہاں کے فیشن کے مطابق خوبصورت نہیں بنائے جاتے۔ چھتوں کی تعمیر میں کھجور کے درختوں کی شاخیں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے آتشزدگی کا خطرہ رہتا ہے۔ بارش برس جائے تو اس کے بعد چھتوں پر گھاس اُگ آتی ہے۔ ہر گھر کے اندر ایک باورچی خانہ، ایک غسل خانہ اور دوسرے کمرے ہوتے ہیں۔ عمارت مٹی گارے سے بنائی جاتی ہے۔ اضافی مراعات کا یہاں اس قدر رواج ہے کہ اگر کسی کو حج کے دوران گدھا بھی کرایے پر لینا ہو تو کسی ایجنٹ کی وساطت سے حاصل کیا جا سکتا ہے جسے کمشن ملتا ہے۔ یہی رسم خرید و فروخت کے موقعہ پر بھی ضروری ہوتی ہے۔ کسی چیز کے بک جانے کے فوراً بعد اس کی قیمت طلب کی جاتی ہے۔ کسی پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا۔

مجھے یوں لگا جیسے بھیک مانگنا ایک قابل عزت کام تھا۔ مسافر جب مکے سے رخصت ہوتے ہیں۔

اس وقت انہیں شرفاء اور عام لوگ گھیر لیتے ہیں اور بخشیش کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ہندوستان سے جرائم پیشہ لوگ جب نکال دیئے جاتے ہیں تو وہ مکے میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک سے اشیاء درآمد کی جا سکتی ہیں مگر چیزیں مہنگی بہت ہیں۔

خواتین کی دس دس شادیاں ہوتی ہیں ایسی خواتین جنہوں نے دو دفعہ شادی کی ہو ان کی تعداد بہت کم ہے۔ جب کسی خاتون کا خاوند بوڑھا ہو جاتا ہے یا وہ کسی اور مرد کو پسند کرنے لگتی ہے تو شریف مکہ کے پاس جا کر پہلے خاوند سے طلاق لے لیتی ہے اور دوسرے شوہر سے شادی کر لیتی ہے جو پہلے خاوند کے مقابلے میں زیادہ جوان اور صاحب ثروت ہوتا ہے۔ اس طرح کوئی بھی شادی ایک یا دو سال سے زیادہ نہیں قائم رہتی۔

وہ لوگ جو شہروں میں رہتے ہیں وہ کسی حد تک مذہب سے واقف ہوتے ہیں لیکن وہ جو پہاڑی علاقوں میں بستے ہیں، وہ مذہب سے مکمل طور پر ناواقف ہوتے ہیں۔

ایک ضیافت: میں جس وقت مکہ مکرمہ پہنچی اس وقت عشاء کی اذان کی آواز مختلف مساجد سے آ رہی تھی۔ میں مسجد الحرام کے اندر باب امن کے راستے داخل ہوئی اور خانہ ابراہیمؑ میں پہنچ گئی تھی۔ میں وہاں کھڑی ہو کر مقررہ دعائیں مانگ رہی تھی۔ میں پھر طواف کعبہ کے لیے گئی، صفا و مروہ کی پہاڑیوں پر میں نے سعی کی۔ اب میرا خیال تھا کہ میں اس گھر میں جاؤں جو میں نے کرایہ پر حاصل کیا تھا۔ اس سے قبل میں ان جانوروں کی قربانی دینے کا ارادہ رکھتی تھی جو میں اس مقصد کے لیے لائی تھی۔ قربانی دے چکنے کے بعد میں نے بال کٹوانے کی رسم ادا کی پھر میں مطوف ابوبکر کے گھر گئی جہاں حجاج کے لیے ٹھہرنا ایک رسم ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر میرا کرایہ پر حاصل کردہ گھر زیادہ آرام دہ ہوا تو میں اس میں قیام کروں گی۔

اس دوران میری ملاقات مولوی عبدالقیوم سے ہوئی۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے گھر تک چھوڑ آئیں وہ میرے آگے آگے چل رہے تھے کہ اتنے میں شریف مکہ کے وہ چار غلام جو جادہ سے میرے ساتھ آئے تھے۔ مولوی صاحب کے پیچھے دوڑے اور ان کے چہرے پر مارتے ہوئے انہیں دیوار کی طرف دھکیل دیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''بیگم صاحبہ! دیکھیے شریف کا ایک غلام مجھے مار رہا ہے!'' میں نے اس غلام سے پوچھا: ''بھائی! مولوی صاحب کو کیوں مارتے ہو، یہ تو میرے ساتھ ہیں؟''۔ اس نے جواب دیا: ''آپ ہمارے ساتھ شریف کے دولت خانے پر چلیے جہاں آپ کے لئے کھانے کا انتظام کیا جا چکا ہے''۔

میں نے اسے بتایا کہ شریف مکہ نے مجھے تو کھانے پر مدعو نہیں کیا۔ مجھے جب مدعو کیا گیا میں اس وقت آ جاؤں گی۔ یہ کہہ کر میں چل پڑی اور مولوی عبدالقیوم پھر میرے آگے آگے تھے۔ ایک لمبا تڑنگا غلام جو جعفر افندی کے ساتھ تھا، تلوار سونت کر مولوی صاحب کی طرف بڑھا۔ مولوی صاحب نے ایک بار پھر مجھے اپنی مدد کے لیے آواز دی۔ میں نے اس غلام کو بتایا کہ مولوی صاحب میرے احکامات کی تعمیل میں مجھے میرے گھر چھوڑنے جا رہے تھے۔ غلام نے جواب دیا: ''مگر میرے آقا، شریف مکہ کی اس ضیافت کا کیا بنے گا جس پر پانچ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں، ہر چیز خراب اور یہ رقم ضائع ہو جائے گی''۔ اب جعفر افندی نے کہا: ''بہتر ہے کہ بیگم صاحبہ آپ شریف کے گھر چلی جائیں ورنہ وہ بہت ناراض ہوں گے اور ان کی ناراضگی کوئی اچھی بات نہیں ہوگی''۔ یہ سن کر میں شریف کے گھر کی طرف چل پڑی۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس کا بھائی عبد اللہ میرا منتظر تھا۔ اس نے سلام عرض کیا اور میری خیر و عافیت دریافت کر کے وہاں سے چلا گیا تھا۔

میں نے وہاں بال کٹوانے کی رسم ادا کی۔ اس کے ایک کمرے میں مخمل کا خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک چبوترے پر دستر خوان بچھا کر کھانا لگا دیا گیا تھا۔ کھانے میں عرب کے روایتی کھانوں کی بہت سی چیزیں پکی ہوئی تھیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں کھانا شروع کروں۔ میں نے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ مجھے تو کسی نے مدعو نہیں کیا۔ جعفر افندی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''اگر آپ نے کھانا نہ کھایا تو شریف مکہ ناراض ہوں گے اور انہیں ناراض کرنا اچھا نہ ہوگا''۔ پھر میرے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا: ''جب کبھی شریف کسی سے ناراض ہو جاتا ہے تو اپنے بڑے غلاموں کو حکم دیتا ہے کہ اس شخص کو رات کو جا کر گولی مار دیں اور آپ نے تو ابھی طواف بھی کرنا ہے۔ ان حالات میں بہتر ہوگا کہ آپ شریف کو ناراض نہ کریں''۔ میں نے اس کے بعد کچھ نہ کہا اور کھانے کے لیے دستر خوان پر جا بیٹھی۔ کھانے پر اوس پڑ گئی تھی اور یہ برف کی طرح یخ تھا۔ ہر شے کا ذائقہ خراب ہو گیا تھا، ہر چیز بدمزہ ہو گئی تھی۔ جعفر افندی اور کچھ ترک میری خدمت پر مامور تھے۔ اس کے بعد چونکہ رات ہو گئی تھی اس لیے ہم نے وہ رات وہیں گزاری۔

شریف مکہ کا خط: ''اس دربار کی رسم کے مطابق اور آپ سے دوستی کا مظاہرہ کرنے کے لیے میں اپنے بھائی کو آپ کے استقبال کے لیے بھیج رہا ہوں۔ یہ مناسب اور درست ہوگا کہ میزبانی کی بقیہ شرائط (جن میں آخری تین کی ضیافت بھی شامل ہے) پوری کی جائیں۔ اور میرے ملازمین کے علم میں تھا کہ یہ رسم ضروری تھی اور اس کے لیے یہ لازمی نہ تھا کہ آپ کو پہلے سے مدعو کرنے کی خاطر کوئی باقاعدہ دعوت نامہ بھیجا

جائے۔آپ کو یقیناً ان باتوں کا علم نہ ہوگا۔ مجھے آپ کے ملک کی رسم کا اب پتا چلا ہے اور مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ میں نے آپ کے وطن کے رسم ورواج اور آداب کے خلاف بات کی ہے۔تاہم یقین جانیے یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر ہوا ہے اس لیے جو ہو گیا اسے بھول جائیے اور درگزر سے کام لیجیے۔اب آپ کی ہماری دوستی مضبوط بنیاد پر استوار ہوئی ہے۔ جو میرے اختیار میں ہوگا میں آپ کی مدد کے طور پر ضرور کروں گا۔اس بات کا آپ کو قبل از وقت بتایا جانا ضروری نہیں ہے کہ آج سے آپ کے اور ہمارے درمیان جو کاروبار ہوگا ہماری باہمی رضامندی اور اطمینان سے ہوگا اور یہ سب کچھ آپ کی اس التماس کے جواب میں ہوگا جس کا اظہار آپ نے اس خط میں کیا ہے۔یہ گھر آپ کا اپنا گھر ہے آپ کا اس میں آنا کسی کے لیے باعث زحمت نہیں نہ ہی اس کے عوض آپ سے کوئی توقع رکھی جائے گی۔البتہ اگر یہ آپ کی پسند اور ضرورت کے مطابق نہ ہو تو آپ جیسا بھی فیصلہ کریں آپ کو پورا پورا اختیار حاصل ہے۔''

یہ خط موصول ہوتے ہی میں نے ڈپٹی کمانڈر انچیف (نائب بخشی) کو لکھا اور اس سے کہا کہ وہ شریف کے پاس جائے اور میری طرف سے اس سے یہ کہے: ''ان کے مخلصانہ خط نے مجھے بے حد خوشی و مسرت بخشی ہے۔میں نے جو گھر کرایہ پر لیا تھا اس سے متصل پانچ اور گھر تھے، جو سرکاری نہیں تھے، میں چاہتی ہوں کہ وہ بھی میرے لیے حاصل کر لیے جائیں تاکہ رمضان المبارک کا پورا مہینہ یہاں قیام کے دوران مجھے سہولت رہے اور میں ان کا کرایہ انہیں بھجوا دوں گی۔''

اس کے جواب میں ڈپٹی نے لکھا کہ شریف نے شہر کے چیف مجسٹریٹ کو حکم دیا ہے کہ وہ پانچوں عمارتیں خرید کر میرے حوالے کر دے اور انہوں نے اسے زبانی یہ بھی کہا ہے کہ اگر میں ان کے مکان میں رہنا پسند نہ کروں تو اس سے نہ تو انہیں رنج ہوگا نہ وہ ناراض ہوں گے۔اس لیے کہ انہیں تو ہر قیمت پر میرا آرام مطلوب تھا اور میں جس جگہ بھی زیادہ آرام کے ساتھ رہ سکتی تھی مجھے وہیں رہنا چاہیے تھا۔اس نے اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا:

> ''حج کی ادائیگی ایک مقدس فریضہ ہے لیکن ہر ایک پر، جو حج کی ادائیگی کے لیے آتا ہے، یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی میں اپنے مقام و مرتبے اور حیثیت کے مطابق گھر کا انتظام کرے۔میں یہ نہیں کہتا کہ بیگم بھوپال ضروری میرے ہی گھر پر ٹھہریں لیکن انہیں اپنے شاہی مقام و حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے شایان شان گھر کا انتخاب

کرنا چاہیے۔''

ہر چند کہ شریف مکہ نے کرایہ وصول کرنے سے بار بار انکار کیا تھا مگر میں جس وقت واپس آ رہی تھی انہوں نے اسے خوشی خوشی قبول کر لیا تھا۔ مکہ مکرمہ میں میرے قیام کا انتظام ہو گیا تو میں نے مذہبی رسوم کی ادائیگی کی جانب توجہ دی۔

جب ہر ہائنس نواب رئیس بیوہ نے شریفِ مکہ، پاشا اور شیبا صاحب کو وہ تحائف پیش کر دیئے جو وہ ان کے لیے بھوپال سے اپنے ساتھ لائی تھیں تو ان کی فیاضی کا چرچا پورے شہر میں ہوا۔ اس کے نتیجے میں بھکاریوں نے ان کا گھیراؤ شروع کر دیا تھا۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ طواف کے لیے بھی نہ نکل سکتی تھیں۔ میں نے شریف اور پاشا سے التماس کی کہ مجھے اپنے کچھ ترک دے دیں تاکہ جس وقت ہم طواف کے لیے جائیں تو ہمیں یہ فقیروں اور بھکاریوں سے بچا سکیں۔ شریف نے چار ترکوں کو طواف کے دوران ہماری حفاظت پر مقرر کر دیا تھا۔ وہ جب ہمیں طواف کے بعد گھر چھوڑنے آتے تو گو انہوں نے کہا نہیں مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی تحفے کی توقع رکھتے ہیں۔ میں نے حکم دیا کہ ان چاروں کو ہر روز آٹھ آٹھ آنے دے دیئے جائیں (ایک آنہ ایک شلنگ کے برابر تھا)۔ انہوں نے یہ خوشی خوشی قبول کر لیے تھے۔

ہم جب طواف کے لیے یا کسی اور کام سے گھر سے نکلتیں تو ترکی حجاب میں ہوتی تھیں۔ اس موقع پر مکے کے لوگ میرے آدمیوں سے پوچھتے: ''ان خواتین میں سے سکندر بیگم کون سی ہیں؟'' کبھی کبھی میرے آدمی کسی اور خاتون کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیتے کہ یہ بیگم بھوپال ہیں اس لیے مجھے سختی کے ساتھ یہ حکم جاری کرنا پڑا کہ وہ اس سے باز آ جائیں ورنہ جو ایسا کرے گا اسے نوکری سے برخواست کر دیا جائے گا۔ اب کسی کے پوچھنے پر یہ لوگ کبھی نہ بتاتے تھے کہ کون سی خاتون سکندر بیگم ہیں۔

اب اہل مکہ نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ مجھے شریف اور پاشا کے گھر جانا چاہیے کیونکہ یہ دونوں اس ملک کے حکمران تھے۔ میں نے اپنے وزیر اعظم کو شریف کی خدمت میں بھیجنے کا ارادہ کیا۔ میں نے نائب بخشی کو لکھا کہ وہ شریف کو اور پاشا کو مطلع کر دے کہ جب جہاز میرے خدام کو لے کر پہنچ جائے گا تو میں ان شاء اللہ دونوں کے گھر آؤں گی......

جب جہاز پہنچ گیا تو میں پیدل ہی شریف کے گھر گئی۔ وہ اس وقت ایک کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے تین غلام میرے پاس آئے اور مجھ سے ملاقاتیوں کے کمرے میں تشریف لے جانے کی

درخواست کی۔ میں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ ہال کی طرف جانے والی سیڑھی پر میں نے قدم رکھا ہی تھا کہ میری نظر چند جارجیائی خواتین پر پڑی جو تین چار قدم اوپر کھڑی تھیں۔ اتنی ہی مزید بلندی پر چند مصری خواتین دکھائی دیں یہ سب شریف کی والدہ اور بہنوں کی خادمائیں تھیں۔ ان خواتین نے سیڑھیاں چڑھنے میں میری مدد کی۔ اس سے بھی چار پانچ قدم اوپر شریف کی بیویاں اور مزید اتنے ہی فاصلے پر ایک اور بیوی کھڑی تھی پھر ایک ایسے دروازے سے آگے، جو غلام گردش کی طرف جاتا تھا شریف کی والدہ کھڑی تھیں۔ شریف کی ہر بیوی جب مجھ سے ملی تو سب سے پہلے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا پھر انہوں نے اپنا اپنا چہرہ میرے چہرے اور گردن کے ساتھ مَس کیے اور آخر میں ان سب نے باری باری میرے لبوں پر بوسے دیئے۔ شریف کی والدہ نے بھی ایسا ہی کیا۔

نواب فوجدار محمد خان، وزیر حافظ محمد خان اور کپتان مٹھو خان میرے ہمراہ تھے جن کا استقبال مردانہ حصے میں کیا گیا تھا اور انہیں ملنے شریف خود آگے بڑھا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد چند غلاموں نے میرے پاس آ کر بتایا کہ اگر میری اجازت ہو تو شریف اس کمرے میں آ جائے جہاں میں موجود تھی۔ میں نے جواب دیا: ''یہ شریف کا اپنا ہی گھر ہے ضرور تشریف لے آئیں''۔ میں ان کی والدہ اور بیویوں کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی جو عربی بول رہی تھیں اور جعفری افندی کی اہلیہ ترجمان کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ شریف کی سات بیویاں تھیں جن میں سے چار کو میں نے دیکھا تھا۔ ان میں سے دو جارجیائی تھیں، بے حد حسین و جمیل اور بہت خوبصورت قیمتی لباس میں ملبوس۔ یہ سر سے پاؤں تک ہیروں سے لدی ہوئی تھیں۔ سروں کے گرد موتیوں کے ہار تھے جب یہ خواتین حرکت کرتیں یا بولتی تھیں تو ان کی جگمگاہٹ اچھی لگتی تھی۔ ان کے اُوپر چھوٹے چھوٹے رومال تھے جس طرح کے انگریز خواتین ہاتھوں میں رکھتی ہیں، اور ان رومالوں پر موتیوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ ان کے گلے میں بھی قیمتی پتھروں کے ہار تھے۔ چہرے مُہرے، قد وقامت متوازن اور متناسب اعضاء کی خوبصورتی کی بنیاد پر ان دو جارجیائی خواتین کو حُسن و جمال کی پیکر قرار دیا جا سکتا تھا۔ ان میں سے ایک کا لباس سیاہ ساٹن کا اور دوسری کا ارغوانی ساٹن کا تھا جن پر ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ تیسری بیوی عرب تھی جس کے خدوخال عام عرب خواتین کے سے تھے چوتھی بیوی کا تعلق ایبی سینیا سے تھا۔

شریف کی صرف دو بیویاں اس کی موجودگی میں بیٹھ سکتی ہیں جن سے اس کی اولاد ہو اور جن

اور وقتی ہوتی وہ ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہیں۔

جب شریف ہال میں داخل ہوا تو چاروں بیویاں اور والدہ احتراماً کھڑی ہوگئی تھیں۔ میں چند قدم چل کر کے اسے ملنے کے لیے آگے بڑھی۔ جب شریف بیٹھ گیا تو میں نے تحائف پیش کیے۔ پھر معمول کی تقاریر ہوئیں۔ میری خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد شریف نے مجھ سے پوچھا: ''بھوپال یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟'' میں نے جواب دیا: ''یہ ہندوستان کی جنت ہے۔ آپ کو ضرور بھوپال آنا چاہیے''۔ شریف نے قہقہہ لگایا اور کہا: ''میرا گھر تو کعبہ ہے''۔ اس کے بعد بیویاں پھر آداب بجالائیں، والدہ نے دعائیں دیں اور پیچھے جا کر بیٹھ گئیں۔

چند جار جیائی اور افریقیوں نے جو اس وقت خدمت پر مامور تھے اب کافی کی پیالیاں اور انار کا شربت پیش کیا۔ چند اور خدام نے عرق گلاب اور عطر پیش کیا۔ جیسا کہ ہندوستان میں رواج ہے کہ مہمانوں کو عطر پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی مہمانوں کی تواضع کے طور پر خوشبویات پیش کی جاتی ہیں۔

شریف نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے چچا، وزیر کو اور دوسرے حضرات کو یہاں بلواؤں''۔ میں نے جواب دیا: ''میں آج دراصل آپ کے خاندان کی خواتین سے ملاقات کے لیے یہاں آئی ہوں اگر وہ لوگ آ گئے تو خواتین یہاں موجود نہ رہ سکیں گی''۔ مگر شریف نے اپنی خواہش پر زور دیا تو میں نے اپنی رضامندی دے دی کہ بُلا لیا جائے۔ چنانچہ خواتین تو وہاں سے چلی گئی تھیں اور چند غلاموں کو بھیجا گیا کہ وہ مہمانوں کو اندر لے آئیں۔ جب وہ لوگ آ گئے تو شریف نے ان میں سے کسی کو بھی سیلوٹ نہیں کیا البتہ ان سب نے سلام عرض کیا اور شریف کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر بیٹھ گئے۔ چند تقاریر کے بعد یہ سب حضرات مردانہ میں چلے گئے تھے۔ شریف مکہ وہیں بیٹھے رہے جہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی عمر پچاس برس سے کچھ زیادہ تھی۔ خواتین دوبارہ اس ہال میں آ گئی تھیں۔ مزید تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد شریف نے مجھ سے اجازت طلب کی اور مردانے میں چلے گئے۔

میں نے بھی خواتین سے اجازت لی اور شریف کی بہنوں سے ملاقات کے لیے دوسرے گھر چلی گئی۔ یہاں تین بہنیں، چار مائیں، دو سالیاں اور کئی دیگر خواتین تھیں۔ چند معمول کی تقاریر کے بعد شریف کا چھوٹا بھائی اندر آیا اور ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ کافی اور شربت سے تواضع ہوئی۔ لوبان کے جلنے کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے اجازت لی اور اپنے گھر واپس آ گئی۔ مرد ایسے موقعوں پر ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں جبکہ

عورتیں بھی عورتوں سے اسی طرح بغلگیر ہوتی ہیں۔

وہ تیرہ اسباب جن کی وجہ سے میں مدینہ نہ گئی: میری خواہش تھی کہ مدینہ طیبہ حاضری دوں مگر کوئی آخری فیصلہ کرنے سے قبل میں نے میاں فوجدار محمد علی کو لکھا کہ میں نے سنا ہے مدینے جانے والی سڑک بہت خوفزدہ کرنے والی ہے، یہ مجھے مدینے جانے سے روکتی ہے پھر مدینے جانا فرض بھی نہیں ہے۔ میں مزید درج ذیل اسباب کی وجہ سے مدینے نہ جاسکوں گی:

1۔ تمام اونٹوں پر جو شگدف رکھے جاتے ہیں ان میں سوار ہو کر پہلو بدلنا ناممکن ہوتا ہے جس سے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔

2۔ سڑکیں بہت خستہ حال اور ٹوٹی پھوٹی ہیں۔

3۔ مدینے جانے والے راستے کے بارے میں مجھے تفصیلات بھی معلوم نہیں۔

4۔ مجھے عربی بالکل نہیں آتی اور بدوؤں کی زبان اور رسوم سے میں بالکل ناواقف ہوں اس لیے جو وہ کہتے ہیں میں بالکل نہیں سمجھ سکتی۔

5۔ میرے ساتھ حفاظتی دستے بہت کم ہیں۔

6۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں شریف یا پاشا کے حفاظتی دستوں کا انتظام کرلوں۔

7۔ اگر پیسے ہوتے بھی تو افسروں کی تنخواہ چونکہ مقرر نہیں ہے اس لیے وہ منہ مانگے پیسے مجھ سے لینا چاہیں گے اور میں جانتی ہوں وہ اس طرح میری املاک میں سے بہت کچھ لوٹ لیں گے۔

8۔ قدسیہ بیگم کی دولت اور فیاضی کا اس قدر چرچا ہے کہ وہ بھیس بدل کر بھی سفر نہ کرسکیں گی اگر ہم خاموشی کے ساتھ چلے گئے تو بدو ناراض ہو کر کہیں گے: ''یہ وہی خاتون ہے جو کہ مکہ میں اس قدر زیادہ روپیہ خرچ کرسکتی تھی مگر اب محض اس لیے خالی ہاتھ سفر کررہی ہے کہ ہم اُسے راستے میں لوٹ نہ لیں''۔

9۔ بدو قدم قدم پر خیرات مانگتے ہیں اور اگر انہیں روپیہ یا کھانا نہ ملے تو بے عزتی کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو جان سے مار ڈالتے ہیں۔

10۔ مقامی اتھارٹی حجاج کی حفاظت کا انتظام نہیں کرتی۔ شریف بدوؤں سے فی اونٹ دو ریال

وصول کر لیتا ہے۔ جہاں اونٹوں پر محصول لیے جاتے ہیں وہ حاجی ادا کرتے ہیں جو جاتے
ہیں۔ جب بہت سے حجاج جمع ہو جاتے ہیں تو اونٹوں ... ہوتی ہے ... کرتا ہے ... اس کی
کی ہوتی ہے۔ وہ یہاں سے محصول لیتا ہے اور ان کی حفاظت اس کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔

11۔ شریف مکہ خود کسی قافلے کے ساتھ نہیں جاتا۔ اس کے خدام نے مجھے بتایا کہ اسے ایسا نہیں
کرنا چاہیے۔ وہ قافلے کے ساتھ اپنے بھتیجے یا کسی اور ... کو بھیج دیتا ہے۔

12۔ یہ بات بھی میرے علم میں آئی ہے کہ بدو اس لئے ... کے ساتھ اکثر لڑتے
رہتے ہیں جس کی وجہ سے قافلوں کو دو دو تین تین مہینے مکہ اور مدینے میں رکنا پڑ جاتا ہے۔

میاں فوجدار محمد خان کا درج ذیل جواب مجھے موصول ہوا

آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بالکل درست ہے اور دانشمندی کی بات ہے۔ جب
تک مدینے تک سڑک محفوظ نہ ہو جائے وہاں جانا اپنی جانوں سے کھیلنا ہے۔ مدینے نہ
جانے کا فیصلہ آپ نے صحیح کیا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے کہ زندگی کو خطرے
میں ڈالنا گناہ ہے۔ ہم مسلمانوں کو مکے جانے کا حکم تو ہے مگر مدینے جانا لازمی نہیں
ہے۔ ہم حج کی ادائیگی کے بعد مکے سے واپس بھوپال جا سکتے ہیں۔"

حکیم باقر علی خان نے بھی لکھا: "میں آپ کی رائے سے سو فیصد متفق ہوں۔ آپ مدینے نہ جائیے۔
آپ یہاں دوبارہ کسی اور دن آ سکتی ہیں جب آپ آنے کے قابل ہوں گی۔ مولوی حضرات اور علماء کا فیصلہ
ہے کہ اگر راستہ محفوظ نہ ہو تو مدینے جانا لازمی نہیں ہے بلکہ حضرت امام غزالی نے تو اس سے منع فرمایا ہے۔

میں نے پھر شریف عبداللہ اور پاشا عزت احمد کو لکھا:

"میں نے مدینے جانے والی سڑک کے بارے میں کئی لوگوں سے دریافت کیا ہے۔
کچھ لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ مدینے کو چار سڑکیں جاتی ہیں، کچھ نے اطلاع دی ہے
کہ پانچ چھ راستے جاتے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ سڑکیں کھلی ہوئی ہیں جبکہ بعض نے
اطلاع دی ہے کہ بند ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی صحیح معلومات نہیں
رکھتا۔ میں آپ کی ممنون ہوں گی اگر آپ مجھے ان مختلف راستوں کی ایک فہرست بھیج
دیں جو مدینے جاتے ہیں۔ یہ بھی بتایئے کہ کن راستوں پر سفر کیا جا سکتا ہے اور کون سی

سڑکیں کھلی ہوئی ہیں اور کون سی بند کر دی گئی ہیں''۔

میرے استفسار پر شریف اور پاشا نے جواباً لکھا:''مدینے پانچ سڑکیں جاتی ہیں جو شاہی سڑک کے علاوہ ہیں مگران پر چالیس سے پچاس اونٹوں پر مشتمل چھوٹے قافلے جاتے ہیں۔ بڑے قافلے یا تو شاہی سڑک سے یا مشرقی سڑک سے جاتے ہیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ مدینے کے پاشا کی کوششوں سے شاہی سڑک کو جلد بدوؤں سے پاک کر دیا جائے گا۔''

مجھے ایک محمد حسن نامی عرب نے مدینے کے راستوں کے بارے میں درج ذیل معلوماتؓ فراہم کی تھیں:

''تقریباً 15 یا 20 شوال کو پہلا قافلہ مکے سے روانہ ہوتا ہے۔ یہ وادی فاطمہ میں جمع ہوتے ہیں۔ پانی کی قلت کی وجہ سے قافلے کے لوگ چھوٹی چھوٹی پارٹیوں میں مکے سے روانہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے راستے میں ایک دن اور ایک رات کے لیے رکتے ہیں۔''

''قافلہ مدینے جاتے ہوئے بدوؤں کے ڈر سے پارٹیوں میں تقسیم ہو کر سفر کرتا اور دو ایک جگہ پھر سے جمع ہو کر مدینے پہنچتا ہے۔''

''حج کے بعد دو قافلے مکہ سے مدینہ جاتے ہیں، پہلے قافلے کا نام طیارہ ہے جو شامی قافلے کے ساتھ جاتا ہے، دوسرا قافلہ بیس روز بعد روانہ ہو کر بہت آہستہ آہستہ سفر کرتا ہے۔''

میں نے عدن کی مریم بی بی (ایک روحانی شہرت کی مالکہ خاتون) کو بھی لکھا جن کے احکامات بدو بہت مانتے ہیں۔ بدوؤں کے 12 سردار شیخ سعد کے ماتحت ہیں جو خود اس خاتون کے مرید ہیں:

''میں نے مکہ مکرمہ کے لوگوں سے سنا ہے کہ مدینے جانے والی سڑکیں بدوؤں اور سلطان ترکی کے درمیان پائے جانے والے جھگڑے کی وجہ سے بند کر دی گئی ہیں۔ مجھے یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ شیخ سعد جو بدوؤں میں ایک سردار اعلیٰ کے طور پر مشہور ہیں، آپ کے مرید ہیں اس لیے آپ سے التماس ہے کہ شیخ سعد کو خط لکھیے کہ جب میرا قافلہ مکے سے مدینے کے لیے روانہ ہو تو شیخ سعد خود یا اس کا برخوردار یا کوئی قریبی

عزیز اس قافلے کی حفاظت کے لیے ساتھ چلے تاکہ یہ قافلہ بحفاظت مدینے پہنچ جائے اور یہی عمل مدینے سے مکے تک واپسی سفر میں بھی دہرایا جائے۔ میں اس کے عوض معقول رقم ادا کرنے کو تیار ہوں۔ شیخ سعد کے نام خط آپ مجھے ارسال کرسکتی ہیں، میں یہ خط خود انہیں بھجواؤں گی۔"

میں نے ایک اور خط جدہ میں برطانوی قونصل کو بھی اس طرح لکھا:

"مدینے جانے والی تمام سڑکوں کی حالت کے بارے میں مجھے جو رپورٹیں موصول ہوئی ہیں، میں ان کی نقول آپ کو ارسال کر رہی ہوں۔ از راہ کرم اس بارے میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ میرا خیال ہے کہ میں مصری اور شامی قافلے کے ساتھ مدینے جاؤں اور حج کی ادائیگی کے بعد اسی قافلے کے ساتھ سویز چلی جاؤں۔ میں نے سنا ہے کہ وہاں سے مجھے ایک ایسا دخانی جہاز مل جائے گا جو براستہ عدن مجھے بمبئی پہنچا دے گا۔ مجھے یہاں بیٹھ کر مدینے سے سویز تک کے راستے کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں ہوسکتیں۔ مہربانی فرما کر سڑک کے محفوظ ہونے، سامان رسد کی دستیابی اور حفاظتی دستے کی فراہمی کے بارے میں مطلع کیجیے۔"

مجھے قونصل کا درج ذیل جواب موصول ہوا:

"مکہ میں سینکڑوں لوگ ایسے موجود ہیں جو راستوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں مگر چونکہ آپ نے مجھ سے میرا مشورہ پوچھا ہے، میں آپ کو یہی کہوں گا کہ آپ جدہ چلی جائیں وہاں سے بذریعہ دخانی جہاز ینبو پہنچ جائیے اور پھر وہاں سے آگے مدینہ زیادہ دور نہیں رہ جاتا۔ سویز روڈ کے بارے میں مجھے یہاں کے لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ یہ سڑک خراب ہے، پانی کی قلت ہے۔ فاصلہ زیادہ ہے اور اخراجات بہت زیادہ ہوں گے۔ مدینے سے سویز تک کا فاصلہ 600 برطانوی میل ہے اور میں آپ کو ہرگز ہرگز یہ مشورہ نہ دوں گا کہ اس راستے سے جائیے۔ تاہم اگر آپ پہلے سویز ہی پہنچنا چاہتی ہیں تو آپ کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ مدینے سے ینبو تک خشکی کے راستے جائیے وہاں سے سویز تک دخانی جہاز سے۔ اگر آپ کو اس سے

اتفاق ہو تو میں آپ کے لیے ایک شاہی ترکی دخانی جہاز کا انتظام کر سکتا ہوں جو آپ کے لیے چارٹر کرا دوں گا۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ سوئز سے بمبئی تک آپ کو مشکلاتِ پیش آئیں گی کیونکہ وہاں صرف دو یا تین جزیرہ نما کے اور اورینٹل کمپنی کے دُخانی جہاز ہیں میرے خیال میں بہتر یہ ہوگا کہ آپ بمبئی سے دخانی جہاز چارٹر کر لیں جو سوئز آ کر آپ کو لے جائے۔ جس شخص نے آپ کو مکے سے سوئز اور وہاں سے بمبئی بذریعہ دخانی جہاز سفر کرنے کا مشورہ دیا ہے اس کے یقیناً اس میں کچھ ذاتی مفادات ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مکے سے مدینے تک مشرقی سڑک سب سے زیادہ محفوظ ہے مگر پھر بھی اس راستے مسافروں اور جانوروں دونوں کو مشکلات پیش آتی ہیں۔ یہ چونکہ ایک غیر ملک ہے اس لیے میں آپ کے ساتھ حفاظتی دستے بھی نہیں بھیج سکتا۔ میں یہ حکما کرانے کا مجاز نہیں ہوں۔"

مریم بی بی نے جو خط شیخ سعد کو لکھا تھا اُس کے جواب میں اس نے مجھے یہ لکھا کہ:

"میں اپنے بیٹے حذیفہ کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ آپ جو چاہتی ہیں اس کا وہ انتظام کر دے گا۔ آپ اس طرح بحفاظت اور بہ سہولت سفر کر سکیں گی۔ میں ہر ممکن آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مہربانی فرما کر میرے بیٹے اور اس کے ساتھ جو چند دوسرے عرب آ رہے ہیں ان سے شفقت و مہربانی سے پیش آیئے گا اس لیے کہ یہ کافی تکلیف اٹھا کر آئیں گے۔ آپ کی فیاضی اور سخاوت کو تو سبھی جانتے ہیں۔ شتر بانوں کی میں پوری مدد کروں گا اور میرا بیٹا آپ کے پورے آرام کا خیال رکھے گا۔"

میں نے مزید دریافت کیا تو پتا چلا کہ یہ سفر اسی طرح طے کیا جاتا ہے۔ قافلہ روزانہ اکیس گھنٹے چلتا ہے اور ایک جگہ پڑاؤ ڈالتا ہے، یوں مدینے تک 12 دن لگ جاتے ہیں۔ راستے میں پانی کہیں نہیں ملتا۔ راستے سے صرف بدو واقف ہیں اور صرف ان کے علم میں ہوتا ہے کہ پانی کہاں ملے گا۔ مدینہ جاتے ہوئے راستے میں بہت سی پہاڑیاں ہیں، یہ سب کی سب خشک اور اشجار سے خالی ہیں۔ حجاج کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ لٹیرے لوٹ لیتے ہیں، وہ صرف وہی شے چھوڑتے ہیں جو اُن کے کام کی نہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ اونٹوں پر لدا

ہوا پانی تک چھین لیتے ہیں۔ یہ لوگ جس قافلے سے خوش ہوں صرف اسے بحفاظت مدینے پہنچاتے ہیں۔ خدانخواستہ یہ کسی قافلے سے ناراض ہو جائیں تو اسے راستے میں چھوڑ کر خود پہاڑیوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ حجاج جو راستے سے واقف نہیں ہوتے ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں اور بالآخر بھوک پیاس سے مر جاتے ہیں۔

مدینے تک جو 12 منازل ہیں ان میں سے صرف پانچ پر یہ بدو شریف عبداللہ کا تسلط مانتے ہیں، بقیہ سات پر ان کے نزدیک شیخ سعد کی حکومت ہے۔

یہ اپنے سرداروں کے احکامات بھی صرف اسی وقت تک مانتے ہیں جب تک یہ ان کے حق میں ہوں۔ ان پر کسی طرح بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں اپنے عہد و پیمان کا خیال نہیں رہتا نہ یہ کسی کا حکم مانتے ہیں۔

ان اسباب کی بنا پر میں نے مدینہ منورہ نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس سفر میں مجھے اور میرے لوگوں کو خطرہ لاحق تھا۔ یوں مدینے کی زیارت سے اس بار میں محروم رہ گئی تھی۔

☆☆☆

11۔ جان ایف کین

اینگلوانڈیا...... 78-1877ء

جان کین، کپلنگ کے ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ یہ کلکتہ کے ایک بہت بڑے انجلیقی گرجا گھر کے سینئر پادری کا بیٹا تھا۔ وہ 12 برس کی عمر میں بھاگ کر ملاح کے طور پر وہیل کا شکار کرنے والے جہاز پر بھرتی ہو گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ زندگی تند و تیز طوفانوں سے گھری ہوئی مہم پر مشتمل زندگی ہوتی ہے خواہ آپ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوں۔ وہ 32 برس کا تھا جب حجاز پہنچا۔ اس کا وہاں مکے اور مدینے میں قیام ایک برس کا تھا جس میں اس نے وہاں کے حالات دو بار لکھے اور یہ تحریر سفرناموں میں بے حد قیمتی تصور کی جاتی ہے۔ ان میں اچھا مزاح بھی ہے، سبک رفتاری بھی اور حیرت انگیز حد تک یہ جدید بھی ہیں۔

کین عُمر بھر مسلمانوں کے ساتھ زندگی گزارتا رہا تھا۔ برٹن کے مقابلے میں وہ اپنے ساتھیوں کے خاکے کھینچنے میں سست رفتار ہے، وہ مشرق و مغرب کے تقابلی جائزے میں بھی دلچسپی نہیں رکھتا۔ وہ قلم اٹھاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ کسی ایسے فنکار کی تحریر ہے جو ممالک غیر سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ رمضان المبارک میں اکیلا جدے پہنچا تھا مگر بہت جلد وہ ایک ہندی امیر کے ساتھ آنے والے حجاج کی رہائش گاہ سے منسلک ہو گیا تھا۔ ایسا کرنے میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اُردو فر فر بولتا تھا۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حج کے دوران لوگ کس قدر جلدی آپس میں بلا امتیاز رنگ و نسل گھُل مل جاتے ہیں، بالخصوص ایک مشترک زبان بولنے والے حجاج۔ کین کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ وہ مکہ میں رہ کر وہاں کے حالات و واقعات کا آنکھوں دیکھا حال قلمبند کرے، اور اس میں خاص طور پر وہ باتیں ضرور شامل ہوں جو اس کی دلچسپی کی تھیں۔ اس نے اپنا نام محمد امین رکھ لیا تھا۔ اب وہ ہندی قافلے کے ساتھ ساتھ تھا۔

مکہ میں ہندی امیر کے قافلے کے تمام حجاج جس جگہ ٹھہرے ہوئے تھے وہ ایک دائرے کی شکل میں تعمیر شدہ کئی مکانات تھے جو حرم کے چاروں طرف واقع تھے۔ کین کے کمرے کی کھڑکی کعبہ کی جانب کھلتی تھی جس کی مدد سے وہ صحن حرم کا طائرانہ جائزہ لے سکتا تھا۔ وہ یہاں سے رات دن طواف کرنے والے حجاج کو دیکھ سکتا تھا اور کمرہ چھوڑے بغیر اپنی نمازیں ادا کرسکتا تھا۔ ہندی امیر کی دولت کا اندازہ کین اس کی قیام گاہ

دیکھ کر لگا سکتا تھا جس کا مقابلہ بیگم بھوپال کی دولت سے کیا جا سکتا تھا، جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آ چکا ہے۔ ایسا اتفاقیہ طور پر نہیں ہوا کہ اس عرصے میں سفرِ حج کے جتنے حالات بھی قلمبند ہوئے سب ان مصنفین کے تھے جن کی ہندوستان سے قریبی وابستگی تھی۔ ہندوستان، برطانیہ کی امیر ترین نو آبادی بھی نہیں تھی۔ یہاں سے زیادہ سے زیادہ حجاج مکے جاتے تھے اور حج کے حوالے سے ان کے ذریعے کثیر رقم حاصل ہوتی تھی۔

کین نے تقریباً دس روز گھر کے اندر ہی گزارے پھر وہ باہر نکلا اور گرد و نواح میں گھومنے نکل جاتا تھا۔ ایک روز وہ ایسا لباس پہنے ہوئے تھا جو کچھ ہندی تھا کچھ عربی۔ نہ تو اس کا لباس نہ سفید رنگت اسے دوسروں کے لیے باعث توجہ بنا رہی تھی۔ ابتداء میں اسے جدہ میں بطور انگریز کے داخل ہونے اور اسے حاجی کی حیثیت سے یہاں سے روانگی تک کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ بہت سے سفرناموں میں یہاں پیش آنے والے ان خطرات کا ذکر ملتا ہے جو ان لوگوں کو درپیش تھے جنہوں نے اپنا روپ بدل رکھا تھا۔ مگر حج کی جس روداد کا ذکر اب ہونے والا ہے یہ ایک انگریز کے قلم سے ہے جس نے سچائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اس کے خیال میں مکہ بذاتِ خود کسی بہروپ بھرنے والے کو بہترین روپ مہیا کرتا ہے کیونکہ یہاں دنیا کے ہر ملک سے وہ حجاج آتے ہیں، جن کا تعلق مختلف قوموں، مختلف نسلوں سے ہوتا ہے مگر حج کے دوران یہ سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں، تمدنی امتیازات بھی حائل نہیں رہتے۔ کین کو مکہ ایک شہر ممنوعہ نظر نہیں آیا تھا بلکہ یہ تو ایک عالمگیر اجتماع تھا جس میں ہر سطح کے، ہر پس منظر کے اجنبی ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ جاتے ہیں کہ غیریت، اجنبیت اور دوری کا ہر نشان مٹ جاتا ہے۔

کین دائمی طور پر مسلمان بھی نہیں ہوا تھا مگر جس آسانی کے ساتھ وہ حج کی دنیا میں داخل ہو گیا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس میں کس قدر لچک ہے جو انسانی لچک تھی مذہبی لچک نہیں تھی۔ اس حوالے سے اس کی کتاب ایک ایسا مطالعہ فراہم کرتی ہے جس میں شناخت کی ایسی لوچ اور اثر پذیری ہے جس میں اپنی ذات بھی گم نہیں کرنی پڑتی۔ درج ذیل اقتباسات میں کین ایک کلچر سے دوسرے کلچر میں تیزی سے مراحل طے کرتا ہوا داخل ہو جاتا ہے۔ جب وہ پہلی بار مسجد الحرام سے گزر رہا تھا تو اسے ذرا سی مشکل اس وقت پیش آئی تھی جب اسے ایسا لگا جیسے اس نے ایک ایسی جگہ کوئی حکم عدولی کر دی ہو جہاں ایک چھوٹا سا بورڈ آویزاں تھا کہ گھاس پر پاؤں نہ رکھیں۔ چند ہفتے گزر گئے تو اس نے جب حجاج کو کعبہ کے گرد دیکھا تو اس نے مذہبی خوف اور ڈر کے بارے میں اپنا خیال الگ طور پر ظاہر کیا تھا ایک مہینے کے بعد اس نے کہا: ''میں نے یہ محسوس کیا کہ میں ہر لحاظ

سے اتنا ہی پکا اور سچا مسلمان تھا جتنا ایک پیدائشی عرب۔ میں نے سوچا کہ میں نے بھوٹ موٹ کا مسلمان بن کر کامیاب اداکاری کی ہے''۔ دوسرے باب میں اخلاقی ابہام کے تمام نشانات مٹ جاتے ہیں۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ مکہ میں ''اپنے آپ کو اجنبی بالکل نہیں سمجھ رہا تھا، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پیدائش ہی سے مسلمان چلا آ رہا ہے۔

کین ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو تضادات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس نے تو مکے میں اپنے آپ کو حجاج کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کی کتاب میں ان باتوں کا ذکر ہے جو خود اُسے پیش آئیں۔ وہ راستہ چلتے لوگوں سے دوستی کر لیتا تھا، جس قافلے کے حجاج کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا اُن کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا کرتا تھا۔ وہ پانچوں نمازیں باقاعدگی سے وقت پر ادا کرتا تھا۔ اس نے ایک مقامی حجام سے بھی شناسائی پیدا کر لی تھی۔ ایک روز جب وہ شیو بنوا رہا تھا اسے بتایا گیا کہ ایک انگریز خاتون بیس برس سے مکے میں رہائش پذیر ہے۔ کین کو اس بات پر یقین نہ آتا تھا وہ خود اس سے ملنے گیا۔ یوں حج کی روداد میں ایک اجنبی اور بنیادی تصور شامل ہو جاتا ہے۔ اب مکے میں دو برطانوی کین اور لیڈی وینس مہینے میں کئی بار آپس میں ملتے ہیں۔

رمضان المبارک کے کچھ عرصے بعد ہندی امیر اور اس کے لوگ کچھ دنوں کے لیے یروشلم چلے گئے تھے لیکن کین ان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ وہ اس دوران شہر بھر میں مٹرگشت کرتا تھا۔ ایک بعد دوپہر وہ ایک سکول کے قریب سے گزر رہا تھا جہاں اس نے کافی لڑکے جمع دیکھے تھے۔ وہ وہاں رک کر کچھ لڑکوں کی طرف متوجہ ہوا جو کھیل میں مصروف تھے۔ ایک لڑکے نے کین کی سفید رنگت دیکھ کر اسے عیسائی کہہ کر مخاطب کیا۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا جس میں کین کو زخم بھی آئے مگر اس نے اس واقعہ کو بڑے مزاحیہ انداز میں لکھا ہے لیکن اس سے اس کا اعتماد ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اگلے تین ہفتے کمرے کے اندر رہا، درد کو دور کرنے کے لیے وہ افیون کھاتا تھا اور ان مجاز افسروں کی نظر سے چھپتا پھرتا تھا جو پوچھ گچھ کر سکتے تھے۔

اَب تک کوئی سپاہی نہیں آئے تھے، امیر یروشلم سے واپس آ گیا تھا اور کین کے زخم مندمل ہو چکے تھے۔ اس نے پہلے کی طرح باہر سڑکوں پر نکلنا شروع کر دیا تھا اور نوٹ بک میں لکھا بھی جا رہا تھا۔ مکہ اس کے لیے از سرِ نو امن کی جگہ بن چکا تھا مگر اس نے محتاط رہنا شروع کر دیا تھا، بالخصوص لیڈی وینس سے ملنے میں اب وہ بہت احتیاط سے کام لیتا تھا۔ حج کے دنوں سے کچھ ہفتے پہلے وہ شہر کے قریبی پہاڑوں پر گیا تاکہ پورے شہر کی

انسانی آبادی اور جانوروں کی تعداد کا اندازہ لگا سکے۔ وہ اپنے سفر نامے کا ایک طویل باب اس موضوع کے پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ان بلند و بالا پہاڑوں پر وہ بالکل محفوظ تھا۔

سکول کے طلبہ والے واقعہ کو ایک طرف کر دیا جائے تو کین اپنے پیشرووں کی نسبت حج کے موقعہ زیادہ پرسکون تھا۔ برکات، العباسی اور برٹن کے برعکس وہ کسی کے لیے کام نہیں کر رہا تھا۔ نہ ہی اُس کی یہ کتاب ایک ایسی سرکاری رپورٹ ہے جو سائنسی یا تجارتی مالی معاونین کے نام ہے۔ کین نے حج اپنی دلچسپیوں اور مفادات کے لیے ادا کیا اور اس پر جب کتاب لکھی تو یہ مقبول عام بنانے کے لیے اور زیادہ سے زیادہ قارئین کے مطالعہ کے لیے تھی۔ وہ عام لوگوں میں آزادی کے ساتھ، بے تکلفانہ گھومتا پھرتا تھا۔ وہ صحرا میں بھی باتونی لگتا تھا۔ وہ ہجوم کے ساتھ جبل الرحمت پر چلا جاتا تھا۔ مکہ میں وہ روشنی کے اچانک سیلاب کا ذکر کرتا ہے، وہ گھومتا پھرتا بھی ہے اور کبھی کبھی مسجد کے باہر اکیلا بیٹھ بھی جاتا ہے۔ وہ پرندوں کو ڈالنے کے لیے دانہ بھی ساتھ رکھتا ہے اور پرندے غول درغول اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ قربانی کے بعد پھیلنے والی گندگی اور وبائی بیماریوں کے پھوٹنے کا ذکر بھی کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ ایک دن میں 63 حجاج ہیضے سے مرے تھے۔

برٹن اور کین دونوں نے مشرقیت کے چلتے پھرتے نمونوں کا مخصوص حجاج کی شکل میں ذکر کیا ہے۔ برٹن کے ہاں ڈاکٹر اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس درویش کے کرداروں سے یہ تصویر مکمل ہوتی ہے اور وہ ان کے ردعمل کا تجزیہ کرتا ہے، مگر کین اس معاملے میں ایک بالکل مختلف طریقے سے یہ کام کرتا ہے۔ اس میں اپنی ذات کو اس نے ڈرامائی شکل بہت کم دی ہے اور اس کے سفر نامے میں وہ میلوڈراما کہیں نہیں ملتا جہاں کین جذباتیت کا شکار ہو گیا ہو۔ وہ تو اس کے برعکس مستقل مزاجی کے ساتھ گھومنے پھرنے اور سماجی مقام و مرتبے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ جب حالات بگڑ جاتے ہیں تو وہ شہر چھوڑ کر بھاگتا نہیں، البتہ وہ اس وقت تک کمرے سے باہر نہ نکلنے میں عافیت سمجھتا ہے جب تک وہ مصیبت ٹل نہیں جاتی۔ وہ اپنے خاکوں اور سفرناموں میں اس آنکھ سے دیکھتا ہے جس سے مشکلات کو دیکھا جا سکے۔ کین نے خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہوئے لوگوں کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بے مثال ہے۔ وہ عربی دان نہیں تھا لیکن اسے جس قدر عربی سیکھنے کا شوق تھا اس نے کین کو کافی حد تک کامیابی بخشی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے حج پر جو کچھ لکھا ہے وہ پوری اہمیت لئے ہوئے ہے۔

☆☆☆

"مکّہ مکرّمہ میں چھ ماہ"، میں سے اقتباس، از جان ایف کین

جدّہ میں آمد: حج کے موسم میں دنیا کے مشرقی ممالک سے ہزاروں مسلمان حج کے لیے جدہ میں جمع ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ قافلوں کی صورت میں عرب کے صحراؤں کو عبور کر کے آتے ہیں جبکہ تعداد ان کی ہے جو بحری سفر کرتے ہیں۔ اس میں برطانوی جہازوں کے ذریعے یہ طویل مسافت طے کی ہے۔ جس حج کا ذکر میں کر رہا ہوں اس میں جدہ میں اترنے والے حجاج کی تعداد 42718 تھی۔ البتہ حج کے دن مکہ میں یہ تعداد 180,000 افراد سے تجاوز کر گئی تھی۔ میں یہیں ایک ہندی امیر کے قافلے کے ساتھ شامل ہوا تھا جو حج کے لیے مکہ اور دوسرے مقاماتِ مقدسہ جا رہا تھا۔

بہت سے ایسے متمول حجاج بھی تھے جن کے پاس اپنے دوستوں اور ہموطنوں کے نام کے تعارفی خطوط بھی تھے، جو حجاز میں رہتے تھے۔ میرے سرپرست کے پاس ایسے تعارف کئی ایک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارا استقبال کرنے والے بہت سے لوگ تھے۔ میں نے برطانوی قونصل کو اپنا نام اور پتا دیا ساتھ ہی برطانیہ میں اپنے دوستوں کے نام بتائے۔ میں نے اسے اپنے ارادوں سے بھی مطلع کر دیا تھا۔ اس نے مجھے بہت سمجھایا کہ راستے اچھی حالت میں بھی نہیں اور محفوظ بھی نہیں ہیں اور جب سے ترکی دستے جنگ میں شرکت کے لیے یورپ گئے ہیں اس ملک میں حجاج کی امن وسلامتی خطرے میں پڑ گئی ہے تاہم میں نے اس سلسلے میں پختہ ارادہ کر لیا تھا چنانچہ میں نے اپنے بہت سے کپڑے فروخت کر دیئے اور مقامی لباس خرید لئے تھے۔ میں نے جدہ میں تین روز آرام کیا اور پھر اپنے قافلے کے ہمراہ مکہ جانے کی تیاری میں لگ گیا تھا۔

تیسرے روز دوپہر کے وقت بدوؤں سے اونٹ کرائے پر حاصل کیے گئے۔ میں ان سے پہلی بار ملا تھا اور ظاہری شکل وصورت اور حلیے سے یہ بہت خوفناک نظر آتے تھے، آواز میں کرختگی تھی مگر ان میں کچھ اچھی باتیں بھی تھیں۔ یوں ان کے متعلق جو پہلی رائے میں نے قائم کی تھی وہ کچھ اتنی بری بھی نہ تھی۔

جدہ سے مکہ مکرمہ روانگی: ہم جب دروازے میں سے گزر رہے تھے اس وقت دو سپاہیانہ وضع کے ترک سنتری اپنی بندوقوں کے ساتھ کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ انہوں نے اونٹوں پر بھی اچٹتی ہوئی نظر شاید ہی ڈالی ہوگی۔ ہمارے قافلے میں پچاس افراد تھے۔ مرد اور عورتیں ملا کر

15 اونٹ کرائے پر حاصل کیے گئے تھے جن میں سے کچھ سامان کے لیے تھے کچھ سواری کے لیے۔ ہمارے قافلے کے ہمراہ کچھ بھکاری بھی نظر آئے جن کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی حجاج ہیں اور انہیں ہم سب نے خیرات کے طور پر رقم بھی دی تھی۔

وہ اونٹ جن پر حجاج سوار ہو سکتے تھے ان پر کھٹولے رکھے ہوتے تھے جن کو شگدف یا شبریا کہتے ہیں۔ ان میں بیٹھا بھی جا سکتا ہے اور بوقت ضرورت لیٹا بھی۔ شگدف کے اندر ہی کھانے پینے کی چیزوں اور نہانے دھونے کے لیے بڑی بڑی جیبیں بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ باہر کی طرف سوار کے لیے اس کی دسترس میں پانی کی چھاگل ہوتی ہے۔ اس میں سوار ہونے کے لیے سیڑھی لگائی جاتی ہے۔ مجھے اس بیچارے اونٹ پر بڑا ترس آتا تھا جسے اتنا کچھ اٹھا کر میلوں چلنا پڑتا تھا۔ سڑک ریتلی اور کچی ہوتی تھی مگر ہوتی ہموار تھی۔ اونٹ اس پر اپنی ایک خاص رفتار کے ساتھ چلتا تھا۔ پھر بھی سوار کو جھٹکے بہت سہنے پڑتے تھے۔ شگدف اونٹ کی کوہان پر ایک خاص زاویے سے ٹکا کر باندھ دیا جاتا تھا۔ توازن کے سہارے شگدف میں طویل مسافت طے ہو جاتی ہے جو دیکھنے میں مشکل نظر آتا ہے۔ ہمارے شتربان نے ہمیں کئی بار دھمکیاں دیں اور لگتا تھا ہمیں گالیاں بھی دے رہا تھا۔ میرا ساتھی بھی میری طرح پہلی بار اس قسم کے سفر اور ذریعۂ سفر سے روشناس ہوا تھا۔ ہم نے اسے خوش کرنے کے لیے چند کھجوریں اور روٹی دے دی تھیں۔ میں نے زندگی میں ایسی تکلیف دہ رات اس سے قبل کبھی نہ گزاری تھی جو اس سفر کے دوران گزارنی پڑی تھی۔ مجھے سفر کے دوران بخار ہو گیا تھا حالانکہ سمندری زندگی کے کئی برسوں کے دوران میں کبھی بیمار نہ ہوا تھا۔

ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے سب صحرائی تھا، کہیں کہیں معمولی سی چڑھائی آ جاتی تھی۔ ہم سمت کا تعین ستاروں سے کر رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ حادہ تک 28 میل کا سفر تھا جہاں ہم اس وقت پہنچے تھے جب دن کی روشنی نمودار ہو گئی تھی۔ یہ مقام جدہ اور مکہ کے درمیان واقع ہے۔ یہاں چار پانچ میل تک زرعی زمین بھی تھی، بدوؤں کی جھونپڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ شمال مشرق کی جانب نمکین پانی کی ایک نہر بہتی ہے جو صحرا میں غائب ہونے سے قبل پتھر کے بنے ہوئے آبی راستوں سے گزرتی ہے۔ اس کے اردگرد پہاڑی سلسلہ ہے جہاں پہلی بار مسافر میدان سے پہاڑی علاقے میں داخل ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ مشرقی جانب پہاڑی سلسلہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ ایک بڑے سے سائبان کے نیچے ہم نے دن گزارا، جسے کارواں سرائے کہتے ہیں۔ ہمیں کھانے کا، آرام کرنے کا اور دن کو یہاں ٹھہرنے کا کرایہ ادا کرنا تھا۔ حجاج سوئے نہیں تھے

کیونکہ وہ یہ دعا پڑھنے میں مصروف رہے۔ لبیک اللھم لبیک۔ لبیک لا شریک لک لبیک۔ ان ال
والنعمة لك و الملك ۔ لا شريك لك ۔ (ترجمہ) حاضر ہوں میں اے اللہ۔ میں حاضر ہوں۔ حاضر
ہیں نہیں تیرا کوئی شریک، حاضر ہوں میں تیرے لیے بیشک تعریف اور (تمام) نعمتیں اور بادشاہت تیرے
لیے ہیں۔ نہیں کوئی شریک تیرا۔

اب مجھے یقین تھا کہ میں وضو بھی کر سکتا تھا اور نماز بھی اس طرح ادا کر سکتا تھا کہ کسی کو شک نہ گزرے کہ مجھے نماز پڑھنی نہیں آتی تھی۔ میں نے دراصل دوسروں کو دیکھ دیکھ کر بہت کچھ نقل کر لیا تھا۔

غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ قبل ہم مکہ کے راستے پر چل پڑے تھے۔ اس سے آگے راستہ کی طرف چلا گیا تھا، پہاڑیاں بلند تر ہو گئی تھیں جس کی وجہ سے اونٹوں نے بلبلانا شروع کر دیا تھا۔ ج لبیک اللھم لبیک کی آواز گونج رہی تھی جس کا یقیناً ایک پراسرار اثر ہوتا تھا۔ صبح کے وقت جب ہم چٹانی چبوترے کی چوٹی پر پہنچے تو لبیک کی آوازوں میں شدت جذبات شامل ہو گئی تھی وہ لوگ جو ہم سے آگے تھے اونٹوں سے اُتر گئے تھے اور بتا رہے تھے کہ مکہ مکرمہ اب ان کی نظر میں تھا۔ ہم نے حادہ سے 20 کا فاصلہ طے کر لیا تھا اور راستہ ابھی تک مشرقی سمت جا رہا تھا۔ اس راستے سے جب ہم مکے میں داخل ہ ہیں تو شہر کا منظر کچھ دلکش نہیں لگتا۔ اونچی اونچی پتھر کی بنی ہوئی عمارتیں پہاڑی ڈھلوانوں پر کھڑی نظر آتی یہاں تمام حجاج اونٹوں سے اُتر جاتے ہیں کیونکہ مناسب یہی سمجھا جاتا ہے کہ مکہ میں پیدل داخل ہوا جا البتہ خواتین اور معذور افراد اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ آپ پیدل چل کر کھلی گلیوں میں سے گزرتے ہیں کے دونوں طرف مکانات ہیں۔ اب آپ ایک پہاڑی راستے سے نیچے اترتے ہیں، گلیاں تنگ ہو جاتی ہیں شہر کی طرف بڑھتے بڑھتے صفائی میں بھی کمی آتی جاتی ہے۔ یہاں حرم کی چاردیواری سے قریب ہی لیے ایک مکان کا انتظام کیا گیا تھا۔

میں، ایک اصلی برطانوی یہاں کھڑا تھا اور ایک آہنی کھڑکی میں سے دیکھ رہا تھا۔ میں یہاں دنیا کے اسلامی مرکزی مقام سے اس کی وسعتوں کا اندازہ لگا رہا تھا جو پوری "کائنات کا مرکز تھا" جسے کہتے ہیں، جہاں سینکڑوں ہزاروں مسلمان بڑھاپے میں مرنے کی آرزو کرتے ہیں اور پانچ وقت کی نماز کے دوران دنیا بھر کے مسلمان اسی کعبہ کی طرف رجوع کر کے اپنے اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ مگر جلدی ہی بدل گیا تھا اور میں نے جو اندازے لگانے شروع کیے تھے ان کا تسلسل یہیں منقطع ہو گیا تھا جس کی

یہاں پہنچ کر میں تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا اور ابھی مجھے بہت سی مذہبی رسوم بھی ادا کرنی تھیں۔ روزانہ کی پانچ نمازوں کے علاوہ ہمیں حرم کے ایک حصے میں دو نفل ادا کرنے تھے اور دو رکعت ایک دوسری جگہ۔ پھر ہمیں طواف کرنا تھا۔ طواف کا مطلب تھا کعبہ کے گرد سات چکر لگانا، حجر اسود کو بوسہ دینا جو خانہ کعبہ کی عمارت کے ایک کونے میں نصب ہے۔ ہم نے اس مقصد کے لیے ایک گائیڈ کی خدمات بھی حاصل کر لی تھیں۔ ہم نے صفاو مروئی کی پہاڑیوں پر سعی بھی کی۔ یہ حضرت ہاجرہؓ کی یاد میں کی جاتی ہے جو اسی جگہ پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑی تھیں۔ یہ گلی شہر کے مرکز میں ہے۔ آخری رسم سر منڈوانے کی ہوتی ہے، اس سے فارغ ہو کر اب میں احرام اتار کر دوسرے کپڑے پہن سکتا تھا۔

مکّہ مکرّمہ: مکہ میں یہ میری پہلی رات تھی، ہم نماز عشاء سے فارغ ہوئے تو سونے کے لیے چلے گئے تھے۔ امیر اور تقریباً تیس مومنین اسی کمرے میں خراٹے لے رہے تھے۔ رمضان کا مہینہ تھا جس میں سحری کھانے کے لیے اٹھنا ہوتا تھا۔ میں نماز فجر کے لیے ساتھیوں کے ساتھ گیا اور صبح کا یہ وقت بہت اچھا لگا تھا۔ فضا میں خنکی تھی اور ٹھنڈے پانی سے غسل نے بڑا لطف دیا تھا۔ ہمیں ایک سہولت یہ حاصل تھی کہ جس کمرے میں ہمارا بستر تھا اس کی تین طرف کھڑکیاں کھلتی تھیں اور ہم وہیں سے حرم دیکھ سکتے تھے۔ کمرے کے اندر بھی کعبہ ہماری نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔ سوائے نماز جمعہ کے امیر اور اس کے ساتھ مسجد الحرام میں نماز ادا کرنے نہیں جاتے تھے۔ ابتداء میں تو میں زیادہ تر ان کھڑکیوں کے قریب رہتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ عام لوگوں کی نظروں سے بچ کر رہوں۔

یہ سفر نامہ چونکہ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے لکھا گیا ہے جو اسلام اور مکے کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتے ہیں اس لیے تفصیلات میں جانے سے پہلے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ حج کے بارے میں بتا دوں کہ حج کیا ہے۔ میں اس کے ساتھ ساتھ مکے میں اپنی حیثیت کے بارے میں بھی بتانا چاہوں گا۔ میں نے یہاں آنے سے قبل اکثر یہ سنا بھی تھا اور میرا اس بات پر یقین بھی تھا کہ ہر سال مکہ میں جمع ہونے والے بیشمار مسلمان حج کی ادائیگی کے لیے یہاں آتے ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ یہاں ایک قسم کا میلہ لگتا تھا اور دراصل لوگ یہاں تجارت کے لیے آتے تھے۔ مگر آج جب میں خود طویل سفر کے بعد یہاں پہنچا ہوں تو مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی۔ حج ایک فریضہ ہے جو ایک مذہبی فریضے کے طور پر ادا کیا جاتا ہے اور یہ ایک مذہبی عقیدے کا حصہ ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حج ادا کیا تھا۔ میں پورے یقین کے ساتھ

کہہ سکتا ہوں کہ ایک بہت مختصر اور محدود سی تعداد عارضی دنیاوی مفادات کے لیے حج کا سہارا لیتی ہوگی۔

میرا بہروپ: میں نے اپنے لباس اور حُلیے سے اپنے آپ کو ہندوستان کے شہر بمبئی کا باشندہ ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی۔ البتہ ایک دو بار میں ایسا کرنے میں ناکام ہوا تو مجھے یہ کہانی گھڑنے کی ضرورت پیش آئی کہ میں حال ہی میں حلقہ بگوش اسلام ہوا ہوں۔ مجھ سے ملنے والے یہ کہانی سن کر میری بے حد عزت کرنے لگتے تھے۔ مجھے ایسے موقعوں پر میرا ضمیر ملامت کرتا تھا اور مجھے اپنی منافقت پر تکلیف ہوتی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ اس میں ایک بار داخل ہو جانے کے بعد اب واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ مجھے اب چار و ناچار یہ ساری مشکل برداشت کرنی تھی۔ شروع شروع میں مجھے اکثر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں ایک شعبدہ باز، فریبی اور مکار ہوں۔ ایک بار میں نے کسی ملاح کو دوسرے ملاح سے یہ کہتے سنا تھا: ''جیک تم نے یہ جھوٹ اکثر بولا ہے اور تمہیں یہ معلوم ہے''۔ مجھے بھی اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کوئی ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ چنانچہ اب میرے ساتھ جو معاملہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں، میں ایک پیدائشی عرب جیسا سچا مسلمان بن چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے اپنے جھوٹ کو چھپانے میں کامیاب اداکاری کی تھی۔ میں نے اپنا جو نام اختیار کیا تھا اس کا مطلب تھا رسول کا غُلام...... ہندوستان میں یہ نام عام تھا مگر اس کے باوجود میرے قافلے کے وہ لوگ جو قدامت پسند اور کٹر مسلمان تھے وہ اس نام پر خوش نہ تھے، ان کا کہنا تھا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اللہ کے غلام نہ تھے۔ مجھے خیال آیا میرا یہ نام بار بار زیر بحث لایا جائے گا اس لیے میں نے غُلام کو ہٹا کر نیا نام محمد امین رکھ لیا تھا۔ مجھے یقین تھا اب کوئی بھی مسلمان اس نام پر بحث نہیں کرے گا۔ مجھے رفتہ رفتہ یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں عقیدے کا فرق پایا جاتا تھا۔ میں وہابیوں سے بھی واقف ہوں، اہل وسیلہ سے بھی، مگر شافعی میرے لیے کبھی پُراسرار نہیں بنے البتہ ''شاکر'' میرے لیے ایک معما ہیں۔ بطور ایک ہندی کے ممکن ہے مجھ تک یکطرفہ معلومات پہنچی ہوں مگر میں کوشش کروں گا کہ حاجی محمد امین کے طور پر جو ایک سُنی مسلمان ہے اور جس کا تعلق ایک ''معقول طبقے'' سے ہے اپنی روداد صحیح صحیح آپ کے مطالعہ کے لیے پیش کروں۔

مکہ مکرّمہ میں قیام: میں اب مکہ میں مقیم تھا اور ایک ایسے حاجی کی عام سی زندگی بسر کر رہا تھا جسے ''حج اکبر'' کا انتظار تھا۔ آٹھ دس روز کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اب میں گلیوں بازاروں میں آزادی سے

گھوم سکتا ہوں اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بھی نہیں بنتا۔ اب لوگ، میری سفید رنگت کو بھی تجسس بھری نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ عربی زبان سے لاعلمی بھی میرے لیے کوئی مشکل نہیں پیدا کرتی تھی کیونکہ یہاں بہت سی قوموں کے، کئی زبانیں بولنے والے لوگ جمع تھے۔ میں ان زبانوں کا شمار کرنا چاہوں تو نہ کرسکوں گا۔ مجھے کسی بھی ھندی ٹی سٹال پر تاتار، ملایا، حبشہ کے لوگ نظر آتے تھے آپ کا لباس بھی کسی کو آپ کی طرف متوجہ نہیں کرے گا البتہ ایک احتیاط ضروری ہے کہ ایسا فاخرانہ لباس پہن کر باہر نہ نکلیں جسے دیکھ کر بھکاری آپ کا پیچھا نہ چھوڑیں۔ بصورت دیگر کینٹر بری کا لاٹ پادری بھی اگر طواف کر رہا ہو اور اپنے چوغے میں ملبوس ہو تو کوئی اسے دیکھ کر اس پر جملہ نہیں کسے گا کیونکہ اس قسم کے لباس میں ملبوس بیسیوں اور افراد بھی نظر آئیں گے۔

رمضان المبارک رُخصت ہو گیا: ماہِ رمضان میں عام مہینوں کی نسبت زیادہ لوگ طواف کرتے نظر آئے حالانکہ ابھی مزید لوگوں کی آمد متوقع تھی۔ 2 رمضان المبارک کو نماز مغرب کے وقت تیس ہزار سے کم لوگ نہ تھے۔ کیا رُوح پرور منظر تھا، ہزاروں افراد کا مجمع، باریش، پگڑیوں والے، خانہ کعبہ کے گرد طواف میں مصروف پھر نماز میں امام صاحب کے پیچھے صف آرا، اللہ کی حمد اور ثنائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈُوبے ہوئے! پھر یکا یک آواز آتی ہے: ''اللہ اکبر''...... جذبات کا ایک سیلاب ہے کہ روکے نہیں رُکتا، بس عصیاں کو دھوتا چلا جاتا ہے، بہائے چلا جاتا ہے...... سب بیک وقت سربسجود ہوتے ہیں، اپنی اپنی جبینِ نیاز زمین پر رکھ دیتے ہیں...... بندگی و عاجزی کا یہ سلیقہ کہاں سے آیا، انہیں کس نے سکھا دیا، دیکھنے والی آنکھ دیکھتی رہ جاتی ہے اور محسوس کرنے والا دل ان کے نصیب پر رشک کرنے لگتا ہے۔ میں اکثر اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھتا ہوں اور بے خیالی میں اپنے سامنے موجود منظر کی لپیٹ میں چلا جاتا ہوں۔ ایسا منظر اس سے قبل میری نظروں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس وقت کعبہ کھلا ہوا تھا مگر میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں اندر داخل ہو جاؤں حالانکہ میں کئی روز بعد ایک موقعہ پر میں اس کے اندر چلا گیا تھا۔ تین ہفتوں کے بعد مجھے ساری باتوں کا صحیح صحیح علم ہو گیا تھا۔

شہر اور اس کی مسجد: شہر مکہ ان پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا ہے جو پانچ سے سات سوفٹ تک اونچی ہیں۔ ان کی سطح سمندر سے بلندی بارہ سے پندرہ سوفٹ تک ہے۔ اس پوری وادی کی وسعت ڈیڑھ میل لمبائی اور ایک میل کی ایک تہائی چوڑائی پر مشتمل ہے۔ اس کے اندر تمام ڈیزائنوں کی چھوٹی بڑی عمارتیں ہیں

جن میں کوئی ترتیب نہیں رکھی گئی۔ پہاڑیوں کے اوپر جانے کے لیے یہاں وہاں سے راستے بنا دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں اکا دکا مکان کسی پہاڑی کی چوٹی پر بھی تعمیر کر لیا گیا ہے۔ جس کی چھت مسطح ہے، یورپی آنکھ کو بے چھت کا گھر دکھائی دیتا ہے۔ اس پر نصف پلستر دکھائی دیتا ہے کیونکہ یہاں کی آب و ہوا اور موسموں کی وجہ سے پورے گھروں کو پلستر نہیں کیا جاتا۔ مکانوں کی دیواریں ناتراشیدہ پتھروں اور روڑے اینٹوں سے بنائی جاتی ہیں جن کی موٹائی تین سے چھ فٹ ہوتی ہے۔ مزید اونچی عمارتوں میں یہ اور موٹی تہ میں ہوتی ہیں لیکن ان میں پتھر صرف کھڑکیوں یا کواڑوں کی لکڑی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور اینٹوں کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ دیواروں کی اس موٹائی کے باوجود راستوں کے کنارے شہر میں بوسیدہ اور گرنے والی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ بہت سے مکانات زیادہ اونچے ہیں جیسے کارخانے ہوں اور ان میں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بہت رکھی جاتی ہیں۔ ساتھ ساتھ بنے ہوئے دو مکان بہت کم ایک ہی جتنے اونچے ہوتے ہیں اور ان کا رخ بھی ایک جانب نہیں ہوتا۔ کسی گلی یا ایک ہی قطار میں تعمیر شدہ مکانوں کے طرز تعمیر میں فرق دکھائی دیتا ہے۔ کہیں بھی مجھے گھروں کے درمیان ایک سو گز خالی زمین نظر نہ آتی تھی، البتہ شہر سے باہر صورت حال مختلف ہے جہاں آبادی زیادہ گنجان نہیں مگر وہاں بھی بے ترتیبی ویسی ہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ اصول پیش نظر رکھا گیا ہے کہ کوئی سی دو چیزیں ایک جیسی نہ ہوں۔ مکہ میں ہر شے کے اندر وہ مشرقی خاصیت رکھی گئی ہے کہ عدم یکسانیت کا مقررہ قانون کارفرما ہے۔ اس شہر کا زیادہ حصہ چٹانی پتھروں سے بنا ہے جس میں تیس فیصد سستا چونا استعمال ہوا ہے۔ تاریک گلی کوچوں میں ایسا لگتا ہے جیسے سیاہ فام لوگوں کا ہجوم اُمڈ آیا ہے۔ ان مکانوں کو دیکھ کر ایک ہی تشبیہ دینے کو جی چاہتا ہے کہ جیسے چیونٹیوں نے اپنی بستی بسا لی ہو۔ اس عدم یکسانیت کے اندر ایک یکسانیت بھی پائی جاتی ہے وہ یہ کہ اس کے درمیان سے اگر نظریں کسی جگہ گاڑ دی جائیں تو وہاں حرم نمایاں طور پر سامنے آ جاتا ہے اور بیشک مکہ کی یہی ایک خاص بات ہے۔

میں نے مختلف عمارتوں، راستوں اور گلی کوچوں کی پیمائش کے لیے اپنے پاس ایک بانس کی ایک گز لمبی چھڑی رکھی ہوئی تھی۔ کسی کو شائبہ تک نہ ہوتا تھا کہ رات کے وقت طواف کعبہ میں مصروف ایک شخص پیمائش بھی کرتا جا رہا ہے۔ عمارتوں کی بلندی میں ان کے سایے سے نکال لیتا تھا۔ میں نے جہاں کہیں بھی پیمائش فٹوں میں دی ہے وہ درست ہے اور میں اسے اسی وقت نوٹ بھی کر لیتا تھا جب پیمائش کرتا تھا۔ مشاہدہ اور استفسار ہی اب ایسی چیز تھا جو مجھے اپنی شناخت یاد دلاتا تھا۔ میں اپنے گرد و نواح سے اس قدر مانوس ہو گیا تھا

اور حالات کے مطابق میں نے اپنے آپ کو اس قدر تیزی کے ساتھ ڈھال لیا تھا کہ یہاں صرف چھ ہفتے گزارنے کے بعد میں کسی ایسے مسلمان کی طرح محسوس کرتا تھا جو پیدائشی مسلمان ہو۔ میں نے دوست بھی بنا لئے تھے اور گھر کے اندر میرے حاسدوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ ہم سب کی دلچسپیاں ایک جیسی تھیں، مفادات یکساں تھے اور ہم کھاتے بھی ایک ہی پلیٹ میں سے تھے۔ ہم جس بڑی طشتری کے اندر مل کر کھاتے تھے اس میں میرے ساتھ ایک نابینا مولوی اور ایک ایسا شخص شامل تھا جس کے دائیں ہاتھ کی صرف دو انگلیاں تھیں۔ یہ واحد شخص تھا جس کے ساتھ کوئی مسلمان ہی ہم نوالہ ہو سکتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم سب کمرے کے وسط میں ایک چراغ کے گرد بیٹھ جاتے، مٹھائیاں کھاتے، حقے کے کش لیتے اور ایک دوسرے کو قصے کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ مجھے یہیں سے حقے کی لت پڑی تھی۔ ایک صراحی نما برتن میں پانی ہوتا تھا اور جس ٹیوب سے کش لیا جاتا تھا اس میں دھواں پانی کے اندر سے گزر کر آتا اور ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ جب حقہ پینے والا کش لیتا ہے تو دھواں سیدھا پھیپھڑوں میں جاتا ہے جس سے ایک خاص سرور آتا ہے، البتہ اس کے نئے نئے عادی ہونے والے کو کچھ تکلیف بھی ہوتی ہے۔

کبھی کبھی میں اِس خاص سٹائل سے کہانی سنایا کرتا تھا: امیر مجھ سے سوال کرتا ہے ''محمد امین آپ بہت سے ملکوں میں گئے ہیں.....؟'' .....'جناب' میں بالکل گیا ہوں کیونکہ میرا تو کام ہی سیاحت ہے'' .....''میں نے سنا ہے سمندر میں ایک بہت بڑی مچھلی ہوتی ہے، شاید بحری جہاز سے بھی بڑی؟'' .....''جی ہاں میں نے خود دیکھی ہے اور جنوبی ہندوستان کے سمندر میں، ان کا میں نے شکار بھی کیا ہے''۔ پھر یہ سلسلہ وھیل تک پہنچتا اور ہر شخص ہمہ تن گوش میری کہانی سے زیادہ میرے انداز بیان میں کھو جاتا تھا۔ درمیان میں کبھی کبھی امیر بڑے چبھتے ہوئے سوالات پوچھ بیٹھتا تھا یا میں کسی ایسے ملک کا ذکر لے بیٹھتا جہاں چھ چھ ماہ تک سورج غروب ہی نہیں ہوتا، جہاں برف ہی برف ہوتی ہے ہر طرف، ایک انچ زمین بھی برف کے بغیر نہیں ملتی۔ امیر مجھ سے پوچھتا ہے: ''اچھا! دنیا میں کوئی ایسی زمین بھی ہے؟'' .....''جی ہاں'' ..... ''مگر یہ بتاؤ اگر وہاں برف کے سوا کچھ بھی نہیں تو جہاز وہاں کیوں جاتے ہیں؟ یہ پہیلی لگتی ہے اور وہاں بیٹھے ہوئے افراد کا پورا حلقہ بیک زبان بول اٹھتا ہے: ''جی ہاں، جی ہاں'' اور پھر وہ سوالیہ نظروں سے مجھے گھورنے لگتے ہیں۔

''دراصل وہاں دو اونٹوں کے برابر ایک بڑا سا جانور رہتا ہے جسے فیل البحر (والرس) کہتے ہیں۔ اس کا جسم بیل کا، پاؤں مگر مچھ کے، سر چیتے کا، دانت ہاتھی جیسے اور دُم مچھلی کی ہوتی ہے۔ یہ بہت موٹا ہوتا ہے اور ہم

دراصل ان کے شکار کے لیے گئے تھے''۔ ہر چہرے سے لگتا تھا کہ انہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا کہ امیر یہ کہہ کر سب کو خاموش کرا دیتا ہے۔

''بہت خوب! مگر یہ بتاؤ کہ اس قدر موٹا ہونے کے لیے وہ کھاتا کیا ہے؟'' ''سمندری مچھلی!''۔ اب سب مل کر فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہیں اور سب کے منہ سے نکلتا ہے ''خداوندا! یہ تو جھوٹوں کا باپ ہے''۔ میں نے ایسی ہی بہت سی کہانیاں انہیں خوش کرنے کے لیے گھڑ لی تھیں اور مجھے یہاں، دوسری جگہوں کی طرح یہ پتا چلا کہ حقیقت اور سچائی پر فسانہ دفسوں سے کم یقین کیا جاتا ہے۔

لیڈی وینس: میں مجموعی طور پر ناخوش بالکل نہیں تھا۔ مجھے اپنے مسلم دوستوں کے ساتھ گزاری ہوئی کئی خوشگوار شامیں آج بھی یاد ہیں۔ میں ان کو پسند تھا اور یہ بھی مجھے ایک بے ضرر سا انسان سمجھتے تھے۔ میری طرف سے مذہبی رسوم کی باقاعدگی سے ادائیگی انہیں اچھی لگتی تھی۔ میں اپنی مذہبی سوجھ بوجھ اور علمیت سے نابینا مولوی کو بھی حیرت زدہ کر دیتا تھا۔ وہ میری اصول پسندی کو بنظرِ تحسین دیکھتا تھا۔ یہ میں جانتا تھا کہ میں نے پوری عمر ایسے لوگوں میں گزاری تھی جو صرف نام کے مسلمان تھے اور میں زیادہ پڑھا لکھا انسان نہیں تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کے علاوہ بھی کئی افراد سے شناسائی پیدا کر لی تھی جن میں سے ایک وہ بوڑھا حجام تھا، میں جس کے پاس ہفتے میں دو دفعہ جا کر سر منڈواتا تھا، اسے باتیں بہت آتی تھیں۔ مجھے پتا چلا تھا کہ یہ کسی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں سپاہی تھا۔ یہ بہت مجلسی تھا اور بمبئی سے متعلق بڑی معلومات رکھتا تھا۔ وہ مجھ سے ہندوستان کا ذکر کرتا تو بعض لوگوں کو ''شیطان انگریز'' کے نام سے یاد کرتا تھا۔ مگر اس کے دل میں ان کے لیے بڑی محبت تھی۔ میں اب ایک مسلمان کی حیثیت سے ان انگریزوں کو پسند نہیں کرتا تھا مگر میں اس کا اندازہ اسے نہ ہونے دیتا تھا۔

ایک روز جب اس حجام کی دُکان پر گاہک کم تھے تو اس نے گزشتہ گفتگو کے حوالے سے مکہ مکرمہ میں موجود ایک انگریز خاتون کا ذکر کیا جو لیڈی وینس کے نام سے مشہور تھی۔

یہ سن کر میری آنکھیں کھل جانی چاہئے تھیں، یہ الگ بات تھی کہ میں نے عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے بات کو ٹال دیا تھا۔ میں نے پوچھا: ''یہ خاتون کب سے مکہ میں ہے''۔

''کئی برسوں سے''۔ ''یہ خاتون کس کے حرم کی زینت ہے؟''۔ ''کسی کے بھی حرم میں نہیں ہے۔ یہ سینے کا کام کرتی ہے اور ایک نواب نے اسے اپنے حرم کے گھر کا ایک کمرہ دے رکھا ہے اور یہ اس کے عوض اس نواب کا

کچھ کام بھی کر دیتی ہے، یہ ایک بوڑھی خاتون ہے"۔ "میرے خیال میں یہ انگریز خاتون نہیں بلکہ آدھی انگریز ہے" میں نے لقمہ دیا۔ حجام نے جواب دیا:

"نہیں وہ انگریز ہے، کیا آپ اس سے ملنا پسند فرمائیں گے؟"

"ہاں، میں اس سے انگریزی میں بات کروں گا اور مجھے معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون ہے"۔ میں یہ بات کسی سے نہیں چھپاتا کہ میں عیسائیوں کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ معلوم نہیں وہ حجام اس انگریز خاتون کے اصل انگریز ہونے کا ذکر کر کے مجھے آزما رہا تھا یا ایسا اس نے برسبیل تذکرہ کیا تھا میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ نیتوں کا مالک تو خدا ہے ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ اس نے اپنے برادرِ نسبتی (ایک مولوی صاحب) کے گھر پر اگلے روز 2 بجے ہماری ملاقات کروانے کا انتظام کر دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ انگریز خاتون وہاں ضرور آئے گی۔ میرے خیال میں اس بوڑھے نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کام کے لیے اسے ہم دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے بخشش ضرور ملے گی۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا تھا اسے بخشش مل گئی تھی۔ میرے لیے اس رات کے بارے میں ایک بات ایسی تھی جس پر مجھے غور کرنا تھا۔ وہ بات یہ تھی کہ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ ایک انگریز عورت اتنے عرصے سے مکے میں قیام پذیر ہے، یہ ناممکن بات تھی۔ مجھے خیال آیا میں خود بھی تو یہاں ہوں اور مجھے یہاں پہنچنے میں کوئی دقت بھی نہیں ہوئی......

انٹرویو: میں نے اپنے جوتے اتارے اور کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے ہیلو کہا۔ جواب ملا: "تشریف رکھیے، تشریف رکھیے"۔ میں فرش پر اس خاتون کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ یقیناً مجھے دیکھتے ہی میرے بارے میں، میرے اصلی کردار کے بارے میں سمجھ گئی تھی۔ مجھے یہ انٹرویو دینا بڑا کٹھن لگا تھا۔ چند منٹ تو ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے، وہ حجاب میں تھی اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنا ہاتھ زیرِ نقاب لے گئی ہے اور اپنے آنسو پونچھ رہی ہے۔

اب مولوی صاحب نے اس سے عربی میں بات کی اور مجھ سے انگریزی میں چند سوال پوچھنے کے لیے کہا، مثلاً نام، وطن، عمر، ملازمت کے بارے میں۔ میں نے ہر سوال کا جواب انگریزی میں دیا تاکہ مولوی صاحب کو یقین آ جائے۔ جب مجھ سے یہ پوچھا گیا کہ میں مکے کیسے پہنچا تو میں نے جواب دیا: "یہ بات خدا نے میرے ذہن میں ڈال دی تھی" اس نے کہا "نہیں خدا نے یہ بات تمہارے دل میں ڈال دی تھی"۔ میں نے اپنے آپ کو محفوظ سمجھا اور زیادہ آزادی کے ساتھ بات کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس

خاتون کی خواہش پر ہم نے اپنی دلچسپی کے موضوعات پر ہندی میں گفتگو شروع کر دی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ وہ 1858ء سے مسلمانوں میں رہ رہی ہے۔ اس نے مجھے نصف گھنٹے کی بات چیت کے دوران یقین دلا دیا تھا کہ وہ واقعی ایک تعلیم یافتہ انگریز خاتون ہے۔ جب وہ جانے لگی تو میں نے اس سے اجازت طلب کرتے ہوئے انگریزی میں پوچھا کہ کیا میں اس سے ہاتھ ملا سکتا ہوں۔ اس نے جواب دیا: ''نہیں''۔ اس نے مجھے حرم کعبہ کے اس حصے کے بارے میں بتایا جہاں وہ عبادت کیا کرتی تھی۔ اس نے مجھے یہ اجازت بھی دی تھی کہ میں اسے وہاں کسی بھی روز نماز ظہر کے وقت مل سکتا ہوں۔

میں جب واپس کمرے میں پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ امیر نے اچانک یروشلم جانے کا پروگرام بنالیا ہے اور دو دن بعد وہ اس طویل سفر پر روانہ ہوں گے۔ مجھے اور چار ساتھیوں کو حکم ملا کہ اس کی واپسی تک ہم اس گھر میں رہیں گے۔ مجھے اس کی بالکل توقع نہ تھی کہ جب تک حالات بہتر نہیں ہو جاتے یہ وہاں جائیں گے۔ اونٹوں کو کرایے پر حاصل کر لیا گیا تھا۔ تیاری بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ مگر وہ پروگرام کے مطابق اس سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ وہ بار بار کچھ نہ کچھ بھول جاتے اور راستے سے مڑ کر لینے آتے تھے یہاں تک کہ وہ اتنی دور جا چکے تھے کہ اب کوئی پیچھے بھولی ہوئی شے یاد بھی آئی تو اسے لینے کے لیے مڑنا آسان نہ رہا تھا۔ سب سے آخر میں جو فراموش شدہ شے آدمی بھیج کر منگوائی گئی وہ امیر کی گھڑی تھی۔ یہ سونے کی بہت قیمتی گھڑی تھی۔ یہ گھڑی اس قالین کے نیچے سے ملی تھی جہاں امیر اس سفر پر روانہ ہونے سے قبل افیون کھا کر سویا ہوا تھا۔ دراصل میرے تمام ہندی ساتھی افیون کے عادی تھے۔ جب کبھی کوئی ضرورت پیش آتی یہ معمول کی مقدار میں ذرا سا اضافہ کر دیتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ خدا انہیں معاف فرمائے گا۔

مقامِ مُلاقات: پچھلے تین دنوں میں مجھے بالکل وقت نہ ملا تھا کہ میں لیڈی وینس سے ملنے جا سکتا۔ مجھے جونہی وقت ملا میں اس سے ملنے چلا گیا تھا۔ کوئی بھی شخص جو مسلمانوں کی سماجی عادات سے واقف ہے ضرور اس حسد، روایتی یا غیر روایتی کو جانتا ہوگا جو مردوں میں عورتوں کے حوالے سے پایا جاتا ہے مگر انہیں حیرت ہوگی کہ میں اس خاتون کے ساتھ عام لوگوں کی نظروں کے سامنے پھرتا تھا مگر پھر بھی کسی کی اس طرف توجہ نہ ہوتی تھی کیونکہ میرا رویہ ہی ایسا تھا۔ مکہ مکرمہ میں عورتوں کو بڑی آزادی حاصل ہے۔ حرم میں کی جانے والی بہت سی احتیاطی باتوں میں بھی نرمی برتی جاتی ہے۔ متمول خواتین عبادت گاہ میں اپنے محرم کے بغیر بھی جا سکتی ہیں۔ یہ مردوں کے درمیان نماز بھی ادا کر سکتی ہے، اور حرم کا کوئی حصہ ان کے لیے الگ مخصوص نہیں کیا گیا

جیسا کہ ہر دوسری مسجد میں کیا جاتا ہے۔

امیر کی روانگی کے دوسرے روز، میں حرم کے اُس حصے میں گیا جہاں اس نے بتایا تھا کہ وہ ظہر کے وقت مل سکتی ہے۔ جب مجمع چھٹ گیا تو مجھے اپنی بائیں جانب ایک خاتون تنہا بیٹھی نظر آئی۔ میں نے سمجھا یہ لیڈی وینس ہے اور میں اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے لباس میں چھپے ہوئے ہاتھوں کو بلانے کے انداز میں حرکت دے رہی ہے۔ وہ پھر اٹھی اور حرم سے باہر چلی گئی۔ میں بھی تھوڑے فاصلے پر اس کے پیچھے گیا۔ ہم اس طرح ایک چوتھائی میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ وہ ہر موڑ مڑنے سے قبل پیچھے دیکھ لیتی تھی۔ وہ رک گئی اور میں اس دوران اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے اچانک مجھے انگریزی میں مخاطب کر کے، اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اب ہم ایک ہندی دوست کے گھر جا رہے تھے جہاں ہم بلا کسی کی مداخلت کے جتنی دیر چاہتے بات کر سکتے تھے۔

تقریباً دو سو گز چل کر جانے کے بعد ہم ایک تنگ گلی میں داخل ہوئے جہاں ایک ترک سنتری ڈیوٹی دے رہا تھا۔ یہاں اس خاتون نے اونچی آواز میں عربی میں بولنا شروع کر دیا تھا۔ میں بھی اسے عربی میں جواب دے رہا تھا۔ میں نے پوری کامیابی کے ساتھ یہ تاثر دیا تھا کہ میں عربی میں مافی الضمیر ادا کر سکتا تھا۔ اس نے ہمارے لیے چائے بنائی، مجھے حقہ پیش کیا اور ہمیں بٹھا کر خود چلا گیا۔ ہم نے انگریزی میں کھل کر گفتگو کی۔ ہم ہنسے بھی، مسکرائے بھی اور وہ خاتون تو روئی بھی۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے برسوں بعد اپنی مادری زبان میں باتیں کی تھیں۔ میں بھی معلوم نہیں کیا اول فول بکتا رہا، محض باتوں کو طول دینے کے لیے جو ذہن میں آتا بولتا رہتا۔ ہم ایک دوسرے سے سوالات کرتے رہے اور ایک کا جواب ملنے سے قبل دوسرا سوال کر دیتے تھے۔

ہم نے تین گھنٹے اکٹھے گزارے۔ پھر وہ ہندی میزبان آ گیا اور ہم نے رخصت چاہی۔ الوداع کہنے سے قبل اس خاتون نے نقاب اٹھا کر اپنا چہرہ مجھے دکھایا، جو اسی قدر ایک انگریز خاتون کا چہرہ تھا جس قدر میرا، ایک انگریز مرد کا۔ ہم نے ہاتھ بھی ملایا اور طے یہ پایا کہ عبداللہؓ نامی لڑکا ہماری خیریت کی اطلاع ایک دوسرے کو دیا کرے گا۔ ہم مختلف راستوں سے اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔

ایک یاددہانی: ایک روز میں شہر کے مضافات میں ایک بڑے کالج کے قریب سے گزر رہا تھا کہ میں نے 150 طلبہ کو جن کی عمریں 5 سے 15 برس کے درمیان تھیں باہر کھیلتے دیکھا۔ میں انہیں کھیلتا دیکھ کر رک

گیا۔ وہ ہنٹے بھی کھیل رہے تھے جو انگریز لڑکے نہیں کھیلتے۔ اس دوران ایک ہندی لڑکا میرے قریب آ کر چلایا: "ارے اسے دیکھو یہ ایک عیسائی ہے!"۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس شیطان کے بچے کے ذہن میں یہ کیسے آیا تھا۔ ممکن ہے اس نے ہندوستان میں انگریز دیکھے ہوں اور میری ان سے مُشابہت نے اسے یاد دلایا ہو کہ میں بھی انگریز ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے محض شرارت کے طور پر ایسا کیا ہو مگر مشرقی لڑکے عموماً شرارتاً ایسا نہیں کرتے۔ میرے ساتھ ایسا معاملہ آج تک چونکہ کبھی پیش نہ آیا تھا اس لیے میں پریشان ہو گیا تھا۔ اس سے پڑوس کے وہ تمام نوجوان وہاں جمع ہو گئے تھے جن کے کانوں میں اس ہندی لڑکے کی آواز پڑی تھی۔ ان میں سے ایک جو بہت تند مزاج نظر آتا تھا۔ آگے بڑھا اور مجھ سے یوں مخاطب ہوا: "او کرسچین تُم اگر تم مسلمان ہو تو اپنے مذہب کا اعتراف کیوں نہیں کرتے"۔

میں طبعاً صُلح جو اور امن پسند واقع ہوا ہوں۔ میں ایک منٹ کی لڑائی کے بجائے ایک میل بھاگ جانا بہتر سمجھتا ہوں مگر نہ جانے کیوں زندگی بھر مجھے لڑائیوں میں گھسیٹ لیا جاتا رہا ہے۔ شاید اس لیے کہ میں دیکھنے میں ایک ایسا کمزور اور مسکین سا انسان نظر آتا ہوں جس پر غلبہ پانا ہر کس و ناقص کو آسان دکھائی دیتا ہے۔ میں نے اس نوجوان کو کندھوں سے پکڑ کر اسے چکر دے کر اس کے چوتڑ پر پاؤں سے ٹھوکر ماری جس سے یقیناً اسے دن میں تارے نظر آ گئے ہوں گے۔ میرا خیال ہے میں نے ایک غیر اسلامی حرکت کا ارتکاب کیا تھا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھے طیش میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ مار کھانے والے نے چلا کر کہا: "ہاں تم عیسائی ہو"۔ اور سب نے یہی جملہ دہرایا۔ میں نے اب عافیت اسی میں سمجھی کہ وہاں سے غائب ہو جاؤں۔ مگر اس سے پہلے کہ میں بھاگنے کی کوئی ترکیب سوچتا، لڑکوں نے مجھ پر پتھروں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ لڑکے ایک عیسائی کو سنگسار کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ان میں پہلی صدی کے یہودیوں کا سا جوش و جذبہ پایا جاتا تھا۔ مجھ پر ہر سمت سے پتھر برس رہے تھے اور میں اس سنگ باری میں زخمی ہو چکا تھا اور ہاتھوں سے اپنے چہرے کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں اس طرح سنگسار ہو گیا تو میرے بعد میرے بارے میں کیا کیا انکشافات ہوں گے۔ ایک چھوٹا سا غریب بچہ ایک بہت بڑا پتھر اٹھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر دوڑا اور ایک لمبی دیوار کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس کی طرف پیٹھ کر لی اور اس چھوٹے لڑکے کو بطور ڈھال اپنے سامنے کھڑا کر لیا تھا۔ مجھے اذیت پہنچانے والے ایک لمحے کے لیے حیران و پریشان رہ گئے تھے۔ وہ ایک بار پھر میری طرف بڑھے تاکہ ابراہیم کو ہمیشہ

گرفت سے آزاد کرا سکیں۔

بیچارہ ابراہیم ایک خوبصورت لڑکا تھا اور مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ میں ابراہیم کو ان کے حوالے کر کے ایک بار پھر اپنی جان بچانے کی خاطر دوڑا۔ ایک ترکی گارڈ ہاؤس قریب تھا اور میں بھاگ کر اس کے اندر چلا گیا تھا۔ میرے بازو اور ٹانگیں زخمی تھیں اور میں سنتری کے پیچھے بے سدھ گرا پڑا تھا۔ تاہم اب میں وقتی طور پر محفوظ تھا۔ اب یہ معاملہ بہت گھمبیر صورت اختیار کر سکتا تھا۔ اس دوران باہر عرب اور حبشی نوجوانوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ ترک گارڈ جب لفظ کرسچین سنتے تو ان کی غضبناک نظریں مجھے کھانے کو دوڑتی تھیں۔

ایک سپاہی گیا اور ایک افسر کو بلا لایا۔ ایک نوجوان لیفٹیننٹ اس کے ہمراہ آیا تھا جو دیکھنے میں بے حد مہذب تھا۔ اسے اس کی پیرس ڈیزائن کی یونیفارم میں دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ میرے قریب آیا اور مجھ سے فرانسیسی زبان میں کچھ پوچھنا چاہا۔ میں نے جواب دیا: ''میں ترکی نہیں بول سکتا''۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یہ کہتے ہوئے میں باہر نکل آیا جہاں میری نظر ایک پرانے دوست پر پڑی...... یہ ایک عرب تاجر تھا جو غلاموں کی تجارت کرتا تھا۔ اس نے میرے امیر کے ساتھ مل کر میری سگریٹ کی کئی ڈبیاں پھونک ڈالی تھیں۔ اس نے اپنی چھڑی لہرائی اور ان نوجوانوں کے پیچھے بھاگا جو وہاں جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان کا تعاقب بھی کر رہا تھا اور انہیں لعنت ملامت بھی کرتا جا رہا تھا۔ اب سب لوگ میرا ساتھ دے رہے تھے اور اس دوست نے مجھ سے معذرت چاہی کہ نوجوان نسل میں جوش و جذبہ بہت پایا جاتا ہے جو درست نہیں۔ اب تو اس ترک سنتری نے بھی ان لڑکوں کو پتھر پھینک کر بھگانا شروع کر دیا تھا۔ لفٹیننٹ نے مجھے عقبی دروازے سے وہ راستہ دکھایا جس پر چل کر میں کسی خرابی سے دوچار ہوئے بغیر گھر پہنچ سکتا تھا۔

میں گھر آتے ہوئے راستے میں ایک کافی ہاؤس میں چلا گیا تھا تاکہ اپنی حالت ٹھیک کر لوں اور اگر کوئی پوچھے کہ تمہاری یہ ہیئت کذائی کیسے بنی، تو جواب یہ دوں کہ اپنے گدھے سے گر گیا تھا۔ کافی پینے کے بعد میں نے حقے کا کش بھی لگا لیا تھا جس سے میری حالت سنبھل گئی تھی۔ اب میں لنگڑاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا تھا۔ میری کمر پر اور جسم کے دوسرے حصوں پر جو زخموں کی خراشیں آئی تھیں ان سے اب ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ چہرہ محفوظ رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گھر پہنچ کر میں لیٹ گیا تھا اور ساتھیوں نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔ مجھے اب یہ ڈر کھائے جا رہا تھا کہ معاملے کی تحقیق کے لیے کوئی میرے گھر نہ پہنچ جائے اور اگر کسی کو

شک وشبہ ہو گیا تو میں اپنی صفائی کیسے پیش کر سکوں گا۔

میں نے اپنے ساتھیوں کے سامنے عذر یہ پیش کیا تھا کہ مجھے بخار ہو گیا تھا اور میں کچھ دیر کے لیے کمرہ بند کر کے سونا چاہتا ہوں تا کہ کوئی مجھے ملنے نہ آئے نہ ہی شور ہو۔ میں اس کمرے میں امیر کی واپسی تک رہا، تھوڑی دیر کو باہر نکلتا پھر اسی میں آ جاتا اس طرح تین ہفتے گزر گئے تھے۔ اس دوران کئی لوگوں نے دوستانہ انداز میں میری خیریت دریافت کی۔ میں درد سے نجات پانے کے لیے افیون کھا رہا تھا۔ جوں جوں یہ اپنا اثر دکھاتی گئی میں اس کی مقدار میں اضافہ کرتا گیا۔ میں اب دن میں صرف ایک وقت کا کھانا کھاتا تھا جو امیر کا سیکرٹری مجھے دیتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں افیون کھا رہا ہوں اور وہ مجھ سے اظہار ہمدردی بھی کرتا تھا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ افیون کا مزید کچھ روز کے لیے استعمال میرے لیے بہتر تھا۔ میں افیون کے فائدے اور نقصانات کی بحث نہیں چھیڑنا چاہوں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ تین ہفتوں سے زیادہ وقت تین دن کی طرح گزر گیا تھا۔ میں بے حد مطمئن اور خوش تھا کہ ہر بات معمول کے مطابق تھی۔

مُشاہدات: اگر حرم میں نماز کے لیے آنے والوں میں سے سب کو ملا کر پھر ان میں سے ایک 100 کو علاحدہ کر لیا جاتا اور ان کا تجزیہ کیا جاتا تو مختلف قومیتیں درج ذیل نسبت سے سامنے آتی تھیں:

تُرک۔6	عرب۔15،	ہندی۔20 ،	ملائی۔5
حبشی۔10،	فارسی۔10 ،	مغربی۔15،	شامی۔6
تاتاری۔5،	بدُو۔3		

اس کے علاوہ چین، افریقا کے مغربی ساحل اور رُوس سے اور درویش نما افراد جن کا تعلق نہ جانے کہاں سے تھا، تعداد میں 5 بنتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں ہندوستان سے آ کر آباد ہو جانے والوں کی تعداد مجھے تیس ہزار بتائی گئی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے مجھے بتانے والے عرب نے اس میں مبالغہ آمیزی کر دی ہو کیونکہ میں خود بھی تو ہندوستان سے آیا تھا۔ اس کے باوجود ممکن ہے یہ تعداد اتنی ہی ہو۔ ہندی عنصر تو عربوں کی نسبت دوگنا بھی ہو سکتا تھا اور ہندوستان سے آنے والے حجاج پورے مشرق سے آنے والے حجاج کے برابر ہو سکتے تھے۔ بدو اور عرب آبادی جو مضافات میں رہائش پذیر تھی، عرفات پر جمع ہونے والے دن تقریباً کم ہوتی تھی۔ بہت سے ہندی یہاں سرکاری ملازم ہیں جو سرکاری محکموں میں اعلیٰ مشاہروں پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے چند ایک تو اعلیٰ

...فاتر ہیں۔

...جنگلی کبوتر یہاں تعداد میں اس قدر زیادہ ہیں کہ شاید ہی اتنی تعداد میں کہیں اور ہوں۔ میں بھی ...نے لگتا تھا اور بڑے اور چھوٹے غولوں کے درمیان تقابلی جائزہ لیتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی میری ...ار سے تجاوز کر جاتی تھی۔ یہ اس قدر انسانوں سے مانوس ہیں کہ بلا خطر ان کے ہاتھوں سے دانہ ...تے ہیں۔ ان کے نہ ڈرنے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ انہیں مقدس سمجھا جاتا ہے، مکہ کے ہر جانور سے ... یہ حرم کی ملکیت تصور کیے جاتے ہیں اور انہیں کبھی نہیں مارا جاتا، نہ ان کا شکار کیا جاتا ہے۔ میں ...انہ ڈالنے حرم میں چلا جاتا ہوں۔ حجاج دانے کی ٹوکریاں بھر کے لاتے اور انہیں کھلاتے ہیں۔ یہ ...پ کے اردگرد اڑتے پھرتے ہیں اور ان کے پروں کی ہوا سے آپ کا لباس اڑنے لگتا ہے۔ شور بہت ہوتا ...ور آپ جلدی جلدی دانے کی ٹوکری خالی کر کے چلے جانے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔ میں تو کبھی کبھی ان ...درمیان بیٹھ جاتا ہوں تاکہ انہیں مجھ پر بیٹھنے کا موقع مل جائے۔ جب ان کے قریب پڑا دانے کا ذخیرہ کم ہو ...ہے تو یہ حرم میں سے اڑ کر متصل بازاروں کا رُخ بھی کر لیتے ہیں۔

مکہ مکرمہ سے عرفات تک: جُمعہ۔ 14۔ دسمبر 1877ء عرفات پر کھڑے ہونے کا دن تھا۔ ...بار حج جمعہ کو آ رہا تھا اس لیے اسے حجِ اکبر کہا جا رہا تھا۔ اس حج کے موقعہ پر عام برسوں کے حج کے مقابلے ...حجاج کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ 13۔ دسمبر کو تمام قومیں جو وادی مکہ میں جمع تھیں، یہاں سے نکل گئی تھیں ...ح کر گئی تھیں۔ چوبیس گھنٹوں میں دو لاکھ حجاج پر مشتمل یہ فوج ظفر موج، جس میں ہر کوئی اپنا جرنیل اپنا ...ور رسد رسانی تھا، مکے سے چلا گیا تھا۔ انہیں مشرق کی جانب 11 میل کا سفر طے کرنا تھا تاکہ عرفات کے ...دان میں جا کر پڑاؤ کر سکیں جو کوہ عرفات کے قریب تھا۔ ہر شخص تیزی میں تھا ہم بڑے آرام سے تیار ہو ...ے تھے۔ نماز فجر کے فوراً بعد اونٹ ہمارے دروازے پر تھے مگر بمشکل گیارہ بجے تک ہم خیمے، سامان اور ...ان خورد و نوش ان اونٹوں پر لاد سکے تھے۔ اس کے باوجود کچھ اہم چیزیں ہم یہیں بھول گئے تھے مثلاً پانی کی ...کیں، نئے احرام وغیرہ۔ ہمیں یہ چیزیں آخری لمحے خریدنی پڑی تھیں۔ ہم خود بھی اونٹوں پر سوار ہوئے اور دو ...گھنٹوں کے بعد ہم نے صرف ایک میل سفر طے کیا تھا۔ کبھی کبھی شگدف پھٹ جاتے تھے اور ان میں سوار ...عورتیں چیخنے لگتی تھیں۔ مرد بھی شکایت کرنے لگتے تھے اور ایسے موقعوں پر اپنی زبان پر قابو رکھنے کے احکامات ...بھول جاتے تھے۔ لبیک لبیک کی صدا گونج رہی تھی، میں بھی اپنی آواز ان آوازوں میں ملا کر بے حد مطمئن

تھا۔ اب ہم شہر سے نکل آئے تھے اور حجاج کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر مکہ سے جانب منیٰ رواں دواں تھا
چھوٹا سا گاؤں ہے جو مکہ سے مشرق کی جانب پانچ میل کی مسافت پر واقع ہے جہاں ہم 3 بجے پہنچے
گاؤں کے مرکز میں ایک گھر کے دو کمرے ہمارے لیے گراؤنڈ فلور پر مخصوص کر دیئے گئے تھے۔
سڑک کی طرف تھا، یہاں سے گزر کر ہمیں عرفات پہنچنا تھا، ہم نے یہاں رات بسر کی۔ منیٰ کی جانب
والی سڑک رفتہ رفتہ ڈھلوان کی طرف چلی گئی تھی۔ ہم پہاڑیوں کے درمیان بنے ہوئے راستے سے گزر
تھے۔ ہمیں یہ سڑک بھی بہتر نظر آئی اور راستے میں ایک دو پانی کے حوض بھی دکھائی دیئے جہاں پانی
تھا۔

منیٰ کا گاؤں وادی میں نہیں بلکہ ایک درے میں واقع ہے جس کی اونچائی دو تین سو فٹ
عرفات روڈ پر درے کے دونوں طرف کم اونچے گھر تعمیر کیے گئے ہیں، یہ سڑک 80 فٹ چوڑی ہے۔
کے کنارے سامان خورد ونوش، چائے یا تمباکو کے سٹال لگا دیئے جاتے ہیں جس نے وقتی طور پر سفید
جیسے سفید لباس میں لوگوں کے ہجوم نظر آئے۔ عورتوں کے لیے اگرچہ احرام باندھنے کی پابندی نہیں لیکن
کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ سفید لباس زیب تن کریں۔

اگلی صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب قالین اور غالیچے لپیٹے جا رہے تھے۔ سورج طلوع ہو
اور نماز فجر کا وقت گزر رہے دیر ہوگئی تھی۔ اس موقع پر سبھی ساتھی ایک دوسرے کی غلطیاں معاف کر رہے
اس لیے کہ وہ چاہتے تھے کہ انہیں ماضی کے تمام گناہوں، کوتاہیوں اور ایک دوسرے کے ساتھ کی گئی زیادتی
کی معافی مل جائے۔ میں نے وضو کیا، دعا کی اور اللہ سے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور عام
میں شامل ہوگیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی گردنوں پر گر رہے تھے اور ہمیں اپنے گناہِ صغیرہ بھی یاد آ گئے تھے
میں سے کئی ایک تو آنکھوں میں آنسو آتے ہی معاف کر دیئے گئے ہوں گے۔ میرے ساتھیوں نے
یاد دلایا کہ میں نے انہیں کس طرح نادانستہ ناراض کیا تھا مگر ان سب نے ازراہِ مہربانی مجھے معاف کر دیا
اب مجھے یاد آیا کہ میری چیزوں میں سے کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں کہاں گئی تھیں، جن میں موزے، رومال اور
ہی دوسری اشیاء شامل تھیں۔ میں نے بھی ہر ممکن طریقے سے فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ساتھیوں
معاف کر دیا تھا۔ اب ہم اپنی اپنی جگہ بڑا اطمینان محسوس کر رہے تھے اور عرفات کے میدان میں ہمارے
بالکل مطمئن تھے۔

مجھے وہ صبح اچھی طرح یاد ہے جس صبح مجھے حاجی کا خطاب ملنا تھا۔ اس روز جو منظر میری نظروں کے سامنے آیا وہ صرف چند ایک یورپیوں کے نصیب میں ہوتا ہے (پوری نسل میں سے صرف ایک ایسا ہوتا ہوگا)۔ مجھے ایک طرح کا ڈپریشن محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا جس سے آگے راستہ ... میں اونٹوں کو لادنے اور سامان اتارنے میں بھی مدد کرتا تھا۔ گھر سے ایک دو بار باہر نکلتے، اندر آتے ... میں ایک خاتون نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور اگلی بار جب میں وہاں سے گزرا تو اس نے مجھے نام سے پکارا۔ مجھے فوراً لیڈی وینس یاد آئی۔ میں جن حالات سے گزر رہا تھا ان میں سچ تو یہ ہے کہ وہ میری یادوں سے محو ہو گئی تھی۔ مگر آج جب وہ اچانک منظر پر ابھری تو میرے دل کی گہرائیوں سے ''السلام علیکم'' ''ساری تعریف اللہ کے لیے ہے'' کی آواز آئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جس گھر میں، میں رہتا تھا وہ بھی ایک دوست کے ساتھ اسی گھر کے ایک کمرے میں رہتی تھی۔ وہ دوست اسے اونٹ پر سوار کرا رہی تھی۔ بتایا گیا تھا کہ میں جدہ چلا گیا ہوں۔ ہمارے پاس بات کرنے کو وقت بہت کم تھا مگر میں نے اس سے التماس کی کہ آئندہ تین روز کا پروگرام مجھے بتا دے۔ ہم نے آئندہ ہفتے کے روز حرم میں ملنے کا ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا۔ قریب کھڑے ہوئے لوگوں نے ایسے فقرے کسنے شروع کر دیئے تھے کہ ہمیں جلدی ایک دوسرے کو ...نی طور پر الوداع کہنا پڑا۔

ہم دن کے 11 بجے عرفات کے میدان میں پہنچے۔ ایک بڑا ریتلا میدان تھا جس کا کل رقبہ چار ... مربع میل ہو۔ میدان کی شمال مشرقی سمت میں کوہ عرفات ہے، ایک دو سو فٹ اونچی پہاڑی جو بھورے ...ماق سے بنی تھی۔ اس چھوٹے سے پہاڑ کے دامن میں جبل رحمت ہے۔

ہم نے اپنے خیمے اس پہاڑی کے جنوب میں میل کے تہائی فاصلے پر نصب کر دیئے تھے (ایک امیر ... کے آدمیوں کے لیے اور دوسرا بیگم اور خواتین کے لیے) جوں ہی یہ کام مکمل ہوا میں کوہ عرفات کی چوٹی پر چلا گیا تھا۔ جو منظر مجھے یہاں سے دیکھنے کو ملا اگر میری موت کے وقت یہی منظر میری آنکھوں کے سامنے آ جائے تو مجھے حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ آپ اپنے آپ کو یہاں ایک طاقتور تھیٹر کے اسٹیج پر محسوس کرتے ہیں، ... آپ کے سامنے میلوں تک سامعین بیٹھے ہوں اور سیاہ جبل الرحمت کا منظر آپ کے عقب میں ہو۔ وعظ کے لیے کیا وقت اور مقام ہے یہ! ہم اس روز وعظ سننے کے لیے باہر نکل آئے تھے اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ یہ بڑے انہماک سے سنوں گا۔ میں دوپہر کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا کیونکہ لیڈی وینس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ

اسی وقت شروع ہوگا۔

میں نے نیچے بہت بڑے اجتماع پر نظر دوڑائی تو مجھے سیاہ سروں اور سفید جسموں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دکھائی دیا جو پہاڑی کے اطراف میں پھیلا ہوا تھا۔ جنوب میں ڈیڑھ میل تک مردوں کا ہجوم تھا جو دنیا کے مختلف ممالک سے حج کے لیے آئے تھے۔ ایک رعب اور دبدبے کا احساس تھا جس نے ہر شخص کو مرعوب کر رکھا تھا۔ مجھے خیال آیا کیا یہ سب کچھ رائیگاں جائے گا اور یہ ایمان و عقیدہ کسی کام نہ آئے گا؟ اگر ایسا ہو تو شخص کے لیے اس قسم کی ہر شے پر سے ایمان اٹھالینا کافی تھا۔

دوپہر کے وقت میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس تلاش میں گیا کہ مبلّغ یا واعظ کہاں کھڑا ہوگا تاکہ جگہ کو ڈھونڈ لوں۔ حجاج عموماً پہاڑی کے اوپر آجاتے تھے، ایک دو نمازیں یہیں ادا کرتے، پندرہ بیس منٹ یہاں رہتے اور پھر میدان میں لوٹ جاتے تھے۔ دوپہر کے وقت نماز کے لیے عمومی بلاوا نہیں تھا اور پارٹیوں میں تقسیم ہو کر اپنے خیموں کے نزدیک عبادت میں مصروف تھے۔ میں نے بھی ظہر کی نماز نہیں پڑھی اور کوہِ عرفات پر ادھر ادھر دیکھنے میں وقت گزار دیا تھا۔

چوٹی پر ایک چھوٹا سا پندرہ فٹ اونچا ستون اور چند پتھر کی کم اونچی دیواریں ہیں جو چٹان کی معمولی سی بے قاعدگی کو ایک دوسرے سے جدا کر رہی ہیں۔ ان احاطوں کے اندر اور باہر اور دراصل پہاڑی پر ہجوم اتنا بڑا تھا کہ انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس کے لیے دیواروں کا سہارا کامیاب ہونا بھی ممکن نہ تھا۔ نہ ہی ایک چٹان سے دوسری چٹان پر جست لگا کر۔ پہاڑی کے دامن میں آبی ذخیرہ بھی ہے اور پانی کا ایک اور ٹینک (اسے ہندوستان میں یہی نام دیا جاتا ہے) بھی تعمیر کر دیا گیا۔ پہلے آبی ذخیرے سے سو گز جنوب میں ہے۔ حجاج دن بھر ان آبی ذخیروں پر وضو کرنے کے لیے جمع رہے۔ میں سے ایک کا پاؤں پھسل گیا تھا اور جب وہ گرا تو دوسرے حاجی اس پر ہنس رہے تھے۔ نمازِ ظہر تک پہاڑی پر موجود رہا لیکن نہ تو کوئی واعظ نظر آیا نہ میرے کانوں میں اس کے وعظ کی آواز آئی۔ پھر مجھے ایک فٹ بلند دیوار کے اوپر ایک معمر عرب نظر آیا جو احرام میں بھی نہ تھا اور اس کا لباس بھی صاف ستھرا نہ تھا سے مخاطب ہو کر کچھ کہہ رہا تھا مگر اس کی آواز تو دس گز دور بیٹھے حجاج تک بھی نہیں پہنچ رہی تھی کیا یہی وہ جسے سننے کے لیے ہم سب اتنی دور سے آئے تھے۔ مجھے بالکل یقین نہیں آرہا تھا۔ ہو سکتا ہے اتنے بڑے میں اور اس قدر شور و غل کے درمیان میں مفتی کے وعظ سے محروم رہ گیا تھا۔

عرفات سے مکہ مکرمہ واپسی: اگلی صبح چبھنے والی سردی تھی۔ ہم طلوع آفتاب سے دو گھنٹے قبل منی کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ ہم وہاں پہلے پہنچنے والے حجاج میں شامل تھے۔ میں نماز فجر کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ میرے ساتھ ہندی امیر کے لوگوں میں سے ایک لڑکا بھی تھا جسے میں پیار سے جیک کہا کرتا تھا۔ میں اڑ کر مکے پہنچنے کے لیے بیتاب تھا جہاں زندگی کی رونقیں عروج پر ہوتی ہیں۔ میں مکہ مکرمہ پہنچ کر وہی مذہبی رسوم ادا کرنا چاہتا تھا جو میں نے وہاں آمد پر ادا کی تھیں۔ البتہ اب حج کا لباس پہننے کی ضرورت نہ تھی۔

مکہ مکرمہ جانے والی سڑک پر ابھی حجاج کا ہجوم نظر نہیں آتا تھا۔ چند ایک حجاج پیدل چلتے آ رہے تھے، ہم گدھوں پر سواران کے قریب سے گزر رہے تھے۔ ہم طلوع آفتاب کے فوراً بعد مکہ میں تھے۔ شہر کے مضافاتی علاقے میں چند کافی کی دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہم چند بدوؤں اور حبشیوں کے گروہوں کے پاس سے بھی گزرے مگر جب ہم شہر کے اندر داخل ہوئے تو گلیاں خالی تھیں۔ دُکانیں بند تھیں، مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں ابھی تک نہیں کھلی تھیں، کوئی شخص باہر گھومتا نظر نہ آیا۔ میں مہینوں سے اس شہر میں جو چہل پہل دیکھ رہا تھا یہ منظر اس کے بالکل برعکس تھا۔ ہم جب حرم پہنچے تو کچھ بھکاریوں کو سڑک کے کنارے بیٹھا دیکھا۔ یہ غالباً وہ لوگ تھے جو اس قدر کمزور تھے کہ حجاج کے ساتھ نہ جا سکتے تھے۔ کچھ تو زندہ نظر آتے تھے کچھ کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ مُردہ ہوں۔ انہوں نے رحم بھری نگاہوں سے ہمیں دیکھا، وہ ہم سے کھانے کے طلبگار تھے اور لگتا تھا وہ کئی روز سے فاقے سے ہیں۔ کُتوں کا معاملہ ان سے مختلف تھا کیونکہ وہ مزے سے ٹانگیں پھیلائے لیٹے ہوئے تھے۔ میرے پاس رومال میں کچھ کھجوریں اور روٹی تھی جو میں نے ان بھکاریوں میں سے ایک کو دے دی تھیں۔ ان میں سے ایک نے ہمارے گدھوں کو پکڑے رکھا اور ہم حرم کے اندر چلے گئے۔

میں نے صرف چھ ایسے مغربی دیکھے جو رات ہی کو عرفات سے لوٹ آئے تھے یہ وہ حجاج تھے جو پہلے بھی یہاں میرے ساتھ تھے۔ کچھ عرب بھی جو حرم میں پیچھے رہ گئے تھے اور جن کے سپرد کئی کاموں کی ادائیگی کے علاوہ غلاف کعبہ تبدیل کرنا بھی شامل تھا جو ہر سال اس موقعہ پر تبدیل ہوتا ہے اس وقت یہاں موجود تھے۔ یہ غلاف کعبہ قاہرہ سے بھیجا جاتا ہے جسے وہاں سات سو دوشیزائیں تیار کرتی ہیں۔ ہم نے نمازوں کے بعد طواف اور سعی کی۔ سعی ہم نے گدھوں پر بیٹھ کر کی تھی جس کی کمزور، لاغر اور بیماروں کو اجازت ہوتی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کی کہ ہم بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے ہم ایسا کر

ایک اور مقام ملاقات: پھر ایک روز لیڈی وینس سے میری ملاقات کا دن آ ہی گیا تھا۔ اب ہمارے درمیان طے یہ ہوا تھا کہ وہ نماز ظہر کے بعد میرے مرسے کی کھڑکی کے نیچے ایک دو پھیرے لگائے گی۔ جہاں میں بیٹھا ہوں گا اور اسے پہچان لوں گا۔ یہ بات قابل عمل نکلی تھی اور اب میں اس کی رہنمائی میں جا رہا تھا۔ ہم ہجوم کے درمیان میں سے ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن کر گزر رہے تھے یہاں تک کہ ہم ایک ہندی جلد ساز کی دکان کے قریب پہنچ گئے تھے جو قرآن پاک کی جلد بندی کیا کرتا تھا۔ مجھے وہاں انتظار کرنے کے لیے کہہ کر لیڈی وینس خود اندر چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد ایک چھوٹا سا بچہ میرے پاس آیا اور مجھے اپنے ساتھ دکان میں لے گیا۔ وہ مجھے دکان کے پیچھے ایک کمرے میں لے گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لیڈی وینس وہاں اکیلی بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ بچہ مجھے وہاں پہنچا کر خود چلا گیا تھا۔ ہم نے مکے میں خوش قسمتی سے آپس میں مل جانے پر خوشی کا اظہار کیا اور میں نے اس سے اس کی صحت کے بارے میں دریافت کیا کیونکہ گزشتہ برس اس کی صحت خراب تھی۔ اتنی ہی خراب جتنی شاید اس وقت تھی جب وہ برسوں پہلے مکے پہنچی تھی۔ (غالباً اس نے بیس برس بتائے تھے) اس نے نقاب الٹ دیا تھا اور کچھ دیر تک نقاب کے بغیر میرے سامنے بیٹھی رہی۔ کوئی اجنبی ہمیں اس طرح بیٹھے دیکھ لیتا تو ضرور اسے میری بیوی سمجھتا یا کوئی بہت قریبی عزیزہ۔ مجھے ایک ایسا موقع ملا تھا جس میں، میں اس کے خد و خال کو قریب سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ چالیس سال کی نظر آتی تھی مگر جوانی میں یہ ضرور خوش شکل رہی ہوں گی۔ تاہم اسے آج بھی بدصورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ دیکھنے میں صحت مند تھی، چہرہ سنولا گیا تھا البتہ رنگت اب بھی سفید تھی۔ وہ بات کرتی تو اچھی لگتی تھی۔ میں آج بھی اسے اپنے ذہن کی سکرین پر اسی طرح دیکھ رہا ہوں جس طرح کبھی اسے اپنے سامنے دیکھا تھا۔ کچھ افسردہ افسردہ سی، زیر لب مسکراہٹ لیے، جس سے وہ میرے ساتھ اینگلو عربک مذاق بھی کر لیتی تھی مثلاً مجھ سے کہتی تھی:

''بچے! انگریزی میں بات کرو...... بے دھڑک انگریزی بولو!''

مجھے واقعی اس پر ترس آتا تھا۔ ایک بے چاری انگریز خاتون جو اتنے برسوں سے یہاں اس حالت میں مقیم تھی۔ وہ مسکراتی تو اس کی آنکھیں اشکوں سے بھر آتی تھیں۔ وہ رو بھی دیتی تھی جس سے اس کا دل ہلکا ہو جاتا تھا۔ مجھے پہلی ملاقات ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ ماضی اور ماضی سے وابستہ باتیں اسے پریشان کر دیتی ہیں اس لیے میں اس سے اکثر اپنے بارے میں باتیں کرتا تھا۔ اپنے کرسچین نام کے بارے میں بتاتا اور یہ بتاتا کہ میں مکے کیوں آیا تھا۔ میرا خیال تھا میری یہ باتیں سن کر وہ بھی اپنے بارے میں ضرور مجھے اسی قسم کی معلومات

دے دے گی۔ باہر اچانک شور ہوا تو اس نے فوراً نقاب گرا لیا تھا۔ ایک لڑکا چائے اور مٹھائی لے کر اندر آیا جو اس کے دوست اور گھر کے مالک نے بھجوائی تھی۔ میں نے لڑکے سے حقّے کی فرمائش کی کیونکہ اوّل تو مجھے اس کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ دوسرا یہ کہ حقہ پینے کے بعد کمرے سے باہر نکلنے کا یہ اچھا بہانہ ہوگا کہ میں حُقہ واپس کرنے جاؤں گا۔ ہم چائے پی چکے تو میں نے اس سے ملایا کے لوگوں کے بارے میں پوچھا کہ کیا وہ ان کے بارے میں جانتی ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک دو سال قبل اس کی ملایا کے لوگوں کی بیویوں سے دوستی تھی۔

لیڈی وینس جب اپنے بارے میں کچھ بتانے لگی تو میں نے اسے مزید کریدا مگر مجھے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس نے غالباً اپنا نام میکنتوش بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا باپ ڈاکٹر تھا جو اس وقت ڈیون شائر میں رہتا تھا جب یہ جوان تھی۔ اس نے یہ ذکر بھی کیا کہ 1857ء کی جنگ آزادی یا غدر کے وقت وہ محاصرے کے دوران لکھنو میں تھی۔ اسے ایک مشہور باغی وہاں سے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس سے آگے وہ مزید تفصیلات بتانے سے گریز کر رہی تھی۔ میں نے سوال کیا کہ وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ چلی گئی تھی یا وہ اسے زبردستی قیدی بنا کر لے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس شخص کے ساتھ ہندوستان میں تقریباً ایک سال مقیم رہی تھی پھر انگریزوں نے اسے ملک بدر کر دیا تھا۔ اور حکومت وقت نے اس کے سر کی قیمت مقرر کر دی تھی اور اس نے مکے میں پناہ حاصل کر لی تھی۔ اس وقت یہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اللہ کو یہی منظور تھا کہ وہ آٹھ سال قبل فوت ہو گیا تھا۔ یہ اس کی وفات کے بعد غربت کا شکار ہو گئی تھی اور اب وہ گزر اوقات کے لیے ٹوپیوں پر کڑھائی کرتی تھی اور یہ ٹوپیاں بازار میں فروخت کرتی تھی۔

ایک متمول ہندی تاجر کو اس کے بیٹے کے خط انگریزی میں آتے تھے، اس کا یہ بیٹا ہندوستان میں کاروبار سنبھالے ہوئے تھا۔ اس تاجر کو معلوم تھا کہ میں یہ خطوط اس کے لیے ترجمہ کر سکتی تھی۔ اس نے مجھے اپنے گھر کا ایک کمرہ رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ یہ ساری باتیں اس نے مجھے میرے سوالات کے جوابات دیتے وقت بتائی تھیں۔ میں نے پھر خود ہی رحم کھا کر مزید سوالات پوچھنے بند کر دیئے تھے۔ وہ بہت ڈر گئی تھی۔ میں نے اب اسے کہا کہ وہ قرآن پاک کے چند پارے مجھے سُنائے۔ میں نے بہانہ یہ پیش کیا کہ میں مکہ کا لہجہ اور تلفظ سیکھنا چاہتا تھا۔ مجھ پر اب یہ عقدہ کُھلا کہ وہ ہندوستانی (اُردو) کے علاوہ فارسی اور عربی دونوں زبانیں لکھ، بول اور پڑھ سکتی تھی البتہ اسے ترکی نہیں آتی تھی۔ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں بتایا کہ اس کی کسی ترک سے کبھی ملاقات نہیں رہی اس لیے وہ ترکی نہ سیکھ سکی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس کے دل میں ترکوں کے

لئے احترام پایا جاتا تھا۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ وہ مکہ میں بہت سے ایسے افراد سے واقف ہے جو باغی تھے اور جن کے سروں کی قیمت انگریز سرکار نے مقرر کر رکھی تھی۔ اسے دراصل لکھنو کے محاصرے اور اس کے فتح ہونے سے متعلق بہت سی باتیں معلوم تھیں۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایک نوجوان فرانسیسی مکہ میں 18 مہینے رہ کر میری یہاں آمد سے چھ ماہ قبل وفات پا گیا تھا۔

روشنی کا سیلاب: میرا خیال ہے یہ حج کے بعد آٹھویں روز کی بات ہے کہ یہاں ایک سیلاب آیا تھا۔ ایسا سیلاب مکہ میں پچھلے 17 برس میں کبھی نہ آیا تھا۔ اس میں حرم کے اندر سات فٹ تک پانی چڑھ گیا تھا۔ اس مرتبہ مشرقی سمت سے ایک سیاہ دن کا آغاز ہوا تھا۔ بادلوں میں دھواں اور ریت دنوں ملے ہوئے نظر آتے تھے۔ میں نے اس سے پہلے یہ صورت حال ایک دو بار اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی جب فوراً بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ مکہ میں 11 بجے صبح تک بارش شروع نہیں ہوئی تھی حالانکہ عرفات اور منیٰ میں بارش ہو رہی تھی۔ شہر کے مشرقی حصے میں بارش برسنے کی ابتداء ہوئی تھی اور گلیوں میں کئی انچ پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر کسی سیلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ گلیوں میں تو معمولی سی بارش سے بھی طغیانی آ جاتی تھی۔

جونہی بارش شروع ہوئی میں واپس گھر آ گیا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو مشرق سمت سے بارش برستی آ رہی تھی اور پھر موسلا دھار بارش کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایسی بارشیں عموماً منطقہ حارہ میں واقع ممالک میں ہوتی ہیں۔ جوں جوں بارش تیز ہوتی گئی، دوست اور اجنبی بھاگ کر ہمارے کمروں میں پناہ لینے داخل ہو گئے تھے۔ یوں بارش میں بھیگے ہوئے افراد سے ہمارے کمرے بھر گئے تھے۔ حرم میں چند انچ پانی جمع ہوا تو خدا نے پانی نکالنے کا اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ تھوڑی مقدار میں جمع شدہ پانی کو تو بڑے بڑے سوراخوں کے ذریعے زیرِ زمین دھکیل دیتے تھے۔

مگر آج تو معاملہ مختلف تھا، ایک گھنٹہ گزر چکا تھا اور بارش مسلسل برس رہی تھی۔ تیز و تند ہوا نے طوفان برپا کر دیا تھا۔ جو غلاف کعبہ کو لگتا تھا اڑا لے جائے گا۔ یہ نیا تھا اس لیے بچ گیا ورنہ پھٹ گیا ہوتا۔ امیر نے چند نوکروں کو بھیجا کہ حرم سے بارش کا کچھ پانی پینے کے لیے لے آئیں۔ انہوں نے بتایا کہ گلیوں کا پانی اس قدر بلند ہو چکا ہے کہ بہت جلد یہ حرم میں داخل ہونے والا ہے۔

ہم میں سے کچھ احباب باہر دیکھنے لگے جن میں، میں بھی شامل تھا۔ پانی اس قدر تیزی کے ساتھ حرم میں داخل ہو رہا تھا کہ کوئی احتیاط کارگر نظر نہ آتی تھی۔ دیکھنے والوں نے بتایا کہ منیٰ کی جانب سے ایک لہر

اٹھی تھی کہ یہاں تک پہنچ گئی۔اب تمام گلیوں میں تین چار فٹ بارش کا پانی جمع تھا،کیچڑ ملا پانی،کسی ندی نالے کے بہاؤ کی مانند۔

حرم کے ہر دروازے پر داخلی راستے میں پتھر کی ایک چھوٹی سی دیوار بنی ہوئی ہے تا کہ ایسے سیلاب کے موقعہ پر پانی کو اندر آنے سے روکا جا سکے۔میں ان میں سے ایک پر کھڑا ہو گیا تھا۔میں پانی کو حرم کی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا۔پانی اپنے ساتھ پرندوں کے پنجرے،پھل،روٹی کے ٹکڑے،خالی ٹوکریاں،چوبی سٹالوں کی لکڑیاں،تیرتے ہوئے کتے لا رہا تھا حبشی اور عربی پانی کے اندر اتر کر جو چیزان کے کام کی تھی اسے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔بہت سی دُکانوں کے اندر پانی داخل ہو چکا تھا دُکانداروں کو پانی کے تیز بہاؤ نے یہ موقعہ ہی نہ دیا تھا کہ سامان باہر نکال لیں۔جن دُکانوں میں پانی ابھی داخل نہیں ہوا تھا اور خشک جگہ موجود تھی وہاں لوگوں نے پناہ لے رکھی تھی۔

اس سیلابی ریلے کی گہرائی اور بلندی میں ہر لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔اب جو تیرنا جانتے تھے وہ تیر کر پانی میں جا سکتے تھے۔ابھی تک یہ سیلاب حرم کے اندر داخل نہیں ہوا تھا جہاں ہزاروں لوگوں نے پناہ لے رکھی تھی۔پھر پانی نے ہمارے پاؤں کے نیچے سے نکل کر ہمارے پیچھے حرم میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا۔حرم کے بڑے دروازے بند کر دیئے گئے تھے مگر چھوٹے دروازے جو تعداد میں زیادہ تھے بند نہیں کیے جا سکتے تھے کیونکہ اب یہ سیلاب اس قدر تند و تیز تھا کہ انہیں بند کرنا ممکن نہ رہا تھا۔دوپہر کا وقت تھا میں واپس گھر چلا گیا تھا۔میں نے کپڑے تبدیل کیے اور دن کا بقیہ حصہ کمرے میں بیٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے میں گزارا۔

بارش کے تھم جانے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔طوفان باد و باراں جاری تھا اور ایک ہی سمت میں تھا۔حرم کے اندر پانی ہر دروازے کے راستے داخل ہو رہا تھا۔کمزور اور نازک دروازے کسی رکاوٹ اور مزاحمت کے قابل نہ تھے،پانی اپنے ساتھ بہا کر لانے والی زیادہ اشیاء ان دروازوں پہ چھوڑ کر اندر جا رہا تھا۔

اس وقت دو بجے تھے جب ہوا کا رُخ اچانک مغرب کی جانب پھر گیا تھا۔غلاف کعبہ اپنی جگہ آ گیا تھا۔بارش تین بجے تک جاری رہی اور پانی کا بہاؤ بدستور حرم کی جانب تھا۔ہوا کے رُخ بدلنے اور بارش کے تھم جانے کے فوراً بعد اب پانی کا حرم کے اندر کی طرف بہاؤ اپنی تیزی و تندی کھو چکا تھا۔اس طوفان کے دوران حجاج نے طواف جاری رکھا تھا اور وہ حجر اسود کو بوسہ بھی دیتے رہے تھے۔طوفان ... ن ،جہ حرارت کافی

گر گیا تھا اور یکساں طور پر سرد تھا۔ طوفان شمال کی سمت چلا گیا تھا تاہم غروب آفتاب تک مطلع ابر آلود رہا۔

حرم کے اندر ایک جھیل پیدا ہو گئی تھی۔ مغربی سمت میں پانی تین فٹ تک کھڑا ہوا تھا اور کعبہ کے گرد چھ فٹ اور مشرقی بارہ دریوں میں پانی چند انچ تک محدود تھا۔ جونہی پانی کے چڑھاؤ میں رکاوٹ آئی ہم سب نے بے حد خوشی و مسرت کا اظہار کیا تھا۔ اب چراغوں کے بجھ جانے کا خدشہ ٹل گیا تھا۔ ایسا ہو جائے تو اسے اچھا شگون نہیں سمجھا جاتا۔ پانی اتنی ہی تیزی کے ساتھ اتر گیا تھا جتنی تیزی کے ساتھ یہ حرم کعبہ کے اندر بلند ہوا تھا۔ نماز مغرب کے وقت پانی بارہ دریوں سے نکل کر چوکور عمارت کی تین بلند سمتوں کی طرف لوٹ گیا تھا۔ صرف کعبہ کے قریب دو فٹ پانی باقی رہ گیا تھا جبکہ بارہ دریاں بالکل خشک نظر آنے لگی تھیں۔

تین وبائی بیماریاں: اس سیلاب کے کئی روز بعد تک تمام کنوؤں کا پانی بھورا اور گدلا تھا۔ اسے پوری رات کھڑا رہنے دیا جاتا تو صبح تک یہ نصف پرسکون ہوتا۔ تمام کنوؤں کے پانی کا ذائقہ تبدیل ہو گیا تھا۔ عام پانی زم زم کا ذائقہ دیتا تھا اور زم زم خود بہت بدلا ہوا ذائقہ دے رہا تھا۔ دو ایک روز تک ہوا میں نمی رہی۔ روٹی اگر ان ڈھکی رہ جاتی تو چند گھنٹوں کے بعد دوبارہ گرم ہونے کے قابل نہ رہتی تھی۔ یہ سخت ہو کر اپنے ارد گرد ایک گول دھاتی حلقہ بنا لیتی ہے۔ اس سیلاب کا سب سے برا اثر یہ ہوا کہ شہر میں بیماریاں پھیل گئی تھیں۔ ان بیماریوں میں ہیضہ، چیچک اور دوسری وبائی بیماریاں شامل تھیں جو تقریباً تین ہفتوں تک بہت تیزی سے پھیلی تھیں۔

مختلف ممالک میں مسلمانوں کی تجہیز و تکفین کی رسمیں مختلف ہیں اور یہ وہاں کے حالات کے مطابق ایک دوسری سے مختلف ہوتی ہیں۔ مصر اور شام میں یہ رسم اور طرح کی ہے جبکہ صحرائی ممالک میں اور قسم کی، جہاں مُردے کو قبر میں سیدھا لٹا دیا جاتا ہے اور قبر پر چند پتھر رکھ کر بند کر دیا جاتا ہے۔ مکہ میں مُردے کو حرم کعبہ کے ایک حصے میں مقام ابراہیم کے پاس لے جاتے ہیں تاکہ کعبہ کے دروازے سے روح باہر جا سکے اور تدفین سے قبل اُن کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے، جو امام پڑھاتا ہے پھر متوفی کو قبر میں اتار کر، کعبہ کی طرف اس کا منہ کر کے، دفن کر دیا جاتا ہے۔ مسلمان تابوت کبھی استعمال نہیں کرتے حالانکہ وہ مرنے والے کے جسد خاکی کو کپڑے کے کفن کے علاوہ کئی چادروں میں لپیٹ کر قبر میں اتارتے ہیں، عموماً سفید کپڑے کا کفن استعمال ہوتا ہے۔

سیلاب کے تین روز بعد میں نے دیکھا کہ ایک ہی وقت میں نو نو جنازے جمع ہو جاتے تھے۔ 10

روز بعد یہ تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ نماز ظہر کے وقت حرم میں جنازوں کا جلوس نظر آتا تھا۔ میں نے ایک روز 63 جنازے گنے تھے۔

اس سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اس سیلاب میں کتنے افراد روزانہ جان بحق ہوئے تھے۔ مرنے والوں میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کے کوئی دوست یا عزیز واقارب وہاں موجود نہ تھے۔ ایسے بھی یقیناً ہوں گے جنہیں کوئی حرم میں جنازے کے لیے لانے والا بھی نہ ہوگا۔ ہیضے سے مرنے والے کئی افراد سڑک کے کنارے پڑے ہوئے ملے تھے اور کوئی ان کے قریب تک نہ جاتا تھا۔ چیچک اور ٹائیفائڈ کے مریض، اپنی بیماری کے مختلف مراحل میں لوگوں کے درمیان گھومتے پھرتے تھے۔ وہ یوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پھرتے تھے جیسے ان مریضوں سے دور رہنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ میں جس گھر میں گیا وہاں چیچک کے آٹھ مریض تھے جن میں سے پانچ جانبر نہ ہو سکے تھے اور پانچ صحت مند افراد ان کے ساتھ اسی کمرے میں کھاتے پیتے اور سوتے تھے۔

ہم انگریز چھوت چھات کی بیماریوں سے بہت خوفزدہ رہتے ہیں اور کوئی صحت مند انسان کسی ایسے مریض کے قریب بھی نہیں جاتا جسے کوئی ایسا مرض لاحق ہو جو اسے بھی لگ سکتا ہو مگر مکے میں یہ کیسا معجزہ تھا کہ کسی صحت مند کو بیمار سے دور رہنے کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ مجھے ذرہ بھر بھی ڈر نہ تھا حالانکہ ہمارے گھر کے دو کمروں میں مریضوں کا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ ہم شہر کے ان علاقوں میں بے خطر گھومتے پھرتے تھے۔ جن میں کئی وبائیں پھوٹ پڑی تھیں۔ حیرت اس بات پر تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی بیمار نہ ہوا تھا۔ شاید یہ ہمارے امیر کی وجہ سے تھا کہ اس نے اخراجات کی پرواہ کیے بغیر بہت سے مریضوں کو گھر میں رکھا ہوا تھا۔ بہت سے مریضوں نے گلے میں ایک تعویز بھی باندھ رکھا تھا تاکہ بیماری سے محفوظ رہ سکیں، ایک میرے گلے میں بھی تھا جو میری تسبیح کے ساتھ الجھ کر ٹوٹ گیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس پر کیا لکھا ہوا ہے مگر یہ اس قدر رختہ حالت میں تھا کہ تحریر پڑھی نہ جا سکتی تھی۔

مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ دیکھ کر بہت سے حجاج نے مکے سے جانا شروع کر دیا تھا۔ یوں شہر میں لوگوں کا ہجوم دن بدن گھٹتا جا رہا تھا۔ حجاج ہزاروں کی تعداد میں ایک ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہو رہے تھے اور ہم نے تیاری شروع کر دی تھی تاکہ مدینہ طیبہ جانے والے پہلے قافلے میں شامل ہو سکیں۔

12۔ مُحمد حسین فارانی......فارس

1885-86ء

بے بس ایرانی سیاح کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ وہ کہاں جائے؟ کس گروہ کے سپرد اپنے آپ کو کردے؟ وہ کس طرح اپنے سامان، کپڑوں، خوراک اور پانی کو محفوظ رکھ سکتا ہے؟ بھاری کسٹم ڈیوٹی کو وہ کیوں کر ادا کرنے کا متحمل ہو سکتا ہے؟ وہ ان رُوسی چوروں اور ایرانی ٹھگوں سے کیسے بچ سکتا ہے؟ وہ کس پر بھروسہ کر سکتا ہے؟ وہ بچ نکلنے کی کون سی سبیل کر سکتا ہے؟.............محمد فارانی

کیپٹن یا برٹن۔ کے سفر نامے کے برعکس محمد فارانی کی فارس سے حج کے لیے روانگی کی روداد سفر کسی مہم کی کہانی نہیں ہے۔ نہ ہی اس میں مصنف پر یا خود حج پر اتنی توجہ مرکوز کی گئی ہے جتنی تہران سے مکے تک، راستے میں پڑنے والے علاقوں پر مرکوز ہوئی۔ اس روداد سفر کا یہ معاملہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے: وہ اپنے ہمعصر فارسی حجاج کو تازہ بہ تازہ ضروری تفصیلات فراہم کرنا چاہتا ہے جو دنیا کے بدلتے ہوئے خطوں میں سے گزر کر مکے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جو اقتباسات فارانی کے سفر حج کی سرگزشت میں سے لیے گئے ہیں وہ مکے سے متعلق نہیں ہیں لیکن انہیں اس مجموعے میں اس لیے شامل کر لیا گیا ہے کیونکہ وہ اس سفر حج کے بارے میں گرانقدر معلومات فراہم کرتے ہیں جو اب جدید دور میں داخل ہو چکا ہے۔ فارانی سکالر بھی تھا اور بیورو کریٹ بھی اور اس نے اس سفر حج پر قلم اٹھایا جو دورِ مشین میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے فارسی بولنے والے حجاج کو ریل گاڑی اور دخانی جہاز سے متعارف کرایا۔ اس نے اُن نئے حج راستوں پر بھی روشنی ڈالی ہے، جو مغربی ایشیاء سے حجاز آ رہے تھے۔ راستے میں دوران سفر وہ انہیں اس اہم ترقی کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرنا چاہتا ہے جس میں ان بین الاقوامی طبی معیارات کا ذکر شامل ہے جن کی مدد سے حجاج میں پھیلنے والی درجنوں وبائی بیماریوں کو دور رکھا جا سکتا ہے۔ فارانی نے جن موضوعات پر طبع آزمائی کی وہ بعد میں آنے والے حج سفر ناموں میں بھی شامل کر لیے گئے تھے۔

ریل گاڑی اور دخانی جہاز کے سفر نے مل کر ایشیاء سے حجاز تک کے سفر کو مختصر، محفوظ اور کم خرچ بنا دیا تھا۔ 1870ء میں ریل نے ہندوستان، افغانستان، کیسپین خطے کے حصوں اور قفقاز کو ملا دیا تھا۔ اس دوران حج راستوں میں سے نہر سویز، ترکی اور برطانوی دخانی جہازوں نے حجاج کو جدہ پہنچانا شروع کر دیا تھا۔ جس وقت 1885ء میں فارانی تہران سے روانہ ہوا اس وقت سمندری سفر کا آغاز ہو چکا تھا مگر وہ خشکی کے راستے مکے پہنچنا چاہتا تھا اس نے اس روایتی بری راستے سے مختلف راستہ اختیار کیا تھا جو دمشق یا بغداد کے قافلوں کا تھا۔ وہ قازون تک بذریعہ کوچ پہنچا تھا جہاں سے آگے وہ گھوڑے پر سوار سفر کر کے بالآخر ایک دخانی جہاز کے ذریعے باکو کے آخری ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ ہر اخلاقی اور سماجی پابندی سے آزاد یہ ایک رُوسی شہر تھا جہاں تیل وافر مقدار میں نکلا تھا۔ بہت سے فارسی حجاج جب یہاں پہنچتے تو ایک ثقافتی صدمہ انہیں ہلا کر رکھ دیتا تھا۔ یہ 1180ء کی آخری دہائی کا زمانہ تھا جب حجاج کی اتنی تعداد مکے جاتے ہوئے عیسائی علاقوں سے گزرتی تھی۔

ایک سطح پر فارانی کی کتاب نے پہلی بار حج پر جانے والوں کے لیے نئے مناظر کے اسرار پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ دُوسری طرف یہ سفر کے بارے میں بہت سے انتباہ پیش کرتی ہے۔ رُوسی قدامت پسند اور اہلِ تشیع کے معاشرے کے درمیان جو روایتی وسیع نظریاتی اختلاف پایا جاتا تھا اس کے علاوہ چور، بھیدی، حریص کسٹم ایجنٹ، بدعنوان جبری حراست میں رکھنے والے افسر، اونٹ کو کرایہ پر دلوانے والے امیر دلال اور گائیڈ بھی ہمارے اس مصنف کی نظر سے گزرتے ہیں۔ بعض اوقات تو ایسا لگتا ہے جیسے تہران اور مکے کے درمیان پھیلے ہوئے بحر و بر میں سوائے معصوم حجاج کے اور انہیں لوٹنے والے افسروں کے اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ بعد میں دیئے گئے اقتباسات میں ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی افسر بھی بدمعاش ہو سکتے تھے۔

انیسویں صدی نے حجاج کو بدعنوانی سے بڑھ کر ایک اور خطرے سے دو چار کر دیا تھا مکہ میں 1831ء میں ہیضہ پہلی بار پھیلا تھا۔ اس بیماری کے پھیلنے کے سبب وہ بیمار حجاج تھے جو برطانوی ہندوستان سے آئے تھے۔ اس کی روک تھام کے لیے ایک بورڈ تشکیل دے دیا گیا تھا مگر پھر بھی یہ بیماری شہر کے مغربی حصے کی جانب منتقل ہو گئی تھی۔ 1845ء میں اس سے یورپ کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس کے پیش نظر فرانس نے اپنے مشرق قریب کے قونصل خانوں میں طبی ماہرین مقرر کر دیئے تھے۔ عثمانی ریاستوں اور برطانیہ نے بھی انسدادی اقدامات کیے تھے۔ 1851ء میں پیرس میں اس مرض پر ایک پہلی کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا۔ ان ابتدائی انسدادی تدابیر کے باوجود 1865ء میں ایک بڑی وبائی بیماری نے مکہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

حاجیوں کے جہازوں کے ذریعے پھیلی تھی جن کا تعلق ہالینڈ کے مشرقی جزائر سے تھا۔جون میں پندرہ ہزار حاجی اس بیماری سے وفات پا گئے تھے۔مصر میں ساٹھ ہزار افراد مرے تھے۔پھر یہ بیماری مارسیلز کے راستے یورپ میں داخل ہوگئی تھی۔نومبر میں نیویارک میں بھی ہیضے کے پھیلنے کی اطلاع موصول ہوئی تھی۔خیال کیا جاتا ہے کہ چونکہ ان دخانی جہازوں پر برطانیہ کی اجارہ داری تھی جن کے ذریعے حجاج سفر کرتے تھے،اس لیے اس بیماری کو پھیلنے میں مدد ملی تھی۔اس کے برعکس وہ حجاج جو خشکی کے راستے قافلوں کی شکل میں سفر کرتے تھے وہ اس سے محفوظ رہے۔

1865ء میں بڑے پیمانے پر پھیلنے والی بیماری کے دوران حجاز کی سرحدوں پر اہم مقامات پر ایسے مراکز قائم کردیئے گئے تھے جہاں سے حجاج کا آنا جانا تھا۔یہاں مرض کی علامات کا پتا لگالیا جاتا تھا اور حجاج اور ان کے سامان کی جراثیم کشی کردی جاتی تھی۔انہیں 15 روز تک باقی لوگوں سے علاحدہ رکھا جاتا تھا۔بحیرۂ احمر کے راستے مصر میں داخل ہونے والے ہر حاجی کے پاس ہیلتھ سرٹیفکیٹ کا ہونا لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔سوئز کے مقام پر تمام بحری جہازوں کا معائنہ ہوتا تھا۔ان کوششوں کے باوجود ایک عشرے کے بعد بھی جان کین نے اپنے سفرنامے میں مکے میں پھیلنے والی وبائی بیماری کا ذکر کیا ہے۔آنے والے زمانے میں دیر تک نظام کی بدعنوانی قائم رہی،اس بارے میں ہمیں آگے چل کر علم ہوگا۔بہت سے متقی اور پرہیزگار مسلمانوں نے مغرب کی اس مداخلت پر جسے انہوں نے دیکھا تھا احتجاج کیا۔اس مغرب نے حج کو کاغذ کی ایک اورتہ میں لپیٹ کر اس کے نظام الاوقات کو تباہ کردیا تھا۔عدم تعاون کے باوجود یہ بڑی کوشش رفتہ رفتہ کامیاب ہوگئی تھی۔ 1912ء کے بعد ہیضہ کی وبائی بیماری کا حجاز میں خاتمہ ہوگیا تھا۔اس میں پاسپورٹ کی شرط اور سفرحج کے لیے زیادہ رقم کی ضرورت اور کسی حد تک جراثیم کشی کے لیے دھونی کا استعمال اور بیماری سے بچانے کے لیے الگ تھلگ رکھنا شامل تھا۔

مسلم حجاج کو جدید حفظانِ صحت کے اصولوں سے متعارف کرانے کے لیے فارانی کا جبری تنہائی میں رکھنے کے مناظر کا بیان حج لٹریچر میں اوّلین کوشش ہے۔اس نے حفظانِ صحت کے اصولوں کے سوال کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا ہے:وہ پوچھنا چاہتا ہے کہ اس وقت کیا ہوتا ہے جب غیر اسلامی دنیا حجاج کے لیے صاف ستھری نہیں ہوتی؟ 1880ء میں بے شمار فارسی حجاج اسلامی دنیا کی سرحدوں سے باہر کے راستوں سے پہلی بار سفر کررہے تھے۔اسلامی قانون کے تحفظ کے بغیر وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتے تھے۔مغربی

اقوام جراثیم کشی پر زیادہ زور دے رہی تھیں جبکہ پاکیزگی اور صفائی کے بارے میں مسلمانوں کی اپنی فکر مندی تھی۔ صاف پانی کی اشد ضرورت تھی۔ پانچ وقت کی نمازوں کے لیے دو تین بار وضو کرنا لازمی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی غسل کی ضرورت بھی پڑتی ہے جس کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے مذہب کے قانون کے مطابق خاص غذا کی تیاری ان کی ایک اور فکر مندی تھی۔ ان میں سے زیادہ معاملات میں فارانی نے اپنے آپ کو ایک مصلح کے طور پر پیش کیا ہے۔ اسے یہ احساس تھا کہ اسلامی قانون کو سفر حج میں رہنمائی کرنی چاہیے نہ کہ سدِ راہ بننا چاہیے اور وہ اس بات کو تحریر میں لانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔

جس زمانے میں بہت سے حجاج کے لیے دنیا اُلٹ پلٹ رہی تھی فارانی نے اس وقت نہایت مفید اور واضح طور پر پیش کی گئی معلومات فراہم کیں۔ مذہبی تشریح وتصریح تو مسئلے کا ایک پہلو تھا۔ اس نے ویزا سے متعلق پیچیدہ مسائل پر سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ وہ ریلوے اسٹیشنوں کے درمیان موجود ٹھیک ٹھیک فاصلوں کی نشان دہی کرتا ہے، ہر بندرگاہ کے بارے میں مختصراً معلومات مہیا کرتا ہے۔ آب و ہوا، خوراک، تعمیرات، کرنسی، سماجی رسوم، ہوٹلز اور منڈیوں کے بھاؤ کے متعلق ضروری حقائق قلمبند کرتا ہے۔ فارانی دوبارہ نہر سوئز سے سفر کرتا ہوا گزرا، وہ بڑی تفصیل کے ساتھ ان باتوں اور ضابطوں کا ذکر کرتا ہے جو حجاج پر اثر انداز ہوتے تھے یا ان کے لیے پریشانی کا باعث بنتے تھے۔ وہ طور اور سنائی میں متعدی امراض سے بچنے کے لیے قائم جبری حرامت کے اسٹیشنوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ فارانی نے حجاج کی رہنمائی کے لیے گائیڈ سفر نامہ لکھا۔ اس میں فارس سے حج پر جانے والوں کو بتایا گیا تھا کہ وہ کس طرح تہران سے کوچ پر روان ہو کر انزلی پہنچیں گے، وہاں سے بحری جہاز لیں گے، پھر ریل میں بیٹھ کر استنبول پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے اسکندریہ اور پھر نہر سوئز سے گزرتے ہوئے جہاز میں اتر جائیں گے۔

محمد فارانی انسانی رویے کا ایک تیز اور ماہر جج تھا۔ وہ قصے اور حکایت کی قدر و قیمت بھی جانتا تھا۔ آج ہم جب اس کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ حج کے بارے میں بنیادی نقلِ مکانی کے پہلے مرحلے کے متعلق کلیدی باتیں بتاتا ہے۔ وہ خود ایک مکمل جدید حاجی تھا۔ تین ہزار میل کے دوران اس نے اونٹ پر سوار ہو کر صرف جدہ سے حجاز تک کا سفر کیا تھا گو جس دنیا کا ذکر اس نے کیا ہے وہ بڑی حد تک غائب ہو گئی ہے مگر اس کا خاکہ آج بھی حیرت انگیز حد تک مانوس سا دکھائی دیتا ہے۔

☆☆☆

(اقتباس) ایک شیعہ کا مکے تک سفرِ حج ...... اَز مرزا محمد حسین فارانی

1885-86ء

تعارف: ہمارے معاصرین کے ہاں ایک رسم یہ پائی جاتی ہے کہ وہ اسلوب کو اس قدر زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ ایک غیر اہم سے موضوع کی تمہید اتنی طوالانی ہو جاتی ہے کہ اصل موضوع نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ایک مختصر سی تقریر کے لیے طویل تمہید کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ نہ ہی یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہزار سطور کی کتاب کا دیباچہ دو ہزار سطور پر مشتمل ہو۔ ''کام کی بات کرو اور تمہیدی باتوں کو پیچھے چھوڑ دو''۔ محمد حسین الحسینی الفارانی نے یہ مختصر اور سادہ پیش لفظ لکھا ہے۔ اس کا تعلق ناصر الدین شاہ (شاہ ایران، 1848-1896ء) کے عہد حکومت سے تھا۔ اللہ شاہ کے تخت وتاج کو دوام دے۔

جب میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میں اللہ کے گھر کی زیارت کروں تو میں یہ کتاب ایک دانا استاد کے ساتھ لے آیا تھا۔ انہوں نے اس بارے میں فرمایا تھا کہ اگر تم کسی قسم کا لالچ اور ہوشیاری دکھاؤ گے تو روحانی مسرت سے محروم رہ جاؤ گے۔

میں نے اس ضرب المثل کو بہت پسند کیا کہ ''جنہوں نے جتنا کم وزن اٹھا رکھا ہوگا، اتنی ہی ان کی بچت ہو جائے گی''۔ مجھے خیال آیا کہ جن مسافروں کے ساتھ کم وزنی سامان ہوتا ہے وہ اتنا ہی تیزی سے سفر کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کیا اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں تنہا سفر کروں گا۔

میں اپنے محبوب بادشاہ (ناصر الدین شاہ) کی نیک تمناؤں کے ساتھ اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔

تہران سے روانگی: 16۔ جولائی 1885ء، بروز جمعرات رات کے وقت میں کوچ میں بیٹھ گیا تھا، جس میں مسافروں کے لیے کئی درجے تھے۔ ان کے کرایے بھی مختلف ہیں۔ تہران سے قازون تک کا

فاصلہ 24 فرسنگ ہے۔راستے میں پانچ مہمان خانے تعمیر کیے گئے ہیں۔ ہر مقام پر کوچ کے گھوڑے تبدیل کر دیئے جاتے ہیں۔ایک مہمان خانے (گیسٹ ہاؤس) سے دوسرے تک 4 فرسنگ کا فاصلہ ہے۔ دو مہمان خانوں کے درمیان تین محافظ خانے تعمیر کیے گئے ہیں۔اس طرح ہر فرسنگ پر ایک محافظ خانہ ہے۔ ان محافظ خانوں کے کچھ نگران اپنے بیوی بچوں سمیت خود بھی ان میں رہتے ہیں۔ دوسرے تنہا رہتے ہیں۔ ہر محافظ خانے (گارڈ ہاؤس) میں اس کے قریب ہی بہتا ہوا پانی بھی دستیاب ہوتا ہے، ان کے نگرانوں نے ان میں پھول، پودے درخت اور باغیچے ان کے سامنے والے حصے میں لگا دیئے ہیں۔ جہاں یہ پانی دستیاب نہیں وہاں ان کے قریب ہی کنویں کھدوائے گئے ہیں۔ان اسٹیشنوں پر تار گھر بھی موجود ہیں۔

باکو، 29۔ جولائی۔۔۔۔۔اس شہر میں پانی کی قلت ہے اور درخت بھی بہت کم ہیں۔ کچھ گھروں میں لوگوں نے پھول لگا رکھے ہیں۔ ان پھولوں میں زیادہ تر گل شمعدانی اور لق لقی چونچ سے مشابہ پھول شامل ہیں۔سمندر کے قریب ہونے کی وجہ سے آب وہوا مرطوب ہے۔ باہر کھلے آسمان تلے سونا ممکن نہیں ہے۔ تاہم زمین بہت خشک ہے اور اس علاقے میں تیل ہونے کی وجہ سے زمین میں نمی نہیں ہے۔ باکو کے لوگ موٹے اور صاف رنگت والے ہیں۔ان کی جسمانی حالت اچھی ہے۔ یہاں کے لوگوں میں دن میں ایک وقت کا کھانا، کھانے کی رسم پائی جاتی ہے۔دن میں یہ دوپہر کا کھانا (لنچ) بہت اہتمام اور شوق سے کھاتے ہیں۔ رات کا کھانا یہ نہیں کھاتے۔ یہ رات کا زیادہ وقت جاگ کر گزارتے ہیں اور ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

تیل کے کنویں: شہر کے مضافات میں بالخانہ گاؤں تک، جو شہر سے دو فرسنگ کے فاصلے پر ہے، تیل کے بہت سے کنویں ہیں۔ان میں سے چند کنویں حکومت کے ہیں جبکہ بقیہ کے مالک مختلف افراد ہیں۔ باکو کی بڑی تجارت تیل کی ہے جو ایران، یورپ اور سلطنت عثمانیہ کو بھیجا جاتا ہے۔ کئی برسوں سے لوگ اپنے تیل کے کنویں کھود رہے ہیں مگر انہیں تیل حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی یوں انہیں اس میں کافی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ 1872ء میں جب سے حکومت نے تیل کی صنعت کی نجکاری کی ہے اور 1883ء سے یہ شہر بذریعہ ریل بھی کئی مقامات کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے باکو میں بڑی خوشحالی آئی ہے۔ جب کسی کنویں سے تیل نکل آتا ہے تو اس کے نزدیک نہریں اور ٹینک بنا دیئے جاتے ہیں تاکہ کنویں سے نکلنے کے بعد تیل ان کے اندر منتقل کر دیا جائے۔ اسے پھر کارخانوں میں صاف کیا جاتا ہے، یوں مٹی کا تیل علاحدہ کر لیا جاتا ہے جو

باورچی خانوں میں جلانے کے کام آتا ہے۔ یہ صوبوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ جہازوں میں اور کارخانوں میں کوئلے کی جگہ بھی جلتا ہے۔ سب سے بڑا تیل کا ذخیرہ بالخانہ میں ہے جہاں بہت سے کارخانے قائم کر دیئے گئے ہیں۔ یہاں سے یہ تیل شہر کو بھیج دیا جاتا ہے۔

سوراخانی گاؤں میں قدیم آتش کدہ: شہر کے شمال مشرق میں تین فرسنگ کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے جس کا نام سوراخانی ہے، جہاں قدیم زمانے سے ایک آتش کدہ ہے۔ کچھ آتش پرست (زرتشت) اور ہندو وہاں زائرین کے طور پر آتے ہیں۔ بہت سے ہندوستانی ہمیشہ اس گاؤں میں رہائش پذیر رہتے ہیں۔ یہ آتش کدہ ایک مربع عمارت کی شکل میں ہے جس کے مرکز میں ایک گڑھا ہے جس میں سے آگ نکلتی ہے۔ اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں اور ہر کمرے اور گڑھے کے درمیان ایک راستہ رکھا گیا ہے جو ڈھکا ہوا ہے۔ یہ جب چاہتے ہیں یہ ڈھکن اتار دیتے ہیں، اس راستے کو یہ جلتی ہوئی یا سلائی دکھاتے ہیں، جس سے گیس کو چراغ کی طرح آگ لگ جاتی ہے۔ اس گاؤں میں ہر جگہ ایسا ہی ہے۔ یہ جہاں بھی آگ روشن کرنا چاہیں زمین میں ایک گڑھا کھود لیتے ہیں اور کھودی ہوئی جگہ کو جلتی ہوئی دیا سلائی یا کوئی دوسرا بیرونی شعلہ دکھا کر آگ کی طرح کا شعلہ بلند کر لیتے ہیں۔ تاہم اس کی حدّت زیادہ نہیں ہوتی۔ نہ ہی اس میں دھواں نکلتا ہے۔ اسے پانی سے بجھایا بھی نہیں جا سکتا۔ بعض اوقات زمین کھودے بغیر بھی اچانک آگ جلائی جا سکتی ہے۔ اگر لوگ آگ کو کسی دوسری جگہ لے جانا چاہیں تو جہاں سے زمین کھودی گئی تھی اس کے بالمقابل چمڑے کا ایک تھیلا رکھ دیتے ہیں۔ جب اس تھیلے میں گیس بھر جاتی ہے تو یہ اسے بند کر کے وہاں سے ہٹا دیتے ہیں۔ پھر جہاں کہیں آگ کی ضرورت ہو یہ اس تھیلے کے کنارے پر لوہے کا پائپ رکھتے ہیں، اس پائپ کے کنارے سے کسی بیرونی شعلے کو چھوتے ہیں اور یوں اس پائپ کے آخری سرے تک آگ لگ جاتی ہے اور گیس لیمپ کی طرح روشنی ہو جاتی ہے۔ جب تک اس تھیلے میں گیس رہتی ہے۔ یہ روشن رہتا ہے جب ختم ہو جائے تو روشنی بجھ جاتی ہے۔ اس سوراخانی گاؤں میں تیل صاف کرنے کے کارخانے میں قائم کیے گئے ہیں جن میں زمین سے نکلنے والی قدرتی (گیس) آگ استعمال ہوتی ہے۔ سمندر کے درمیان بھی تیل کا ذخیرہ ہے۔

انتظامیہ: باکو میں زیادہ تر سرکاری ملازمین روسی ہیں۔ بظاہر وہ اس طرح کام کرتے ہیں جس

ہے یہ ظاہر ہو کہ ہر شے پوری طرح نظم وضبط کے اندر ہے اور کسی کو بھی کسی کی پرواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک بدنظمی کی فضا پائی جاتی ہے، کسی کی زندگی، املاک یا دوسری چیزیں محفوظ نہیں ہیں کوئی بھی شخص اپنے گھر رات آرام وسکون سے نہیں گزار سکتا۔ جرائم پیشہ لوگوں کی تعداد بہت ہے۔ کم راتیں ایسی گزرتی ہیں جن میں گھروں میں یا سڑکوں پر ڈاکے نہ پڑے ہوں اور دو تین افراد موت کے گھاٹ نہ اتار دیئے گئے ہوں۔ تہوارات کے وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ممکن نہیں، آپ کے ساتھ چار پانچ افراد ہوں تب آپ کہیں جاسکتے ہیں کسی قتل، چوری یا ڈاکے کی صورت میں جب لوگ حکومت سے شکایت کرتے ہیں تو ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ''جس چور کو گرفتار نہیں کیا جا۔کا وہ بادشاہ ہے''۔ ثبوت درکار ہوتا ہے اور ثبوت مہیا کرنا کوئی اتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ اسی لیے لوگ زندگی اور املاک کے زیاں کو برداشت کر لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

گمراہی اور فسق وفجور: لوگوں نے ایک شے ایسی ہے جسے آزادی اور آرام وآسائش کے ذریعے کے طور پر زندگی میں اپنالیا ہے، وہ فسق وفجور کا مرتکب ہونے کا عمل ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص کا اپنی بیوی یا جوان بیٹے سے جھگڑا ہو جاتا ہے تو وہ عورت یا لڑکا کسی کافی ہاؤس یا قحبہ خانے میں چلا جائے گا اور وہاں جا کر کہے گا: ''میں اپنی مرضی اور خوشی سے فسق وفجور کا ارتکاب کرنا چاہتا ہوں''۔ وہاں کوئی ان سے کبھی یہ نہیں کہتا کہ واپس چلے جاؤ، ایسا مت کرو، ہم تمہیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ یہ گویا ان کے لیے ایک جائے امان ہے۔ لوگ اپنی عزت وآبرو کو کنٹرول کرنے سے قاصر ہیں۔ مرد اپنی بیویوں اور نوجوان بیٹیوں سے سخت خائف ہیں۔ جب مذکورہ واقعہ پیش آ جاتا ہے تو اس حسد کے جذبے اور بے عزتی کے نتیجے میں ایسے مردوں نے افیون کافی شروع کر دی تھی، کچھ نے زہر کھالی تھی اور مر گئے تھے۔ اس آزادی کے معانی آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکے۔

اخلاقیات اور مذہب: جہاں تک میں نے دیکھا روسیوں میں متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ بداخلاق، بدکردار، گستاخ، ناانصاف، سخت طبیعت کے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں میں شادی ایک مقدس بندھن کے طور پر رائج نہیں ہوئی۔ جب کوئی مرد کسی عورت کو چاہتا ہے تو اس کے ماں باپ یا کسی پادری کو بتائے بغیر شادی کے بندھن کے بغیر میاں بیوی کا تعلق پیدا کر لیتے ہیں۔ چرچ کیا کہتا ہے ان کا اپنا قانون کیا کہتا ہے

انہیں کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ حضرت عیسیٰ، ان کے خاندان، حواریوں اور عیسائی مذہب کے قوانین
صرف تخیلات کی حد تک جانتے ہیں۔ شراب نوشی میں وہ ساری حدیں پار کر جاتے ہیں نہ اس کے لیے
رات کا خیال کرتے ہیں نہ صبح اور غلط وقت کا، نہ زیادہ پینے سے باز رہنے کا خیال آتا ہے نہ کم پینے کی جانب
رجوع کرتے ہیں۔ اتنی پیتے ہیں کہ ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں۔ پاکیزگی کیا ہے، پاکیزہ زندگی کیا ہے
انسانی اصول کیا ہیں، کسی سطح پر بھی وہ اس بارے میں سوچنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ایسے رُوسی بہت کم ہیں جو
سے 6 کلوگرام شراب یومیہ نہ پیتے ہوں۔ عموماً یہ شراب ہی پسند کرتے ہیں۔ وہ کوئی دوسرا مشروب پسند ہی نہیں
کرتے۔

باگو سے بطوم تک: ہم 16 تاریخ کو بدھ کے روز بعد دوپہر باگو پہنچے تھے۔ وہاں سے
جمعرات کے دن، 17۔ شوال (30۔ جولائی) کو چل پڑے تھے۔ ہم ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ باگو سے
بطوم تک ریل چلتی ہے۔ ریل گاڑی بلاناغہ باگو سے طفلس اور بطوم جاتی ہے۔ باکو اسٹیشن شہر سے نصف
فرسنگ کے فاصلے پر ہے۔ اس اسٹیشن کی عمارت عالیشان، وسیع وکشادہ اور دومنزلہ ہے۔ یہاں ایک گارڈ
اور کچھ کارکن رہتے ہیں۔ اسٹیشن پر بہت سے کاؤنٹر ہیں۔ ایک پر ریل کی ٹکٹیں جاری اور جمع ہوتی ہیں۔ کاؤنٹر
پر ٹکٹ لینے سے قبل کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے کاؤنٹر پر سامان کی بکنگ بھی ہوتی ہے اور سامان مسافروں
کے حوالے بھی کیا جاتا ہے سامان میں کچھ چیزیں ایسی شامل ہیں جن کا کرایہ وصول نہیں کیا جاتا۔

باگو سے بطوم تک 36 اسٹیشن ہیں۔ ہر اسٹیشن کسی بڑے اور اہم شہر میں بنایا گیا ہے جہاں سے زیادہ
سے زیادہ مسافر ریل سے سفر کرتے ہیں، ایسے شہروں کی آبادی بھی زیادہ ہوتی ہے اور ان میں کام کرنے
والے مزدوروں کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک بیس پچیس منٹوں سے لے کر
تیس منٹوں تک کا وقت لگتا ہے۔ ہر اسٹیشن پر ریل دومنٹ سے نصف گھنٹے تک رکتی ہے۔

ہر دو اسٹیشنوں کے درمیان چار چوکیاں ہوتی ہیں جن پر سنتری تعینات ہوتے ہیں۔ ان میں سے
ہر ایک میں ایک خاندان کی رہائش بھی ہوتی ہے۔ ہر دو کے درمیان ایک سنتری اور ایک نگران کھڑے ہوتے
ہیں۔ جب یہ سبز جھنڈی دکھاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ راستہ محفوظ ہے اور ریل تیزی سے دوڑ
جاتی ہے۔ جب سرخ جھنڈی دکھا دی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ریلوے لائن زیر مرمت ہے اور
ریل کو آہستہ آہستہ اور احتیاط کے ساتھ چلنا چاہیے۔ جب سرخ اور سیاہ جھنڈی بلند کر دی جائے تو اس سے

مراد ہوتی ہے کہ ریلوے پٹری خراب حالت میں ہے اور ریل آگے نہ آئے اور اس وقت تک رکی رہے جب تک وہ رکاوٹ دور نہیں کر دی جاتی۔ رات کے وقت ان جھنڈیوں کے بجائے سبز اور سُرخ بتیاں اسی طرح بلائی جاتی ہیں جس طرح جھنڈیاں بلند کی جاتی ہیں۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ تار لائن بھی موجود ہوتی ہے۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن کو تار بھیجا سکتا ہے۔ ریلوے لائن کے صحیح اور خراب ہونے کی اطلاع بذریعہ تار دی جاتی ہے۔

ریل گاڑیوں کے اندر صورت حال: ریلوے کے ملازمین وغیرہ عموماً رُوسی ہوتے ہیں اگر کوئی مسافر ذرا سی بھی بے احتیاطی کرے تو یہ بڑی صفائی کے ساتھ اسے اس کے سامان سے محروم کر دیتے ہیں۔ اگر یہ مسافر اپنے سامان کے چوری ہو جانے کی شکایت کرتا ہے تو اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ مسافر چوکنا رہے اور اپنے سامان کی حفاظت خود کرے۔ ریل گاڑی کے اندر مُسلمان، کافر بھی مل کر سفر کرتے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہوتے ہیں، عورتیں بھی۔ سب کی حیثیت اور مقام و مرتبہ مساوی تصور ہوتا ہے جس کے پاس ٹکٹ ہے وہ ریل گاڑی میں جہاں چاہے بیٹھ جائے۔ تمام اسٹیشنوں پر خورد و نوش کی چیزیں بکتی ہیں۔ جو اسٹیشن جتنے بڑے شہر میں ہوتا ہے وہاں اسی حساب سے کھانے پینے کی اشیاء زیادہ دستیاب ہوتی ہیں تاہم ان کی قیمتیں بھی اسی حساب سے زیادہ ہوتی ہیں۔ چند اسٹیشنوں پر کھانے کی چیزیں اور پھل قریبی دیہات سے آتے ہیں اور نسبتاً سستے ہوتے ہیں۔

نہر سویز: ریل 19۔ اگست بروز جمعہ رات دو بجے سویز پہنچی تھی۔ سویز اسٹیشن کے مرکز میں ہے اور رات کے اس وقت یہاں مسافروں کی بہت بھیڑ تھی۔ لوگوں کے اس ہجوم کے درمیان بہت سے ایرانی مالکان جائیداد اور کافی شاپس کے مالک نمودار ہوئے اور انہوں نے ایرانی حجاج کو اپنے گھروں پر مدعو کیا تھا۔ میں نے اس صورت حال سے یہ اندازہ لگایا کہ چونکہ کافی ہاؤسز کے مالکان کے گھر کسی نے بھی دیکھے ہوئے نہیں تھے، نہ ہی کرایے کا تعین ہوا تھا اس لیے ہو سکتا ہے اس پر کوئی تنازع کھڑا ہو جائے۔ چنانچہ میں ذاتی طور پر گھر دیکھنے گیا اور ایک گھر کا انتخاب کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے کرائے کے بارے میں بھی دریافت کر لیا تھا۔ وہ اپنا اپنا سامان وہاں لے آئے تھے چند حجاج میرے ہمراہ آ گئے تھے۔ دوسرے حجاج کا کرائے کے زیادہ ہونے پر مالکان کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ بات قونصلر تک پہنچی اور ایک مقدمہ کھڑا ہو گیا تھا۔

قونصل خانہ اور ایرانی شہری: سوئز میں سات آٹھ ایرانی نژاد بستے ہیں۔ ایرانی حکومت کا نمائندہ ایک تاجر ہے جس کا نام احمد افندی ہے جس کے والد سوئز کے بہت بڑے تاجر اور اہم شخصیت تھے۔ یہ خود بھی صاحب جائیداد اور صاحبِ ثروت تھے۔ یہ حکومت ایران، آسٹریا اور برازیل کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے مکان پر ہفتے میں تین روز ان تین ممالک کے جھنڈے لہراتے ہیں اگر ان تین ملکوں کے شہریوں کو کوئی قانونی مسئلہ درپیش ہو تو وہ اس سے رجوع کر سکتے ہیں۔ یہ بڑا بارسوخ اور صاحب اختیار تصور ہوتا ہے۔ یہاں یہ قانون بھی نافذ ہے کہ حجاج کے پاسپورٹوں پر یہاں مہر لگائی جاتی ہے۔ عثمانی ایجنٹ عثمانی حجاج کے پاسپورٹ دستخط کرتے ہیں اور ایرانی ڈپٹی اور ایجنٹ ایرانی حجاج کے پاسپورٹ دستخط کرتے ہیں، وہ اس کی فیس کے طور پر ہر حاجی سے 25 ڈالر وصول کرتے ہیں۔

جبری حراست تنہائی: سوئز پہنچنے پر ایک اور مشکل سے حجاج کا واسطہ پڑتا ہے۔ خدیو کے ایما پر معالج اعلیٰ حجاج کو صحت کے تصدیق نامے جاری کرتا ہے۔ اس کام کی بھی فیس مقرر ہے جو ہر حاجی ادا کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ معالج ہر حاجی کا طبی معائنہ کرے۔ گویا اصل مقصد ان کا طبی معائنہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ مقررہ فیس کی وصولی ہوتا ہے۔ ایک شخص دس بارہ حجاج کی طرف سے فیس لے کر جاتا ہے اور فیس ادا کر کے صحت کے تصدیق نامے لے آتا ہے۔

جدّہ کی بندرگاہ: 27۔ اگست کو ایک بجے بعد دوپہر دخانی جہاز جدّہ پہنچا تھا۔ سوئز سے جدہ تک کا یہ سفر بغیر کسی تاخیر کے 68 گھنٹوں کا تھا۔ جہاز میں جگہ کم اور مسافر اس قدر زیادہ تھے کہ تین عرب موت کا شکار ہوئے اور بہت سے لوگ بیمار پڑ گئے تھے۔

جدہ پہنچ کر جہاز کو تین گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس وقت تک جہاز کے قریب کوئی کشتی نہ آئی جب تک جبری حراستِ تنہائی کے لیے سرکاری ڈاکٹر دوسرے عملے کے ہمراہ پہلے اس جہاز پر نہ آ گئے تھے۔ انہوں نے جہاز کی تلاشی لی اور یہ تسلی کر لی تھی کہ جہاز پر کوئی وبائی مرض نہیں پھیلا تھا۔ اب انہوں نے لوگوں کو جدہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ جہاز کے مسافر لانچوں اور کشتیوں میں سوار ہو کر گئے تھے۔ کرایہ اپنی مرضی کا، عام شرح سے کہیں زیادہ وصول کیا گیا تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ کرایہ تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ایک حصہ حکومت کا، ایک ہر ملک کے قونصل کا اور ایک ملاح کا۔ پوری سلطنت عثمانیہ میں بالخصوص جدہ

میں ملاحوں سے بھاری ٹیکس وصول کیے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ان حجاج کو جبری حراست تنہائی کے لیے مخصوص عمارت میں لایا جاتا ہے، جو ساحل سمندر پر واقع اور شہر سے بالکل قریب ہے۔ لوگ بغیر سامان کے اتر جاتے ہیں اور اس احاطہ میں باقاعدہ پہرہ ہوتا ہے۔ ہر حاجی کو ایک طبع شدہ سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا جبری حراست تنہائی کا پرمٹ ہوتا ہے، ہر شخص سے اس کی ایک مقررہ فیس وصول کی جاتی ہے۔

اس احاطے کے اندر پیشہ ور حجاج گائیڈ ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیٹھے ہوئے تھے انتظار تھا کہ کون کون سے حجاج کس گائیڈ کے حصے میں آتے ہیں۔ یہ گائیڈ اب ان حجاج کے سر پر اتالیق بن گئے تھے۔

رسوم: جب کوئی حاجی جبری حراست تنہائی کی فیس برائے حصول پرمٹ ادا کر دیتا ہے پاسپورٹ پر مہر لگانے کی فیس بھی وصول کر لی جاتی ہے تو پھر حاجی کو اس احاطہ سے باہر نکلنے کا ٹکٹ مل جاتا اور وہ اب آزادی سے جا سکتا ہے۔ باہر آنے کے بعد ہر حاجی اپنے سامان کی طرف جاتا ہے جو بذریعہ یہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ شہر میں داخلے کے لیے ایک خاص دروازے پر پہنچنا ہوتا ہے۔ کسٹم ہاؤس میں حجاج کے سامان کی تلاشی لی جاتی ہے۔ اگر ان کے سامان میں سے کوئی ایسی شے نکل آئے جس پر کسٹم ڈیوٹی لگتی ہے تو اس سے وہ وصول کر لی جاتی ہے۔ اگر ایسی کوئی چیز نہ بھی نکلے تو ہر حاجی سے یہ لوگ جتنی رقم چاہیں کسی نہ کسی بہانے ضرور وصول کر لیتے ہیں۔ اسے وہ کسٹم افسر کی ''بخشیش'' یا انعام کا نام دیتے ہیں۔

کسٹم ہاؤس جمعہ کے دن قبل از دوپہر بند ہو جاتا ہے اگر کوئی اس وقت جہاز سے اترے تو اس کے لیے شہر میں داخلے کی کوئی پابندی نہیں مگر سامان دوسرے روز تک کسٹم ہاؤس میں رکھ لیا جاتا ہے جب تک اس سامان کی پڑتال نہ کر لی جائے۔ البتہ وہ اہم شخصیات جو اپنی آمد کی اطلاع اپنی حکومت کے قونصل خانوں کو کر دیتی ہیں ان کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوتا۔ متعلقہ قونصل خانہ کسٹمز کے افسر اعلیٰ سے پرمٹ حاصل کر لیتا ہے کہ فلاں مسافر کے سامان کو نہ روکا جائے۔ اس طرح یہ لوگ تو جمعہ کے روز بھی سامان سمیت شہر میں داخل ہو سکتے ہیں۔

آرام: حجاج کے گائیڈ نے جس عالیشان گھر کی نشاندہی کی تھی ہم اس گھر میں منتقل ہو گئے تھے۔

ہم جس کمرے میں داخل ہوئے اس میں قالین اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ہم تھکے ماندے یہاں بیٹھ گئے کچھ دیر بعد پردہ اٹھا اور ہمیں کھانے کے کمرے میں چلنے کے لیے کہا گیا تھا۔ دستر خوان پر ایک بڑی سی ر میں بہت سی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ حجاج کے گائیڈ نے صاحب خانہ سے کہہ کر یہ سارا انتظام کرایا تھا۔ ہم نے کھانا کھایا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ کھانا بے حد لذیذ تھا مگر جب صاحب خانہ کو ہم نے اس کا بھاری بل ادا کیا تو سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا۔

حجاج کے گائیڈ: میں میں جب اپنے گھر چلا گیا تو سیّد منصور جو شیعہ حجاج کا گائیڈ تھا اور جے اس کے نوکروں نے بتایا تھا کہ چند حجاج جدہ پہنچے ہیں، گدھا لے کر مکہ سے یہاں پہنچا تھا۔ اس نے دوستی کے ایسے دعوے کیے کہ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرا غلام ہو یا کوئی بہت پرانا ہمدم جس سے میری برسوں کی دوستی تھی۔

یہاں میں ان حالات کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا جن کا تعلق پیشہ ور حجاج گائیڈ سے تھا۔ شریف مکہ نے مکہ مکرمہ میں تیس شیعہ اور سنّی حجاج گائیڈ مقرر کیے ہیں، ان کے پاس اجازت نامہ ہوتا ہے کہ یہ حجاج کی حج کی ادائیگی میں رہنمائی کریں۔ ان میں سے ہر ایک کے سات آٹھ معاونین اور نوکر ہوتے ہیں۔ حج کا موسم شروع ہونے سے قبل یہ ان شہروں میں چلے جاتے ہیں جہاں حجاج عارضی طور پر آ کر ٹھہرتے ہیں، مثلاً نجف، کربلا، بغداد، بمبئی، بصرہ، بندر عباس، استنبول اور اوڈیسہ۔ انہیں جو حاجی بھی ملتا ہے یہ اس کو درج ذیل دعوت نامہ جاری کرتے ہیں: ''آپ وہاں کی مذہبی رسوم کے بارے میں کوئی معلومات نہیں رکھتے، آپ کو کوئی ایسا گائیڈ چاہیے جو اس بارے میں علم اور معلومات رکھتا ہو، یعنی حج گائیڈ اور مجھ سے بہتر گائیڈ آپ کو مل ہی نہیں سکتا۔'' بیشک حجاج کی اپنے خدا سے یہی التجا ہوتی ہے کہ انہیں کوئی ایسا صاحب علم گائیڈ مل جائے جو حج کے دوران ان کی رہنمائی کر سکے۔ حج بدل کے لیے افراد کو متعارف کرانے والے ''حج فروش'' (جو مشہور ہوتے ہیں اور ہر سال مکے آتے ہیں) حج گائیڈ سے کچھ رقم لے کر ایسے افراد کو ان کے سپرد کرتے ہیں۔ حج کے ایام سے کچھ روز پہلے یہ جدہ آ کر سارے انتظامات کر کے واپس مکے لوٹ جاتے ہیں۔ یہ حجاج کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ انہیں بہت اچھے گائیڈ فراہم کریں گے۔ یہ حج گائیڈز کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ حاجی فریب میں آ کر مان جاتا ہے۔ یہ دوسرا کام یہ کرتے ہیں کہ ان تمام بندرگاہوں پر اپنے ایجنٹ اور نوکر بھیج دیتے ہیں۔ جہاں حجاج اترتے ہیں مثلاً جدہ، یانبو یا مدینہ تاکہ حجاج کو تلاش کر سکیں۔ جوں ہی کوئی حاجی اس قسم کا لفظ منہ سے نکالتا ہے: ''میرا حج گائیڈ فلاں فلاں ہے'' تو یہ ایجنٹ اور نوکر متعلقہ حج گائیڈ کو جا کر اطلاع

تے ہیں: ''فلاں فلاں حاجی آپ کی رہنمائی میں آنے والا ہے، اس کا خیال رکھنا''۔ اگر تو حاجی کوئی معروف
شخص ہو تو حج گائیڈ ایک دو دن کا سفر طے کر کے بھی اسے خوش آمدید کہنے پہنچتا ہے اور ایک رات کھانے پر اسے
اپنے گھر بھی مدعو کرتا ہے۔ یوں وہ حاجی اس حج گائیڈ پر مکمل انحصار کرتا اور مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر ہوتا
ہے۔ مثال کے طور پر اگر اسے کچھ سامان بیچنا ہو تو وہ اپنے حج گائیڈ کو مطلع کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور اسے اس کی
رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ خریدار کا انتظام تو کرتا ہے مگر اس سامان کی آدھی قیمت خود وصول کر لیتا ہے۔

اگر حاجی وہاں سے تحائف لانا چاہتا ہے یا تجارت کی غرض سے کچھ سامان خریدنا چاہتا ہے تو اس کا
گائیڈ فروخت کنندہ کے پاس جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے: ''اس حاجی کو سامان مہنگے داموں خریدنے دو''۔
یوں منافع کا نصف گائیڈ کی جیب میں چلا جاتا ہے۔

یا اگر، مثال کے طور پر حاجی جدہ سے سعدیہ یا مکہ جانا چاہتا ہے یا اسے مکہ سے مدینہ طیبہ تک یا ینبو
تک سواری کرائے پر لینی ہے تو اس کے لیے بھی اسے اپنے حج گائیڈ پر انحصار کرنا پڑے گا۔ چنانچہ امسال ہر
شخص جو جدہ سے سعدیہ میقات گیا اس نے اونٹوں کے کرائے کے طور پر اٹھارہ ڈالر ادا کیے۔ ان میں سے
سات ڈالر تو اس اونٹ کا کرایہ ہوتا ہے جو اس حاجی کے لیے منگوایا جاتا ہے۔ ایک اونٹ کے لیے پاشا، شریف
مکہ، قونصل، حج گائیڈ اور ایجنٹ یا بروکر گیارہ ڈالر وصول کرتے ہیں۔

اگر کوئی حاجی جدہ یا مکہ میں رہائش کرائے پر حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس میں حج گائیڈ ایک خاص
کردار ادا کرتا ہے اور اس میں وہ اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔ جب کوئی حاجی عرفات یا منیٰ جاتا ہے تو گدھے کا
کرایہ اور خیمے کا کرایہ زیادہ نہیں تو نصف ضرور حج گائیڈ کی جیب میں چلا جاتا ہے۔

جب کوئی حاجی یا اس کی پارٹی کا کوئی دوسرا شخص وفات پا جاتا ہے تو حج گائیڈ متوفی کے لیے جو
دعائیں مانگتا ہے اس کے عوض بھی اسے معقول رقم ملتی ہے۔ اگر کوئی حاجی غریب ہو اور اس کے پاس پیسے کم
ہوں تو وہ حج گائیڈ کو کم از کم دو ڈالر ضرور ادا کرتا ہے۔ اگر وہ یہ رقم ادا نہیں کرتا یا اس کے پاس یہ رقم نہیں ہے تو
اس کے نتیجے میں حاجی اور حج گائیڈ کے درمیان دشمنی، جھگڑا، شریف مکہ کو درخواستیں، گورنر اور قونصل تک رسائی
کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ یہ رقم بزور طاقت، تشدد یا بذریعہ قید اس بے بس حاجی سے وصول کی جاتی ہے۔
اگر حاجی کوئی اہم شخصیت، کوئی متمول انسان ہو تو حج گائیڈ اس سے ایک سے دس لیرے تک وصول کرنے کی
پوری کوشش کرتا ہے۔

حج کے موسم میں ایک حج گائیڈ کی آمدنی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یہ اس کے لیے، اس کے معاونین اور ایجنٹوں کے لیے دو سو تمان سے تین ہزار تمان تک ہوتی ہے۔

نئے حجاج کی آمد: میں دو تین دنوں کے اندر اندر جدہ میں تھا۔ بصرہ اور بغداد سے دو بحری جہاز آ چکے تھے۔ ان پر ایک ہزار ایرانی حجاج تھے۔ جو جہاز پہلے پہنچا وہ جدہ کی گودی میں لنگر انداز ہوا۔ دوسرا جہاز اس کے بعد آیا تھا یہ پہلے جہاز کے قریب آ کر لنگر انداز ہوتے وقت اس سے ٹکرا گیا تھا اور پہلے سے لنگر انداز جہاز فوراً ٹوٹ گیا تھا۔ جہاز کا کپتان، عملہ اور حجاج گھبرا گئے تھے۔ وہ اپنا سامان چھوڑ کر خود کشتیوں میں سوار ہو گئے تھے۔ ساحل کے قریب ہونے کی وجہ سے جہاز غرق آب نہیں ہوا۔ تاہم اس افراتفری میں چند حجاج کا کچھ سامان سمندر میں گر گیا تھا۔ جب اس حادثے کی تفتیش ہوئی تو یہ بات سامنے آئی کہ دونوں جہازوں کے کپتان ایک دوسرے سے مخاصمت رکھتے تھے اور ایک عرصے سے ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بالآخر اس جہاز کے مالک سے، جو اس حادثے کا ذمہ دار تھا اور جہاز کے کپتان سے ہرجانہ وصول کر لیا گیا تھا۔

حجاز کے صوبے میں حجاج کے لیے کرائے: شریفِ مکہ کی طرف سے ہر مُلک کے حجاج کے گروپ کے لیے ایک شتر بروکر مقرر کیا جاتا ہے جو حجاز بھر میں، جدّے سے سعدیہ اور مکّہ یا مکہ سے عرفات یا مکہ سے مدینہ منورہ اور ینبوع تک سواری والے جانور کرائے پر حاصل کرنے کا انتظام کرتا ہے۔ اس طرح چھ شتر بروکر مقرر کیے جاتے ہیں: ایک ایرانی حجاج کے لیے، ایک سلطنت عثمانیہ کے حجاج کے لیے، ایک جاوا کے حجاج کے لیے، ایک ہندوستان کے، ایک شمالی افریقا اور ایک مصر کے حجاج کے لیے مقرر ہوتا ہے۔ یہ مل بیٹھتے اور آپس میں مشورہ کرتے ہیں اور پھر ہر سال تمام جانوروں کو کرائے پر لینے کے لیے اس شتر بروکر کے علم میں لانا اور اس کی مدد سے اونٹ یا کوئی دوسرا جانور کرائے پر حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مکہ سے مدینہ یا مدینہ تا ینبوع یا جدّہ یہ شتر بروکر کرایہ مقرر کرتے ہیں۔ جو کرایہ مقرر ہو جائے حجاج کے لیے ادا کرنا ضروری ہوتا ہے اور اس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔ ہر اونٹ کے لیے فیس کا ایک حصہ شریف، ایک قونصل، ایک حج گائیڈ اور ایک حصہ ان کا اپنا مقرر ہو جاتا ہے اور اسے کرایے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ ایرانی حجاج کے لیے جو شتر بروکر مقرر ہوتا ہے اس کا نام محمد قبولی ہے۔ ہر ایرانی اس کے مشورے اور منظوری سے جانور کرائے پر لے سکتا ہے۔ یہ تمام

شتر بردو کر بہت امیر ہو گئے ہیں۔

کوہِ سنائی پر مابعد حج جبری حراستِ تنہائی کا اسٹیشن: 10 نومبر 1885ء بروز منگل ہم راستے میں تھے۔ 11۔نومبر بروز بدھ نو بجے ہم کوہ سنائی کے قریب ساحل پر لنگر انداز ہوئے تھے جو امسال جبری حراستِ تنہائی کا مقام مقرر ہوا تھا۔ جب کپتان نے متعلقہ افسروں کو اپنی آمد کی اطلاع کر دی تو دس بارہ سرکاری کشتیاں ہمارے دخانی جہاز کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ حجاج کو کرایہ لیے بغیر ان پر سوار کرا دیا گیا تھا۔ عام حالات میں ملاح، حجاج سے ضرور کچھ نہ کچھ بطور کرایہ وصول کر لیتے تھے۔ خشکی پر پہنچ کر یہ پیدل چلتے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک سرکاری عمارت تعمیر کی گئی تھی جس میں زیادہ تر کمرے کشادہ اور ہوادار اور کچھ ہال کمرے ہوتے تھے۔

جبری حراست تنہائی کے ملازمین میں درج ذیل شامل ہوتے تھے: ایک معالج اعلیٰ، دو معالجین، ایک انسپکٹر، ایک معاون انسپکٹر، ایک سیکورٹی کا انچارج جسے ''محافظ'' کہتے تھے اور 200 پیادہ سپاہی۔

یہ دستے حجاج کو ادھر ادھر پھرنے سے منع کرتے ہیں۔ جب عمارت کے سامنے تمام حجاج جمع ہو جاتے ہیں تو اعلان کر دیا جاتا ہے کہ تمام حجاج ٹکٹ حاصل کر لیں اور اس عمارت کے اندر چلے جائیں۔ ایک کمرے میں انسپکٹر، معاون انسپکٹر اور اکاؤنٹنٹ بیٹھتے ہیں۔ ہر حاجی ڈیڑھ ڈالر ادا کر کے ٹکٹ حاصل کرتا ہے جو جبری حراست تنہائی کے بارے میں کوئی معلومات نہ رکھتے تھے ان سے یہ ڈیڑھ سے دو ڈالر وصول کر لیتے تھے۔ کئی دوسرے طریقوں سے بھی یہ حجاج کو ٹھگ لیتے تھے۔ مثلاً یہ کرنسی تبدیل کرنے کے بہانے حجاج سے کافی پیسے ہتھیا لیتے تھے۔ یہ ہر شخص کو چھپا ہوا ٹکٹ دیتے تھے اور دو یا دس افراد کو بھی ایک ہی ٹکٹ دیا جاتا تھا۔ جب یہ تمام حجاج سے روپیہ اکٹھا کر لیتے اور انہیں ٹکٹیں دی جاتیں تو پھر اکاؤنٹنٹ عمارت کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا تھا، اس کے ساتھ دو سپاہی بھی ہوتے تھے اور پھر یہ لوگوں سے ٹکٹ چیک کرتے تھے۔ یہ گروپوں کی شکل میں اندر داخل ہوتے تھے۔ اس عمارت کے کچھ کمروں میں دھونی دینے کے آلات بھی ہوتے تھے۔ اگر لوگوں کو کوئی وبائی مرض لاحق نہ ہوتا تو انہیں دھونی نہیں دی جاتی تھی۔

میدان میں نصب خیمے: عمارت کا ایک اور دروازہ جس میں سے لوگ باہر نکلتے ہیں کے

قریب ہی ایک میدان ہے۔ اس میدان میں چار گروپوں کے خیمے نصب ہوتے ہیں۔ ہر گروپ دوسرے گروپ سے ایک میل کی مسافت پر ہوتا ہے اور اس کے فوجی سفید خیموں کی تین قطاریں ہوتی ہیں۔ ہر قطار میں 25 خیمے ہوتے ہیں۔ ہر گروپ کے خیموں کے سامنے چھ ایسے خیمے ہوتے ہیں جن میں دُکاندار ٹھہرتے ہیں۔ دو کافی ہاؤسز اور چار آٹے دال کے خیمے ہوتے ہیں۔ ہر گروپ میں ایک خیمہ ایسا ہوتا ہے جس میں دو یہودی کرنسی تبدیلی کرنے والے اور دو آرمینی قصائی ہوتے ہیں۔ یہاں سے زندہ بھیڑیں بھی مل سکتی ہیں مگر یہ مہنگی بہت ہوتی ہیں۔ ہر گروپ کے خیمے کے نزدیک دولوہے کے پانی کے ٹینک ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے پاس دو تین ڈول ہوتے ہیں جن سے یہ پانی کھینچتے ہیں۔ سرکاری اونٹوں پر پانی لاد کر لایا جاتا ہے اور ان ٹینکوں میں انڈیل دیا جاتا ہے۔ حجاج کو اتنا ہی پانی بلا قیمت دیا جاتا ہے جتنا انہیں ضرورت ہوتا ہے۔ ہر پانچ، سات، آٹھ یا دس لوگوں کے پاس ایک خیمہ ہوتا ہے۔ خیموں کے ایک گروپ کی نگہداشت تیس سپاہی کرتے ہیں۔ وہ رات کے وقت حجاج کے سامان کی تلاشی لیتے ہیں اور دن کے وقت بھی یہ تسلی کر لیتے ہیں کہ ایک جہاز اور ایک خیمے کے افراد آپس میں نہ ملیں۔ جبری حراست کی تنہائی کے ہاں ہماری حاضری کے بعد دو اور جہاز آ گئے تھے جنہیں ہم دور سے دیکھ سکتے تھے مگر نہ تو ہم ان کے اندر سوار لوگوں کو دیکھ سکتے تھے نہ ہی وہ ہمیں دیکھ سکتے تھے۔

جبری حراستِ تنہائی: اب اس موضوع کو مختصراً یوں ختم کرتے ہیں کہ جبری حراست تنہائی کا قیام سلطنت عثمانیہ نے استنبول میں ادارہ صحت کی تشکیل کے ذریعے کیا تھا اگر کوئی وبائی بیماری نہ ہو تو جبری حراست تنہائی میں حجاج کا قیام 48 گھنٹوں کے لیے ہوتا ہے۔ اگر ان 48 گھنٹوں میں ان میں سے کوئی مر جائے تو اس مدت میں تجدید کر دی جاتی ہے۔ تاہم اس ادارے کے ملازمین کا تقرر مصر کا خدیو کرتا ہے۔ سنائی وادی بھی سلطنتِ مصر کا حصہ ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے خدیو مصر کی سلطنت عثمانیہ کی ملازمت یا اس سے وفاداری صرف یہی کچھ ہے کہ چاند تارے والا جھنڈا استعمال کر لیا جائے اور جبری حراستِ تنہائی کا معاملہ سامنے رہے۔ اس سے سلطنتِ عثمانیہ کو نہ کوئی نقصان ہوتا ہے نہ اس پر اس کا کچھ خرچ ہوتا ہے۔ جو وہ اس پر خرچ بھی کرتی ہے اس سے دوگنا حجاج سے واپس آ جاتا ہے۔ اس ادارے کے ملازمین پر کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔

جب جبری حراست تنہائی کے کام کے لیے افسروں کی تعیناتی ہوتی ہے تو یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں حجاج کو نوچنے اور لوٹنے پر مامور کیا جا رہا ہے۔ یہ بات کھل کر اس وقت سامنے آ جاتی ہے جب جبری حراست تنہائی کے افسران مجاز بالخصوص معالج اعلیٰ دخانی جہازوں کے کپتانوں سے کچھ نہ کچھ وصول کر لیتا ہے تاکہ وہ کوئی

مسئلہ کمزانہ کردیں۔ حراست تنہائی کے دوران اگر دونوں میں سے کوئی مر جاتا ہے تو اس مدت کی وہ تجدید نہیں کرتے نہ ہی دخانی جہاز کو روکا جاتا ہے۔

تاہم چونکہ موسم گرما کی مدت ختم ہو رہی تھی اور اس مقام پر خشک زمین رطوبت کے بغیر تھی اور پانی بھی قابل استعمال تھا، اس لیے اس جبری حراست تنہائی کا وقت حجاج کو گراں نہ گزرا تھا۔ وہ یہاں 11۔ نومبر بروز بدھ پہنچے تھے اور 13۔ نومبر بروز جمعہ انہیں اس حراست سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ سرکاری کشتیاں حجاج کو دخانی جہاز تک مفت لے جا رہی تھیں اور غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ قبل دخانی جہاز روانہ ہو گیا تھا۔

بطوم میں ایرانی عطائی (نیم حکیم): اس شہر میں ایرانی حجاج کے لیے کسٹم والوں سے بڑھ کر ایک پریشان مسئلہ عطائیوں کا تھا۔ بہت سے ایرانی یہاں بروکرز کا کام کرتے ہیں مگر یہ برسوں سے بدمعاش اور فراڈیے مشہور ہیں۔ ان کے دو گروپ ہیں۔ ان کے اپنے اپنے گروپ میں اور کئی افراد شامل ہیں، جو حجاج کو لوٹنے اور ان سے مال اکٹھا کر لینے میں بڑے ماہر ہیں۔ ان کے سرغنوں کے نام درج ذیل ہیں۔

- ٹیکران جو آرمنی ہے، یہ ایرانی نژاد ہے اور بعض اوقات اسے بطوم میں قونصلر کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔
- حاجی غلام، جو ایرانی ہے اور جو کسٹم ہاؤس میں بطور سپاہی ملازم ہے۔
- کربلائی محمد علی، مشہدی رضا اور مشہدی علی یزدی۔

سب سے پہلے تو یہ اس بات پر اڑ جاتے ہیں کہ مسافروں اور حجاج کو اپنی پاسپورٹ فیس یہاں خود ادا کرنی ہے حالانکہ وہ یہاں ادا نہیں ہوتی۔ اس طرح ہر شخص کو دو تمان پاسپورٹ فیس دینی پڑتی ہے۔ ہر مسافر جو بطوم میں رہائش کرائے پر لیتا ہے اس کا کرایہ یہ وصول کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر رہائش کا کرایہ نصف تمان ہے تو یہ دو تمان وصول کر لیتے ہیں۔ یہاں جو چیز بھی کوئی حاجی خریدتا ہے اس کی اسے دوگنی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے کیونکہ یہ سرغنے دکانداروں سے ملے ہوتے ہیں اور قیمتیں یہ پہلے سے بڑھوا لیتے ہیں کیونکہ خریداری بھی ان کے توسط سے ہوتی ہے۔ کسی مسافر نے کوئی چیز بیچنی ہو تو یہ اس کی قیمت کم دلواتے ہیں۔ ایک سرغنے کے افراد دوسرے کے حجاج کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے ہیں۔ حجاج کو مقدمہ بازی اور جرمانے کی ادائیگی تک میں پھنسا دینے کے ان کے پاس بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔ یوں ایک ایرانی مسافر پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ کہاں جائے؟ کیا کرے؟ وہ کس سرغنے پر اعتماد کرے؟ یہ بیچارا اپنے سامان، کپڑوں،

خوراک اور پانی سے کیسے دستبردار ہو جائے؟ بھاری کسٹم ڈیوٹی وہ کیوں کر ادا کرے؟ وہ ان رُوسی چوروں اور ایرانی بدمعاشوں سے کیسے بچ سکتا ہے؟ وہ راہِ فرار پائے تو کیسے پائے؟

بلاشبہ حاجی عجیب صورت حال میں گرفتار ہو چکا ہے۔ ان دنوں تو بلا مبالغہ ''باپ کو بیٹے کی خبر نہیں ہوتی''۔ ''یہ تو یوم حساب لگتا ہے''۔ ''یہ تو وہ دن ہے جس دن بھائی بھائی سے پناہ مانگتا ہے''۔ یہاں پہنچ کر بھی مسافر سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ میرے پاس چونکہ کوئی ایسا سامان تھا ہی نہیں جس پر کسٹم ڈیوٹی لگتی ہو اس لیے میں آرام سے تھا اور دور کھڑا دیکھ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

یہ لوگ بغداد کے ایک مشہور صوفی شیخ شبلی کی کہانی یوں سناتے ہیں کہ وہ اپنے سفر کے دوران ایک قافلے کے ساتھ تھے جب لوگوں کو اپنے سامان کے ضائع ہو جانے پر رنج و غم کا شکار دیکھا۔ لوگ رو رہے تھے، فریاد کر رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ شیخ ایک گوشے میں بیٹھے قہقہے لگا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے شیخ شبلی سے پوچھا: ''آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟'' شیخ نے زیرِ لب تبسّم فرمایا اور جواب دیا: ''ان لوگوں کے پاس جو کچھ تھا ڈاکوؤں نے لُوٹ لیا ہے۔ یہ اس لیے رو رہے ہیں اور پریشان ہیں۔ میرے پاس کچھ ایسا سامان نہیں جسے یہ چور چرا کر لے جائیں اس لیے میں آرام میں ہوں اور ہنس رہا ہوں..... جس پر بوجھ کم ہو گا، اسے بچا لیا جائے گا''............

☆☆☆

13۔ آرتھر جے بی ویول

اینگلوافریقا......1908ء

آرتھر ویول پچیس برس کی عمر میں پہلا حاجی مصنف تھا جس نے دمشق مدینہ ریلوے اور اُس آخری مغربی بہروپیے اور جھوٹے مُدعی کے بارے میں لکھا، جس نے حج پر قلم اُٹھایا تھا۔ اس کا باپ ایک فوجی کرنل تھا۔ اس کا چچازاد 47-1943ء میں ہندوستان کا وائسرائے تھا۔ اپنے خاندان کے دوسرے فوجیوں کی طرح، ویول کی ٹریننگ بھی رائل ملٹری کالج، سینڈھرسٹ میں ہوئی تھی اور پھر اسے ویلز کی رجمنٹ میں کمشن مل گیا تھا۔ وہ جنوبی افریقا کے محاذ پر لڑا بھی تھا اور برطانوی انٹیلیجنس میں بھی خدمات سرانجام دیتا رہا تھا۔ اس نے 1906ء میں فوج سے استعفیٰ دے دیا تھا اور ممباسا کے قریب ایک فارم خرید لیا تھا۔ یہاں اس کی ملاقات ان بہت سے لوگوں سے ہوئی جو پہلے سے یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اس نے عربی سیکھی، اسلام کا مطالعہ کیا اور 1907ء میں برطانیہ واپس آ گیا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک تنخواہ دار سواحلی ملازم مسعودی بھی تھا جس نے اس کے ہمراہ حج پر جانا تھا۔

مارسیلز پہنچ کر ان دونوں نے چور بازار (بلیک مارکیٹ) سے دوترکی پاسپورٹ خریدے۔ ان کے ساتھ ایک تیسرا شامی شخص عبدالواحد بھی تھا۔ یہ بذریعہ ریل جنیوا پہنچے، وہاں سے بحری جہاز سے مصر آ گئے تھے۔ ویول ہمیں راستے ہی میں ایک مسلمان کا روپ دھار لیا تھا۔ اس نے سر منڈوا لیا تھا، مغربی لباس بیروت پہنچ کر اتار دیا اور د مشق پہنچ کر وہ رمضان کے روزے بھی رکھتا تھا۔ درج ذیل اقتباسات میں وہ اپنے بہروپ کے خطرات کا ذکر کرتا ہے۔ ویول حج کو بڑے احترام اور عقیدت سے دیکھتا تھا لیکن یہ سب دُور دُور سے ہی تھا ورنہ وہ تو اسے بطور ایک مہم جُو کے، ایک عارضی سہارے، آسرے کے طور پر ہی اپنانا چاہتا تھا۔

رمضان المبارک کے ختم ہو جانے کے بعد یہ تین ہمسفر دمشق کے مضافات کی طرف نکل گئے تھے۔ یہاں انہیں وہ سالانہ قافلہ نظر آیا جو مدینہ منورہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ حج رپورٹنگ کے لیے اس حصے کو منتخب کرنے کے علاوہ، ویول اپنے آپ کو ایک پیراگراف کی تفصیل تک محدود کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ... بس شہر آ کر چند دنوں کے بعد ریل کے تین ٹکٹ خریدتا ہے۔ وہ 1908ء میں شام میں تھا، یہاں اس کی آمد کے

اسباب کبھی سامنے نہیں آئے مگر یہ زمانہ بالکل وہی زمانہ ہے جب حج سفر میں ایک اہم موڑ آیا تھا۔ دمشق۔ مدینہ حج ریلوے کو مکمل ہوئے آٹھ برس گزر گئے تھے۔ دربار سلطنت عثمانیہ کی کوششوں کا سہرا اس ریل کا اجرا تھا۔ دربار سلطنتِ عثمانیہ خلافت کو دوبارہ واپس لانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ یہ ایک خالصتاً اسلامی معاملہ تھا اور ریل کے اس راستے سے حجاج کو بہت فائدہ پہنچا تھا۔ آٹھ ہزار ترک سپاہیوں نے آٹھ برس تک کام کر کے اسے مکمل کیا تھا۔ دنیا بھر کے مسلمانوں نے اس کے لیے مالی تعاون کیا تھا۔ اس میں سوائے چند جرمن انجینئروں کے یورپ نے کوئی مدد نہیں کی تھی۔ نئے ریل راستے نے ایک ہزار میل کے سفر میں لگنے والے تیس دنوں کو صرف پانچ دنوں تک محدود کر دیا تھا۔ تیسرے درجے کا ٹکٹ تین پاؤنڈ کا آتا تھا۔ ریل کے سفر نے فوجی دستوں کی نقل و حمل بھی آسان بنادی تھی۔ اندرونی حج ٹرانسپورٹ کے طور پر ریل نے ایک نئے دور کو متعارف کرایا تھا۔ آنے والے پانچ برسوں میں مشرق قریب کے مرکزی علاقوں اور جنوبی صحراؤں کے درمیان اس ریل پر ایک ملین سے زیادہ حجاج نے سفر کیا۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے اس ریل پر سواری کی، ان میں ویول بھی شامل تھا۔

ریل نے ایک حاجی کے مقدر میں، اس سفر میں بہتری پیدا کرنے میں کئی حوالوں سے اہم کردار ادا کیا۔ اس سے حجاز میں طاقت کا توازن بگڑ گیا تھا۔ ایک مختصر سا خاکہ ایک اقتباس کی شکل میں یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔ ویول نے بتایا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جو تمام پارٹیوں کے لیے خطرہ کا باعث تھی...... مدینہ کے شہری، بدو عملی کی طرح دیہی قبائل، قابض ترک اور حجاج سبھی کا دعویٰ تھا کہ وہ حفاظت کرنے والے تھے۔ اس نے بڑی تیزی کے ساتھ ترک افواج کی حالت جنگ کو قلمبند کیا۔ توپ خانے کے فائر سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ریل شہر کے قریب پہنچ گئی ہے۔ وہ جب مدینہ منورہ پہنچا اس وقت دس ہزار دستوں نے بیس توپوں کے ساتھ دفاعی مورچے کو سنبھال رکھا تھا۔ باہر بیس ہزار بدو انتظار میں تھے۔ ایک حالیہ جنگ کا ذکر بھی ویول نے کیا ہے جس میں ایک روسی انقلابی پارٹی کی مشین گن استعمال ہوئی ہے۔ اس سے قاری کو اندازہ ہو جائے گا کہ حجاز اب جدید جنگ و جدل کے دور میں داخل ہو رہا تھا۔ ویول اور مسعودی نے اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کیں کہ وہ چھاؤنی کی حفاظت میں مدد کرنے کو تیار ہیں۔ ان کی یہ پیشکش اس لیے مسترد کر دی گئی تھی کیونکہ وہ حاجی تھے۔

ویول کی عسکری دلچسپی نے اُسے شہر کی دیگر باتوں کی طرف سے غافل نہیں کیا تھا۔ وہ اقتصادی

حوالے سے حج کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ 1908ء میں مدینے کے ہر مرد نے حجاج کی خدمت میں چند ماہ رہ کر سال بھر کے اخراجات کے لیے کافی رقم کمالی تھی۔ ویول نے حاجی کے لیے مدینے کی خاص طاقت کو بھی صحیح صحیح قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''مکہ میں جلال اور رعب ودبدبے کا احساس غالب ہوتا ہے'' اور مدینہ منورہ میں ''یہاں ذاتی عنصر شامل ہو جاتا ہے، محبت کا، شفقت کا عنصر''۔

جدہ میں جب ہم اگلی بار ویول سے ملتے ہیں تو ویول اور اس کے ساتھیوں نے شہر کی گلیوں میں ہر طرف حجاج کا ہجوم دیکھا تھا جنہوں نے احرام باندھ رکھے تھے۔ یہ اونٹوں پر سوار مکے جا رہے تھے۔ یہ بھی اس ہجوم کا حصہ بن گئے جو پہاڑیوں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مکہ مکرمہ میں ویول کی ملاقات زم زم کنویں کے سردار سے ہوئی۔ اس میں اس کی شعوری کوشش شامل تھی۔ یہ وہ شہر تھا جہاں بنک کوئی نہیں تھا کرنسی تبدیل کرانے میں دقت پیش آتی تھی اور قدم قدم پر چوروں کا ڈر رہتا تھا۔ حج کے بعد زیادہ تر حجاج کو ایک ہفتے تک مکہ میں رکنا پڑا تھا۔ جب ترک دستے عرفات سے مکہ مکرمہ واپس آ گئے تاکہ سڑکوں کی حفاظت کر سکیں تو ویول اور اس کے دونوں ساتھی جدہ چلے گئے، جہاں وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔

یورپی آبادیوں میں مسلمانوں کی خوراک کا مسئلہ، جبری حراستِ تنہائی کے قوانین کے موضوع پر ویول نے قلم اُٹھایا ہے جو اس سے قبل فارانی کے مطالعہ میں آ چکے تھے۔ اس کا لہجہ نرم ہے، وہ ذہانت کی باتیں کرتا ہے، اس کی آواز ایک باصلاحیت انگریز کی آواز ہے، جو مشرق کے رازوں کو لندن کے قارئین کے لیے جمع کر رہا ہے۔ وہ دینیات کو آسانی سے ترتیب دے دیتا ہے، اس کی حسِ مزاح جدید ہے جس میں طنز کا نشتر پایا جاتا ہے۔ وہ مکہ کی طبعی تشریح مختصر اور جامع شکل میں پیش کرتا ہے۔ اسے یہ احساس تھا کہ ایک اچھا سفرنامہ لکھنا اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کے ساتھ سفر میں دو مسلمان بھی تھے اس لیے دوسرے یورپی سفرنامہ نگاروں کی نسبت شہر کی جذباتی طاقت کو بہتر شکل میں قارئین تک پہنچا سکتا تھا۔ اس نے مسعودی کی عقیدت سے حصہ ہی نہیں لیا بلکہ اس کا مکمل ادراک کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''ایک مسلمان کے لیے مکہ مکرمہ ایک ایسا مقام ہے جو بمشکل اسی دنیا کا ایک شہر نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں اللہ ہر طرف موجود ہے''۔ ویول کو یہ صلاحیت ودیعت ہوئی تھی کہ وہ اس منعکس شدہ روحانیت کو اپنی تحریر میں سمو ڈالے۔ اس سے اس کی کتاب کو ایک نئی اور گرانقدر جہت حاصل ہوتی ہے۔ کم وبیش ایک صدی بعد ویول وہ آخری غیر مسلم مصنف تھا جس نے حج کیا تھا۔

☆☆☆

[اِقتباس] جدید دور کا ایک حاجی مکہ میں اور سنائی میں مُحاصرہ......از آرتھر جے بی ویول

تمہید: مکہ و مدینہ کے بارے میں...... یہ بات واقعی حیرت انگیز لگے گی، اگر ان دو شہروں کا ذکر مغربی یورپ کے لوگوں کے دلوں میں انہیں دیکھنے کا تجسس اور شوق پیدا نہیں کرتی۔ آیئے سب سے پہلے یہ بات واضح کردی جائے کہ جو کوئی بھی ان شہروں کو دیکھنے کا آرزومند ہو وہ انہیں دیکھ سکتا ہے مگر اس کے لیے شرطِ اولین یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو یا اسلام قبول کرنے کا اعلان کر چکا ہو۔ اسے ایسا کرنے کے لیے ایک قاضی (جج) کے پاس جانا ہوگا، کچھ کلمات پڑھنے ہوں گے اور ایک چھوٹا سا آپریشن کرانا ہوگا۔ اس عمل سے گزرنے کے بعد اس نومسلم کو کافی عرصے تک مقامی مسلمانوں کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ اس نے خلوصِ نیت سے اسلام قبول کیا تھا، ایک نوآموز اور زیرِ تربیت مسلمان کی حیثیت سے وقت گزارنا ہوگا تب جا کر اس کے حج پر جانے پر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس کے اور وزارتِ خارجہ کے درمیان طویل خط و کتابت رہی اور پھر جب مزید کسی تاخیر کی گنجائش نہ رہی تو سلطنتِ عثمانیہ کے دربار سے انہیں ایک خاص پاسپورٹ دے دیا گیا تھا۔ ایک بار جب کسی کو پاسپورٹ دے دیا جاتا ہے تو پھر سلطنتِ عثمانیہ اس شخص کی خیر و عافیت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اب وہ بے خوف و خطر مکہ و مدینہ کا سفر کر سکتا تھا۔ اسے غالباً تحفظ بھی فراہم کیا جاتا ہے اور اس کی دیکھ بھال بھی ہوتی ہے۔ اسے دیکھ کر ایک ایسی شے سمجھا جا سکتا ہے جسے دیکھ کر تجسس پیدا ہوتا ہے، اگر شک و شبہ پیدا نہ ہو۔

دوسرا طریقہ ان مقاماتِ مقدسہ کو دیکھنے جانے کا یہ ہے کہ روپ بدل کر وہاں جائیں۔

مصنف نے 09-1908 میں جزواً اس تجسس کے تحت حج کیا تھا کہ وہ عربوں کے رسم و رواج سے، مستقبل کے سفر کے حوالے سے، متعارف ہونے کا خواہشمند تھا، جس سفر میں روپ بدل کر مقاماتِ مقدسہ جانے کے امکانات موجود ہوں۔ ایک حاجی کا مقام و مرتبہ اور بطور حاجی اس کی شہرت مسلم ممالک میں سفر کرنے والے کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔

درج ذیل صفحات میں آپ کو میرے اس سفر کی روداد ملے گی جو میں نے واپسی پر لکھی۔ میرا اس سے قبل یہ ارادہ نہیں تھا کہ میں اسے شائع کراؤں گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو حجاز کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں تک رسائی ناممکن ہے، یہ غلط ہے۔ مسعودی ممباسا کا ساحلی ہے جسے میں نے برطانیہ میں صرف اس لیے اپنے ساتھ لے لیا تھا کہ وہ سفر حج کے دوران میری مدد کرے گا۔ جہاں تک میرے دوسرے ساتھی عبدالواحد کا تعلق ہے یہ ایک عرب ہے جو الیپو کا ہے یہ برلن میں مقیم رہا۔ اسے میں نے بعد میں اپنے ساتھ رکھنے کے ایک معاہدے پر دستخط کیے تھے۔

دمشق: مشرق میں یہ رواج ہے کہ شہروں کو اسلامی، یہودی اور عیسائی شہروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اسلامی شہر بڑا اور سب سے امیر شہر ہوتا ہے۔ اس میں ایک معیاری ہوٹل ہوتا ہے جہاں عام طور پر یو۔ پی باشندے ٹھہرتے ہیں جبکہ مشرقی قومیت کے افراد کے لیے بہت سے چھوٹے چھوٹے ہاسٹل ہیں۔ ہم ایک ہاسٹل میں بڑا سا کمرہ لے کر اس میں ٹھہرتے تھے۔ اس ہاسٹل کے بارے میں ٹرین کے اندر ایک مسافر نے ہم سے ذکر کیا تھا۔ یہ اپنی قسم کا بہترین ہاسٹل تھا جو مہنگا بھی تھا اس لیے ہم نے اسے جلد چھوڑ دیا تھا۔ ہم کھانا مختلف جگہ جا کر کسی کیفے میں کھاتے تھے۔ یہاں کھانا ہوٹلوں میں کم ہی ملتا ہے۔

آج رمضان المبارک کی 20 تاریخ تھی اور ہم ایک مہینہ اور مدینے کے لیے روانہ نہیں ہو رہے تھے۔ چنانچہ ہم آرام سے یہاں دن گزار رہے تھے۔ میں نے اس موقعہ کو غنیمت جان کر اپنے آپ کو مشرقی طور طریقوں سے متعارف کرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے یہاں کے محاورات، ضرب الامثال، ملنے جلنے کے ادب و آداب، چند سوالات مع ان کے جوابات کے آنے چاہیے تھے تاکہ میں مختلف مسلم تقاریب میں بلاجھجک جا سکوں۔ مسجد جانا، وہاں کے لباس میں گھومنا پھرنا میرے لئے آسان ہو جانا چاہیے تھا تاکہ کوئی مجھ پر شک نہ کر سکے۔ ان ہی رسم و رواج کے درمیان ایک یورپی کے لیے اس وقت پریشانی بن جاتی ہے جب وہ پیدائشی مسلمانوں کے درمیان رہتے ہوئے مشکوک نظر آنے لگتا ہے۔ یہ رسومات دنیا بھر کے مسلمانوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ کسی یورپی نے کوئی غلطی کی نہیں کہ پکڑا نہیں گیا، اس لیے کہ وہ فوراً نظروں میں آ جاتا ہے۔ انہیں مشکل زبان کی یا لباس کی دقت درپیش نہیں ہوتی بلکہ ان دوسرے معاملات کی ہوتی ہے۔ مکہ مکرمہ میں اتنے ہی گورے ہیں جتنے سیاہ فام اور گندمی رنگت والے۔ شامی عربوں کے نہ تو خوبصورت بال ہوتے ہیں نہ نیلی آنکھیں جبکہ مقامات مقدسہ کے رہنے والوں میں چند ایک کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

ایک یورپی نے ایک بار مجھ سے سوال کیا تھا کہ اس سفر پر روانہ ہونے سے قبل میں نے کون سا رنگ لگایا تھا۔ عربوں میں نسلی امتیازات کا تعصب اب بھی کہیں کہیں نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور لوگ اپنی نسل پر نازاں ہوتے ہیں۔

مگر یہ کہنا بھی سو فیصد درست نہ ہوگا کہ روپ بدل کر سفر کرنا ہو تو اس میں کامیابی کے لیے ایک اچھا اداکار ہونا ضروری ہے۔ اصل شے یہ ہوتی ہے کہ آنکھیں کھلی رکھی جائیں اور منہ بند۔ کسی غیر ملک میں رہتے ہوئے آپ حیرت انگیز حد تک وہاں کے لوگوں کی عادات اپنا سکتے ہیں۔ اس کے لیے دانستہ طور پر کوئی کردار ادا نہیں کرنا ہوتا۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ آپ اس جگہ کے لوگوں کی طرح رہیں کہ لوگوں کے درمیان اور ان سے الگ ہر جا عملاً ان جیسی حرکات و سکنات ہی آپ کو محفوظ رکھ سکیں گی۔

دمشق سے روانگی کی تیاریاں: عیدالفطر کے دوسرے روز ہم نے دیکھا کہ محمل مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ ریلوے کی تکمیل سے قبل حج قافلہ اس تاریخ کو روانہ ہوا کرتا تھا۔ مدینہ منورہ تک کے سفر میں چالیس روز لگتے تھے۔ یہ سفر امیروں کے لیے بھی تکلیف دہ ہوتا تھا اور جو غریب پیدل سفر کرتے تھے انہیں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ محمل ایک اونٹ پر رکھا ہوا وہ کھٹولا ہوتا ہے جس کے اندر تحائف رکھے ہوئے ہوتے ہیں، اسے ہر سال عزت و احترام کے اظہار کے طور پر سجا سنوار کر مقاماتِ مقدسہ روانہ کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک محمل مصر سے بھی بھیجا جاتا ہے اور کچھ عرصہ پہلے تک ایک محمل بغداد سے بھی جاتا تھا۔ یہ کچھ عرصہ ہوا کسی وجہ سے بند ہو گیا ہے۔ جب یہ محمل روانہ ہوتا ہے اس وقت اسے دیکھنے کے لیے لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو جاتا ہے۔ گورنر اور چند اہم شخصیات کچھ دور تک اس کے ساتھ ساتھ جاتی ہیں۔ جس اونٹ کے حصے میں محمل کو اٹھا کر لے جانے کا اعزاز آتا ہے وہ اونٹ قد و قامت اور صحت میں منفرد اور اعلیٰ نسل کا بھی ہوتا ہے۔

ہماری روانگی کا وقت اب قریب آ رہا تھا اور ہم نے سفر کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں۔ ہم نے احرام کی سفید چادریں خرید لی تھیں جو ہمیں مکہ میں داخل ہونے سے قبل باندھ لینی تھیں اور تین دن تک انہیں پہنے رکھنا تھا۔ ہم نے خیمے، چٹائیاں، زین کے ساتھ باندھنے والے تھیلے، جن میں چاقو چھریاں کانٹے پلیٹیں اور کھانے کے دوسرے برتن رکھنے تھے، خرید لیے تھے۔ ہم پانی کے پائپوں اور چائے کی پتی اور تمباکو کو بھی نہیں بھولے تھے۔ یہ تمام چیزیں مدینے کی نسبت دمشق میں سستی تھیں۔ میرے پاس اب جو 200 پاؤنڈ

پیسے جدہ میں نے ایک مقامی تاجر عبداللہ کے پاس جمع کرا دیئے تھے۔ اس نے مجھے دو چیک دے دیئے تھے جو جدہ اور مکہ میں اس کے ایجنٹ کے لیے تھے جہاں سے مجھے نقد رقم مل جاتی تھی۔ ان دونوں شہروں میں کوئی بنک نہیں ہے۔

ہم نے 15 تاریخ کو روانگی کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر ہمیں یہ تاریخ 18 تک بڑھانی پڑ گئی تھی کیونکہ ٹرین میں فوجی دستوں کی وجہ سے جگہ نہیں تھی، یہ دستے مدینہ چھاؤنی میں بطور کمک بھیجے جا رہے تھے۔ شہر میں اس جنگ کی خبریں گردش کر رہی تھیں۔ تاہم اخبارات کو اجازت نہ تھی کہ جنگ کی خبروں کو تفصیل کے ساتھ شائع کریں۔ افسروں تک کو صحیح صورت حال سے آگاہی نہ تھی۔ اس لیے سچ تک پہنچنا مشکل ہو گیا تھا۔ البتہ یہ خبر عام تھی کہ حکومتی دستوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے اور شہر محاصرہ میں تھا۔ میرے لیے یہ اچھی خبر تھی کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اس سے کئی لحاظ سے میرے لیے یہ سفر آسان ہو جائے گا۔ جنگ کے دوران جب لوگوں کا ذہن ایک ہی جانب مبذول ہو جاتا ہے تو پھر وہ دوسری باتوں کی طرف تجسس آمیز نظروں سے نہیں دیکھتے جہاں کوئی دلچسپ واقعہ پیش آ رہا ہو میں بجائے وہاں سے بھاگ جانے کے، جائے واردات پر موجود ہونے کو ترجیح دیتا ہوں۔

حجاز ریلوے: حجاز اسٹیشن شہر کے مشرقی حصے میں کچھ فاصلے پر ہے۔ ہمیں ہوٹل سے وہاں تک پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ ٹرین نے یورپی وقت کے مطابق صبح 11 بجے روانہ ہونا تھا۔ ہمیں تاکید کی گئی تھی کہ ہم 9 بجے وہاں پہنچ جائیں کیونکہ توقع یہ کی جا رہی تھی کہ مسافر زیادہ ہوں گے۔ ریل میں دو درجے تھے، فرسٹ اور تھرڈ۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اس سفر میں چار روز لگ جائیں گے۔ میں نے فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کو ترجیح دی۔ پھر فرسٹ اور تھرڈ کلاس کے ٹکٹ میں زیادہ فرق بھی نہیں تھا مگر ہمارے دمشق کے دوستوں نے اس فضول خرچی پر اعتراض کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ بڑے بڑے لوگ تھرڈ میں سفر کرتے ہیں اور یہ درجہ تھا بھی آرام دہ پھر فرسٹ کلاس میں زیادہ پیسے دے کر سفر کرنا دانشمندی نہ تھی۔ میں نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ میں یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے پر میں دوسروں کی نظروں میں آ جاؤں۔ میں نے بعد میں خوشی کا اظہار کیا کہ میں دوستوں کی ترغیب پر بروقت ایک اچھا فیصلہ کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ ہماری مدینے میں آمد ایک سنسنی خیز خبر بن گئی تھی۔

ہم بروقت اسٹیشن پہنچ کر اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان ہو گئے تھے۔ ہم سامان بک کرانے گئے تو

مسعودی کو پیچھے چھوڑ گئے تھے کہ وہ ہماری سیٹوں پر کسی کو نہ بیٹھنے دے۔ کُل ٹکٹ تین پاؤنڈ دس شلنگ کے تھے اور سفر ایک ہزار میل کا تھا۔ ہمیں یہاں ابھی مزید اڑھائی گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ ہم اپنے دوست عبداللہ کے ساتھ جو ہمیں الوداع کہنے آیا تھا ایک کیفے میں جا بیٹھے تھے۔ بعد میں کچھ دور تک میں اس کے ساتھ گیا تو اس نے موقعہ غنیمت جانتے ہوئے مجھے نصیحت کی: ''یاد رکھنا حجاز کے لوگ زیادہ مہذب نہیں ہیں۔ انہیں ایسا مت سمجھنا جیسے وہ یہاں ہیں۔ ان سے جھگڑنا بالکل نہیں ورنہ کسی مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ یہ لوگ حجاج سے طرح طرح سے پیسہ نکلواتے ہیں، ان کے فریب میں بھی نہ آنا مگر کُھل کر ان سے یہ بھی کبھی مت کہنا کہ وہ تمہیں لوٹ رہے ہیں۔ شروع میں زیادہ پیسہ خرچ نہیں کرنا۔ ٹرین کے اندر تم پر خدانخواستہ حملہ ہو جائے اور حملہ آور تعداد میں زیادہ ہوں تو ان سے الجھنا بالکل نہیں۔ اپنے سامان سے برضا و رغبت دستبردار ہو جانا تاکہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے''۔ اس نے مجھے یہ تاکید بھی کی کہ میں حج کے دوران نمازیں پابندی کے ساتھ ادا کرتا رہوں اور آغاز ہی میں کچھ رقم خیرات ضرور کروں۔ اس نے بطور خاص مجھ سے ایک التجا بار بار کی کہ میں جب مسجد نبوی میں حاضری دوں تو دو رکعات نفل اس کی طرف سے وہاں ضرور ادا کروں۔ الوداع کہتے وقت وہ مجھ سے اس طرح بغلگیر ہو کر ملا جس پر برطانیہ میں تو اعتراض کیا جاتا ہے۔

میں جب ٹرین کی طرف واپس آیا تو ایک افراتفری کا عالم تھا۔ ٹرین کے ڈبوں میں لکڑی کے بنچ تھے جن کی قطاروں کے درمیان راستہ تھا۔ ہر بنچ پر آمنے سامنے دو دو مسافر بیٹھ سکتے تھے۔ ہم نے ان میں سے چار اپنے لیے مخصوص کرائے تھے۔ مسعودی کے احتجاج کے باوجود کچھ لوگوں نے ہماری دو سیٹوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہر ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تھی، ہمارا سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ ٹرین کی روانگی میں ابھی مزید ایک گھنٹہ باقی تھا مگر ہم اب اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلے۔ جو مسافر دیر سے پہنچے تھے انہیں مایوس واپس لوٹنا پڑا۔ گاڑی نصف گھنٹہ تاخیر سے روانہ ہوئی تھی۔

ہمارے ڈبے میں بہت سے ترک افسر وردیوں میں ملبوس سفر کر رہے تھے، ان کے علاوہ چند ایک شامی حجاج بھی تھے اور کچھ گندے مراکشی بھی۔ ڈبے میں دوسری طرف دو ترک باپ بیٹا بیٹھے ہوئے تھے جن کا واحد سامان ایک گراموفون تھا۔ حجاز میں یہ بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ اس پر سننے کے لیے عربی زبان میں ریکارڈ بھی مل جاتے ہیں اور قرآن پاک کی تلاوت پر مشتمل ریکارڈ بھی۔ میں ذاتی طور پر ہمیشہ اس کی ایجاد پر معترض رہتا ہوں اور اسے ایک بُری ایجاد کہتا ہوں۔

رات سے پہلے ہم اس سفر کے دوران کھلے سرسبز کھیت دیکھ رہے تھے۔ دمشق سے نظر آنے والی جبل الشیخ کی چوٹی بھی ابھی تک ہماری نظروں کے سامنے تھی۔ پہلے دن کے سفر میں ہم بڑے بڑے اسٹیشنوں سے گزرے لیکن دوسرے روز صبح کے وقت ہم صحرا میں داخل ہو چکے تھے۔ اب اس سے آگے دور دور تک آبادیاں کم تھیں۔ زمین خشک اور بنجر تھی اور جوں جوں ٹرین جنوب کی طرف بڑھتی گئی۔ کہیں کہیں نظر آنے والی جھاڑیاں بھی اب غائب ہو گئی تھیں۔ ہم اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں بھی لائے تھے..... ان میں زیادہ تر اُبلے ہوئے انڈے، ڈبل روٹی، کیک شامل تھے مگر مٹی اس قدر اڑ رہی تھی کہ کوئی چیز نکال کر کھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ رات کو وقفے وقفے سے ہم تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے تھے مگر گہری نیند کے مزے اس سفر میں کہاں مل سکتے تھے۔ دوسرے روز مجھے ملیریا بخار ہو گیا تھا جو مدینے پہنچنے تک رہا۔ میں سفر سے لطف اندوز نہ ہو سکتا تھا۔ اس موقعہ پر ہمسفر افراد کی ہمدردی اور مہربانی قابل تعریف تھی۔ مجھے بیمار پا کر وہ میرے اردگرد جمع ہو گئے تھے اور مجھے سونے کے لیے جگہ فراہم کرنے کے لیے کئی ایک نے تو اپنی اپنی سیٹیں خالی کر دی تھیں۔ ترک افسروں کے پاس کوئلے کی انگیٹھی کا انتظام تھا وہ مجھے چیزیں پکا کر کھلاتے رہے۔ انہوں نے مجھے پھل بھی دیئے تھے۔ ہم نے کوشش کی کہ کسی طرح ان کے اس احسان اور مروت کا بدلہ چکا سکیں۔ ہمارے پاس ایک سٹوو تھا اور ہم جب چاہتے چائے بنا کر انہیں پیش کر سکتے تھے۔ ریل میں ایک چھوٹا سا ڈبہ ایسا بھی تھا جس میں ایک ترک، اس کی بیوی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا سفر کر رہے تھے۔ اس ٹرین میں ان کے علاوہ اور کوئی خاتون سفر نہیں کر رہی تھی۔ وہ زیادہ وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت کے طور پر نعتیں پڑھتی رہتی تھیں۔

تیسرے روز ہم صبح کے نو بجے ایک اسٹیشن پر پہنچے تھے جہاں ہمیں 5 بجے تک رُکنا پڑ گیا تھا۔ یہ انجن ڈرائیور کی وجہ سے ہوا جو کسی وجہ سے ابھی پہنچا نہ تھا اور جو ڈرائیور ہماری گاڑی کو وہاں تک لایا تھا اس کا کہنا تھا کہ چونکہ وہ بہت تھک گیا ہے اور اسے نیند آ رہی ہے اس لیے وہ گاڑی کو اس سے آگے نہیں لے جا سکتا۔ ہم نے یہ بھی سنا تھا کہ آگے ریل کی پٹڑی بھی بہت خراب تھی۔ ہم نے تھوڑی دیر تو احتجاج کیا پھر گاڑی سے نکل کر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے تھے۔ ہمارے اس اسٹیشن پر دیگر کئی اسٹیشنوں کی طرح ایک دو ٹین کے جھونپڑے اور ایک ٹینک تھا۔ ہم دھوپ زیادہ دیر برداشت نہ کر سکتے تھے اس لیے جلدی ہی بھاگ کر ڈبے کے اندر آ گئے تھے۔ عربی اور شامی صحراؤں کی سرخ ریت آنکھوں میں اتنی نہیں چبھتی جتنی مصر کی۔

انجن ڈرائیور جب خوب آرام کے بعد تازہ دم ہو گیا تو ہم پھر چل پڑے تھے۔ ایک رات اور گزر گئی تو ہم نے دیکھا کہ ہماری ریل اب ایک ایسے ملک میں داخل ہو رہی ہے جو بہت خوبصورت ایک دوسرے سے جدا پہاڑیوں میں واقع ہے۔ گھسی پٹی چٹانیں دور تک نظر آ رہی تھیں۔ چند ایک چٹانیں بالکل عمودی تھیں۔ ریل کو ان میں سے گزرتے ہوئے ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ اب ہم عرب میں داخل ہو گئے تھے۔ دونوں جانب اونچے اونچے پہاڑی سلسلے تھے۔ چٹانیں پر پیچ تھیں اور ریل پر پیچ راستوں سے چھک چھک کرتی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ہم دوپہر کے وقت مدائن صالح پہنچے تھے۔ یہ صوبہ حجاز کی سرحد پر واقع ہے۔ اس سے آگے کوئی غیر مسلم سفر نہیں کر سکتا۔ جن دنوں یہ ریلوے لائن بچھی تھی یورپی انجینئروں کو اس سے آگے جانے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ انہیں فارغ کر کے ان کی جگہ ترک اور عرب انجینئروں کو بھرتی کیا گیا تھا۔

یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں ایک دو ٹین کی جھونپڑیاں ہیں۔ یہاں لوگ عجیب سی چٹانی رہائشیں رکھتے ہیں۔ مسافر صدیوں سے انہیں دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ چارلس مانٹیگ ڈوٹی اور کئی دوسرے مصنفین نے ان کا ذکر کیا ہے جو عرب میں بطور مہم جو آئے تھے۔ چٹانوں نے یہاں ایسی غاروں کی شکل اختیار کر لی ہے جن میں کھڑکیاں اور دروازے لگے ہوئے ہوں۔ ان کی شکل ابو سمبل کے ان چٹانی معبدوں سے ملتی جلتی ہے جو بالائی نبیا میں ہیں۔ میں انہیں قریب سے جا کر نہ دیکھ سکتا تھا، یہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں اور نہایت خوبصورتی سے بنائے گئے ہیں۔ عربوں میں ان کے بارے میں یہ کہانی مشہور ہے کہ جیسا کہ اس جگہ کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہ شہر تھا جس میں اللہ کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام رہتے تھے۔ قرآن میں بھی ان شہروں کے لوگوں کا ذکر آیا ہے کہ یہ بہت پتھر دل تھے اور حضرت صالحؑ کی بات نہ سنتے تھے۔ انہوں نے ان کی اونٹنی کو بھی مار ڈالا تھا۔ پھر جب لوطؑ کی بیوی نے ایک انتہا کر دی تو قدرتی زلزلے نے یہ شہر تباہ کر دیا تھا۔

اس تیسرے روز بعد از دوپہر ہم ایک کافی بڑے گاؤں میں پہنچے تھے جس کے ارد گرد کھجور کے بیشمار درخت تھے مُلک شام سے نکلنے کے بعد ہمیں یہ پہلی آبادی نظر آئی تھی۔ ہم یہاں ایک گھنٹہ ٹھہرے۔ ہم نے سامان خورد و نوش بھی لے لیا تھا اور کافی بھی۔ مدائن صالح کے تمام جنوبی اسٹیشنوں پر خندقیں کھدی ہوئی تھیں اور خاردار تار لگی ہوئی تھی۔ یہ منظر جنوبی افریقا کے جنگی زمانے کی یاد دلا رہا تھا۔ جس زمانے میں یہ ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی ان دنوں یہاں جنگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اب بھی یہاں موجود چوکیوں پر خانہ بدوش

قبیلے حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ ہمیں کئی تباہ شدہ انجن نظر آئے جو ریلوے لائن کی خرابی کی وجہ سے پٹری سے اُتر کر تباہ ہو گئے تھے۔ ہم بڑی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ ہمیں چوکنا کر دیا گیا تھا کہ اس مقام اور مدینے کے درمیان ہم پر کسی لمحے بھی حملہ ہو سکتا تھا۔ یہ حملہ عرب قبیلوں سے متوقع نہیں تھا بلکہ وہ پیشہ ور ڈاکو حملہ آور ہو سکتے تھے جن کا کام ہی حجاج کو لوٹ لینا تھا۔ ہم نے اپنے ہتھیاروں کو تیار کر لیا تھا۔ ہم اگلے روز، اتوار کو مدینے پہنچنے والے تھے۔

رات خیریت سے گزر گئی تو ہم سب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بس یہی ایک دن اور ہمیں اس تکلیف دہ سفر میں گزارنا تھا۔ میری طبیعت بھی اب سنبھل گئی تھی۔ ہمیں دیر ہو گئی تھی اور ایک بج گیا تھا جب دور توپ خانے کے فائر نے اعلان کیا کہ ہم منزل مقصود پر پہنچنے والے ہیں۔ اب اسٹیشن پر فوجیوں کے دستے تعینات تھے۔

مزید کچھ وقت گزرا تو پہاڑیوں کے درمیان میں سے سوئی کی مانند مسجد نبوی کے مینار دکھائی دیئے۔

پھر جب ریل میدان میں پہنچی تو پورا شہر نگاہوں کے سامنے تھا۔

میرا ایک ترک دوست جو پائیدان پر کھڑا تھا مختلف نام لے لے کر کچھ جگہوں کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ مثلاً کوہ احد جہاں قریش کی فوجوں سے آنحضرتؐ کی فوج کو شکست ہو گئی تھی، حضرت حمزہؓ کا مزار اور کئی دروازے۔ ہم جوں جوں شہر کے قریب پہنچتے گئے فائر کی آواز تیز ہوتی گئی۔ ہم جب اسٹیشن پر پہنچے تو میں نے دیکھا کہ بکنگ آفس پر لوگ ایک دوسرے کو دھکیل رہے ہیں۔ لڑائی البتہ اس وقت شہر کی دوسری جانب ہو رہی تھی۔ اسٹیشن اس وقت محفوظ تھا۔ البتہ اس صبح لوگوں کا وہ ہجوم جو ٹرین کے پہنچنے پر یہاں جمع ہو جاتا تھا آج غائب تھا۔ میں نے دل میں کہا یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔

ترکوں اور بدوؤں کے باہمی تعلقات: موضوع سے ہٹ کر ایک اور ذکر یہاں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ یہ چھوٹی سی جنگ کیوں شروع ہوئی تھی اور ہم کیسے محاصرہ کرنے والوں سے نقصان اُٹھائے بغیر بخیر و عافیت گزر آئے تھے۔

عرب کا یہ حصہ اصولی طور پر ترکی کا صوبہ تھا۔ یہاں جو عرب قبیلے آباد ہیں وہ ترکی رعایا ہیں۔ اس دور میں ترکی چونکہ سب سے زیادہ طاقتور مسلم ملک ہے، اس کا حکمران مومنین کا کمانڈر کہلاتا ہے اور وہی مقامات مقدسہ کا سرپرست ہے۔ اسی کے ذمے یہاں کے نظم و نسق کا خیال رکھنا ہے۔ مگر درحقیقت مکہ، مدینہ

اور ساحلی بندرگاہوں پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے علاوہ ترکی کو حجاز میں حقیقی اتھارٹی حاصل نہیں ہے۔ بدو اسی طرح رہتے ہیں جس طرح وہ کبھی رہتے تھے، آزاد قبیلے، ہر برادری کا اپنا علاقہ، اپنے حکمران، اپنا قانون اور اپنی رسوم۔ یہ بڑی حد تک ایک شاہانہ طمطراق کی حامل نسل ہے۔ یہ جینیات کو اور خاندانی حسب ونسب کو بڑی اہمیت دیتی ہے اور دنیا کے باقی لوگوں کو حقارت سے دیکھتی ہے۔ یہ شہروں کے عربوں کو قبول نہیں کرتی جن کے ہاں اب خالص نسلی امتیاز موجود نہیں رہا کہ خون میں ملاوٹ ہوگئی ہے۔ شادیاں اپنے قبیلے سے باہر کرنے لگے ہیں۔ ان کی نظر میں جو عربی بولنے والے نہیں وہ کمتر ہیں مثلاً مصری اور شامی۔ ان کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسری ایسی نسلیں ہوں جو عربوں کی طرح اپنے خون پر اور اپنی شاندار روایات پر اس قدر نازاں ہوں۔ حضرت آدمؑ کی تخلیق سے لے کر اب تک ان کے خیال میں بہترین خاندان وہ ہیں جن کے افراد نے ہاتھوں سے محنت نہیں کی ہے البتہ وہ جنگ وجدل میں حصہ لیتے رہے اور ڈکیتی ولوٹ مار سے بھی گریز نہیں کیا۔

یہ عرب جو اپنے جینی اعتبار سے بدو کہلائے صحرا میں رہتے ہیں۔ ان کا علاقہ بنجر خشک اور بارانی ہے حالانکہ زرخیز علاقے بھی موجود ہیں۔ یہ لوگ شہر یا بستیاں نہیں بساتے بلکہ جگہ جگہ پھرتے رہتے ہیں۔ انہیں مہذب دنیا کی رسومات پسند نہیں آتیں۔ یہاں تک کہ انہیں پختہ اور عالیشان گھر بھی اچھے نہیں لگتے۔ یہ بہت سادہ خوراک کھاتے ہیں، ان کا لباس ایک سُوتی چغہ ہوتا ہے۔ ان کا پسندیدہ کام کسی اچھے مقصد کے لیے جنگ کرنا ہے یہ نہ ہو تو ڈاکہ زنی تو کہیں گئی نہیں۔ یہ بہترین گھوڑ سوار اور شتربان ہوتے ہیں، سخت کوش، باہمت، بہادر اور خوش تدبیر۔ جہاں تک ان کے کردار کا تعلق ہے یہ حالانکہ بہادر، فیاض اور مہمان نواز ہوتے ہیں مگر بے وفائی کر جاتے ہیں اور جنگ کے دوران ان چیزوں کو مباح اور جائز سمجھتے ہیں جو درست نہیں ہوتیں۔ یہ کٹر مذہبی لوگ نہیں ہوتے۔ روزے نماز کے بھی پابند نہیں ہوتے اور سچ تو یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہیں۔

حجاج کی رائے تو ان کے بارے میں یہ ہے کہ یہ لوگ وحشی ہوتے ہیں، ان سے نفرت کا اور ان سے ڈرنے کا ان کے پاس جواز موجود ہے۔ ان کے بارے میں عرب کے شہروں میں رہنے والوں کی رائے بھی یہی ہے۔

ایک زمانہ ہو گیا جب سے ترک بدو قبیلوں کے شیوخ کو ایک خاص رقم ادا کرتے چلے آ رہے ہیں، جن کے ملک سے حج قافلوں کو گزرنا ہوتا ہے، وہ ایسا اس لیے کرتے ہیں تا کہ ان کے قافلے محفوظ رہیں اور

لٹنے سے بچ جائیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو انہیں قافلوں کے ساتھ فوجی دستے بھیجنے ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات کسی ملک کے لیے باوقار بات نہیں لیکن وہ اس معاملے میں بے بس ہو تو کیا کرے۔ عرب کے اندر حج قافلوں کو تحفظ دینا چاند پر قدم رکھنے کے کٹھن کام سے کم مشکل نہیں ہے۔ ترک یا کوئی دوسرا اس کام کی تکمیل کی توقع نہیں کر سکتا۔ اس ملک میں ذرائع نقل و حمل کی مشکلات، پانی کی قلت کے پیشِ نظر ایک دن یورپی فوج کے یہاں تعینات کرنے کی ضرورت محسوس ہو گی، مگر اس فوج کا مقابلہ بھی ان بدوؤں سے ہو گا جن کی ایک بڑی تعداد کو 1898ء میں گورنر جنرل ہر ایکسیلینسی ہربرٹ کچنر نے تباہ کرایا تھا۔ یہ جدید بندوقوں سے مسلح ہوتے ہیں جو مدینہ کے گرد دور تک فائر کر سکتی ہیں۔ اسلحہ کا حصول ان کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ مکہ اور مدینہ دونوں شہروں کی کھلی مارکیٹوں میں اسے بیچا جاتا ہے۔

عرب میں عرب بدوؤں کی تعداد کتنی ہے اس کا اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے صحیح تعداد نہیں بتائی جا سکتی۔ ان میں سے تین چوتھائی تو ایسے ہیں جن کو کوئی جانتا ہی نہیں ہے۔ لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ صرف حجاز کے قبیلے اگر اکٹھے کر لیے جائیں تو ان کی تعداد ایک لاکھ تک جا پہنچتی ہے۔

حجاز ریلوے کی تکمیل پر ترک حکومت نے (جہاں 1908ء میں عبدالحمید کی حکومت تھی) حج قافلوں کو تحفظ فراہم کرنے کے عوض بدو قبیلوں کو مقررہ رقم دینی بند کر دی تھی۔ یہ درحقیقت کوئی اتنی بڑی بات نہ تھی کیونکہ شام اور مدینہ کے درمیان تو قافلوں کو کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی تاہم یہ خبر پورے عرب میں پھیل گئی تھی جس سے اہم قبیلے مدینے اور مکے کے درمیان اور مدینہ اور ینبو کے درمیان چوکنے ہو گئے تھے۔ اگر انہیں ڈاکے ڈالنے کی اجازت نہ دی جاتی اور نہ ہی انہیں اس کام سے باز رکھنے کے لیے رقم ادا کی جاتی تو لامحالہ ان کی حالت خراب ہونے کا خدشہ تھا۔

جس روز پہلی ٹرین پہنچی اس روز کافی بے چینی اور اضطراب کی فضا پائی گئی تھی۔ پہلے تو انہیں اس کی اہمیت کا اندازہ نہ ہوا۔ پھر انہوں نے پوچھا: ''کیا یہ شے (یعنی ٹرین) اتنا مال اور وزن اٹھا سکتی ہے جتنا ایک اونٹ اٹھاتا ہے؟'' پھر کچھ ہی روز بعد جب انہوں نے دیکھا کہ یہ تو سینکڑوں انسانوں اور کئی ٹن وزنی سامان اٹھا سکتی ہے۔ تب انہیں احساس ہوا کہ ان کے قدامت پسند ملک میں کوئی نئی شے آ گئی ہے اور انہیں ضرور مزاحمت کرنی چاہیے۔ ایک بات تو بالکل واضح تھی کہ کچھ عرصے بعد اس ریل کی وجہ سے اونٹ پر سفر کرنا ماضی کا قصہ بن جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی اونٹوں کو کرائے پر دے کر رقم کمانے کا ایک ذریعہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو

جائے گا۔ ان لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ ریل شام سے چار دن میں مدینے پہنچ گئی تھی تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی۔

حالیہ دو ماہ کے دوران ان کے شیوخ نے بلاشبہ بہت فکر مندی کے ساتھ ایک دوسرے سے مشورے کیے تھے۔ مدینے کے گورنر کے پاس وفود یہ مؤقف لے کر گئے کہ ریل کی وجہ سے اب یورپی بھی ان کے ملک میں داخل ہو جایا کریں گے۔ گورنر نے خلیفہ کے ایما پر ان وفود سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔ انہیں گورنر نے بتایا کہ ریل سے سفر کرنے والے مسافروں کے مقابلے میں اب زیادہ آسانی اور بہتر طریقے پر یہ ساری کارروائی ہوا کرے گی۔

بدوؤں کا یہ خیال بھی تھا کہ ریل کو مزید آگے لے جانے سے روکا جائے مگر اس اعتراض کی بنیاد بنانے کے لیے ان کے پاس کوئی معقول جواز نہ تھا۔ ریلوے کو تو بھی پورے عالم اسلام میں متعارف کرانے کی ضرورت تھی اور اس بارے میں دنیا بھر کے مسلمانوں میں جوش و جذبہ عروج پر تھا۔ ایسا کرنا جذبہ حب الوطنی کا حصہ تھا اور مسلمان یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان پر غیر مسلم یہ اعتراض کریں کہ اسلام اس ایجاد کی اہمیت جاننے سے قاصر رہا ہے۔ اس ریل کے اجراء پر تمام مذہبی فرقوں کے سربراہوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور غریب و امیر سب نے برابر فیاضی و سخاوت کا مظاہرہ کیا تھا۔

بدوؤں نے سوچا کہ بہتر یہی ہوگا کہ اس معاملے کو کسی اور بنیاد پر اٹھایا جائے اور ترکوں کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ بجائے مزید ریلوے لائن بچھانے کے کوئی اس سے بہتر کام سرانجام دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس کے لیے مواقع کی کمی نہ تھی۔ مدینے سے چار میل مشرق میں آنحضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کا مزار تھا، جو غزوہ احد میں شہید ہو گئے تھے اور تمام حجاج ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ حضرت علیؓ کے خاندان میں سے ایک اہم قبیلہ شہر کے گرد مقیم تھا اور زراعت کرتا تھا، اس سڑک پر لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے کے عوض حکومت سے کچھ رقم وصول کی جاتی تھی۔ رمضان کے ختم ہو جانے کے بعد رات کو دیر سے آتے ہوئے دو آدمی غالباً چوروں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ گورنر نے اس قبیلے کے سرداروں کو احتجاجی مراسلہ بھیجا اور جرمانہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔ گورنر کو جواب یہ موصول ہوا کہ ہم اس سڑک پر پیش آنے والے واقعات کے ذمہ دار نہیں ہیں اور کوئی جرمانہ ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مزید افہام و تفہیم کی کوششیں بھی ناکام ہوئیں۔ 3۔ شوال کو ایک ہزار کی فوج ان افراد کو منتشر کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی جو شہر میں جمع ہو کر فساد برپا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ ترک

سپاہی جنہیں توپ خانے کی مدد حاصل تھی۔ کھجوروں کے درختوں کے درمیان سے پیشقدمی کر رہے تھے۔ دشمن زیادہ متحرک تھا اس لیے جلد انہیں پسپا ہونا پڑا۔ دشمن نے چاروں طرف سے فائر کھول دیا تھا۔ جب یہ فوجی دستے پسپائی سے دوچار ہوئے تو بدوؤں نے ان کا تعاقب کر کے حملہ جاری رکھا۔ فوج کے ایک سو سپاہی مارے گئے تھے اور باقی شہر واپس لوٹ آئے تھے۔ اس روز سے یہاں چھوٹی موٹی جھڑپیں اکثر جاری رہتی ہیں تاہم کوئی بڑی لڑائی نہیں ہوئی۔ ترکوں نے سوائے شہر کے ہر شے چھوڑ دی تھی اور ان کے پاس شہر کی دیواروں سے باہر دو قلعے بھی تھے جن میں طاقتور فوجی دستے تعینات تھے۔ جلد ہی شام اور ترکی سے کمک روانہ کر دی گئی تھی۔ اس میں توپ خانہ بھی شامل تھا۔ انہیں دیوار کے ساتھ ساتھ تقسیم کر کے کھڑا کیا گیا تھا۔

بنو علی نے دوسری طرف یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ ایک جہاد ہے جو وہ ترکوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ پورے عرب کو مدد کی درخواست کی گئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ حجاج کو نقصان نہیں پہنچائیں گے اور وہ حسب معمول آتے جاتے رہیں گے، یہاں تک کہ وہ ان کے درمیان سے بھی گزریں گے تو بحفاظت گزریں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی جنگ حکومت کے خلاف تھی، صرف حکومت کے خلاف۔

جس مدد کی درخواست انہوں نے کی تھی وہ جلد انہیں پہنچنے والی تھی۔ تمام اطراف سے فوجیں ان کی مدد کو پہنچ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے قبیلوں میں مکمل اتحاد پایا جاتا تھا۔

جب ہم مدینے پہنچے اس وقت یہاں دس ہزار ترک سپاہیوں کی نفری موجود تھی۔ ان کے پاس بیس توپیں تھیں۔ عرب بیس ہزار تھے اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

مدینہ منورہ: مدینہ سطح سمندر سے تین ہزار فٹ کی بلندی پر ایک میدان میں واقع ہے۔ یہ میدان تین اطراف سے شہر سے پانچ سے دس میل دور پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے لیکن جنوب میں کھلا ہوا ہے۔ شہر اپنی شکل میں بیضوی ہے اس کا سب سے بڑا قطر ایک میل ہے۔ یہ دراصل دو شہروں کے ملنے سے وجود میں آیا ہے۔ پرانے شہر کی الگ دیوار ہے جس میں ایک مسجد اور بہت سے رہائشی مکانات اور دکانیں ہیں۔ دوسرا زیادہ جدید حصے پر مشتمل ہے جس میں زیادہ عمارات سرکاری ہیں، بازار اور بیرکیں ہیں۔ اس میں ایک کھلا میدان ہے جس میں قافلے اپنی آمد پر یا روانگی کے وقت جمع ہوتے ہیں۔ اس حصے کو محفوظ رکھنے کے لیے دوسری طرف ایک چھوٹی سی دیوار تعمیر کر دی گئی ہے۔ اس کے بہت سے دروازے ہیں، ان کے نام ان مقامات کے ناموں پر رکھے گئے ہیں جہاں تک ان سے نکلنے والی سڑکیں پہنچتی ہیں...... مثلاً ایک کا نام باب الشام یا شامی

دروازہ ہے، دوسرا مکہ گیٹ ہے وغیرہ وغیرہ۔ پانی کی سپلائی کئی کنوؤں سے ہوتی ہے، پانی کا معیار بھی اچھا ہے اور مقدار میں بھی وافر ہے۔ پورے شہر کے گرد کھجوروں کے درخت اور زرعی زمین بھی میلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ریلوے اسٹیشن شہر کے مغرب میں بیرونی دیوار سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ جس زمانے میں، میں وہاں تھا اس وقت یہ مکمل نہیں ہوا تھا تاہم چند پتھر کی بنی ہوئی عمارات زیرِ تعمیر تھیں، ان پر بندوق کی گولی اثر نہیں کرتی تھی، اس لیے یہ جنگ کے دنوں میں بڑی مفید ثابت ہوئی تھیں۔ قبرستان جو جنت البقیع کے نام سے موسوم ہے جنوب میں ہے۔ یہاں تاریخ اسلام کی کئی معروف شخصیات اور بزرگ ہستیاں محوِ استراحت ہیں جن میں سے کئی آنحضورؐ کے عزیز و اقارب میں سے ہیں۔

مدینے کی آبادی کے بارے میں مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ فوجی دستوں اور حجاج کو نکال کر یہاں تیس ہزار لوگ آباد تھے۔ ان کے پیشے حجاج سے وابستہ ہیں جن کی آمد و رفت پر ان کی آمدنی کا انحصار ہے۔ یہ لوگ حج کے موسم میں تین مہینے خوب محنت کرتے ہیں پھر سال کے بقیہ مہینوں میں یہ لوگ کچھ بھی نہیں کرتے۔ اس نظام میں ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا ہے۔ امیروں کے پاس مکانات ہیں جو وہ مہنگے داموں کرائے پر دیتے ہیں۔ نوجوان زیادہ تر گائیڈز کے طور پر کام کرتے ہیں۔ انہیں اپنی خدمات کا بڑی فیاضی سے معاوضہ ملتا ہے۔ دکانداروں کی ان دنوں چاندی ہوتی ہے جو خوب روپیہ کماتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹے دکاندار، قلی اور سقے تک بھی حجاج کی آمد پر سال بھر کے لیے معقول رقم جمع کر لیتے ہیں۔

جدہ: غیر مسلموں کو ینبُو اور جدہ میں رہنے کی اجازت ہے مگر اس شرط پر کہ وہ دیواروں سے باہر نہ جائیں۔ جدہ میں چند عیسائی اور یہودی تاجر ہیں، زیادہ تر یورپیوں کی نمائندگی قونصل کرتے ہیں۔ انہیں یہاں خطرہ ہر وقت لاحق رہتا ہے کہ کوئی انہیں تشدد کا نشانہ بنا دے گا۔ تمام قونصل خانے شہر کے انتہائی شمال میں ایک ہی جگہ واقع ہیں۔

جدہ دنیا کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ایک خوبصورت شہر ہے مگر صرف اسی وقت جب اسے سمندر سے دیکھا جائے۔ اندر آنے کے بعد اس پر جب نظر پڑتی ہے تو اس کے کئی حصے خستہ حال عمارتوں والے ہیں۔ بہت سے اونچے اور تنگ مکانات گرنے والے ہیں۔ خدانخواستہ کہیں معمولی سا زلزلہ آ جائے تو شہر ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ اس کی گلیوں اور بازاروں کا جائزہ لیا جائے تو مجموعی طور پر گندے ہیں اور ینبُو کی گلیوں اور بازاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چند ایک بڑی اور خوبصورت دکانیں بھی

ہیں اور کہیں کہیں باعزت لوگوں کے بیٹھنے کے لیے اچھے کیفے بھی ہیں۔آب وہوا گرم ہے مگر صحت خراب نہیں کرتی اور مکہ کی آب وہوا سے بدرجہا بہتر ہے کیونکہ مکہ تو اس دن بھٹی کی طرح آگ اگلنے لگتا ہے جس دن گرمی کے ساتھ ساتھ حبس بھی ہو۔مگر یہاں جدہ میں سمندر سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں سکون بخش محسوس ہوتی ہیں۔ینبو کی طرح یہاں بھی پانی کی قلت ہے اور پانی ہے بھی نمکین۔وبائی امراض یہاں اکثر پھوٹ پڑتی ہیں۔

جن دنوں حجاج کی آمد ہوتی ہے، احرام میں ملبوس افراد مشرقی منظر پیدا کر دیتے ہیں۔دوان سلی احرام کی سفید چادروں میں ملبوس لوگوں سے گلیاں، بازار اور کیفے بھر جاتے ہیں۔شروع شروع میں تو یہ منظر مجھے کچھ عجیب سا لگا مگر آہستہ آہستہ یہ مجھے اچھا لگتا تھا۔

جدہ سے مکہ مکرمہ تک: ہمارے شتربان کے پاس ہمارے اونٹوں کے علاوہ تین اور اونٹ بھی تھے جن پر کچھ مصری سوار تھے۔چاند نکل رہا تھا جب یہ شتربان ان مصریوں کو اور ہمیں لے کر جدے سے 11 بجے روانہ ہوا تھا۔وہ تمام اونٹوں کو بیک وقت ساتھ لے کر مکہ میں داخل ہونا چاہتا تھا جہاں اسے وہ لائسنس دکھانا ہوتا تھا جس کے مطابق اسے مقررہ تعداد میں اونٹ ساتھ رکھنے ہوتے تھے، یہ آگے پیچھے مکہ پہنچتے تو شہر کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ ملتی تھی۔ہم اسے سچ سمجھ کر بادل نخواستہ شتربان کے کہنے پر ان مصریوں کے ساتھ ساتھ جدہ سے روانہ ہو گئے تھے ورنہ ابھی ہمارا ارادہ کچھ دیر اور وہاں رکنے کا تھا۔میں ذاتی طور پر خوش تھا کہ دن کی چلچلاتی دھوپ میں سفر کرنے کے بجائے رات کو سفر کرنا زیادہ آرام دہ ہے۔ہم جلدی جلدی تیار ہوئے اور اونٹوں کی قطار میں اپنے اونٹوں کو شامل کر دیا تھا جو آہستہ آہستہ مشرق کی طرف جا رہے تھے۔مکہ جاتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے حجاج کا ہجوم رات دن ایک جیسا رہتا ہے۔ایک اندازے کے مطابق اس مہینے میں نصف ملین لوگ اس سڑک پر سفر کرتے ہوں گے۔اس سامان خورد و نوش کے علاوہ جوان لوگوں کو درکار ہوتا ہے ہم ان جانوروں کی تعداد کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں جو اس سفر کے دوران انہیں ضرورت ہوتے ہیں۔

مکمل خاموشی عجیب تو لگتی ہے مگر بے حد متاثر کرتی ہے۔نہ کہیں سے گانے کی آواز آتی ہے۔نہ پٹاخے چلانے کی نہ فائرنگ کی، بس ایک سناٹا سا چھا جاتا ہے۔زیادہ تر حجاج ارد گرد کے ماحول سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔اونٹ خاموشی کے ساتھ ایک خاص رفتار سے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ منزل سامنے آ جائے۔

جب ایک سچا اور پکا مسلمان مکے پہنچتا ہے تو اس کے جذبات و احساسات کیا ہوتے ہیں، اس بارے میں باہر کا کوئی شخص اندازہ لگا ہی نہیں سکتا نہ انہیں زبان و بیان میں مقید کیا جا سکتا ہے .... یہ تو محسوس کرنے کی ایک کیفیت ہوتی ہے جو محسوس کرنے والا دل ہی بتا سکتا ہے کیسی ہوتی ہے! یہ شہر، یہ زمین لگتا ہے اس دنیا سے باہر کی ہے جہاں کوئی معبود حقیقی اپنا جلوہ ہر شے میں دکھا رہا ہو۔ یہ وہی شہر تو ہے جس کی طرف دن میں پانچ بار منہ کر کے یہ حاجی نمازیں پڑھتا رہا اور اب وہ شہر اپنے تمام اسرار سمیت اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہاں کی برکتوں، نعمتوں، عنایات خداوندی اور قبولیت دعا کی اَن گنت کہانیوں کے سچ نکلنے اور اس کے برسوں کے خوابوں کی تعبیر اس کے قریب تر آ جاتی ہے۔ عبادات اور نمازوں کا کئی گنا اجر مکہ میں عطا ہوتا ہے، جس پر ان حجاج کو یقین محکم ہے.........اور خدانخواستہ یہاں کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کی سزا بھی بڑی کڑی ملتی ہے۔ اس لیے قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوتا ہے، سانس بھی آہستہ لینے پر ہر حاجی رضامند نظر آتا ہے کہ یہ گھڑیاں، یہ لمحے، یہ شب و روز پھر نہ جانے نصیب میں ہیں یا نہیں۔

صبح صادق قریب تھی اور ہم سفید پتھر کے دو ستونوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ یہ مقدس سرزمین کی سرحد کا آغاز ظاہر کرتے ہیں۔ اب اس سے آگے ہم مقدس سرزمین پر چل رہے تھے۔ اب نہ شکار کی اجازت تھی نہ کسی کو مارنے کی۔ ہر طرح کے ظلم و تشدد اور زیادتی کی ممانعت ہو گئی یہاں سے آگے۔ احرام باندھ لینے کے بعد اب تو کیڑے مکوڑوں کو بھی مارنے کی اجازت نہیں سوائے بچھو یا کسی زہریلے جانور کو۔ لبیک اللھم لبیک کی صدا (جو ایک ہی وقت میں سب کی زبان سے نکلتی ہے) فضا میں گونجنے لگتی ہے۔

احرام میں ہمیں خنک صبح کے ان لمحوں میں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ طلوع آفتاب پر ہم شاید اس لیے بہت خوش تھے۔ جب سورج کی روشنی پھیلی تو ابراہیم نامی حاجی نے، جو ایک حج پہلے کر چکا تھا میری توجہ جبلِ نور کی جانب مبذول کرائی...... یہ ایک مخروطی چوٹی تھی جس پر لگتا تھا کوئی مشعل جل رہی ہو مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ ایک مقبرہ ہے۔ یہ ایک مشہور پہاڑی ہے جہاں سے مکہ شہر نظر آتا ہے۔ ہم آٹھ بجے چند پتھر کے بنے ہوئے گھروں کے قریب سے گزر رہے تھے جو ہماری بائیں جانب تھے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ مکہ میں شامل ہیں۔ ہمیں دعاؤں کے چھوٹے چھوٹے کتابچے دیئے گئے تھے تاکہ مکے پہنچ کر وہ دعائیں ان کی خاص ترتیب سے پڑھ سکیں، جو ہمیں مختلف موقعوں پر پڑھنی تھیں۔ مثلاً احرام باندھنے پر، شہر مکہ پر پہلی نگاہ پڑنے پر، دروازے سے داخل ہوتے وقت، خانہ کعبہ نظر آنے پر وغیرہ وغیرہ۔

مجھے اس اعتراف پر کوئی شرمندگی نہیں کہ میں کچھ گھبرا گیا تھا اور جب میں نے اپنے اردگرد حجاج پر نگاہ ڈالی تو مجھے وہ سب کے سب ڈرے اور سہمے ہوئے نظر آئے۔ جب ہم شہر کے قریب پہنچے تو حجاج اس قدر جذباتی ہو گئے تھے کہ مجھ جیسے شخص کے۔لیے یہ منظر دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہم ایک گھنٹے تک سفر میں رہے، صرف چند چھوٹے چھوٹے جھونپڑے راستے میں آئے، ایک بدوؤں کا وقتی طور پر نصب شدہ خیمہ بھی نظر آیا۔ میں حیران تھا کہ مکہ روئے زمین پر کہاں چھپا ہوا ہے۔ پھر اچانک ہم بائیں ہاتھ مڑے تو ہمیں اونچی اونچی پتھریلی پہاڑیوں میں گھرا ہوا ایک قلعہ سا نظر آیا، قریب ہی ایک مسجد تھی، اردگرد اور عمارتیں تھیں جنہیں میں اس وقت نہیں پہچانتا تھا...... یہی تو تھا خانہ کعبہ۔

مکہ مکرمہ دراصل پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے اور پھیلتا ہوا یہ پہاڑی سلسلہ اندرون عرب تک چلا گیا ہے۔ شہر ایک وادی کے اندر نشیب میں آباد ہے اس لیے سمندر کی طرف سے یہ بالکل آنکھوں سے اوجھل ہے اور جب تک کوئی اس کے دروازے تک نہ پہنچ جائے یہ نظر نہیں آتا۔ یہ وادی تقریباً شمال مشرق اور جنوب مغرب کی جانب پھیلی ہوئی ہے اور کافی دور تک چلی گئی ہے۔

مکہ مکرمہ: ہم نے آئندہ چند روز مکے میں خوب گھوم پھر کر گزارے۔ بہت کچھ دیکھنے کو موجود تھا اور بہت کچھ کرنا تھا۔ بازاروں میں لوگوں کا ہجوم رہتا تھا اور ہم بہت لطف اندوز ہوئے۔ مکہ مکرمہ مدینہ منورہ کی نسبت بڑا شہر ہے۔ حجاج کو شمار نہ بھی نہ کیا جائے تو یہاں آباد لوگوں کی تعداد ستر ہزار بتائی جاتی ہے۔ میرا اپنا اندازہ یہ تھا کہ آبادی اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔ حج کے ایک ہفتے کے دوران یہاں حجاج کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ انہیں رہائش کے لیے مکانات کی ضرورت ہوتی ہے، اسی لیے شہر میں عمارات کی تعداد آبادی کی نسبت زیادہ ہے۔ گلیاں کشادہ اور صاف ستھری ہیں اور مکانات تین چار منزلہ ہیں کہیں کہیں اس سے بھی زیادہ منزلہ گھر تعمیر کیے گئے ہیں۔ دمشق کی طرح یہاں بھی زیادہ تر مارکیٹیں چھت والی ہیں مگر تعداد اور تنوع میں ہم ان کا مقابلہ دمشق کی مارکیٹوں کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ البتہ کہیں کہیں بہت خوبصورت دُکانیں دکھائی دیتی ہیں۔ تاجر زیادہ تر حجاج کی ضروریات کا سامان رکھتے ہیں۔ کچھ چیزیں یہ حجاج وطن واپس جاتے وقت بھی خرید کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ مقامی صنعتیں بالکل نہیں ہیں، میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مقامی طور پر یہاں کی کیا شے مشہور ہوگی۔ سامان پورے مشرق سے منگوایا جاتا ہے........ ریشم شام سے، قالین ترکی اور فارس سے، ململ کی چیزیں ہندوستان اور مصر سے اور یہ ساری چیزیں حجاج خرید لیتے ہیں۔ ایسے مسافروں کو مایوسی ہوتی

ہے جو یہ جانتے ہیں کہ یہی چیزیں انہیں مکہ کے بجائے دوسری جگہوں سے سستی اور بہتر مل سکتی تھیں۔ حج کے موسم میں پورے عالم اسلام سے تاجر سامانِ فروخت ساتھ لاتے ہیں کیونکہ انہیں یہ معلوم ہے کہ ان دنوں انہیں یہاں اپنے سامان کے منہ مانگے دام مل جائیں گے۔

مکہ کی حکومت بھی ایک خاص قسم کی حکومت ہے۔ یہ ترکی کا نیم آزاد صوبہ ہے جہاں ایک شریف حکمران ہے۔ شریف مکہ کا انتخاب حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے شجرے سے تعلق رکھنے والے خاندانوں میں سے ہوتا ہے۔ اسے ایک آزاد حکمران تصور کیا جاتا ہے۔ یہ محل میں رہتا ہے اس کے پاس گارڈز کا حفاظتی دستہ ہوتا ہے اور اپنے علاقے میں اسے سارے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس کا مقام و مرتبہ وہی ہوتا ہے جو ترکی کے سلطان کا ہوتا ہے۔ شریف کے انتخاب کے وقت شجرۂ نسب میں کوئی ملاوٹ برداشت نہیں کی جاتی۔ یہ آنحضورؐ کے عہد کا خالص عربی ہونا چاہیے جس کے خون میں غیر ملکی ملاوٹ نہ ہوئی ہو۔ موجودہ شریف مکہ 55 برس کا ہے۔ یہ درمیانے قد کا صحت مند انسان ہے، اس کی لمبی بھوری ڈاڑھی ہے اور رنگ سیاہی مائل ہے۔

زم زم کنویں کا سردار: ہم نے مکہ میں آمد کے بعد پہلے ہی ہفتے میں کئی دوست بنا لئے تھے۔ ان میں زیادہ تر عبدالواحد کے پرانے ملنے والے تھے۔ ان میں بغداد رجمنٹ کا ایک افسر بھی تھا جس نے ہمارا تعارف عبدالرحمٰن سے کرایا۔ یہ ایک معمر شخص تھا جو مکے کا رہنے والا تھا اور زم زم کے کنویں پر جو سقے پانی تقسیم کرتے تھے ان کا انچارج تھا۔

یہ ذمہ داری عبدالرحمٰن کے خاندان کے افراد کے لیے مخصوص تھی اور یہ سلسلہ کئی نسلوں سے اسی طرح چلا آ رہا تھا۔ یہ شخص ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہوا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے اور اس کے دوستوں کے ساتھ حرم میں ہمارے لیے بھی جگہ مخصوص کر دی جائے۔ ہمارے لیے وہاں چٹائیاں بچھا دی گئی تھیں۔ ہمیں اس سے بڑا آرام ملا تھا، خصوصاً جمعہ کے دن، جب باہر سے آنے والے گھنٹوں پہلے آتے تھے تا کہ انہیں سائے میں جگہ مل جائے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو انہیں باہر صحن میں بغیر کسی سائبان کے بیٹھنا پڑتا تھا۔ گرمی کی وجہ سے دوپہر کو یہاں اس طرح بیٹھنا بڑا تکلیف دہ تھا۔ ہم جب چاہتے آتے کیونکہ ہماری جگہ محفوظ تھی جسے عبدالرحمٰن نے ہمارے لیے مخصوص کرا دیا تھا۔ یہ ایک طرح کی بخشیش تھی جو ہمیں عبدالرحمٰن کی طرف سے ملی تھی۔ اس دوست نے ایک روز مجھے اپنے گھر مدعو کیا۔ میں دو بار چائے پینے اس کے گھر گیا تھا

جہاں سے خانہ کعبہ نظر آتا تھا۔ وہ بہت مہمان نواز تھا اور مجھے واپس آتے وقت اس کے گھر میں موجود مہمانوں کی کتاب میں دستخط کرنے ہوتے تھے کیونکہ آٹوگراف جمع کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ زن بیزار نکلا جسے عورت نام تک سے نفرت تھی اور مشرقی روایت کے برعکس وہ کنوارہ تھا۔ اس کے گھر کی دیکھ بھال اس کی بہن کرتی تھی اور یہی بہن، اس نے مجھے بتایا، اس کی عورت کے لیے نفرت کا باعث تھی۔ اسے نئے قانون سے یا پارلیمنٹ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ مدّاح تھا تو عبدالحمید کا اور پرانی حکومت کو ترجیح دیتا تھا اور اسے توقع تھی کہ وہ حکومت دوبارہ برسراقتدار آ جائے گی۔ ہماری اچھی نبھ رہی تھی کیونکہ ہمارے سیاسی نظریات میں یکسانیت تھی۔ میں جب دوسری بار اس کے گھر گیا تو اس نے مجھ سے میرے خاندان کے بارے میں کئی سوال پوچھے تھے۔ کچھ باتیں مجھے ناپسند تھیں کیونکہ میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے اس روز یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ عبدالرحمٰن کے گھر نہیں جاؤں گا۔

ایک دیرینہ شناسا: ہمیں مکہ میں ایک ہفتہ گزر گیا تھا کہ مسعودی کو اچانک ایک دیرینہ شناسا مل گیا تھا۔ یہ ایک تیرہ برس کا لڑکا تھا جس کا نام کپی تھا، وہ اور اس کے والد شیخ محمد نے سال کے اوائل میں ہمارے ساتھ ایک ہی جہاز میں ممباسا سے پورٹ سعید تک سفر کیا تھا۔ یہ دونوں براستہ ینبو، مدینہ جا رہے تھے جہاں یہ حج کے دنوں میں قیام کرنا چاہتے تھے۔ شیخ محمد اس وقت انتقال کر گیا تھا جب باپ بیٹا مکے میں داخل ہو رہے تھے۔ کپی تنہا رہ گیا تھا مگر اسے ایک ایسا ہموطن مل گیا تھا جس نے اس کی مالی مدد بھی کی تھی۔ یہ لڑکا اب اس توقع پر یہاں مقیم تھا کہ کوئی حجاج کی پارٹی اُسے ظنظبار لے جائے گی۔ بہت سے سواحلی اور عرب جن کا تعلق اس ساحل سے ہے مکہ میں مقیم ہیں میں ان میں سے کسی سے بھی ملنے سے گریز کر رہا تھا مگر مسعودی کو جب ایک مرتبہ کسی نے پہچان لیا تھا تو وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ کپی کے ساتھ شیخ کو ملنے چلا گیا تھا جہاں اسے اور کئی لوگ مل گئے تھے۔ اس نے وہاں لوگوں کو بتایا کہ وہ دو امیر عربوں کے ساتھ آیا ہے جن میں سے ایک کا تعلق بغداد سے ہے اور دوسرے کا مسقط سے، جس کے ساتھ وہ رہ رہا تھا۔ اس نے انہیں بتایا کہ چونکہ وہ ایک نوکر کی حیثیت سے رہ رہا ہے اس لیے انہیں گھر پر مدعو نہیں کر سکتا۔ کپی ممباسا میں میرے کچھ دوستوں کا عزیز تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں یہ نیکی کما لوں کہ واپسی پر اسے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ مسعودی نے اسے جا کر یہ بتایا کہ اس کا ایک مسقطی سرپرست، اس کی پریشانیوں کے بارے میں سُن کر، یہ چاہتا ہے کہ اسے اس کے وطن پہنچا دے اور اس عرصے میں وہ اسے کچھ الاؤنس بھی ہفتہ وار دے گا۔ کپی یہ سن کر بہت خوش ہوا اور فوراً ہمارے ساتھ بطور نوکر

کے رہنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ مگر مسعودی نے اسے بتایا کہ ہمارے پاس پہلے ہی کئی نوکر ہیں۔ وہ مجھے صورت شکل سے پہچانتا تھا اس لیے وہ اس وقت تک ہمارے پاس نہ آ سکتا تھا جب تک ہماری روانگی کا وقت نہ آ جائے۔ دراصل اگر یہ لڑکا تھوڑی سی مزید عربی جانتا ہوتا اور ذرا سا ہوشیار بھی ہوتا تو کسی امیر حاجی کے پاس خدمت گار کے طور پر چلا جاتا۔ مجھے پورا پورا یقین ہے کہ اسے اس میں ضرور کامیابی ہوتی۔ حج کے دنوں میں مکہ مکرمہ میں صدقہ و خیرات کا چھوٹا سا کام بھی بیشمار گناہوں سے پاک کر دیتا ہے اور بہت سے لوگ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی مستحق شخص مل جائے تو یہ اس کے ساتھ فیاضی سے پیش آئیں گے۔ عربوں میں یتیم بچوں کے لیے بڑی ہمدردی اور رحم کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

بنک اور رقوم: مجھے اپنا چیک کیش کرانے میں کچھ پریشانی ہوئی تھی۔ جس تاجر سے مجھے یہ چیک دے کر نقد رقم لینی تھی اس نے یہ کہہ کر رقم دینے سے انکار کر دیا تھا کہ اس کے اب عبداللہ وریدی کے ساتھ کاروباری تعلقات اچھے نہ رہے تھے (یہ وہی شخص تھا جس کے نام کا چیک تھا) تاہم اس نے اس بارے میں ایک نوٹیفیکیشن جاری تو کر دیا ہے مگر جواب کا اسے انتظار ہے جس میں کچھ دن لگ جائیں گے۔ اس وقت تک وہ میری کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے عبداللہ کی طرف سے ایک خط ملا جس میں ایک نئے تاجر کے نام ڈرافٹ بھی تھا۔ میں نے سوچا اسے پاس رکھنا نقد رقم پاس رکھنے کی نسبت کم خطرے کا باعث تھا۔

حجاز میں بنک نہیں ہیں جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ قرآن میں بنک کا کاروبار سودی کاروبار بتایا گیا ہے۔ اس کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہے اور اس موضوع پر لکھے پڑھے لوگ بہت پہلے غور کر چکے ہیں۔ قرآن میں ممانعت تو سود کی بتائی گئی ہے جو حرام ہے مگر کاروباری معاملات میں منافع تو اس مد میں نہیں آتا۔ یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ بنک تو شروع کر لیا جائے اور جمع سرمائے پر منافع ادا نہ کیا جائے۔ بنک میں روپیہ جمع کرانا غیر اخلاقی بات نہیں ہے البتہ اس پر سود لینا ضرور منع ہے۔ زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مکہ مدینہ میں جو سینکڑوں کرنسی تبدیلی کرنے والے ہیں ان کا بھی تو یہی کاروبار ہے ان پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ کرنسی تبدیل کرنے والے ڈالروں کو روپے میں یا کسی اور ملک کی کرنسی میں تبدیل کرتے وقت اپنا کمشن وصول کرتے ہیں اور ان کا کاروبار بڑا منافع بخش ہے ویول سُود کے بارے میں اس طرح کی رائے دینے کا مجاز ہرگز نہیں تھا نہ جانے مائیکل وُلف نے یہاں تردیدی نوٹ کیوں نہیں دیا کیونکہ سود کے بارے میں مُسلم سکالرز کی رائے اگر بٹ بھی جائے اور یہودی لابی کے حواری جامعہ الازہر، قاہرہ سے اپنی مرضی کا فتویٰ بھی لے لیں

بارے میں لے آئیں جو وہ لاچکے ہیں تب بھی سود حرام ہی رہے گا اور قرآن پاک میں دیا گیا یہ مفہوم و مطلب رہتی دُنیا تک غیر متبدل رہے گا:

''اور جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن اس طرح کھڑے ہوں گے جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جس کو شیطان نے ہاتھ لگا کر باؤلا بنا دیا ہے۔ یہ ان کے اس کہنے کی سزا ہے کہ بیع بھی سُود کی طرح ہے حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ تجارت کو اللہ تعالیٰ نے درست کیا اور سود کو حرام کیا۔ پھر جس کو اس کے مالک کی طرف سے نصیحت کی بات آئی وہ آئندہ کے لیے سُود سے باز آ گیا۔ سو جو پہلے لے چکا وہ اسی کا ہے اور جو لوگ دوبارہ پھر سُود لیں تو وہ دوزخی ہیں اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔'' (البقرہ: 2:275)

حج: ہم نے پانچ بجے کے قریب اپنے سر منڈوانے کے بعد احرام اتار دیا تھا۔ ہمارا سامان اور نوکر صبح کے وقت بھیج دیے گئے تھے اور ہمیں امید تھی کہ ہماری آمد پر ہماری تیاری بھی مکمل ہو جائے گی۔

ہم اپنے گدھوں پر سوار ہو گئے تھے۔ میرے ساتھ شتربان بھی تھا ہم نے جُھہ نامی شخص اور اس کے بیٹے کو نوکروں کے طور پر ساتھ لے لیا تھا۔ ہمارے ساتھ وہ تین فارسی بھی تھے جو ہمارے اوپر والے کمروں میں رہتے تھے۔ راستہ تنگ تھا اس لیے شروع میں پیشرفت کم ہوئی۔ شہر سے نکلنے کے بعد سڑک کشادہ ملی تو ہماری رفتار تیز ہو گئی تھی۔ سڑک آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔ یہ کہیں کہیں تو پختہ تھی لیکن کسی کسی جگہ کچی بھی تھی۔ ہم جب منیٰ پہنچے اس وقت اندھیر چھا گیا تھا اور جُھہ ہمارا باورچی سڑک پر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

ہمیں اپنے خیموں تک پہنچایا گیا جو بڑے پڑاؤ سے کچھ آگے نصب کیے گئے تھے۔ یہ ان مشعلوں سے زیادہ دور نہ تھے جو شریف مکہ کی رہائش کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ ہم نے رات کا کھانا اطمینان سے کھایا اور پھر ایک فارسی دوست سے کچھ دعائیں سنتے رہے۔ ہمارا یہ دوست سید زادہ اور ایک فاضل انسان تھا۔ ہمیں عشاء کی نماز کے لیے منیٰ کی مسجد میں جانا چاہیے تھا لیکن ان دنوں کم لوگ مسجد میں نماز ادا کرنے جاتے ہیں۔ اندھیرے میں رات کو گم جانے کا خدشہ رہتا ہے اس لیے کوئی بھی یہ خطرہ مول نہیں لیتا اور خیمے کے اندر ہی نماز ادا کر لیتا ہے۔

ہم نے صبح ہی صبح اپنے خیمے لپیٹ لیے تھے اور اپنے نوکروں اور خیموں کو اونٹوں کے ساتھ آگے بھیج

دیا تھا۔ مجھے بالکل امید نہ تھی کہ یہ ہمیں دوبارہ مل سکیں گے۔ جُھہ ہمارا شتربان جو اَب انچارج تھا، اسے بڑا یقین تھا۔ ہم منیٰ چلے گئے تھے اور مزید آگے روانہ ہونے سے قبل ایک دو گھنٹوں کے لیے ایک کیفے میں رُک گئے تھے۔ ہم بالآخر آٹھ بجے چل پڑے تھے۔ گاؤں سے نکلنے والی سڑک مشرق کی سمت جاتی ہے اور یہ اوسطاً نصف میل چوڑی ہے۔ صرف چند سو گز کا فاصلہ تنگ ہے۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں رک گئے تھے تاکہ کچھ کھا پی لیا جائے۔

ہم نے جو غیر معمولی منظر دیکھا اسے قلمبند کرنے کے لیے بڑی مہارت چاہیے جو اپنے آپ میں نہیں پا رہا۔ یہ منظر کیسا ہے اس بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم نصف ملین لوگ 9 میل سڑک پر طلوع آفتاب سے دن کے دس بجے تک سفر میں رہتے ہیں۔ ان میں سے نصف تو اونٹوں اور دوسرے جانوروں پر سوار ہوتے ہیں اور ان میں سے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جنہوں نے اپنا سامان گدھوں پر لاد رکھا ہوتا ہے۔ اس ہجوم کی آواز سمندر کی تند و تیز لہروں کی آواز جیسی ہوتی ہے اور گرد و غبار کے بادل میلوں تک پھیل جاتے ہیں۔ اب ہمیں عرفات نظر آنے لگا تھا، یہ منظر بھی کوئی کم حیران کن نہیں تھا۔ پہاڑی لوگوں سے سیاہ ہوگئی تھی جس کے گرد خیمے نصب تھے۔ سینکڑوں خیمے منٹوں میں نصب ہو گئے تھے۔ اب لبیک اللھم لبیک کی آواز، جو ہزاروں حجاج کی زبان سے بیک وقت نکل رہی تھی، اس قدر اونچی ہوگئی تھی کہ ہر دوسری آواز اس میں دب کر رہ گئی تھی۔

کوہِ عرفات ایک چار سو فٹ اونچی پہاڑی ہے، جو شکل میں ہرم مصر جیسی ہے، اس کی چٹانیں گھسی پٹی ہیں۔ اس کے دامن میں پانی کے چشمے ہیں جو مکہ جانے والے قافلوں کو پانی مہیا کرتے ہیں۔ اس کی چوٹی پر ایک ابھرا ہوا چبوترہ ہے جس پر ایک روشن مینار ہے۔ اردگرد چٹیل پہاڑی سلسلہ ہے، خصوصاً مشرق میں۔ عرفات ایک مسطح مقام پر کھڑا ہے۔ پہاڑی کے اردگرد کیمپ ہے جو کئی مربع میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔

ہم جُھہ کے انتظامات پر اس کے ممنون تھے، ہمیں اس کے احکامات کے وقت پر تعمیل ہونے کا بھی اعتراف تھا۔ ہمیں فوراً ہی اپنے خیمے مل گئے تھے۔ یہ کیمپ کی بالکل سرحد پر تھے۔ بہترین محل وقوع پر، جس کے کئی اسباب تھے۔ ہمارے بہت سے ملنے والے، دوست احباب ہماری ہمسائیگی میں تھے۔ ہر کسی کا جوش و جذبہ دیدنی تھا۔ یہ ایک بڑی پکنک پارٹی کا منظر پیش کر رہا تھا اور کوئی مذہبی اجتماع بالکل نہیں لگتا تھا۔

ہم ایک گھنٹہ اپنے خیمے میں ٹھہرے پھر پہاڑی پر چڑھ گئے تھے تاکہ مذہبی رسم کے مطابق چوٹی پر جا

گردو رکعت نفل وہاں بنے ہوئے چبوترے پر ادا کر سکیں۔ اب تمام حجاج یہاں جمع ہو چکے تھے اور پہاڑی کی چوٹی سے اس عظیم اجتماع میں شامل لوگوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ایک ہی روز قبل اس پہاڑی پر کوئی بندہ بشر نہ تھا، ہر طرف خاموشی تھی، وہی خاموشی جو کل تک پھر اس کا مقدر بن جائے گی اور ہر سال یہی عمل دہرایا جاتا رہے گا۔ کسی اور روز یہاں تھوڑی تعداد میں لوگ جمع ہو سکتے ہی نہیں تھے کیونکہ یہاں ڈاکوؤں اور چوروں کا ڈر رہتا ہے۔

نماز ظہر کا وقت، قریب آ گیا تھا اور ہم اس وقت چوٹی پر تھے۔ 63 توپوں نے سلامی دی بہت سے بینڈ بج رہے تھے اور لوگ خوشی سے چلا رہے تھے۔

پہاڑ سے نیچے اترتے وقت ہم نے دیکھا کہ چشموں سے پانی کے ٹینک بھرے جا رہے تھے۔ بہت سے لوگ یہاں نہا بھی رہے تھے۔ پانی بے حد گندا تھا۔ ہزاروں غریب حجاج نے چٹانوں میں پناہ لے رکھی تھی۔ اس طرح کے ماحول میں وبائی بیماریوں کا پھیلنا کوئی حیران کن بات نہ تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہیضہ ایک بار پھیل جائے تو پورے حج کے دنوں تک نہیں موجود رہتا۔

ایک بازار لگایا گیا تھا جس میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں بک رہی تھیں۔ بہت سے خیموں میں مشروبات دستیاب تھے۔ ہم کچھ دیر تک تو گھومتے پھرتے رہے مگر جب دوپہر کی دھوپ ننگے سروں پر برداشت نہ ہو سکی تو ہم لنچ کے لیے اپنے خیمے میں لوٹ آئے تھے۔

منیٰ کو واپسی: اب ہم احرام اتار کر وہ خوبصورت سے خوبصورت لباس پہن سکتے تھے جو اس وقت ہمارے پاس موجود تھا۔ ہم سب کو موقعہ کی مناسبت سے وہاں کے رواج کے مطابق نئے کپڑے دیئے جاتے ہیں۔ یہ ایک تو عیدالاضحیٰ کی خوشی کے موقع پر دیئے جاتے ہیں دُوسرے اس لیے بھی تاکہ نیا نیا حاجی بننے والا شخص پچھلے تمام گناہوں کے دُھل جانے پر پاکیزہ اور صاف سُتھرے کپڑوں کے ساتھ نئی زندگی کی ابتداء کر سکے۔ یہ نئے کپڑے اس کی روحانی حالت کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ گویا حج کی ادائیگی کا مکمل ہونا وہ موزوں لمحہ ہوتا ہے جب خدا سے نئے عہد و پیمان کیے جاتے ہیں اور پرانی عادات، پرانے برے کام ترک کر دیئے جاتے ہیں۔

مجھے سیاہ کپڑے کا ایک جبہ، سنہری کمر بند اور ایک خنجر دیا گیا تھا۔ مسعودی ظفنطبار کا لباس پہنے ہوئے تھا جس کے ساتھ ایک واسکٹ تھی (گو اس کا اب فیشن نہیں رہا تھا بہت برس پہلے میں نے اس کے لئے دس

پاؤنڈ دیئے تھے) اور عبدالواحد نے پیلے رنگ کا تر کی جبہ پہن رکھا تھا جس پر سنہری کڑھائی کی گئی تھی جسے مسقط کے لوگ پسند کرتے ہیں۔

ہمارے گدھے آ گئے تھے اور ہم ان پر سوار ہو کر واپس منیٰ کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ ہم نے آج اپنے سفر کا آغاز غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے کیا تھا۔ ہم زیادہ دور نہ گئے تھے کہ مسعودی نے اچانک اپنے جسم کو جھٹکا دیا جس نے اس کی ظاہری خوبصورتی ختم کر دی تھی اس کے بعد عبدالواحد نے بھی ایسا ہی کیا، سات دنوں میں ایسا اس نے تیسری بار کیا تھا۔ انہوں نے بیچارے گدھوں کو بے رحمی سے پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بمشکل چل سکتے تھے میں گر گیا تھا۔ عربی گدھوں کو لگام نہیں ڈالی جاتی البتہ ان کی کمر پر کئی کڑھی ہوئی چادریں ڈال کر سوار ہوتے ہیں۔ اس سے ان پر بیٹھنا آرام دہ ہو جاتا ہے۔

ہم جس وقت منیٰ پہنچے اس وقت عشاء کی نماز کے وقت کا اعلان توپوں کو چلا کر کیا جا رہا تھا۔ عیدالاضحیٰ کے روز پانچ نمازوں میں سے ہر ایک نماز کے وقت کا اعلان 21 توپوں سے ہوتا ہے۔

ہمارا خیمہ پندرہ فٹ قُطر کا بڑا سا خیمہ تھا۔ ہم تینوں، عبدالواحد، مسعودی اور میں اس میں سو جاتے تھے۔ ہم درمیان میں وہ سامان رکھ لیتے تھے جو ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ سب سے اہم وہ تھیلا تھا جس کے اندر سونے کے پانچ پاؤنڈ اور ایک خوبصورت مجلد قرآن پاک کا نسخہ تھا جو عرفات کے لیے روانگی سے دو روز قبل میں نے تیس شلنگ ہدیہ دے کر لیا تھا۔ ایک عنبر کی تسبیح تھی، دو پستول تھے۔ اس رات ہم گھوڑے بیچ کر سوئے تھے اس لیے کہ اگلی صبح جب مسعودی کی ہم سب سے پہلے آنکھ کھلی تو تھیلا مع قیمتی سامان اور پاؤنڈوں کے غائب تھا۔ اسی طرح اور کئی چیزیں غائب تھیں جن میں اس کی نئی پگڑی بھی شامل تھی۔ ریت پر موجود کسی کے قدموں کے نشان بتا رہے تھے کہ چور کس طرف سے آیا تھا۔ ہم کچھ بھی نہ کر سکتے تھے مگر ان چوروں کی دیدہ دلیری کا آپ اندازہ اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں۔ ایک ایسے کیمپ کے اندر کے اس خیمے میں سے، جس میں تین مسلّح انسان سو رہے تھے اور کیمپ کے گرد بھی گارڈ موجود تھے۔ سامان کا یوں چوری ہو جانا جادو ہی کہا جا سکتا ہے یا اسے چور کی مہارت کا نام دیا جا سکتا ہے مگر اچھا ہی ہوا جو ہم تینوں بے سُدھ سوئے رہے ورنہ ہم میں سے اگر ایک بھی ذرا سی جنبش کرتا تو خنجر سے اس کا کام تمام کر کے اسے یومِ حشر تک لمبی نیند سلانا اس چور کے لیے مشکل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگوں میں ایک عادت سی بن گئی ہے کہ جاگتے وقت نیم وا آنکھوں سے اردگرد کا پہلے جائزہ لیتے ہیں پھر اطمینان کر لینے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں۔ کسی صحرائی عرب کو نیند

سے جگانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر ہم خوش قسمتی سے چور کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیتے تو اسے اسی وقت موقعہ پر گولی ماردی جاتی ہمیں اکثر اس قسم کے خطرات سے آگاہ کیا جاتا تھا اور ہم ہتھیار سرہانے رکھ کر سوتے تھے۔

سفر کے دوران ہم نے 19 چوروں کے گروہ کو ہتھکڑیوں میں دیکھا تھا جنہیں مکہ لے جارہے تھے۔ ان میں چھ کو گولی ماردی گئی تھی بقیہ کے دائیں ہاتھ کاٹ دیئے گئے تھے۔ یورپی اس قطع ید والی سزا کو اگر وحشیانہ فعل سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں کیونکہ دنیا کے تمام ممالک کے لوگ اس سزا کے حق میں ہیں۔ جب خطرناک اور مہلک بیماریوں کا علاج کرنا ہو تو آپریشن سے جسم کے کئی حصے جدا کرنے ضروری ہو جاتے ہیں تاکہ باقی کے جسم کو محفوظ رکھا جاسکے۔

☆☆☆

چوتھا حصّہ

بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ

ء1925—33

اس حصے میں شامل اقتباسات جن پانچ سفرناموں سے لیے گئے ہیں ان کے مصنف نومسلم ہیں۔ انہوں نے عبدالعزیز ابن سعود کے فتح مکہ (1924ء) کے برسوں کو اور 1932ء میں سعودی ریاست کے قیام کے عرصے کو ایک دوسرے میں چھپا دیا ہے۔ اتفاق سے یہ ٹکڑے علاقائی سیاست میں خصوصی دلچسپی کو ایک دوسرے سے مختلف ظاہر کرتے ہیں۔ ان تین سفرنامہ نگاروں میں سے ایلڈن رٹر (1925ء) نے ابن سعود کے بارے میں وہ پیراگراف لکھے ہیں جو اس کے قریبی مشاہدے میں آئے جبکہ محمد اسد (1927ء) اور سینٹ جان فلبی (1931ء) بادشاہ کے قریبی افراد میں سے تھے۔ دو دیگر سیاح ایسے ہیں جنہوں نے ذاتی یادداشتیں چھوڑی ہیں...... ایک تو بڑے گھرانے میں پیدا ہونے والی متمول اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لیڈی ایویلین کو بولڈ ہے (1933ء) اور دوسری ایک آسٹریلوی شتربان وینفریڈ سٹیگر (1927ء) ہے۔

اس حصے میں شامل ہر مصنف کے پاس اسلام لانے کے مختلف اسباب تھے وینفریڈ سٹیگر نے ایک ہندوستانی سے شادی کی تو وہ اسے مکے لے آیا تھا۔ محمد اسد نے بورژوائی مغربی اقدار کے متبادل کے طور پر اسلام قبول کیا تھا۔ فلبی ایک عیسائی مادہ پرست تھا جس نے مسلمان ہو جانے کے بعد عرب میں پوری زندگی اطمینان سے گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جبکہ لیڈی کوبولڈ کا تعلق برطانیہ سے تھا اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہو چکی تھی۔ ان سب نے اس زمانے میں لکھا جب یورپ اور اسلامی دنیا ایک دوسرے کے قریب تھے۔ اس کے علاوہ 1900ء سے مسلمان ایک بڑی تعداد میں یورپ منتقل ہو رہے تھے جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انہیں یہاں روزگار کے مواقع مل رہے تھے، اور یورپ کو کم اُجرت پر محنت کش مل گئے تھے۔ پھر 1914ء کے بعد یہ مسلمان جنگ عظیم میں حصہ لینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ اسلام 1925ء میں مغربی یورپ میں اس طرح اجنبی نہ تھا جس طرح کسی زمانے میں تھا۔ مغربی نومسلم ابھی تک اپنے آپ کو اکیلا تو محسوس کر رہے تھے مگر ان پر اب انحراف کا داغ نہیں تھا جس نے اٹھارویں صدی میں جوزف پٹس کا تعاقب کیا تھا۔ فلبی کے دوستوں کے وہ خطوط جو انہوں نے 1930ء میں اسے اس وقت لکھے جب وہ مسلمان ہو گیا تھا، بتاتے ہیں کہ اس نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ وہ اپنے مذہب کے بارے میں فکرمند اور تشویش کا شکار ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کے دل میں مذہب تبدیل کر کے حلقہ بگوش اسلام ہو جانے کا خیال آیا۔ کیا قارئین کو اس بات پر حیرت ہو سکتی ہے کہ ایک نومسلم کس قدر قابل اعتماد رپورٹر ہو سکتا ہے؟ رچرڈ برٹن کے عہد میں یورپ میں

یہ سمجھا جاتا تھا کہ کفار زیادہ قابل اعتماد تھے۔ آج بھی کسی بھی موضوع پر عدم دلچسپی ایک زیادہ سائنسی نقطہ نظر کی ضمانت دیتی ہے۔ اس کا اطلاق ذراتی طبیعیات پر ہو سکتا ہے مگر مکہ کے حوالے سے یہ درست نہیں ہوگا۔ ابن جُبیر اور بیگم بھوپال جو دونوں پکے مسلمان تھے حج کے بارے میں ہو سکتا ہے ضرر رساں مواد پیش کر رہے ہوں۔ مذہب نے از خود ان کی معروضی صلاحیت میں کمی نہیں کی تھی بلکہ اس میں اضافہ ہی کیا ہوگا۔ دوسری طرف مغرب مشاہدین حج کے بجائے اپنے بہروپ کے بارے میں زیادہ فکرمند رہتے تھے۔ انہوں نے کم وبیش ہمیشہ ہی سفر کے دوران پکڑے جانے کے خدشات کو دل ودماغ میں جگہ دی۔ مقامی معلومات تک ان کی رسائی میں جو چیز ہمیشہ رکاوٹ بنتی تھی وہ ان کے بہروپ پر سے پردہ اٹھ جانے کا ڈر تھا۔ ان مداخلت کاروں کے متن پر ایک سوال ہمیشہ منڈلاتا رہتا ہے: ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' خواہ یہ برکات (1814ء) کا سفرنامہ ہو یا دیول کا (1908ء)۔ چند ایک کو چھوڑ کر یہ مشاہدین نہ تو غیر جانبدار تھے نہ ان کی روداد ان نومسلم مصنفین کی روداد سے زیادہ مکمل تھی جو ان کے چند برس بعد آئے۔ وہ اکثر صاف صاف اور سچ لکھنے والے تھے مگر وہ صحیح معنوں میں حجاج نہ تھے۔ انہوں نے ایک بےمثال تجربے پر روشنی ڈالی مگر یہ تجربہ صرف ایک مسلمان کو ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ لوگ جب طواف بھی کرتے تھے تو دراصل طواف کی روح سے خالی چکر لگا رہے ہوتے تھے۔ برٹن جو تمام عمر ایک قسم کا مسلمان رہا اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔ اپنا موازنہ ان حجاج سے کرتے ہوئے جو کعبہ کا طواف کر رہے تھے، وہ لکھتا ہے:

میں سچ کہتا ہوں کہ ان عبادت گزاروں میں سے جو غلاف کعبہ تھامے زاروقطار رو رہے ہیں یا جنہوں نے حجر اسود کے ساتھ اپنا دھڑکتا ہوا دل لگا رکھا ہے ان میں سے کسی بھی حاجی کے جذبات وہ نہیں تھے جو شمال کے دور دراز کے ملک سے آیا تھا مگر اس سچائی کو بھی عجز وانکساری کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے کہ ان کا مذہبی جوش وجذبہ اپنی جگہ موجود تھا، جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا میں تو ممنونیت کے احساس سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

آیئے نومسلم مُحمد اسد کے جذبات سے موازنہ کرتے ہیں:

میں معبد ابراہیمؑ کے سامنے کھڑا تھا۔ میں اس عجوبہ روزگار کو دیکھ کر محو حیرت تھا، میرے دماغ نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ کسی پوشیدہ مسکراتے ہوئے بیج نے جو میرے اندر موجود تھا ایک گیت کی مانند فرط مسرت سے پھلنا پھولنا شروع کر دیا تھا۔

ان صفحات میں سے غیر مسلموں کو جدا کر دینا دنیا میں یورپی نوآبادیوں کے عمل کی تکمیل کے ساتھ ساتھ وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ جب تک وہ عمل جاری رہا، سولھویں صدی سے انیسویں صدی تک، مکہ ایک ایسا ممنوعہ شہر تھا جس میں مغربی سیاح داخل ہونے کے لیے بے چین رہتے تھے، اس کی تلاش ان کی زندگی کا مشن بن گیا تھا۔ (اس کے علاوہ ممنوعہ شہروں میں تبت کا لحسہ، مراکش کا سمارا، ملایا کا ٹمبکٹو، بیجنگ کا ممنوعہ شہر اور ایتھوپیا کا ہرار بھی شامل تھا۔ تاہم 1925ء میں مہم جوئی کی سرحدیں کہیں اور تھیں۔ چار صدیوں کے بعد مکہ ایک خالص اسلامی موضوع کی طرف لوٹ گیا تھا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لیے تو بیشک یہ پہلے بھی ایسا ہی تھا۔

تاریخی پس منظر

عہدِ تولیت: اس حصے میں شامل زیادہ تر مصنفین کی دلچسپی مشرق وسطیٰ کی سیاست اور اس علاقے پر یورپی حکمت عملی کے اثر سے تھی۔ پھر جنگ عظیم اوّل اور اس کے معاہدوں نے مشرق وسطیٰ کی شکل ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دی تھی۔ انہوں نے حج کو بھی بدل دیا تھا۔

جب 1914ء میں سلطنت عثمانیہ جرمنوں کے ساتھ جنگ میں مل گئی تھی تو سلطنت عثمانیہ کے مستقبل میں حصے بکھرے کرنے کے لیے برطانیہ، فرانس اور روس نے آپس میں کئی پوشیدہ اور خفیہ معاہدے کر لیے تھے۔ جنگ بندی کا انہیں انتظار تھا تاکہ یہ اپنے عزائم میں کامیاب ہو سکیں۔ اس پیشگی بکنگ کے علاوہ مشرقی باسفورس، فرانس اور برطانیہ نے چند بڑی حقیقی نسلی تقسیم کے متعلق اقدامات کیے تھے۔ یہ تقسیم ترک دربار عثمانیہ اور اس کے آرمینیائی، کُردی اور عرب مقبوضہ جات کے درمیان تھی۔ انہوں نے نہ صرف علاقائی سرداروں کو ترکوں کے خلاف بھڑکایا بلکہ انہیں اسلحہ، دولت بھی فراہم کی اور آزاد کر دینے کا وعدہ بھی کیا۔

جنگ عظیم اول کے وسط تک برطانیہ کا سب سے بڑا عرب باغی سردار مکے کے شریف حسین ابن علی کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ (24-1908ء)۔ مارچ 1916ء میں حُسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کا آغاز مسجد حرم کے قریب واقع اپنے محل کی کھڑکی سے ان کی فوج پر رائفل کے فائر سے کیا تھا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ پورے حجاز میں پھیل گیا تھا اور برطانیہ کی پشت پناہی سے جنگ کے دوران جاری رہا۔ اتحادیوں کی مشرقی جنگ میں یہ ایک چھوٹی سی حرکت تھی۔ شریف مکہ کی بغاوت عسکری طور پر برطانوی پالیسی میں بڑی اہمیت کی حامل تھی

اس لیے کہ اس نے مکہ کے حکمران کو اتحادیوں کے مقصد کے ساتھ پیوست کر دیا تھا۔ دربارِ عثمانیہ نے حالانکہ جرمنی کا ساتھ دیا تھا مگر اس کے باوجود کئی ملین مسلمانوں نے اس کی حمایت کی تھی۔ برطانیہ عظمیٰ اور سلطنت عثمانیہ کی جنگی چالوں میں صرف حکومتِ حجاز تیزی کے ساتھ یرغمال بنائی جا رہی تھی۔ جہاں تک حج کا تعلق ہے حسین کی عرب بغاوت نے 1916ء میں اسے براہِ راست بہت متاثر کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس کے فوجی دستوں نے جن کی مدد برطانوی فوج اور ٹی ای لارنس کی گولہ بارود کی مہارت کر رہی تھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے شمال میں دور دور تک ریلوے لائن اڑا دی تھی۔ ٹرین کا غائب ہو جانا حجاز کی اقتصادیات کے لیے پیغامِ اجل ثابت ہوا۔ اس سے مدینہ منورہ کی ترقی رُک گئی تھی جس کا اندازہ ہم آگے چل کر لگا سکیں گے جبکہ ہم اس سے مکہ آنے والے حجاج کی تعداد میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ جونہی جنگ ختم ہوئی حجاج کی ایک بہت بڑی تعداد بحری اور خشکی کے راستے اُمڈ آئی تھی۔ 1920ء کی دہائی میں اونٹوں کے اندرونی راستوں پر قافلوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ راستے تاحیات ٹھیکے پر دے دیئے گئے تھے۔ حج کے لیے آنے والوں کے لیے اس میں بڑی دلکشی تھی۔

نظامِ تولیّت: جنگ عظیم اوّل ختم ہوئی تو عرب کی آزادی کے اتحادی وعدے، معاہدوں کی میزوں پر دم توڑ گئے تھے۔ اس کے بجائے سلطنتِ عثمانیہ کے چھ سیاسی وجود بنا دیئے گئے تھے جنہیں تولیت کہتے تھے۔ یہ دراصل نوآبادیاں تھیں جنہیں پسماندہ ریاستوں کا نام دیا گیا تھا اور ان کو زیادہ ترقی یافتہ اقوام کی سرپرستی میں اس وقت تک دے دیا گیا تھا جب تک یہ جدید دنیا کے حالات کے تحت اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو جاتیں۔

اس مربیانہ نظامِ تولیت نے برہنہ نوآبادیاتی نظام پر جمعیت اقوام کو لا بٹھایا تھا۔ اس جھوٹے دکھاوے کے پیچھے فرانس اور برطانیہ اپنے مفادات (تیل، تجارت، ہندوستان سے مواصلاتی رابطے کے قیام) کی حفاظت کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ ایسا کرنے میں انہیں سرمایہ کاری اور پورے علاقے کے انتظامی امور کو اپنے ہاتھوں میں لینا تھا۔ 1923ء میں نقشے پر نئی جغرافیائی سرحدیں نمودار ہو گئی تھیں۔ ماورائے اردن، عراق اور شام نے نام حاصل کر لیے تھے اور شریف مکہ کے خاندان کے افراد کو عرب حاکموں کے طور پر درآمد کیا جانے لگا تھا۔ مصر اور فلسطین کو مکمل ریاکاری کی ضرورت نہیں تھی۔ ان پر براہِ راست برطانوی کمشنروں کی حکومت تھی مگر اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یورپیوں نے پالیسی وضع کرنی تھی۔ اس میں

ان کو کو ایک ایسے نیٹ ورک کے قیام کی ضرورت تھی جس میں لندن اور پیرس سے آرڈر لیتے وقت بھاری کمشن وصول کیا جا سکتا ہو۔ ہمارے مصنفین میں سے ایک سینٹ جان فلبی عراق میں (24-1921ء) برطانیہ کا نمائندہ اعلیٰ تھا۔

سعودی حکومت کی حیاتِ نو: اس دوران عرب میں کہانی کا دوسرا اہم باب کھل رہا تھا۔ جنگِ عظیم اوّل سے ایک سال قبل انتہائی شمال مشرق کے صحرائے نجد میں عبدالعزیز ابن سعود سعودی وہابی اتحاد کا وارث اپنے آباؤ اجداد کے مقبوضات از سرِ نو فتح کر رہا تھا۔ ابن سعود ایک دراز قد، وقت پر فیصلے کرنے والا انسان تھا جو اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے عطیۂ الٰہی رکھتا تھا۔ وہ پورے عرب کو ایک پرچم تلے لانا چاہتا تھا۔ اس کے بڑے مخالفین میں محمد ابن رشید، ایک مقامی نجدی سردار، ایک ترک اتحادی اور مکے کا شریف حسین، جسے برطانیہ کی پشت پناہی حاصل تھی، شامل تھے۔ ابن رشید اور حسین غیر عرب طاقتوں کے پہلے ہی اتحادی بن چکے تھے۔ ابن سعود نے ایک مقامی وہابی قبیلے کے افراد کا گروہ اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا جنہوں نے 1912ء میں اپنا مال واسباب بیچنا شروع کر دیا تھا تا کہ پورے نجد میں روحانی برادری کی حیثیت سے فارم بنا کر رہ سکیں۔ ابن سعود جوان کا جدی سردار تھا ایک بار پھر ان کا حاکم بن گیا تھا۔ اس کے پاس چونکہ زمین بہت تھی اس لیے اس نے ایک فوج بھی کھڑی کر لی تھی۔

ان بھائیوں یا اخوان کی پہلی منزل مقصود اسلام کو زیادہ سے زیادہ بدوؤں میں پھیلانا، لوگوں کی توجہ اسلامی اقدار پر مبذول کرانا اور مقامی سرداروں اور شیوخ کے ساتھ ان کے اتحاد کو توڑنا شامل تھا۔ اس طرح سے، ایک حیرت انگیز رفتار کے ساتھ ہزاروں نیم خانہ بدوش اپنے قبیلوں سے باہر اپنی وفاداری کا عہد کر چکے تھے۔ زندگی میں پہلی بار بجائے ڈاکے ڈالنے اور قافلوں کو لوٹنے اور چوری کرنے کے انہوں نے اپنی روزی کمانی شروع کی تھی۔ ان کی بندوقیں اب صرف اور صرف ابن سعود کے حکم کی تعمیل میں چلتی تھیں جو ایک سلطنت کی بنیادیں مضبوط بنانے کے لیے انہیں استعمال کر رہا تھا۔ اس کے عوض اخوان برادری کو کھیتوں پر کام میں استعمال کے لیے زرعی اوزار، اسلحہ، مساجد، کتابیں، مال مویشی اور اصطبل ملتے تھے۔ کھیتوں پر کام کرنے والے یہ محنت کش اس اسلام پر یقین رکھتے تھے جس میں خدائے واحد، خالقِ کائنات تھا، انہوں نے قبائلی رقابتوں کو ختم کر دیا تھا، لوگوں کو ایک نئی شناخت بخشی تھی۔ انہوں نے قبیلوں کے درمیان برسوں جاری رہنے والے جھگڑوں کو ختم کر دیا تھا۔ 1917ء میں ایک چوتھائی ملین بدوؤں نے جن میں مرد، عورتیں اور

بچے شامل تھے۔ صحرائی خیموں سے نکل کر نجد کے گرد و نواح میں سینکڑوں کچے گھروں میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ ان میں 60 ہزار افراد ایسے تھے جو جنگ و جدل میں حصہ لینے کی عمر کے تھے اور ایک لمحے کی مہلت پر جواب دینے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ وہ امیر ابن رشید پر چھا گئے تھے اور سعودی اس کی زمینوں پر ملکیت کا دعویٰ کر رہے تھے۔

جنگِ عظیم اوّل نے حجاز کو ترکوں کے کنٹرول سے آزاد کرا دیا تھا۔ اب ابن سعود اپنے خاندان کے دیگر مسائل کے حل کی جانب متوجہ ہوا جس میں سرفہرست دو مقدس شہروں پر شریف خاندان کا تسلط تھا۔ سب سے زیادہ باہر کے مشاہدین کو شریف حسین کی بعد از جنگ پوزیشن محفوظ نظر آئی۔ پُرامید برطانوی اور فرانسیسی سفارت کاروں نے اپنے بیٹوں کو تین نو آبادیوں کے تخت و تاج کا مالک بنا دیا تھا۔ حجاز پر اس کے حقِ بادشاہت کے دعوے کو اس نے مان لیا تھا۔ تاہم حقیقت یہ تھی کہ وہ مکے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اور ابن سعود کی فوجیں حجاز میں داخل ہو رہی تھیں۔ ستمبر 1924ء میں تین ہزار وہابیوں نے جو سب کے سب جنگجو تھے مکہ کو نظر انداز کر کے طائف کو اپنا نشانہ بنا لیا تھا۔ انہوں نے ایک واضح پیغام ارسال کیا: عرب کے دو سرکردہ خاندانوں شریف خاندان اور سعودیوں کے درمیان صدیوں سے جاری سرد جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو کر ختم ہونے والی تھی۔ حسین نے چند روز بعد شہر خالی کر دیا تھا اور ابن سعود کی فوجیں ایک فائر کیے بغیر مکہ میں داخل ہو گئی تھیں۔ وہ اگلے برس حجاز کا بادشاہ بن گیا تھا۔

ابن سعود کی 1925ء میں کوہ صفا کے قریب تاجپوشی ہوئی۔ شریف حسین کی طرف سے حال ہی میں شہر کو خالی کرنے سے اور ایک سال قبل خلافتِ عثمانیہ کے زوال کی وجہ سے مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار کوئی علامتی عالمگیر نمائندہ نہیں رہا تھا۔ اس طاقتور منظم کرنے والی علامت کے بغیر مشرق وسطیٰ قومیت کے جوار بھاٹے کے لیے بہت موزوں تھا۔ گو ابن سعود کی فتح کی خبر نے پوری اسلامی دنیا میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑا دی تھی مگر وہ کبھی بھی خلیفہ منتخب ہونے کے لیے ایک اچھا امیدوار نہیں رہا تھا۔ دنیا نے اس کے انقلاب کو ان لیے قبول کر لیا تھا کیونکہ وہ جیت چکا تھا مگر اس کا راسخ العقیدہ قسم کا اسلام بہت سے مسلمانوں کے لیے زیادہ سخت تھا۔

سعودی حکومت کی طرف سے حج کی تشکیل نو:

حسین کے طویل دور حکومت میں ... ت حج کا نظام نفع خوری کی اس انتہا کو چھو رہا تھا جس پر قابو پانا مشکل نظر آتا تھا۔ جب ابن سعود کا دور آ

تو اس نظام کو خطرہ لاحق ہوا کہ وہ اس بارے میں بدعنوانیوں کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ مکہ میں خاص طور پر بااصول وہابی فوج کا مطالبہ یہ تھا کہ قرآنی قانون پر عمل کیا جائے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان نجدی مصلحین نے بیگم بھوپال کی مہیا کردہ فہرست خواہشات میں سے ایک صفحہ لے لیا تھا۔ ہر قسم کی زیادتی کو کم کرنے کا عزم لیے ہوئے انہوں نے سرکاری سطح پر رشوت اور بھاری محصول کو ختم کر کے سامان خورد و نوش کی قیمتیں اور حجاج کی رہائش گاہوں کے کرائے کم کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا یہ چونکہ اس بارے میں کسی طرح کی نرمی دکھانے کے حق میں نہ تھے اس لیے بہت سے لوگ ان کے مخالف ہو گئے تھے۔ درج ذیل اقتباسات میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہابی ایک بہت سخت، اصول پسند اسلام نافذ کرنا چاہتے تھے۔ وہ بزرگوں کے مزارات گرا دینے کے حق میں تھے، ان کا خیال تھا کہ تمباکو، موسیقی، شراب اور رقص کو ممنوع قرار دے دیا جائے۔ ابن جبیر کا یہ پرانا مطالبہ کہ حجاز کو بزور شمشیر پاک کر دیا جائے۔ اب ایک اوسط درجے کے وہابی سپاہی کے لیے کوئی انتہائی قدم نہیں رہا تھا۔

حجاج کی اکثریت ان انتہائی اقدام کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی کیونکہ اس کے عوض اسلامی دنیا نے ان کے تشدد اور سختی کو ناپسند کیا تھا۔ 1929ء کے بعد بھی جب ابن سعود نے وہابیوں کو غیر متحرک کر دیا تھا، وہ کچھ برسوں تک اس نقصان کا ازالہ کرتا رہا تھا جو ملک سے باہر اس کے نام کو پہنچا تھا۔ برطانیہ کے ساتھ ایک مضبوط الحاق، سلطنت کے اندر تیل کی دریافت، اور حج کے انتظامات پر مسلسل دی جانے والی توجہ ایسے اسباب ہیں جو سعودی حکمرانی کو پسند کرنے والی ہمسایہ عرب حکومتیں دلائل کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ تاہم یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے "یہ کون سی ہمسایہ عرب حکومتوں کی بات ہو رہی ہے؟" ہمیں نظام تولیت اور جنگ عظیم دوم کا ممنون ہونا چاہیے کہ مشرق وسطیٰ کے دس ممالک میں سے صرف سعودی عرب 1945ء میں ایک مستحکم مقامی حکومت کے طور پر ابھرا تھا۔ حکومت کی سختی، قدامت پسندی اور اندرون بینی، یہ سب یہاں کے عوام کو فائدہ پہنچا رہے تھے۔ یہ ملک بہت جلد ان کے خوابوں سے بڑھ کر امیر ہونے والا تھا۔

سعودی عرب کی ہماری آج کی تصویر کا بطور ایک متمول اور جدیدیت کی جانب مائل ریاست کے دور جنگ و جدل پر اطلاق نہیں ہوتا۔ ابن سعود کا نیا ملک مفلس ہو گیا تھا۔ اس میں نہ سڑکیں تھیں، نہ قومی کرنسی، نہ نظامِ مواصلات۔ 1930ء کی دہائی میں حج سے حاصل شدہ محصولات اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھے۔ مایوسی اور پریشانی کے ان دنوں میں برطانیہ نے اس آمدنی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے 60ہزار پاؤنڈ سالانہ مالی تعاون فراہم کر دیا تھا۔ 1950ء کی دہائی تک اتنا سرمایہ نہیں تھا جو ملک کو جدید بنانے پر خرچ کیا جاتا۔ اس

دوران حج اصلاحات کا عمل بہت سست تھا، جسے تکمیل تک پہنچانے میں کئی عشرے درکار تھے۔تاہم بنیادی کام ایک ہی وقت میں کر لیا گیا تھا۔نومبر 1926ء میں ابن سعود نے ایک فرمان جاری کیا تھا جس میں حج کے قواعد وضوابط کو پہلی بار پوری جامعیت کے ساتھ طے کر دیا گیا تھا۔اس فرمان کی 40 دفعات اس حکومت کو لائسنس جاری کرنے اور حج کی تمام تنظیموں کی نگرانی کا حق عطا کرتی تھیں۔حج گائیڈز، سقوں اور اونٹوں کو کرائے پر دینے والوں کے فرائض کے بارے میں پہلی بار تفصیل جاری کی گئی تھی۔ان کی سرگرمیوں کی نگرانی کے لیے ادارے اور کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں۔خدماتِ حج کے ریٹ مقرر کر دیئے گئے تھے اور انہیں شائع کر وا کر تقسیم کیا گیا تھا۔رفتہ رفتہ خدماتِ حج کے نظام کو ان خطوط پر از سرِ نو تشکیل دیا جا رہا تھا تا کہ یہ ایک صنعت کی صورت اختیار کر لے۔ابن سعود کے عہدِ حکومت میں حج کے انتظامات میں بہتری آئی تھی۔یہ 1930ء کی دہائی کی نسبت اب زیادہ بہتر تھے۔کس قدر طنزیہ بات تھی کہ حج نہیں بلکہ فرانسیسی اور برطانوی سلطنتیں زوال پذیر تھیں۔اس دوران یورپی قونصلوں اور نمائندوں کو جدہ میں ساحل تک محدود کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

14۔ ایلڈن رٹر...... برطانیہ عظمیٰ

1925ء

مئی 1925ء میں ایلڈن رٹر قاہرہ میں حج پر جانے کے انتظامات میں مصروف تھا۔ اس وقت وہ ایک نوجوان نورالدین شرقوی سے مل چکا تھا جس کا تعلق مکہ سے تھا اور جو اس کے ہمراہ حج پر جانے کے لیے تیار تھا۔ دونوں نے مل کر اس سفر کے لیے کچھ سامان خرید لیا تھا۔ اس میں ایک کیمرہ، قطب نما، ایک مقیاس الہوا، شیخ کا چغہ، زین کے ساتھ باندھنے والے تھیلے، عربی میں طبع شدہ چند کتب اور ایک ریوالور شامل تھا۔ یہ ساری چیزیں تیار تھیں کہ روانگی سے چند روز قبل مکے کا وہ نوجوان انتقال کر گیا تھا۔ رٹر کو یوں اس سفر پر تنہا روانہ ہونا پڑا۔

حجاز کے حالات اس زمانے میں کسی حاجی کے لیے کچھ زیادہ سازگار نہ تھے۔ رٹر جب ٹرین سے سویز پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ بندرگاہ پر کوئی اور مسافر نہیں تھا۔ عبدالعزیز ابن سعود نے آٹھ ماہ قبل مکے پر قبضہ کر لیا تھا۔ پورے علاقے میں سڑکیں متنازع بن گئی تھیں۔ پچھلی بار وہابیوں نے علی بے عباسی کے زمانے میں اس شہر پر قبضہ کیا تھا جب ہر حاجی کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ اس ملک سے چلا جائے۔ آج مشکل اور طرح کی تھی کہ شہر میں داخل ہونا محال ہو گیا تھا۔ پہاڑوں سے لے کر ساحل تک دیہات یا تو زیرِ محاصرہ تھے یا شریف حسین کے خلاف علم بغاوت بلند ہو چکا تھا اور ابن سعود کے منہ زور اور جوشیلے سپاہی سڑکوں پر گشت کر رہے تھے۔ 1925ء میں خطرات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ رٹر کے سوئز سے روانہ ہونے سے چند ہفتے قبل مصر کے مذہبی بیئت نے عارضی طور پر حج کی ادائیگی غیر ضروری قرار دے دی تھی۔

ایک انگریز کے لیے جسے سفر کے دوران نوٹس لینے تھے یہ حالات سازگار نہیں تھے۔ مدینہ منورۃ یا نبو اور جدہ شریف مکہ کے قبضے میں تھے اور یہاں اسلحہ کی کثرت تھی۔ رٹر نے یہ راستہ چھوڑ دیا تھا۔ اس نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جس کا ذکر ان صفحات میں نہیں آیا۔ وہ بحیرۂ احمر کے راستے سفر کرتا ہوا مُسوہ سے جو اریٹیریا میں واقع ہے، القنان تک پہنچا تھا جو یمنی سرحد پر ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے۔ یہاں گہری نظر رکھنے والے سعودی

گارڈ تعینات تھے جو بلا عذر اپنی اتھارٹی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مکہ تک جاتے ہوئے ان کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہورہا تھا۔ تفتیش اور سوال و جواب سے بچنے کے لیے رٹر نے سفر کے دوران چار مرتبہ سفر کے ساتھی تبدیل کیے۔ گمنامی کے خطرات کا انتخاب کرتے ہوئے رٹر نے چھوٹے آرام کو تج دیا تھا۔

حجاز کے لوگ بڑے دوست نواز اور ملنسار تھے۔ بہت سے شہروں میں رٹر کا بڑا استقبال ہوا۔ مثال کے طور پر البرق کے مقام پر اس کا استقبال ایک مقامی مؤذن نے کیا تھا۔ پھر مکہ سے تعلق رکھنے والے ایک سربیائی مسلم نے اس کی بڑی خاطر مدارت کی تھی۔ رٹر لکھتا ہے:

''ہم نے کھانا کھالیا تو کھلے آسمان تلے ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا کر اس پر رسی کی بنی ہوئی چارپائی میرے لیے بچھا دی گئی تھی۔ ہم نے یہاں سے ایک تو سمندر دیکھا دوسری طرف پہاڑی سلسلہ، آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا اور ستارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ جلد ہی دوسرے جھونپڑے کے اندر سے کچھ اور لوگ بھی باہر نکل آئے تھے اور انہوں نے بھی ساتھ ہی چارپائیاں بچھا دی تھی۔ مجھے نیند آ گئی تھی۔ اس دوران عمر جو اونگھ رہا تھا کھڑا ہو گیا اور میرے لیے تکیہ اور کمبل لے آیا تھا۔ اس نے بڑی محبت سے کمبل مجھے اوڑھا دیا تو میں اگلی صبح تک گہری نیند کے مزے لیتا رہا۔''

کتاب کے اس حصے میں جو اقتباسات رٹر کی کتاب سے منتخب کر کے شامل کیے گئے ہیں وہ مکے کے سفر کی طویل روداد سے لیے گئے ہیں۔ ابن سعود کے عہد حکومت میں یہ پہلا مستند مصنف تھا جس نے حج کا آنکھوں دیکھا حال قلمبند کیا اور چیلنج کا مقابلہ بھی کیا۔ وہ مکہ مکرمہ میں آٹھ ماہ تک مقیم رہا، برکات کے بعد شاید ہی کوئی اور مصنف اتنے لمبے عرصے تک اس شہر میں رہائش پذیر رہا ہوگا۔ اسی لیے اس مقدس شہر کی جو تصویر اس نے الفاظ میں کھینچی ہے وہ نہایت جامع اور مکمل ہے۔ وہ شہر میں پہنچا ہی تھا کہ اس کے گائیڈ اسے نماز جمعہ ادا کرانے مسجد لے گئے تھے۔ وہ سقوں کے پانی بیچنے کی تجارت کے بارے میں لکھتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ اس نے اسی روز ابن سعود کو طواف کرتے دیکھا تھا۔ بعد ازاں منیٰ میں وہ ابن سعود کے خیمے میں اس سے ملاقات کے لیے بھی گیا۔ اس ملاقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے علی بے عباسی کی طرح اس حکمران کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ ایک مرکزی حیثیت کے اہم اقتباس میں بتایا گیا ہے کہ رٹر کو ایک گلی میں کسی پرانے شناسا نے روک لیا تھا۔ اس ملاقات سے اسے یہ فائدہ ہوا کہ اس کی ملاقات پہلے تو عبدالعزیز سے ہوئی پھر کئی دوسری اہم

شخصیات سے۔ یہ ملاقاتیں شہر کے انتظامی امور پر روشنی ڈالتی ہیں۔ رٹر نے ملکی ثقافت کی بھرپور عکاسی پر مشتمل تحریر چھوڑی ہے، ان میں سے ایک اہم اقتباس کا عنوان ہے: ''ایک مکی کی روزمرہ زندگی''۔

رٹر کے سفرنامے میں احرام میں ملبوس وہابی اونٹوں پر سوار، گھنگھریالے بالوں اور چمکتی رائفلوں سمیت ہوا کے جھونکوں کی مانند گزر جاتے ہیں۔ شریف خاندان کے بدعنوان حکمرانوں کی صدیوں پر پھیلی حکومت کے بعد زوال پذیر ترکوں اور مصری پاشاؤں اور بت شکن برادران نے حجاز بھر کو لرزاں کر دیا تھا۔ عرب انہیں مدعیان کہتے ہیں۔ رٹر ان کے بارے میں لکھتا ہے کہ ان کی تلواریں دودھاری تھیں۔ ایک طرف تو انہوں نے تمباکو نوشوں اور شیطانی عادات کے مالک لوگوں کا مواخذہ کیا اور بزرگوں کے مزارات ہر گاؤں میں جا جا کر مسمار کرائے دوسری طرف بدعنوانی، رشوت سے نمٹنے کے لیے راست اقدامات کیے۔ حج سے متعلق توہم پرستی اور غلط الزامات کو دور کیا۔ غریب حجاج کی اکثریت نے سعود کی طرف سے مقرر کردہ قیمتوں سے فائدہ اٹھایا، اس کا اطلاق چاہِ زم زم، بازاروں اور قافلوں پر بھی ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ ''اخوان'' کی بڑی دہشت تھی۔

ایلڈن رٹر کے سفرنامے میں اس قدر مستند معلومات موجود ہیں کہ اسے پڑھنے کے بعد ہر قاری کا جی چاہتا ہے کہ اسے از سر نو طبع کرائے۔ اسے عربوں کے طور طریقوں کی پوری پوری معلومات حاصل ہیں اور ذاتی تجربے کو بھی اس نے بڑی خوبصورتی سے اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ تاریخی تناظر میں بات کی جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کی کتاب ایک صدی پر پھیلی طویل رپورٹ کی تیسری اور آخری کتاب ہے جس میں حجاز کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کے لیے سعودی پیشکش سامنے آتی ہے۔ اس کہانی کا آغاز علی بے العباسی کے قلم سے 1807ء میں وہابیوں کے پہلی بار منظر عام پر لانے سے ہوتا ہے پھر 1814ء میں برکات کے فراہم کردہ ریکارڈ سے اس کا تسلسل جا ملتا ہے جس میں محمد علی کا ذکر شامل ہے اور اس کی تکمیل 1924ء میں رٹر کے قلم سے ہوتی ہے جو ان وہابیوں کی کامیاب واپسی کا ذکر کرتا ہے۔ کسی قدر ندامت و شرمندگی کا مقام ہے کہ مصنف کے بارے میں جو مختصر سی معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس کے بارے میں بہت کم منظر عام پر آیا ہے۔

☆☆☆

عرب کے مُقدس شہر......از ایلڈن رٹر [اقتباسات]

تاریخی نوٹ: غالباً مکہ و مدینہ نے خوشحالی کا ایسا دور اس سے قبل کبھی نہ دیکھا ہو گا جیسا ترکی سلطنت کے آخری برسوں میں عہد سلطان عبدالحمید میں دیکھا گیا تھا۔ وہ تشہیر کی قوت کا بہت بڑا شارح اور ترجمان تھا۔ وہ اس بات کا بڑا خیال رکھتا تھا کہ اس کی رعایا اس کی طرف سے کی جانے والی تشہیر میں اپنے حصے کی ادائیگی کرے۔ حجاز ریلوے جو دمشق سے مدینے تک تھی، اس کی تعمیر میں اسلامی دنیا کے ہر ملک نے مالی تعاون کیا تھا۔ قسطنطنیہ کے پرنٹنگ پریس قرآن پاک کی طباعت میں دن رات مصروف تھے۔ یہ دعاؤں کی کتابیں بھی کئی زبانوں میں شائع کر رہے تھے۔ آج تک جاوا تا مراکش کے مسلمانوں کو استنبولی قرآن رکھنے پر فخر ہے۔ مقاماتِ مُقدسہ کی تصاویر ایسے زاویے سے کھینچی گئی تھیں کہ دیکھنے والوں کی توجہ کھینچ لیں۔ یہ تصویریں پوری دنیا میں الجیریا تا چین، سربیا تا سماٹرا پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سے مسلمانوں میں ایک خاص جوش و جذبہ پایا جاتا تھا۔ سالانہ حج کے موقعہ پر یہ تصاویر حجاج کی تعداد میں اضافے کا باعث بنتی تھیں۔ اس سے مقدس شہروں کی مستقل آبادی بھی بڑھ رہی تھی۔ مکہ اور خاص طور پر مدینہ میں آج ایسے گھروں کی گلیاں موجود ہیں جو جے ایل برکات کے سفرنامے کے مطابق گذشتہ صدی کے اوائل میں وجود نہ رکھتی تھیں۔ سلطنتِ ترکی کے خاتمے کے ساتھ ہی مقدس شہروں کی آبادی پھر سے کم ہو گئی ہے اور بہت سے گھروں کے کھنڈرات موجود رہ گئے ہیں۔

اسلامی دنیا کو شریف حسین پر بالکل اعتماد نہیں تھا۔ وہ اپنی سفید ڈاڑھی اور پارسائی کے باوجود اس طاقت کی فضا پیدا نہ کر سکا جو سلطان سے مترشح تھی۔ حُسین کفار کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ وہ نہ تو ان کا مخالف تھا نہ ہی سفارتی حیثیت سے ان کے برابر۔

مکہ مکرمہ کی آبادی کئی بار کم ہو چکی ہے اور جنگوں کی وجہ سے بعض اوقات تو کئی کئی برسوں تک حج مکمل طور پر رک گیا تھا۔ حرم جس کے معنی ہیں ''جائے حرمت'' یا جائے پناہ، اس نے ایک سے زیادہ بار خون

جھگڑوں کا منظر دیکھا ہے۔ یہ 1916ء کی بات ہے جب عرب اتحادیوں سے مل گئے تھے۔شریف کے کچھ دستوں نے رائفلوں سے ترکوں کے ایک گروہ پر حملہ کر دیا تھا جس نے مسجد حرام میں پناہ لے رکھی تھی۔

میرا مکی میزبان اور گائیڈ: میں جب کبھی مکہ مکرمہ اور گردونواح کو دیکھنے نکلتا تو میرے ساتھ عبدالشکور ضرور ہوتا تھا۔ وہ اپنے آبائی شہر سے زیادہ واقف نہ تھا۔ وہ اس شہر سے اس لیے ناواقف رہ گیا تھا کیونکہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ میں جب بھی اس سے مکہ کے بارے میں کوئی سوال پوچھتا تو وہ اس کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ وہ اکیاون باون برس کا ہوگا اور اس کی عمر کے وزن نے ابھی سے اس کے کندھے معمولی سے جھکا دیئے تھے۔ اس کا باپ ہندوستان سے تھا اور مکہ آ کر آباد ہوگیا تھا۔ اس کی بیوی عرب تھی اور جبل ہند کی ڈھلوان پر عبدالشکور کا ایک چھوٹا سا اپنا گھر تھا۔

میرا نیا دوست مکہ سے کبھی باہر نہ گیا تھا۔ البتہ اس نے طائف دیکھا ہوا تھا۔ وہ جدہ کبھی نہ گیا تھا نہ اس نے مدینہ منورہ دیکھا تھا۔ مکہ مکرمہ کے اکثر لوگوں کا یہی معاملہ ہے۔ ان میں سے سینکڑوں ایسے ہیں جو پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس شہر سے کبھی باہر نہیں گئے۔ تاہم حج کے موقعہ پر یہ لوگ نصف دن کا سفر عرفات تک ضرور کر لیتے ہیں۔

عبدالشکور نے چھوٹی سی ڈبیہ میں سے چٹکی بھر تمباکو لیا اور اسے لپیٹتے ہوئے سگریٹ بنا کر مجھے پیش کیا۔

''اللہ آپ پر رحم فرمائے'' میں نے اس سے کہا ''مگر میں تو وہابی ہوں''۔

اس نے کہا: ''خوب'' پھر وہ مسکرایا اور بولا ''پھر تو آپ گھر کے اندر مدعیان کی مانند پی سکتے ہیں، البتہ باہر گلی میں پینے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ سگریٹ پینا ممنوع نہیں تھا۔ غیر قانونی اور ممنوع یہ اس وقت ہو جاتا ہے جب سگریٹ پینے والے کو کوئی دیکھ لے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ غیر قانونی اور ممنوع کا یہ مطلب ہے.....''

میں نے سگریٹ لے کر سلگا لیا تھا۔ میں نے اس سے کہا: ''میں ایسا تمہاری اور اپنی دوستی کی خاطر کر رہا ہوں''۔ اس نے جواب دیا: ''میں یہ جانتا ہوں اور ہم آپ کے نوکر ہیں''۔ میں نے اس سے پوچھا: ''جب مدعیان مکے آئے تھے اس وقت کیا ہوا تھا؟''

''چار آدمی احرام باندھے، اونٹوں پر سوار آئے اور گلیوں میں سے گزرے، جو بالکل سنسان تھیں۔ انہوں نے تحفظ کا وعدہ کیا اور کہا کہ مکہ کے لوگ خدا کے ہمسائے ہیں، یہ خدا کی حفاظت اور پناہ میں ہیں نیز ابن

سعود کی پناہ میں۔ہم سب نے اپنے دروازے مقفل کر لیے تھے اور دروازوں میں چٹخنی لگا دی تھی۔پھر دوسرے روز دو ہزار مدعیان آئے،وہ احرام میں تھے اور ان کے پاس رائفلیں اور تلواریں تھیں۔ان سب نے طواف کعبہ کیا اور واپس اپنے کیمپ میں چلے گئے تھے۔چند روز بعد یہ سیّدنا (بادشاہ حسین) کے محل میں نقب لگا کر گھس گئے تھے اور اس کی نشست گاہ کے ساتھ ایک گدھا باندھ آئے تھے۔اس گدھے کے سر پر وہ سیّدنا کی پگڑی رکھ آئے تھے۔پھر اس گدھے کو وہ لے کر شہر کی گلیوں میں گھومتے پھرے اور وہ پگڑی اسی طرح گدھے نے پہن رکھی تھی۔اب انہوں نے سیّدنا کے استنبولی کوٹ کو پاؤں سے ٹھوکر ماری تھی،جس پر موتی ٹنکے ہوئے تھے۔وہ کوٹ کے علاوہ شاہی چھتری کو بھی ٹھوکریں مارتے بازار میں لے آئے تھے،انہوں نے یہ ساری چیزیں چھ پنس میں فروخت کر دی تھیں''۔

میں نے اس سے پوچھا: ''کیا تم نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟''

عبدالشکور نے جواب دیا: ''نہیں......میں نے تو یہ سب کچھ سنا تھا''۔

اس دوران ایک دبلا پتلا سادہ سا نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔اس کی جلد کانسی رنگ کی اور آنکھیں بے حد خوبصورت تھیں۔وہ سترہ برس کا تھا۔اس نے سفید قبا پر پیازی رنگ کی ریشمی جیکٹ پہن رکھی تھی اور سر پر پیلی پگڑی تھی۔

''السلام علیکم'' کہنے کے بعد وہ بوڑھے آدمی کے پاس گیا اور اس کے ہاتھ کو پچھلی طرف بوسہ دیا اور اپنی پیشانی تھوڑی دیر تک اس کے ساتھ ٹیک دی تھی۔

بوڑھے شخص نے کہا: ''یہ میرا بیٹا عبدالفاتح ہے'' پھر اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے اپنی بات یوں جاری رکھی: ''یہ حاجی احمد افندی عبدالرحمٰن کے مہمان ہیں تم ان کی خوب خدمت کرنا''۔

''خوش آمدید''۔عبدالفاتح نے میرا ہاتھ چومتے ہوئے کہا،اس کی آنکھوں میں خلوص و محبت اور میزبانی کے جذبے کی چمک تھی۔

میں اس نوجوان کو دیکھ کر مسکرایا (بعدازاں عبدالرحمٰن کے گھر میں وہ مستقل طور پر میری خدمت میں موجود رہتا تھا) اور اس سے پوچھا کہ جب وہابی مکے میں داخل ہوئے تھے اس وقت وہ کہاں تھا۔

''میں کہاں تھا؟ میں اسی گھر میں تھا۔واللہ! میں نے زنانہ لباس پہن رکھا تھا اور چہرے پر نقاب تھا۔میں مکمل عورت لگتا تھا۔اگر مدعیان دروازہ توڑ کر اندر آ جاتے تو میں ایک عورت کے لباس میں وہاں

موجود تھا۔''

عبدالرحمٰن نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا: ''آفرین، عبدالفاتح! یہ تم کیا بتا رہے ہو؟'' باوقار مطوف گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تمباکو کی ڈبیہ نکالی اور سگریٹ بنانا شروع کر دیا تھا۔

آج جمعہ کا دن تھا، میں نے اور میرے تمام ساتھیوں نے صاف ستھرے سفید کپڑے پہن رکھے تھے، اس دوران اذان کی آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ عبدالرحمٰن کے گھر کے عقب میں باب العمرہ کا مینار چند فٹ کے فاصلے پر تھا جس کی سب سے اونچی گیلری ہمارے گھر کی چھت کا حصہ نظر آتی تھی۔ بعد میں بھی بینائی سے محروم ایک مؤذن عبدالغفار کی اذان فضا میں گونجتی سنی گئی تھی۔ فجر کی نماز کے لیے یہ اذان مجھے اکثر گہری نیند سے بیدار کر دیتی تھی، میں جس وقت کھلے آسمان تلے سویا ہوا ہوتا تھا۔

ہم سب نے وضو کیا اور حرم کی طرف اتر گئے۔ ہم نے ایک جگہ کا انتخاب کر کے دو رکعت سنتیں ادا کی تھیں۔ پھر قرآن کی کچھ آیات دہرانے لگے تھے یہاں تک کہ دو رکعت فرض ادا کرنے کے لیے باجماعت نماز میں امام کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔

نماز ادا کرنے کے بعد بہت سے لوگ طواف کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔ ان میں مجھے ایک کیم شیم چھ فٹ سے زیادہ قد کے پرکشش شخص نظر آئے۔ دھوپ سے بچنے کے لیے وہ سیاہ چھتری اُٹھائے ہوئے تھے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے آ رہے تھے ان کے پیچھے پیچھے بدوؤں کا ہجوم تھا۔ یہ عبدالعزیز ابن سعود تھے، صحرا کے سردار اور حجاز پر چڑھائی کرنے والے۔

گھر واپس آنے سے پہلے عبدالرحمٰن نے مجھے ایک صاحب سے متعارف کرایا جن کا اسم گرامی تھا سید حسن، اور جو مجھے زم زم، میری طلب پر پلایا کریں گے، بالخصوص نماز کے اوقات میں۔

یہ بوڑھا شخص ایک پتھر کی چھوٹی سی دیوار میں بنی ہوئی غار کا برسوں سے مالک تھا۔ یہ حرم کی دیوار سے ملی ہوئی تھی۔ ایک لکڑی کا چھوٹا مگر بھاری دروازہ تھا جو باب الداودیہ سے چند گز کے فاصلے پر تھا، ہم عموماً اسی دروازے سے حرم میں داخل ہوا کرتے تھے۔ اس سے اس غار تک بھی راستہ جاتا تھا۔ دن کے کسی وقت بھی اس غار کے سامنے بوڑھے حسن سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ اس دوران وہ یا تو دھیمی آواز میں قرآن کی تلاوت کر رہے ہوتے تھے یا سوتے میں خراٹے لے رہے ہوتے تھے۔

یہ شخص چھوٹے قد کا چھدری خاکستری ڈاڑھی والا تھا۔ اس کی پیلی پگڑی ہمیشہ بے داغ ہوتی تھی۔ اس کا اُجلا پن اور پیچ وخم ہمیشہ دیکھنے والوں کی توجہ کھینچ لیتے تھے۔ عمر ساٹھ برس سے زیادہ تھی، پورے چہرے پر جھریاں تھیں اور آنکھوں کی چمک قدرے مدھم پڑ گئی تھی۔ اس کا ملنے جلنے کا انداز بڑا دل موہ لینے والا تھا، وہ نہ صرف حجاج کو زم زم کے ایک دو گھونٹ پلانے میں مسرت محسوس کرتا تھا بلکہ مکہ کے بارے میں انہیں تاریخی معلومات فراہم کرنے کے لیے بھی ہمہ وقت تیار دکھائی دیتا تھا۔ اس کی غار دس مربع فٹ تھی اور مکہ کے ''منصفِ اعلیٰ'' کے گھر کے نیچے تھی جو حرم کے متصل واقع تھا۔ اس منصف کے گھر میں کھڑکیاں بھی تھیں جو مسجد حرام میں کھلتی تھیں۔ اس بوڑھے شخص کی غار کی چھت خمدار اور اونچائی زمین سے سات فٹ بلند تھی۔ اس چھت پر پتھر کے دو ٹینک بنے ہوئے تھے جن کی لمبائی چار فٹ، چوڑائی دو فٹ تھی اور گہرائی تین فٹ تھی۔ ان ٹینکوں میں آبِ زم زم بھرا رہتا تھا۔ یہ دیوار کے ساتھ غار کے آخری کونے میں بنے ہوئے تھے۔ گیلے فرش پر بہت سے خالی ٹین بکھرے پڑے تھے جن سے پانی کھینچ کر نکالا جاتا تھا۔ ایک کونے میں سفید دھات کے برتن رکھے ہوئے تھے جن میں حسن پیاسے حجاج کو پانی پلایا کرتا تھا۔ اس غار میں ہوا کے لیے دروازہ اور دائیں ہاتھ والی دیوار میں دو چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے، ان کے ذریعے باب الداؤدیہ کے باہر کے راستے سے کچھ ہوا بھی اندر آجاتی تھی۔ اس غار میں ایک خاص قسم کی پھپھوندی سے آنے والی بُو پھیل رہی تھی جو ان غاروں سے آتی ہے جو سیلی ہوں اور جو نیم تاریک رہتی ہوں۔

اس سیلن والی جگہ میں سیّد حسن، کسی جادوگر کی طرح قیمتی پانی اپنے معاون جعفر کے ذریعے حجاج کو پلایا کرتا تھا۔ جعفر ادھیڑ عمر کا خوبصورت انسان تھا جو پانی کی بوتل لیے دو دھات کے پیالوں میں، جو اس کے دائیں ہاتھ میں رہتے تھے، پیاسوں کی پیاس بجھانے میں مصروف رہتا تھا۔

اس غار میں صرف حسن کے ذاتی دوستوں کو جانے کی اجازت تھی جن میں، میں بھی بالآ خر شامل تھا۔ وہ حاجی جو حسن کے لیے محبت وشفقت رکھتا ہو اور جس کی مالی حیثیت بھی بہت اچھی ہو غار کے اندر آبِ زم زم سے غسل بھی کر سکتا تھا۔

حجاج کو پانی پلانے والا یہ منصب قبل از اسلام موجود تھا اور یہ موروثی ہے۔ کسی حاجی کے لیے از خود چاہِ زم زم پر جانے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ وہاں ہر وقت ایک ایسا شخص موجود رہتا ہے جو کنویں سے پانی نکال کر اسے پیش کر دیتا ہے۔ کنویں سے نکلنے والا تازہ پانی گرم ہوتا ہے مگر پڑا رہے تو ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ غار

کے سامنے یہ پانی برتنوں کے اندر پڑا رہتا ہے تاکہ ٹھنڈا ہو جائے۔ ان میں سے جو جس وقت چاہے اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ تاہم جو ادا کر سکنے کی مالی سکت رکھتے ہیں ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور پیش کریں گے۔ امیر حاجیوں کو آب زم زم پلانے والے بطور خاص نظر میں رکھتے ہیں۔ انہیں عموماً حق خدمت کے طور پر کچھ رقم حج کے بعد ادا کی جاتی ہے یعنی اس وقت جب حجاج مکے سے روانہ ہونے والے ہوں۔ مطوّف اکثر جدہ روڈ پر چلے جاتے ہیں، وہ یا تو پیدل جاتے ہیں یا گدھوں پر سوار ہو کر تاکہ حجاج کے قافلوں سے ان کی ملاقات ہو جائے۔ عموماً وہ اس موقعہ پر آب زم زم ساتھ لے کر جاتے ہیں اور قافلے میں شامل اپنے حجاج کو پیش کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو یہ پانی اپنے ایجنٹوں کو اسی مقصد کے لیے جدہ میں بھی بھیج دیتے ہیں۔

عبدالرحمٰن میرا مطوف تھا جس کا تعلق فلسطین سے تھا۔ یہ حج کے موسم میں ایک ہزار سے زیادہ حجاج کے لیے رہائش کا انتظام کرتا تھا۔ وہابیوں کے حملے کی وجہ سے امسال میرے سوا اس کے پاس کوئی اور حاجی نہ تھا۔ یہ مطوف شہر کے مختلف حصوں میں حجاج کے لیے گھروں کا انتظام کرتے ہیں، جہاں وہ انہیں کرائے پر ٹھہراتے ہیں۔ ملایا کے بہت سے حاجیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں حرم پاک کے قریب مکان لے کر دیا جائے۔ اس سہولت کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ کرایہ ادا کرنے کے لیے رضامند ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مطوف کے پاس ملایا کے حجاج ہوں، اسے ان مکانوں کے مالک اپنے گھر حاجیوں کی رہائش کے لیے کرائے پر دینے کی کوشش کرتے ہیں، جن کے گھر حرم کے قریب ہوں۔ ان کے مطوف کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ حرم کے نزدیک بھی اپنے حاجیوں کو کم کرائے پر گھر لے کر دے۔ عبدالرحمٰن ہر سال اپنا گھر (سوائے سب سے اوپر والی منزل کے، چھت سمیت جہاں یہ اپنے خاندان کے ساتھ خود رہائش پذیر ہوتا ہے) ملایا کے ایک مطوف کو تین ماہ کے لیے دے دیتا ہے۔ اسے کرائے کے طور پر 40 پاؤنڈ وصول ہو جاتے ہیں۔ اسے اسی گھر کا سالانہ کرایہ (پورے گھر کا) تیس پاؤنڈ ملتا تھا۔

ایک دن عبدالرحمٰن نے، مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے رازدارانہ طور پر اپنا رجسٹر اموات دکھایا۔ حکومت کی طرف سے حکماً ہر مطوف کے پاس یہ رجسٹر ہونا لازمی ہے۔ اس رجسٹر میں ان مرنے والوں کے نام و پتے درج ہوتے ہیں جو کسی مطوف کی نگہداشت میں تھے۔ اس میں متوفی کے سامان کی فہرست بھی شامل ہوتی ہے۔ یہ سامان حکومت کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور متوفی کے ورثاء کی طرف سے مانگنے پر انہیں دے دیا جاتا

ہے۔ گذشتہ سال عبدالرحمٰن کی نگرانی میں ایک ہزار حاجی تھے جن میں سے 27 وفات پا گئے تھے، اس نے یہ تعداد مسکراتے ہوئے مجھے بتائی تھی۔ میں نے سامان کی فہرست دیکھی تو کسی متوفی نے دو پاؤنڈ سے زیادہ رقم نہیں چھوڑی تھی۔ اکثر نے تو مرتے وقت کچھ بھی نہ چھوڑا تھا۔ اس سے میرے اندر ایک تجسس پیدا ہوا۔ اگر وہ یہ فیصلہ کر کے نہیں آئے تھے کہ مکہ میں مرنا ہے پھر تو یہ صورت حال نہیں ہونی چاہیے تھی۔ کم از کم فلسطین واپسی تک کے اخراجات تو ان کے پاس مرتے وقت ہونے چاہیے تھے۔ بہت سے غریب تو مکہ تک پہنچتے ہوئے راستے میں مانگ کر ہی گزارہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ مطوف کے ساتھ نہیں رہتے۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ بوڑھے جب مرنے کے قریب پہنچ جاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب ان کی واپسی کا وقت قریب آ گیا ہے تو یہ مکہ مکرمہ کا رُخ کرتے ہیں تاکہ مریں تو یہاں مریں اور حرم مقدس کی حدود کے اندر دفن ہوسکیں۔

ابنِ سعود منیٰ میں: میں نے عبدالرحمٰن سے کہا کہ آؤ ہم بھی بدوؤں، اہل مکہ اور حجاج کے اس ہجوم میں شامل ہو جائیں جو وادی کے سب حصوں سے ابن سعود کے خیمے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ اسے عرفات کے دن کے اختتام پر عیدالاضحیٰ کی آمد پر مبارکباد پیش کرنے جا رہے تھے۔ اس نے جواب دیا: ''ہمیں مدعیان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے اور نہ ہی ہم ان کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔'' آخر میں اس نے مجھ سے کہا کہ وہ میرے ساتھ امیر کے خیمے تک جائے گا۔ مگر مجھے اندر داخل کر کے خود باہر ہی رہے گا۔ ہم اس چبوترے کی جانب بڑھے جس پر شریف مکہ کے خیمے پچھلے سال اس حج کے موسم میں نصب کیے گئے تھے۔ ان خیموں میں نجد کا پرچم لہرا رہا تھا۔ استقبالیہ پر دو حبشی غلام کھڑے تھے۔ ان کا لباس بدوؤں کا سا تھا اور ہاتھوں میں عربوں کی تلواریں تھیں جن کے چاندی کے مزین دستے تھے۔ ملاقاتی گروہوں میں اندر جا رہے تھے جہاں وہ سلطان سے مصافحہ کرتے اسے عید مبارک کہتے اور دوسری طرف سے باہر نکل جاتے تھے۔ ان میں سے کچھ اسے پیشانی پر ہاتھ کی الٹی جانب یا کندھے پر بوسہ بھی دے رہے تھے۔ عبدالرحمٰن نے مجھے خیمے کے دروازہ پر لا کر چھوڑ دیا تھا۔ میں فوراً ملاقاتیوں کے ایک گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔ میں نے کوشش یہ کی کہ میں بخارہ سے آنے والوں کا ساتھی نظر آؤں۔ خیمے میں داخل ہونے کے بعد کچھ دیر تک تو مجھے سوائے ملاقاتیوں کے ہجوم کے کچھ نظر نہ آیا۔ جب یہ بکھر گئے یا دوسری طرف سے باہر نکل گئے تو مجھے اپنے سامنے بنچوں پر بیٹھے کچھ بدو اور اہل مکہ نظر آئے، انہوں نے ایک نیم دائرہ سا بنا رکھا تھا۔ درمیان میں اپنے چار فوجی امیروں میں گھرا ہوا عبدالعزیز ابن سعود بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کوئی فاخرانہ لباس نہیں پہنا ہوا تھا نہ ہی اس کے پاس کوئی اسلحہ تھا۔

ایک سفید لینن کی قبا کے اوپر اس نے ایک چغہ پہن رکھا تھا جو پیلے رنگ کے بالوں والے کپڑے کا بنا ہوا تھا۔ سر پر سرخ اور سفید سوتی قافیہ تھا جس کے گرد ایک سیاہ رسی تھی جس پر چاندی کے رنگ کی تار تھی۔ وہ برہنہ پا تھا کیونکہ اس نے اپنے سینڈل قالین کے ایک سرے پر اتار رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور اس نے دھوپ سے بچنے کے لیے سیاہ چشمہ پہن رکھا تھا۔ وہ ملاقاتیوں سے مصافحہ کرنے کے لیے اٹھا اور ہماری طرف سے پیش کی گئی مبارکباد کا مسکراتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔ یہ ایک ایسا شیر تھا جس نے کئی صحرائی جنگی لڑی تھیں اور نصف عرب سے زیادہ کا مطلق العنان بادشاہ تھا۔ وہ ہر ملاقاتی سے خواہ وہ شہزادہ تھا یا درویش یکساں شفقت سے مل رہا تھا۔ ملاقاتیوں کی تعداد چونکہ زیادہ تھی اس لیے اسے ان کے نام نہیں بتائے جا سکتے تھے۔

ابنِ سعود اس وقت (جولائی 1925ء) 45 برس کا تھا۔ قد اس کا چھ فٹ سے زیادہ ہے لیکن جسم بڑا متناسب اور پروقار ہے۔ چہرہ عربوں جیسا بڑا اور لمبا ہے، ہونٹ موٹے ہیں۔ چہرہ پر مونچھیں اور ڈاڑھی ہے، ڈاڑھی زیادہ بڑی نہیں۔ تاہم وہابیوں کے اپنے سٹائل کے مطابق ایک ہاتھ لمبی ضرور ہے۔ وہ اچھے لہجے میں خوبصورت گفتگو کر رہا تھا۔ گفتگو کے دوران کبھی کبھی ہاتھ کے اشارے بھی شامل ہو جاتے تھے۔ دوسرے طاقتور افراد کی طرح کوئی چیز اس کے راستے میں حائل ہو جائے تو سختی کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ عبدالعزیز کوئی کٹر مسلمان نہیں ہے مگر ایک ایسا سیاسی انسان ضرور ہے جس کی نظر مستقبل میں دور تک ہو۔ وہ برسوں سے ان ذہنوں کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو پڑھے لکھے نہیں ہیں وہ بدوؤں کے قوانین کو نافذ کرنے پر بہت زور دیتا ہے۔ اگر مخالفت ہو جائے تو وہ ایک سخت دشمن تو ضرور ہے مگر فتح کے وقت عرب تاریخ کے کسی نہایت نرم اور انسان دوست کردار جیسا بن جاتا ہے۔

جہاں تک نظامِ حکومت کا تعلق ہے وہ عزیز و اقارب سے بھی مشورہ کر لیتا ہے اور مشاورت کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اس نے مکہ مکرمہ میں ایک مشاورتی کونسل تشکیل دے رکھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک میونسپل کونسل بھی ہے۔ ان دونوں کے نصف اراکین کا تقرر ابن سعود خود کرتا ہے بقیہ نصف کو بذریعہ ووٹ چنا جاتا ہے۔ جب انتخابات ہو جاتے ہیں (اور کوئی بھی منتخب نمائندہ اس وقت تک نشست نہیں سنبھالتا جب تک اس کی منظوری ابن سعود نہ دے چکا ہو) تو سلطان ایک چیئرمین مقرر کرتا ہے جو فیصلہ کن ووٹ ڈلوانے کا اہتمام کرتا ہے۔ اس طرح اس کے اپنے نامزد کردہ اراکین کی اکثریت ہو جاتی ہے۔ یہ ذکر کرنا بے جا ہوگا کہ ان

دونوں کونسلوں میں سے کوئی بھی قانون یا ذیلی قانون وضع نہیں کرسکتی نہ ہی چند پاؤنڈ سے زیادہ اس وقت تک خرچ کرسکتی ہے جب تک اس کی منظوری حکمران نہ دے دے۔ تاہم ان کونسلوں کی تشکیل اس طرح کی جاتی ہے جو کبھی بھی حکمران کے سامنے ایسے اقدامات نہیں لے کر جاتیں جن کو یہ مسترد کردے۔

ایسے مطلق العنان حکمران کو بدو رعایا امام (سردار) امیر (کمانڈر یا شہزادہ) اور الشیوخ (شیخ کی جمع) کے طور پر مانتی ہے۔ اخوان کے درمیان یا وہابیوں کی برادری میں اسے عموماً امام ہی پکارتے ہیں جس سے ان کی مراد ہوتی ہے ''ان تمام مسلمانوں کا سردار جو واقعی ہی مسلمان ہیں''۔ یہ لوگ اپنے آپ کو صحیح مسلمان تصور کرتے ہیں اور کسی کو خلیفہ نہیں مانتے سوائے سعود کے گھرانے کے کسی شخص کے۔ ترکی کے سلاطین کو یہ اہل تشیع کے سردار تصور کرتے تھے۔

ایک رسم: مکہ کی عورتوں میں ماضی قریب تک ایک عجیب رسم پائی جاتی تھی۔ جن دنوں حجاج منیٰ میں پڑاؤ ڈالتے تھے اُن دنوں وہ عورتیں جو گھروں میں اکیلی رہ جاتی تھیں وہ گھروں کے اندر مردانہ لباس میں رہتی تھیں، یہ سروں پر پگڑیاں باندھ کر ہاتھ میں چھڑی یا خنجر لے لیتی تھیں اور اندھیرا ہوتے ہی چار پانچ کی ٹولیوں میں گلیوں میں نکل آتی تھیں۔ اس طرح کے لباس میں، حجاب کے بغیر یہ اس شہر میں گشت کرتی تھیں جس کے مرد منیٰ چلے گئے تھے۔ یہ ایک ایسا گیت گاتی تھیں جو اس قدر فحش ہوتا تھا کہ اسے تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ اس گشت کے دوران اگر انہیں کوئی مرد مل جاتا تو یہ اسے گیت سناتی تھیں اور اسے چھڑیوں سے یا دونوں ہاتھوں سے خوب پیٹتی تھیں شریف حسین نے اس رسم کو اپنے دور میں منسوخ کر دیا تھا۔

منیٰ میں مسجد: سلطان کے خیمے کے نزدیک دن کی پانچ نمازوں کے وقت ایک چھوٹی سی توپ چلائی جاتی تھی۔ غروب آفتاب کے وقت، عبدالرحمٰن کی معیت میں، تینوں شیطانوں کو کنکریاں مارنے کے بعد میں مسجد چلا جاتا تھا۔ اس مسجد کا نقشہ عرفات کی مسجد نمیرا سے بہت ملتا جلتا ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ منیٰ کی مسجد کے دو مینار ہیں اور مسجد نمیرا کا کوئی مینار نہیں ہے۔ ایک مستطیل مشکل میں بنی ہوئی مسجد کے مرکز میں ایک چھوٹا سا گنبد ہے جسے ڈھک دیا گیا ہے، یہاں آنحضورؐ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا مینار کھڑا ہے۔ بڑا مینار دروازے کے اوپر ہے جو دروازہ کے شمالی دیوار میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا مینار کھڑا ہے۔ بڑا مینار دروازے کے اوپر ہے جو دروازہ کہ شمالی دیوار میں ہے۔ یہاں ہمیں حجاج کا ہجوم نظر

بتایا، ان میں سے کچھ بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ بظاہر یہ لوگ اس کے ایک بھیانک راز سے بے خبر تھے جو مجھے بعد میں عبدالرحمٰن نے بتایا تھا کہ یہاں زیر زمین بہت سی محرابیں تھیں۔ جن دنوں مکہ میں طاعون پھیل جاتا ہے ان دنوں انہیں کھول دیا جاتا ہے اور ہزاروں لوگوں کو ان میں اوپر تلے اس طرح دبا دیا جاتا ہے جس طرح کتابیں رکھی جاتی ہیں۔ اس نے خود بھی 1906ء کے طاعون میں مرنے والے انسانوں کو اجتماعی قبر میں ڈالا تھا۔

اس مسجد کو سال بھر بند رکھا جاتا ہے البتہ عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر اسے کھول دیا جاتا ہے۔

جمرات (شیطان کو کنکریاں مارنا): ہم مزید دو دن منیٰ میں مقیم رہے۔ ہم ہر روز تینوں ستونوں کو یا شیطان کو سات کنکریاں مارتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے گرد ایک دائرہ کی شکل میں چھوٹی سی دیوار بنی ہوئی ہے کنکریاں اس کے اندر گرتی ہیں۔ حج کی ادائیگی کے بعد ان کنکریوں کو اٹھا کر گدھوں پر لاد کر لے جاتے ہیں۔ یہاں ان کو حرم میں بچھا دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صحرا کے بدو بعض اوقات ان شیطانوں پر گولیاں بھی برساتے تھے اور ساتھ ساتھ انہیں لعنت ملامت بھی کرتے جاتے تھے۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر نہیں دیکھا تھا۔

یہ رسم حضرت ابراہیمؑ کی یاد منانے کے طور پر ادا کی جاتی ہے جنہیں شیطان نے اس مقام پر اس وقت ورغلانے کی کوشش کی تھی جب آپ عرفات سے واپس لوٹ رہے تھے۔

یہ داستانیں قدیم باطل پرست عربوں میں بھی مشہور تھیں جو وادیٔ منیٰ میں کئی بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ یہ بھی شیطانوں کو اسی طرح کنکریاں مارتے تھے جس طرح آج مسلمان مارتے ہیں۔ مسلم علماء اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ کنکریاں مارنا ایک علامت ہے جس کے ذریعے حجاج شیطان کے خلاف اور اس کے تمام کرتوتوں کے خلاف اپنی نفرت کو مضبوط بناتے ہیں۔

12۔ ذوالحجہ کو نصف دن گزر جانے کے فوراً بعد ہم نے اپنے اونٹوں پر سامان لاد دیا تھا۔ اونٹوں کا مالک رات کو ہی انہیں لے آیا تھا۔ یوں ہم ان کے ساتھ منیٰ سے چل پڑے تھے تاکہ آخری بار شیطانوں کو کنکریاں مار سکیں۔ یہ فریضہ ادا ہو چکا تو ہم اونٹوں پر رکھے شگدف میں بیٹھ گئے تھے۔ میرے تمام ساتھی سوائے عبدالرحمٰن کے پیدل صبح ہونے سے قبل مکہ پہنچ چکے تھے۔ وہابیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، سڑک پر دور تک ان کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ ان کے پرچم ہواؤں میں لہرا رہے تھے، ان میں سے کچھ سرخ اور کچھ سبز تھے۔ ان پر

بڑے بڑے حروف میں لا الہ الا اللہ لکھا ہوا تھا۔

سبھی کچھ مشرق کا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں کے بنے ہوئے مکانات، جن میں سے کچھ میں جھروکے بھی تھے، چھوٹی چھوٹی دُکانیں جن کی کھڑکیاں ہوا اور سورج کی روشنی کے رُخ پر تھیں۔ پہیوں والی کوئی گاڑی نہ تھی، نہ روغن شدہ کھڑکیاں تھیں نہ مشینیں۔ کچھ نہ تھا سوائے مشرق کے مردوں، اونٹوں اور گدھوں کے، چھوٹی چھوٹی دُکانیں قدیم تھیں اور مشینوں کے بغیر تیار کی گئیں چیزیں فروخت ہو رہی تھیں۔ میں فاصلے کے لحاظ سے تو جدید تہذیب کے مضافات سے پچاس میل دور تھا مگر اس فاصلاتی دوری سے ہٹ کر زمانی طور پر مجھے ایک ہزار برس نے الگ کر دیا تھا۔

چاند: ایک لمحے کے لیے بات چیت بند ہو گئی تھی۔ مغربی سایوں کے باہر سے وادی میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے ہیں جس سے اشجار کی ٹہنیاں جھومنے لگتی ہیں جن میں کھجور اور تمرس کے درخت زیادہ قابل ذکر ہیں۔ میری نظر حسن کے چہرے پر پڑتی ہے جو ٹکٹکی باندھے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ حسن ایک نرم مزاج، مخلص و مہربان نوجوان تھا۔ یوسف اور شفیق کے ہاتھوں میں حقہ تھا اور وہ منہ سے دھواں خارج کر رہے تھے۔ اس دوران عبدالرحمٰن نے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک سگریٹ بنایا...... صابری نے گنگنانا شروع کر دیا تھا۔ حسن اچانک بول اٹھا...... ''بھلا بتاؤ تو سہی کون سا چاند زیادہ روشن ہے تمہارا دمشق والا چاند یا یہ ہمارا چاند؟'' ...... ہر کسی کو انتظار تھا کہ دیکھیں میں کیا جواب دیتا ہوں۔ شفیق نے کچھ کہنا چاہا مگر خاموش رہا۔ میں نے جواب دیا: ''چاند تو ایک ہی ہے دونوں جگہ۔ یہ چاند جو ہمیں نظر آ رہا ہے شامیوں کو بھی نظر آتا ہے، مصریوں کو بھی، ہندوستانیوں کو بھی یہاں تک کہ پوری دنیا کو'' ......

حسن زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا مگر اس نے اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ اس کی دراصل اس جواب سے تشفی نہیں ہوئی تھی، اس لیے کہ میں نے جو کہا اس کے ساتھ کوئی ثبوت پیش نہیں کیا تھا۔

شفیق نے حقے کا کش لگاتے ہوئے کہا: ''پچھلے سال ہمارے ساتھ دو شامی حجاج تھے۔ اس دوران چاند گرہن نظر آیا تو ایک خاص نماز ادا کرنے کا اعلان ہوا۔ دونوں شامی نماز ادا کرنے کے لیے دوسرے لوگوں کے ساتھ حرم میں گئے۔ وہاں پہنچ کر ایک نے دوسرے سے کہا: ''بھائی کیا شام میں ہمارا چاند بھی گہنا گیا ہوگا''

دوسرے نے جواب دیا: ''نہیں، واللہ نہیں۔ یہ نماز تو مکہ کے چاند گرہن کے لیے پڑھی جا رہی ہے''۔ پہلے نے کہا: ''خوب، تو پھر میں تو صرف اس لیے نماز نہیں پڑھوں گا کہ مکے کا چاند گہنا گیا ہے۔ یہ تو اہل

مکہ کا معاملہ ہے اور میں تو شامی ہوں اور اگر شام میں ہمارا چاند نہیں گہنایا تو تیری ڈاڑھی کی قسم میں تو نماز نہیں پڑھنے لگا اور یہ کہہ کر وہ مسجد حرام سے باہر چلا گیا تھا۔"

ہمارے تمام ساتھی حسن کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے ہنس دیئے تھے۔ اس نے ابھی تک معاملہ سمجھا نہ تھا، نہ اس کی تہ تک پہنچا تھا۔ میرے خیال میں شفیق ایک چاند رکھنے والا انسان تھا باقی سب کے دو دو چاند تھے۔ مگر سب کے سب جلد ہی شفیق کی رائے سمجھ گئے تھے کہ وہ کیا کہہ رہا تھا اور حسن نہیں سمجھا تھا۔

مجھے حسن پسند تھا اور میں نے سوچا کہ میں اسے چاند کی اکائی کے بارے میں ہم خیال بنانے کی کوشش کروں گا۔ ایک کٹر مسلمان کو سائنس کے ذریعے ہم خیال بنانے کی کوشش جس میں مذہبی نقطہ نظر شامل نہ ہو عبث تھا۔

"میں نے اسے بتایا کہ قرآن میں ایک سورۃ "القمر" (چاند) کے عنوان سے ہے اگر ایک سے زیادہ چاند ہوتے تو اس میں ایک چاند کا نہیں بلکہ کئی چاندوں کا ذکر ہوتا۔"

حسن مسکرایا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اب یقین کامل ہو گیا ہے۔ اس نے کہا: "یہ سچ ہے، واللہ سچ ہے حاجی احمد تم سچ کہہ رہے ہو"!

پھر اس نے سورۃ القمر کی تلاوت کی اور قرآن کے یہ الفاظ دہرائے:

"قیامت قریب آ گئی اور پھر چاند پھٹ گیا" (القمر: 1-54)

ایک اتفاقی ملاقات: ایک روز میں عبدالشکور کے ساتھ ایک جیسی جگہ گیا جہاں آگ لگ گئی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی گلی تھی جہاں ہم کچھ دیر رہے۔ عبدالشکور الليل مارکیٹ جانا چاہتا تھا اس لیے میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا اور خود گھر کی طرف واپس چل پڑا۔

میں تنگ و تاریک گلی میں سے گزر رہا تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی: "صلاح الدین"! یہ میرے نام کا نصف حصہ تھا۔ ایک بوڑھا شیخ مجھے اس نام سے پکارا کرتا تھا۔ یہ دراصل میرا انعام تھا جو اس نے مجھے اصول قانون کی باریکیاں سمجھنے اور قرآن کی تشریح پر دسترس حاصل کرنے پر دیا تھا۔

میں رک گیا اور جس طرف سے آواز آئی تھی اس طرف گھوم کر دیکھا۔ یہ حسنی نام کا الیپو کا ایک باشندہ تھا جو مجھے مصر میں ایک انگریز کی حیثیت سے جانتا تھا۔ میں نے مصر سے اپنی روانگی سے کئی ہفتے قبل اسے نہیں دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ دمشق چلا گیا ہے جہاں مجھے معلوم تھا کہ اس نے کسی کام سے جانا ہے۔

اس کے ساتھ آج ایک سیاہ فام عرب تھا جو بدوی لباس پہنے ہوئے تھا۔

حسنی ایک دلچسپ کردار تھا۔ میں اس سے پچھلے برس قاہرہ میں ملا تھا۔ یہ ابھی بہت چھوٹا تھا جب اس کا باپ اسے الیپو سے ہندوستان لے آیا تھا۔ پھر یہ مختلف مقامات پر رکتے ہوئے چین پہنچ گئے تھے۔ ہانگ کانگ میں ایک ہندوستانی مسلمان کی دوخانی جہازوں کی کمپنی تھی حسن کا باپ اس کمپنی کے ایک مقامی ایجنٹ کے ساتھ منسلک ہوگیا تھا۔ ہانگ کانگ 15 برس کے قیام کے دوران حسنی نے وہاں کی دونوں مقامی بولیاں سیکھ لی تھیں۔ پھر دونوں باپ بیٹا اپنے وطن شام واپس آ گئے تھے۔ حسنی کو سیاحت کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اس نے شمالی افریقا اور ایشیائے کوچک کا ہر شہر دیکھا ہوا تھا اور وہ مکہ و مدینہ بھی جا چکا تھا۔ ہم دونوں اکثر ملا کرتے تھے، مجھے وہ متواضع لگا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس میں بادشاہ گری کی صلاحیت موجود ہے۔ اس کی ہندوستان اور کئی دوسرے اسلامی ممالک کی سوسائٹیوں کے ساتھ خط و کتابت تھی۔

یہ وہ شخص تھا جس نے آج مجھے مکہ میں یوں اچانک آواز دے کر حیران کر دیا تھا۔ میں نے بڑی گرمجوشی سے اس سے اس کا حال احوال پوچھا۔ میں اسے علاحدگی میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں نے عارضی طور پر اس کے وطن کی شہریت اختیار کر لی تھی۔ مگر اس نے تو اس کی مہلت ہی نہ دی اور اپنے بدو ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا:

"یہ ایک بہت بڑا انگریز مسلمان ہے۔"

بدو نے جب انگریز کا لفظ سنا تو وہ فوراً بے حد سنجیدہ اور محتاط ہو گیا تھا۔ اس نے بڑے ادب سے مجھ سے سوال کیا: "آپ واقعی انگریز ہیں؟" حسنی نے اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا پھر فوراً فیصلہ کن انداز میں کہا: "ہاں ہاں یہ انگریز ہے"۔

میں نے جواب دیا: "ہاں یہ درست ہے کہ میں انگریز ہوں"۔ اس نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا: "لیکن آپ ہیں تو مسلمان ناں"۔

حسنی نے پھر بلا تامل مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے کہا:

"تم کہتے ہو مسلمان...... یہ مسلمان بھی ہے اور ایک بہت پڑھا لکھا انسان بھی"۔

میں نے بدو کو یقین دلایا کہ میں واقعی مسلمان ہوں۔

اب بدو کی حیرت میں کمی آ گئی تھی...... اس نے کہا: "الحمد للہ" اور ہم تینوں چل پڑے۔ حسنی نے

مجھے تاکید کرتے ہوئے کہا: مگر یہ دوسروں کو مت بتانا، ہمیں تو معلوم ہو گیا مگر صلاح الدین دوسروں کو یہ خبر نہیں ہونی چاہیے۔ دوسرے بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ تم نے انہیں کہیں بتا تو نہیں دیا؟''

میں نے جواب دیا: ''نہیں، میں نے انہیں یہ تاثر دیا ہے کہ میں شامی ہوں''۔

حسنی نے خوش ہو کر کہا: ''واللہ یہ تم نے اچھا کیا! ہم اس بارے میں کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔''

تاہم مکہ میں اس حقیقت کا علم لوگوں کو ہو گیا تھا کہ ایک انگریز مکہ مکرمہ آیا ہوا ہے اور پھر یہ خبر ابن سعود تک بھی پہنچ گئی تھی۔ میں ایک روز پریس جا رہا تھا تا کہ وہابی اخبار خرید سکوں۔ اخبار کا نام تھا ''اُم القریٰ''...... مجھے وہاں ایک شامی مدیر مل گیا تھا۔ اس نے بے حد عجز و انکسار کے ساتھ کہا کہ کسی نے میرے بارے میں اسے بتایا ہے اور یہ کہ کیا میں سلطان سے ملنے کا خواہش مند تھا؟۔ میں نے فوراً اس سوال کے جواب میں اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ میرا بھی امتحان لینا چاہتے ہیں جس طرح محمد علی نے برکات کے معاملے میں لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب مجھ سے کبھی کوئی سوال نہ کرتا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میرے عمل نے ہر مشاہد کو مطمئن کر دیا تھا جو میری اصل شناخت سے واقف تھا۔

ہر شخص اپنے دل میں اپنی نیتوں اور ارادوں کے بارے میں جانتا ہے خواہ وہ نیک ہوں یا بد جہاں تک میرا معاملہ تھا میرا روپ بدلنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں سب سے الگ تھلگ نظر آؤں۔ جس ملک میں کٹر مذہبی طبقہ اور ڈاکو رہتے ہوں وہاں غیر نمایاں رہنا بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔ حج کے دوران بہت سے فارسی اور اہل تشیع اپنے آپ کو کُرد اور بخاری کہتے ہیں اس لیے کہ سنیوں اور شیعوں میں ایک دوسرے کے لیے ناپسندیدگی پائی جاتی ہے۔ یہ بالکل ویسی ہی ہے جس طرح کی کبھی کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ کے درمیان پائی جاتی تھی۔ حجاز میں شیعوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسے سُنی جو مالی طور پر کمزور ہیں انہیں معاشرے کے کمتر طبقے میں شمار کیا جاتا ہے۔ مطوف ایسے لوگوں کی طرف زیادہ توجہ ہی نہیں دیتے...... انہیں وہی حجاج زیادہ اچھے لگتے ہیں جن سے انہیں بھاری رقوم وصول کرنے کی توقع ہوتی ہے۔

اس شامی نے مجھے بتایا کہ اگلے روز بعد دوپہر ابن سعود حمیدیہ میں بیٹھے گا۔ اس نے مجھے دعوت دی کہ وہ مجھے اس سے ملوائے گا۔ میں پروگرام کے مطابق اس کے ساتھ وہاں گیا۔ غروب آفتاب میں ایک گھنٹہ باقی تھا میں اس کے ہمراہ سرکاری دفتر پہنچا۔ استقبالیہ پہلی منزل پر تھا۔ اس کی کھڑکیوں سے حرم پاک نظر آتا تھا جہاں باب امّ ہانی سامنے آ جاتا تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر جب اوپر والی منزل پر پہنچے تو میں نے دیکھا کہ ابن

سعود کے نصف درجن بدو گارڈ بنچوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ہم جب کمرے میں داخل ہوئے تو اس وقت سلطان ایک بڑے دیوان پر براجمان تھا اس کی پیٹھ کھڑکی کی جانب تھی۔اس نے اُٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔اسی لمحے شامی نے اسے بتایا کہ میں کون ہوں اور میرا نام لیا......صلاح الدین الانگلشی۔

عبدالعزیز نے دیوان پر مجھے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔اب سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تھے۔کمرے میں اس کے صرف چار ملازمین تھے۔یہ سقوط جدہ سے پہلے کی بات تھی۔اس واقعہ کے بعد تو اب یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ سلطان حمیدیہ میں تشریف رکھتے ہیں اور پھر بہت سے سردار ملکی معاشرے کے چیدہ اور سرکردہ افراد خوشامد اور قصیدہ گوئی کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔

ابن سعود نے میری خیر و عافیت پوچھنے کے بعد حضرت عیسیٰؑ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دین پر گفتگو کی۔دو تین منٹ گزر گئے تو میں نے محسوس کیا کہ اب موضوع تبدیل ہونا چاہیے۔میں نے اسے بتایا کہ میں اس کے کیریئر کے بارے میں کچھ شائع کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔اس بات سے وہ بے حد خوش ہوا۔اس نے مسکراتے ہوئے میرے خیال کو پسند کیا اور میرا شکریہ ادا کیا۔

میں نے اخبار کی آئندہ اشاعت کے لیے ایک خوبصورت مضمون لکھ کر رکھا ہوا تھا۔ابن سعود نے مسود پڑھا اور اس کی اشاعت کی منظوری دے دی تھی۔اس کے بعد وہ اٹھا الوداعی کلمات ادا کیے، سینڈل پہنے ربا ہر چلا گیا۔وہ ایک چھوٹی سی موٹر کار استعمال کرتا تھا جو حال ہی میں بحری راستے سے منگوائی گئی تھی۔وہ کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا، محافظ اعلیٰ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا باقی کے گارڈ پائیدانوں پر کھڑے تھے۔یوں یہ سب یہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔

میں نے بعد ازاں بھی کئی مرتبہ ابن سعود کے محل میں حاضری دی۔ایک ملاقات کے دوران اس نے مجھے بتایا کہ اسے تین چیزوں سے بڑا لگاؤ تھا......اوّل اللہ دوم میرے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور سوم عرب قوم۔وہ جدہ روڈ پر واقع باحیرہ سے واپسی پر جہاں اس نے اپنے مقبوضات اور بین الاردنی اور عراقی سرحدوں کے درمیان تنازعہ سے متعلق امور پر ایک برطانوی مشن سے ملنا تھا، اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس کانفرنس میں ایک بہترین فیصلے پر پہنچ گئے تھے۔وہ اس کانفرنس کے نتیجے پر بہت خوش تھا۔خاص طور پر اس حقیقت پر کہ کئی متنازع مقبوضات جو وادی سرہن، شمال میں الجاف، میں واقع تھے اس کی سلطنت میں شامل ہو گئے تھے۔

ایک موقعہ پر میں نے اسے یہ کہانی سنائی کہ اخوان سفید پگڑی اس لیے باندھتے ہیں تا کہ میدانِ جنگ میں موت واقع ہو جانے کی صورت میں اسے کفن کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ ابن سعود یہ سن کر بہت ہنسا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ سفید پگڑی اس لیے باندھی جاتی ہے کیونکہ یہ سر ڈھانپنے کا صحیح طریقہ ہے جسے وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو مذہب کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ دائرے میں اس کے سامنے مشرق سے آئے ہوئے کچھ بدمعاش بیٹھے ہوئے تھے، اس نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''ان لوگوں نے کچھ افراد کو قتل کر دیا ہے۔ مگر یہ مدعیان ہیں اور انہوں نے سفید پگڑیاں باندھی ہوئی ہیں جو انہیں دوسروں سے ممیز کرتی ہیں''۔ اس نے ان کے لیے جس انداز میں مہربانی کا اظہار کیا وہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ یہ بات آسانی سے محسوس کی جا سکتی تھی کہ وہ دوسروں کی نسبت سوادِ اعظم کو بہتر جانتا تھا۔ وہ اپنے طور پر اپنے کپتان کو بغور دیکھ رہے تھے، ان کی اس کے ہر اشارے پر نظر تھی اور وہ اپنی عادات کی سختی اور تلخی کو اپنے کپتان کی آشیرباد سے شیریں بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا تعلق گھت گھت قبیلے یا برادری سے تھا۔ یہ تمام نجد اخوان میں نہایت کٹر اور متشدد مشہور تھے۔ جب کبھی اخوان کی کوئی پارٹی کسی ملکی ہجوم سے الجھ پڑتی، اس وقت اس قبیلے کے لوگ زیادہ برافروختہ ہو جاتے تھے۔ لفظ گھت گھت کے معنی ہیں ''آواز والا اُبال'' (کسی پکانے والے برتن میں) یا ''گرجنا، مشتعل ہونا''۔ نجد کے گھت گھت قبیلے کے لوگوں کا مزاج قبیلے کے نام کی عکاسی کرتا ہے۔

جب یہ خبر پھیلی کہ برطانوی حکومت نے یا بین الاردنی حکومت نے کچھ مقامات پر قبضہ کر لیا ہے تو ابن سعود نے مجھے بلا بھیجا تھا تا کہ میں اس کی جرات مندانہ تقریر سن سکوں۔ وہ کہہ رہا تھا: ''یورپی اپنی بندوقوں سمیت آنا چاہتے ہیں تو آ جائیں وہ اپنا توپ خانہ اور ہوائی جہاز بھی لے آئیں۔ ہم اپنے صحراؤں کی طرف چلے جائیں گے اور جب وہ ہمارا تعاقب کرنے کی کوشش کریں گے تو ہم ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔'' میں نے اسے بتایا کہ میں نہیں سمجھ رہا کہ یورپی حکومتوں کو ان کے صحراؤں سے کچھ لینا ہے بلکہ وہ تو اس کی عزت کرتے ہیں اور اس بات کے مداح ہیں کہ وہ ان کے اور صوبوں کے حقوق کا خیال رکھتا ہے۔

اس نے دائرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا: ''الحمدللہ''۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کو میری بات سے اتفاق تھا۔

مکہ مکرمہ میں مختلف وقتوں میں بہت سے مشکوک شامی پر پیچ راستوں سے داخل ہو گئے تھے۔ اس وقت شام میں بغاوت ہو گئی تھی، اور فرانسیسی دمشق پر گولے برسا رہے تھے۔ ابن سعود کے ایک ملازم نے مجھے

بتایا کہ اس کے آقا کی بڑی منت سماجت کی گئی ہے کہ وہ فرانسیسی فوجوں کو شام سے نکالنے کے لیے ان کی مدد کو آئیں۔ اس کی رائے میں سلطان کو فرانسیسی فوجوں پر حملہ کر دینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی بشرطیکہ وہ برطانیہ عظمیٰ پر یہ اعتماد کر سکے کہ وہ غیر جانبدار رہے گا۔ تاہم اس وقت جدہ اور مدینہ کے محاصرے اس کی توجہ پوری طرح کھینچ رہے تھے۔

ابن سعود سے اپنی ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات کے دوران شیبا قبیلے کا ایک فرد اندر آیا تاکہ خانہ کعبہ کی چھت کی مرمت کے انتظامات کے بارے میں بات کر سکے۔ اس نے امام کے کندھوں کو بوسہ دیا اور بیٹھ گیا۔ مجلس کی بات چیت کے دوران اسے جب میری قومیت کا علم ہوا تو اس نے اجلاس کے اختتام پر مجھے بازو سے پکڑا اور مجھے اپنے گھر پر مدعو کر کے چلا گیا تھا۔ میں نے یہ دعوت قبول کرتے ہوئے دوسرے روز اس کے گھر پر حاضری دی۔

ایک روشن ضمیر سردار: ایک اور شخص جس سے میں مکہ مکرمہ میں ملا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور بڑی پرکشش شخصیت کا مالک انسان تھا...... اس کا نام تھا شریف پاشا عدنان جو شریف خاندان کا سردار تھا۔ وہ امیر مکہ کے عہدے کا امیدوار بھی تھا۔ مگر اس کی یہ خواہش اس لیے پوری نہ ہوئی کیونکہ ابن سعود نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ شریف خاندان کے کسی فرد کو بھی کوئی سرکاری عہدہ نہیں دیا جائے گا۔ شریف پاشا کا پسندیدہ موضوع حجاز کی مادی ترقی تھی۔ اس نے کوئی ایسی وجہ نہیں دیکھی تھی کہ ملک بھر میں ریل اور موٹر کاریں کیوں نہ چلیں۔ اس نے کہا: ''اگر ہمیں زراعت میں ترقی کرنی ہے تو عرب کا ملک بھی اللہ کے فضل سے مصر اور شام کی طرح بن سکتا ہے جس میں ایک شخص مکہ سے جدہ تک سفر کر سکے گا اور راستے میں اتنے درخت ہوں گے کہ وہ سورج کو بھی نہ دیکھ پائے گا''۔ زمین سے پٹرول نکلے گا، تانبا، پارہ، لوہا اور دیگر بہت سی معدنیات بھی نکلیں گی۔ بدو اپنی خانہ بدوشانہ زندگی چھوڑ دیں گے، وہ زراعت کریں گے اور ان کی مثبت مصروفیات بڑھ جائیں گی۔

ابن سعود کی تاجپوشی: جمعہ کے روز نماز جمعہ کے بعد میں ان پتھر کی بنی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھ کر فخریہ سکول میں داخل ہو رہا تھا، جو باب ابراہیم کے قریب ہے۔ میں دراصل وہاں ایک واقف کار سے ملنے گیا تھا جو وہاں بطور استاد کام کر رہا تھا۔ میں جس وقت اس کھڑکی کے قریب پہنچا وہ بیٹھے چائے پی رہے تھے، جہاں سے حرم پاک نظر آتا تھا تو ہم نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک ہجوم باب صفا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یقیناً وہاں کوئی ایسا

واقعہ پیش آیا تھا جس نے ان لوگوں کو اس طرف دوڑنے پر اکسایا تھا۔

ہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور سیڑھیاں اتر کر حرم میں پہنچ گئے۔ ہم جب باب صفا کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ ایک جگہ اہل مکہ اور بدو جمع ہیں۔ ان کے درمیان حرم پاک کے مبلغین میں سے ایک مبلّغ ایک لکڑی کے پلیٹ فارم پر کھڑا اس مجمع سے مخاطب تھا۔ ہم بھی اس مجمع میں سے اپنا راستہ بناتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے جہاں دروازے کے قریب ابن سعود بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مبلّغ سلطان کی خوشامد میں لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنی تقریر کا اختتام کیا تو بہت سے شریفِ خاندان کے افراد، شیبا قبیلے کے افراد اور دیگر مشہور ملکی شخصیتیں آگے بڑھ کر سلطان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے حجاز کا بادشاہ تسلیم کر رہے تھے۔ ابن سعود مسکرا مسکرا کر اس کا جواب دے رہا تھا۔ جب یہ تقریب ختم ہوئی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے مسلّح محافظوں کی نگرانی میں کعبہ کی جانب جا رہا تھا پھر وہ خانہ کعبہ کے گرد طواف میں مصروف ہو گیا تھا۔ طواف کے بعد اس نے مقام ابراہیم میں دو نفل ادا کیے اور مسجد حرام سے نکل کر حمیدیہ چلا گیا تھا جہاں وہ عام لوگوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

میں بجائے حمیدیہ جانے والے ہجوم کے ساتھ جانے کے اپنے ساتھیوں سمیت ایک محرابی راستے میں بیٹھ گیا تھا۔ سورج کی موسم گرما کی تمازت میں کمی ہو گئی تھی اور ہوا میں خنکی محسوس ہوتی تھی۔ اچانک قلعے میں ایک پرانی توپ کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد دوسری توپ جبلِ ہندی میں چلی تھی۔ فوجی دستے نئے بادشاہ کو سلامی دے رہے تھے۔ ایک سو ایک مرتبہ شہر کا امن برباد ہو گیا تھا۔

☆☆☆

15۔ وینفریڈ سٹیگر ــــــ آسٹریلیا

1927ء

وینفریڈ سٹیگر نے جس وقت حج سفر کی روداد لکھی اُس وقت یہ خاتون 80 کی دہائی میں شامل ہو چکی تھی اور یہ اس کی وفات سے چند برس پہلے کی بات تھی۔ اس یادداشت میں جہاں اس کا ذکر ہوا ہے۔ یہ مکہ مکرمہ کے بارے میں کم اور اس کٹھن سفر کے بارے میں زیادہ ہے جو اس خاتون نے شہر مقدس تک طے کیا تھا۔ اس خاتون سفرنامہ نگار کی تحریر اس کہاوت کو ثابت کرتی ہے کہ حج کی ابتداء تو گھر سے نکلنے والے پہلے قدم سے ہی ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کے درمیانی ابواب میں سٹیگر نصف دنیا کے اس سفر کا ذکر کرتی ہے جو اس نے، اس کے خاوند علی اور تین بچوں نے حجاز تک آسٹریلیا سے شروع کیا تھا جس میں بری اور بحری دونوں سفر شامل تھے۔ یہ سفرنامہ اس کٹھن سفر کی روداد پر مشتمل ہے جسے کئی ملین مسلمان ہر سال اختیار کرتے ہیں جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اس سفر حج کے لیے وہ ایک ایک پیسہ جمع کرتے ہیں اور عموماً عمر کے درمیانی حصے میں حج کی ادائیگی کا فریضہ انجام دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ ایک عقیدت اور جذبہ انہیں دنیا کے سارے کام کاج چھوڑ کر اس سفر پر روانہ ہونے کا شوق دلاتے ہیں جس میں مال بھی خرچ ہوتا ہے اور زندگی بھی خطرات میں رہتی ہے۔ یہ کسی پیشہ ور سفرنامہ نگار کی تحریر نہیں ہے۔ سٹیگر نے ایک مسلمان سے شادی ضرور کی تھی مگر ان کے رہن سہن کا مطالعہ کبھی نہ کیا تھا۔ اس لیے اس کی کتاب کو ایک ادبی کتاب نہیں سمجھا جانا چاہیے۔

بڑھاپے میں جب یہ خاتون ماضی کی یادوں کے سہارے زندگی گزارتے ہوئے کچھ وقت کے لیے ستانے کو بیٹھی تو خیال آیا کیوں نہ ان یادوں کو کتابی شکل دے دی جائے .... یُوں یہ سفرنامہ قارئین تک پہنچا اور آج ہم بھی اس میں سے چند اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔

سٹیگر کی زندگی از پیدائش تا دم واپسیں بے مثال تھی۔ سبز آنکھوں والی یہ کوہ قافی خاتون چین میں پیدا ہوئی، اس کی کیتھولک عیسائی بہنوں نے اس کی پرورش کی اور اس کا نام وِن سٹریج رکھا۔ وہ 16 برس کی عمر تک ان کے ساتھ رہی۔ پھر ایک وبائی مرض نے کلیسائی مشن کے پاؤں اکھاڑ دیئے تھے۔ کتاب کے ایک

باب میں جس کا عنوان ہے ''دروازے پر دستک'' یہ لڑکی ایک انگریز ایلس بلیک سے ملتی ہے جو بتی بدھ مت کی ماننے والی تھی۔ یہ اتفاقی ملاقات جو اس وقت ہوئی جب سٹیگر 19 برس کی تھی اسے پہلے حج پر لے گئی۔ وہ لاما راہبوں کی خانقاہ میں سات ماہ تک مقیم رہی۔ پھر بلیک کے ساتھ واپس بیجنگ آ گئی اور.... ریشم کے ایک کارخانے میں ملازمت کر لی تھی۔ یہاں اس کا اپنا دفتر تھا اور یہ اکاؤنٹنگ سیکھ رہی تھی۔ یہیں اس کی ملاقات علی سے ہوئی جو مستقبل میں اس کا شوہر بننے والا تھا۔ یہ ایک مقناطیسی کشش کا حامل ہندی مسلمان تھا جسے ریشمی سوٹ اور سنہری جھالر والی پگڑیاں بہت پسند تھیں۔ یہ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور آکسفورڈ سے پڑھ کر آیا تھا۔

جب علی نے سٹیگر سے شادی کا فیصلہ کیا تو باپ نے اسے اپنی جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ انکے پاس صرف اتنے پیسے تھے کہ یہ میاں بیوی آسٹریلیا پہنچ جائیں۔ سٹیگر لکھتی ہے:

''مجھے یہ بات بڑی اچھی لگی تھی۔ ہم کھو کیا رہے تھے؟ ہم دونوں جوان تھے، صحت مند تھے اور ایک اجنبی ملک میں ہم اپنی روزی کما سکتے تھے''۔ وہ دونوں آسٹریلیا کے شمالی علاقے میں رہائش پذیر تھے، سٹیگر اس سرزمین کا مقابلہ بحیرۂ مردار سے کرتی ہے۔ علی کچھ ایسے شتربانوں کے ساتھ مل کر سامان لیے صحرائی سفر پر لے جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس جوڑے کے پاس اپنے مال مویشی آ گئے تھے۔ سٹیگر نے ایک بار اپنی کتابیں سنبھالیں اور اپنے شوہر کے ساتھ ایک سفر پر ساتھ گئیں۔ سفر کٹھن تھا مگر وہ لکھتی ہیں:

''علی سے ملنے سے قبل میں قید تنہائی بہت کاٹ چکی تھی اب مجھے اس کے ساتھ ایک رومانوی زندگی گزارنے کی آرزو تھی''۔ پھر ایک روز علی یہ خبر لے کر آیا کہ وہ حج پر جا رہا ہے اور پریشان ہے کہ بیوی کو کس کے پاس چھوڑ کر جائے۔ سٹیگر جو تنہا رہنے سے خائف تھی، پریشان ہو گئی اور غصے میں آ گئی تھی۔ چند ہفتوں بعد علی نے ہار مان لی تھی اور سٹیگر کی ضد پر اسے اور بچوں کو اپنے ہمراہ لے جانے پر رضامند ہو گیا تھا۔

درج ذیل اقتباسات ان کے آسٹریلیا سے ہندوستان تک کے سفر کے حالات اور پھر بحیرۂ احمر کے راستے حجاز پہنچنے تک کی روداد پر مشتمل ہیں۔ ان میں سفر کی صعوبتوں کا ذکر ہے اور کئی ایسے موڑ ہیں جو بے حد تکلیف دہ تھے۔ جبری حراست تنہائی میں رکھنے والے انسپکٹروں دو بیٹوں کو پیچھے چھوڑ جانے کا فیصلہ، صرف ایک بیٹی کو ساتھ لے جانے پر رضامندی سبھی مشکل مراحل تھے ہم ان کے ہمراہ ایک حج ٹرین پر لکھنو سے روانہ ہوئے۔ ہر اسٹیشن پر پھول ہی پھول تھے پھر جب ہم ایک عجیب و غریب سے شکستہ حال دو خانی جہاز میں سوار

ہوئے تو دیکھا کہ حجاج سے یہ جہاز بھرا ہوا ہے۔ یہ جہاز کانرڈ کے پٹنہ سے بھی بری حالت میں تھا۔ آج بھی ہزاروں حجاج کے لیے یہ تجربات عام طور پر مشترک ہیں۔ بعد میں جو اقتباسات آئیں گے وہ اس سفر کے حالات پر مشتمل ہیں جو جدہ مکہ قافلے کے ہمراہ سفر کے دوران پیش آئے تھے، یہ قافلہ ایک ایسا حاجی لے کر جا رہا تھا جو برسوں سے اونٹوں کے ساتھ حجاج کا قافلہ لے کر چلتا تھا اور سفر کو رومانوی رنگ دے دیتا تھا۔ جس سرزمین سے یہ گزرے وہ بڑی داستانوی لگتی تھی.......... ابراہیمؑ کے کنویں، سلیمانؑ کی کانیں، راستے میں پڑتی تھیں۔ مکہ مکرمہ میں حجاج کے داخل ہونے سے قبل کی رات کا ذکر کرتے وقت وہ لکھتی ہے کہ ہم سرزمین مقدس کی سرحد پر جب اندر داخل ہونے کے منتظر تھے اس وقت حاجیوں کی عقیدت اور مذہبی جوش وجذبہ دیکھنے کے قابل تھا۔

سٹیگر کی کتاب سفر کے ان حقائق پر مبنی ہے جو ایک ایسے مسافر نے قلمبند کیے ہوں جس کے پاس نہ دولت کی فراوانی تھی نہ دوستوں، شناساؤں کی مدد حاصل تھی۔ زبان و بیان سادہ ہے اور ایک خاتون کئی عشرے کی باتیں، جو اس کی یادوں میں محفوظ تھیں پہلی بار کتابی شکل میں 1969ء میں پیش کر رہی تھی۔ وہ لکھتی ہے:
''اگر میری یہ ساری تحریر بے ربط لگے تو آہ بھر کر صرف اتنا کہہ دیجیے کہ یہ اس خاتون کی تحریر ہے جو اس وقت 87 برس کی تھی جب یہ سفرنامہ لکھا گیا''۔ ونفریڈ سٹیگر کی پوری زندگی ایک سفر تھی۔

☆☆☆

وینفرڈ سٹیگر کی ''جرسِ کارواں'' سے لیا گیا

اوڈنادتہ......آسٹریلیا، 1926ء......گو میں نے سفرِ حج میں بہت کم سامان رکھا تھا مگر اس کے باوجود مجھے اس سفر کی مشکلات کا علم تھا۔ جوانی میں مجھ سے بہت سے حاجیوں کی ملاقات ہو چکی تھی اور میں نے اس سفر کی بہت سی کہانیاں انکی زبانی سن رکھی تھیں، اسی لیے مجھے اس سفر کے خطرات سے پوری پوری آ گاہی حاصل تھی۔ میرے لیے ان خطرات کے علاوہ جو حجاج کو عموماً درپیش ہوتے تھے ایک اضافی خطرہ بھی تھا۔ مجھے تلاوت کے دوران ہمیشہ مشکل پیش آتی تھی کہ میں عربی زبان سے واقف نہ تھی، تلاوت کے دوران کہاں کہاں توقف کے بعد آگے پڑھنا ہوتا تھا یہ مجھے مشکل لگتا تھا۔ اگر کسی نے اندازہ لگا لیا کہ میں مسلمان نہیں ہوں تو کیا بنے گا۔ میری اور علی دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی کہ حجازِ مقدس میں ہم کیوں کر داخل ہوئے۔ مجھے اپنے بزدل ہونے کا اعتراف ہے اور میں جلد ڈر بھی جاتی ہوں مگر میں علی کے اکیلے سفر پر جانے سے نہ جانے کیوں زیادہ خائف تھی۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ اس کے بغیر اکیلے آسٹریلیا میں رہنا میرے لیے معلوم نہیں کیا خطرات لائے گا میں علی کو پھر کبھی مل بھی سکوں گی کہ نہیں۔ یہ سب میں برداشت نہ کر سکتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میرا شوہر کسی خطرے میں ہو تو میں اس کے پیچھے کھڑی اس خطرے سے الگ نہ رہوں۔

لکھنو: ہمیں پہلی حج ٹرین سے لکھنو سے سوار ہونا تھا۔ جب ہم اسٹیشن پہنچے تو پتا چلا کہ ٹرین تو کل آئے گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں رات بھر پلیٹ فارم پر سونا پڑے گا۔ لوگ سوئے ہوئے تھے اور بوڑھے مسافروں کے کھانسنے سے ان کی نیند خراب ہو جاتی تھی۔ رات بھر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ بہت سے حجاج کو حج ٹرین کے پہنچنے کا انتظار تھا۔ کتے خوراک کی تلاش میں سوئے ہوئے مسافروں کے اردگرد بے خوف پھر رہے تھے کہ کوئی انہیں مارتا نہیں تھا۔

صبح خنک تھی کیونکہ ایک رات قبل بارش برس چکی تھی۔ عورتوں نے ستونوں کے گرد پھولوں کے ہار لٹکانے شروع کر دیے تھے۔ بہت سی ٹولیوں میں بیٹھی ہار بنانے میں مصروف تھیں۔ اسٹیشن کے دروازوں اور

کھڑکیوں پر ہار ہی ہار نظر آتے تھے۔ ریڑھیاں تک پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ دیکھنے والی ہر آنکھ حیران تھی کہ اتنی مقدار میں گلاب اور یاسمین کے پھول کہاں سے آ گئے تھے۔ بالآخر قبل از دوپہر ٹرین آ ہی گئی تھی۔ میں اسے بوڑھی کہوں گی کیونکہ یہ جوانی کی ساری رعنائیوں سے عاری بڑھاپے کی ساری نشانیاں لیے ہوئے تھی۔ صرف اس کی سیٹی مضبوط تھی۔ بوگیوں پر سے رنگ اڑ چکا تھا، انجن زنگ آلود ہو گیا تھا۔ جب یہ بھاپ چھوڑتی تو یوں لگتا تھا جیسے دوڑتے دوڑتے تھک گئی ہو اور کھانس رہی ہو۔ مگر لگتا تھا وہ دیکھنے میں کمزور و ناتواں ضرور تھی لیکن چلنے میں بڑی مضبوط اور تیز رفتار۔ اسے بھی حجاج کے عزیز و اقارب نے نئی نویلی دلہن کی طرح پھولوں سے لاد دیا تھا۔ دروازے، دستے ہر شے کو پھولوں کے ہار پہنا دیئے گئے تھے۔ کانوں کو بہرا کر دینے والی آواز سنتے ہی حجاج کے عزیزوں نے انہیں الوداع کہنا شروع کر دیا تھا۔ ریڑھی بان اپنی چیزیں بیچنے کے لیے چلا رہے تھے، بچوں کا شور و غل الگ تھا اور انجن سمندر میں دھند کی طرح بھاپ نکال رہا تھا۔

مسافر بوگیوں میں سوار ہو گئے تھے۔ بہت سے تو پہلے سوار ہونے کی کوشش میں دوسروں کو دھکیل کر کھڑکی کی راہ بوگی میں سوار ہونے کو ترجیح دے رہے تھے۔ لوگوں کا ایک ہجوم دروازوں سے اندر گھس رہا تھا اور یوں لگتا تھا یہ دروازے ان کی اس دھکم پیل میں ٹوٹ جائیں گے۔

علی نے میرے اور بچوں کے لیے ایک نشست حاصل کر لی تھی۔ اب خواتین ریل کے ڈبے کے اندر آ کر مسافروں کے گلے میں ہار پہنا رہی تھیں۔ ہمارے حصے میں بہت سے ہار آئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ عورتیں جانتی تھیں کہ میں اجنبی بھی ہوں اور ڈری سہمی ہوئی بھی۔ انہوں نے تو مجھے ٹھوڑی تک پھولوں میں چھپا دیا تھا میں نے بچوں کو بچا لیا تھا ورنہ ان کے لیے پھولوں میں ڈوب جانے کے بعد سانس تک لینا مشکل ہو جاتا۔ مگر پھر بھی یہ دن میری زندگی کا یادگار دن تھا۔ میں کہ ایک ایسی بچی تھی جسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا تھا کہ میں چین کے ایک گرجا گھر کے چمن میں مر جاؤں، آج ایک ملکہ کی مانند گلاب اور یاسمین کے شاہی لباس میں نظر آ رہی تھی۔

ایک گھنٹے بعد انجن نے تین بار بھاپ اُگلی اور تماشائی پلیٹ فارم کے کنارے سے ذرا پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ریڑھی والوں نے اپنا مال بیچنے کے لیے آوازیں لگانا بند کر دی تھیں۔ پھر پلیٹ فارم پر موجود سب لوگ ایک ہجوم کی شکل میں مشرق کو مڑ گئے تھے۔ ریل کے پہیے حرکت میں آئے تو ''اللہ اکبر'' کی صدا سے فضا گونج اٹھی تھی۔ اب ٹرین پلیٹ فارم سے دور نکل آئی تھی۔ انجن کی آواز ابھی تک آ رہی تھی اور ایک ہزار مسلم

مسافر مکہ مکرمہ کے مقدس سفر پر جا رہے تھے۔

کراچی میں تیاریاں: علی نے کراچی میں ایک متمول گھرانے میں بچوں کو اتنے دن اپنے پاس رکھنے کا انتظام کرلیا تھا جتنی مدت کے لیے ہم حج پر تھے، وہ ان لوگوں کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ میری بیٹی جینی کی عمر صرف چار برس تھی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اتنی چھوٹی عمر میں مجھے اس کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ مگر مجھے اطمینان تھا کہ وہ ہمارے بعد کراچی میں زیادہ محفوظ ہوگی۔ میں تو دونوں طرح پریشان تھی اور مجھے خیال بالکل نہیں آرہا تھا کہ میرے علاوہ باقی لوگ بھی تو حج پر جاتے وقت بچوں کو پیچھے چھوڑ کر جاتے ہیں اور کئی وصیتیں بھی کر کے جاتے ہیں۔ ایک بوڑھے شخص کو حج پر جانے کا موقعہ ہی نہ ملا تھا اور وہ قتل ہو گیا تھا اور اس کے گھر چوری بھی ہوگئی تھی۔ شہر میں چوری کی کئی وارداتیں ہو چکی تھیں۔ علی نے مجھے تاکید کی تھی کہ اس کی غیر حاضری میں مجھے دروازہ اندر سے بند کر کے رکھنا چاہیے اور یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ہمارے گھر میں کیا ہے جو چوری ہو جائے گا۔ بچوں کے کچھ کپڑے، تین غالیچے، میری بیٹی کی گڑیا، آٹا، مصالحے، دالیں، ایک گیلن گھی یہی کل سرمایہ تھا ہمارا۔

جہاز پر سفر کے دوران استعمال کے لیے میں نے کچھ مٹر خرید لیے تھے۔ ہر مسافر کے پاس راستے میں استعمال کے لیے سامانِ خورد و نوش ضرور ہونا چاہیے۔ ہمیں تین گیلن پانی، 15 پاؤنڈ سوختنی لکڑی فی کس ساتھ لے جانے کی اجازت تھی۔ بچوں کے لیے کوئی الاؤنس نہ تھا۔ بحیرۂ احمر میں پانی کی یہ مقدار ہمارے لیے بہت کم نکلی تھی۔

علی نے کافی تگ و دو کے بعد ٹکٹیں حاصل کر لی تھیں، کرایہ زیادہ طلب کیا گیا تھا۔ ہمارے نام اس عرصے کے لیے تبدیل کر دیے گئے تھے تاکہ ہم اپنے ناموں سے مسلمان سمجھے جائیں۔ علی کا نام تو پہلے ہی اسلامی تھا صرف جینی بیٹی کا اور میرا نام تبدیل ہونا تھا۔

میں کراچی میں تھی جب علی کا بھائی بھی ہمیں آ ملا تھا۔ اس کا نام لبّو تھا اور وہ میرا ہمیشہ بڑا خیال رکھتا تھا اور ویسے بھی مزاجاً وہ ایک اچھا انسان تھا جو مشکل گھڑی میں دوسروں کا ساتھ دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔

طبّی معائنہ: جہاز پر سوار ہونے کا دن قریب آ گیا تھا۔ ہم نے تانگے پر بیٹھ کر بندرگاہ پہنچنا تھا۔ ہمارا خیال تھا ہم سیدھے جہاز تک چلے جائیں گے مگر دوسرے حاجیوں کا خیال کچھ اور تھا۔ ہمیں ساحل سمندر پر

بانس کے بنے ہوئے ایک کچے سے چھپر تک لے جایا گیا جہاں پینے کے لیے ٹھنڈے پانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں صرف مرد حاجی بیٹھ سکتے تھے جہاں ان کا طبی معائنہ کیا جا رہا تھا۔ ہم چار سو عورتوں کو ایک پرانی عمارت کی طرف لے گئے جس کی چھت بھی نہیں تھی، یہ صرف تین دیواروں پر کھڑی تھی۔ دوپہر کا وقت ہو گیا تھا اور کسی سائبان کے بغیر ہمیں وہاں جا کر قطاروں پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ جینی میرے قریب ہی دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر ریت پر چلتی ہوئی ہمارے پاس آئی، اس کا تعلق یوریشیا سے تھا۔ ایک آیا اس کے ہمراہ تھی جس نے کاغذ قلم اٹھا رکھے تھے۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ ہم عورتوں نے کیا قصور کیا تھا کہ مردوں کی طرح ہمارے لیے سائبان اور ٹھنڈے پانی کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ علی کے والدین کے گھر سے روانگی کے وقت مجھے ملیریا تھا۔ میں ابھی تک تندرست نہیں ہوئی تھی اور دن کے ایک خاص وقت پر مجھ پر معمول کے مطابق ملیریا کا حملہ ہوتا تھا۔ پھر اس قدر گرمی تھی کہ مجھے گرمی دانے بہت پریشان کر رہے تھے۔

لیڈی ڈاکٹر نے سفید لینن کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ سکرٹ کے ساتھ سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی بھی تھی۔ وہ دیکھنے میں تیس برس کی لگتی تھی۔ ایک منٹ کے لیے ہمارے سامنے کھڑے اس نے ہم سب کا جائزہ لیا۔ پھر حکم ملا کہ ہم اپنے سینے برہنہ کر لیں تا کہ پیٹ بھی نظر آئے۔ پھر اپنے ہاتھ کی پچھلی طرف سے اس نے ہر ایک کے پیٹ پر ہلکی سی چپت لگائی جیسے ٹھوک کر بجایا جاتا ہے۔ میں نے منہ پر ہاتھ رکھے بغیر لمبا سانس لیا جو میں جانتی تھی کہ غلط بات تھی کیونکہ اس سے وبائی امراض پھیلنے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ ہندوستان کی خواتین بہت نفاست پسند ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں اسے آدابِ مجلس کے بھی خلاف تصور کیا جاتا تھا۔ عورتوں نے میری اس حرکت کو برا محسوس کیا اور اپنی سیاہ آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف بے بسی سے دیکھا۔

کچھ نے جلدی سے اپنے چہرے دیوار کی طرف پھیر لیے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر طبی معائنے کے اس عمل میں مصروف تھی اور مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ طبی معائنہ کے نام پر کیا جا رہا تھا۔

مجھے اس وقت ملیریا نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور میں کانپ رہی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر اپنی آیا کے ساتھ عمارت کا چکر کاٹتی ہوئی اب تیسری اور آخری دیوار کی طرف آ رہی تھی۔ مجھ سے اور جینی سے پہلے صرف چار عورتیں رہ گئی تھیں پھر ہماری باری تھی۔ پنجاب سے آئی ہوئی ایک ماں خوف سے کانپ رہی تھی اور اسے

معلوم بھی نہ تھا کہ وہ کیوں خوفزدہ تھی۔

یہ خاتون اس قدر خوفزدہ تھی کہ اس نے ڈاکٹر کا یہ حکم بھی سنا اَن سنا کر دیا تھا کہ اپنی قمیص پیٹ سے اٹھاؤ۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا رکھا تھا اور دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔ ڈاکٹر نے بیچاری اس عورت کی قمیص پھاڑ دی تھی۔ اس کا سر ڈاکٹر نے پکڑ رکھا تھا اور اسے دیوار کے ساتھ بے رحمی سے ٹکرا رہی تھی۔ عورت سسکیاں لیتی ہوئی زمین پر گر گئی تھی۔ آیا نے ڈاکٹر سے کچھ کہا تو اسے بھی زور کا تھپڑ پڑا جس سے اس کی چوڑیاں اور پازیب بج اٹھی تھیں۔

اب وہ لیڈی ڈاکٹر میری بیٹی جینی کی طرف آئی اور مجھے حکم ملا کہ اس بچی کی قمیص اونچی کرو۔ میں نے کہا: ''تم اپنے گندے ہاتھ میری بچی کو نہ لگانا۔ خبردار جو میری بیٹی کو چھونے کی کوشش کی''۔ میں نے بمشکل اپنی بات مکمل کی تھی کہ اس اثنا میں اس کے ہاتھ میری بیٹی تک پہنچ چکے تھے۔ جینی سہم کر میری ٹانگوں کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ اب ڈاکٹر نے اسے چھوڑ کر مجھے حکم دیا کہ میں اپنی قمیص اوپر کروں اور جلدی سے کروں کیونکہ اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

میں نے انکار کر دیا اور ڈاکٹر سے کہا کہ جو وہ کر رہی تھی یہ طبی معائنہ نہیں تھا بلکہ اس سے تو بیماری پھیلنے کا اندیشہ بڑھ گیا تھا۔

ڈاکٹر مشتعل ہو گئی اور کہنے لگی: ''تمہاری یہ ہمت کیسے ہوئی کہ تم ایسی بات مجھ سے کہو؟ میں تمہیں سزا دے سکتی ہوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ فوراً قمیص اوپر کر لو۔''

''نہیں، اپنے غلیظ ہاتھ مجھے مت لگانا''، میں نے جواب دیا۔

اب اس نے میری قمیص پھاڑنے کی کوشش میں ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔ میں نے غضب آلود نظروں سے اسے دیکھا پھر میں پوری طاقت اور غصے کے ساتھ اس پر جھپٹی۔ ہم دونوں گر گئی تھیں، میں اوپر تھی اور وہ میرے نیچے میں نے غم و غصے میں اس کے کپڑے پھاڑ دیئے تھے اور اس کا ریشمی بلاؤز میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے آج برسوں بعد جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو مجھے ایک شرمناک خوشی کا احساس ہوتا ہے کہ میں نے اس لیڈی ڈاکٹر کے کپڑے پھاڑ دیئے تھے۔

اس نے میرے نیچے سے نکلنے کی ناکام کوشش کی، میں اس سے زیادہ مضبوط اور طاقتور تھی۔ ہم لوٹ پوٹ کر دور چلی گئی تھیں مگر وہ نیچے سے نہ نکل سکی۔ آیا اپنی مالکہ کو بچانے کے لیے آگے بڑھی اور روشنی کی

دوات اس نے ہم دونوں پر انڈیل دی تھی۔ میری دشمن کا انڈے کی طرح سفید لباس گندا ہو گیا تھا۔ اس پر سیاہ اور سرخ روشنائی کے داغ تھے۔ ڈاکٹر چیخ رہی تھی اور عورتیں اسے اس حالت میں دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ اگر کبھی آپ نے چار سو عورتوں کو ایک ہی وقت میں ہنستے سنا ہو تو آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس وقت کس قسم کی آواز ہوا میں گونج رہی ہوگی۔ مرد ڈاکٹر اور دوسرے لوگ مردوں والے حصے سے بھاگتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے انہوں نے ہم دونوں کو چھڑایا۔ اب میں کھڑی نہیں ہو سکتی تھی کہ کسی نے مجھے بیٹھنے کو کرسی دی۔ پولیس کا ایک دستہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ مرد حجاج کو دور کھڑے رہنے کو کہا گیا تھا۔ اب ڈاکٹروں نے میری جواب طلبی کی کہ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں ہوا۔ میں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں کانپتی ہوئی زمین پر گر گئی تھی۔ میری مٹھی میں اب تک لیڈی ڈاکٹر کے بالوں کا ایک گچھا موجود تھا۔

میں نے جب بتایا کہ یہ ڈاکٹر معائنہ کس طرح کر رہی تھی تو مرد ڈاکٹر بہت حیران ہوئے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ اس ڈاکٹر نے کیسے ایک عورت کا سر دیوار سے مار دیا تھا۔ بہت سی عورتوں کا بیان لیا گیا تو سب نے شکایت کی اور لیڈی ڈاکٹر کے ظلم کی تفصیل بتائی۔ پولیس آگے بڑھی اور لیڈی ڈاکٹر کو حراست میں لے لیا۔ مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ اس لیڈی ڈاکٹر کا پیشہ اس واقعہ کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔

اب پولیس کے ایک سپاہی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''یہ سب کچھ تم نے کیا ہے۔ اب تمہیں تو جیل جانا ہوگا''۔ میں بے حد پریشان تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہوگا، اب تو سفر یہیں ختم ہو کر رہ جائے گا۔

مزید مرد موقعہ واردات پر پہنچ گئے تھے یہ حج افسران تھے۔ میں مر جانا چاہتی تھی۔ میں نے مرنے کی خواہش کی، ملیریا، گرمی دانوں، شدید سر درد اور ذہنی پریشانی سے۔ میں بھی کیوں نہ بے ہوش ہو کر گر گئی جس میں میری جان بھی جا سکتی تھی، مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا۔ مجھے جو جسمانی تکلیف ہوئی تھی وہ تو ایک طرف مگر مجھے تو اب یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ علی میرے بارے میں کیا سوچے گا اب تو وہ حج پر بھی نہ جا سکے گا۔ میں نے تو اس سے یہ قیمتی شے چھین لی تھی...... میرا شوہر اب عمر بھر مجھ سے نفرت کرے گا۔ اس وقت تو موت ہی میرے لیے عزیز ترین شے تھی۔

مجھے احساس ہوا کہ میرے لیے عجیب و غریب الفاظ استعمال کیے جا رہے تھے۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ افسران مجاز کو میرا ممنون ہونا چاہیے تھا کہ میں نے اس لیڈی ڈاکٹر کی اصلیت کھول کر رکھ دی تھی۔ گاڑی منگوائی گئی اور مجھے، علی اور جینی کو ایک بہت اچھے ہوٹل میں لایا گیا تھا۔ یہاں ہمیں کمرہ دیا گیا تھا غسل کا انتظام بھی تھا

اور لنچ بھی بہت عمدہ کھلایا گیا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے مجھے کونین کی ایک خوراک بھی دی۔ اب ہمیں بندرگاہ لایا گیا اور اس سے قبل حج دفتر سے مجھے درخواست کی گئی کہ میں جہاز کے اندر سفر کے دوران چار سو عورتوں کی انچارج بنا قبول کرلوں۔ یہ اس لیے ضرورت تھا کہ دوسرے جہازوں پر ان شکایات کی افواہ تھی کہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے خیال آیا ایک شوہر، تین بچے اور چار سو عورتوں کی ذمہ داری، کچھ زیادہ بوجھ نہیں تھا میرے ان ناتواں کندھوں کے لیے..... مگر میں خوش بھی بہت تھی اور اپنی قسمت پر نازاں بھی۔

جہاز کے اندر: علی نے میرے کندھے سے جینی کو لیتے ہوئے مجھ سے پوچھا: ''چھوٹی کیا تم بہت تھک گئی ہو؟''

''اوہ علی! آپ سارا وقت کہاں رہے؟ ہاں میں بہت تھک گئی ہوں، آؤ اپنے کیبن میں چلیں''۔ ''ٹھہرو مجھے کیبن کے بارے میں معلوم کر لینے دو'' علی نے کہا۔ ''مگر کیوں کیا ہمیں اس جہاز میں کیبن نہیں دیا گیا؟'' میں نے علی سے پوچھا۔ ''نہیں دراصل اس جہاز پر سوار کپتان اور افسروں کو کیبن ملتے ہیں'' علی نے کہا۔ ''مگر ہم سوئیں گے کہاں اور کپڑے کہاں تبدیل کریں گے؟ میں نے سوال کیا۔

''فکر مت کرو، میرے پاس ایک خوبصورت جگہ ہے وہاں نیچے''.....

''مگر وہ تو جہاز کے پیندے کے قریب ہوگی''۔

سمندر میں: جہاز آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم انجن کے بہت قریب تھے۔ اندھیرا ابھی بہت تھا۔ ایک ہی چھوٹا سا لالٹین تھا جس کی روشنی بہت مدھم تھی۔ وہاں نیچے خاموشی بھی نہیں تھی بلکہ انجن کی آواز شور وغل پریشان کر دیتا تھا۔ حجاج کے کھانسنے تھوکنے اور چیخنے چلانے سے بھی طبیعت بوجھل ہو جاتی تھی۔ مردوں عورتوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور سیڑھی تک پہنچنے کے لیے سوئے ہوئے جسموں کے اوپر سے پھلانگ کر جانا پڑتا تھا۔ ہر حاجی کو سونے کے لیے محدود سی جگہ ملی تھی جہاں اس نے اپنا سامان باندھ کر پاؤں کی طرف رکھا ہوا تھا۔

بہت کم جگہ ایسی تھی جہاں حجاج نے باورچی خانے کے طور پر لکڑی جلانے کا انتظام کر رکھا تھا تا کہ بوقت ضرورت کوئی چیز پکا سکیں۔ یہ کل چودہ جگہیں تھیں جہاں باری باری کھانا پکانے کی سہولت میسر تھی۔ اسی لیے ہم اکثر بھوکے رہتے تھے۔ علی کوئی زیادہ چست و چالاک انسان نہ تھا۔ میں نے اپنے سامان خورد و نوش

میں جینی کے لیے کچھ چیزیں بطور خاص رکھی ہوئی تھیں۔ جس میں دودھ بسکٹ کھجوریں شامل تھیں۔ اس کے باوجود میری بیٹی نے بڑی تکلیف اُٹھائی تھی۔

اور بھی کئی چیزیں تھیں مگر انہیں کسی خاص ترتیب سے نہیں رکھا گیا تھا۔ بیت الخلاء کا انتظام بھی تھا جسے ہر شام صاف کیا جاتا تھا۔ دو ٹینک بھی بنے ہوئے تھے جن میں لوگ نہاتے تھے۔ عورتوں کو ایک بالٹی دی جاتی تھی جس کے ساتھ رسی بندھی ہوئی ہوتی تھی۔ اس سے وہ سمندر میں سے پانی بھر لیتی تھیں۔ ٹین کے ایک ڈبے کو نہاتے وقت استعمال کیا جاتا تھا۔ نہانے کے انتظامات اتنے ناقص تھے کہ نہانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مردوں کے لیے کچھ کام آسان تھے مثلاً سمندر سے پانی لینے کے لیے وہ ایک پرانے پمپ کو سمندر میں ڈال دیتے تھے جس کے ساتھ ایک ٹیوب ہوتی تھی جو پانی کو اس میں کھینچ لیتی تھی۔

جس جہاز میں ہم سوار تھے ایسا ہی ایک اور جہاز بھی تھا۔ یہ دونوں برسوں پہلے بنائے گئے تھے۔ پھر یہ ڈوب گئے تھے۔ کئی برس یہ پانی کے اندر رہے اور جب نکالے گئے تو بہت سستے بکے تھے۔ ایک تاجرانہ ذہن کے مالک نے سوچا کیوں نہ انہیں حجاج کو مکہ لے جانے کے لئے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ ان میں نئے انجن فٹ کیے گئے اور انہیں تھوڑے پیسے اور خرچ کر کے قابل استعمال بنالیا گیا تھا۔

ہمارے جہاز میں کہیں کہیں زنگ نے سوراخ کر دیئے تھے۔ اوپر والے عرشے پر چار چھوٹی کشتیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میرے خیال میں یہ بھی انجنوں کی طرح قابل بھروسہ نہ تھیں۔ مگر پھر بھی کسی کسی وقت مجھے خیال آتا گیارہ سو مسافروں کو عملے کے علاوہ، یہ جہاز کیسے منزل تک لے جائے گا۔ نہ اس میں جان بچاؤ پیٹیاں (لائف بیلٹس) تھیں نہ اچھے جہازوں کی دوسری سہولیات۔ یہ تو مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ جہاز کتنے ٹن وزن اٹھا سکتا تھا مگر یہ مجھے یقین تھا کہ یہ ایک آسٹریلوی کوسٹر سے بڑا نہ تھا۔

جہاز میں پہلی ہی رات سے خواتین کے مفادات کی دیکھ بھال کی میری ڈیوٹی شروع ہو گئی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ ضرورت صاف ہوا کی محسوس ہوئی تو میں جہاز کے عرشے کی کھڑکی سے نیچے اتری۔ اس کوشش میں، میں ایک بار لیش حاجی پر گرتے گرتے بچی تھی جس نے میرے راستے میں اپنا گھر بنا رکھا تھا۔

سوئے ہوئے حجاج کے اوپر سے پھلانگتی ہوئی میں بالآخر سیڑھی کے اختتام پر پہنچی مگر حیرت زدہ ہو کر رک گئی تھی۔ فرش پر دو نوجوان لڑکیاں سوئی ہوئی تھیں۔ ایک شخص قریب پڑے ہوئے پرندوں کے پنجرے کو دھو رہا تھا۔ یہ پرندے کپتان کے تھے پانی لڑکیوں کے بستر کے اندر رس رس کر جارہا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر مجھے ایک انچ بھی خشک یا نمدار جگہ نظر نہ آئی۔ مجھے ان لڑکیوں کی فکر تھی۔ میں دوسری سیڑھیوں پر چڑھ گئی تھی مگر کہیں بھی کوئی جگہ نہ ملی۔ میں عرشے پر سب سے اوپر تک چلی گئی تھی۔ جہاں سے ستاروں بھرا آسمان نظر آ رہا تھا مگر وہاں بھی ویسا ہی معاملہ تھا۔ میں نے اس صورت حال سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ عرشے کا سامنے والا حصہ لوہے کی ایک گرل سے پوری طرح مضبوط کنارے سے کٹ چکا تھا اور اس میں ایک چھوٹا سا دروازہ اندر کی طرف چلا گیا تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے مجھے چند سیڑھیاں اور چڑھ کر اوپر جانا تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی اور جہاز اس طرح نہیں چل رہا تھا جس طرح نچلے حصے میں بیٹھ کر میں نے محسوس کیا تھا۔ میں نے دروازے کو کھٹکھٹایا تو کچھ دیر بعد ایک افسر نے آ کر مجھ سے کہا: ''یہ تم کیا کر رہی ہو؟ نیچے چلی جاؤ جہاں سے تم آئی ہو''۔ میں نے اس کی بہت تلخ لہجے میں کہی ہوئی بات کے جواب میں بڑی نرمی سے کہا: ''کیا آپ مہربانی فرما کر ایک منٹ کے لیے میری بات سنیں گے؟'' اس نے پوچھا: ''جی جی کیا معاملہ ہے؟'' میں نے مختصراً اس افسر کو ان دو نوجوان لڑکیوں کی مشکل کے بارے میں بتایا۔

اس نے جواب دیا: ''دیکھیے یہ میرا قصور نہیں ہے، اس بات کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لڑکیاں وہاں کیوں سوئی ہوئی ہیں انہیں اوپر والے عرشوں پر آ کر سونا چاہیے تھا۔

اس نے جواب دیا: ''دیکھیے یہ میرا قصور نہیں ہے، اس بات کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لڑکیاں وہاں کیوں سوئی ہوئی ہیں انہیں اوپر والے عرشوں پر آ کر سونا چاہیے تھا اور اب آپ نیچے چلی جائیں''۔

میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا: ''نہیں، میں اس وقت تک نیچے نہیں جاؤں گی جب تک آپ ان کے لیے کچھ کرتے نہیں ہیں''۔

''میں نے آپ سے کہہ دیا ہے یہ میرا کام نہیں ہے۔ آپ نیچے جاتی ہیں یا میں آپ کو بھیج دوں؟''

''میری بات سنیئے مسٹر افسر! میں آپ کے مالکان کی نمائندگی کر رہی ہوں۔ یہ لوگ، لڑکیوں سمیت مسافر ہیں اور آپ کی تنخواہیں ان کی جیب سے آتی ہیں۔ کیا میں آپ کی شکایت کر سکتی ہوں، جو میرے خیال میں میرا حق بنتا ہے کہ آپ ان لوگوں کا خیال نہیں کر رہے جو اس جہاز میں سفر کر رہے ہیں؟''۔

''میں پھر وہی بات دہراؤں گا کہ یہ میری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ مسافر مویشیوں سے کچھ بہتر ہیں۔ ان کے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ وہ اس جہاز پر سفر کر رہے ہیں''۔

''دیکھیے نوجوان افسر، میں بھی ان ہی میں سے ہوں۔ کیا آپ دانستہ میری بے عزتی نہیں کر

رہے؟''

مجھے نہیں معلوم اس نے کیا جواب دیا لیکن عین اس وقت ایک اور افسر آ گیا تھا جس نے پوچھا:

''کیا بات ہے، کیا تکلیف ہے؟''

میں نے جلدی جلدی مگر بہت اختصار کے ساتھ پوری بات اس کے گوش گزار کر دی تو وہ فوراً میرے ساتھ گیٹ کا تالا کھول کر نیچے تیسرے عرشے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا آ رہا تھا:

''میم صاحب! یہ واقعی بڑا مشکل کام ہے مگر میں آپ کے ساتھ چل کر دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں'' ہم نیچے پہنچے تو لڑکیاں اسی طرح سوئی ہوئی تھیں جس طرح میں ان کو چھوڑ کر گئی تھی۔ اس افسر نے انہیں دیکھ کر کہا: ''غریب چھوٹی شیطان لڑکیاں، انہیں یہاں نہیں بلکہ اپنے والدین کے ساتھ گھر پر ہونا چاہیے تھا۔ یہیں انتظار کریں۔''

وہ حجاج کے اوپر سے پھلانگتا ہوا ایک چھوٹے سے دروازہ پر پہنچا جو عرشہ نمبر 3 کی طرف کھلتا تھا جہاں سے جہاز کا سامنے والا حصہ نظر آتا تھا۔ یہاں اس وقت صرف چھ سات مربع فٹ کی ایک چھوٹی سی الماری تھی جس میں رسیاں، زنجیریں اور اس طرح کی دوسری چیزیں رکھی جاتی تھیں، پاس ہی عرشے صاف کرنے کے لیے دو جھاڑو رکھے ہوئے تھے۔ چند ہی منٹوں کے اندر اندر اپنے سفید لباس کا خیال کیے بغیر اس نے یہ ساری چیزیں وہاں سے اٹھالی تھیں اور ان لڑکیوں کے لیے وہاں جگہ بنا دی تھی۔

''میرے ساتھی افسروں کو ایسا کر لینا چاہیے تھا'' اس نے کہا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ یہ کہتا ہوا چلا گیا: ''اب یہ آپ کا کام ہے کہ ان لڑکیوں کو یہاں سے اٹھاؤ اور جو جگہ ان کے لیے میں نے بنائی ہے وہاں چھوڑ آؤ''۔ پھر اس نے مڑتے ہوئے مجھ سے سوال کیا:

''میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سن لیا تھا کہ آپ مالکان کی نمائندگی کر رہی ہیں..... کیا یہ سچ تھا؟''

''جی ہاں، میرے خیال میں یہ ایک لحاظ سے نمائندگی ہی ہے کیونکہ مجھے حج افسران کی طرف سے ہدایت کی گئی تھی کہ میں جہاز پر عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے بارے میں رپورٹ کروں''۔

اس نے غور و فکر کرتے ہوئے کہا: ''یہ تو ٹھیک ہے مگر ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مسٹر ہارورڈ کے بُرے سلوک کو بھلا دیں؟ دراصل اس کا مطلب یہ نہیں تھا جو آپ سمجھیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ خود کچھ پریشان تھا

اس لیے ایسے سخت الفاظ آپ سے کہہ بیٹھا۔ اس کی پریشانی کا سبب وہ بوڑھا آدمی تھا جو اسے کسی نہ کسی بہانے پریشان کر رہا تھا۔

''جناب کی مہربانی، اس نرم رویے اور تعاون نے میرے ذہن سے اس واقعہ کو محو کرا دیا ہے۔ آپ کی وجہ سے وہ دونوں لڑکیاں آرام میں ہیں یا آرام میں ہوں گی جب میں ان کو جا کر نئی جگہ منتقل کروں گی۔''

''بہت خوب، شب بخیر''...... ''شب بخیر''۔

مجھے ان لڑکیوں کے بارے میں تفصیل بعد میں معلوم ہوئی۔ وہ دونوں اور ان کا ایک بھائی پشاور سے آئے تھے۔ ان کے والدین نے انہیں حج کے لیے مکہ مکرمہ روانہ کیا تھا۔ جہاز کے روانہ ہونے سے قبل یہ تینوں بخیر و عافیت تھے مگر جہاز کی روانگی سے صرف دو روز قبل ان لڑکیوں کے بھائی کو ایک موٹر لاری نے کچل کر مار دیا تھا۔ مرنے سے قبل متوفی نے اپنی بہنوں سے کہا تھا کہ والدین کو مایوس نہ کرنا اور سفر جاری رکھنا۔ یہ لڑکیاں اس طرح کے ماحول اور مشکل سفر سے اب تک بالکل واقف نہیں تھیں۔ بڑی 16 برس کی تھی اور اس کی دوسری بہن اس سے دو برس چھوٹی تھی۔

والدین نے نہ جانے کیا سوچ کر بچوں کو حج پر بھیج دیا تھا، شاید وہ یہ چاہتے ہوں گے کہ ان کی نمائندگی ان کی نوجوان اولاد کر دے تو بہتر رہے گا کیونکہ وہ تو اب بوڑھے ہو چکے تھے۔ انہیں اسی میں اللہ کی خوشنودی نظر آئی ہوگی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز میں جینی کے ہمراہ لیٹی ہوئی تھی کہ میں نے بیک وقت چالیس آنکھوں کو اپنی طرف گھورتے دیکھا۔ مجھے بڑی تشویش ہوئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ پہلے ''اللہ'' کی آواز بلند ہوئی اس کے بعد کچھ عورتیں علی کی تلاش میں دوڑتی نظر آئیں جو اسے جا کر بتانا چاہتی تھیں کہ تمہاری بیوی کو دورے پڑ رہے ہیں۔ وہ بیچارا دوڑتا ہوا نیچے آیا اور راستے میں ان عورتوں سے پوچھتا ہوا آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے......

میں نے علی کو بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی میں تو بالکل ٹھیک تھی۔ مگر بجائے مجھ پر اعتبار کرنے کے وہ تو الٹا مجھ پر برس پڑا تھا کہ میں نے ان عورتوں کو گھور کر کیوں دیکھا تھا۔ ہم میاں بیوی کے درمیان گفتگو سن کر کچھ لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں بالآخر گرمی سے تنگ آ کر، کچھ علی کی غلط فہمی کی وجہ سے چیخ اٹھی تھی۔ ہم عموماً

جب تھک جاتے ہیں اور ہمیں اپنی غلطی کا بھی احساس ہو جاتا ہے تو ہم صلح کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کو چومتے ہیں۔ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا کہ میں آئندہ ان عورتوں کو اس طرح نہیں دیکھوں گی۔ میں نے اپنے ہاتھ اور چہرہ بلند کیا تا کہ وہ مجھے معافی کا بوسہ دے سکے مگر علی نے ایسا نہیں کیا اور بھاگ کر سیڑھیاں چڑھ گیا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ مگر مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ حج کے لیے روانہ ہونے پر مولوی صاحبان ایک نصیحت یہ بھی کرتے ہیں کہ جہاز میں سوار ہونے کے بعد مرد اور عورت کا میاں بیوی کا رشتہ جنسی تعلق سے پاک ہو جانا چاہیے۔ یہاں تک کہ ایک معصوم سا بوسہ بھی لینے یا دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ عورتوں کو چہروں پر نقاب لے لینے چاہئیں تا کہ اس طرح کا کوئی خدشہ باقی ہی نہ رہے۔ نو بیاہتا جوڑوں کے لیے بھی پرہیز لازمی تھی۔ ایک چونا کی ہوئی سفید دیوار سے زیادہ پاکیزہ نہیں تھی۔

ٹین کے اندر پانی گرم اور نمکین تھا۔ جہاز کے پیندے میں جمع ہونے والے پانی میں سے بدبو آ رہی تھی۔ حجاج بری طرح سے کھانس رہے تھے۔ ایک شور تھا جو کبھی ختم نہ ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ علی کے بھائی لبو نے دونوں لڑکیوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ اگر کوئی انسان اچھا ہو سکتا تھا تو وہ لبو تھا۔ میں نے اسے ان لڑکیوں کے بارے میں تفصیل سے بتا رکھا تھا۔ اسے احساس تھا کہ ان دونوں بہنوں کو کھانے کی پریشانی ہو گی کہ جہاز پر اس کے انتظامات ناقص اور بہت کم تھے۔ وہ اکثر اپنے حصے کا سالن انہیں دے آتا تھا۔

عرشے پر کھانا پکانے کے لیے، روشن آگ، کئی جگہ الگ الگ، کبھی نہ بجھی تھی۔ جو دن کو اس کے قریب نہ جا سکتے تھے وہ رات کو کچھ پکانے کے لیے چلے جاتے تھے۔ آگ کے نزدیک ہر وقت، کھانا پکانے والوں اور والیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ جن دنوں ہوا تیز چلتی تھی ان دنوں آگ کے شعلے مجھے بہت پریشان کرتے تھے۔ میں اس تصور سے ہی کانپ اٹھتی تھی کہ خدانخواستہ ہمارے جہاز کو آگ لگ گئی تو کیا ہو گا۔

جدّہ: جدہ کے ارد گرد سمندر کا پانی اس قدر نیلا ہے کہ شاید ہی کہیں اور کسی نے اتنا نیلا پانی دیکھا ہو گا۔ جب ہم لنگر انداز ہونے جا رہے تھے اس وقت دوپہر کا وقت تھا اور پانی، آسمان پیلی ریت اور سفید عمارات تمام چکا چوند کر رہی تھیں۔ ساحل سے ایک دو میل سمندر کے اندر کی طرف سفید ستونوں کی ایک قطار تھی جس کے ساتھ ساتھ کشتیاں تیرتی ہوئی ہمارے جہاز کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ پانی اس قدر صاف اور شفاف تھا کہ ہم شارک مچھلیوں کو اپنے گرد چکر کاٹتے دیکھ سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ مچھلیاں ان جہازوں کی آمد و رفت

سے مانوس ہوگئی ہوں اور انہیں یہ انتظار ہو کہ جہاز پر سے کچھ کوڑا کرکٹ پھینکا جائے گا۔

ابن سعود نے فرمان جاری کیا تھا کہ ساحل سمندر پر اترنے والا ہر حاجی سات روپے بطور ٹیکس ادا کرے گا۔ یہ ٹیکس اس سے قبل وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ علی اور میں نے محسوس کیا کہ یہ بالکل انصاف کی بات تھی کہ ٹیکس وصول کیا جاتا۔ ابن سعود نے امسال یہ ذمہ داری خود اٹھائی تھی کہ بدوؤں سے حجاج کو محفوظ رکھے گا۔ حج کے دنوں میں یہ بدو پہاڑوں سے اتر کر آجاتے تھے اور حجاج کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ ان سے مزاحمت کرنا گناہ تصور کیا جاتا تھا کیونکہ ان کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کا شجرۂ نسب آنحضورؐ کی والدہ ماجدہ سے جا ملتا ہے۔ ابن سعود نے اس ظلم کو روکنے کی کوشش کی اور بدوؤں کو منع کیا کہ وہ حجاج کے ساتھ زیادتی نہ کریں نہ انہیں لوٹنے کی کوشش کریں۔ اس نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ حج کے دران انہیں مفت چیزیں فراہم کیا کرے گا۔ اسی لیے امسال حجاج کی تعداد پچھلے برسوں کی نسبت زیادہ تھی۔ ابھی کئی دوسرے جہاز لنگر انداز ہونے والے تھے جو دنیا بھر سے حجاج کو لے کر آئے تھے۔ ہمیں وہ حجاج ملے جو ملایا، جاوا اور افریقا سے لائے گئے تھے۔

میں نے جب اس پر غور کیا تو مجھے یہ احساس ہوا کہ اس ٹیکس کے نفاذ سے ابن سعود کو معقول آمدنی ہوگی اور بدوؤں کے ساتھ کیے جانے والے سودے میں بھی اسے کوئی نقصان نہ تھا۔ سات روپے فی حاجی کے حساب سے کافی رقم بنتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی سلطنت میں کھجور کے ہر درخت پر نصف روپیہ ٹیکس لگا دیا تھا۔ اس کے علاوہ عید قربان کے موقعہ پر لاتعداد جانوروں کی جو کھالیں بحری جہازوں کے ذریعے امریکا بھیجی جاتی تھیں وہ ابن سعود کی ہوتی تھیں۔

یہ قدرتی بات تھی کہ سات روپے کے ٹیکس سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ ہر حاجی بخوشی یہ ٹیکس ادا کر رہا تھا۔ شہر کے دروازے سے ایک بار جب حجاج داخل ہو جاتے تھے تو ایجنٹ حضرات ان کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ یہ ایجنٹ ان حجاج کے لیے کرائے پر رہائش کا انتظام کرتے پھر اونٹ بھی کرائے پر یہی ایجنٹ لے کر دیتے تھے۔ غرض سفر حج کے سارے انتظامات ان ایجنٹوں کی معرفت ہوتے تھے۔

ہم اپنے گروپ کے انچارج کو اپنے پاسپورٹ دے دیتے تھے۔ وہ حج کے اختتام پر یہ پاسپورٹ اپنے پاس رکھتا تھا۔ جو کمرے ہماری رہائش کے لیے کرائے پر لیے جاتے ان میں سے ہر کمرہ میں بیس افراد رہ سکتے تھے۔ ہر شخص کو ایک روپیہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ میں اور علی اس حوالے سے خوش قسمت تھے کہ ہمیں پانچ منزلہ

عمارت کی پانچویں منزل پر ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر ملا تھا۔

ہمیں پانی اور لکڑی خریدنی پڑی تھی۔اس کے علاوہ ہمیں سامان خورد و نوش کا انتظام بھی خود ہی کرنا تھا۔ان دنوں جدہ میں پانی کی بہت قلت تھی۔حجاج کی آمد پر یہاں کی آبادی تین گناہ بڑھ جاتی تھی۔سقے گدھوں پر لاد کر لے جایا کرتے تھے۔پانی کے چار ٹین گدھے کی پیٹھ پر لادے جاتے تھے۔ایک ٹین کا ایک روپیہ ملتا تھا۔اس کے باوجود پانی مشکل سے حاصل ہوتا تھا۔کبھی کبھی تو علی کو پانی کا ایک ٹین حاصل کرنے کے لیے پورا پورا دن لگ جاتا تھا۔

مکہ مکرمہ سے روانگی: دن اڑتے جا رہے تھے۔میرے لیے یہ مناسب وقت تھا کہ ایک بار پھر چل پڑوں۔ہمیں اپنے اونٹ ٹاؤن ہال کے قریب نظر آئے۔مٹی اڑ رہی تھی، چیخنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ایجنٹ اور شتربان سودے بازی میں لگے ہوئے تھے۔

مجھے کبھی کوئی یہ نہ بتائے کہ اونٹ اور شتربان کے درمیان محبت کا رشتہ پایا جاتا ہے۔اُونٹ، شتربانوں، مسافروں اور ہر اُس شے سے نفرت کرتے ہیں جس کا ان سے کوئی واسطہ ہو۔یہ بلبلاتے اور ہر کسی کو اپنے سیاہ دانت دکھاتے ہیں۔میں خود زندگی میں زیادہ برس تک اونٹوں کے درمیان رہی ہوں، میں انہیں پیدائش سے موت تک جانتی ہوں۔یہ جانور تو بنی نوع انسان سے نفرت کرتا ہے۔

ہمارے اونٹوں کے درمیان بوڑھے اور جوان دونوں طرح کے اونٹ تھے، جوان اونٹوں میں سے بہت سے تو اپنے سامان کو آسمان کی طرف اچھال دیتے تھے۔حجاج کی اس کثیر تعداد کے دنوں میں ان اونٹوں کو بھی لاد دیا جاتا تھا جو ابھی لادی نہیں ہوئے تھے اور ان پر سامان نہیں لادا جانا چاہیے تھا۔اگر آپ نے ابھی تک ہزار یا کم و بیش اونٹوں کو لادے جانے والے اوقات میں بلبلاتے نہیں دیکھا تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔

جب ہم اپنے اونٹوں پر سوار ہوئے اس وقت آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ہم فصیل شہر کو عبور کر کے صحرا میں پہنچ گئے تھے۔جب ہم دیوار سے باہر نکل آئے تو تمام جانور روک دیے گئے تھے۔ان پر سے ہر شخص نیچے اُتر رہا تھا... سُرخ ریت اڑا اڑ کر ہماری طرف آ رہی تھی مگر یہ صرف چند منٹوں تک کی بات تھی پھر ہم نماز ادا کرنے کے بعد دوبارہ سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔

ہر اونٹ پر دو حجاج سوار ہوئے۔اس جانور پر دو آدمی بیک وقت رسیوں کے بنے ہوئے بستروں میں بیٹھ سکتے تھے، ایک کوہان کے ایک طرف، دوسرا دوسری طرف۔اونٹ پر سوار ہونا اور اترنا دونوں مشکل کام

ہیں۔

ان دو بستروں کی وجہ سے اونٹوں کو بٹھانا بہت مشکل ہوتا تھا۔ کچھ ایجنٹوں کے پاس تو سیڑھیاں ہوتی تھیں جنہیں لگا کر حجاج اونٹوں پر سے نیچے اتر آتے تھے اور اسی طرح سوار ہوتے تھے۔ عام طور پر اونٹ پر سوار ہونے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک پاؤں اونٹ کی گردن پر رکھ کر چھلانگ کر پیچھے کی طرف جانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ پہلی بار جب میں نے یہ کیا تو اس جانور کی گردن پر میں پہنچی ہی تھی کہ اس نے غصے میں بلبلانا شروع کر دیا تھا۔ پھر اس نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا۔ میں اس قدر ڈر گئی تھی کہ اس کی کوہان تک پہنچ ہی نہ سکی اور زمین پر گر گئی تھی۔ علی نے کہا کہ یقیناً میری چیخ آسٹریلیا میں سنی گئی ہوگی۔

اونٹ کے اوپر بنے ہوئے دونوں بستروں کے اوپر ایک چھت نما سائبان تھا جو پٹ سن کا بنا ہوا تھا۔ اس کا مرکز اونٹ کی گردن کی سیدھ میں آتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عمودی چھڑی لگی ہوئی ہوتی ہے جس کے ساتھ آپ پانی کی بوتل لٹکا سکتے ہیں۔ آپ کا فالتو ساز و سامان آپ کے تکیے کے پیچھے رہتا ہے۔ جب آپ تھک جائیں تو آپ اس میں لیٹ بھی سکتے ہیں۔ گویا یہ آپ کے گھر کی طرح بن جاتا ہے۔ وہ گھر جو اونٹ کی پیٹھ پر ہوتا ہے۔ حجاج کو اونٹ پر سوار کراتے وقت شتربان دونوں جانب کا وزن برابر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے میں اور جینی بیٹی ایک طرف ہوتی تھیں اور علی دوسری طرف۔ اگر دونوں سوار بھاری جسم کے بہت موٹے ہوتے تو ان کے لیے کسی بہت مضبوط اور صحت مند اونٹ کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ البتہ کم وزن رکھنے والے مسافروں کو کسی بھی اونٹ پر بٹھایا جا سکتا تھا۔

اونٹوں کی لمبی قطاریں جب چلتی تھیں تو سانپ کی طرح نظر آتی تھیں جن کی دُم ناک کے ساتھ بندھی ہوئی ہو۔ ایک ایک رسی میں تیس چالیس اونٹ ہوتے تھے۔ دو شتربان ساتھ ساتھ چلتے تھے جن کے ہاتھوں میں نوکدار چھڑیاں ہوتی تھیں۔

جس سرزمین سے ہم گزرتے تھے یہ بے حد ڈراؤنی ہوتی تھی۔ بنجر، چٹیل، بے آب و گیاہ، آتش فشانی، لاوا اگلنے والی زمین، ایک ایسی سرزمین جسے بھوک اور خوف کی سرزمین کہا جا سکتا ہو۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ آج جب وہاں تیل نکل آیا ہے تو لوگ خوشحال ہو گئے ہیں۔ حجاج کے قافلوں کو دیکھتے ہی بھکاریوں کی قطاریں لگ جایا کرتی تھیں اور یہ منظر بڑا تکلیف دہ ہوا کرتا تھا۔ رات بھر اونٹ خاموشی سے چلتے رہے۔ علی اور جینی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ صبح ہونے کو تھی اور خنکی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ اس سرزمین کی خاصیت ہے

کہ دن کے وقت جہاں آپ سورج کی تمازت سے جھلس جاتے ہیں رات وہاں کی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ نماز فجر کے لیے دس منٹ کا وقفہ تھا۔ پھر سفر دوبارہ جاری تھا جو دوپہر تک بلا رکے جاری رہا۔ یہ اچھا لگتا تھا کہ ہم کسی ایسی جگہ پہنچتے تھے جہاں سے جلانے کی لکڑی مل سکتی تھی تا کہ اس پر کھانا پکایا جا سکے۔ مگر سفر کے دوران کئی دن ایسے بھی آتے تھے جن دنوں ہم کچھ بھی نہیں پکاتے تھے۔ بس مٹھی بھر کھجوروں پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔

مکہ مکرمہ میں آمد: ہم جب بھی نخلستان میں پڑاؤ ڈالتے تو مجھے کھجور کے درختوں کے نیچے بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ کبھی کبھی آپ کھجور کے درختوں سے براہ راست کھجوریں خرید سکتے ہیں۔ وہ کھجوریں جن میں سے رس ٹپک رہا ہو اور جو کھانے میں بے حد لذیذ ہوتی ہیں۔ یہ درخت عربوں کے لیے اتنے ہی مفید ہیں جتنے چینیوں کے لیے بانس کے درخت۔ میں نے دیکھا کہ کھجور کی گٹھلیوں کو محفوظ کر کے ان کو پیس لیا جاتا ہے تا کہ اونٹوں کو کھلایا جا سکے۔ عرب اپنے اونٹوں کو گھاس بھی ڈالتے ہیں مگر نہ جانے یہ لوگ گھاس لاتے کہاں سے ہیں کیونکہ میں نے تو سفر کے دوران کہیں گھاس کا تنکا بھی اُگا ہوا نہیں دیکھا۔ تاہم جدہ میں گھاس کے چھوٹے چھوٹے گچھے سبزی کی طرح بکتے ہیں۔

جوں جوں سفر طے ہوتا گیا یہاں کی سرزمین اپنی اجنبیت کھوتی گئی تھی۔ آنکھوں کو یہ سرزمین ضرور نئی اور اجنبی لگتی تھی مگر ذہن کو نہیں۔ میری ٹریننگ چین کے کرسچین مشن میں ہوئی تھی اور میرے ذہن میں عہد نامہ عتیق کی بہت سی کہانیاں تھیں۔ مجھے رفتہ رفتہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں زندگی گزار رہی ہوں۔ ایسا میں نے اس لیے محسوس کیا تھا کیونکہ صحرا میں حضرت ابراہیمؑ کے ایام اب بھی موجود تھے اور ان کا نام ہر طرف تھا۔

یہودی اور عیسائی روایات نے عہد عتیق کے بہت سے مقامات کو انتہائی شمال میں دکھایا ہے مگر جو مقامات ہم دیکھ رہے تھے ان کے پیچھے بھی قدیم روایات موجود تھیں۔ چشم تصور وا کر کے خدا کے کئی پیغمبروں کو اس قدیم سرزمین پر چلتے پھرتے دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک صبح ہمیں وہ مقام دکھایا گیا تھا جہاں سے کھدائی کے دوران حضرت سلیمانؑ کے معبد کا زیادہ سونا برآمد ہوا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ وہاں مزید سونا موجود تھا لیکن کسی کو نکالنے کی جرات اس لیے نہ ہوتی کہ کہیں حملہ آوروں کے لالچ کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ اب ہم ایک سطح مرتفع کے گرد چکر کاٹ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ہمارے دائیں طرف ایک پتھریلی وادی تھی، اجاڑ منظر لیے ہوئے خوفزدہ کر دینے والی اور ممنوعہ سرزمین لیے ہوئے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ وہ مقام تھا جہاں حضرت الیاسؑ کو خدا

پرندوں کی خوراک مہیا کی تھی۔

مجھے نقشے کی مدد سے معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ کا جدہ سے فاصلہ چالیس میل ہے۔ معلوم نہیں یہ فاصلہ اتنا بنتا تھا کیونکہ ہمیں تو مکہ پہنچنے میں یہاں سے دس روز لگ گئے تھے۔ ایک بعد دو پہر اونٹوں کو ایک جگہ بٹھا دیا گیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہم مقدس شہر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ مگر ہم صبح ہونے سے قبل شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ہمارے میز بانوں کی زبانی یہ خبر بادِ صبا کے جھونکوں کی مانند پھیل گئی تھی۔ پھر ایک خاموشی نے تمام حجاج کو کسی گہری سوچ میں ڈال دیا تھا۔ لگتا تھا ہر کسی کا سانس تک رک گیا تھا۔ یہ خاموشی اچانک ''لبیک'' نے توڑ دی تھی۔ مجھے ایسی ہی آواز آئی تھی۔

اس رات مولوی حضرات مومنین کو صبح تک ہدایات دیتے رہے، حجاج نوافل ادا کرتے رہے تھے۔ ہمیں خبردار کیا گیا تھا کہ اس سرزمین مقدس پر نہ لڑنا جھگڑنا ہے نہ کسی کو کوئی نقصان پہنچانا ہے نہ کسی کا بُرا چاہنا ہے۔ ہمیں پاک دل اور پاک عمل کے ساتھ شہر میں داخل ہونا ہے۔ وضو کے وقت کوئی خوشبو یا عطر استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اگر ہم سے یہاں قانون کی خلاف ورزی ہو جائے تو ہمیں ایک اضافی بکرا یا مینڈھا قربان کرنا ہوگا۔ اگر کوئی ہم سے زیادتی کرے تو جواباً ہم نے اس سے نہ زیادتی کرنی ہے نہ بدلہ لینا ہے بلکہ صبر سے کام لینا ہے خواہ اس میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ ہمیں ہر لمحے یہ یاد رکھنا ہوگا کہ ہم جس سرزمین پر ہیں یہ اللہ کی نظر میں مقدس اور حرمت والی ہے۔ میں تو نصف شب کو سو گئی تھی مگر جب صبح آنکھ کھلی تو علی جائے نماز پر بیٹھے اپنے اللہ سے ہمکلام تھے۔

ہم میں سے زیادہ تر ہندوستانی حجاج بہت بوڑھے تھے، کچھ اُن میں ایسے بھی تھے جو صرف عصا یا لاٹھی کے سہارے چل سکتے تھے۔ ہمیں علم تھا کہ ہم میں سے سینکڑوں ایسے ہیں جو وطن واپس لوٹ کر نہیں جائیں گے اور ان میں سے بہت سے تو خود بھی واپس جانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی واحد آرزو یہ تھی کہ انہیں اس سرزمین پر موت آ جائے اور اسی خاک میں، خاکِ شہر مقدس میں دفن ہو جائیں۔ بہت سے اتنے کمزور تھے کہ بمشکل چل پھر سکتے تھے، کھانستے تھے تو لگتا تھا ان کے پھیپھڑے جواب دے گئے ہیں۔ ان کی یہ آرزو ان کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر ہوتی تھی، ایک انجانی خوشی سے سرشار یہ لوگ اپنے مالک وخالق سے اپنے گناہوں کی معافی کے خواستگار تھے۔ یوں مکہ مکرمہ کا قریب آ جانا ان کے سفر کی آخری منزل نہ تھا۔ ابھی چھ مذہبی رسوم کی ادائیگی باقی تھی جو مکہ پہنچنے کے بعد شروع ہونے والی تھیں جوان کو حاجی کی سبز پگڑی باندھنے کا حقدار بنانے

والی تھیں۔ گویا مقامِ عروج کے آنے میں ابھی کچھ ہفتے باقی تھے۔

نمازِ فجر کے بعد، روزے کے دوران (کیونکہ یہ رمضان کا مہینہ تھا) ہم اپنے اونٹوں پر دوبارہ سوار
ہوگئے تھے۔ سورج طلوع ہو چکا تھا اور ہم ایک پہاڑی ڈھلوان سے نیچے اتر رہے تھے۔ اس طرح جیسے کوئی
طاس یا حوض میں اُترا جاتا ہے۔ چاروں طرف پہاڑ تھے...... پھر جب سُورج نکل آیا تو ہم نے نیچے، نشیب
میں شہر دیکھا...... یہ شہر مکہ تھا ہماری اُمیدوں اور آرزوؤں کی منزل...... ہمارے اُس سہانے خواب کی تعبیر جو
ہم نے برسوں دیکھا تھا...... اب مسجد حرام بھی سامنے تھی۔ مکہ مکرمہ کے مکانات پہاڑوں کے اوپر کافی اونچائی
پر نظر آرہے تھے...... خانہ کعبہ اب ہماری نظر کے سامنے تھا۔ پانچ مینار مع اپنے پیاری شکل کے گنبدوں کے اور
چاہِ زم زم پر بنا ہوا سنہری گنبد سامنے تھا۔

☆☆☆

16۔ مُحمد اَسد......شمال مغربی اسپین 1927ء

محمد اسد ایک ایسے سیاح تھے جن میں روحانی توانائی بہت زیادہ تھی۔ ان کے سفرنامے، کتابیں اور سفارتی خدمات 70 برس کے طویل عرصے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ 1900ء میں لوو میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد فقیہہ اور قانون دان تھے لیکن اسد نے تاریخ اور فلسفے کا مطالعہ کیا۔ پھر برلن میں وہ فنکاروں اور دانشوروں کے ایک حلقے میں شامل ہو گئے تھے۔ 1921ء میں انہوں نے یونائیٹڈ ٹیلی گراف نیوز ایجنسی کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور یروشلم چلے گئے تھے جہاں وہ فرینکفرٹر زیتنگ کے خصوصی نامہ نگار رہے۔ وہ بے حد مقبول خبری کہانیاں اپنے وطن بھیجتے رہے جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئیں''۔ کتاب کا نام تھا ''غیر رومانویت بھرا مشرق''۔ اسد شام، عراق، ایران، افغانستان اور ایشیا کے طویل سفر کے بعد 1926ء میں جرمنی واپس چلے گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر 26 برس تھی اور وہ ایک معروف صحافی کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔

'جو اقتباسات ہم اس کتاب میں شامل کرنے والے ہیں یہ ان کی 1954ء کی یادداشتوں میں سے منتخب کیے گئے ہیں جو ''دی روڈ ٹو مکہ'' کے نام سے شائع ہوئی تھیں۔ ان میں ایسے تین مرکزی واقعات شامل ہیں جو انہیں واپسی کے بعد پیش آئے تھے۔ ان کی شادی ایک جرمن مصورہ ایلسا ویس سے ہوئی اور یہ دونوں برلن میں مُشرف بہ اسلام ہوئے۔ پھر یہ میاں بیوی دونوں حج کی ادائیگی کے لیے مکے گئے تھے۔ قاری دیکھے گا کہ حجاز میں اپنی پہلی بیوی کی جواں مرگ نے اسد کے خطِ پرواز کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا تھا۔ وہ کئی برس تک مغرب کو واپس نہ آ سکے تھے۔

''دی روڈ ٹو مکہ'' کا شمار اچھے سفرناموں میں ہوتا ہے مگر یہ اپنے اصطلاحی معنوں میں سفرنامہ نہیں ہے۔ یہ ایک یورپی یہودی کی اسلام لانے کی داستان ہے جس میں اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ کس طرح رفتہ رفتہ اور بجلتی سے زیادہ تر ایک نفسیاتی منطقی عمل کے ذریعے دائرۂ اسلام اور اسلامی کلچر میں داخل ہو گیا تھا۔ جیسا کہ

اس کتاب کا عنوان بتاتا ہے۔ یہ کتاب حج کو اس کے سفر کی علامت کے طور پر لیتی ہے۔ گو کہیں کہیں اس کتاب کی تمثیل انگیزی خطیبانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے مگر مجموعی طور پر یہ کتاب کامیاب ہو جاتی ہے مگر اس کے چند ایک اقتباسات اسے قارئین تک مطلوبہ حد تک نہ پہنچا سکیں گے۔ پوری اسلامی دنیا میں یہ کتاب پسندیدگی سے پڑھی جاتی ہے۔

اسد کے اسلام لانے کا ایک سبب مغرب کے لیے اس کا عدم اطمینان تھا۔ وہ ایک جویا، متلاشی اور فرائڈ کا طالب علم تھا اور زندگی کو عقلی اور روحانی طور پر یکجا دیکھنے کا جدیدیت پسند انسان تھا۔ اسلام نے اسے ایک نظریاتی مرکز فراہم کیا تھا اور اس کے پاس اب سفر کرنے کا معقول جواز بھی موجود تھا۔ یہ اسے مطلق العنانی اور بڑھتی ہوئی اُس عدم صیہونیت کے مقابلے میں ایک متبادل نظریہ فراہم کرتا تھا جو اس وقت یورپ کو بہائے لے جا رہی تھی۔ عرب بطور خاص اسد کو اچھا لگتا تھا اور عربی اسے پسند کرتے تھے۔ ابن سعود نے خود اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ بلاشبہ بادشاہ وقت کو ایک ایسے انسان میں افادیت نظر آئی تھی جو عربی بھی بولتا تھا اور یورپ کی دوسری زبانیں بھی، ایک ایسا شخص بادشاہ کے دوستوں میں تھا۔ اسد نے بعد میں ابن سعود پر مضامین بھی لکھے جو جرمن پریس کو بھیجے جاتے تھے۔ وہ ایک بار ایک خفیہ سعودی مشن پر کویت بھی گیا تھا۔ مگر ابن سعود کی نظر میں وہ معتبر اور محترم اس لیے تھا کہ یہ بادشاہ کے معتمدین میں شامل تھا۔ جیسا کہ فلبی (اور بہت سے دوسروں) کے ساتھ بعد میں ہوا ہمیں یہاں ایک ایسا حکمران ملتا ہے جس کے گرد کم عقل و شعور والے لوگ جمع تھے اور وہ اپنی تنہائی سے نکل کر اجنبیوں میں پہنچ گیا تھا۔ اگر اسد کی بادشاہ کے لیے کوئی سیاسی قدر و قیمت تھی تو یہ ہمیشہ ایک راز رہی۔

اسد سعودی عرب میں چھ برس تک مقیم رہا، وہ سلطنت کے کونے کونے میں جاتا تھا اور صحرا سے اپنی محبت کے جذبے کی تسکین حاصل کرتا تھا۔ وہاں سے اس نے مشرق کا سفر جاری رکھا۔ اسلامی دنیا کے بارے میں جو یہ تصور تھا کہ یہ ایک باہمی رابطے کا خطہ ہے اور مکہ اس میں ایک چوراہے کی حیثیت رکھتا ہے وہ چودھویں صدی میں مرا نہیں ہے۔ اسد کی کتاب کے اوراق میں شروع سے آخر تک سفر اور پیشہ ورانہ زندگی کو اس طرح باہم جوڑ دیا گیا ہے جس سے ابن بطوطہ کی یاد بطور سیاح کے تازہ ہو جاتی ہے۔ چین جاتے ہوئے اسد ہندوستان میں ٹھہرے تھے جہاں اس کی آسٹریائی شہریت کی وجہ سے اسے دوسری جنگ عظیم کے قیدیوں کے ایک کیمپ میں حکومت ہندوستان کے ایک ایسے مہمان کے طور پر لے گئے تھے جو اپنی مرضی سے وہاں نہیں جانا

چاہتا تھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد اسد کو فلسفی محمد اقبال نے پاکستانی قوم کے لیے بنیادی کام کرنے میں مدد کے لیے دعوت دی تھی۔ پھر 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد وہ نئی حکومت کی خدمت کے لیے مشرق وسطی ڈویژن کے سربراہ کی حیثیت سے چلے گئے تھے۔ انہوں نے دوسری شادی 1952ء میں بوسٹن کی پولا اسد سے کی تھی۔ اس خاتون نے بہت سی کتابیں لکھنے اور شائع کرانے میں اپنے شوہر کی مدد کی۔ ان ساری باتوں کا تذکرہ ''دی روڈ ٹو مکہ'' میں ہے جو انگریزی میں لکھی گئی اور 1954ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچی تھی۔

ایک آپ بیتی کے علاوہ اسد نے اسلامی حکومت کے اصول اور اسلامی قانون پر کتب لکھیں اس کے نظریات کٹر مذہبی عقائد سے آزاد روایت کے گہرے علم پر مبنی تھے۔ وہ مسلم خواتین کے حقوق کے علمبردار تھے (ان کے اصرار پر پاکستان کا آئین ایک عورت کو وزیراعظم کا انتخاب لڑنے کی اجازت دیتا ہے) انہوں نے اپنے مضامین میں جو شرعی نظام قانون پر تھے عدل و انصاف میں تاخیر کو سمجھنے کے لیے دلائل پیش کیے تھے۔ 1980ء کی دہائی میں چند انتہا پسندوں سے ان بن کی وجہ سے اور ایرانی انقلاب کے پھیلتے ہوئے اثرات پر تشویش کی بنا پر انہیں یہ ملک چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ وہ پہلے پرتگال پھر اسپین چلے گئے جہاں اسد خود ساختہ جلاوطنی میں، جو اسلامی دنیا سے تھی، زندگی گزارتے رہے اور 22۔ فروری 1992ء کو انتقال فرما گئے تھے۔ انہیں غرناطہ کے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔

☆☆☆

مکے کا راستہ (دی روڈ ٹو مکہ)...........از محمد اسد [اقتباسات]

ایک کہانی کی کہانی: اس کتاب میں جو کہانی میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں وہ کسی ایسے انسان کی آپ بیتی نہیں جو سرکاری امور میں اپنے کردار کی وجہ سے مشہور ہوا۔ یہ کسی مہم کی روداد بھی نہیں، اس لیے کہ میں نے بہت سی مہمات کی تفصیلات بھی پڑھی ہیں، جو وہی کچھ بتاتی تھیں جو میرے اپنے اندر وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ یہ دین و ایمان کی تلاش میں کی گئی کسی شعوری کوشش کی کہانی بھی نہیں ہے۔ ... اس لیے کہ یہ عقیدہ و ایمان تو کئی برس تک اس تلاش کرنے کی میری کوشش کے بغیر میرے ساتھ ساتھ رہا۔ میری کہانی تو صرف ایک یورپی کے اسلام کی دریافت کی کہانی ہے۔ یہ ایک کہانی ہے اس کے مسلم برادری کا حصہ بن جانے کی اور بس۔

مجھے یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ میں اسے لکھ ڈالوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ میری زندگی سے سوائے میرے کسی دوسرے کو بھی کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب مغرب سے 25 برس دور رہنے کے بعد، میں پیرس آیا، پھر 1952ء میں نیویارک گیا تو مجھے اپنا یہ خیال تبدیل کرنا پڑا۔ میں جن دنوں اقوام متحدہ میں پاکستان کے وزیر، اختیارات کُل کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، ان دنوں میں لوگوں کی نظر میں تھا اور میرے بہت سے یورپی اور امریکی دوستوں کے علاوہ کئی شناساؤں کو میرے بارے میں بڑا تجسس تھا۔ پہلے تو لوگ یہ سمجھے کہ ایک ''یورپی ماہر'' کو ایک مشرقی حکومت نے ایک خاص مقصد کے لیے ملازمت دے رکھی ہے اور میں نے اپنے آپ کو اس قوم کے طور طریقوں کے مطابق ڈھال لیا ہے جس نے مجھے ملازمت دے رکھی تھی مگر جب اقوام متحدہ میں میری کارکردگی نے ان کے تمام اندازے غلط ثابت کر دیے اور انہوں نے دیکھا کہ میں مسلم دنیا کے سیاسی اور ثقافتی مقاصد کو پورا کرنے کا فریضہ انجام نہیں دے رہا تو یہ بہت حیران و پریشان ہو گئے تھے۔ اب لوگوں نے مجھ سے میرے سابقہ تجربات کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں معلوم ہوا کہ میں نے ابتدائی زندگی میں یورپی اخبارات میں ایک غیر ملکی نامہ نگار کی

حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ پھر میں نے مشرقِ وسطیٰ کے تمام ملکوں کا سفر کیا اور 1926ء میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد میں 6 برس تک سعودی عرب میں مقیم رہا اور ابن سعود سے میری دوستی رہی۔ اس کے بعد میں ہندوستان گیا جہاں میری ملاقات عظیم مسلم شاعر اور فلسفی اور تصورِ پاکستان کے روحانی باپ محمد اقبال سے ہوئی۔ انہوں نے ہی مجھے مشرقی پاکستان، چین اور انڈونیشیا کے سفر کے ارادوں سے باز رکھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ہندوستان میں رہ کر مستقبل کی اسلامی ریاست کے قیام کی کوششوں میں مددگار ثابت ہوں جو اس وقت صرف ایک خواب کی صورت میں اقبال کے دل و دماغ کا حصہ تھی۔ مجھے اور محمد اقبال کو یہ یقین تھا کہ ہندوستان میں ایک نوزائیدہ آزاد اسلامی ریاست کا قیام ہی اسلام کے مستقبل کی توقعات کو پورا کر سکتا ہے۔ اس اسلامی ریاست کا ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے نقشہ عالم پر ابھرنا لازمی تھا ... میں نے کئی برس تک اپنے آپ کو اس کام میں مصروف رکھا، مطالعہ کرتا رہا، لکھتا رہا، لیکچر دیتا رہا اور پھر ایک وقت ایسا آیا جب میں اسلامی قانون اور ثقافت کے ترجمان کے طور پر شہرت حاصل کر چکا تھا۔ جب 1947ء میں پاکستان وجود میں آ گیا تو مجھے حکومت پاکستان کی طرف سے بلا بھیجا گیا کہ میں پاکستان جا کر اسلامی تعمیرِ نو کا محکمہ تشکیل دے کر اس ضمن میں مزید کام کروں۔ مجھے ریاست کے نظریاتی، اسلامی تصورات کی تفصیلات فراہم کر کے ایک نوزائیدہ سیاسی سلطنت کی مدد کرنی تھی۔ اس سرگرمی میں مجھے دو سال لگ گئے تھے اور میں نے ایک خاکہ تیار کر کے حکومت پاکستان کے حوالے کر دیا تھا۔ اب میرا تقرر مشرقِ وسطیٰ ڈویژن کے سربراہ کی حیثیت سے کر دیا گیا تھا جو وزارت امورِ خارجہ کے ماتحت تھا۔ میں نے اپنی اس حیثیت میں پاکستان اور اسلامی دنیا کے درمیان تعلقات کو مضبوط بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران مجھے نیویارک میں اقوامِ متحدہ کے لیے پاکستان مشن میں تعینات کر کے بھیج دیا گیا تھا۔

مجھے ایک خاص ثقافتی ماحول سے ایک دوسرے ماحول میں بھیج دیا گیا تھا جو اس سے بالکل مختلف تھا۔ میرے بہت سے مغربی دوستوں کو یہ بہت عجیب محسوس ہوا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایک ایسا انسان جس کی پیدائش مغرب میں ہوئی جو مغرب ہی میں پلا بڑھا ہو وہ بغیر ذہنی تحفظات کے کسی طرح مسلم دنیا میں اپنی شناخت کرا چکا تھا۔ اس نے اپنے مغربی ثقافتی ورثے کو اسلام کے ثقافتی ورثے کے ساتھ کیسے بدل لیا تھا۔ کس بات نے اسے ایک مذہبی اور سماجی نظریے کو قبول کرنے پر آمادہ کیا ہوگا جسے ان کے خیال میں تمام یورپی نظریات کے مقابلے میں وسیع پیمانے پر کمتر سمجھا جاتا تھا۔

مغرب کو واپسی ۔ 1926ء: یہ 1926ء کی بات ہے، موسم سرما ختم ہو رہا تھا اور میں وطن واپسی کے لیے سفر پر ہرات (افغانستان) سے روانہ ہو رہا تھا۔ مجھے افغانستان کی سرحد سے بذریعہ ریل مارو جانا تھا جو روسی ترکستان میں واقع تھا۔ پھر مجھے سمرقند، بخارا اور تاشقند سے گزر کر ترکمان کے دشت سے یورال اور ماسکو پہنچنا تھا۔

میں نے مارو کے ریلوے اسٹیشن پر جو کچھ دیکھا یہ روس کے بارے میں میرا پہلا اور آخری تصور تھا میں نے دیکھا ایک بہت بڑی خوبصورت تصویر پوسٹر کی شکل میں آویزاں ہے جس میں ایک نوجوان پرولتاری کو نیلے اوورکوٹ میں، سفید ڈاڑھی والے ایک مضحکہ خیز شخص کے جوتے پالش کرتے دکھایا گیا تھا۔ یہ بارلیش شخص سفید چغہ پہنے ہوئے تھا۔ اس پوسٹر کے نیچے یہ رُوسی روایت لکھی ہوئی تھی: خدا کو روس کے مزدوروں نے یوں اس کی جنت سے ٹھوکر مار کر نکال دیا ہے! جاری کردہ بزبوزنکی (بے دین) ایسوسی ایشن آف دی یونین آف سوویٹ سوشلسٹ ریپبلک۔

یہاں آپ جس طرف بھی جائیں اسی قسم کا سرکاری پروپیگنڈا مذہب کے خلاف آپ کو دیکھنے کو ملے گا۔ عوامی عمارتوں، گلی کوچوں اور بطور خاص ایسے گھروں پر مشتمل علاقے میں جہاں عبادت خانے ہیں، اس قسم کا پروپیگنڈا زیادہ کیا جاتا ہے۔ ترکستان میں قدرتی بات تھی کہ ایسا اس حصے میں کیا جاتا تھا جہاں مساجد تھیں۔ ابھی نماز پر پابندی کُھل کر نہیں لگائی گئی تھی۔ مگر لوگوں کو مسجدوں میں جانے سے روکا جاتا تھا۔ مجھے بخارا اور تاشقند میں یہ بات بطور خاص معلوم ہوئی کہ مسجد میں داخل ہونے والے ہر نمازی کا نام خفیہ پولیس نوٹ کر لیتی تھی۔ قرآن حکیم کے نسخے ضبط کر کے ضائع کر دیے جاتے تھے۔ بزبوزنکی مُلحد ایسوسی ایشن کا من پسند مشغلہ یہ تھا کہ وہ سُور کے سر مساجد میں پھینک دیتی تھی اور اپنی اس حرکت پر اسے بڑی خوشی ہوتی تھی۔

میں ایشیائی اور یورپی روس سے گزرتا ہوا کئی ہفتوں بعد پولینڈ کی سرحد عبور کر گیا تھا۔ میں سیدھا فرینکفرٹ گیا اور اپنے اخبار کے دفتر حاضری دی۔ مجھے جلد ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ چلے جانے کے بعد میری عدم موجودگی میں میرا نام بہت مشہور ہو گیا تھا۔ مجھے اب وسطی یورپ کا ممتاز غیر ملکی نامہ نگار سمجھا جاتا تھا۔ میرے چند مضامین جو ایرانیوں کی پیچیدہ مذہبی نفسیات پر لکھے گئے تھے مشہور مشرقی سکالرز نے بے حد پسند کیے تھے۔ مجھے اپنی اس کامیابی پر برلن کی اکادمی برائے جیوپالیٹکس میں کئی لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔

یہاں مجھے بتایا گیا تھا کہ اس سے قبل ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میری عمر (میں ابھی 26 برس کا ہوا تھا) کے کسی مقرر کو اس قدر امتیازی حیثیت حاصل ہوئی ہو۔ میرے دوسرے مضامین جو عام دلچسپی کے تھے کئی اخبارات میں دوبارہ شائع کیے جا رہے تھے۔ میرا ایک مضمون میری اطلاع کے مطابق تین بار شائع کیا گیا تھا۔ مجھے ایران کی سیر و سیاحت نے بہت فائدہ پہنچایا تھا۔

برلن۔ 1926ء: یہ وہ زمانہ تھا جب میری شادی ایلسا سے ہوئی تھی۔ میری یورپ سے دو سال کی دوری نے ہماری محبت میں کمی نہیں آنے دی تھی بلکہ اس میں تو اس دوری نے اضافہ کر دیا تھا اور مجھے یہ محسوس کر کے خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے اپنی اور ایلسا کی عمر میں تفاوت کے خیال کو ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دیا تھا۔

ایلسا نے مجھ سے پوچھا: ''آپ مجھ سے کیسے شادی کریں گے، آپ ابھی بمشکل 26 برس کے ہوئے ہیں اور میری عمر چالیس سے کچھ اوپر ہو گئی ہے۔ میں تو ایک بوڑھی عورت ہوں؟''

میں نے ہنس کر جواب دیا: ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں آنے والے وقت میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا''۔ وہ بالآخر رضامند ہو گئی تھی۔

میں نے قطعاً مبالغہ سے کام نہیں لیا تھا جب میں نے ایلسا سے یہ کہا تھا کہ میں مستقبل میں اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ جسمانی طور پر تو خوبصورت تھی ہی اس کی وجدانی اور فطری دلکشی نے اسے اس قدر حسین بنا دیا تھا کہ میں کسی اور عورت کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں زندگی میں کس شے کا خواہاں تھا، اسے کیسے بسر کرنا چاہتا تھا، وہ اس سے باخبر تھی اس نے میری امیدوں اور توقعات کو اور روشن کر دیا تھا اور مجھے ان کے حصول میں تقویت بخشی تھی۔ میں اکیلا شاید اپنی توقعات کو پورا کرنے میں کامیاب نہ ہوتا اگر ایلسا میری زندگی میں داخل نہ ہو گئی ہوتی۔

ہماری شادی کو تقریباً ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک دن اس نے کہا: ''یہ کتنی عجیب بات لگتی ہے کہ آپ مذہب میں تصوف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے حالانکہ آپ خود ایک صوفی ہیں ایک ایسا حواسی صوفی جو اپنے اردگرد کی زندگی تک سرانگشت سے پہنچ رہا ہے، جسے روزمرہ کی چیزوں میں متصوفانہ نمونے ملتے ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں لوگ آپ کی طرح محسوس نہیں کرتے مگر جس لمحے آپ مذہب کی جانب مڑتے ہیں آپ سراپا عقل بن جاتے ہیں۔ بہت سے دوسرے لوگ اس کے بالکل برعکس کرتے ہیں....''

ہم قرآن پاک کی تلاوت اکثر ایک ساتھ بیٹھ کر کرتے تھے۔اس میں دی گئی تعلیمات پر تبادلہ خیالات ہوتا تھا۔ایلسا میری طرح قرآن کی اخلاقی تعلیم اور اس کی عملی رہنمائی کے درمیان ایک اندرونی ربط سے بہت متاثر تھی۔قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو اللہ نے انسان کو اندھی تقلید کا حکم نہیں دیا بلکہ سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی تلقین کی ہے۔وہ انسان کی تقدیر سے دور نہیں کھڑا ہوا بلکہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے۔اس نے عقیدے اور سماجی رویے میں کوئی خط فاصل نہیں کھینچ دیا۔سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اس مُسلمہ حقیقت سے بات شروع نہیں کرتا کہ زندگی مادہ و روح کے درمیان پائے جانے والے تصادم کے بوجھ تلے دب گئی ہے۔روشنی تک جانے والا راستہ روح کو جسم کی زنجیروں سے آزاد کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نفس کشی کو ناپسند فرمایا ہے۔آپؐ نے واضح کر دیا تھا کہ اسلام میں ترک دنیا کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔انسان کی زندہ رہنے کی خواہش کے ساتھ ساتھ کچھ اخلاقی پابندیاں بھی اس پر عائد کر دی گئی ہیں۔زندگی کس طرح گزارنی ہے،اس طرح نہیں جیسے کوئی انسان خود چاہے بلکہ اس طرح جیسے اسے گزارنی چاہیے اور وہ رہنما اصولِ حیات قرآن اور قرآن ناطق کے اسوۂ حسنہ سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

اسلام کی ایک حتمی شکل میرے سامنے آ رہی تھی اور اب ایک فیصلہ کن مرحلہ کبھی کبھی مجھے دم بخود کر دیتا تھا۔ایک طرح کا ذہنی انجذاب تھا جو ایک خاص عمل سے گزر کر میرے اندر سرایت کر رہا تھا۔اس میں میری کوئی شعوری کوشش شامل نہ تھی۔پچھلے چار برسوں میں جو کچھ دوران مطالعہ مجھ تک پہنچا تھا اب وہ ایک خاص شکل میں ڈھل چکا تھا۔مجھے اپنے سامنے فن تعمیر کا ایک شاہکار دکھائی دیا جس کے تمام حصے بڑی مہارت سے یکجا کیے گئے تھے اور یہ ایک دوسرے کو سہارا دیے ہوئے تھے۔نہ اس میں کسی شے کی زیادتی تھی نہ کمی......ایک توازن کے ساتھ ہر شے اپنی اپنی جگہ موجود تھی اور یہی میری نظر میں اسلام کی ایک جامع اور حسین شکل تھی۔

مدینہ طیبہ۔1932ء:مسجد نبوی میں اس وقت روشنی کے لیے چراغ جلا دیے گئے تھے۔یہ محرابوں کے ستونوں پر رکھے ہوئے ہیں۔شیخ عبداللہ ابن بُولد سر سینے پر جھکائے،آنکھیں بند کیے بیٹھا ہے۔جو اسے نہیں جانتا یہی سمجھتا ہے کہ وہ سویا ہوا ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ پورے انہماک سے مجھے سن رہا ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ وہ اسے اپنے وسیع تجربے میں کہیں فٹ کر لے جو انسانوں اور انسانی قلوب سے متعلق

اسے حاصل ہے۔ کافی دیر بعد وہ اپنی آنکھیں کھول دیتا ہے اور سر اُوپر اٹھاتا ہے۔ اس نے مجھ سے سوال کیا:
''اور پھر کیا ہوا؟ تم نے پھر کیا کیا؟''۔

''یا شیخ! میں نے اپنے ایک مسلمان دوست کو تلاش کیا جو ہندوستان سے تھا اور برلن میں مسلم برادری کا سربراہ تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ میری طرف پھیلایا تو میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ دو گواہوں کی موجودگی میں میں نے یہ اعلان کیا کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ چند ہفتوں بعد میری بیوی نے بھی اسی طرح کیا''۔

''اور تمہارے لوگوں نے اس بارے میں کیا کیا''۔

''انہوں نے اسے پسند نہیں کیا تھا۔ میں نے جب اپنے والد کو بذریعہ خط بتایا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں تو انہوں نے میرے خط کا جواب دینا بھی گوارا نہ کیا۔ کچھ دنوں بعد میری بہن کا مجھے خط آیا جس میں لکھا تھا کہ میرے والد نے کہا ہے کہ میں ان کے لیے مر گیا ہوں۔ میں نے ایک دوسرا خط انہیں ارسال کیا کہ میرے اسلام لانے کے باوجود میرے لیے ان کا احترام اور ان کی محبت اتنی ہی رہے گی جتنی پہلی تھی۔ میں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے انہیں لکھا کہ اسلام میں تو والدین کے احترام اور ان سے محبت کی تلقین زیادہ کی گئی ہے مگر اس بار بھی کوئی جواب نہ آیا''۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے والد اپنے مذہب کے معاملے میں بہت پختہ عقیدہ رکھتے ہیں''۔

''نہیں یا شیخ! یہ بات نہیں ہے۔ یہی تو اس کہانی کا عجیب ترین حصہ ہے۔ وہ مجھے خارج از مذہب تصور کرتے ہیں اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ یہ ان کے نزدیک کوئی اہم مذہبی معاملہ ہے (اس لیے کہ وہ خود بھی کبھی کٹر مذہب پرست نہیں رہے) بلکہ وہ مجھے اس برادری کا غدار سمجھتے ہیں جس میں میری پرورش ہوئی، اس کلچر سے ان کے نزدیک میری غداری ہے جس سے میں اتنا عرصہ منسلک رہا''۔

''کیا اس وقت سے آج تک تم ان سے نہیں ملے''؟

''جی نہیں ملا کیونکہ حلقہ بگوش اسلام ہونے کے فوراً بعد میں اور میری بیوی یورپ سے چلے آئے تھے۔ اب ہمارا وہاں رہنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہا تھا اور پھر میں اس کے بعد وہاں کبھی واپس گیا بھی نہیں

ہوں''۔ (میرے اپنے والد کے ساتھ تعلقات 1935ء میں بحال ہو گئے تھے جب انہیں یقین ہوگیا تھا کہ میں مسلمان کیوں ہوا تھا مگر ہم ایک دوسرے سے ملے کبھی نہیں تھے صرف خط وکتابت کا سلسلہ ہمارے درمیان جاری رہا۔ پھر 1942ء میں انہیں اور میری بہن کو نازیوں نے ویانا سے نکال دیا تھا اور بعد میں قیدیوں کے کیمپ میں وفات پا گئے تھے)

لبیک اللھم لبیک: ''میں نے اپنے پانچ حجوں کے درمیان یہ آواز بہت دفعہ سنی۔ لگتا ہے جیسے میں اسے آج بھی سن رہا ہوں۔ یہ آواز ان سمندری لہروں کی مانند، جو جہاز سے ٹکراتی رہتی ہیں، میرے دل کی گہرائیوں میں ٹکراتی رہتی ہے، یہ آواز انجن سے نکلنے والی آواز سے ملتی جلتی ہے اور میں ان دونوں آوازوں سے خوب مانوس ہوں۔ میں جب ''لبیک اللھم لبیک'' کی آواز سنتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے سینکڑوں جہازوں سے یہ آواز گونج رہی ہے بالکل اسی طرح جیسے یہ اس وقت اس جہاز میں گونجی تھی جس سے میں پہلی بار حج کے لیے بحیرہ احمر کے ذریعے مصر سے مکہ آ رہا تھا۔ ایسا کیوں ہے اس کا جواب شاید کسی کے پاس بھی نہ ہو۔ جب ہم خلیج سوئز سے چلے تھے تو پانی کا رنگ بھورا تھا۔ دائیں جانب براعظم افریقہ کے پہاڑ تھے اور بائیں طرف جزیرہ نما سنائی کے...... دونوں درختوں اور سبزے سے محروم چٹیل...... جوں جوں ہم فاصلہ طے کر رہے تھے یہ دور سے دور تر ہوتے جا رہے تھے۔ پھر یہ دھند میں ایسے چھپے تھے کہ پھر نظر نہ آئے۔ بعد دوپہر ہم جب کھلے بحیرۂ احمر میں نکلے تو تند ہواؤں اور بحیرۂ روم کے نیلے پانی جیسے سمندر میں سفر کر رہے تھے۔

اس جہاز میں صرف حجاج کرام تھے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ جہاز بمشکل ان کا وزن اٹھائے جا رہا تھا۔ دراصل بحری جہازوں کی کمپنیاں موسم حج میں حجاج کو زیادہ سے زیادہ ان جہازوں میں لاد کر روپیہ کمانے کے لالچ کا شکار رہتی تھیں۔ مسافروں کے آرام کا خیال کیے بغیر ان جہازوں میں حجاج کو اس طرح سوار کرایا جاتا تھا جیسے یہ انسان نہیں بے جان سامان ہو۔ عرشوں پر، کیبنوں کے اندر، غلام گردشوں میں، سامان کے رکھے جانے والے حصوں میں غرض ہر خالی جگہ میں مسافروں کو ٹھونس دیا گیا تھا۔ ان مسافروں میں زیادہ تعداد ان حجاج کی تھی جو مصر اور شمالی افریقہ سے تھے۔ سفر بے حد تکلیف دہ تھا مگر منزل کو نظروں کے سامنے رکھ کر یہ لوگ ساری تکلیفیں برداشت کر رہے تھے اور زبان پر حرف شکایت بھی نہ لاتے تھے۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کے گروپ مختصر سی جگہ میں سمائے ہوئے تھے۔ کھانا کمپنی مہیا کرتی تھی، کھانا رکھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ پانی

پانی کے کنستروں میں ملتا تھا۔ پانی کے نلوں کے گرد دن میں پانچ بار بہت ہجوم رہتا تھا۔ نل کم تھے اور لوگوں کی تعداد ان گنت۔ یہ لوگ یہاں نماز کے لیے وضو کرنے جمع ہوتے تھے۔ عرشے سے دو منزلیں نیچے مسافر اس جگہ رکھے جاتے تھے جو جگہ مسافروں کے سامان کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ ایمان وعقیدہ کی گرمی تھی کہ مسافروں نے یہ ساری صعوبتیں برداشت کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ مکہ مکرمہ کا تصور ان کی ساری مشکلات، تمام تکالیف سفر پر حاوی تھا۔ ذکر کرتے تو صرف حج کا اور بات کرتے تو مکہ مکرمہ کی جس سے ان کے چہرے خوشی و مسرت سے دمک اٹھتے تھے۔ عورتیں مل کر اکثر مکے کے گیت گاتی تھیں...... بار بار "لبیک اللھم لبیک" کے الفاظ دہرائے جا رہے تھے۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت جہاز کا سائرن بجا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ہم جدہ کے شمال میں ایک چھوٹی سی بندرگاہ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں قدیم روایت کے مطابق شمال سے آنے والے حجاج روزمرہ کے لباس اتار کر احرام باندھ لیتے ہیں جو دو ان سلی چادروں کو اس طرح جسم کے گرد لپیٹا جاتا ہے کہ اُوپر والے حصے کی چادر میں کندھے ننگے رہیں۔ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ آنحضورؐ کا فرمان تھا کہ یہ حج کا لباس اس لیے ضروری ہے تا کہ دنیا کے مختلف ممالک سے آنے والے مختلف طبقوں کے لوگوں کے لباس میں یکسانیت ہوتا کہ وہ یہ محسوس کریں کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اللہ کی نظر میں ایک جیسے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے جہاز کے اندر مردوں کے رنگ برنگے لباس کی جگہ سفید ایک جیسے لباس نے لے لی تھی۔ تونیشیا، مراکش، مصر سبھی جگہ کے حجاج نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ آپ کو اپنے اردگرد سوائے سفید سوتی احرام کے کوئی دوسرا رنگ نظر آتا تھا۔ مگر اس سادگی لباس میں ایک وقار تھا۔ ایک شان تھی جسے حجاج ہی محسوس کر سکتے تھے۔ عورتوں کے لیے البتہ یہ احرام ضروری نہیں کیونکہ انہیں پورا جسم ڈھانپ کر رکھنے کا حکم ملا ہے وہ اپنے سادہ سے زنانہ لباس میں ہی مناسک حج ادا کرتی ہیں۔

تیسرے روز صبح کے وقت ہمارے جہاز نے عرب کے ساحل پر لنگر ڈال دیا تھا۔ ہم میں سے زیادہ تر عرشے پر کھڑے اس سرزمین کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جو صبح کے دھندلکوں میں سے آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔

چاروں طرف دوسرے حج جہازوں کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ دور مشرقی سمت کوئی مجھے پہاڑی جیسی نظر آئی جو رفتہ رفتہ سمندر کے کنارے ایک شہر میں بدل گئی تھی۔ اونچے اونچے مکانات

تھے...... یہ جدہ تھا۔لکڑی کی بالکونیوں والے گھر اب قریب آتے جارہے تھے۔ ہوا میں نمی تھی ہر طرف
جیسا بھورا سبز رنگ چھایا ہوا تھا۔ کھڑی ہوئی انگلی کی مانند ایک سفید مینار دکھائی دے رہا تھا۔

ایک بار پھر ''لبیک اللھم لبیک'' کی صدا بلند ہوئی۔ سر تسلیم خم ہے کی خوشی و مسرت بھری صدا
ایک ہی جذبے سے سرشار تھے کہ ان کی اُمیدوں کی سرزمین آ گئی ہے۔

میری اور دوسرے حجاج کی اُمیدیں تو یکساں تھیں مگر میرے لیے تو عرب کے ساحل کا نظارہ
میری برسوں کی تلاش کی معراج تھی۔ میں نے مڑ کر ایلسا کی طرف دیکھا جو اس حج کے موقعہ پر میرے ہم
تھی، اس کی نظروں میں وہی جذبات بزبان خود بول رہے تھے۔

اب ہمیں بہت سے سفید پَر نظر آئے جو ہماری طرف بڑھ رہے تھے، یہ عربی ساحلی کشتیاں تھیں
کے سفید بادبان ہوا میں لہرا رہے تھے۔ یہ بغیر آواز پیدا کیے لہروں کے درمیان سے اپنا راستہ بناتی ہوئیں ہما
جانب آ رہی تھیں۔ یہ عرب کی پہلی سفیر تھیں جو ہمارا استقبال کرنے والی تھیں۔ بہت جلد یہ ہمارے جہاز
گرد جمع ہوگئی تھیں۔ انہوں نے ایک ایک کر کے اپنے بادبان لپیٹ لیے تھے، یوں لگتا تھا جیسے مرغابیوں کا ا
غول خوراک کی تلاش میں اُتر آیا تھا چند لمحے پہلے جو سکوت تھا وہ ان کی آوازوں سے ٹوٹ گیا تھا۔ وہ ملاح
شور مچا رہے تھے جو ایک کشتی سے دوسرے کشتی پر چھلانگ لگا کر جا رہے تھے۔ اب وہ زینے پر کھڑے ہو کر
کو اترنے میں مدد دے رہے تھے اور ان کا سامان اتار رہے تھے۔ حجاج کا تو سرزمین مقدس کو دیکھ کر خوشی
برا حال تھا انہیں تو کسی چیز کا جیسے ہوش ہی نہ تھا۔

کشتیاں کشادہ اور بڑی تھیں جن پر اونچے اونچے مستول اور بادبان تھے۔ بہادر سند باد بھی ایک
کسی کشتی میں سوار ہو کر مہم پر نکلا ہوگا اور بجائے کسی ساحل پر اترنے کے ایک وھیل مچھلی کی پیٹھ پر اتر گیا تھا
سند باد سے قبل بھی مہم جُو اسی قسم کی کشتیوں میں جنوبی سمت میں بحیرۂ احمر کے راستے بحیرۂ عرب میں داخل ہو
ہوں گے، جنہیں مصالحہ جات لوبان اور اوپیر کی تلاش تھی۔ (اوپیر عبرانی زبان کا لفظ ہے عہد نامہ عتیق میں مذ
مقام جہاں سے سونا حاصل ہوتا تھا) اور آج ہم ان عظیم مہم جو انسانوں کے حقیر سے جانشین ایک مختلف قسم
سفر طے کر کے آئے تھے...... اس مرتبہ مسافر حجاج تھے سفید احرام میں ملبوس، ضروری اشیائے سامان
لدے ہوئے، بہت سی توقعات سے کانپتے ہوئے حجاج۔

مجھے بھی بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ مگر میں کیسے مستقبل میں جھانک کر دیکھتا جب میں ایک

اپنی بیوی کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا، کہ محض ایک حج کی ادائیگی کے بعد ہم اندر باہر سے تبدیل ہو جائیں گے؟ ایک بار اور سند باد کی یاد آئی۔ اس نے جب اپنے وطن کے ساحل کو چھوڑا ہوگا، میری طرح، اسے تو یہ نہ ہوگی کہ مستقبل اسے کیا دے گا۔ نہ اس نے آنے والے زمانے میں جھانکنے کی کوشش کی ہوگی نہ کوئی اش..... وہ تو صرف تجارت کے لیے نکلا تھا اور تجارت سے پیسہ کمانے کا خواہشمند تھا..... اور میں، میں تو لے حج ادا کرنے کے کچھ اور نہ مانگتا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے دنیا کو اپنی پرانی نظروں سے دیکھا ہو۔

یہ بالکل سچ ہے کہ میری زندگی میں جنوں جیسی مخلوق اور سحر زدہ کر دینے والی دوشیزائیں اور قوی ہیکل ں جیسے پرندے، جو بصرہ سے چلنے والے ملاح کو نظر آتے تھے مجھے کبھی نظر نہیں آئے، میں ان سب سے دور ہی رہا۔ مگر سند باد کے سارے سفر ایک طرف اور میرا یہ سفر حج دوسری طرف، میرے اس پہلے حج کے سفر نے میری زندگی کے اندر کاٹ کر ایک راستہ پیدا کر دیا تھا۔ جہاں تک میری شریک حیات ایلسا کا تعلق ہے، ت اس کی منتظر تھی..... ہم دونوں میں سے کسی کو بھی یہ پیش آگاہی نہ تھی کہ موت کی یہ گھڑی کس قدر قریب لا۔ میں یہ ضرور جانتا تھا کہ میں نے مغرب کو چھوڑ دیا ہے اور اب مجھے مسلمانوں کے درمیان زندگی گزارنی ہے۔ مگر بخدا یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اپنا سارا ماضی پیچھے چھوڑ دینے والا ہوں۔ میری پرانی دنیا بغیر کسی اشتباہ کے ختم ہو رہی تھی۔ وہ دنیا جو مغربی تصورات، جذبات، تگ و دو اور محاکات کی دنیا تھی یوں لگتا تھا جیسے ایک دروازہ خاموشی سے میرے پیچھے بند ہو رہا تھا، اس قدر خاموشی کے ساتھ کہ اس کی مجھے خبر ہی نہ ہو۔ ں سمجھ رہا تھا یہ سفر بھی میرے سابقہ سفروں جیسا ہی ہوگا جب ایک شخص ممالک غیر میں گھومتا پھرتا ہے اور ہمیشہ اپنے گھر میں لوٹ لوٹ جاتا ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا میرے ایام زندگی بالکل تبدیل ہو رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ میری تمام تر خواہش کی سمت تبدیل ہو رہی تھی۔

میں اب تک مشرق کے بہت سے ملکوں کی سیر کر چکا تھا۔ میں ایران اور مصر سے یورپ کے کسی بھی ملک کی نسبت زیادہ جانتا تھا۔ کابل میرے لیے عرصہ ہوا اجنبی نہ رہا تھا، دمشق اور اصفہان کے بازاروں سے میں بہت مانوس تھا۔ اسی لیے میں آج محسوس کر رہا تھا کہ جدہ کا بازار پہلی بار مجھے کیسا لگے گا۔ ہو سکتا ہے یہ فرق کسی بھی ملک سے تھوڑا بہت مختلف ہو مگر جب میں جدہ کے بازار سے گزرا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان کی نسبت کئی لحاظ سے بہت بہتر اور جامع تھا۔ سخت گرمی سے بچنے کے لیے بازار میں موجود دکانوں کو

تختوں اور بوری کے کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ سوراخوں اور چھوٹے چھوٹے درازوں سے ... شعاعیں چھن چھن کر اندر آرہی تھیں۔ کھلے باورچی خانے نظر آئے جن کے سامنے تنگ ... کے ٹکڑے بھون رہے تھے۔ کافی پینے کے رسیا یورپی اور مشرقی کافی کی دکانوں میں جمع تھے۔ ... اور رنگین کپڑوں میں تھے جدہ کے مستقل رہائشی حجاج کے چہروں، کپڑوں اور طور اطوار میں ... کے تمام ممالک سے آئے تھے۔ باپ کا تعلق اگر ہندوستان سے تھا تو ماں کا باپ ملایا اور عرب ... باشندہ تھا۔ ممکن ہے اس کے ددھیال ازبکستان اور ننھیال صومالیہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ تج ... پرانے زندہ نشانات تھے یہ وہ اسلامی ماحول تھا جس میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ جدہ 1927ء میں حجاز کا وہ واحد شہر تھا جس میں غیر مسلموں کو رہنے کی اجازت تھی۔ اسی لیے اس وقت بعض دکانوں کے سائن بورڈ یورپی تحریر میں نظر آتے ہیں، لوگ سفید کرم خطوں کے لباس میں ملتے ہیں جن کے سروں پر دھوپ سے بچنے کے لیے ٹوپیاں تھیں۔ قونصل خانوں پر غیر ملکی پرچم لہرا رہے تھے۔

بندرگاہ سے آوازیں اور بو آرہی تھی۔ سمندر میں لنگر انداز جہاز اور مچھلیاں پکڑنے میں استعمال ہونے والی کشتیاں نظر آرہی تھیں جن پر سفید تکونے بادبان تھے۔ یہ دنیا بحیرۂ روم کی زندگی سے کچھ زیادہ مختلف بھی نہ تھی۔ مکانات قدرے مختلف ضرور تھے مگر ان میں سمندر سے چلنے والی ٹھنڈی ہواؤں کا گزر تھا اور نقشہ کچھ تبدیل کر کے انہیں تعمیر کیا گیا تھا کہ مکینوں کے لیے بلا رکاوٹ باہر دیکھنا آسان تھا لیکن راستہ گزرنے والے اندر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ سب کچھ نہ تو بحیرۂ روم کے ملکوں جیسا تھا نہ بالکل سعودی عرب جیسا۔ یہ دراصل بحیرۂ احمر کی ساحلی دنیا تھی جہاں ایسے ہی فن تعمیر پر مشتمل اس کے دونوں جانب عمارات کھڑی تھیں۔

عرب میں اوپر کھلا آسمان، زمین پر پہاڑی سلسلے اور مشرق کی سمت ریت کے تودے تھے۔ یہ سارے منظر عرب کی تصویر میں جمع ہو گئے تھے۔

جدّہ سے مکہ مکرمہ تک 1927ء: اگلے روز بعد از دوپہر ہمارا قافلہ مکہ کو جانے والی سڑک پر جارہا تھا۔ حجاج کے ہجوم، بدوؤں اور ان اونٹوں کے درمیان میں سے ہمیں راستہ بنانا پڑتا تھا جن اونٹوں میں سے کچھ پر تو سائبان دار پلنگ تھے کچھ پر نہیں۔ اونٹوں پر لوگ سوار تھے، گدھوں پر سامان لدا ہوا تھا جو شہر کے مشرقی دروازے کی طرف جارہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی اِکا دُکا موٹر کار ہمارے قریب سے فراٹے بھرتی گزر جاتی تھی۔ یہ وہ موٹر کاریں تھیں جو سعودی عرب میں پہلی بار آئی تھیں۔ ان میں بھی حجاج سوار تھے اور

اپنے ہارن بجا بجا کر شور کر رہی تھیں۔ اونٹوں کو یہ پتا چل گیا تھا کہ یہ نئے عفریت ان کے دشمن تھے۔ یہ دشمن پاس سے گزرتے تو اونٹ اپنی لمبی گردنیں اِدھر اُدھر موڑ لیتے تھے، گھبرائے ہوئے مگر بے بس۔ ایک نیا دور خوفناک انداز میں ان لمبے اور صابر جانوروں کے لیے قریب آ رہا تھا جو انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے شہر کی سفید دیواروں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور اب ہم صحرا میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک کھلا ریتلا میدان ہمارے سامنے تھا جس میں خاردار جھاڑیاں تھیں، کہیں کہیں گھاس بھی تھی اور ایک دوسرے سے دور پہاڑیاں تھیں جو یوں لگتی تھیں جیسے سمندر میں جزیرے نمودار ہو گئے ہوں، مشرقی سمت ان کی بلندی میں اضافہ ہو گیا تھا، یہ نیلی بھوری تھیں جن پر نہ درخت تھے نہ سبزہ اور نہ ہی زندگی کے آثار۔ قافلے ایک دوسرے کے پیچھے رواں دواں تھے، ان کے ساتھ سینکڑوں ہزاروں اونٹ تھے ایک کے پیچھے ایک جانور ایک واحد قطار بن گئی تھی۔ ان پر سائبان دار پلنگ تھے، حجاج تھے اور سامان تھا۔ کبھی کبھی یہ پہاڑیوں کے پیچھے چھپ جاتے پھر دوبارہ سامنے آ جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے بہت سے راستے مڑ کر ایک ریتلی سڑک میں آ ملے تھے، یہ وہی راستہ تھا جسے ایسے ہی قافلوں نے صدیوں پر محیط سفر کے دوران تخلیق کیا تھا۔

کہیں صحرا کی مکمل خاموشی اونٹوں کے قدموں کی آواز سے ٹوٹ جاتی تھی تو کہیں بدو شتربانوں کی آوازوں سے اور کہیں کہیں کسی دھیمی سُروں میں گاتے ہوئے کسی حاجی کے گیت سے۔ مجھے اچانک ایک ڈراؤنے جوش و جذبے نے گھیر لیا تھا، ایک ایسا جذبہ جسے کشف کا نام دیا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے پُل پر دیکھا جس کی لمبائی ایک ان دیکھی خلیج پر محیط تھی۔ یہ اتنا لمبا پُل تھا کہ اس کے جس سرے سے میں اس پر آیا تھا وہ دور دھندلے فاصلے پر کھو گیا تھا اور اس کا دوسرا حصہ جو نظروں کے سامنے تھا اس کا آخری کنارہ ابھی تک نظروں سے اوجھل تھا۔ میں اس کے درمیان تھا اور میرا مارے خوف کے برا حال تھا کیونکہ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ مجھے اسی مقام پر ہمیشہ معلق رہنا ہوگا۔ اسی لمحے ایک مصری خاتون نے جو میرے اونٹ سے آگے والے اونٹ پر سوار تھی اچانک ''لبیک اللھم لبیک'' کی آواز نکالی۔ اس آواز نے میرے خواب کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

ہر طرف سے لوگوں کی مختلف زبانوں میں باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی چند حجاج بیک وقت آواز پکار اٹھتے تھے: ''لبیک اللھم لبیک''۔ یا کوئی مصری عورت آنحضور کی مدح میں چند اشعار پڑھنا

شروع کر دیتی تھی۔ کہیں کہیں سے ایسی آواز بھی آ جاتی تھی جو شادی بیاہ، بچے کی پیدائش، ختنے کے موقعہ پر، کسی مذہبی تہوار پر یا حج کے موقعہ پر عورت کے منہ سے نکلتی ہے۔ ابتدائی زمانے میں جنگجو عربوں میں یہ رواج تھا کہ سرداروں کی بیٹیاں اپنے قبیلے کے مردوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں جا کر بہادری و شجاعت سے لڑنے کے لیے ان کی ہمت و حوصلہ بڑھاتی تھیں (ان دوشیزاؤں میں سے کسی کو قتل کرنا انتہائی بے عزتی کی بات سمجھی جاتی تھی اور دشمن کے ہاتھوں گرفتار کر لیا جانا اس سے بھی زیادہ بری بات تصور ہوتی تھی)۔

زیادہ تر حجاج اونٹوں پر رکھے ہوئے سائبان والے پلنگوں میں سفر کرتے تھے، ایک میں دو افراد سوار ہوتے تھے۔ ہچکولے بہت لگتے تھے جس سے نیند بھی آتی تھی اور جسم بھی ٹوٹنے لگتا تھا۔ ابھی کوئی مسافر سونے ہی لگتا تھا کہ جھٹکے سے جاگ جاتا تھا، وہ پھر سونے کی کوشش کرتا تو پہلے کی طرح دوبارہ جگا دیا جاتا تھا۔ شتربان جو اپنے اونٹوں کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے تھے کبھی کبھی اونٹوں سے باتیں بھی کرنے لگتے تھے۔ ان شتربانوں کی حدی خوانی بھی اونٹوں کے بڑا کام آتی تھی۔

صبح کے وقت ہم بحرہ پہنچے تھے جہاں ہمارا قافلہ دن بھر کے لیے رُک گیا تھا۔ اس لیے کہ گرمی صرف رات کو سفر کرنے کی اجازت دیتی تھی۔

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، گنے چنے گھر، کافی شاپس، کھجور کے پتوں سے بنے ہوئے کچھ جھونپڑے اور ایک بہت ہی چھوٹی سی مسجد۔ یہ جدہ اور مکہ کے بیچ میں تھا اور ہر قافلہ یہاں ضرور رکتا تھا۔ خشکی پر منظر وہی تھا جو ساحل سے روانگی کے وقت پہلی بار آنکھوں نے دیکھا تھا۔ صحرا اور اونچی نیچی پہاڑیاں ادھر ادھر بکھری ہوئیں۔ مشرق میں نیلگوں پہاڑ تھے جو ساحلی علاقے کو وسطی عرب کی سطح مرتفع سے جدا کر رہے تھے۔ مگر اب یہ سارا صحرا جو ہمارے ارد گرد تھا ایک بہت بڑا فوجی کیمپ دکھائی دیتا تھا جس میں اَن گنت خیمے نصب تھے، اونٹ تھے، ان پر سائبان والے پلنگ تھے، بندھا ہوا سامان تھا، بہت سی زبانیں بولی جا رہی تھیں......... عربی، ہندوستانی، ملائی، فارسی، صومالی، ترکی، پشتو، ایتھوپیا کی اُمھاری اور نہ جانے اور کون کون سی۔ یہ اقوام کا صحیح معنوں میں اجتماع تھا مگر سفید احرام میں ملبوس ہونے کی وجہ سے سارے امتیازات مٹ گئے تھے۔ یُوں تمام اقوام ایک ہی قوم بن گئی تھیں۔

رات بھر سفر کرنے کے بعد حجاج تھک گئے تھے مگر چند ایک کو علم تھا کہ اس آرام کے وقت کا بہتر مصرف کیا ہو سکتا ہے۔ بہت سوں کے نزدیک سفر ایک معمول کے کام سے مختلف تھا اور بہت سے حجاج ایسے

تھے جنہوں نے زندگی میں پہلی بار سفر کیا تھا اور سفر بھی کیسا تھا منزل پر پہنچانے والا سفر، جس کے سامنے دنیا بھر کے سفر ہیچ نظر آئیں۔ انہیں بے چینی تھی، انہیں لازمی طور پر ادھر اُدھر پھرنا تھا، ان کے ہاتھوں کو واقعی کوئی کام تلاش کرنے کی ضرورت پیش آ رہی ہوگی خواہ اپنے تھیلوں کو کھولنا پھر بند کرنا ہی کیوں نہ ہو ورنہ تو ہر شخص یوں گم ہو جاتا جس طرح اس دنیا سے ماورا کی خوشی و مسرت سمندر میں گم ہو جائے۔

یہ سب کچھ اس خاندان کے ساتھ بیت چکا تھا جو میرے خیمے سے آگے والے خیمے میں مقیم تھا۔ یہ بنگال کے حجاج تھے۔ وہ خاموش، زمین پر پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے، ان کی نگاہیں مشرق میں لگی ہوئی تھیں، مکہ مکرمہ کی سمت، وہ صحرا کو دیکھے جا رہے تھے جو گرمی سے جھلس رہا تھا! ان کے چہروں پر اس قدر اطمینان تھا جیسے وہ بیت اللہ کے روبرو کھڑے ہوں، مالک و خالق کے حضور میں۔ مرد بے حد خوبصورت تھے، دبلے پتلے، لمبے بالوں اور چمکتی ہوئی سیاہ ڈاڑھیوں والے۔ ان میں سے ایک جو بیمار تھا وہ قالین پر لیٹا ہوا تھا، اس کے نزدیک دو نوجوان خواتین بیٹھی تھیں، اپنے سرخ اور نیلے پائجاموں میں یہ چھوٹے چھوٹے رنگین پرندے لگ رہی تھیں۔ ان کے گھنے سیاہ بال زمین کو چھو رہے تھے۔ ان دو میں سے جو چھوٹی تھی اس کی ناک میں سونے کی نتھ تھی۔

اسی بعد دوپہر بیمار چل بسا تھا۔ ان عورتوں نے کوئی نوحہ بلند نہیں کیا تھا جس طرح کہ مشرق میں عموماً عورتیں کرتی ہیں۔ یہ اس لیے کہ مرنے والا حج کے سفر کے دوران مرا تھا۔ مقدس سرزمین پر اس نے جان دی تھی اور بخش دیا گیا تھا۔ اسے نہلا کر اسی چادر میں کفنایا گیا تھا جو اس کا آخری لباس تھا۔ اس کے بعد ان میں سے ایک شخص خیمے کے سامنے کھڑا ہو کر اعلان کر رہا تھا کہ متوفی کا جنازہ رکھا ہوا ہے سب بھائی آئیں اور نماز جنازہ میں شامل ہو جائیں۔ احرام میں ملبوس حجاج ہر چہار جانب سے پلک جھپکنے میں اُمڈ آئے تھے اور ایک امام کے پیچھے صف آرا ہو گئے تھے جیسے کسی عظیم فوج کے سپاہی اپنے کمانڈر کے پیچھے صف آرا ہوتے ہیں۔ نماز جنازہ پڑھائی جا چکی تھی...... متوفی کے لیے قبر تیار تھی۔ ایک بوڑھے شخص نے قرآن پاک کی چند آیات تلاوت کیں اور اس مرنے والے حاجی کو لحد میں اتار دیا گیا تھا، اسے اس طرح کروٹ کے بل لٹایا گیا تھا تا کہ اس کا چہرہ مکہ کی طرف رہے۔

مکہ مکرمہ: دوسری صبح سورج نکلنے سے قبل صحرائی میدان تنگ ہو گیا تھا، پہاڑیاں ایک دوسرے کے قریب آ گئی تھیں، اب ہم ایک گھاٹی میں سے گزر رہے تھے۔ ہمیں صبح کے دھندلکے میں مکہ کی عمارتیں

دکھائی دے رہی تھیں۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہم اس شہر مقدس کی گلیوں میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں کے مکانات جدہ کے مکانوں سے ملتے جلتے تھے جن میں کھڑکیاں اور بالکونیاں تھیں۔ البتہ جس پتھر سے یہ تعمیر کیے گئے تھے وہ پتھر زیادہ بھاری تھے۔ ابھی سورج نکلا ہی تھا مگر گرمی کی شدت ابھی سے محسوس ہو رہی تھی۔ بہت سے گھروں کے سامنے بنچ رکھے ہوئے تھے جن پر تھکے ماندے لوگ سو رہے تھے۔ کچی گلیاں تنگ سے تنگ ہوتی جا رہی تھیں اور ہمارا قافلہ شہر مقدس کے مرکز کی جانب بڑھ رہا تھا۔ حج کا مبارک موقعہ چند دنوں کے فاصلے پر تھا۔ گلیوں میں لوگوں کے ہجوم بڑھتے جا رہے تھے۔ بیشمار حجاج تو احرام میں تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے عارضی طور پر روزمرہ کا لباس پہن رکھا تھا۔ اسلامی دنیا کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے حجاج کا اپنا اپنا لباس تھا۔ سقے پانی کے بھاری مشکیزوں تلے دبے جا رہے تھے۔ کچھ نے پرانے پیٹرول کے دو دو کنستر اٹھا رکھے تھے۔ گدھوں پر بھی پانی کے کنستر لدے ہوئے تھے گدھوں کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور مخالف سمت سے اونٹ آ رہے تھے جن کی پیٹھ پر سائبان دار خالی پلنگ تھے، کیونکہ حجاج ان میں سے اتر آئے تھے۔ گلیوں میں ہجوم دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے صدیوں بعد یہ حج آیا ہو جہاں لوگ دنیا بھر سے طویل عرصے بعد حاضر ہوئے ہیں۔ ہمارا قافلہ اب بکھر گیا تھا، اونٹ کہیں، حجاج کہیں اور سامان کسی اور جگہ اور شتربان ہر نظم اور ترتیب سے آزاد، شوروغل اتنا کہ قریب کھڑے ہوئے ساتھی کی آواز سنائی نہ دے۔

میں نے جدہ ہی میں یہ انتظام کر لیا تھا کہ ہم ایک مشہور مطوف کے گھر پر رہیں گے جو حجاج کا گائیڈ بھی تھا اور حسن عابد کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس افراتفری میں اس کو ہم کہاں تلاش کریں گے، اس کا گھر کیسے ڈھونڈھ پائیں گے۔ پھر اچانک ایک آواز آئی:

''حسن عابد! آپ کے حجاج کہاں ہیں؟''...... میں نے دیکھا کہ جس طرح ایک جن بوتل میں سے برآمد ہوتا ہے ایک نوجوان ہمارے سامنے تھا، اس نے ہمیں جھک کر السلام علیکم کہا اور اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کر کے چل پڑا تھا۔ حسن عابد نے اسے بھیجا تھا کہ وہ ہمیں اس کے گھر پر پہنچا دے۔

ہمارے مطوف نے نہایت عمدہ ناشتہ کرایا جس کے بعد میں اس نوجوان کے ہمراہ باہر چلا گیا تھا جس نے ہمیں اس گھر تک پہنچایا تھا۔ ہماری اس وقت منزل مسجد حرام تھی۔ ہم بارونق گلیوں میں سے گزر رہے تھے، لوگوں کا ایک ہجوم تھا، قصابوں کی دکانوں پر بھیڑوں کا گوشت لٹک رہا تھا۔ سبزی فروشوں نے زمین پر چٹائیاں بچھا کر سبزیاں چُن رکھی تھیں۔ مٹی اڑ رہی تھی، مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، پسینے سے ہر شخص کا برا حال تھا۔

پھر ہم ایک بہت تنگ بازار میں سے گزرے جو چھتا ہوا تھا اور جہاں صرف کپڑوں کی دُکانیں تھیں۔ مغربی ایشیاء اور شمالی افریقا کے بازاروں کی مانند یہاں بھی دُکانیں زمین سے ایک گز اونچی تھیں۔ دُکاندار خود تو آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ ان سے اوپر اسلامی دنیا کے مختلف ممالک کے لوگوں کے لباس لٹکے ہوئے تھے۔

تمام نسلوں اور قوموں کے لوگ یہاں جمع تھے، کچھ کے سروں پر پگڑیاں تھیں کچھ ننگے سر تھے، کچھ کی ڈاڑھیاں تھیں کچھ نے شیو کرا رکھی تھی۔ چند ایک کے ہاتھوں میں تسبیح تھی باقی خالی ہاتھ تھے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کسی سمت جا رہے تھے۔ صومالیہ کے باشندوں کا جسم ان کے لباس کے اندر سے تانبے کی طرح چمک رہا تھا۔ عربی جو اندرون عرب سے آئے تھے، دبلے پتلے تھے مگر بخارا کے اُزبک بھاری جُسوں والے تھے جنہوں نے مکہ کی سخت گرمی میں بھاری چوغے اور گھٹنوں تک اونچے چمڑے کے بُوٹ پہن رکھے تھے۔ جاوا کی جوان لڑکیوں کے کشادہ چہرے اور بادامی آنکھیں تھیں۔ مراکشی آہستہ آہستہ چلتے تھے اور سفید لبادوں میں بڑے پروقار معلوم ہوتے تھے۔ ان کے سروں پر عجیب و غریب سی چھوٹی چھوٹی ٹوپیاں ہوتی تھیں جو وہ سر کے بالکل وسط میں اوڑھتے تھے۔ مصریوں کے چہرے ہشاش بشاش تھے، سفید لباس پہنے ہوئے ہندوستانی اپنی آر پار ہو جانے والی سیاہ آنکھوں سمیت، سفید پگڑیوں میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے اور ہندوستانی عورتیں اپنے خاص قسم کے سفید برقعوں میں یوں لگتی تھیں جیسے چلنے والے خیمے ہوں۔ ٹمبکو کے حبشی نیلے لباسوں میں سروں پر سرخ ٹوپیاں لیے پھرتے تھے اور چینی عورتیں ایسی تتلیاں لگتی تھیں جن پر کشیدہ کاری کی گئی ہو، وہ چلتی اس طرح تھیں جس طرح غزالاں۔ ہر سمت آوازوں کی گونج تھی بیشمار زبانیں بولی جا رہی تھیں، خوشی و مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ہم حرم پاک کے ایک دروازے پر کھڑے ہیں۔ یہ تین محرابوں والا دروازہ تھا جس میں پتھر کی سیڑھیاں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک طرف ایک ہندوستانی بھکاری بیٹھا ہوا تھا، لباس سے آزاد، نیم برہنہ۔ اس نے بھیک مانگنے کے لیے ہاتھ ہماری طرف پھیلایا۔ مجھے اب خانہ کعبہ کی عمارت صاف نظر آ رہی تھی۔ ایک چوکور میدان ہے جس کے چاروں طرف بیشمار ستونوں والے حجرے اور نیم دائرے کی شکل میں بنی ہوئی محرابیں تھیں۔ مرکز میں ایک مخروطی شکل کی چالیس فٹ اونچی عمارت تھی جو سیاہ غلاف میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس غلاف کے نصف بالائی حصے پر سنہری حروف میں قرآن پاک کی آیات کاڑھی گئی تھیں...... یہ کعبہ تھا......

یہ کعبہ تھا وہی کعبہ جو کروڑوں مسلمانوں کی آرزوؤں کا صدیوں سے مرکز رہا تھا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے بیشمار حجاج نے ایک زمانے سے بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں۔ بہت سے راستے میں انتقال کر گئے تھے۔ بہت سے یہاں پہنچ تو گئے تھے مگر بڑی محرومیوں کے بعد۔ یہ چوکور عمارت ان کی آرزوؤں کا مرکز رہی تھی جہاں تک پہنچ جانا ان آرزوؤں کی تکمیل تھی۔

یہ مکعب شکل میں ہے (جیسا کہ اس کے عربی نام سے ظاہر ہے) جس پر سیاہ غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ایک خاموش جزیرہ ہے جو مسجد کے ایک مربع میدان کے اندر کھڑا ہے اور دنیا بھر میں شاید ہی اس قدر خاموش کوئی اور عمارت ہوگی۔ یوں لگتا ہے جیسے جس کسی نے سب سے پہلے کعبہ تعمیر کیا تھا، حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے لے کر اب تک اس کا بنیادی ڈھانچہ اسی شکل میں بار بار تعمیر ہوتا رہا ہے۔ بنانے والے نے اسے انسان کی اپنے خالق کے سامنے عجز و انکساری کی مثال کے طور پر بنایا تھا۔ اور معمار ضرور یہ جانتا تھا کہ فن تعمیر کی خوبصورتی کی کوئی مثال بھی اپنی جامعیت میں، خواہ وہ عمارت کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو، اس مکعب نما عمارت کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

میں نے کئی اسلامی ممالک میں ایسی مساجد دیکھی ہیں جن میں عظیم صناعوں کے ہاتھوں نے فن تعمیر کے شاہکار تخلیق کر دیے ہیں۔ میں نے شمالی افریقا میں بھی مساجد دیکھی تھیں، سنگ مرمر کی بنی ہوئیں، استنبول کی عالیشان عمارات بھی دیکھیں اور ایشیائے کوچک میں بصرہ کی عمارتیں بھی، ایران کی مسجد صفوی بھی دیکھی، سنگ مرمر، کئی رنگوں کی ٹائلیں، پچی کاری سے مزین، چاندی کی گل کاری والے دروازے، اونچے اونچے مینار، سنگ مرمر سے ڈھکی ہوئی مربع عمارتیں جن میں پانی کے چشمے بھی تھے اور برسوں پرانے کیلے کے درخت بھی۔ میں نے سمرقند میں تیمور لنگ کی مساجد کے کھنڈرات بھی دیکھے جو اس حالت میں بھی شاندار نظر آتے تھے۔

یہ ساری عمارتیں اور مساجد دیکھنے کے باوجود میں نے اپنے آپ کو کسی عمارت کے سامنے اس قدر مضبوط محسوس نہیں کیا تھا جس قدر مضبوط میں خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا محسوس کر رہا تھا۔ معمار کا ہاتھ اس کے مذہبی تصور کے اس قدر قریب آ گیا تھا۔ ایک مکعب نما عمارت کی مکمل سادگی اور ہیئت کی تمام خوبصورتی اس خیال کی ترجمانی کر رہی تھی: ''انسان اپنے ہاتھوں سے جس قدر خوبصورتی تخلیق کرنا چاہے کر ڈالے یہ محض ایک تصور ہوگا جو خدا کا عطا کردہ ہے، اس لیے انسان جس قدر بھی سادگی کے ساتھ تصور کر سکتا ہے اسی قدر زیادہ وہ

اللہ کی عظمت کا اظہار کر سکتا ہے''۔ ایسا ہی ایک احساس اہرام مصر کی ریاضیاتی سادگی کا اظہار کرنے کا ذمہ دار تھا۔ حالانکہ وہاں انسان کے تصور نے حیرت انگیز جہتوں میں ایک ایسا اظہار تلاش کر لیا ہوگا جو اس نے اپنی عمارت کو دیا۔ مگر یہاں کعبہ میں، عمارت کا سائز بھی انسانی لاتعلقی اور سر تسلیم خم کر دینے کا اظہار کر رہا تھا۔ اس عمارت کی قابل ناز عجز و انکساری کا روئے زمین پر ثانی نہیں تھا۔

کعبہ میں داخلہ کا ایک ہی راستہ ہے، شمال مشرقی سمت ایک دروازہ جس پر چاندی کا غلاف چڑھا ہوا ہے جو زمین سے سات فٹ کی اونچائی پر ہے تاکہ اس کے اندر داخل ہونے کے لیے لکڑی کی سیڑھی استعمال کی جا سکے۔ سال کے کچھ دنوں میں یہ دروازہ کھلتا ہے۔ کعبہ کے اندر کا حصہ جو اکثر بند ہی ہوتا ہے (جسے میں نے بعد میں ایک موقعہ پر دیکھا تھا) بہت سادہ سا ہے۔ فرش اس کا سنگ مرمر کا ہے جس پر چند قالین بچھے ہوئے ہیں اور چھت سے چراغ لٹک رہے ہیں، لکڑی کے شہتیر اس چھت کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ دراصل کعبہ کے اس اندرونی حصے کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں اس لیے کہ جہاں تک تقدس کا تعلق ہے وہ تو پوری عمارت کو حاصل ہے جو ''قبلہ'' ہے۔ وہ سمت جس طرف منہ کر کے دنیا بھر کے مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ اللہ کی واحدانیت کی یہ ایک علامت ہے جس جانب منہ کر کے اسلامی دنیا کے کروڑوں مسلمان دن میں پانچ وقت کی نماز ادا کرتے ہیں۔

خانہ کعبہ کے مشرقی کونے میں ایک سیاہ پتھر نصب ہے جسے حجر اسود کہتے ہیں۔ اس پر کوئی شے ڈھانپنے والی نہیں اور یہ چاندی کے ایک فریم میں گھرا ہوا ہے۔ اس سیاہ پتھر کو صدیوں سے حجاج کی بہت سی نسلیں بوسہ دیتی چلی آ رہی ہیں۔ غیر مسلموں میں اس پتھر سے متعلق بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جن کے خیال میں یہ کوئی طلسماتی شے تھی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے کے کفار سے ایک رعایت کے طور پر حاصل کی تھی۔ مگر اس میں کوئی صداقت نہیں۔ کعبہ ایک عزت و احترام والی عمارت ہے، پرستش والی نہیں، اسی طرح حجر اسود بھی کوئی ایسی چیز نہیں جس کی پوجا کی جائے۔ یہ قابل احترام اس لیے ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کے کعبہ کی اصل عمارت کی یہ ایک یادگار ہے اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اسے بوسہ دیا تھا اس لیے آج تک حجاج اسے آنحضورؐ کی تقلید میں بوسہ دیتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے بعد مومنین کی نسلیں ان کی چھوڑی ہوئی اس مثال کی تقلید کریں گی۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ حجر اسود پر جہاں آپؐ نے اپنے ہونٹ مبارک رکھے تھے وہاں آنے والے تمام حجاج اپنے ہونٹ رکھ کر علامتی طور پر ان

ہونٹوں کو بھی حجر اسود کے ساتھ بوسہ دیا کریں گے۔ حجاج جب حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں تو آنحضورؐ کا استدیا ہوا بوسہ انہیں یاد ہوتا ہے۔

کسی بھی مسلمان کو اس حقیقت سے انکار نہیں کہ کعبہ آنحضورؐ سے بہت پہلے بھی یہاں موجود تھا۔ بیشک اس کی اہمیت اس حقیقت میں مضمر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ کسی نئے مذہب کے بانی ہیں۔ اس کے برعکس اسلام، قرآن کے مطابق ''انسان کا فطری میلان ہے۔ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا نام ہے اور یہ انسانی آگہی کی ابتداء سے چلا آ رہا ہے۔ یہ وہی مذہب تھا جس کی تعلیم حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور خدا کے تمام پیغمبر دے رہے تھے...... قرآن کا پیغام البتہ آخری وحی الٰہی تھی۔ ایک مسلمان کو اس سے بھی انکار نہیں کہ کعبہ بتوں سے بھرا ہوا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل پراسرار قوتوں نے انہیں توڑ دیا تھا جس طرح موسیٰؑ نے سنائی پر سونے کے بچھڑے کو توڑ دیا تھا۔ جس وقت یہ بت کعبے میں ابھی نہیں لائے گئے تھے اس سے بہت پہلے حقیقی خدا کی یہاں عبادت ہوتی تھی۔ چنانچہ آنحضورؐ نے حضرت ابراہیمؑ کے معبد کو اس کے اصل مقصد کی جانب لوٹا دیا تھا۔

اور میں اسی حضرت ابراہیمؑ کے معبد کے سامنے کھڑا تھا۔ میں اس کی شاندار عمارت کی جانب بغیر کچھ سوچے سمجھے (اس لیے کہ خیالات اور تصورات بہت بعد میں آئے تھے) دیکھے جا رہا تھا۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی چھپی ہوئی، مسکراتی ہوئی گٹھلی میں سے جو میرے اندر موجود تھی، ایک فرحت و شادمانی کسی گیت کی مانند ابھر آئی تھی۔

صاف و شفاف سنگ مرمر کی سلوں میں سے سورج کی روشنی منعکس ہو رہی تھی جس نے کعبہ کے گرد ایک وسیع دائرے میں زمین کو ڈھانپ لیا تھا۔ ان سنگ مرمر کی سلوں پر بہت سے لوگ، مرد، عورتیں سیاہ غلاف میں ڈھکے ہوئے خانۂ خدا کے گرد چکر لگاتے رہتے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو روئے تھے اور وہ بھی جنہوں نے اللہ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگی تھیں...... بہت سے ان میں ایسے بھی تھے جن کے پاس الفاظ نہیں تھے، اشک نہیں تھے مگر یہ سر جھکائے خاموش چلتے رہتے تھے۔

یہ حج کا حصہ ہے کہ کعبے کے گرد طواف کرتے ہوئے سات چکر لگانے ہوتے ہیں صرف اسلام کی اس جائے حُرمت کے لیے عزت و احترام دکھانے کے لیے نہیں بلکہ اسلامی زندگی کے بنیادی تقاضے کو یاد کرتے ہوئے۔ کعبہ خدا کی واحدانیت کی علامت ہے اور حجاج کا جسمانی طور پر اس کے گرد چکر لگانا انسانی

سرگرمی کا علامتی اظہار ہے جس سے مراد یہ ہے کہ نہ صرف ہمارے خیالات اور جذبات بلکہ وہ تمام جو'' داخلی زندگی'' کی اصطلاح میں شامل ہے وہ بھی اور ہماری خارجی، سرگرم زندگی، ہمارے اعمال اور عملی تگ و دو میں خدا کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔

اور میں بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور کعبہ کے گرد جاری طواف کا حصہ بن گیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا کہ کوئی مرد یا عورت میرے قریب ہے۔ الگ الگ تصاویر میری نظروں کے سامنے گھومتی دکھائی دیں اور پھر غائب ہو گئیں۔ ایک دیو قامت حبشی سفید احرام میں ملبوس جس کی مضبوط سیاہ کلائی کے گرد ایک چوبی تسبیح ایک زنجیر کی مانند لٹک رہی تھی۔ ایک بوڑھا جس کا تعلق ملایا سے تھا تھوڑی دیر کے لیے میرے قریب آیا، اس نے اپنے دو بازو پیچھے باندھ رکھے تھے۔ ایک بھوری آنکھوں والا تھا جس کی بھنویں بہت گھنی تھیں دکھائی دیا، معلوم نہیں یہ کس ملک سے تھا بہت جلد ہجوم میں گم ہو گیا تھا۔ حجر اسود کے سامنے حجاج کا ہجوم تھا جن کے درمیان ایک ہندوستانی عورت بھی تھی۔ وہ بیمار دکھائی دیتی تھی۔ اس کا چہرہ نازک سا تھا اور کوئی عجیب سی آرزو اس کے دل میں مچل رہی تھی، جو دیکھنے والوں کو نظر آتی تھی، اسی طرح جیسے مچھلی میں زندگی نظر آتی ہے۔ اس کے ہاتھ، زرد ہتھیلیوں سمیت کعبہ کی جانب پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا یہ بے لفظ اور خاموش دعاؤں میں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔

میں چلتا ہی گیا، کئی منٹ گزر گئے تھے اور میرے دل میں سے ہر وہ شے جو تلخ او چھوٹی تھی نکل چکی تھی۔ میں طواف کعبہ میں مصروف ٹیم کا حصہ بن گیا تھا کیا یہ اس کا مطلب تھا جو ہم کر رہے تھے: اس بات سے باخبر ہونا کہ ہر کوئی محوری حرکت کا حصہ ہے یا یہ ہماری ساری پریشانی کا اختتام تھا؟ اور اب منٹ تحلیل ہو رہے تھے۔ وقت ٹھہر گیا تھا اور یہ کائنات کا مرکز تھا......

دو دن بعد ایلسا وفات پا گئی تھی۔ وہ گرمی کی وجہ سے ایک ہفتے سے بھی کم بیمار رہی اور جب میں اسے ہسپتال لے گیا تو شامی ڈاکٹر جو اس ہسپتال میں کام کرتے تھے، بے بس کھڑے تھے۔ میرے گرد اندھیرا اور مکمل مایوسی مزید قریب ہو گئے تھے۔

اسے مکہ مکرمہ کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔ اس کی قبر پر ایک لوح قبر لگا دی گئی تھی۔ میں اس پر کچھ بھی کندہ نہیں کروانا چاہتا تھا۔ اس بارے سوچنے کا مطلب تھا مستقبل کے بارے میں سوچنا اور میں اب کسی مستقبل کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

ایلسا کا چھوٹا بیٹا احمد میرے ساتھ ایک سال سے زیادہ عرصے تک رہا اور اس نے اندرون عرب میرے ساتھ سفر بھی کیا تھا۔ اس کی عمر دس برس تھی۔ کچھ عرصے بعد مجھے اس سے بھی جدا ہونا پڑا کیونکہ اس کے ننھیال کا خیال تھا کہ اسے یورپ میں تعلیم کے لیے بھیج دیا جائے۔ اب میرے ساتھ ایلسا کی یاد کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ اور اگر مزید کچھ تھا تو وہ مکہ کے قبرستان میں اس کی قبر پر لگا ہوا پتھر تھا۔ ایک اندھیرا تھا جس نے کافی عرصے تک میرا ساتھ نہ چھوڑا حالانکہ میں نے وقت کی قید سے آزاد اپنے آپ کو عرب کی آغوش میں ڈال دیا تھا۔

عرفات کی یاد: یہاں سے زیادہ دور نہیں جہاں وادیوں اور پہاڑیوں کے زندگی سے خالی اس ویرانے میں عرفات کا میدان واقع ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سال میں ایک روز وہ تمام حجاج جو مکہ آتے ہیں، جمع ہوتے ہیں۔ یہ اس اجتماع کی یاد تازہ کرتا ہے جب روز محشر انسان اپنے خالق کے سامنے ان تمام اعمال کا حساب دے گا جو اس نے دنیا کی اس زندگی میں کیے تھے۔ میں خود بھی سفید احرام میں ملبوس ان حجاج کے اجتماع کے درمیان، احرام پہنے، ننگے سر یہیں کئی بار کھڑا ہوا تھا جن کا تعلق دنیا کے تین براعظموں سے تھا۔ ہمارے چہرے جبل رحمت کی سمت تھے۔ ہم دوپہر کو یہاں اس انتظار میں کھڑے رہتے تھے کہ ہم پر قیامت کا وہ دن منعکس ہو جائے جس سے کسی بھی بشر کو مفر نہ تھا۔ جس روز ہر کسی کا پوری زندگی کا اعمال نامہ اس کے سامنے آ جانا ہے اور ہمارا کوئی راز چھپا ہوا نہ رہے گا۔

میں جس وقت پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا تھا اس وقت میں نیچے میدان کی طرف دیکھ رہا تھا جو وہاں نظر نہیں آ رہا تھا تاہم چاندنی میں ڈوبا ہوا ایک خوبصورت منظر میرے سامنے تھا۔ وہی سرزمین جہاں ایک لمحہ پہلے مُردنی چھائی ہوئی تھی اچانک انسانوں کے اجتماع سے زندہ ہو گئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تیرہ سو سال کے دوران مکہ اور عرفات کے درمیان سفر کرنے والے کروڑوں انسانوں، مردوں اور عورتوں کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی ہو۔ انسانی آوازیں، ان کے قدموں اور ان کے جانوروں کے قدموں کی آوازیں جاگ اٹھتی تھیں اور از سر نو کانوں میں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ میں تصور ہی تصور میں انہیں چلتا پھرتا، اونٹوں پر سوار اور جمع ہوتا دیکھ رہا تھا۔ تیرہ سو سال کے دوران آنے والے حجاج کا جم غفیر تھا، مجھے ان کے گزرے دنوں کی چاپ بھی سنائی دے رہی تھی۔ ایک ہی دین کے پروں پر اڑ کر یہ لوگ یہاں جمع ہوتے رہے، صدیوں بعد زندگی کا گرم لمس محسوس ہو رہا تھا۔ ان کے مضبوط پروں کے پھڑ پھڑانے نے مجھے بھی ان

کے محور میں کھینچ لیا تھا اور میرے اپنے گزرے دن ماضی سے حال میں داخل ہو گئے تھے اور میں ایک بار پھر اس میدان میں سوار پھر رہا تھا۔

سفید احرام میں ملبوس ہزاروں بدوؤں کے درمیان جو عرفات سے مکہ لوٹ رہے تھے میں بھی اس میدان میں سرپٹ دوڑتے جانور پر سوار تھا۔ سانڈنیاں دوڑ رہی تھیں، ان پر حجاج سوار تھے، رنگ برنگے پرچم بانسوں پر بندھے ہوئے فضا میں لہرا رہے تھے، یہ پھڑ پھڑ کرتے تو لگتا جیسے نقارے بج رہے ہوں۔ قبائلی جنگوں کے درمیان گائے جانے والے گیت ہوا میں بلند ہو رہے تھے۔ ہم اونٹوں پر سوار تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے بلکہ میدان عرفات میں اڑ رہے تھے مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے ہم ہوا کے سنگ اڑے جا رہے ہیں اس ہوا کے سنگ جس میں ایسی خوشی و مسرت شامل ہو گئی ہے جس کا نہ کوئی کنارہ ہے نہ حد...... اتنے میں ہوا نے میرے کانوں میں خوشی کے کسی نغمے کے یہ الفاظ ڈال دیئے تھے: ''کبھی نہیں، دوبارہ کبھی نہیں، تم آئندہ کبھی ایک اجنبی نہیں رہو گے!''

میں دائیں اور میرے بائیں میرے بھائی تھے، میں انہیں جانتا نہیں تھا مگر پھر بھی وہ میرے لیے اجنبی نہ تھے...... ہماری تلاش ایک ہی تھی، ایک ہی مسرت و شادمانی کی تلاش، ہم سب ایک ہی منزل کی تلاش میں تھے۔ وسیع دنیا ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے، ہمارے دلوں میں وہی چنگاری روشن ہے جو آنحضورؐ کے صحابہؓ کرام کے دلوں میں جلتی تھی۔ وہ میرے دائیں اور بائیں کے سب بھائیوں کو جانتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میرے بھائیوں سے جس کی توقع تھی وہ پوری نہیں ہو رہی اور صدیوں کے گزر جانے کے بعد ان کے دل چھوٹے پڑ گئے ہیں مگر تکمیل کا جو وعدہ ان سے کیا گیا تھا نہ ان سے لیا گیا ہے نہ ہم سے......

پھر جم غفیر کے درمیان میں سے کوئی اپنے قبیلے کی چیخ ترک کر کے عقیدہ و ایمان کی چیخ مارتا ہے: ''ہم اس کے بھائی ہیں جو اپنے اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتا ہے''! ایک دوسرا اس آواز میں ایک اور آواز شامل کرتا ہے: ''اللہ اکبر''۔ اللہ عظیم ہے، صرف اللہ عظیم ہے۔

اور پھر تمام قبیلے بھی ایک آواز نکالتے ہیں۔ وہ اب نجدی بدو نہیں رہ جاتے جنہیں اپنے قبیلے پر کبھی بڑا غرور تھا۔ اب وہ ایسے انسان ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ اللہ کے اسرار ان کے منتظر ہیں...... ہمارے منتظر ہیں...... ہزاروں اونٹوں کے قدموں کی آواز اور سینکڑوں پرچموں کے پھڑ پھڑانے کی آواز کے درمیان ایک

ہی آواز بلند ہوتی ہے: ''اللہ اکبر''! یہ لوگ اپنی چھوٹی زندگیوں سے کہیں بڑے ہو گئے ہیں اور ان کی قوت ایمانی انہیں بہا کر آگے لے جاتی ہے۔ وہ ایک واحد جسد کی شکل اختیار کر چکے ہیں......اب ان کی آرزو نہ چھوٹی رہتی ہے نہ پوشیدہ، تکمیل کی گھڑی آن پہنچی ہے اور انسان اللہ کی عطا کردہ خوشی و مسرت، علم جو آزادی ہے کے سہارے آگے بڑھتا ہے ایک ایسے کرۂ ارض میں جس کی کوئی حدود نہیں ہیں۔

سانڈنیوں کے جسموں کی بو، تھکن سے ان کے منہ سے نکلنے والی آواز، ان کے قدموں کی آواز کا شور انسانوں کے چلانے کی صدائیں، زینوں کی کھونٹیوں سے لٹکتی ہوئی بندوقیں، گرد و غبار کا پسینہ اور میرے ارد گرد کے انسانوں کے خوشی سے دمکتے چہرے اور ایک اچانک پیدا ہونے والی خوشی کا سکوت جو میرے اندر تھا......میں ان سب کو ساتھ لیے چلا جا رہا تھا۔

میں اپنی کاٹھی میں بیٹھے بیٹھے پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے ہزاروں حجاج سفید احرام میں ملبوس، اونٹوں پر سوار ہاتھ ہلاتے نظر آتے ہیں اور ان سب سے آگے وہ پل ہے جس پر سے گزر کر میں آیا ہوں: اس کا آخری کنارہ تو بالکل میرے پیچھے ہے مگر اس کا شروع کا کنارا فاصلوں کی دھند میں گم ہو چکا ہے۔

☆☆☆

17۔ ہیری سینٹ جان فلبی ...... برطانیہ عظمیٰ

1931ء

اس حصے میں جن سیاحوں کو شامل کیا گیا ہے ان میں سے وہ جو شاہ عبدالعزیز ابن سعود کو جانتے تھے وہ برطانوی مصنف اور مہم جو سینٹ جان فلبی ایسا تھا جو اس کے دربار میں کئی عشروں تک رہا اور کام بھی کیا۔ وہ بادشاہ کے ساتھ ایک ہی دستر خوان پر کھانا بھی کھاتا تھا اور ایک موقعہ پر اس نے ریاست کے نئے انقلاب میں ایک اہم کردار بھی ادا کیا تھا۔ اسی عرصے میں اس کے پاس ملک دیکھنے کا وقت بھی تھا اور اس نے پورے ملک کا تین چوتھائی حصہ دیکھ لیا تھا۔ برطانیہ کا سابقہ اعلیٰ سرکاری افسر، بادشاہ کا دوست، ایک نومسلم جان فلبی مکہ مکرمہ کے واقعات کو ایک ایسے نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے جو ہمارے اس پورے مجموعے میں بے مثال ہے۔ اس نے ایک مراعات یافتہ شہری کی حیثیت سے حج کیا تھا۔ وہ شاہی جلوس کے ساتھ سفر کرتا تھا، کبھی اونٹوں پر اور کبھی موٹر کار میں۔

ہیری سینٹ جان برجر فلبی سیلون میں 1885ء میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک کافی پیدا کرنے والے انگریز کا چار بیٹوں میں سے دوسرا بیٹا تھا۔ اس کی ماں آئرش تھی اور کولمبو میں رہتی تھی۔ جب ایک بت روگ (پودوں کی بیماری) نے 1880ء میں کافی کے کھیتوں کو تباہ کر دیا تو نقصان کا غم غلط کرنے کے لیے فلبی کے باپ نے کثرت شراب نوشی میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ ماں اور بچے لندن چلے گئے تھے جہاں وہ کئی برس تک زندہ رہے۔ اس دوران فلبی نے کوئن گیسٹ میں ایک بورڈنگ ہاؤس کھول لیا تھا اور فلبی نے ویسٹ منسٹر سکول میں وظیفہ حاصل کر لیا تھا جس کے بعد اسے انڈین سول سروس (آئی سی ایس) میں لے لیا گیا تھا۔ وہ 1907ء میں پنجاب آیا تھا۔ اسے فرانسیسی، جرمن، فارسی اور اُردو، چاروں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔

رچرڈ برٹن کی طرح فلبی کی زندگی پر ایک بدو نوجوان کا بڑا اثر تھا۔ دونوں اعلیٰ سرکاری افسر تھے اور

دونوں برطانیہ اور برطانیہ کی نوآبادی، ہندوستان کے درمیان سرکاری ملازمت کے دوران آزادانہ اور آسانی کے ساتھ گھومتے تھے۔ فلبی زیادہ کامیاب رہا۔ اس نے 1915-1909ء میں اس نے عربی سیکھنی شروع کر دی تھی۔ اسے سرگودھا میں ایس ڈی او (سب ڈسٹرکٹ افسر) کے طور پر تعینات کیا گیا تھا۔ اس کی شادی ہوئی اور وہ ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر ترقی پا چکا تھا۔ بعدازاں اسے برٹش لنگوئج بورڈ کا چیف بنا دیا گیا تھا۔ ملازمت میں فلبی ذہین اور گرم مزاج مشہور تھا جب یورپ میں جنگ عظیم اوّل شروع ہوئی تو اسے ہزاروں میل دور پھینک دیا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اسے اس بات کا بڑا شوق تھا کہ وہ جنگ میں حصہ لے اور ساتھ ہی وہ عربوں کے درمیان رہ کر کام کرنا چاہتا تھا۔ چند ماہ بعد اسے عراق بھیج دیا گیا تھا تا کہ وہ سرپرسی کاکس، چیف پولیٹیکل افسر کے ساتھ فرائض منصبی ادا کر سکے۔

کاکس نے 1917ء میں فلبی کو ریاض (سعودی عرب) کے قریب ابن سعود کے کیمپ میں بھیج دیا تھا تا کہ وہ مشرقی صحرائی قبائل اور شریف مکہ کے درمیان پائی جانے والی دشمنی کو ختم کرا سکے۔ ابن سعود برطانوی چالوں کو آہستہ آہستہ سمجھ سکا تھا مگر اس نے فلبی پر فوراً اعتماد کر لیا تھا جو ایک راستباز اعلیٰ سرکاری افسر تھا، عربی روانی سے بول سکتا تھا، مسلمانوں کے طور اطوار سے واقف تھا کہ ان کے درمیان اس کی تربیت ہوئی تھی۔ فلبی امیر کے الگ تھلگ کیمپ میں یورپ کے بارے میں معلومات لے آیا تھا۔ وہ بہادر، نڈر اور بیباک تھا۔ نجد میں واقع سعودی اڈے پر پہنچنے کے لیے اس نے نقشے کے بغیر عرب کے صحرا عبور کر لیے تھے۔ اسی سفر کی بنیاد پر اسے بعد میں رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے بانی کا تمغہ دیا گیا تھا۔ فلبی نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اکثر بدوؤں سے زیادہ سواری کر سکتا تھا اور اس کی سیر و سیاحت کی خواہش لامحدود تھی۔ وہاں پہنچنے کے بعد اس نے بادشاہ سے اجازت طلب کی کہ وہ جدہ جانا چاہتا ہے۔ ایک ہزار میل آگے کے سفر پر شریف حسین کی طرف سے پابندی تھی۔ ابن سعود کو فلبی کی یہ خواہش اچھی لگتی تھی کیونکہ یہ اپنے دشمن حُسین کو ناراض کرنے کا اچھا موقعہ تھا۔ چنانچہ اس نے اس سفر کے لیے اسے مقامی گائیڈ اور اچھے اونٹ مہیا کر دیئے تھے۔

آج کا سعودی عرب مغربی یورپ جتنا ہے۔ جب فلبی وہاں پہنچا اُس وقت اس کے کل رقبے کا چوتھائی حصہ نقشے پر موجود تھا۔ اس نے جب 1950ء کی دہائی میں اپنا سفر مکمل کر لیا تو قومی نقشہ کم و بیش مکمل ہو گیا تھا۔

سعودی عرب کی سیاحت کرنے والے مشہور سیاحوں میں نابھر، برکات، سٹیزن، برٹن، دوغتی، بلنٹ، مُوسل یا تھیسجر شامل تھے مگران میں سے کسی نے بھی فلبی کے مقابلے میں نصف علاقے بھی نہیں دیکھے ہوئے تھے۔ وہ ساٹھ برس کا تھا جب اس نے ان میں سے زیادہ حصے دیکھے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب موٹر کار صحراؤں میں متعارف ہوئی اس وقت یہ فلبی ہی تھا جس نے اونٹ پر سوار ہو کر ہزاروں میل کا سفر طے کرنے پر لینڈروور میں جانے کو ترجیح دی تھی۔ سعودی عرب کی جدید شاہراہوں کا پہلا سروے اس طرح مکمل ہوا تھا۔

ہم پہلے ہی یہ دیکھ چکے ہیں کہ سیاحوں نے جن میں ابن بطوطہ سے علی بے العباسی تک سبھی شامل تھے کس طرح مسلم حکمرانوں اور اداروں کو استعمال کیا اور مہم جوئی میں کامیاب ہوئے۔ فلبی نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے بادشاہ کے انعام واکرام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آئندہ تیس برسوں کی مہموں کو کامیابی سے سر کر لینے کا عزم کر لیا تھا۔ اس میں زیادہ وہ علاقے تھے جو اس نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ فلبی نے 1918ء اور 1955ء کے درمیانی عرصے میں رائل جیوگرافیکل سوسائٹی برطانوی خارجہ امور کے ادارے اور ابن سعود کو عربی نقشہ نویسی پر سب سے زیادہ کام فراہم کیا تھا۔ جب اس کے بدو دوست ہمت ہار جاتے تھے اور ان کے سر اور بندوقیں دونوں جھک جاتے تھے اس وقت فلبی چوٹیوں پر بے دھڑک چڑھ جاتا تا کہ اپنے نقشوں کو بہتر بنا سکے۔ اس کی ڈائریاں اور نوٹ بکس لندن کی رائل جیوگرافیکل سوسائٹی میں محفوظ ہیں۔ اس نے ہر منظر میں آنے والی تبدیلی اور سمت نما کی سمت، ہر نظر آنے والے جانور، سانپ اور کیڑے مکوڑوں کو ریکارڈ کیا۔ اس نے چٹانوں کے نمونے حاصل کیے اور انہیں بحری جہاز سے برٹش میوزیم کو روانہ کیا۔ اس کا طویل ترین سفر 1936ء میں مکہ اور مکالا کے درمیان تھا جس میں اسے آٹھ ماہ لگ گئے تھے۔ اس نے موسم گرما میں حجاز کا سفر موٹر کاروں میں کیا تھا۔ جب یہ سفر اپنے اختتام کو پہنچا اس وقت فلبی تنہا بے نیاز پیدل چل رہا تھا تو کہیں خچر پر سوار تھا اور آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع برفانی پہاڑوں پر گھوم رہا تھا۔ ہر نئے سفر سے واپسی پر اس نے ایک سفرنامہ لکھا تھا۔

درج ذیل روداد سے فلبی کے اسلام لانے کی کہانی سامنے آتی ہے۔ اس کے بعد 1931ء کے حج کے ریکارڈ میں سے لیے گئے منتخب حصے قاری تک پہنچتے ہیں۔ آئندہ دس برس تک فلبی ہر سال حج کے لیے جاتا تھا۔ وہ حج سفر کے نتیجے میں جو پست حوصلگی کے اثرات مرتب ہوتے تھے ان کا خلاصہ پیش

کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ حجاج کی تعداد 1931ء میں 130,000 سے 40,000 تک گر گئی تھی اور مزید دو سال بعد یہ تعداد اس سے بھی نصف ہو گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں سرکاری محاصل پانچ ملین پاؤنڈ سے گر کر دو ملین پاؤنڈ سے بھی کم تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ سعودی معیشت اب بھی حج کی مد میں آنے والے محصولات اور وصولیوں پر کس قدر انحصار کرتی تھی۔ اس بحران سے جو نقصان ہوا اس سے مقامی کرنسی کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ وہ وہاں ایک تاجر کی حیثیت سے موجود تھا مگر تجارت کے لیے درکار نقد رقوم ملک میں بھی نہیں تھیں۔ حج کے محصولات اور وصولیوں میں 1935ء تک کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

''عرب میں گزرے دن: آپ بیتی ایک حاجی کی'' میں سے

مصنف: ہیری سینٹ جان برجر فلبی

اسلام، امن وسلامتی کا دین۔ موسم گرما 1930ء...... اس تجارتی سفر پر جانے سے قبل میں اپنے صحافیاتی کام اور دوسری تحریروں میں مصروف تھا۔ میں بادشاہ کے مشیروں میں ایک خاص مقام ومرتبے پر فائز تھا اور حکومت وقت میں میری بڑی قدر ومنزلت تھی۔ جدہ میں یہ میری وہ زندگی تھی جس سے میں پوری طرح مطمئن تھا۔ مگر رفتہ رفتہ مجھے یہ خیال ستا رہا تھا کہ زندگی کے بقیہ دن وہاں گزارنا میرے لیے کچھ زیادہ باعث کشش نہ تھا۔ اسی لمحے میں اس بات کو بھی بنظر تحسین دیکھ رہا تھا کہ اس ملک کے موجودہ حالات میں، عرب میں میری سرگرمیوں کے دائرے کے وسیع ہونے کا کم موقعہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ ابن سعود میرے دوست ضرور تھے مگر کسی بھی بُرے وقت میں شاید وہ بھی میری کوئی مدد کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ وہ یہ حکمت عملی اپنائے ہوئے تھے کہ تمام یورپی ممالک کے ساتھ دوستانہ اور اچھے مراسم رکھے جائیں۔ ان میں برطانیہ سرفہرست تھا مگر یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت تھی کہ وہ اپنی سلطنت کو پوری دخل انداز سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ یورپ کی طرف سے سعودی عرب کی معیشت اور سیاست کا استحصال کرنے کے بھی خلاف تھے، جیسا کہ دنیا بھر میں وہ کر چکے تھے اور عرب میں جنگ عظیم کے آغاز سے ایسا ہو رہا تھا۔ میں اس پالیسی کے خلاف کچھ کہنے کی پوزیشن میں بالکل نہیں تھا اور میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھے اس ملک کے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں۔

اسے آپ جو نام مرضی ہے دیں مگر مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے عرب سے عشق ہو گیا تھا۔ اب مجھے مسئلہ یہ درپیش تھا کہ 1925ء کے بعد میں یہ سوچنے لگا تھا کہ میں عربوں کے ساتھ کہاں تک نباہ کر سکوں گا یا یہ بہتر ہوگا کہ میں جہاں سے آیا تھا وہیں واپس لوٹ جاؤں اور اس ماحول کا حصہ بن جاؤں جس کے لیے میری پیدائش اور تعلیم نے مجھے تیار کیا تھا۔ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا جس کا حل اتنی آسانی کے ساتھ

میرے ہاتھ آ جاتا۔ میں اب بھی جوان تھا اور انگلستان واپس جا کر اپنے سیاسی کیریئر پر توجہ دے سکتا تھا۔ اس سے میرے اس کاروبار پر بھی برا اثر نہ پڑتا تھا جو میں نے جدّہ میں شروع کیا تھا۔ دوسری طرف مجھے ابھی عرب کے بارے میں بہت کچھ سیکھنا اور دنیا کو سکھانا تھا۔ یہ میرے لیے افسوس کا تمام تھا کہ میں یہیں رہ کر اپنا کام مکمل نہیں کر سکتا تھا جس کا آغاز میں کر چکا تھا اور جس کے لیے میرے اندر صلاحیت بھی تھی۔ میں زندگی میں فیصلے جلد کر لیا کرتا ہوں مگر اس بار یہ فیصلہ کرنے میں مجھے ایک ہچکچاہٹ سی ہو رہی تھی شاید اس لیے کہ میں یہ جانتا تھا کہ اس بارے میں ایک بار جو فیصلہ میں نے کر لیا ہے اسے پھر بدلنا ممکن نہیں ہوگا۔ ابن سعود کو کچھ عرصے سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔ تاہم وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرے کسی بھی فیصلے کو بدلنے کے لیے مجھ پر دباؤ ڈالتا۔ اس کے خیال میں یہ میرا اور میرے ضمیر کا معاملہ تھا جس میں اس نے مجھے مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ اگر میں نے اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا تو وہ اسے خوشی سے قبول کرے گا اور مجھے خوش آمدید کہے گا۔

آخر میں ایک حادثہ پیش آیا جس نے مجھے یہ فیصلہ کرنے میں تیزی دکھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جولائی 1930ء کے آخر میں اور اگست کے ابتدائی ایام میں جدہ میں ناقابل برداشت گرمی تھی۔ درجہ حرارت 95-93 ڈگری تک پہنچ گیا تھا اور حبس ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ میں اپنی کتاب کے لیے ہندوستان کی سیاست پر چند ابواب مکمل کرنے کی فکر میں تھا۔ پھر اگست کے آغاز میں ایک بعد دوپہر میرا سر میز سے لکڑی کے ٹکڑے کی مانند جا ٹکرایا تھا۔ مجھے دنیا آنکھوں کے سامنے گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے زیادہ پرواہ نہ کی اور رینگتا ہوا صوفے تک پہنچ گیا تھا جہاں میں چند گھنٹے لیٹا رہا تھا۔ میں ٹھیک تو ہو گیا تھا لیکن مجھے ایک تشویش سی پریشان رکھنے لگی تھی۔ میرا ذہن پہلی کی طرح کام کر رہا تھا اور میں یہ سوچ سکتا تھا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا تھا۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

بادشاہ موسم گرما طائف میں گزار رہا تھا۔ وہ ریاض سے مکہ مکرمہ حج کی ادائیگی کے لیے آیا ہوا تھا۔ وہ جدّہ میں سر اینڈریوریان کو ملنے آیا تھا جو ان دنوں ابن سعود کے دربار میں پہلا برطانوی سفیر تھا۔ اس ملاقات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ریان سے دستاویزاتِ سفارت بھی وصول کیے جائیں۔ فواد حمزہ جو آج کل سیکرٹری خارجہ ہے۔ میں نے اسے اطلاع دی کہ میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا تھا اور وہ بادشاہ کو بتا دے کہ میں نے جن معاملات پر اس سے بحث کی تھی، میں نے ان کے بارے میں ایک حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے اپنی اس

خواہش کا اظہار بھی اسی کی معرفت کرنا چاہا تھا کہ میں بادشاہ سے طائف میں ملنا چاہوں گا تا کہ تفصیلات سے زبانی آگاہ کر سکوں۔ چند گھنٹوں بعد بادشاہ طائف سے خود فون پر مجھ سے بات کرنے کے لیے آ جا چکا تھا۔ اس نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا تھا کہ میں نے حلقہ بگوش اسلام ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اسی وقت فواد حمزہ کو میرے پاس بھیج رہا تھا تا کہ میں ایک دستاویز پر دستخط کر دوں۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ میں دستخط کرنے سے قبل اسے پڑھ لوں اور اسلام لانے کی کاغذی کارروائی پوری ہو جائے۔ یہ کارروائی مکہ کی مذہبی اتھارٹی کی تسلی کے لیے ضروری تھی کیونکہ اگلی شام مجھے فواد حمزہ اور وزیر مالیات عبداللہ سلیمان نے اپنے ہمراہ لے کر مکے جانا تھا تا کہ میں عمرہ ادا کر سکوں۔ پھر مجھے طائف میں خوش آمدید کہا جانے والا تھا۔ فواد سے گفتگو کے 24 گھنٹوں کے بعد یہ ساری کارروائی مکمل کر لی گئی تھی۔ اور 7۔ اگست 1930ء کو بعد دوپہر میرے عملے کو یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ مجھے وزیر مالیات سے وادی فاطمہ میں چند کاروباری معاملات پر گفتگو کرنے کے لیے جانا تھا۔ میں نے عربی لباس پہنا اور اپنی سبز فورڈ موٹر کار میں روانہ ہو گیا تھا...... میں پرانی زندگی سے نئی زندگی میں داخل ہونے جا رہا تھا۔

آج کا دن بے حد مبارک دن تھا کہ اس روز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ مجھے میرا کفیل حادہ میں ملا، ہم نے چائے اکٹھے پی، ایک خیمے میں وضو کیا اور ایک حاجی کے لباس میں باہر نکلے۔ نماز مغرب میں مجھے پہلی بار اپنے ہم مذہب لوگوں کے ساتھ خدائے واحد کی عبادت کا موقعہ ملا تھا۔ میں نے کھانا بھی ان کے ساتھ کھایا تھا۔ اب میں فواد حمزہ اور عبداللہ سلیمان کے ہمراہ صحرا کی خنک شام کو شہر مقدس کی سرحد کے قریب سے گزر رہے تھے۔ ہم مکہ میں عبداللہ سلیمان کے گھر پہنچ گئے تھے۔ وہاں ہم نے [illegible] پینے کے لیے کچھ دیر رکے پھر مسجد حرام کی جانب چل پڑے تھے۔ خانہ کعبہ کو غسل دینے کی رسم شروع ہونے والی تھی اور میں نے عمرہ بھی کرنا تھا۔ یہ بے حد متاثر کرنے والا تجربہ تھا جس میں ایک رعب اور دبدبہ تھا کہ میں جس کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ میرے لیے کچھ بھی نیا نہیں تھا، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس ساری رسم سے پہلے سے واقف تھا۔ بس ایک بھولی بسری یاد تھی کہ تازہ ہو گئی تھی۔ مجھے یہ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ میں ذہنی اور روحانی طور پر سر تسلیم خم کر دینے پر ایک عجیب سا اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ جو میں کر رہا تھا اس کے نتائج کیا نکلیں گے۔ جنہیں بہر صورت نکلنا تھا، یہ سب میں جانتا تھا۔ مجھے اس تنقید اور تبصرے کی بھی امید تھی جو میرے مسلمان ہو جانے کے بعد متوقع تھا۔ جیسا کہ میں نے بعد ازاں اپنے ایک اچھے دوست کو لکھا تھا کہ میں

نے یہ قدم اٹھا کر میں نے اپنی عقل سلیم یا خلوص کو قربان نہیں کیا تھا بلکہ ریان نے میری طرف سے اس اقدام کے جواز کے لیے ایک بہترین فارمولا تلاش کر لیا تھا۔'' مکہ اور اسلام قلبی کو وہ پس منظر دیں گے جو اسے اس وقت سے درکار تھا جب اس نے حکومت کے ساتھ جھگڑا کیا تھا'' ۔ اب میرے اندر زندگی میں کوئی بڑا اور عظیم کام کرنے کی آرزو پیدا ہو گئی تھی جسے اب میں نے مستقبل میں تکمیل تک پہنچانا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک بھٹکی ہوئی رُوح کو کسی حادثے یا معجزے نے اس کا مطلوبہ ماحول فراہم کر دیا تھا۔ زندگی میں ایک طویل عرصے بعد مجھے دنیا میں ایک انوکھا سا اطمینان اور سکون محسوس ہوا تھا۔

مکہ مکرمہ کے حج کی تیاریاں: اپریل 1931ء کے تیسرے ہفتے میں حجاج کے آخری گروپ کے بحری جہاز مصر، سوڈان، مراکش، شام، ہندوستان اور مشرق بعید سے جدہ پہنچ گئے تھے۔ سمندر پار سے 40,000 حجاج مکہ میں جمع ہوئے تھے۔ ابھی نجد اور یمن سے حجاج متوقع تھے جن کے ساتھ مقامی حجاج کی شمولیت سے آئندہ چند دنوں میں حاجیوں کی تعداد دوگنی ہونے والی تھی۔

گذشتہ پانچ برسوں کے دوران باہر سے آنے والے حجاج کی تعداد 80,000 اور 120,000 کے درمیان رہی اور 1931ء میں ان کی تعداد میں کمی کا بڑا باعث عالمی سطح پر اقتصادی بدحالی تھی۔ پھر 1932ء میں یہ تعداد مزید کم ہو کر 30,000 اور 1933ء میں صرف 20,000 رہ گئی تھی۔ مگر 1934ء میں اس تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا جب باہر سے آنے والے حجاج کی تعداد 25,370 ہو گئی تھی۔ پھر اس زمانے سے اس تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے چھڑ جانے سے ایک بار پھر یہ تعداد پیچھے کی طرف مڑنے لگی تھی۔ جنگ عظیم سے دس سال قبل مکہ آنے والے غیر ملکی حجاج کی تعداد 35000 ہو گئی تھی۔ اس دور سے قبل صرف ملایا اور ڈچ جزائر شرق الہند سے 50,000 سے زائد حجاج آتے تھے۔ اس کے نتیجے میں ان ممالک کی پیداوار کی قیمتوں میں کمی آ گئی تھی جس میں چینی اور ربڑ خاص طور پر قابل ذکر تھے۔

19۔ اپریل کو حجاز میں پہلی کا چاند نظر نہیں آیا تھا۔ صحراؤں اور کوہستانی علاقوں سے آنے والے نئے حاجیوں کو اُس شام بڑا انتظار تھا کہ چاند نظر آ جائے گا۔ حج کی ادائیگی کا دن 9۔ ذی الحجہ کو تھا جس کے لیے چاند کا نظر آنا ضروری تھا کیونکہ اس دن کا تعین چاند کے نظر آ جانے کے ساتھ مشروط ہوتا تھا۔ 23۔ اپریل کو جمعرات کا دن تھا، ذی الحجہ کی پانچ تاریخ تھی جب یہ تصدیق کر دی گئی تھی کہ چاند نظر آ گیا ہے اور فلاں روز حج ہوگا۔ چاند دراصل 19۔ اپریل سے قبل کی شام کو نظر آ گیا تھا اور ذی الحجہ کی نو تاریخ کو پیر تھا اور انگریزی مہینے

کی 27 تاریخ بنتی تھی۔ اب منیٰ اور عرفات پر پہنچنے کی منصوبہ بندی کی جاسکتی تھی۔ کچھ لوگ 24 اپریل کو جمعہ کی نماز کے بعد مکہ سے چل پڑے تھے۔

اسی شام شاہی محل میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں چھ سات سو مہمان مدعو تھے۔ ان میں افغانستان کا سابق بادشاہ امان اللہ خان، شہزادہ احمد سیف الدین عثمانیہ خاندان کے سلطان عبدالعزیز کا پوتا، قاہرہ میں افغان وزیر اور افغان وقت حاکم کے کئی نمائندے، نادر خان بنگال ایگزیکٹو کونسل کے رائے کے غزنوی اور بہت سے دوسرے جن کے نام شمار نہیں کیے جاسکتے۔ تقریباً ہر ملک کے نمائندے اور مسلم برادری کے نمائندے بھی شامل تھے۔

حج جلوس: دوسرے روز احرام میں ملبوس حجاج ننگے سر عرفات کی جانب ایک سیلاب کی شکل میں بڑھ رہے تھے۔ وہ کھلی گلی جو مسجد حرام سے شہر کی مشرقی سمت جاتی ہے اور المعلیٰ قبرستان کے قریب سے گزرتی ہے۔ اس میں حجاج کا جم غفیر تھا اور دن بھر انسانوں اور اونٹوں کی قطاریں شہر سے نکلتی رہی تھیں۔ یہ فاصلہ نو دس میل کا تھا جسے آہستہ آہستہ طے کیا جا رہا تھا۔ ان کے درمیان سے کچھ حجاج گدھوں پر سوار تیزی سے آگے نکلنے کے لیے راستہ بناتے جا رہے تھے۔ پیدل سفر کرنے والوں میں مرد، عورتیں، بچے بھی شامل تھے جو ٹولیوں میں جا رہے تھے۔ ان کے اپنے اپنے پرچم تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے عرفات پر خیموں کا ایک نیا شہر آباد ہو گیا تھا۔ سفید احرام میں ملبوس حجاج کے درمیان رنگ برنگے پرچم ایک خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے۔ ادھر مکہ میں مشرق سے آنے والے نئے حجاج کے گروپ ابتدائی رسوم کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ دو دنوں کے لیے ان موٹر کاروں کا شہر میں چلنا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا جنہیں بادشاہ کے اپنے دستخطوں کے ساتھ ایک اجازت نامہ، عام دنوں میں ان گاڑیوں کو شہر میں چلانے کے لیے حاصل رہتا تھا۔ شام قریب تھی اور اونٹ، گدھے، پیادہ پہلے سے زیادہ تعداد میں پہلے سے موجود حجاج میں شامل ہو رہے تھے۔

عرفات کی سمت خروج: دوسرے روز تک حجاج کا سیلاب بدستور عرفات کی سمت رواں دواں تھا۔ صرف بادشاہ اور درباری ابھی تک اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے کیونکہ ان کی روانگی کا وقت بعد دوپہر کا تھا۔ بادشاہ نے کہا: ''یہ ایک مہم کی طرح ہے حج کی ادائیگی بھی''۔ اور اس کے لیے ایسا ہی تھا۔ تمام سرگرمیوں کی رپورٹ اسے برائے اطلاع یا برائے اخراجات مل رہی تھی۔ اس میں ٹریفک کی خلاف

ورزیوں کی رپورٹ بھی شامل تھی اور کسی ٹریفک کے حادثے میں زخمی ہو جانے والے حجاج کے بارے میں
اطلاع بھی یا شاہی خاندان کے لیے یا کسی بڑے افسر کے لیے موٹر گاڑی کی ضرورت کے بارے میں
درخواست بھی شامل تھی۔

مجھے بادشاہ کے ساتھ سوار ہو کر جانا تھا مگر میرا اونٹ چونکہ دیر سے آیا تھا اس لیے مجھے وزیر مالیات اپنے ہمراہ موٹر کار میں لے گئے تھے۔ یوں مجھے یہ موقعہ ملا تھا کہ میں وہ سڑک بھی دیکھ لوں جس پر صرف موٹر کاریں چلتی تھیں اور اونٹوں و دیگر جانوروں اور پیدل چلنے والوں کو اس پر سفر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ایک نجدی اونٹ تو آج بھی موٹر کار کے شور پر احتجاج کرتا ہے حالانکہ حجاز میں تو اونٹ اب ان گاڑیوں کے شور شرابے سے مانوس ہو گئے ہیں۔

منٰی کے جنوب میں موٹر کاروں کے لیے مخصوص راستہ اس وادی میں سے گزرتا ہے جس میں اس سڑک کی تعمیر ملکہ زبیدہ نے کرائی تھی۔ ہمیں راستے میں ایک دو کاریں ریت میں پھنسی ہوئی نظر آئی تھیں۔ ایک گاڑی تیز رفتاری کے باعث الٹ بھی گئی تھی اور اس میں سوار افراد زخمی ہو کر اسی کے سایے میں منتظر تھے کہ انہیں مرہم پٹی کے لیے کب کسی ہسپتال میں لے جاتے ہیں۔ ہم بخیر و عافیت منٰی پہنچ گئے تھے۔ نئے تعمیر شدہ منٰی محل میں اس وقت بادشاہ اکیلا استقبالی کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے محافظوں کے اونٹ محل کے چاروں طرف کھڑے تھے۔ شاہی خاندان کے باقی افراد اپنے اپنے خیموں میں تھے۔

منٰی سال کے 350 دنوں میں ویران گاؤں رہتا ہے پھر حج کے دنوں میں اچانک اسے زندگی مل جاتی ہے۔ یہاں کے ایک ایک مکان میں حجاج ٹھہرتے اور بھاری کرائے ادا کرتے ہیں۔ صرف حج کے چند دنوں کا کرایہ مکان تیس چالیس پاؤنڈ وصول کیا جاتا ہے۔ اس کی وادی میں خیموں کا ایک شہر چند دنوں کے لیے آباد ہو جاتا ہے۔ اس کی واحد سڑک گاؤں کے اندر سے اور وادی کے وسط سے گزرتی ہے۔ اس میں سے پیدل گزرنے والوں اور قافلوں کا ایک سمندر تھا جو عرفات کی سمت بڑھ رہا تھا۔ حنبلی مسلک کے برعکس بہت سے حجاج یہاں رات بسر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ نجد کے لوگ بھی یہاں رات کو ٹھہرتے ہیں کیونکہ آنحضورؐ نے منٰی میں رات گزاری تھی۔ عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں یہیں ادا کی جاتی ہیں کہ یہی سنت نبوی ہے۔ یہ اگلی صبح سورج کے نکل آنے کے بعد یہاں سے روانہ ہو جاتے ہیں۔

محل کے قریب شاہی پارٹی کے لیے رات کے کھانے کا اہتمام ایک بہت بڑے خیمے میں کیا گیا

کھانے کے بعد میں کیمپ اور گاؤں میں گھومتا رہا تھا۔ اونٹوں اور لوگوں کے درمیان گھومنا پھرنا کوئی آسان
کام نہ تھا۔ چاندنی نے رات کے منظر کی دلکشی کو دوبالا کر دیا تھا۔ تینوں شیطان اس گاؤں میں تھوڑے
فاصلے پر تھے۔ یہ ایک ستون کی شکل میں بنائے گئے تھے اور ان کے گرد دائرے کی شکل میں مناسب اونچائی
والی دیوار تھی۔ اسے حال ہی میں چونا کیا گیا تھا۔ منیٰ کے دکانداروں نے حجاج کے لیے اپنی دکانوں پر
کھانے پینے کی اشیاء، پانی اور یادگاری چیزیں سجا رکھی تھیں۔

میں نے اپنا بستر بڑی سڑک کے نزدیک اس چبوترے پر ستاروں بھرے آسمان تلے بچھا لیا تھا، جو
سڑک سے متصل تھا۔ میں احرام ہی میں سو گیا تھا۔ رات بھر عرفات کی طرف جانے والے قافلے قریب سے گزر
رہے تھے، تین سو موٹر گاڑیوں پر مشتمل ایک قافلہ شاہی خاندان کے افراد کو لے کر منزل کی سمت جا رہا تھا۔ ان
میں ارکان مرد اور غلاموں کے علاوہ بچے بھی تھے۔ سب سے کم عمر ان میں طلال تھا جو صرف ایک سال کا تھا جو
بادشاہ کے پچاس بچوں میں سب سے چھوٹا تھا۔

مشرق میں ایسے مبارک موقعوں پر سونے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ مجھ سمیت بہت سے بیشک سو
رہے تھے مگر میں 3 بجے فجر کی نماز کے لیے اٹھ گیا تھا۔ ہم جس وقت چائے، کافی پی رہے تھے بادشاہ اس وقت
تلاوتِ قرآن پاک میں مصروف تھا۔

طلوع آفتاب کے ساتھ اونٹوں کی حرکت شروع ہو گئی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد ہم سب اونٹوں پر سوار
ہو چکے تھے اور بادشاہ کی پارٹی بھی وادی سے نیچے جا رہی تھی۔ اس صبح بادشاہ کے پیچھے پیچھے دس ہزار اونٹ،
کاروں سمیت چل رہے تھے، یہ حج کی صبح تھی۔ مزدلفہ کے واحد مینار کے قریب سے ہم گزر رہے تھے۔
ہمیں راستے میں پانی کے حوض بھی نظر آ رہے تھے اور ایک آب ریز بھی جسے ملکہ زبیدہ نے بنوایا تھا۔ پھر وادیٔ
نمرہ آئی جس میں مسجد نمیرا ہے جس کا کوئی مینار نہیں ہے۔ عرفات کے میدان کی طرف دو ستون ہیں جو عرفات
کی حدود کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ہم سنتِ نبوی کی پیروی میں یہاں رک گئے تھے اور اگلے روز بعد دوپہر تک
رکے رہے تھے۔ ہم سب سے پہلے خیمے نصب کر دیئے گئے تھے اور ناشتہ کے بعد سو گئے تھے۔ جبل رحمت ہم سے
زیادہ دور نہ تھا۔ یہ میدان عرفات کا قابل ذکر مقام ہے۔ اس کی چوٹی پر ایک ستون نظر آ رہا تھا۔ راتوں رات
حاجیوں کے ٹھہرنے کے لیے خیمے نصب ہو گئے تھے۔ ہمارے چاروں طرف وادی اریناتھی جس میں فاصلے
فاصلے پر خیمے نصب تھے۔ نمیرا مسجد میں حجاج کی بڑی تعداد جمع تھی جن میں زیادہ تر سیاہ فام افریقی تھے۔ گرمی

بہت زیادہ تھی اور ہم نیم ڈھکے جسموں کو دھوپ سے بچانے کے لیے خیموں کے سائے میں پناہ لے رہے تھے۔ پانی وافر مقدار میں دستیاب تھا اور شاہی محل سے برف بھی آجاتی تھی۔

بادشاہ تھوڑی دیر کے لیے سو گیا تھا اور دوپہر کے فوراً بعد ہمیں اس کے خیمے میں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا گیا تھا۔ اس کھانے میں چاول، گوشت اور چند دوسری چیزیں شامل تھیں۔ ہم اس کے بعد ریت پر جب چلے تو برہنہ پاؤں کو یہ ریت جلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ ہم میں سے ہر ایک کو سینڈل پہننے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہمیں نمیرا مسجد تک جانا تھا جہاں حجاج کا بڑا اجتماع ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں محراب تک منبر کے قریب جانے کا راستہ دے دیا گیا تھا۔

شیخ عبداللہ ابن حسن نے وعظ فرمایا تھا۔ وہ ایک منبر پر چڑھ کر حجاج سے مخاطب تھے، ان کے ہاتھ میں شتربان کی چھڑی تھی۔ انہوں نے حج سے متعلق آنحضورؐ کے خطبہ حجتہ الوداع کے حوالے پیش کیے تھے۔ اس تذکرے سے حجاج زار و قطار رو رہے تھے کیونکہ تیرہ سو برس پہلے کی پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں آپ کی یاد تازہ کر رہی تھیں۔ میرے قریب ہی ایک ہندوستانی سسکیاں بھر رہا تھا۔ یہ جس موقعہ کی باتیں تھیں اس موقعہ پر وہ دین مکمل ہو گیا تھا جو بعدازاں عرب سے نکل کر ایشیاء، افریقا اور یورپ میں پھیلا تھا اور کروڑوں انسانوں کو ایک رہنما روشنی میسر آئی تھی۔

مسجد نمیرا کے اس وعظ کے بعد ظہر اور عصر کی نمازیں شیخ عبداللہ کی امامت میں ادا کی گئی تھیں۔ پھر حجاج مسجد سے باہر نکل کر اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے تھے۔ اب بہت سے ہندوستانی اور دیگر ممالک کے حجاج بادشاہ سے ملنے اس کے خیمے میں گئے تھے۔ ان کی تواضع کافی اور کھانے پینے کی چیزوں سے کی گئی تھی......

اب نجد کے دو تین سو مضبوط اور صحت مند حجاج احرام میں ملبوس بادشاہ کے پاس حاضر ہوئے تھے۔ انہوں نے بندوقیں بھی اٹھا رکھی تھیں، گولیاں رکھنے والی پیٹیاں، تلواریں اور خنجر بھی ان کے جسموں سے لٹک رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے اپنے وقار کی خاطر باقاعدہ فوجی دستے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا جنہیں یورپی طرز پر سیلوٹ کرنے اور فوجیوں کی طرح پریڈ کی تربیت دی گئی تھی۔ مگر حج کے دوران ان فوجیوں کو بھی وردی کی جگہ احرام باندھنا ہوتا ہے تاکہ صحرا اور شہر میں پلے ہوئے سپاہیوں میں کوئی فرق محسوس نہ ہو۔ ان نئے تربیت یافتہ سپاہیوں کی موجودگی کے باوجود پرانے باڈی گارڈ بھی اپنے فرائض سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ یہ

تو کسی بھی لمحے اکیلا نہیں چھوڑتے تا کہ ہر خطرے سے اسے محفوظ رکھ سکیں۔

جبل رحمت کی بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کی چقماق کی چوٹی 100 سے 150 فٹ تک بلند ہے۔ جس ایک سفید ستون نظر آتا ہے۔ اس کی تین کم بلند چوٹیاں بھی ہیں، جن کی ریتلی ڈھلوانیں ہیں۔ اس پہاڑ کے غرب اور جنوب میں میدانِ عرفات ہے جس میں خیموں کا عارضی شہر آباد ہے۔ اس جگہ کو وادی ارینا میں بڑی اہمیت حاصل ہے جہاں کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کا خطبہ دیا تھا۔ نجد کے لوگ یہاں آ کر ضرور کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کی اس وقت تعداد ہزاروں میں پہنچ جاتی ہے۔ ان کی یہاں آمد بجے بعد دوپہر سے شروع ہوتی ہے، جب بادشاہ اور ان کی پارٹی سبز وہابی پرچموں کو لہراتے ہوئے ان کے درمیان آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص اونٹ پر سوار ہوتا ہے مگر ان کا منہ پہاڑی کی طرف نہیں (حالانکہ اس کی اجازت ہے) بلکہ خانہ کعبہ (قبلہ) کی جانب ہوتا ہے۔ اس مجمع میں اونٹوں پر سوار خواتین بھی تھیں جنہوں نے اپنے آپ کو مردوں کی نظروں سے چھپا رکھا تھا۔ مرد سروں سے ننگے تھے، احرام میں تھے، انہوں نے دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی چھتری نہیں اٹھا رکھی تھی، جس طرح غیر نجدی حجاج کے ہاتھوں میں چھتریاں تھیں۔ دو بجے سے لے کر شام تک وہ دعائیں مانگی جا رہی تھیں جو اس موقعہ کے لیے مخصوص تھیں۔ ایک دعا ان میں اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی کے لیے ضروری مانگی جا رہی تھی۔ نجدی گروپ کے ساتھ، جو باقی حجاج کی طرح ننگے سر تھے، بادشاہ کھڑا تھا جس کے ہمراہ اس کے بھائی اور بیٹے تھے جن کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی دعاؤں کی کتاب تھی جو اس موقعہ کے لیے بطور خاص شائع ہوئی تھیں۔

اس وسیع میدان کے ان حصوں میں، جہاں میں نہ جا سکا تھا عید کا سا سماں تھا۔ حجاج دھوپ میں باہر نکلے یا خیموں میں رہنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ گرمی کافی تھی حالانکہ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ غریب لوگ اپنے ساتھ کھجور کے درخت کی ٹہنیاں لائے ہوئے تھے جن سے وہ سائبان کا کام لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ افریقا کے سیاہ فام حبشی خیموں سے باہر پہاڑی پر گھوم رہے تھے یا نہر زبیدہ کے کنارے پر تھے جہاں انہیں پانی وافر مقدار میں مل سکتا تھا جسے وہ پی سکتے تھے، وضو کے لیے بھی استعمال کر سکتے تھے۔

سوڈان اور نائیجیریا کے حجاج کی الگ الگ شناخت تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے گھروں سے مکہ مکرمہ تک پہنچنے میں کئی کئی برس لگا دیتے تھے۔ وہ افریقا کے براعظم سے چلتے وقت یہ طے کر لیتے تھے کہ سوڈان جا کر وہاں کئی برس کام کریں گے پھر حج پر روانہ ہوں گے۔ مجھے ایک جوڑا ایسا بھی ملا تھا جو جب سفر پر روانہ

ہوا تھا تو ان کا ایک بچہ تھا اور جب وہ حج ادا کر چکے تھے تو ان کے چھ بچے ہو گئے تھے۔ مکہ پہنچتے پہنچتے انہیں 14 برس لگ گئے تھے۔ ایک حاجی مجھے ایسا بھی ملا تھا جس کی عمر 120 سال تھی۔ میں اسے 1930ء میں جدہ میں ملا تھا جہاں اسے لاگوس سے پیدل پہنچنے میں 70 برس لگ گئے تھے۔ اس نے پوری عمر مطالعہ دین اور فلسفے کی تعلیم حاصل کرنے میں گزار دی تھی۔ راستے میں اسے جہاں بھی اچھے مدارس ملتے یہ وہاں حصول علم کے لیے رک جاتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جس سال مہدی کی فوج کے ہاتھوں مصری سوڈان کے برطانوی گورنر چارلس گارڈن کی موت واقع ہوئی اس سال وہ وہاں موجود تھا۔

گو عرفات پر اس وقت کوئی خاص رسم تو ادا نہیں ہو رہی تھی مگر حجاج اپنے طور پر جو پسند کرتے، اس میں مصروف تھے۔ دراصل مقررہ اوقات میں ان کا میدانِ عرفات میں موجود رہنا ضروری تھا کیونکہ اس سے ان کو یہ تسکین ملتی تھی کہ وہ وہاں ''کھڑا رہنے'' کی پابندی کر رہے تھے۔

مصری حجاج اپنی کسی رسم کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ میں نے انہیں، مردوں عورتوں کو ایک جگہ جمع دیکھا، ان کی پیٹھ مکہ کی طرف اور منہ جبل رحمت کی طرف تھے، ان کا ایک لیڈر جوان کے سامنے کھڑا تھا اور یہ جس کے پیچھے صف آرا تھے، وہ کچھ پڑھ رہا تھا اور یہ سب بیک زبان اس کے پیچھے پیچھے وہ الفاظ دہراتے جاتے تھے۔ ایسا کرتے وقت وہ اپنے رُومال پہاڑی کی طرف بلند کر کے لہرا رہے تھے۔ یہ رسم محمل کے دنوں سے چلی آ رہی تھی اور انہیں اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ وہابیوں کا اس بارے میں کیا خیال تھا۔ ویسے بھی وہابی پہاڑی کی دوسری طرف تھے جہاں سے نہ وہ انہیں دیکھ سکتے تھے نہ یہ ان کو۔ بیس تیس کے گروپ خیموں کے سایوں میں کھڑے تھے۔ کچھ بیٹھے ہوئے تھے اور چائے پی رہے تھے۔ چند ایک غروب آفتاب تک سو گئے تھے۔

غالباً یہ کھڑے رہنے کی رسم ترکوں یا شریف خاندان کے حکمرانوں کے عہد میں وجود میں آئی ہوگی۔ پہاڑ پر دیئے جانے والے وعظ میں بھی ہو سکتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آئی ہوں۔ تاہم نجدیوں نے آ کر اس میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اب یہ رسم حج کا ایک حصہ بن چکی تھی جس میں انسان کے اندر ایک عجز وانکساری پیدا ہوتی ہے۔ انسانی قوت برداشت میں اضافہ ہوتا ہے اور یہی اللہ کو پسند ہے۔

سورج جبل ثور کی طرف غروب ہو رہا تھا اور گرمی کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ سیاہ پہاڑیوں کی لکیر

کے پیچھے سورج آہستہ آہستہ غروب ہو گیا تھا۔ دعاؤں کی آواز مدھم ہوتے ہوتے خاموشی میں بدل گئی تھی۔ سورج کے غروب ہوتے ہی پھر سے چہل پہل شروع ہو گئی تھی کیونکہ واپسی سفر کی تیاریوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے کسی مصنف نے آج تک یہ نہیں لکھا کہ عرفات کی رسم دراصل اونٹوں کا میلہ ہے۔ میں نے دور تک نظر دوڑا کر دیکھا تو مجھے اونٹ ہی اونٹ دکھائی دیئے اور اس منظر نے مجھے اونٹ ہی اونٹ دکھائی دیئے اور اس منظر نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ عرفات کے وسیع میدان سے لے کر وادی کی طرف، جو راستہ مکہ کو جا رہا تھا اس پر حد نگاہ تک اونٹ ہی اونٹ تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان کی تعداد پچاس ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ یہ خاموشی کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے، ریگستان کے اس جہاز کی یہی خوبی ہے، بھوکا پیاسا بھی میلوں چلتا رہتا ہے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا، اونٹوں کے چلنے سے مٹی اڑنے لگی تھی۔ اب آسمان پر چاند اور کچھ ستارے زیادہ نمایاں تھے۔ چاند کی چاندنی میں بھی کوئی چیز اب صاف دکھائی نہ دیتی تھی۔ پہاڑیوں کے درمیان پہنچ کر راستہ تنگ ہو گیا تھا۔ قافلے میں اونٹ بھی تھے، اونٹ سوار بھی، پیدل چلنے والے حجاج بھی جن میں مرد عورتیں دونوں شامل تھے۔ کچھ راستے میں تھک کر بیٹھ گئے تھے اور دم لے کر دوبارہ چلنے والے تھے۔ اونٹوں کے راستے میں جو چیز آ جاتی یہ اس سے بچ کر نکل جاتے تھے۔

مکہ مکرمہ واپسی: ہم سرحد کا تعین کرنے والے ستونوں سے گزر کر مکہ کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ سفر کے دوران ہمیں ایک ایسا شہر نظر آیا جس میں چراغ جل رہے تھے، کھمبوں پر چھوٹے چھوٹے لالٹین بھی روشنی دے رہے تھے۔ ہم نے سوچا صبح آتے ہوئے تو یہ شہر دکھائی نہیں دیا تھا پھر یہ شام کے دھندلکوں میں اچانک کیسے آباد ہو گیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ مزدلفہ تھا جہاں آنحضورؐ کی سنت کی پیروی میں ہمیں رات بسر کرنی تھی۔ بادشاہ اور اس کی پارٹی نے ایک ڈھلوان پر اس مسجد کے قریب پڑاؤ ڈال دیا تھا جس مسجد کا کوئی مینار نہیں ہے۔ موٹر گاڑیوں کی ایجاد نے اس خوبصورت منظر میں ایک بدنظمی اور ابتری متعارف کرا دی تھی جس سے اب رات زیادہ بھیانک لگتی تھی۔ مگر بظاہر کوئی حادثات نہیں ہو رہے تھے اور شاہی خاندان کا سامان اب ان خیموں میں رکھا گیا تھا جو اس مقصد کے لیے نصب کیے گئے تھے۔

حج کے منظر نامے میں موٹر کاروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر جن دنوں میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ ان دنوں تک یہ صرف شاہی خاندان تک محدود تھیں یا ان اعلیٰ سرکاری افسروں کے استعمال میں تھیں جنہیں فرائض منصبی کی ادائیگی کے دوران ان کی ضرورت ہوتی تھی۔ پھر 1933ء میں ایک بڑے دائرے تک ان کے پھیل

جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ایک سال اور گزرا تو ہر خاص و عام کو اجازت مل گئی تھی کہ جو بھی موٹر کار رکھنا چاہتا ہے خرید سکتا ہے۔اب حج کے دوران استعمال ہونے والی موٹر کاروں کی تعداد چار سو تک پہنچ گئی تھی۔اس کے بعد اس تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔غیر ملکی حجاج جو اس آسائش سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

چاروں طرف اُونٹوں کے بلبلانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور لوگ اپنے گمشدہ ساتھیوں کو تلاش کرنے میں مصروف تھے،جن کی آوازیں کانوں میں آ رہی تھیں۔رات کو آباد ہو جانے والے اس شہر میں جو کھمبیوں کی مانند زمین پر نمودار ہو گیا تھا۔یہ لوگ اپنے ساتھیوں کو کیسے تلاش کریں گے۔اس شہر نے دن میں نظر اس لیے نہیں آنا تھا کیونکہ طلوع آفتاب سے بہت پہلے ہمیں یہاں سے چلے جانا تھا۔

بادشاہ نے خود بھی کُھلے آسمان تلے قالینوں پر پڑاؤ کیا تھا۔چاول گوشت پکوا کر ہماری تواضع کی گئی تھی۔ہم نے سیر ہو کر کھانا کھایا تو اس کے بعد محافظوں کو کھانا دیا گیا تھا۔پھر بادشاہ نے حکم دیا کہ باہر جا کر اجنبی حجاج کو بلا کر کھانا کھلایا جائے۔یہ سینکڑوں میں تھے جنہوں نے شاہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا تھا اور اُنہیں اگلی صبح کے لیے کچھ کھانا ساتھ دے دیا تھا۔ان کے پیٹ بھر گئے تھے اور وہ خوش خوش جا رہے تھے۔اُن کی زبانوں پر تشکر آمیز الفاظ تھے۔میں سو گیا تھا مگر نصف شب کے بعد موٹر کاروں کی آواز نے مجھے نیند سے جگا دیا تھا۔چند قدم کے فاصلے پر میں نے بادشاہ کو تلاوتِ قرآن پاک کرتے دیکھا۔مجھے نیند تو اب بھی آ رہی تھی لیکن میں اب سونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ پھر فجر کی نماز کے لیے اٹھنا مشکل ہو جانا تھا۔ہم اب اونٹوں پر سوار ہو کر مزدلفہ کے مینار کی طرف جا رہے تھے،جہاں پہنچ کر ہم رک گئے تھے۔مینار کے ساتھ لالٹین لٹک رہے تھے۔حجاج کے گروپ اس مینار کے گرد جمع ہو گئے تھے۔باقی کے حجاج وادیٔ مُحسر میں تھے جہاں وہ شیطانوں کو مارنے کے لیے کنکریاں جمع کر رہے تھے۔ہم نے رات جہاں پڑاؤ کیا تھا وہاں سے کنکریاں جمع کر لی تھیں۔مزدلفہ کے گرد و نواح سے کہیں سے بھی یہ کنکریاں جمع کرنے کی اجازت تھی۔تاہم زیادہ تر لوگ اسی وادی سے کنکریاں جمع کرتے ہیں۔ہم نے یہ کنکریاں احرام کی چادر کے کونے میں باندھ لی تھیں۔

مجھے بعد میں مِنیٰ میں بہت سے حجاج نظر آئے جنہیں مزدلفہ سے کنکریاں جمع کرنے کی اہمیت کا علم نہ تھا۔پچاس ہزار حجاج نے شیطانوں کو کنکریاں مارنی تھیں اور ہر حاجی نے 49 کنکریاں مارنی ہوتی ہیں۔مگر ہر سال ایسا کرنے کے باوجود یہاں کنکریوں کے ڈھیر جمع نہیں ہوتے تھے۔

دن کی روشنی پھیلتے ہی مینار پر سے لیمپ اتار لیے گئے تھے۔ہم نے منیٰ کی جانب روانگی شروع کر دی تھی۔ ہمارے اونٹ ایک جگہ پہنچ کر بدک گئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ راستے میں ایک اونٹ ہم سے پہلے گر کر مر گیا تھا۔ میں نے ایک مریض یا زخمی کو بھی دیکھا جسے سٹریچر پر ڈال کر لے جا رہے تھے۔مکہ تک واپسی کے دوران ان دو کے علاوہ کوئی اور حادثہ یا موت دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

ہم منیٰ پہنچے تو بادشاہ نے اونٹ کی جگہ فوراً ایک گھوڑا منگوالیا تھا۔اب وہ شیطان کو کنکریاں مارنے جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ اونٹوں سے اتر کر بادشاہ کے پیچھے چل پڑے تھے۔میں اونٹ سے اترے بغیر بادشاہ کے پیچھے جا رہا تھا۔ البتہ منزل کے قریب پہنچ کر جب ہجوم بڑھ گیا تو میں اونٹ سے اُتر آیا تھا۔آخری 100 گز کا فاصلہ میں نے پیدل طے کیا۔حجاج مزدلفہ سے ساتھ لائی ہوئی کنکریاں شیطان کو مار رہے تھے۔اس موقعہ پر ہر حاجی نے سات کنکریاں مارنی تھیں۔حجاج کنکریاں مارتے وقت ایک خاص خوشی و مسرت سے سرشار دکھائی دیتے تھے۔میرے لیے قریب جا کر کنکریاں مارنا ممکن نہ تھا۔میں دور سے کنکریاں مار رہا تھا جو شیطان کو تو کیا لگتیں سامنے والے حجاج کے سروں پر گر رہی تھیں۔

اس وقت یہ رسم میرے نزدیک تکمیل تک پہنچ گئی تھی کیونکہ بادشاہ کا بھائی عبداللہ کار میں سوار ہو گیا تھا تاکہ مکے پہنچ کر حج کی دیگر رسوم پوری کر سکے۔ مجھے خوش قسمتی سے اس کے ساتھ موٹر کار میں جگہ مل گئی تھی، میں نصف گھنٹے سے بھی کم وقت میں، اپنے گھر میں تھا اور اب مجھے مکہ میں بقیہ حج کی رسوم ادا کر کے حج کی ادائیگی کو تکمیل تک پہنچانا تھا۔حج کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ:

(1) احرام باندھ لیا جائے جو میں نے 36 گھنٹے ہوئے باندھ لیا تھا۔(2) عرفات میں ''کھڑا'' ہونے کی رسم ادا کرنا جو میں ادا کر چکا تھا۔(3) عرفات سے واپسی کے فوراً بعد بڑے شیطان کو کنکریاں مارنا اور مکہ واپس آ کر طواف کرنا، صفا مروہ پر سعی کرنا، شیو کرنا (اگر ڈاڑھی باقاعدہ رکھی ہوئی نہ ہو تب) اور سر کے بال کٹوانا۔ نمبر 3 میں شامل تینوں کام کر لینے کے بعد حجاج احرام اتار کر عام لباس پہن لیتے ہیں۔اگر نمبر 1 اور نمبر 2 کی ادائیگی کے بعد نمبر 3 کو کسی اور وقت کے لیے ملتوی کر دیا جائے، ایک حاجی اب تمام پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے ماسوا ایک کے کہ اسے مُباشرت کی اجازت نہیں ہوتی۔اسے یہ اجازت صرف اسی وقت ملتی ہے جب وہ تیسری رسم ادا کر چکا ہو۔ایسے حجاج جن کے ساتھ ان کی بیویاں نہیں ہوتیں وہ اکثر مکہ میں ادا کی جانے والی رسوم منیٰ میں ادا کی جانے والی تین روزہ رسوم کے اختتام تک ملتوی کر دیتے ہیں۔

مکہ مکرمہ میں ادا کی جانے والی رسوم: صبح کے 6 بجے تھے جب میں مکہ پہنچا تھا۔ اہم گلی میں حجاج ایک ہجوم خانہ کعبہ کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔ یہ یقیناً مزدلفہ میں ادا کی جانے والی رسم پوری کیے بغیر گئے تھے۔ ان میں سے کچھ پیدل تھے کچھ اونٹوں پر سوار تھے۔ یہ رات بھر چلتے رہے ہوں گے تاکہ مکہ میں وقت پر پہنچ جائیں۔ حرم میں حجاج کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ صفا مروئی کے درمیان سعی کرنے والوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔

میں نے تھوڑی دیر آرام کیا پھر تازہ دم ہو کر سات بجے صبح حرم پاک میں آ گیا تھا تاکہ گرمی شروع ہونے سے پہلے ہی طواف بھی کر لوں اور سعی بھی۔ میں مسجد حرام کے باب ابراہیم کی طرف گیا۔ راستے میں مجھے بہت سے بھکاری ملے، وہ مجھے میرے حج کے قبول ہو جانے کی خوشخبری سنا رہے تھے اور اس کے بدلے میں مجھ سے خیر خیرات بھی مانگ رہے تھے۔

پچھلے برس کا غلاف کعبہ (کسوئی) جو موسموں کے تغیر و تبدل اور بارش سے خراب ہو گیا تھا اسے بارہ فٹ بلندی تک لپیٹ دیا گیا تھا۔ خانہ کعبہ کی عمارت کا یہ حصہ اب ہماری نظروں کے سامنے تھا حجر اسود تو ویسے بھی پہلے ہی غلاف سے باہر رہتا ہے، کعبے کی عمارت کے ایک کونے میں نظر آ رہا تھا جہاں حجاج کی ایک بڑی تعداد اپنی اپنی باری پر اسے بوسہ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ نیا غلاف پہنچ چکا تھا جسے پرانے کو اتار کر بیت اللہ کی عمارت پر ڈالنے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ یہ مخملی ریشم کا بنا ہوا تھا جس پر طلائی کام کیا گیا تھا۔ خانہ کعبہ کا دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا اور کلید بردار جن کا تعلق بانوشیبا خاندان سے تھا، موجود تھے۔ یہ ایک موروثی اعزاز تھا جو ایک طویل عرصے سے چلا آ رہا تھا۔ ایک لکڑی کی کرین اور چرخی کی مدد سے پرانا غلاف اتارا گیا اور اس کی جگہ نئے غلاف نے لے لی تھی۔ پرانے غلاف کعبہ کے ٹکڑے تبرک کے طور پر حجاج میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔

مجھے جلدی تھی کہ طواف مکمل کر لوں۔ اس کے لیے مجھے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر مکمل کرنے تھے جس میں حجر اسود کو بوسہ دینا بھی شامل تھا اور اگر بوسہ نہ دے سکوں تو دور کھڑا ہو کر اسے دونوں ہاتھ اٹھا کر سلام کر لوں۔ دو باوردی پولیس کانسٹیبل ڈیوٹی پر تھے تاکہ حجاج کی بڑھتی ہوئی تعداد کو کنٹرول کر سکیں۔ وہ اس کام کے لیے چھڑی بھی استعمال کرتے تھے اور ہاتھ بھی۔ یورپی ذہن میں یہ منظر دیکھ کر ٹریفک کا بہاؤ اور سد راہ یا رکاوٹیں آ جاتی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں کسی قسم کی بدنظمی کا امکان برائے نام تھا کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو یہ

اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہوگا کیونکہ اسلام انفرادیت پر بڑا زور دیتا ہے اور اسے مسلمان مرد، عورت یا بچہ اپنی بخشش اور نجات کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ اس کی ذمہ داری ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے نتائج سے بے نیاز یہ اس کا فرض ہوتا ہے جسے وہ ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ ایسے لمحات میں اس کی ذہنی قوت پر اس کی روحانی طاقت غالب آ جاتی ہے اور وہ لوگ جو اسلام کے بنیادی اصولوں پر یقین رکھتے ہیں اس کے برعکس کی آرزو کر ہی نہیں سکتے۔ اگر کبھی کوئی حاجی سرمستی و بے خودی میں اپنے اوپر کنٹرول نہیں کر سکتا تو اسے آپ کیا کہیں گے؟

اس دوران میں نے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر مکمل کر لیے تھے اور میں واپس وہاں پہنچ گیا تھا جہاں سے میں نے چکر لگانے شروع کیے تھے...... حجر اسود کے قریب۔ حجاج کی کثرت کے باعث پہنچنے کے لیے بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر دور سے اسے سلام کیا اور مقام ابراہیم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس کے بعد رسم یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر، دونوں ہاتھ بلند کر کے غلاف کعبہ کو تھام لیا جاتا ہے اور اپنے مالک و خالق سے حال اور مستقبل میں رحمتوں اور کرم کی درخواست کی جاتی ہے، رویا جاتا ہے، گڑگڑایا جاتا ہے اور اپنی انتہائی بندگی کا ثبوت دینے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ میں ایسا اس لیے نہ کر سکا تھا کہ میں غلاف کعبہ اور خانہ کعبہ کی دیوار کے قریب ہی نہ پہنچ سکا تھا۔ میں چاہ زم زم پر چلا گیا تھا جہاں پانی پلانے والے دھات کی پیالیوں میں حجاج کو پانی پلا رہے تھے جس کے عوض انہیں شلنگ دینا ہوتا ہے۔ میں نے بھی آب زم زم سے اپنی روحانی پیاس بجھائی۔ اس پانی میں ہلکا سا نمکین ذائقہ پایا جاتا ہے مگر یہ پانی لذیذ ہے اور مجھے ہمیشہ ہی اچھا لگا۔ یہ انسانی جسم کے اندر کی مشینری کے لیے بھی بہت مفید ہے۔ روئے زمین پر دستیاب پانیوں میں یہ سب سے زیادہ مقدس اور تاریخی پانی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے برٹن، ڈیول، ایلڈن رٹر اور دوسروں کی تنقید بالکل پسند نہیں آئی جنہوں نے آب زم زم میں نقص نکالنے کی کوشش کی ہے۔ میں ان لوگوں کے لیے جنہیں اس بات کا علم نہیں ہے یہاں اس بات کا اضافہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ چاہ زم زم کو ہر طرح کی آلودگی اور ناپاکی سے محفوظ بنا لیا گیا ہے۔ اور اب یہ کنواں پوری طرح سے ڈھکا ہوا ہے۔

یہ احتیاط بہت ضروری تھی کیونکہ ایسے لوگوں کے بارے میں بھی سننے میں آیا تھا کہ انہوں نے اس کنویں میں چھلانگ لگا کر اس لیے خودکشی کر لی تھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آب زم زم انہیں سیدھا جنت

میں پہنچا دے گا۔ بہت سے حجاج احرام کی چادروں کو آب زم زم سے دھو کر واپسی پر ساتھ لے جاتے ہیں تا کہ انتقال کے وقت انہیں ان میں کفن کے طور پر لپیٹ کر دفن کیا جائے۔

میری آب زم زم کی دوسری پیالی میں چند قطرے پانی کے بچ گئے تھے جو زم زم پلانے والے نے میرے سر پر چھڑک دیئے تھے۔ میں اب وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ میں صفا گیٹ سے نکل کر صفا مروئی پر سعی کے لیے چلا گیا تھا۔ ان دونوں پہاڑیوں تک کشادہ سیڑھیاں جاتی ہیں اور انہیں اب بے حد خوبصورت بنا دیا گیا ہے۔ سعی کے دوران ہاتھ بلند رہنے چاہئیں ۔صفا و مروئی اور خانہ کعبہ کے درمیان اب دیواریں حائل ہیں جس کی وجہ سے سعی کے دوران خانہ کعبہ کی عمارت نظروں سے اوجھل رہتی ہے، جو پہلے نظر آیا کرتی تھی۔ سعی کرنے والے حجاج ٹولیوں میں بھی ہوتے ہیں اور فرداً فرداً بھی۔ یہاں بھی اکثر ہجوم رہتا ہے اس لیے آپ کو بچ بچا کر ان کے درمیان سے راستہ بنانا پڑے گا۔ سعی کی درمیانی جگہ 380 گز لمبی ہے۔ صفا و مروئی کے درمیان سات بار سعی کرنی ہوتی ہے۔ چار بار حاجی کو صفا سے مروئی تک اور تین بار واپس مروئی سے صفا تک آنا ہوتا ہے۔ اب شیو اور بال کٹوانے کی رسم باقی رہ جاتی ہے۔ حجام اس موقعہ پر خوب پیسے کماتے ہیں۔ میں اب حاجی کا خطاب پا چکا تھا جو عرب میں بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ میں نے اپنے گھر پر اپنے بال خود ہی کاٹنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ عید کے موقعہ پر جو دوست بھی ملے گا مجھے حج کی مبارک دے گا۔ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ مکہ کے اندر ابھی بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے ایک حج بھی نہیں کیا تھا۔ مگر اب حالات بدل گئے تھے اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا جب یہاں مقامی لوگ حجاج کو ہر طرح سے پریشان کیا کرتے تھے۔

منیٰ: میں دن کی گرمی سے ڈرتا تھا اس لیے دن بھر گھر پر رہا۔ میں بعد دوپہر اپنی کار میں منیٰ کے لیے روانہ ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بادشاہ اپنے نئے محل کے ایک کمرے میں اکیلا تھا آج پوری اسلامی دنیا میں عیدالاضحیٰ منائی جا رہی تھی۔ یہ وہ تہوار ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یاد تازہ کرتا ہے۔

مکہ میں حج کی تمام رسوم ادا کی جا چکی تھیں جن کا ذکر میں نے درج بالا سطور میں کیا ہے۔ مگر عیدالاضحیٰ کے دن نماز عید کے لیے اتنا ہجوم نہیں تھا جتنے کی مجھے توقع تھی۔ حرم میں مثال کے طور پر نماز عید نہیں پڑھائی گئی تھی۔ میں تو صبح کے وقت قربانی بھی نہ دے سکا تھا۔ دوسرے روز میں نے قربانی دی جس میں، میں خود نہ پہنچ سکا تھا۔ میں اس بات کا بھی اضافہ کرتا جاؤں کہ منیٰ میں بھی تین دن ٹھہرنے کے دوران مجھے لوگ اس طرح قربانی کے جانور ذبح کرتے نظر نہیں آئے تھے جس طرح کے لوگوں کے بارے میں لکھنے والوں نے صفحے

کے صفحے کالے کر دیے ہیں۔ مجھے وہ جگہ بھی دکھائی نہ دی جو قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے مخصوص تھی، جسے اب حجاج کے کیمپ سے مناسب فاصلے پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ البتہ مجھے ایک ایسی جگہ ذبح کی گئی بھیڑوں کے سر پڑے نظر آئے تھے جہاں ان کو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ محکمہ صحت کے کارکنوں نے بلا مبالغہ اپنے فرائض دیانتداری سے سرانجام دیئے تھے۔ ان کے کام کا اس سال صلہ یہ تھا کہ حجاج کی اموات بہت کم ہوئی تھیں اور جن مکھیوں کا ہم نے بڑا ذکر سن رکھا تھا، وہ کہاں تھیں؟ حج کے موقعہ پر تو یہ کہیں نظر نہ آئیں بعد میں جائیں تو کچھ کہا نہیں جا سکتا جب حجاج یہاں سے جا چکے ہوں۔ یہ جگہ پھر سے اسی طرح ویران ہو جائے گی جس طرح چند روز پہلے تھی۔ منیٰ میں قیام کے دوران رات کو کھلے آسمان تلے مچھروں کے کاٹنے کے ڈر سے بے نیاز ہو کر سویا جا سکتا تھا۔

دن بھر، بالخصوص صبح و شام حجاج منیٰ میں ادھر ادھر گھوم سکتے تھے۔ پانی کے ایک ٹینکر نے راستہ دھو ڈالا تھا، اس پانی میں جراثیم کش محلول بھی شامل تھا۔ مٹی بیٹھ گئی تھی اور جراثیم بھی مر گئے تھے اور یوں ایک وقت میں دو کام کر لیے گئے تھے۔ گلی کے کشادہ حصے کی جانب ایک جگہ جو دو شیطانوں والے مقام کے قریب تھی، وہاں ایک حوض پر پانی کا پمپ لگا دیا گیا تھا جس کے گرد دن بھر پیاسے لوگوں کا ہجوم رہتا تھا جن کے ہاتھوں میں ہر سائز اور ہر شکل کے پانی کے ڈول ہوتے تھے۔ ان میں پانی ڈالنے کے لیے بلدیہ کا ایک ملازم موجود رہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی پانی ان کے ڈول میں ڈالنے کے بجائے ان کے سروں پر یا جسموں پر گرا دیتا تھا جس کو دیکھ کر لوگ ہنس دیتے تھے۔

وادی کے مشرق میں حجاج کے خیموں سے کچھ دور ابن سعود سامعین کے درمیان گھرا بیٹھا تھا۔ وہ معاملات ریاست بھی نمٹا رہا تھا، رپورٹیں وصول بھی کر رہا تھا اور مختلف احکامات بھی جاری کرتا جاتا تھا۔ اس کا مکہ مکرمہ اور جدّہ کے ساتھ ٹیلیفونی رابطہ بھی تھا۔ ڈاکخانے کی ایک شاخ اسے دور دراز کی خبریں بہم پہنچا رہی تھی۔ طبی انتظامیہ کا صدر دفتر ایک مقامی ہسپتال کے اندر قائم کیا گیا تھا تا کہ دنیا کی فلاح و بہبود سے متعلق اہم اعداد و شمار سے بھی اسے آگاہ کیا جاتا رہے۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ حجاج صرف عرب سے نہیں بلکہ دنیا بھر کے ملکوں سے آتے ہیں۔ امور خارجہ کی وزارت کے لوگ بھی بادشاہ کی خدمت میں معقول تعداد میں موجود تھے۔ تجارت کو بھی پوری توجہ دی جا رہی تھی مگر حج کی تجارت کی وجہ سے دیگر معاملات کو نظر انداز بالکل نہیں کیا گیا تھا۔

عیدالاضحیٰ کے تیسرے روز غروب آفتاب کے قریب شیطان کو آخری کنکریاں ماری گئی تھیں۔ یوں حج کی رسوم اختتام کو پہنچی تھیں۔ ''شیطانوں'' کو اب ایک سال تک کے لیے سکون سے رہنے کی مہلت دے دی گئی تھی۔ حجاج منٰی سے وادی کے نشیب کی طرف اتر رہے تھے۔ مرد عورتیں اور بچے پیدل بھی چل رہے تھے اور اونٹوں پر بھی سوار تھے۔ یہ لوگ تھک چکے تھے مگر پھر بھی خوش تھے۔ یہ خوشی انہیں اس لیے تھی کہ ان کے ماضی کے گناہ دُھل گئے تھے یوں یہ گناہوں کے اس بوجھ سے آج آزاد ہو گئے تھے جسے انہوں نے آج تک اٹھایا ہوا تھا۔

ایک بدو عورت، مردوں کی نظروں سے بچنے کے لیے چہرے پر حجاب لیے ہوئے ستر پوشی کے سارے تقاضے پورے کرنے والے لباس میں اونٹوں کی قطاروں کے درمیان میں سے اپنی سانڈنی پر سوار، راستہ بناتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی سانڈنی پر نہ زین ڈال رکھی تھی نہ سانڈنی کو نکیل ڈالی تھی، مگر وہ اس جانور کی پیٹھ پر مزے سے بیٹھی جا رہی تھی۔ میں اپنی کار میں جب اس کے قریب سے گزرا تو مجھے اس کا یوں اعتماد کے ساتھ سفر کرنا اچھا لگا تھا۔ میں نے اس کے گرد اور اس کے نواح میں عرب کی رُوح اسلام کی رگوں میں دوڑتی ہوئی دیکھی تھی۔

☆☆☆

18۔لیڈی ایولین کوبولڈ...... برطانیہ عُظمیٰ 1933ء

لیڈی ایولین کوبولڈ مکہ جانے سے کئی برس پہلے مسلمان ہو چکی تھی۔ بچپن میں اس کا موسم سرما الجیریا میں گزرتا تھا۔ کوبولڈ نے عربی بہت پہلے سیکھ لی تھی اور وہ الجیریائی بچوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ان دنوں ''کسی حد تک دل سے مُسلمان ہو چکی تھی''۔ پھر لڑکپن ہی میں اس کا الجیریا آنا جانا ختم ہو گیا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے عرب دوستوں کو بھلا چکی تھی اور جو دعائیں اور زبان انہوں نے اسے سکھائی تھی وہ انہیں بھی بھلا بیٹھی تھی۔ پھر برسوں بعد وہ لکھتی ہے:

> ''مجھے روم میں اپنے کچھ اطالوی دوستوں کے ساتھ ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس دوران میرے میزبان نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں پوپ سے ملنا پسند کروں گی۔ میں بے حد جذباتی ہو گئی تھی اور میں نے سیاہ لباس پہنا، حجاب اوڑھا اور اپنے میزبان اور اس کی بہن کے ہمراہ پوپ سے ملنے چلی گئی تھی۔ پوپ نے اچانک مجھ سے سوال پوچھا کہ کیا میں کیتھولک تھی۔ میں پہلے تو بہت حیران ہوئی پھر جواب دیا کہ نہیں میں مسلمان ہوں۔ میں نے برسوں سے اسلام کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا مگر نہ جانے آج میں نے یہ کیوں کہہ دیا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ ایک دیا سلائی روشن کر دی گئی تھی اور میں نے اسی وقت اسی لمحے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ میں اسلام کے بارے میں پڑھوں گی، مطالعہ کروں گی......''

لیڈی کوبولڈ، ڈنمور کے ساتویں ارل (طبقہ امراء کا رکن) کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس کا خاوند 1929ء میں 38 برس کی عمر میں انتقال کر گیا تھا۔ وہ فروری میں مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہو گئی جب اس کی عمر 66 سال تھی۔ اس نے قاہرہ سے جدہ تک کا سفر بحری جہاز میں اکیلے کیا تھا۔ وہ بیوہ تھی مگر مشرق وسطیٰ میں بڑے

آرام کے ساتھ سفر کرتی تھی۔ اسی جہاز پر مکنیز کا پاشا جو ایک ''عظیم مُور'' تھا، بھی سفر کر رہا تھا جس کے ہمراہ بہت مصاحبین بھی تھے اس کے علاوہ سر اینڈر ریوریان تھا جو سعودی عرب میں برطانیہ کے وزیر کی حیثیت سے اپنی ملازمت پر واپس جا رہا تھا۔ جدہ میں کوبولڈ کی میزبانی۔ ڈورا اور سینٹ جان فلبی نے کی۔ اس زمانے میں فلبی کس طرح کی زندگی بسر کر رہے تھے اس کی تفصیل کوبولڈ نے پیش کی ہے۔ اس کی ڈائری کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ جدہ میں ان دنوں جو چند یورپی رہائش پذیر تھے وہ کس طرح کی زندگی گزار رہے تھے، وہ ان کے بارے میں لکھتی ہے: ان کی پکنک پارٹیاں بحیرہ احمر میں تو لنچ ڈچ بنک کاروں کے ساتھ ہوتے تھے۔ رات کا کھانا ریان اور اس کے مہمانوں کے ساتھ کھایا جاتا تھا۔ ان مہمانوں میں تُرک، اطالوی، فارسی اور بالشویکی وزراء ہوتے تھے۔ نیو ہوٹل میں تیل کی ابتدائی تاریخ کے مشہور لوگوں کے ساتھ وقت گزرتا تھا۔

ابھی حج کے موسم میں کچھ ہفتے باقی تھے۔ وہ سڑکیں جو حجاز کی طرف آ رہی تھیں ان پر حجاج کے قافلے نظر آتے تھے۔ کوبولڈ جب باہر گھومنے نکلتی تو حجاج کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے ایک خلش محسوس ہوتی تھی۔ وہ سعودی عرب دعوتیں کھانے نہیں آئی تھی مگر وہ بغیر اجازت مکہ چھوڑ بھی نہ سکتی تھی۔ سعودی حکومت کی پالیسی کی رُو سے مستقبل کے یورپی حجاج کو ایک سال تک جدہ میں قیام کرنا ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ آزمائش اس کے پیشروان مصنفین کی وجہ سے تھی جنہوں نے مکہ تک کا سفر کیا اور واپس جا کر سفرنامے لکھے اور حج کے بارے میں خاص طور پر ذکر کیا۔ یورپی باشندوں پر اعتبار نہیں کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے ایک نئی آزمائش بھی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ مشرق قریب میں جہاں بھی نظر آتے وہ مُسلم مقبوضہ جات ہاتھ سے نکل جاتے تھے۔ کوبولڈ ایک اور پیراگراف میں لکھتی تھی:

''میں جس وقت یہ لکھ رہی ہوں اس وقت بھی مراکش کے بربروں کو فرانسیسی افواج ان کے آخری مضبوط قلعے سے جو اطلس پہاڑوں میں ہے، باہر نکال رہی ہیں۔ یوں ایک عظیم قوم کا ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔ یہ وہ قوم ہے جو آزادی اور اپنے مردوں کی بہادری و شجاعت کی خوبیوں اور عورتوں کے حسن و جمال کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ تعداد میں اپنے سے کہیں زیادہ اس بڑے دشمن کے ساتھ آخری دم تک لڑنے میں مشہور رہی ہے جس کے پاس اس کی نسبت زیادہ فوج، جدید اسلحہ اور آلات حرب ہوں''۔

اس کے جدہ میں قیام کے دوران شاہی دربار کے مختلف اراکین وقفے وقفے سے وہاں آتے رہتے تھے۔ ابن سعود کا وزیر مالیات، فہد حمزہ آیا پھر بادشاہ کا بیٹا امیر فیصل اس کے بعد حجاز کا وائسرائے فلبی کے گھر آیا تا کہ انگریز حجاج کی جانچ پڑتال کر سکے، کوبولڈ نے اپنا عربی لب ولہجہ بہتر بنانے کے لیے ایک اتالیق کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ فلبی اس کا معاملہ بادشاہ کے ساتھ زیر بحث لانے کے لیے مکہ کے چکر لگا رہا تھا۔ تین ہفتوں بعد اس کے لیے جدہ میں سال گزارنے کی شرط ابن سعود کے حکم سے ختم کر دی گئی تھی۔ وہ ایک کرائے کی موٹر کار میں ایک عرب ڈرائیور، ایک سوڈانی باورچی اور فلبی کے گائیڈز میں سے ایک گائیڈ کے ساتھ مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔

پورے سفر میں کوبولڈ کو ترک سمجھا گیا تھا۔ اس کے بارے میں یہ تاثر ایسا تھا جس کی اس نے کبھی تردید بھی نہ کی تھی۔ مدینے کے راستے میں اسے بنو حارب کی بنجر زمین دکھائی دی۔ یہ وہ قبیلہ ہے جس کے حجاج کو صدیوں سے ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا ہے۔ ان کی مالی حالت اب اس قدر کمزور ہو گئی ہے کہ انہوں نے سڑک کے کنارے بھیک مانگنا شروع کر دیا ہے۔ اسے پہلی حج بسیں بھی نظر آئیں جو مسافروں سے لدی ہوئی تھیں۔ مدینہ منورہ پہنچ کر وہ روضہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوئی اور اس نے زیادہ وقت مقامی عورتوں کے ساتھ گزارا۔ ویول جب 1908ء میں مدینے آیا تھا اس زمانے کے مقابلے میں یہ شہر اب چھوٹا ہو گیا تھا۔ اس کے خیال میں ایسا برطانیہ کی پالیسی اور حجاز ریلوے کی تباہی کی وجہ سے ہوا۔ مدینہ میں کوبولڈ کی ملاقات ایک انگریزی بولنے والی ترک بیوہ سے ہوئی جس کا خاوند 1917ء میں اس وقت وفات پا گیا تھا جب شریف حسین کے فوجی دستے اور ٹی ای لارنس نے ایک ریلوے پل تباہ کر دیا تھا۔

کوبولڈ نے ابن سعود کے پروگراموں کی اس قدر تعریف کی ہے کہ قارئین شاید اسے حد سے بڑھ کر کی جانے والی تعریف کا نام دیں۔ مگر ریکارڈ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ شریف خاندان کے حکمرانوں کے دور کی نسبت ابن سعود کے عہد میں حج زیادہ محفوظ تھا۔ ایسے مقامات جہاں اب مفت علاج کے لیے ڈسپنسریاں قائم کر دی گئی ہیں۔ یہاں کبھی بیماری، بھوک اور فاقہ اور پیاس سے موت کے واقعات صدیوں تک عام تھے۔ دونوں مقدس شہروں میں عورتوں اور مردوں کے لیے خصوصی رہائش گاہوں کا علاحدہ علاحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ کم نرخ پر دستیاب اشیائے ضرورت کی فراہمی کے لیے کرائے پر دکانیں بنا کر دی گئی تھیں۔ ابن سعود نے طبی سہولیات کو مزید بہتر بنانے کے انتظامات بھی کیے تھے۔ اس نے غلاموں کی درآمد روک دی تھی، معذور،

بیوہ خواتین کے لیے پروگرام تشکیل دیئے اور ہسپتالوں میں پیرس کے تربیت یافتہ سرجنوں کو تعینات کیا گیا تھا۔ کوبولڈ کے ریکارڈ میں بھی فلمی کے ریکارڈ کی طرح یہ دکھایا گیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بادشاہ ہر کہیں موجود ہے۔ مکہ واپس آنے کے بعد وہ مسجد حرام میں بطور شاہی جاروب کش گئی۔ اس نے پانی کی بالٹی لے کر کعبہ کے اندر کا حصہ دھویا۔ بازاروں میں اس نے روایتی کہانیاں سنانے والوں کو سُنا اور 1934ء تک کی ابن سعود کی کہانی کو لکھا۔ یہ اس کے خیال میں ایک مقبول عام کہانی تھی۔

حج پر آئی ہوئی ایک خاتون کے طور پر لیڈی ایولین کو مردوں کے مقابلے میں زیادہ سماجی آزادی حاصل تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عربی کلچر مردوں اور عورتوں کو بلحاظ جنس علاحدہ علاحدہ دیکھتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ویول اور برکات مسلم خواتین کے ساتھ بات چیت نہ گھر پر کر سکتے تھے نہ کھلے عام۔ ان کے برعکس کوبولڈ عورتوں اور مردوں کے اجتماعات میں آزادی سے گھومتی تھی۔ اُسے ایک خاص سماجی حیثیت یہ حاصل تھی کہ بطور ایک غیر عرب مسلم بیوہ اور ایک مہمان کے ملک کے سرکردہ افراد سے مل سکتی تھی اور اسے یہ سماجی رسائی پورے حجاز میں حاصل رہی۔ پورے سفر میں وہ ایک تنہا عورت کی حیثیت سے صحراؤں، شہروں میں پھرتی، بدو خاندانوں سے جب چاہتی ملتی تھی۔

ایک انگریز عورت کی یہ پہلی حج روداد تھی جس میں منیٰ سے عرفات تک کے موٹر کار کے ذریعے طے کیے گئے سفر کی باتیں ریکارڈ کی گئی تھیں۔ کوبولڈ عُمر بھر سفر میں رہی۔ اپنے وطن میں وہ ایک اچھی نشانہ باز اور ہرن کا شکار کرنے والی ماہر شکاری کے طور پر مشہور تھی...... اس نے دو سفرنامے لکھے: ''حج مکہ، 1934ء'' اور اس سے اگلے برس ''کینیا...... ایک خیالی سرزمین''...... اس کا انتقال 1963ء میں 95 برس کی عمر میں ہوا۔

☆☆☆

لیڈی ایولین کوبولڈ کے سفرنامے ''حجِ مکہ'' میں سے لیا گیا

جدہ 26 فروری 1993 ......ہم گرم پانیوں میں سفر کرتے ہوئے چار دن بعد جدہ پہنچے تھے۔ ہم ابھی ساحل سمندر سے کچھ دُور تھے مگر منظر بے حد مسحور کن تھا۔ ایک شہر جس کے تین اطراف میں اونچی دیوار ہے یہ سفید اور نسواری رنگ کا شہر دور سے قلعہ لگتا تھا جس کے اونچے اونچے مینار آسمان سے باتیں کر رہے ہیں اور مکانوں کی کھڑکیاں گلیوں کی جانب کھلتی ہیں۔ سنہرے صحرا کے پار عرب کے پہاڑوں کے دامان کو وہ کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ جوں جوں ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں ان کی بلندی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ آٹھ ہزار فٹ یا اس سے بھی زیادہ تک پہنچ جاتی ہے۔ سمندر کا پانی نیلا ہے مگر جہاں یہ پانی کم گہرا ہے وہاں کائی کی وجہ سے اس کا رنگ ارغوانی ہو گیا ہے۔

میں اس سرزمین پر ایک اجنبی تھی جسے یہ امید تھی کہ عرب کے مقاماتِ مقدسہ کو دیکھنے کی اسے اجازت مل جائے گی۔ فلبی نے نہایت خلوص و محبت سے مجھے یہ پیشکش کی تھی کہ وہ مجھے اپنے گھر میں بطور مہمان ٹھہرائے گا۔ غالباً یہ ذکر کرنا غیر ضروری ہوگا کہ فلبی ایک مسلمان ہے اور شاہ ابن سعود سے اس کی دوستی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس کا ایک اور تعارف یہ ہے کہ وہ ایک مشہور مہم جو ہے جس نے سمندر تک عرب کو دو مرتبہ عبور کیا ہے۔

میں ایک لانچ میں سفر کر رہی تھی کہ میری میزبان خاتون میرے پاس ایک سبز پرچم لے کر آئی جس پر عربی میں لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ سفید حروف میں لکھا ہوا تھا۔ یہ عبدالعزیز ابن سعود کا جھنڈا ہے جو اس ملک کا حکمران ہے اور مجھے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ میں سعودی عرب میں ہوں۔

اس لانچ کو تقریباً ایک میل کا سفر طے کرنا تھا۔ ساحل کے قریب سمندری چٹانیں ہیں جس کی وجہ سے ان جہازوں کو خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اس لانچ کو ایک دس سالہ عرب بچہ چلا رہا تھا جو بڑے اعتماد کے ساتھ اس پرخطر راستے سے لانچ کو لے جا رہا تھا۔ ہم ساحل پر اتر کر کسٹم ہاؤس میں سے گزرتے ہوئے فلبی کے بہت سے پتھریلے مکان تک پہنچ گئے تھے۔

28۔فروری: بادشاہ خود ریاض میں تھا، نجد اس کا دارالخلافہ ہے جہاں تک اونٹ 16 دن لیتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کے وزیر نے جو لندن میں ہے جو خط اسے لکھا تھا وہ اسے کچھ دن مزید موصول نہیں ہوگا۔ برطانیہ سے چلنے سے قبل میں نے ہز ایکسیلینسی شیخ حافظ وہب، وزیر سعودی عرب سے ملاقات کی تھی اور میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ میں مقاماتِ مقدسہ دیکھنا چاہوں گی۔ اس نے ازراہ لطف و کرم ایک خط اس موضوع پر ہز میجسٹی کو لکھ دیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر میں صحیح سلامت حج ادا کر لیتی ہوں تو اس میں اس کی مدد کا زیادہ ہاتھ ہوگا۔ جب تک وہ خط بادشاہ تک پہنچتا ہے مجھے صبر سے کام لینا ہوگا۔ میرا زیادہ وقت ساحل کے قریب گرم سمندر میں نہانے میں گزرتا تھا۔ میں شارک مچھلی سے بہت ڈرتی تھی اور صحرا میں موٹر کار میں سفر کرنے سے بھی مجھے خوف آتا تھا۔

جب مرحوم بادشاہ حسین کی حجاز پر حکومت تھی اس وقت یورپی باشندوں کے لیے جدہ میں رہائش رکھنا لازمی تھا اور انہیں اس شہر کی دیواروں سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ یوں زندگی ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ تازہ ہوا کے لیے یہ لوگ صرف اپنے گھر کی چھت پر جا سکتے تھے، جہاں مچھروں کے کاٹنے سے ملیریا بخار میں مبتلا ہو جانے کا ہمیشہ خدشہ رہتا تھا۔ موجودہ بادشاہ کے دورِ حکومت میں یہ پابندی اٹھا لی گئی تھی۔ ہر شام جب سورج کی گرمی میں کمی آ جاتی ہے، جدہ شہر کی ساری آبادی شہر کی دیواروں سے باہر نکل جاتی ہے اور صحرا میں ورزش کرتی اور تازہ ہوا میں سانس لیتی ہے۔ شہر میں چونکہ سڑکیں نہیں ہوتیں اس لیے فورڈ گاڑیاں صحرا میں ریت پر چلتی ہیں اور انہوں نے ہمیں ریت میں پھنس کر پریشان کبھی نہیں کیا۔ یہاں بھٹ تیتروں اور خرگوشوں کا شکار بھی کبھی کبھی مل جاتا ہے۔

چاند کی چودھویں رات کو ہم سمندر میں نہانے جاتے ہیں مگر پانی اس قدر نمکین ہے کہ ڈوبنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم ان چاندنی راتوں کے سحر میں پکنک مناتے ہیں جب پورا صحرا چاندنی میں نہایا ہوتا ہے۔ میں ساحل کے ساتھ ساتھ سیر کرتی ہوں اور سیپیاں گھونگے جمع کرتی ہوں۔ سعودی عرب کی یہ جادو بھری راتیں میری یادوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

ہم نے بہت سے حجاج کو مقدس شہروں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان میں سے کچھ موٹروں میں تو کچھ اونٹوں پر سوار تھے۔ جو بہت غریب تھے وہ پیدل چل رہے تھے۔ مرد احرام میں تھے اور سر سے ننگے تھے۔ جو خواتین مدینے جا رہی تھیں ان کا لباس سیاہ تھا اور جو مکہ جا رہی تھیں انہوں نے سفید لباس زیب تن

گزر رکھا تھا۔

دور دراز ملکوں سے آنے والے حجاج مکہ پہنچنے میں کئی کئی برس گزار آتے تھے۔ میرے میزبان نے مجھے بتایا کہ ایک روز وہ مدینہ روڈ پر موٹر میں جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ایک مرد، ایک عورت اور ان کا بیٹا گرم ریت پر پیدل چلے جا رہے تھے، انہوں نے اپنا سارا سامان باندھ کر یا تو اپنے سروں پر اٹھا رکھا تھا یا اپنی پیٹھ پر دھر رکھا تھا۔ اس نے کار روک کر انہیں اپنے ساتھ بیٹھنے کے لیے کہا تو انہوں نے جلدی جلدی پہلے اپنا سامان گاڑی میں رکھا۔ میرے میزبان نے دیکھا کہ ان کے سامان میں تو ان کے تین چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ یہ بچے حج سفر کے دوران راستے میں پیدل ہوئے تھے۔

یکم مارچ: میں نے مشرق میں اب تک جتنے شہر بھی دیکھے ہیں ان سب میں جدہ مختلف تھا۔ یہ خالصتاً عرب کا ایک شہر ہے۔ اس میں پینے کے پانی کی سبیلیں نہیں ہیں، دکانیں نہیں صرف چند بازار ہیں جو عرب آبادی کو اشیائے ضرورت فراہم کرتے ہیں۔ سینما گھر، گراموفون اور بہت سی دوسری ضروری چیزیں اس شہر میں نہیں ملتیں جس سے یہاں زندگی بہت کٹھن ہو گئی ہے۔

اس شہر کے مکانات کا فنِ تعمیر بے حد دلکش ہے۔ یہ مکانات اس پتھر سے تعمیر کیے گئے ہیں جو قریب کے صحرا میں پتھر کی کانوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ دروازے، بالکونیاں زیادہ تر لکڑی کے بنے ہوئے ہیں جو زیادہ تر ساگوان کی ہوتی ہے اور جاوا سے درآمد کی جاتی ہے، کیونکہ عرب میں تو درخت ہوتے ہی نہیں۔

فلبی کا گھر جسے بیت البغدادی کہتے ہیں، شہر کا سب سے بڑا اور خوبصورت گھر ہے۔ اس کی چھت پر دو طرفہ باغیچہ ہے جس میں گملوں میں پھول لگائے گئے ہیں۔

گھر کے ایک کونے میں ایک چبوترہ ہے جس پر میرا میزبان اس وقت سوتا ہے جب وہ جدہ میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک مکان مکہ میں بھی ہے جہاں یہ ایک ہفتہ چھوڑ کر جا کر رہتا ہے۔ اس گھر میں کئی غسل خانے ہیں جن کے فرش سنگ مرمر کے ہیں۔ فرش میں سوراخ رکھے گئے ہیں تاکہ پانی ان کے راستے بہ نکل جائے۔

چھت پر ایک برآمدہ سا بنا ہوا ہے جس کے نیچے دھوپ سے بچنے کے لیے بیٹھا جا سکتا ہے۔ یہاں سے مغرب میں سمندر کا منظر بے حد مسحور کن ہے۔ جدہ میں کسی قسم کا سبزہ نظر نہیں آتا۔ یہاں قیمتی معدنیات وافر ملتی ہیں۔ یہاں غروب آفتاب کا منظر قابل دید ہوتا ہے۔

2۔ مارچ: ہم آج اس صحرائی راستے پر گاڑی میں بیٹھ گئے تھے جو آگے چل کر مکہ کو چلا جاتا ہے۔ اس سال موسم سرما میں ایک بارش بھی نہیں ہوئی۔ تاہم اونٹوں کو کھانے کے لیے ایسی جھاڑیاں مل جاتی ہیں جو بارش کے بغیر بھی صحرا میں اُگ آتی ہیں۔

ایک امریکی انجینئر کا کہنا ہے کہ اگر یہاں پانی دستیاب ہو جائے تو یہ سرزمین بڑی زرخیز ہے۔ دو سال پہلے اس نے پہاڑی کے دامن میں ایک کنواں کھودا تھا۔ اب وہاں ایک سرسبز زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا ہے جہاں کچھ غلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

عرب کا رقبہ ایک ملین مربع میل سے زیادہ ہے جس کا صرف پانچواں حصہ زیر کاشت ہے۔ اس میں معدنی دولت بہت ہے مگر یہاں کے لوگ غیر ملکیوں کی مداخلت بالکل پسند نہیں کرتے اور آج تک ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ دستیاب وسائل کو بہتر بنا سکیں۔

کنویں کے پاس سے گزرنے کے بعد جلد ہی ہم جدہ کی طرف واپس مڑ جاتے ہیں کیونکہ اب ہم ممنوعہ علاقے کے قریب پہنچنے والے تھے۔ یہاں پتھر کے دو ستون نصب ہیں جو اس علاقے کی نشان دہی کرتے ہیں اور صرف مسلمان اس علاقے کے اندر جا سکتے ہیں۔

جب ہم جدہ کی سماجی زندگی میں واپس لوٹتے ہیں تو مکہ مکرمہ جاتے ہوئے حجاج پر بڑا رشک آتا ہے۔ جو حاصل نہ ہو سکتا ہو اس کے حصول کو ہمیں نہ جانے کیوں زیادہ آرزو ہوتی ہے، ہمیں وہ نیلا پرندہ کیوں اچھا لگتا ہے جو ہماری دسترس سے پار بہت دُور ہوا میں اڑتا دکھائی دیتا ہے۔

ہم نے جدہ واپس آ کر نیو ہوٹل میں کھانا کھایا۔ یہ ہوٹل چند روز قبل حجاج کے لیے کھلا تھا اور اس میں وہ امریکی انجینئر رہتے تھے جو بادشاہ کی طرف سے تیل کے حصول میں رعایتیں حاصل کرنے آئے تھے۔

ان کی بیویوں، مسز ہملٹن اور مسز ٹوچل نے ہمیں خوش آمد کہا اور عمدہ کھانا کھلایا۔ اس پارٹی میں مسٹر لانگ رِگ، عراق تیل کمپنی کا نمائندہ بھی شامل تھا جو ویسی ہی مراعات بادشاہ سے حاصل کرنے آیا تھا۔ مختلف پارٹیوں کا مفاد بھی مشترک ہو تب بھی یہاں آپس کے دوستانہ تعلقات متاثر نہیں ہوتے۔

مسٹر لانگ رگ کے کافی کے پیالے میں شیشے کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا نکل آیا تھا تب بھی دوستانہ مراسم متاثر نہیں ہوئے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد ہم برج کھیلتے تھے اور کبھی کبھی نصف شب کو ہم صحرا کی طرف

سوڈکار میں نکل جاتے تھے اور وہاں موجود ایک جھیل میں نہاتے بھی تھے۔

4۔ مارچ: میرا آج صبح جمعہ کی نماز پڑھنے مکہ چلا گیا تھا۔ اس نے ایک عام عرب کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس سال حج 4۔ اپریل کو تھا، جس کا اعلان حکومت کر چکی تھی۔ شمسی اور قمری حساب سے سال میں 11 دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس حساب سے اگلے سال ماہ رمضان اور حج دونوں سرد دنوں میں آنے والے تھے۔

آج شام مجھے بتایا گیا تھا کہ بادشاہ کو اس کے وزیر کی طرف سے لندن سے خط آ گیا ہے جس پر وہ ہمدردانہ غور کر رہا ہے نیز مجھے مشورہ دیا گیا تھا کہ میں بادشاہ کے بیٹے امیر فیصل، وائسرائے حجاز کو خط لکھوں جس میں اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں تفصیلات فراہم کروں۔ اس کے علاوہ امور خارجہ کا انڈر سیکرٹری چند دنوں کے لیے جدہ آ رہا تھا اور مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔

5۔ مارچ: آج بعد دوپہر میرے پاس ہز ایکسیلنسی فہد حمزہ آئے تھے۔ وہ سفید رنگ، شامی ہیں اور بہترین انگریزی بولتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت مہربان ہو رہے ہیں اور میری مدد بھی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے خوشی ہوئی۔ وہ واپس مکہ جاتے وقت میرا وہ خط بھی لے گئے تھے جو وائسرائے کے نام تھا۔ اب مجھے اپنے مقدر کے فیصلے کا انتظار تھا جو بادشاہ کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے پہلے سے یہ رعایت مانگی تھی کہ یورپی مسلمانوں کے لیے مقدس مقامات تک جانے سے پہلے جدہ میں جو ایک سال کا قیام لازمی ہے، مجھے اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ بدقسمتی سے ایک سے زیادہ بار غیر مسلم یورپیوں نے مکہ میں داخل ہوتے وقت اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا تھا۔ یہ یورپی بہت بڑا خطرہ مول لے کر جس میں ان کی جان بھی جا سکتی تھی حج ادا کرنے جھوٹ بول کر مکہ میں داخل ہوئے تھے۔

8۔ مارچ: میرا میزبان مکہ سے واپس آ گیا تھا اور مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ اب یہ بادشاہ کے اختیار میں تھا کہ وہ کیا فیصلہ کرتا ہے، مجھے مقامات مقدسہ جانے کی اجازت ملتی ہے یا نہیں۔ اس دوران وائسرائے جدہ میں اپنی آمد کے دوران جمعہ کے روز میری میزبان کے گھر آ رہا تھا۔ اس نے شہر سے باہر اپنے محل میں ٹھہرنا تھا۔ یہ برطانوی وزیر اور لیڈی ریان سمیت ایک مسلم گھرانے کے لیے اعزاز کی بات تھی کہ انہیں وائسرائے نے ملاقات کی دعوت دی تھی۔ بادشاہ ذاتی طور پر یورپی خواتین کو ملنے سے ہمیشہ انکار کر دیتا ہے مگر میری

میزبان اس معاملے میں مستثنیٰ تھی۔

9۔ مارچ: امیر فیصل ٹھیک پانچ بجے آ گیا تھا۔ وہ جب دروازہ سے داخل ہوا تو ایک دراز قد جسم کے ساتھ خوبصورت لگ رہا تھا۔ اُس نے نسواری اور سنہری عبا پہن رکھی تھی جس کے نیچے سفید چغہ تھا۔ سر پر نجد کے رواج کے مطابق عقال تھا۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بیٹا تھا جو بالکل باپ جیسے لباس میں تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے چند وزراء تھے۔ امیر دبلے پتلے جسم کا مالک ہے اور ملنے والوں کو اپنی خوبصورت شخصیت سے متاثر کرتا ہے۔ بہت سے نجد عربوں کی طرح وہ امتیازی شان کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ننھیال کی طرف سے وہ عبدالوہاب کی اولاد میں سے ہے، جو وہابی فرقے کا بانی تھا۔ یہ اسلام میں اپنے آپ کو راسخ العقیدہ مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس کے چھوٹے سے بیٹے نے ہم سب کے دل جیت لیے تھے۔ معصوم عبداللہ اس سے قبل کسی یورپی کے گھر نہیں گیا تھا نہ کبھی کسی یورپی خاتون سے ملا تھا مگر بہت پر اعتماد نظر آتا تھا۔ اپنے والد کے اشارے پر وہ ہمارے درمیان آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ہم چونکہ عربی روانی کے ساتھ نہیں بول سکتے تھے اس لیے اسے ہم سے گفتگو کرتے وقت مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ اونٹ اور گھوڑے کی سواری کا شوقین ہے۔ میں نے جب اس سے پوچھا کہ کیا کبھی اس نے گدھے کی سواری بھی کی تھی تو قدرے خفا ہو گیا تھا۔ دس برس کی عمر میں یہ بچہ خواتین کے رہائشی کمرے سے علاحدہ اپنے کمرے میں اکیلا رہتا تھا۔

10۔ مارچ: جدہ میں ایک دن لوگوں کے لیے خوشی و مسرت کا دن ہوتا ہے، جس روز برطانوی کشتی ٹولیدو آتی ہے جس میں ڈاک، اخبارات اور کھانے پینے کا سامان آتا ہے ایسا پندرہ روز میں ایک بار ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اسی روز ایک اطالوی کشتی بھی پہنچتی ہے۔ لوگوں کی نظریں افق پر لگی ہوتی ہیں، جونہی برطانوی کشتی 10:30 دکھائی دیتی ہے۔ جدہ میں آباد چھوٹی سی دنیا اس کی جانب لپکتی ہے تاکہ اپنے خطوط وصول کر کے پڑھ سکیں۔ یہ چھوٹا دخانی جہاز باہر کی دنیا اور جدہ کی اس مختصر سی دنیا کے درمیان ایک رابطے، ایک پل کا کام دیتا ہے۔ پھر یہ سوڈان کی بندرگاہ کی جانب چلا جاتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں اب پھر دو ہفتے تک کے لیے دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی طرف کے علم کی طرف کھلنے والا دروازہ ان پر بند ہو گیا ہے۔

آج بعد دوپہر مسز اینڈرسن ایک ڈچ لیڈی ہمیں کچھ ایسی خواتین سے ملانے لے گئی جو کسی زمانے میں غلام رہ چکی تھیں اور اب ایک امیر تاجر نے ایک گھر میں ان کی رہائش کا مفت انتظام کر رکھا تھا۔ کمروں کے دروازے ایک صحن میں کھلتے تھے اور بہت صاف ستھرے تھے۔ ہر ایک کمرے میں دو دو خواتین سوتی تھیں اور

اندری کا کام کر کے اپنی روزی کماتی تھیں۔ ان میں سے زیادہ کا تعلق سوڈان سے تھا، جو دیکھنے میں بے حد خوش اور مطمئن نظر آتی تھیں۔ صحن میں ایک کنواں کا تعلق سوڈان سے تھا، جو دیکھنے میں بے حد خوش اور مطمئن نظر آتی تھیں۔ صحن میں ایک کنواں چند درخت، کچھ پھولوں کے پودے تھے۔ ایک طرف ایک بلی، چند بکریاں اور کچھ کبوتر بھی مکینوں کے ساتھ نظر آئے تھے۔ ایک معمر خاتون کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو فاقوں سے تقریباً قریب المرگ تھی۔ اسے روزگار نہ ملا تو وہ چار روز تک بھوکی رہی تھی مگر اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا تھا کہ اس کا کسی سے ذکر کرتی یہاں تک کہ وہ نڈھال ہو کر گر پڑی تھی۔ دوسری عورتوں کو اس کے بارے میں علم ہوا تو وہ اس کی مدد کو آ گئی تھیں۔ ہم نے جب اسے دیکھا اس وقت وہ ٹھیک ہو گئی تھی۔

انہوں نے ہماری تواضع چائے، سگریٹ، بسکٹوں سے کی تھی۔ سگریٹ انہوں نے ہمارے سامنے اپنے ہاتھوں سے بنائے تھے، ان کی انگلیوں پر مہندی لگی ہوئی تھی۔ ہماری موجودگی میں ان سے ملنے دو نہایت خوبصورت عورتیں آئی تھیں۔ شہر میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اس قسم کی لاوارث اور سابقہ غلام عورتوں کو پناہ دیتے ہیں۔

12۔ مارچ: مجھے آج ہی یہ اچھی خبر موصول ہوئی ہے کہ مجھے حج کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ جانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ مجھے کافی عرصے تک اس اُمیدی و ناامیدی کی کشمکش میں رہنا پڑا تھا تب جا کر آج میری آرزو پوری ہونے کی نوید جانفزا مجھ تک پہنچی تھی۔ اب میرے سفر کے لیے میرا میزبان تیاری کرے گا جو مکہ واپس جا رہا ہے۔ وہ اپنی گونا گوں مصروفیات میں سے یقیناً وقت نکال کر میرے آرام دہ قیام کے انتظامات کرے گا۔ مجھے اپنے حج کے لباس کا انتظام کرنا تھا۔ یہ ایک سیاہ رنگ کے کریپ کا سکرٹ تھا جو پاؤں تک ہو، سر ڈھانپنے کے لیے ہڈکیپ (دونوں ایک جگہ) مجھے یہ عام لباس کے اوپر پہننا ہو گا جب میں مدینہ طیبہ جاتی ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے ایک سیاہ کریپ کا حجاب بھی لینا ہو گا جو میرے چہرے کو چھپا لے۔ تاہم جہاں تک مکہ مکرمہ کا تعلق تھا مجھے مکمل سفید لباس تیار کرنا تھا کیونکہ رنگین لباس کی اجازت نہیں ہے۔ ایام حج، سرکاری اعلان کے مطابق 4۔ اپریل تک شروع نہیں ہوتے اس لیے میں پہلے مدینہ منورہ جانے کی تیاری کر رہی ہوں۔

مدینہ منورہ۔ 15۔ مارچ: ہم نماز فجر کے بعد مدینے کے لیے روانہ ہو گئے تھے، میں نے حج

کے 20 ایام کے لیے موٹر کار اور عرب ڈرائیور کا انتظام کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے ساتھ مسٹر فلبی نے مصطفیٰ نذیر کو بھی بھیج دیا تھا جو بہت مہذب اور شائستہ انسان تھا۔ اسے ہمارے سفر کے انتظامات اور سامان کی نگرانی کرنی تھی۔ ہمارے ہمراہ ایک نہایت نفیس معمر سوڈانی بھی تھا جو باورچی کا باپ تھا اور حج پر آیا ہوا تھا۔ میں نے اسے جب مدینے تک اپنی گاڑی میں جگہ دی تو وہ اظہار تشکر میں میرے پاؤں چومنا چاہتا تھا۔

ہمارے جدہ سے روانہ ہونے کے بعد جلد ہی سورج نکل آیا تھا اور صبح کا سہانا موسم تھا۔ ہم صحرا میں سے گزر کر شمال کی جانب بڑھ رہے تھے۔ صرف جھاڑیاں راستے میں نظر آئیں جن پر پیلے پھول تھے۔ سڑک پر کہیں کہیں مردہ اونٹوں کی ہڈیاں دکھائی دیں جو ایک ہزار برس کے دوران حج پر آنے والے ہزاروں حجاج کے راستے میں بکھری ہوئی تھیں۔ کوئی جاندار شے نظر نہ آتی تھی ایک دوبار چند بھٹ تیتر اور کچھ اڑتے ہوئے پرندے دکھائی دیئے تھے۔

ہمیں ایک ایسی چوکی پر روک لیا گیا تھا جہاں سے آگے مقاماتِ مقدسہ کی حد شروع ہوتی تھی۔ ہمارے پاسپورٹ کی پڑتال ہوئی اور ہمیں یہاں ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ ہمارے سفر کا ایک تہائی حصہ مکمل ہوا تھا مگر اس سے آگے سڑک بہت خستہ حالت میں تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں قریب ہی ایک چھوٹی سی بندرگاہ واقع تھی جو جنگِ حجاز کے دوران جدہ کی جگہ حاجیوں کے اترنے کی بندرگاہ تھی جہاں سے حجاج مکہ پہلے چلے جاتے تھے۔ شہر سمندر سے دو میل دور ہے۔ کچے مکانات ایک میدانی علاقے میں بغیر کسی ترتیب کے تعمیر کیے گئے تھے۔ بازار کے قریب ہی ایک جگہ کو کھجور کے پتوں اور ٹہنیوں سے ڈھک دیا گیا ہے جہاں حجاج آرام کے لیے رُک سکتے ہیں، سونا چاہیں تو سو بھی سکتے ہیں میں نے کئی لوگوں کو چارپائیوں پر سوتے بھی دیکھا تھا۔ یہاں دن کا گرم حصہ گزار کر یہ دوبارہ عازم سفر ہوتے ہیں۔

چند بدو لڑکیاں کار کے گرد جمع ہو گئی تھیں۔ انہوں نے دستکاری پر مشتمل کچھ چیزیں بیچنے کے لیے اٹھا رکھی تھیں۔ میں نے یہ چیزیں خریدنے سے انکار کیا تو وہ دوسرے حجاج کی جانب دوڑیں جو سوئے ہوئے تھے۔

میں نے تھوڑی دیر آرام کر لیا تھا اور ڈرائیور نے اس دوران گاڑی کا تیل پانی پورا کر لیا تھا۔ مصطفیٰ حقہ پینے چلا گیا تھا اور ڈرائیور اب اپنے جاننے والوں سے باتوں میں مصروف تھا کیونکہ اس راستے پر اکثر سفر کرتے رہنے کی وجہ سے اس کی واقفیت زیادہ ہو گئی تھی۔

ان پہاڑی علاقوں میں زندگی بڑی مشکل تھی، میں نے اس کا اندازہ یہاں کے مقامی لوگوں کو

لگتے ہی لگا لیا تھا۔ بچوں کو دیکھا تو بیچارے ہڈیوں کے پنجر تھے، ان پر مجھے بہت ترس آیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کار کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور خیرات مانگتے ہوئے ہمارا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے، میں ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے۔ میں نے جب خیرات کے لیے ان کی بار بار کی اپیل مسترد کر دی تو وہ مشتعل ہو گئے تھے۔

بدو عورتیں حجاب میں تھیں اور صرف ان کی آنکھیں حجاب سے باہر تھیں۔ مردوں کا تعلق حارب کے اس قبیلے سے تھا جو لوٹ مار کے لیے بدنام تھے۔ شریف مکہ حسین نے اپنی فوج میں اسی قبیلے کے لوگوں کو بھرتی کیا تھا۔ ترکوں کو شکست دینے کے بعد یہ حجاز کا بادشاہ بنا تھا اور ترکوں کو عرب سے نکال دیا تھا۔ پھر چند برسوں کے بعد نجد کے ابن سعود نے اسے نکال باہر کیا تھا۔

موجودہ بادشاہ نے اس صحرائی لوٹ مار کو ختم کر دیا ہے اور اس طرح اس قبیلے کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ختم ہو گیا ہے۔ بادشاہ چونکہ بہت سختی سے پیش آتا ہے اس لیے بھی اب ان میں جرات نہیں ہوتی کہ مسلمانوں کو لوٹ سکیں۔

جدہ کے مدینہ گیٹ سے نکلتے وقت اور راستے میں کئی مقامات پر وہابی پولیس کے ہاتھوں ہمارے پاسپورٹ چیک کیے گئے تھے۔ پولیس حجاج کے راستے پر گشت کرتی رہتی ہے تاکہ حجاج کا سفر بحفاظت کٹے۔ (ایسا پہلے نہیں تھا جب غریب حاجی کو راستے میں لوٹ لیا جاتا تھا اور اس کے پاس مر جانے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہ جاتا تھا)

جدہ سے مدینہ منورہ تک کا فاصلہ 250 میل تھا جس میں ہمیں 15 گھنٹے لگ گئے تھے مگر میں سیلوٹ کرتی ہوں اس چھوٹی فورڈ کار کو جس نے صحرائی راستوں کو طے کر کے ہمیں منزل تک پہنچانے کا عزم کر رکھا تھا۔ صرف ایک بار پورے سفر کے دوران مصطفیٰ اور بوڑھے سوڈانی کو گاڑی سے نیچے اتر کر دھکا لگانا پڑا تھا۔ اونٹوں پر سوار حجاج کے علاوہ ہمیں بہت سے ایسے حجاج بھی نظر آئے جو پیدل چل رہے تھے جھلسا دینے والی صحرا کی گرمی میں ان کے ہاتھوں میں پانی کے جگ اور بوتلیں تھیں، وہ احرام میں تھے اور چونکہ سر سے ننگے تھے اس لیے ہر ایک کے پاس چھتری تھی۔

جدہ اور مدینہ منورہ کا درمیانی سفر اونٹ پر دس روز کا ہے اور پیدل چلنے والوں کو تین ہفتے درکار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً رات کو سفر کرتے ہیں اور دن کی گرمی سے بچنے کے لیے کسی کارواں سرائے میں رک

جاتے ہیں جہاں انہیں کھانا، پانی، کافی چائے بھی ملتی ہے اور سو جانے کے لیے چار پائیاں بھی۔

ہمیں کہیں کہیں اومنی بس میں بھی سفر کرتے ہوئے حجاج نظر آئے تھے۔ ان کا سامان، برتن، پانی کے جگ بس پر بندھے ہوئے تھے۔ ایسی بس جب چلتی تھی تو بہت شور ہوتا تھا۔

ہمیں ایک جگہ پولیس نے فلیش لائٹ دے کر روک لیا تھا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ تین دن لگاتار بارش کے برسنے کی وجہ سے سڑک پر پھسلن تھی اس لیے احتیاط سے گاڑی چلانے کی ضرورت تھی۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہ راستہ چھوڑ کر ایک اور صحرائی راستے پر ہو لئے تھے مگر پانی پھر بھی راستے میں ضرور موجود تھا۔ ڈرائیور نے کار سے اتر کر پانی کی پیمائش کی تو یہ اس کے گھٹنوں تک تھا۔ ایسا ہی ہوا ہماری کار نے ہمیں پریشان نہیں کیا تھا اور ایک گھنٹے بعد کچھ فاصلے پر کسی شہر کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ یہ مدینہ منورہ کی روشنیاں تھیں، روشنیوں کے شہر کی، ہمارے پیارے نبیؐ کے شہر مدینہ کی۔

17۔ مارچ: آج صبح میں اپنی ڈائری لکھنے میں مصروف تھی۔ اتنے میں مجھے آواز آئی کہ نیچے کچھ خواتین میرا انتظار کر رہی ہیں۔ مجھے پتا چلا کہ وہ میرے دمشق میں رہنے والے ایک دوست کے خاندان سے تھیں۔ میں نے خوشی خوشی ان کا استقبال کیا۔ اپنے فرغل چغے اور حجاب اتار کر وہ آرام سے بیٹھ گئی تھیں۔ یہ پانچ تھیں جن میں سے ایک دمشق میں میرے ایک پرانے دوست کی بیوی تھی۔ یہ بے حد خوبصورت اور ملنسار خاتون تھی، دوسری عورت اس کی بہن تھی جس سے اس کی دو جوان بیٹیاں تھیں اور ایک اور عورت بے حد خوش مزاج اور مزاحیہ طبیعت کی مالک تھی۔ میری میزبان جس کے گھر میں، میں قیام پذیر تھی اس نے ان خواتین کی خاطر و مدارت کے لیے میری مدد کی۔ پہلے انہیں چائے پیش کی گئی تھی پھر کچھ وقفے کے بعد چاکلیٹ کافی سے ان کی تواضع کی گئی تھی۔

ان خواتین نے جب سیاہ ریشمی لباس اتار کر رکھا تو اس کے نیچے انہوں نے چست پائجامے پہن رکھے تھے جو عموماً دبلی پتلی خواتین پہنتی ہیں۔ یہ عموماً ریشمی یا سوتی کپڑے کے ہوتے ہیں۔ ان کے سروں پر ایک رنگین ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا جسے انہوں نے پگڑی کی طرح سر کے گرد اس طرح باندھ رکھا تھا کہ اس کا ایک سرا کندھے پر لٹکتا رہے۔ ان کے لمبے بال دو حصوں میں بٹ کر ان کی پیٹھ پر آ گئے تھے ان میں اکثر یہ ربن بھی باندھتی ہیں اور دھاگے بھی جن میں موتی پروئے گئے ہوں۔ غازے پاؤڈر سے یہ بالکل ناواقف ہیں تاہم ان کی آنکھوں میں کاجل ضرور تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سے ان کی آنکھیں دھوپ کی چمک سے محفوظ

رہتی ہیں، دانت ان کے بے حد خوبصورت تھے اور ان سب خواتین نے اپنا پورا پورا خیال رکھا ہوا تھا۔

انہیں میرے وطن کے بارے میں جاننے کا بڑا شوق تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ میرے ملک میں عورت کیسی زندگی گزارتی ہے، اس کے لیے انہوں نے مجھ سے بہت سوال کیے۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتی تھیں کہ پارلیمنٹ میں خواتین کو نمائندگی ملتی ہے یا نہیں اور حکومت میں ان کا کتنا حصہ ہوتا ہے اور انہیں کس قدر آزادی حاصل ہے۔ انہوں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ مجھ سے پوچھا کہ میں کب اور کیوں مسلمان ہوئی۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ میں عربی لکھ پڑھ سکتی ہوں تو وہ میرا امتحان لینے کے لیے مجھے دیوار پر لگی ہوئی ایک تحریر کی طرف لے گئیں کہ میں انہیں وہ پڑھ کر سناؤں۔ میری یہ خوش قسمتی تھی کہ میں نے آسانی سے وہ عبارتیں پڑھ لی تھیں۔

ایک اور کہانی: شام کو اگر آپ مارکیٹ کے کونے میں کھڑے ہو جائیں تو آپ کو وہاں ایک ہجوم نظر آئے گا جو ایک کہانی سنانے والے سے کہانی سن رہا ہوگا۔

یہ داستان گوئی کا پیشہ مشرق میں بہت مقبول رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سینما اور تھیٹر نے اسے قاہرہ اور الجیریا سے باہر دھکیل دیا ہے مگر میں نے مراکش میں موروں کو داستاں گو کی داستانیں سنتے دیکھا تھا اور اب مدینے میں یہی کچھ دیکھ رہا ہوں۔ وہ ہوسکتا ہے ''گھوڑی کی چوری'' یا ''ایک ہزار ایک رات'' کے کچھ حصے سنا رہا ہو یا ممکن ہے وہ قبل از اسلام کے کسی بڑے شاعر کی جذباتی کر دینے والی کہانی سنا رہا ہو۔ اس داستان گو کا کمال فن یہ ہے کہ وہ داستان کو جب نقطہ عروج پر لے جاتا ہے تو وہاں رک جاتا ہے اور اپنے سننے والوں کو اگلی شام کہانی کے اس سے اگلے حصے کو سننے کا شوق دلا کر رخصت ہو جاتا ہے۔

اب کہانی کچھ بدل گئی ہے۔ آج آپ کو سعودی عرب کے موجودہ بادشاہ کی کہانی سننے کو ملتی ہے۔ اس کے کارہائے نمایاں پر مشتمل کہانی۔ عبدالعزیز ابن سعود کی زندگی کی حیرت انگیز کہانی سننے والوں کو ایک جدید داستان گو کی زبانی سننے کو ملتی ہے۔

صحرا میں پڑاؤ کی روشنیوں یا کافی ہاؤسز کے چراغوں کی روشنی میں لوگ ہمہ تن گوش اس نوجوان شہزادے کی کہانی سنتے ہیں جسے گیارہ برس کی عمر میں اس وقت جلاوطن کر دیا گیا تھا جب اس کے باپ سے نجد کی سلطنت چھین لی گئی تھی۔ پھر اس نے کویت میں آٹھ برس کی جلاوطنی کاٹی تھی۔ وہ اپنے آبائی وطن کے سلسلہ ہائے کوہ کو دیکھنے کے لیے ترس گیا تھا۔ کہانی اگلے مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو یہ شہزادہ جو ابھی

بمشکل 19 برس کا تھا واپس آتا ہے، اس کے ہمراہ اس کے چالیس عزیز واقارب بھی تھے۔ پھر تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس نے نہایت شجاعت و بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کا دارالخلافہ ریاض فتح کر لیا تھا۔ اب ایک بار پھر عنانِ حکومت اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے لڑائی میں سلطنتِ عثمانیہ کی افواج، امیر ابن رشید اور حجاز کے مرحوم بادشاہ حسین کو شکست فاش دی تھی۔

داستان گو اب کہانی کے جدید مہماتی حصے میں پہنچتا ہے۔ یہ کسی بھی قدیم جنوں پریوں کی کہانی سے زیادہ حیرت انگیز ہو جاتی ہے، کہ کس طرح اس شہزادے نے صحرائی قبیلوں کو اخوت و بھائی چارہ کے رشتے میں پرو لیا تھا۔ اس کے نتیجے میں شاہراہوں پر پڑنے والے ڈاکے ختم ہو گئے تھے اور اب خلیج فارس سے لے کر بحیرۂ احمر تک اس کی حکومت ہے۔ مکہ و مدینہ، دونوں مقدس شہر اس کی تحویل میں ہیں اور اسے پورے عالم اسلام میں ''محافظِ اسلام'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

امیر ابن رشید جنگ میں مارا گیا تھا اور اس کے خاندان کے زندہ بچ جانے والے افراد کو ریاض میں بادشاہ کے محل میں پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ آج کل اسی شہر میں آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہیں پوری عزت کے ساتھ یہاں آباد کر دیا گیا تھا۔ ان کی ہر طرح سے حفاظت کی جاتی ہے اور انہیں صرف نام کی حد تک قیدی سمجھا جاتا ہے۔ شریف حسین سائپرس بھاگ گیا تھا اور بالآخر وہ امان میں انتقال کر گیا تھا جہاں اب اس کا بیٹا عبداللہ بطور امیر حکومت کرتا ہے۔

21۔ مارچ: مجھے 19 مارچ کو ایک پیغام موصول ہوا تھا کہ میں نیو ہوٹل پہنچوں جہاں حجاج کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ اس ملک کی ایک اچھی اور خوش کن روایت یہ ہے کہ ان غریب لوگوں کی دیکھ بھال اور پوری پوری حفاظت کی جاتی ہے جنہیں ماضی میں صحرائی راستوں پر بڑے خطرات درپیش ہوتے تھے۔ چوریاں اور ڈاکے عام تھے۔ سفر کے دوران لوگ بھوک پیاس سے مر جاتے تھے۔ اب سفرِ حج میں جگہ جگہ کنویں کھدوا دیے گئے ہیں، ریسٹ ہاؤس تعمیر کرائے گئے ہیں، ہسپتال، ڈسپنسریاں ہیں۔ ان کی رہائش کے لیے نہ صرف مقدس شہروں میں ہوٹل تعمیر ہوئے ہیں بلکہ جدہ، یانبو میں بہترین انتظامات موجود ہیں۔ منیٰ سے عرفات جاتے ہوئے راستے میں ٹھہرنے کے انتظامات کر دیے گئے ہیں۔ حکومت نے ایک کمیٹی تشکیل دے دی ہے جو ان کی صفائی کی نگرانی کرتی ہے، مرمت کراتی ہے اور ہر کمرے میں افراد کی مقررہ تعداد کو ٹھہرانے کا اہتمام کرتی ہے۔ خواتین کے ٹھہرنے کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے ہیں۔

متمول حجاج کے لیے ان کی مرضی کے مطابق کرایے پر گھر مل جاتے ہیں جہاں یہ لوگ خود بھی اور ان کے ملازمین بھی آرام سے رہ سکتے ہیں۔

جس ہوٹل میں مجھے معائنے کے لیے بلایا گیا ہے یہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو کسی مکان میں رہنے کی سہولت اور تکلیف سے بچنا چاہتا ہے اور آرام و آسائش کے لیے اور اپنی اور اپنے خاندان کے تخلیے کے لیے ایسے ہوٹل میں ٹھہرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ایسے ہوٹل کو گرینڈ ہوٹل کا نام دیا جاتا ہے۔ مینیجر مجھ سے یہ سننے کا خواہش مند تھا کہ اس ہوٹل کا مقابلہ لندن اور پیرس کے ہوٹلوں کے ساتھ کیسے کیا جا سکتا ہے۔

میں ایک کھلے صحن میں داخل ہوئی جہاں سے قطار در قطار گیلریاں اونچی ہو کر مختلف کمروں میں جاتی تھیں۔ یہ صحن ایک قسم کا داخلی ہال تھا جس پر ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ اس پر بیٹھ کر مہمان چائے، کافی پی سکتے تھے، شطرنج کھیل سکتے تھے، جو مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ میں بہت مقبول کھیل ہے۔ اندرونی احاطہ کو کھانے کے کمرے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پتھر کی ایک کھلی سیڑھی کمروں کی طرف چڑھتی ہے۔ ان کمروں میں ایک گدا، تکیہ، چادر، مچھر دانی ایک سنگار میز، برش، کنگھا فراہم کیا جاتا ہے۔ نچلے حصے میں بڑی بڑی صراحیاں رکھی ہوئی تھیں جن میں پانی ٹھنڈا رہتا تھا۔ دروازے حاجی کے پاؤں میں پہننے کے لیے نرم اور ملائم سلیپر رکھے ہوئے تھے یہ سب کچھ موجود ہو تو انسان کو اور سفر میں کیا چاہیے ہوتا ہے؟

میں نے اس سب کے لیے ہوٹل کے مینجر کو مبارکباد پیش کی تھی، خصوصاً برش اور کنگھا فراہم کرنے پر۔ یہ سن کر اس نے جواب دیا تھا کہ اس کی ضرورت حجاج کو اپنی ڈاڑھیوں کے لیے رہتی ہے۔ بیشک تھکے ہارے پاؤں کو ان سلیپروں کی ضرورت تھی۔ ہوٹل چند دنوں کے بعد کھول دیا جانے والا تھا۔

بعد دوپہر، تھوڑی دیر قیلولہ کرنے کے بعد میں نے سوچا کیوں نہ لیڈی فاطمہ اور اس کے خاندان سے ملنے اس کے گھر چلا جائے جو میرے گھر آ چکی تھی۔ میں اپنے ہمراہ مصطفیٰ کو بھی لے جانا چاہتی تھی کیونکہ مجھے ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں اپنی نانی دادی کی طرح اکیلے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔

میری میزبان مصطفیٰ کو وہیں چھوڑ کر، جہاں وہ کافی پی رہا تھا، مجھے چھت پر لے گئی تھی۔ یہاں کچھ خواتین رہتی تھیں، جو بے حد خوبصورت تھیں۔ گملوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ فاطمہ نے یہاں مجھے خوش آمدید کہا تو نیچے اس کا شوہر مصطفیٰ کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ چند مرد مہمان اور بھی نیچے موجود تھے میں ان خواتین سے ملاقات کر رہی تھی جو مجھ سے ملنے آ گئی تھیں۔

ہم سب خواتین اس وقت بہت خوش تھیں اور گپ شپ میں مصروف قہقہے لگا رہی تھیں۔ مجھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر بے ساختہ ہنسی آ رہی تھی شاید اس لیے کہ اس وقت میں بہت اچھے موڈ میں تھی۔

مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب میں نے ایک چھوٹی سی ترک خاتون کو فرانسیسی روانی سے بولتے سُنا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جنگ سے قبل اس کا باپ پیرس میں ترک سفارت خانے سے وابستہ تھا۔ اس کی شادی عثمانیہ فوج کے ایک افسر سے ہوگئی تھی جو 1917ء میں اس وقت جاں بحق ہو گیا تھا جب حجاز ریلوے کے پل کو اڑایا گیا تھا۔ اب اس کی دوسری شادی مدینے کے ایک شخص سے ہوگئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے پیرس میں گزرے جوانی کے دن یاد آتے ہیں یا وہ شہر جہاں اس کے والد دوران ملازمت تعینات رہے کیا وہاں کی یادیں اسے پریشان نہیں کرتیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بہت مطمئن تھی اور جتنی خوش وہ اب اس شوہر اور اپنے تین بچوں کے ساتھ تھی اتنی اس نے قبل کبھی نہیں تھی۔ تاہم جب کبھی اسے مالی حالات اجازت دیتے ہیں وہ باسفورس میں اپنے خاندان سے ملنے چلی جاتی ہے۔ میں نے چائے کے ساتھ مزیدار کیک کھایا جو شہد اور باداموں سے بنایا گیا تھا، پھر اجازت لے کر واپس آ گئی تھی کیونکہ مغرب کی نماز کا وقت قریب تھا۔

22۔ مارچ: میں آج طلوع آفتاب کے فوراً بعد مصطفیٰ کے ہمراہ مدینے پہنچنے پر امیر کو سلام کرنے گئی تھی۔ کئی افسروں نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں ایک ہال میں لے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد امیر آیا اور مجھے چبوترے پر لے آیا جہاں میں اس کے دائیں طرف والی نشست پر بیٹھ گئی تھی۔ امیر ایک دراز قد، دبلا پتلا، معمر اور باوقار شخص ہے، وہ اپنے سفید چغے کے اوپر سنہری عبا پہنے ہوئے تھا اس کے سر پر سفید چیک کا کفیہ تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میرا مدینے آنا ممکن بنایا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے شہر مقدس میں خوش آمدید کہتے ہوئے اسے بے حد مسرت ہوئی تھی۔ اس نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ حج اسلام میں میرے ایمان و یقین کو مضبوط کرے گا۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں حاجی عبداللہ فلبی کو جانتی تھی اور انگلستان میں مسٹر فلبی کی کیا حیثیت تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شک و شبے کے ایک احساس نے ہم دونوں کو گھیر لیا ہے۔ مجھے اس وقت ایسی بات پر حیرت نہیں ہوتی جب میں برٹن، برکات اور ان دوسرے افراد کے بارے میں سوچتی ہوں جو مسلمانوں کے رُوپ میں حرم پاک میں داخل ہو گئے تھے۔ اسلام ہر اس شے کی حفاظت کرتا ہے جو اس کے عقیدے کے لیے نہایت مقدس ہے۔

ایک خادم گرم دودھ کے گلاس مہمانوں کو پیش کر رہا تھا۔ میں نے حجاب کے نیچے گلاس کو لے جا کر

دودھ پی لیا تھا۔ پھر چینی کے بغیر بلیک کافی اور کیک پیش کیے گئے تھے۔ اس کے فوراً بعد میں نے اپنے میزبان سے اجازت لے لی تھی کیونکہ کئی دوسرے ملاقاتی انتظار میں بیٹھے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے امیر کی یہ صبح بہت مصروف گزرے گی۔

23۔ مارچ: ہم عرب کے مقامی وقت کے مطابق مدینے سے آٹھ بجے چلے تھے اور غروب آفتاب سے کچھ پہلے ایک جگہ رُک کر کار میں تیل پانی ڈالا، خود چائے پی اور پھر پہاڑی راستے سے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ سڑک کے کنارے خیرات مانگنے والے گوشت سے خالی بازو پھیلائے ہوئے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ ڈاکو ہیں جنہوں نے ایک بار حجاج پر حملہ کیا تھا، آج وقت بدل گیا ہے اور یہ ان سے خیرات مانگتے ہیں جنہیں یہ کبھی لوٹ لیا کرتے تھے۔

جب رات قریب آ جاتی ہے اور پہاڑوں کا رنگ نیلا ہو جاتا ہے تو ہم ایک بار پھر اپنے آپ کو کھلے میدان میں دیکھتے ہیں۔ شام کو نماز مغرب کے لیے رک جاتے ہیں۔ وضو کے لیے پانی نہ ہونے کی وجہ سے تیمم کر لیا جاتا ہے۔ ہمارا منہ مکہ کی طرف ہوتا ہے اور ہم قرآن پاک کے پہلے پارے میں سے تلاوت کرتے ہیں۔ نماز کے بعد جب ہم کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو صحرا ہمارا ڈائننگ ٹیبل اور ستارے چراغ ہوتے ہیں۔

ہم جنوب کی طرف سفر جاری رکھتے ہیں اور خاموش اونٹوں کے پاس سے گزرتے ہیں۔ تھکے ماندے حجاج اپنے پانی کے جگ ہماری طرف بڑھاتے ہیں کہ ان میں پانی ڈال دیا جائے۔ مصطفیٰ مجھے باخبر رکھتا ہے کہ محتاط رہوں ورنہ ہمارے اپنے لیے پانی کی ایک بوند نہیں بچے گی۔ میں اپنی آنکھیں بند ہوتی محسوس کرتی ہوں، سر چکرا رہا تھا اور پھر مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ کار رک جاتی ہے اور ہم زمین پر قالینیں بچھا دیتے ہیں۔ آسمان پر ان گنت ستارے رات کی تاریکی کو روشنی میں بدل رہے تھے۔ میں تکیے پر سر رکھتے ہی سو جاتی ہوں۔

27۔ مارچ: طلوع آفتاب کے تین گھنٹے بعد میں ایک بار پھر حرم میں تھی۔ مصطفیٰ میرے ساتھ تھا۔ میں حجاب میں رہی تاکہ دھوپ سے بچ سکوں۔ خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنے والے حجاج کا جم غفیر تھا۔ میں نے سنا کہ ابن سعود احرام باندھے اندر موجود تھا اور آب زم زم سے کعبے کا فرش دھو رہا تھا جس میں گلاب کا عطر ملا دیا گیا تھا۔ مکے کے تاجر یہ عطر ان گلابوں سے کشید کرتے ہیں جو طائف میں بہت پیدا ہوتے ہیں۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ یہ روح پرور منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں مگر میرے

تلوے جلنے لگتے ہیں اور میں چاہ زم زم پر چلی جاتی ہوں۔ دو عرب کنویں میں سے مسلسل پانی نکال رہے تھے جس سے باہر رکھی ہوئی صراحیاں بھر لی جاتی تھیں اور پھر حجاج کو یہ پانی پلایا جاتا تھا۔ اس پانی میں طبی لحاظ سے کئی بیماریوں کی شفا شامل ہے۔ اس لیے یہ پانی لوگ گھروں میں بھی لے جاتے ہیں۔

منیٰ، 28۔ مارچ: آج بعد دوپہر میں اپنے میزبان اور مصطفیٰ کے ہمراہ کار میں منیٰ اور عرفات کے لیے روانہ ہوئی تھی تا کہ منیٰ میں تین راتوں کے قیام کے لیے رہائش کے انتظامات کر سکوں۔ مکے سے روانہ ہونے کے بعد ہم شمال کی طرف گئے اور شہر سے باہر مضافات میں بادشاہ کا محل راستے میں آیا تھا۔

جلد ہی یہ محل ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ہم نے بہت سے اونٹ دیکھے جو نجد سے حجاج کو لا رہے تھے۔ ان کی عورتیں اونٹوں پر اس طرح سوار ہوتی ہیں جیسے بڑے بڑے پنجرے یا شہد کے چھتے اونٹ کی پیٹھ پر کوہان کے دونوں طرف لدے ہوئے ہوں۔ یہ چٹائیوں میں لپٹی ہوئی تھیں اور ان چٹائیوں میں سوراخ تھے اسی طرح کے جیسے میرے اس نقاب میں تھے جو میں نے حج کے موقعہ پر پہنا تھا۔ انہیں اس سفر پر نکلے تین چار ہفتے گزر چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں صحرا میں زیادہ ہوا ملتی ہے۔ ہم مشرق کو مڑ جاتے ہیں اور ایک ایسی گہری گھاٹی میں سے گزرتے ہیں جسے مرحوم بادشاہ حسین نے ٹھوس چٹان میں سے بارود کے ذریعے علاحدہ کیا تھا۔ اہل مکہ کا کہنا ہے کہ یہی ایک اچھا کام اس نے کیا تھا مگر ایسا کہنا زیادتی ہے۔ اس گھاٹی کے وجود میں آنے سے قبل یہ راستہ بے حد خطرناک تھا بالخصوص اونٹوں کے لیے اور ان پھسلن والی چٹانوں کو عبور کرتے وقت بہت سے حجاج مر گئے تھے۔

اس گہری گھاٹی کو عبور کرنے کے بعد ہم جلد منیٰ پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا صحرائی شہر ہے جہاں حجاج شیطان کو عرفات سے واپسی پر کنکریاں مارتے ہیں۔ یہاں میں حاجی ہوٹل گئی اور اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس ہوٹل میں ٹھہرنے سے کہیں بہتر ہوگا کہ دامن کوہ میں خیمہ نصب کر لیا جائے۔ موسم گرما تھا مگر کمرہ کرائے پر نہ مل سکتا تھا کہ حجاج کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

منیٰ صحرا میں واقع ہے۔ یہاں ایک ایسی پرانی مسجد ہے جس میں آنحضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر نماز ادا کی تھی۔ یہ مسجد صرف عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر کھلتی ہے اور ان تین دنوں میں یہاں حجاج کا ہجوم رہتا ہے۔ اس کے میناروں سے اذان کی آواز گونجتی ہے۔ حج کے اختتام پر خیمے لپیٹ لیے جاتے ہیں، ہجوم چلا جاتا ہے اور ایک بار پھر یہ مسجد اگلے سال تک کے لیے صحرا میں خاموش کھڑی رہ جاتی ہے۔

ہم موٹر کار میں جس راستے سے سفر کر رہے تھے یہاں کبھی دریا بہتا تھا۔ آگے چل کر پہاڑیوں کا ڈھلوانی راستہ شروع ہو جاتا ہے۔ شمال مشرق کی سمت میں پہاڑوں کے نیلے نظر آتے ہیں۔ ان کی ڈھلوان پر سبزہ اور خاردار جھاڑیاں اُگتی ہیں۔ ان میں سے گزرتے وقت خوشبو آتی ہے۔ یہاں جو بہت کم سبزہ اُگتا ہے اس میں ایک ایسی جھاڑی اُگتی ہے جسے بدو اپنی زبان میں بیشام کہتے ہیں۔ اس میں سے ایک گوند سی خارج ہوتی ہے جو زخموں پر مرہم کے طور پر لگائی جاتی ہے۔ اس میں زخموں کو مندمل کر دینے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ مقامی لوگوں میں یہ کہانی مشہور ہے کہ یہ پودا حضرت سلیمانؑ نے متعارف کرایا تھا اور انہیں یہ ملکہ شیبا نے پیش کیا تھا۔

ہم ان دوستونوں کو پیچھے چھوڑ آئے تھے جو مقدس سرزمین کی حد کو علاحدہ کرتے ہیں۔ ہم نے حد نگاہ تک پھیلا ہوا صحرا دیکھا تھا اور ایسی پہاڑیاں بھی جو عرب کے مرکز تک چلی گئی ہیں۔ اب اس سے آگے کار نہیں جا سکتی تھی۔ ہم بائیں طرف مڑ کر کوہ عرفات کے دامن میں چل رہے تھے۔ چٹان کی ڈھلوان پر بہت سی ایسی جگہیں تھیں جہاں نماز ادا کی جا سکتی تھی۔

پہاڑوں سے بہہ کر آنے والے پانی کو یہاں ٹینکوں میں جمع کر لیا جاتا ہے جو حوضوں میں بھی محفوظ کرتے ہیں۔ بالآخر یہ پانی مکہ پہنچتا ہے، جو یہاں سے بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ ہزار سال سے یہ پانی یہاں موجود تھا جسے آج کل شہر کو فراہم کیا جا رہا ہے۔ واٹر سپلائی کا یہ انتظام ملکہ نے کیا تھا۔

ہم نے اپنی کار یہیں چھوڑ دی تھی تاکہ نماز پڑھنے کے لیے اس جگہ پہنچیں جہاں حضرت آدمؑ نے نماز ادا کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہیں حضرت آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی تھی۔ یہاں بہت سے حجاج آرام کر رہے تھے اور مزید پہنچ رہے تھے۔ اس پہاڑی پر موجود مرد اور عورتیں یمن سے آئے ہیں جنہیں یہاں پہنچنے میں کئی ماہ لگ گئے تھے۔ ان لوگوں نے یہ سفر صحرا میں سے گزر کر کیا تھا۔ عورتوں نے مخروطی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں اور بالکل جادوگرنیاں لگتی تھیں۔ بہت سی عورتیں خوبصورت تھیں اور بڑے وقار کے ساتھ گھوم رہی تھیں، عموماً کوہستانی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

یہ عورتیں کار دیکھنے کے لیے پہاڑی سے نیچے اتر آئی تھیں مگر ڈر کر بھاگ گئی تھیں اس لیے کہ انہوں نے اس سے قبل کار کبھی نہ دیکھی تھی۔ انہیں یہ یقین دلانے میں کہ یہ بے چاری تو بہت ہی بے ضرر تھی بہت وقت درکار تھا۔

سونا اور تیل: سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سرزمین پر چٹانوں اور ریت کے سوا کچھ بھی نہیں یا اس نے اپنے اندر معدنیات کے قیمتی خزانے چھپا رکھے ہیں؟ زمانہ قدیم میں تو اوپیر میں سونے کی کانیں دنیا بھر میں مشہور تھیں اور یقیناً یہ خزانہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ دراصل یہاں کے لوگوں کو خوف یہ رہتا ہے کہ غیر ممالک کہیں ان کا استحصال نہ کرنے لگیں۔ اسی لیے یہ لوگ اپنے وسائل سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ انہوں نے اپنے ملک کو آزاد اور مقاماتِ مقدسہ کو محفوظ رکھا ہوا ہے۔ حجاز نے حجاج سے حاصل شدہ آمدنی پر صدیوں گزارہ کیا ہے مگر اب ان کی تعداد ہر سال کم ہوتی جا رہی ہے۔ کسی زمانے میں یہاں آنے والے حاجیوں کی تعداد دو لاکھ سے بھی بڑھ جاتی تھی مگر دنیا کے دباؤ کے باعث اب یہ لاکھ سے زیادہ نہیں ہوتے جس کے نتیجے میں سعودی عرب نقصان میں رہتا ہے میں جب جدہ میں تھی تو میں نے سنا تھا کہ تیل نکالنے میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ امریکی اور برطانوی دونوں کوشش کر رہے تھے کہ اس سلسلے میں انہیں رعایت مل جائے……

3۔ اپریل: رات بھر اونٹوں پر سامان لادا جا رہا تھا جن کے بلبلانے کی آواز صبح تک آتی رہی تھی۔ نیند کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بس ایک انجانی سی خوشی تھی کہ سونے نہ دیتی تھی۔

میں صبح جلدی اٹھ گئی تھی تاکہ حج سے قبل ایک بار طواف کر لوں۔ مجھے بیٹھے ہوئے اونٹوں کے درمیان سے راستہ بنانا پڑا تھا۔ فجر ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا جب میں اور میرا مطوف دونوں مسجد حرام میں داخل ہوئے تھے۔ ہم ان لوگوں میں شامل ہو گئے تھے جو ہم سے پہلے بیت اللہ کے طواف میں مصروف تھے۔ بہت سے بے خودی و سرمستی کے عالم میں چکر لگا رہے تھے۔ طواف مکمل ہو گیا تو میں ایک سیڑھی پر بیٹھ کر اس عجیب منظر سے لطف اندوز ہونے لگی تھی۔ حجر اسود کے پاس ہی دو سپاہی چھڑیاں اور چابک لیے کھڑے تھے۔ حجاج دیوانہ وار حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ سپاہی انہیں مارتے اور پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ نظم و ضبط قائم رکھا جا سکے۔ جلد ہی میری ایک دوست میرے قریب آئی اور مجھے حجر اسود کو آگے بڑھ کر بوسہ دینے پر اکسایا مگر میں نے معذرت کرتے ہوئے اسے بتایا کہ میں اس دھکم پیل میں ایسا کرنے سے قاصر ہوں۔ میں نے اسے بھی منع کیا۔ اتنے میں اس کا بھائی آ گیا تھا جس کا اس نے مجھ سے تعارف کرایا۔ اس نے بھی اپنی بہن کو روکا کہ حجر اسود کو اس صورت حال میں بوسہ دینا بہت مشکل تھا اس لیے وہ باز آ جائے۔ اب اس عورت نے اپنے بھائی کی مدد سے راستہ بناتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے حجر اسود

کے قریب لے جانا چاہا۔ میر امطوف بھی ہماری مدد کر رہا تھا مگر یہ کام ناممکن نظر آتا تھا۔ ہمیں ان بدوؤں نے دھکیل کر ایک طرف کر دیا تھا جو حجر اسود کو ہر قیمت پر بوسہ دینے کے لیے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ میں صحیح سلامت ان میں سے باہر نکل آئی تھی۔ اس خاتون کا بھائی اسے زخمی حالت میں پکڑ کر میرے پاس لایا اور بہن سے عربی میں جو کچھ کہا اس کا مطلب تھا: ''میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ ایسا ہی ہوگا!......''

5۔ اپریل: میں حج کے موقعہ پر ایک انگریزی کتاب اپنے ساتھ لے آئی تھی کیونکہ مجھے یہ معلوم تھا کہ ہجوم کے درمیان ہماری پیشرفت بہت سست ہوگی۔ میں نے ایک جگہ رک کر وہ کتاب پڑھنی شروع کر دی تھی۔ میں کتاب کے مطالعہ میں غرق تھی کہ قریب سے کار میں بیٹھے ہوئے کسی انسان نے مجھ سے پوچھا: ''کیا آپ کے ہاتھ میں عربی کی کتاب ہے؟'' سلیمان نے جلدی سے جواب دیا، ہاں یہ کتاب عربی میں ہے اور مجھ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ میں کتاب بند کر دوں۔ میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس شخص نے دوبارہ کار میں سے مجھ سے پوچھا: ''کیا آپ قسم کھا کر کہہ سکتی ہیں کہ یہ عربی میں ہے اور یہ مسلمانوں کے پڑھنے کی کتاب ہے؟'' اس سے قبل کہ سلیمان جو چوکنا ہو گیا تھا جواب دیتا، میں نے مڑ کر کتاب اس سوال کرنے والے کی طرف بڑھا دی تھی۔ ساتھ ہی میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا: ''یہ کتاب انگریزی میں ہے اور میں انگریز مسلمان عورت ہوں اور میں یہاں حج ادا کرنے آئی ہوں جس کے لیے بادشاہ نے مجھے اجازت دے رکھی ہے۔'' چند ہی سیکنڈوں میں جس دوران حیرت انگیز خاموشی چھائی ہوئی تھی اس نے کتاب مجھے واپس کرتے ہوئے کہا: ''الحمدللہ (سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے)''......

چند میلوں کے سفر کے بعد ہم مزدلفہ میں تھے، یہاں ایک قدیم مسجد کے کھنڈرات نظر آئے۔ پہاڑیوں پر کوئی سبزہ نہ تھا یہاں تک کہ ہم ان اونچے ستونوں تک پہنچ گئے تھے جو سرزمین مقدس کی حد کے ختم ہونے کی نشان دہی کر رہے تھے۔ اس سے آگے عرفات کا میدان ہے جس میں اس وقت خیمے، اُونٹ اور حجاج نے ایک چھوٹی سی دنیا آباد کر رکھی تھی۔ جُوں ہی ہم قریب پہنچے ہمیں حجاج کی زبانی ''لبیک اللھم لبیک'' کی آواز سننے کو ملی۔ یہ اس قدر بلند تھی کہ ہر دوسری آواز اس تلے دب کر رہ گئی تھی۔ ایک لاکھ سے زیادہ مردوں اور عورتوں کا مجمع تھا، یہ وہ حجاج تھے جن میں سے بہت سے ہزاروں میلوں کا فاصلہ طے کر کے یہاں پہنچے تھے۔ راستے کی صعوبتیں بھی انہوں نے برداشت کی ہوں گی اور برسوں سے جمع کی گئی پونجی بھی خرچ کرتے آئے ہوں گے۔ دنیا کا یقیناً کوئی دوسرا شہر ایسا نہ ہوگا جہاں کی اتنی زیادہ آبادی صرف مذہبی پابندی کا احترام کرتے

ہوئے مقررہ مدت کے دوران میاں بیوی کے جنسی تعلق سے مکمل پرہیز کر رہی ہو......

میرے میزبان نے مجھے دعوت دی کہ میں اس کے خیمے میں چلی جاؤں۔ میں نے وہاں جا کر اپنا گدا اور تکیہ اس جگہ بچھا لیا تھا جہاں سے مجھے باہر کا پورا منظر دیکھنے کو مل جائے۔ میں نے حجاب اتار دیا تھا، گرمی بہت زیادہ تھی۔ میں ایک ایک منٹ کے بعد چائے پیتی تھی یا وہ انار کھا لیتی تھی جو میں طائف سے ساتھ لائی تھی۔ میرا میزبان بادشاہ کے وزراء میں سے تھا (فلبی کبھی بھی ابن سعود کا وزیر نہ رہا تھا۔ مائیکل ڈولف) اور اس کے بہت سے دوست تھے جو اسے ملنے آتے تھے مگر کسی نے میری وہاں موجودگی پر حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

میرا جب اُس سے تعارف کرا دیا گیا تو ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں انہیں برطانیہ کی زندگی اور وہاں کی تفریح کے بارے میں بتا رہی تھی، اور ساتھ ساتھ معذرت بھی کرتی جاتی تھی کہ میں ان سے عربی میں روانی سے گفتگو نہیں کر سکتی تھی ورنہ باہمی دلچسپی کے کئی موضوعات پر ان سے بات کرنے کو میرا جی چاہتا تھا۔ کھانا آیا تو میری پسندیدہ چیز میرے پاس تھی جو میں ساتھ لائی ہوئی تھی۔ باقی سب لوگ ایک ہی جگہ بیٹھ گئے اور چھری کانٹے کے بغیر ہاتھوں سے کھا رہے تھے۔ کھانے سے قبل سب کے ہاتھ دھلائے گئے تھے۔ پھر صاف تولیہ دیا گیا تھا کہ ہاتھ خشک کر لیے جائیں۔

اس کے بعد میں اس خیمے کے عقب میں دوسرے خیمے میں چلی گئی تھی تا کہ دیکھوں کہ میری میزبان اور اس کی پارٹی وہاں کیا کر رہی تھی کیونکہ اس دن تمباکو اور سگریٹ نوشی کی تو ممانعت تھی۔ مصطفیٰ کی والدہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ ایک نوجوان خاتون دوسروں کو قرآن پاک کی ایک سورۃ پڑھ کر سنا رہی تھی۔ جسے سب بڑے انہماک سے سن رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر ان کے درمیان بیٹھی رہی مگر میرے بڑے اور کھلے خیمے کی نسبت یہاں گرمی زیادہ تھی اس لیے میں واپس لوٹ آئی تھی۔ اب ہم نماز ظہر کے لیے وضو کرنے میں لگ گئے تھے۔ اگر کہیں پانی دستیاب نہ ہو تو ریت یا مٹی سے تیمم کر لیا جاتا ہے۔

میرے لیے جائے نماز بچھا دی گئی تھی جس کا رُخ کعبے کی طرف تھا۔ میں نے چار رکعتیں ادا کیں۔ اس کے بعد نماز میں مردوں کی امامت ہمارے میزبان کرائی جس میں انہوں نے بھی چار رکعتیں ہی پڑھی تھیں۔ اب ہم سب بیک آواز ''لبیک اللھم لبیک'' کہہ رہے تھے۔ اسے بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ پھر قرآن پاک کا ایک پارہ بے حد خوش الحانی سے تلاوت کیا گیا تھا۔

کیمپ میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ پتا کیا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ کے لیے راستہ خالی کرایا جا رہا تھا جو

جبل رحمت کی طرف جا رہا تھا۔ وہ جب کار میں قریب سے گزرا تو میں نے بھی اس حکمران کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی۔ وہ ایک مقناطیسی کشش کا مالک شخص تھا اسی لیے عرب میں جو حیثیت اسے آج حاصل ہے وہ اس سے پہلے کسی کو حاصل نہ تھی۔ صرف شاہی خاندان سے تعلق رکھنا اچھے اور کامیاب حکمران کے لیے ضروری نہیں ہوتا......

بادشاہ کے پیچھے پیچھے کئی معروف شخصیات تھیں۔ ان میں ڈچ بنکار وان ڈرپال بھی تھا جو چند ہی برس قبل اسلام قبول کر چکا تھا۔ میں جدہ میں اس سے برطانوی سفارت خانے میں مل چکی تھی۔ وہ چلچلاتی دھوپ میں ننگے سر، احرام باندھے ایک اعلیٰ نسل کے اونٹ پر سوار تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے تین اور حضرات اونٹوں پر سوار تھے جو اسی سے ملتے جلتے مقام و مرتبے کے مالک دکھائی دیتے تھے۔ یہ ڈچ بنکار الجیریا میں رہتا ہے اور ہر سال حج ادا کرنے آتا ہے۔

ہم نے امام کو جبل رحمت کی چوٹی پر کھڑے دیکھا تھا۔ قدیم دور میں وہ اونٹ پر بیٹھتا تھا مگر اب وہ اونچے ستون کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے اور اسی پہاڑ سے اپنا وعظ وہاں موجود حجاج تک پہنچاتا ہے۔ اس کی آواز ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ہم نے عصر کی نماز ادا کی اور پھر ''لبیک اللھم لبیک'' کی آواز بلند کرنی شروع کر دی تھی۔ اب سورج غروب ہو گیا تھا اور بادشاہ چلا گیا تھا۔ خیمے لپیٹے جا رہے تھے، سامان باندھا جا رہا تھا، کہیں اسے اونٹوں پر لادا جا رہا تھا تو کہیں کار پر اور یہ سب کچھ مختصر سے وقت میں ہو گیا تھا۔ حج ہو چکا تھا اور میدان عرفات میں جمع ہونے والے تمام لوگ مرتے دم تک اب اپنے نام کے ساتھ حاجی یا حجن (خاتون کے لیے) لگانے کے مستحق تھے۔

ہم بروقت مزدلفہ پہنچ گئے تھے جہاں ہم نے چند گھنٹے آرام کیا۔ نماز ادا کی اور زمین پر کمبل بچھا کر سو گئے تھے۔ نصف شب کو ہم دوبارہ عازم سفر ہو چکے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس سات سات کنکریاں تھیں جو ہم نے صحرا سے جمع کی تھیں تاکہ منیٰ پہنچ کر ''بڑے شیطان'' کو مار سکیں۔ منیٰ پہنچ کر ہم اپنی کاروں سے اتر آئے تھے اور کنکریاں مارنے والی جگہ کی طرف پیدل چل رہے تھے۔ مصطفیٰ کی امی کار میں پھر سو گئی تھی۔ اسے جگانے کی ہر کوشش ناکام گئی تو ہم نے اسے سیٹ پر سلا دیا تھا۔ لگتا تھا حج کے دوران وہ زیادہ وقت سوئی ہی رہی تھی کیونکہ میں نے اسے طواف کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ ایک معمر خاتون ہے اور اس نے اپنے بیٹوں میں سے کسی ایک سے کہہ رکھا ہے کہ وہ حج کی تمام رسوم اس کی جگہ ادا کرے۔ ابوبکر اسے جدہ سے ساتھ لایا تھا۔

یوں وہ دو بیٹوں کے ساتھ حج کر رہی تھی اس لیے جس دوران وہ سوئی رہتی تھی یہ ان دونوں بیٹوں کا فرض تھا کہ اس کی جگہ مختلف رسوم ادا کرتے جائیں۔

شیطان کو جہاں جا کر کنکریاں مارنی تھیں وہ جگہ ایک میل دور تھی۔ مگر چونکہ رات کا وقت تھا اس لیے حجاج کے ہجوم میں سے راستہ بنانے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ خواتین جن کا تعلق حرم سے تھا ان کے لیے بہت مشکل تھا کہ انہیں تو پیدل چلنے کی بالکل عادت نہ تھی۔......

جب ہم واپس کار میں آئے تو اس وقت بھی مصطفیٰ کی امّی سوئی ہوئی تھی۔ ہم نے اسے منیٰ والے چھوٹے سے گھر میں چھوڑا اور خود کار میں مکہ مکرمہ واپس آ گئے تھے۔ طلوع آفتاب میں ابھی کچھ وقت باقی تھا جب ہم مکے پہنچے تھے۔ ہم سیدھے مسجد حرام میں پہنچے، طواف کے بعد نماز فجر کی دو رکعتیں ادا کیں اور گھر آ گئے۔ ہمیں گھر سے گئے صرف دو روز ہوئے تھے مگر مجھے یوں لگتا تھا جیسے پوری ایک صدی گزر گئی ہو۔ میں جب سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اس وقت دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میرے پیچھے پیچھے سلیمان تھا جس نے میرا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔ مسجد میں مصطفیٰ کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے فوراً بعد میں نے جلدی جلدی اپنے کپڑے تبدیل کیے اور سو گئی۔

6۔ اپریل، الوداعی طواف: میں جب اٹھی تو ایک غلام نے مجھے حج کی ادائیگی مکمل ہو جانے پر مبارکباد دی۔ غسل کے بعد میں نے سیاہ ریشمی لباس پہنا، حجاب لیا اور پھر طواف کے لیے مسجد حرام چلی گئی تھی۔ میں نے طواف بھی کیا اور سعی بھی۔ حجاج کی کثرت تھی اور کوئی شخص اس وقت سو نہیں رہا تھا۔ سب نے احرام اتار دیئے تھے۔ اور سبھی نئے لباس میں طواف میں مصروف تھے تمام مطوّف اور حجاج دعاؤں میں مصروف تھے اور حجاج کے گڑگڑانے اور آہ وزاری کی چیخوں سے مسجد گونج رہی تھی۔

خانہ کعبہ کو نیا غلاف پہنا دیا گیا تھا۔ اس نہایت قیمتی اور خوبصورت غلاف کعبہ پر لکھی ہوئی عبارت دور سے صاف پڑھی جا سکتی تھی کیونکہ تمام حروف مشرقی خطاطی میں جلی لکھے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں اس غلاف پر قرآن پاک کے پورے تیس پارے کڑھے ہوئے ہوتے تھے......

چند برس قبل خیال کیا گیا تھا کہ اب تک ہاتھ سے بُنی جانے والی قالین اب مشین پر بنائی جانی چاہیے۔ چنانچہ مانچسٹر (برطانیہ) سے ایک مشین بہت مہنگی خرید کر منگوائی گئی تھی لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی اور انہیں ماضی کی طرح ہاتھ سے بُننے پر اکتفا کرنا پڑا تھا۔

میں ستاروں بھرے آسمان تلے دوبارہ سوگئی تھی مگر حج تو ادا ہو چکا تھا۔ میں سرسبز لہلہاتے کھیت، کھلے آسمان، بارش کی رم جھم دیکھنا چاہتی تھی، جہاں میں تیز دھوپ اور گرمی سے بچ سکوں۔

اگلے روز عیدالاضحیٰ تھی اور جب تک یہ ختم نہ ہو جائے بادشاہ کی اجازت کے بغیر کوئی جا نہیں سکتا۔

اس وقت منیٰ کے گردونواح میں ایک لاکھ حجاج نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے، خیمے نصب ہیں اور حدنظر تک خیمے ہی خیمے دکھائی دے رہے ہیں۔ اونٹوں کو پہاڑیوں میں باندھ کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ میں نے سوچا ایک میرے چلے جانے سے بادشاہ کو کیا فرق پڑے گا؟ میں کیوں نہ التماس کر دیکھوں کہ میں جانا چاہتی ہوں۔

7۔اپریل: مصطفیٰ میرے لیے یہ خبر لے کر آیا تھا کہ بادشاہ نے مجھے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ جس وقت مجھے یہ پیغام موصول ہوا میں اس وقت چھت پر تھی۔ میں نے جلدی جلدی اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنی میزبان کو الوداع کہا۔ تمام خواتین، نوکروں اور غلاموں کو خدا حافظ کہا۔ میری کار دروازے پر تھی اور میرا میزبان اور اس کا بیٹا بھی موجود تھے۔ میں نے اس مہربانی، مہمان نوازی اور خدمت کے لیے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا جو مجھے ان سے ملی تھی۔ میں مصطفیٰ کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی تھی۔ ایک چھوٹا سا غلام جس کے پاس مکے والے گھر کی چابی تھی میرے ساتھ تھا کیونکہ میں وہاں سے اپنا سامان اٹھانا چاہتی تھی۔

کار آہستہ آہستہ خیموں کے قریب سے گزرتی باہر آ رہی تھی۔ حجاج اپنے رنگین کپڑوں میں عید منا رہے تھے، احرام سب نے اتار دیئے تھے۔ کھانوں کی خوشبو فضا میں پھیل گئی تھی۔ اونٹ بلبلا رہے تھے۔ بچے اور بڑے اپنے اپنے دوستوں کو آوازیں دے کر ہجوم کے اندر تلاش کر رہے تھے۔ سورج کی روشنی پوری وادی میں پھیلی ہوئی تھی اور رنگین کپڑوں نے دور دور تک ایک قوس قزح کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر کھیلتی مسرت اور طمانیت قابل دید تھی۔

ہجوم آہستہ آہستہ پیچھے رہ گیا تھا اور سڑک ویران لگتی تھی۔ صرف چند بدو اپنے اونٹوں کے ساتھ مکہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔

ہم ایک خاموش شہر میں داخل ہوئے، دکانیں ابھی بند تھیں، مکانوں میں مکین نہیں تھے اور وہ مقفل تھے۔ صرف کبوتر اور کتے کھلے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ میں جب اس مکان میں داخل ہوئی جہاں میں نے ایک مختصر سا یادگار عرصہ گزارا تھا تو میں سیڑھیاں چڑھ کر اس کمرے میں پہنچ گئی تھی جہاں میری چیزیں بکھری پڑی

تھیں۔ میں نے سفر کی تیاری شروع کر دی تھی۔ مصطفیٰ مسجد گیا تھا اور سلیمان ہمارے لیے ڈبل روٹی اور انڈے لینے چلا گیا تھا۔

مصطفیٰ مجھے بتا کر گیا تھا کہ وہ ایک گھنٹے میں واپس آ جائے گا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر جا رہا تھا اور پھر مجھے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ میں اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔ چند لمحے پہلے موجود ساری رونق، چہل پہل انسانیت کا ہجوم رخصت ہو گئے تھے۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا جس کے بعد مجھے پہلے سے بھی زیادہ گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنا سامان باندھ چکی تھی اور اب مجھے مصطفیٰ کی واپسی کا انتظار تھا۔ اب میری آرزو یہی تھی کہ یہاں سے چل پڑوں۔

میرے پاس حج کے موضوع پر دو کتابیں اور ایک نسخہ قرآن پاک کا عربی میں تھا۔ میں نے ان میں سے ایک کتاب کھول کر اس کے دلکش الزبیتھی سٹائل پر توجہ مرکوز کی۔ میرے خیال میں اس کتاب کی ساری خوبصورتی اس سٹائل یا طرز تحریر میں ہے۔ میں نے فوراً اس کتاب کو بند کر کے رکھ دیا تھا کیونکہ مجھے اچانک یہ خیال گزرا تھا کہ یہاں اس موقعہ پر ایسی کتاب کا مطالعہ کرنا بے ادبی ہو گی۔ اب میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی کہ شاید مصطفیٰ واپس آ رہا ہو۔ پھر اچانک میں نے قرآن کھول لیا تھا۔ میری نظر کے سامنے "سورۃ النور" تھی۔

میں اپنے اردگرد سے بالکل بے خبر اس سورۃ کو پڑھ رہی تھی کہ باہر دروازہ پر مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں جو تین گھنٹوں سے اس گھر میں اکیلی ایک قیدی کی طرح بند تھی، مصطفیٰ اور سلیمان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ مصطفیٰ نے مجھے بتایا کہ اسے پولیس نے روک لیا تھا اس لیے اسے دیر ہو گئی تھی۔ وہ اس سے یہ جاننا چاہتے تھے کہ جس وقت تمام محترم حجاج منیٰ میں تھے یہ مکہ میں کیا کر رہا تھا۔ سلیمان اور چھوٹا غلام ہمارے اس لنچ کے لیے سامان لے آیا تھا جس میں دیر ہو گئی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی لنچ کیا کیونکہ میں شام کا اندھیرا پڑنے سے پہلے جدہ پہنچنا چاہتی تھی۔

مکہ مکرمہ سے روانہ ہونے سے قبل میں ایک بار پھر طواف اور سعی کے لیے مسجد حرام میں جاتی ہوں۔

اس وقت بھی مکہ خالی تھا اور یہاں کی پوری اسلامی دنیا منیٰ میں عیدالاضحیٰ عید منا رہی تھی۔ مجھے تھوڑے سے حجاج ایسے بھی نظر آئے تھے جو طواف کعبہ میں مصروف تھے۔ اہل مکہ کو اس بات پر بجا طور پر فخر ہے

کہ دن ہو یا رات، سال کے ہر حصے میں کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا جب اہل ایمان بیت اللہ کے طواف میں مصروف نہ ہوں۔

صفا مروہ پر سعی کے دوران میرا پاؤں ایک سیڑھی پر سے پھسلا اور میں پیچھے کی جانب گر گئی تھی۔ میری کلائی ٹوٹ گئی تھی۔

گو مصطفیٰ نے اس پر کس کر پٹی باندھ رکھی تھی مگر مجھے درد اس قدر شدید تھا کہ میں سات مرتبہ سعی کرنے کے قابل نہ رہی تھی، میں چار بار صفا و مروہ پر دوڑ چکی تھی۔

چھوٹا غلام لڑکا منیٰ اپنے گدھے پر سوار ہو کر جا رہا تھا، میں اپنی کار میں مصطفیٰ کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ سنسان سڑکوں، گلیوں میں سے کار گزر رہی تھی، بازار ویران تھے، دُکانیں بند تھیں۔ یہاں تک کہ ہم شہر کے سبز دروازوں پر پہنچ گئے تھے۔ میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ میں نے مصطفیٰ سے پوچھا کہیں ایسا نہ ہو کہ بادشاہ نے یہ حکم جاری ہی نہ کیا ہو کہ ہمیں جانے کی اجازت ہے، وہ بھول گیا ہو۔ اس نے مجھے بتایا کہ نہیں ایسا نہیں کیونکہ اس نے خود بادشاہ کو ٹیلیفون پر یہ پیغام دیتے سنا تھا۔ مصطفیٰ نے اور خود میں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ جانے کی اجازت تو بادشاہ نے مجھے دی ہوگی۔ مصطفیٰ کو ساتھ آنے کی تو نہیں...... ہاں سلیمان کو ضرور اجازت دی ہوگی کہ وہ میرا ڈرائیور تھا۔ مصطفیٰ اپنے آپ کو میری حفاظت کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ میں یہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ اسے میرے ساتھ جدے تک واپس آنے کی اجازت نہیں ملی ہوگی۔

اس دوران صرف یہ ہوگا کہ پولیس منیٰ میں موجود بادشاہ کو فون کر کے اجازت لے گی اور مصطفیٰ کو اس چیک پوسٹ پر میرے ہمراہ انتظار کرنا پڑے گا۔ چونکہ سخت گرمی تھی اس لیے میں کار سے باہر آ گئی تھی اور قریب کے ایک کیفے میں چلی گئی۔ کیفے کا مالک اکیلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور وہ اللہ کے 99 ناموں کو لَے سے پڑھ رہا تھا۔ اس کی آواز دُور سے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ لگتی تھی۔ باہر چونکہ بہت گرمی تھی اس لیے کیفے کے اندر آ کر مجھے بڑا سکون ملا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کیفے کا مالک اس وقت منیٰ میں کیوں نہیں تھا۔ اس نے جلدی جلدی ہمیں چائے پیش کی (آپ سرخ چائے پسند کریں گی یا سبز؟ اس نے مجھ سے پوچھا تھا)۔ اس نے بتایا کہ پچھلے تین دنوں میں ہمارے علاوہ کوئی گاہک اس کے کیفے میں نہیں آیا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑا اطمینان تھا اور چہرے مہرے سے وہ ایک باوقار نیک انسان لگتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہے۔

اسلام، جس میں معاشرتی بلندی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا ایک انسان ہزار برس قبل تک کا سفر طے کر کے اپنا شجرۂ نسب معلوم کرسکتا ہے مگر اسے اپنی روزی محنت کر کے کمانا ہوگی اور ایمانداری کے ساتھ رزقِ حلال کے حصول کے لیے کوشاں رہنا ہوگا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کا اپنا تعلق قریش کے ایک اعلیٰ خاندان سے تھا، ان کی اولاد اکثر غریب گھروں میں ملتی ہے۔

جب ہمارا میزبان ہماری تواضع چائے سے کرنے میں مصروف تھا ایک چھوٹی سی معصوم بچی شرماتی ہوئی اندر داخل ہوتی ہے۔ وہ جب اپنے والد کے پیچھے سے جھانک کر مجھے دیکھتی ہے تو مجھے اس کا چہرہ کھلا ہوا نظر آیا تھا۔ باپ نے اسے اپنے گھٹنوں پر بٹھالیا تھا اور ہم دونوں کی بہت جلد دوستی ہوگئی تھی۔ وہ ہنستی بھی جاتی تھی اور مجھ سے باتیں بھی کرتی جاتی تھی اور اس دوران اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں رقص کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ اپنے دن بھر کی کہانی سنانے میں مصروف تھی اور اس کا لب ولہجہ انداز، اعتماد ایک پختہ عمر کی عرب خاتون جیسا تھا۔

ایک گھنٹے تک پولیس فون پر بات چیت کرتی رہی تب جا کر پیغام آیا کہ مجھے جانے دیا جائے لیکن اکیلے مصطفیٰ کو ساتھ جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ مصطفیٰ کو روک کر اس جرم میں گرفتار کرلیا گیا تھا کہ وہ میرے ہمراہ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم نے اس کا سامان کار سے اتار دیا تھا اور میں نے مصطفیٰ کو الوداع کہا جو بے حد ناخوش اور رنجیدہ تھا۔ تاہم اس کا حقہ اس کے ساتھ تھا جو اس کی دلجوئی کرسکتا تھا بشرطیکہ پولیس نے اسے حقہ پینے کی اجازت دے دی ہو۔

☆☆☆

پانچواں حِصّہ

دورِ جَیٹ کا حج

1947—90ء

جیٹ ہوائی جہاز کے زمانے کا حج

بیسویں صدی تک سفرحج کی روایت تقریباً اتنی ہی پرانی تھی جتنا پرانا حج خود تھا۔ایک ہزار برس تک جن لوگوں کو حج ادا کرنا ہوتا تھا وہ حج کے لیے مخصوص مہینے میں مکہ مکرمہ سے باہر کے بہت سے اسٹیشنوں میں سے کسی ایک اسٹیشن پر آ جاتے اور یہاں سے کسی مقامی گائیڈ کی خدمات حاصل کر لیتے تھے جو انہیں مکے لے جاتا تھا۔جن حجاج کو بہت دور دراز کے علاقوں سے آنا ہوتا تھا وہ کسی سالانہ قافلے کے ہمراہ سفر کرتے تھے۔یہ قافلے کے سردار کو خوراک اور اپنے تحفظ کے لیے کچھ رقم دے دیتے تھے اور خشکی کے راستے فاصلے کو مدنظر رکھتے ہوئے سفرحج پر روانہ ہو جاتے تھے۔جو سفرنامے قارئین نے پڑھے ہیں ان سے انہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ خشکی کے سفر کی رفتار کے اعتبار سے ابن بطوطہ کے سفر (1326ء) اور رچرڈ برٹن کے سفر (1850ء کی دہائی) میں بمشکل کوئی تبدیلی آئی تھی۔

آئندہ سو سال میں یہ ہمیشہ کے لیے بالکل بدل گیا تھا۔اس میں اصل پیشرفت ٹرانسپورٹ کی وجہ سے ہوئی۔پھر نئی نئی سواریاں ایجاد ہوتی رہیں اور یہ طویل سلسلہ جیٹ ہوائی جہاز کے دور تک پہنچ گیا تھا۔ 1960ء میں ہوائی جہاز کے ذریعے سفرحج کرنے کی وجہ سے حجاج کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوا تھا۔زمانہ وسطی کے اونٹوں گھوڑوں پر سوار ہو کر حج پر جانے کے رواج میں بہت بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔قافلے اور کارواں سرائے اپنا وجود کھو بیٹھے تھے۔مناسکِ حج البتہ غیر متبدل رہے۔پختہ سڑکوں، بسوں، ہوائی جہازوں نے حجاج کے سفر کو آسان بنا دیا تھا۔ 1933ء میں جب لیڈی ایولین کوبولڈ مکہ گئی اس سال حجاج کی تعداد ایک لاکھ سے بھی کچھ کم تھی۔چند عشروں کے بعد یہ 1990ء کی دہائی میں دو لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔

باوجود بہت سے دباؤ کے حج کا فریضہ آج بھی ادا ہو رہا ہے اور اس کی توسیع کے دو بڑے اسباب ہیں۔پہلا یہ کہ دنیا بھر میں اب بھی اس تجربے میں بڑی دلکشی ہے جو ایک اجتماعی شرکت پر مبنی ہے۔دوسرا یہ کہ 1950ء سے حجاج کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا جس سے سعودی عرب کی معیشت بہت بہتر ہوئی، جس کے نتیجے میں حکومت نے حجاج کے لیے سہولیات کی طرف خصوصی توجہ دی۔

حج سہولیات ابتدائی مراحل میں

1950-75ء

مسجد حرام کے فرش میں 1950ء سے قبل چند ایک بار توسیع ہوئی۔ پہلا اضافہ 638ء میں اس وقت ہوا جب بیرون عرب اسلام تیزی سے پھیلا اور ہر سال مقامات مقدسہ کو آنے والے حجاج کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ آئندہ سو سال میں دروازوں، لالٹینوں، ہال کمروں کی چھتوں، ساگوان کی لکڑی کے استعمال، ستونوں، عمارت کی زیب و زینت اور کندہ تحریروں مین بتدریج اضافہ ہوا تھا۔ پھر 700ء کے وسط تک کوئی توسیع نہیں ہوئی تھی۔ اب مزید جگہ درکار تھی اور یہ مسئلہ بنا ہوا تھا۔ 918ء میں مسجد کی دیواریں ایک بار پھر پیچھے ہٹادی گئی تھیں جس سے 100,000 مربع فٹ جگہ بن گئی تھی۔ پھر ایک ہزار برس تک کوئی قابل ذکر اضافہ مسجد حرام میں نہیں ہوا۔ حکومتیں اب اس طرح بدلتی رہیں۔ پہلے فاطمیہ سلطنت آئی (961-1171ء)، پھر سلطنت ایوبیہ (1169-1250ء)، اس کے بعد مملوک آئے (1250-1517ء) پھر سلطنتِ عثمانیہ (1517-1922ء)۔ اس آخری حکومت کے سلاطین نے زیادہ توجہ عمارت کو خوبصورت بنانے پر دی۔ یہ سچ ہے کہ 1572ء میں سلطان سلیم نے عمارت کو از سر نو تعمیر کرنے کا حکم جاری کیا تھا جس میں لکڑی کی چھت تبدیل کر کے پلستر سے گنبد بنانے کی طرف توجہ دی گئی تھی لیکن اس سے مسجد کا رقبہ کچھ زیادہ نہیں بڑھا تھا۔

پھر 1950ء کی دہائی میں جب توسیع کا کام ایک بار اور شروع ہوا تو پہلے کی طرح اب بھی زیادہ زور مزید جگہ حاصل کرنے پر دیا گیا تھا۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد پہلے پانچ برسوں میں دوسرے ممالک سے آنے والے حاجیوں کی تعداد تین گناہ بڑھ کر 150,000 ہوگئی تھی۔ اس تعداد کے لیے مسجد میں توسیع لازمی ہو گئی تھی۔ پہلی توجہ صفا و مروئی کے درمیان کی اس جگہ پر دی گئی جہاں سعی کی جاتی تھی۔ زیادہ حجاج کو زیادہ جگہ مہیا کرنے کے لیے اسے دو منزلہ بنا دیا گیا تھا۔ دونوں سطحوں کو چوڑا کر کے دونوں کو علاحدہ علاحدہ کر دیا گیا تھا تاکہ تصادم نہ ہو۔ صفا و مروئی کی پہاڑیوں پر بڑے بڑے گنبد بنا دیئے گئے تھے۔ 16 دروازوں کا اضافہ کر دیا

گیا تھا، نئی سیڑھیاں بنا دی گئی تھیں اور نماز کے لیے تہ خانے میں بڑے بڑے ہال بن گئے تھے۔ دیواروں کے باہر کے حصے پر سنگ مرمر لگ گیا تھا۔

1959ء میں دوسری عمارت کی تعمیر شروع ہوئی اور سعی کے لیے صفا و مروہ تک جانے والا راستہ بہتر بنا دیا گیا تھا۔ ایک بڑی بارہ دری جنوب کی طرف بنائی گئی تھی دوسری 1961ء میں شمال کی طرف۔ کعبہ کو مرمت کے ذریعے بالکل نیا بنا دیا گیا تھا۔ طواف کے لیے جگہ میں کافی توسیع کر دی گئی تھی۔ ایک تیسری منزل، جو دراصل مسجد حرام کی چھت تھی، اب نماز کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ یہ 1965ء کی بات ہے جب مسجد کا کل رقبہ 656,000 مربع فٹ ہو گیا تھا جس کے اندر 400,000 افراد سما سکتے تھے۔ یہ وہ سہولت ہے جس کا ذکر سعید ملر خلیفہ، جلال آل احمد اور میلکم ایکس نے درج ذیل اقتباسات میں کیا ہے۔ مسجد اس وقت 1950ء کے مقابلے میں چھ گنا بڑی تھی۔

1950ء کی دہائی میں تیل سے حاصل شدہ منافع مکہ کو حج کی آمدنی پر انحصار کرنے کے بجائے ایک ایسے شہر میں تبدیل کر رہا تھا جو اپنے انتظامی امور اور بنکاری کے مرکز کی حیثیت سے ایک خاص اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ ایک سیاح لکھتا ہے کہ 1954ء میں حجاج سے جو 10 ملین پونڈ سٹرلنگ حاصل ہوئے تھے وہ تیل سے حاصل شدہ دولت کے سمندر میں ایک قطرے سے زیادہ نہ تھے۔ یہ شہر اب مزید جدید بن رہا تھا۔ تعمیرات کا کام ایک اہم انڈسٹری کی شکل اختیار کر گیا تھا جس کی وجہ سے پختہ سڑکیں، عالیشان مکانات، دفتری عمارات جو پہاڑیوں پر تعمیر ہو گئی تھیں، اس شہر میں رونما ہونے والی نمایاں تبدیلی کو ظاہر کرتی تھیں۔ گھروں، عمارتوں اور سڑکوں پر بجلی سے روشنی ہی روشنی ہو گئی تھی۔ بادشاہ کو شہر میں ہر طرف بڑی بڑی امریکی کاریں دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد حج خودکار ہو گیا تھا۔ اندرونی طور پر 1947ء سے عریبین ٹرانسپورٹ کمپنی حجاج کی ایک بڑی تعداد کو عرفات تک پہنچا رہی تھی۔ 1960ء میں حجاز سے باہر کے حجاج بذریعہ بس بھی آئے تھے۔ دس برس بعد عراق، اردن اور یمن سے آنے والی سڑکیں پختہ بنا دی گئی تھیں اور ملک کے اندر پہلی چار رویہ شاہراہ جدہ اور مکہ کے درمیان بن گئی تھی۔ 1975ء میں پرائیویٹ کاروں اور ٹرکوں کی تعداد دوگنا ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ خواب سا لگتا تھا۔ حجاج کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا تھا کہ عرفات اور مزدلفہ کے درمیان کا چند میلوں پر مشتمل فاصلہ چار پانچ گھنٹوں میں بھی بمشکل طے ہوتا تھا۔ اس بڑھتی ہوئی تعداد کو سنبھالنے کے لیے

ایک اعلیٰ پیانے کا شاہراہوں کا نظام وضع کیا جا رہا تھا جس میں منیٰ کی وادی تک ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی بہت سی سڑکیں جا رہی ہوں گی۔ مکے کی پہاڑیوں میں ٹریفک کے لیے سرنگیں بنا دی گئی تھیں۔

کاروں اور ٹرکوں کی طرح 1930ء کی دہائی میں ہوائی جہازوں نے بھی آزمائشی پروازیں شروع کی تھیں لیکن دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے اصل ترقی 1950ء کی دہائی تک رک گئی تھی جب ایک سرکاری ہوائی کمپنی کے جہازوں نے پورے مشرق وسطیٰ تک پروازیں شروع کر دی تھیں۔ صرف دس برس کے اندر اندر اب یہ پروازیں دنیا بھر میں جا رہی تھیں۔ ہوائی سفر کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی تھی کہ 1974ء میں حجاج کی 50% تعداد جو 450,000 بنتی تھی، جدہ ایئرپورٹ سے گزرتی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر وہ چارٹرڈ پروازیں ہوتی تھیں جو حج ایجنٹوں کے ذریعے دنیا بھر سے حجاج کو لے کر آتی تھیں۔ حج کے موسم میں اس ہوائی اڈے پر بس پر دو ساتھ ساتھ رن وے تھے 24 گھنٹوں میں 400 جمبو جیٹ اترتے تھے۔ شہر کے شمال میں ایک مزید بڑا ٹرمینل علاحدہ حج کی سہولت کے ساتھ زیر تعمیر تھا۔ جب یہ کھلا تو یہ دنیا کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ تھا۔

جیٹ ہوائی جہاز کے دور کے حجاج کا سفر یقیناً وہ تو نہیں رہا جو بڑا مہماتی ہوا کرتا تھا لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اب مناسک حج زیادہ عملی طور پر کم پیسے خرچ کر کے ادا ہو سکتے ہیں۔ یہ ہوائی جہاز حاجیوں کو ان کے وطن سے چند گھنٹوں میں مکہ پہنچا دیتے ہیں۔ حرم کے قانون کی نظر میں سب برابر ہیں، یہاں تمام سماجی امتیازات، اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے۔ حج دنیا بھر کے مسلمانوں کا ایک ایسا سالانہ اجتماع ہے جس میں مسلمان مل کر ایک مذہبی فریضہ ادا کرتے ہیں۔ تاہم کوئی مکے تک پیدل چل کر جانا چاہے تو اسے اس بات کی آزادی حاصل ہے اور بہت محدود سی تعداد اب بھی پیدل چل کر حج کرتی ہے مگر سفر حج کا بنیادی ڈھانچہ قدیم دور کے مقابلے میں بالکل بدل گیا ہے۔

☆☆☆

حالیہ سہولیاتِ حج، 95-1975ء

یہ 1960ء کی دہائی کی بات ہے جب سعودی عرب نے تیل کی پیداوار سے بہت دولت کمائی لیکن 1973ء کے تیل کے عالمی بحران تک ملک میں وہ دولت ابھی نہیں آئی تھی جس سے صحرا کی ایک غریب قوم کو جدید قوم میں تبدیل کیا جا سکتا ہو۔ پھر جب عرب امریکن آئل کمپنی (آرامکو) بتدریج قومیالی گئی اور سعودی عرب اس کی تیل کی پیداوار سے سب سے زیادہ مستفید ہونے والا ملک بن گیا تو صورت حال میں تبدیلی آ گئی تھی۔ تاہم اس کے بعد بھی منافع کو سرکاری خزانے میں پہنچنے میں چند برس اور لگ گئے تھے۔ 1978ء میں تیل سے حاصل شدہ وصولیوں میں اضافہ ہوا۔ اب اس رقم میں سے حاجیوں کی سہولیات پر خرچ کرنے کی طرف توجہ دی گئی تھی۔

اس کام میں پہلے ہی بہت تاخیر ہو گئی تھی۔ 1970ء کی دہائی میں غیر ملکی حجاج کی تعداد 700,000 اور 900,000 کے درمیان گھٹتی بڑھتی رہی تھی۔ 1983ء میں پہلی بار ان کی تعداد ایک ملین سے بڑھ گئی تھی، ان میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 1.5 ملین سعودی حجاج آن شامل ہوئی تھی۔ اس طرح حج کے اس موسم میں تعداد 2.5 ملین ہو گئی تھی۔ مکہ مکرمہ کی اس وقت آبادی 40,000 تھی۔ اس سال رہائش، ٹرانسپورٹ، پانی، خوراک اور طبی مدد، حج خدمات کے بنیادی ڈھانچے پر جو ٹیکس وصول ہوا تھا وہ ماضی کے مقابلے میں تین گنا زیادہ تھا۔ اس سے اگلے سال منصوبہ بندی کے لیے کئی اجلاس ہوئے کہ اس صورت حال پر کیسے قابو پایا جائے۔

1989ء میں کئی بلین ڈالر کا توسیعی پروگرام تشکیل دیا گیا تھا۔ مسجد حرام میں بہت سی تبدیلیاں لائی جا رہی تھیں، اس کی عمارت میں تین منزلہ اضافہ مغرب کی سمت کیا گیا، باہر کے صحنوں میں توسیع ہوئی، تہ خانے میں نماز کے لیے کئی ہال بنائے گئے تھے، پہلی منزل پر نماز کے لیے مزید ہال تعمیر ہوئے، اس طرح عمارت کے کل رقبے میں ایک ملین مربع فٹ سے زائد کا اضافہ ہوا تھا۔ اب ایک ملین نمازیوں کے لیے یہ جگہ کافی تھی۔ دو میناروں کا بھی اضافہ کیا گیا تھا جن کی کل تعداد اب نو (۹) ہو گئی تھی۔ چھت پر ایسا سنگ مرمر لگا دیا گیا تھا جو گرم

نہیں ہوتا تھا۔ متحرک سیڑھیاں نصب کر دی گئی تھیں اور پوری عمارت اب ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ پچاس ہزار نئی لائٹس لگائی گئی تھیں جس کی وجہ سے اب اس عمارت میں شام سے صبح تک روشنی رہتی تھی۔ میں نے جب 1990ء میں حج کیا اس وقت یہ سارے منصوبے زیرِ تکمیل تھے۔ جب میں 1996ء میں واپس آیا اس وقت ان میں سے بہت سے مکمل ہو چکے تھے۔ یہ مسجد جو 1.25 ملین نمازیوں کو بیک وقت جگہ دیتی ہے دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔

اس بات کے تذکرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ 1930ء سے اب تک حج کی ظاہری صورت میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ میدانِ عرفات میں زیادہ وولٹیج کے بلب روشن ہیں، منیٰ کی وادی میں پانچ میل لمبی، دو میل چوڑی ایک خیموں کی دنیا حج کے ایام میں آباد ہو جاتی ہے اور رات کو خاص طور پر پہاڑیوں پر سے یہ منظر بڑا روح پرور دکھائی دیتا ہے۔ حج کی ادائیگی کو مکمل طور پر ملک کے اندر ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے اور گھنٹوں بعد بھی اس کے مختلف حصے پوری اسلامی دنیا میں دکھائے جاتے ہیں۔

مامُونیت، تحفظ اور جدید دور کا حج

یہ تصور کرنا بہت مشکل ہے کہ آج حج کے موقعہ پر جاسوس اور بہروپیے کیا کر رہے ہوں گے یا وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے لیے کون کون سے حربے استعمال کریں گے۔ 1950ء کی دہائی کے ابتدائی دنوں میں سرزمین مقدس پر مامونیت اور تحفظ کے لیے بڑے سخت اور جدید انتظامات کیے جاتے تھے۔ اس بارے میں ادریس شاہ لکھتا ہے:

> ''شناخت، دستاویزات اور قیدِ طبّی سے متعلق معاملات پر اس قدر توجہ دی جاتی تھی کہ مجھے پورا پورا یقین تھا کہ میں اس چوکی سے یا اگلی چوکیوں سے کوئی عذر یا بہانہ کر کے نہیں گزر سکوں گا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ترکی دورِ حکومت کے مقابلے میں آج مشکلات کہیں زیادہ ہیں۔ سعودی عرب کے پاس روک لینے اور کنٹرول کرنے کے تمام جدید طریقے موجود ہیں اور سعودی حکومت انہیں استعمال کر رہی ہے......''

حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ میں مامونیت اور تحفظ کا معاملہ ہمیشہ فکر مندی کا باعث بنا رہا ہے تاہم مختلف زمانے میں اس لفظ کے معانی مختلف ہوتے ہیں۔ ہمارے آج کے دور میں جب سیاسی تشدد میں اضافہ ہوا ہے

اور بین الاقوامی سطح پر دہشت گردی میں اضافہ ہوا ہے، سعودیوں کو بہروپیوں اور غیر ملکی مظاہرین کی نسبت کبھی کبھی اندرونی خلفشار سے زیادہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔ ایک ہی خاندان کی حکومت کے باوجود یہاں پُرامن صورت حال ہمیشہ قائم نہیں رہی۔ مکہ مکرمہ میں ایک بار بالکل نچلی عوامی سطح کے لوگوں کی طرف سے انقلاب لانے کی کوشش بھی کی جا چکی ہے۔ 20۔ نومبر 1979ء میں عتیبہ قبیلے کے ایک شخص جہیمن نے حرم پاک کے میناروں سے فائر کھول دیا تھا جس کا تعلق 500 اخوان کے گروپ سے تھا۔ دو ہفتے تک مسجد کا محاصرہ کرلیا گیا تھا۔ اس شخص کا مقصد ان سعودی حکمرانوں کو پریشان کرنا تھا جو مقاماتِ مقدسہ کے محافظین کا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ انقلاب کی جانب پہلا قدم تھا۔ یہ بغاوت تو ناکام ہوگئی تھی لیکن اسلامی دنیا کو ان خون کی ندیوں پر بے حد صدمہ ہوا جو حرم پاک کے اندر بہائی گئی تھیں۔ ایران اور دوسرے ممالک کے نکتہ چینیوں نے اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔ اس کے بعد سعودی حکومت نے حج کے دنوں میں سیکورٹی کے انتظامات بہت سخت کردیے ہیں، پھر تشدد کا ڈر رہتا ہے جس کی ایک مثال 1990ء میں اس وقت دیکھنے میں آئی تھی جب وادیٔ منیٰ میں ایک بم کے پھٹنے سے 1400 حجاج جان بحق ہوگئے تھے۔

حج کے موسم میں جب حجاج کی ایک بڑی تعداد دنیا بھر سے آئی ہوئی ہوتی ہے۔ لوگوں کی جانوں کی حفاظت کے لیے سعودی حکومت نے چند ٹھوس انتظامات کیے ہیں۔ حجاج کی تعداد دو ملین تک پہنچ گئی ہے اور اب ہر سال اس تعداد میں اضافے کو روکا جاتا ہے۔ سعودی سفارت خانے ایک محدود کوٹے کی بنیاد پر ویزے جاری کرتے ہیں۔ حج کے بعد مکہ میں رُک جانے والوں پر بھی اب سختی سے نظر رکھی گئی ہے اور اس کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس طرح اب غیر ملکی حجاج کی تعداد کو محدود کردیا گیا ہے۔ یوں حج کے دوران سیاسی ہلڑ بازی کے امکانات کم ہوگئے ہیں۔ مکہ میں 1987ء اور 1989ء کے خون خرابے کے بعد کچھ عرصے کے لیے ایرانی حجاج پر پابندی لگادی گئی تھی پھر 1991ء کی خلیج فارس جنگ کے بعد عراقیوں کو سرحد پر روک کر واپس کردیا جاتا تھا اور یہ سلسلہ کچھ عرصے تک جاری رہا تھا۔

آج حج پر جانے سے قبل بہت سے مراحل سے گزر کر ویزے کا حصول ممکن بنتا ہے۔ ویزا حاصل کرنے سے قبل ایک حاجی کو وادیٔ منیٰ تک ٹرانسپورٹ کا کرایہ، چند یوم کے لیے ٹھہرنے پر خیمے کا کرایہ اور مدینہ طیبہ تک کا دوطرفہ کرایہ چیک کی شکل میں درخواست کے ساتھ جمع کرانا پڑتا ہے۔ مکہ میں مختلف کرائے کے مکان رہائش کے لیے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ بہت سے حجاج باہر گلیوں میں ڈیرہ لگا لیتے ہیں۔ گائیڈ یا معلم کو

پہلے سے پیشگی رقم ادا کرنی پڑتی ہے جو حجاج کی مناسک حج کی ادائیگی میں رہنمائی کرتے ہیں۔ ہر خیمے میں روشنی اور پنکھا، طبی امداد اور پانی (صحرائی علاقوں میں یہ کوئی کم اہم نہیں ہوتا) مفت مہیا ہوتے ہیں۔ان دنوں کھانے کی قیمتیں حج کے دوران مقرر کر دی جاتی ہیں، حجاج کو ٹیکے لگوانے ہوتے ہیں اور حج پاسپورٹ ضروری ہوتا ہے۔اس کے علاوہ حج کے لیے درخواست دینے والوں کو دوطرفہ ٹکٹ آنے جانے کا پیشگی خریدنا ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو سرحد پر ضمانت کے طور پر ایک مقررہ رقم بھی جمع کرانی پڑتی ہے۔

جمبو جیٹ طیاروں کے دور میں جب حجاج کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے، آج کا حج اپنی ماہیت کے اعتبار سے ماضی کے حج سے ایک مختلف تجربہ ہے۔خصوصاً مکہ میں کاروں اور دوسری گاڑیوں میں اضافے نے ایک بدامنی پیدا کر دی ہے۔ آج کے حجاج کو ایک نیا چیلنج درپیش ہے کہ وہ ہزاروں بسوں، ٹرکوں اور ٹیکسیوں کے شوروغل میں روحانی رسومات حج کیسے ادا کریں۔ٹریفک کا شور حرم کے پرسکون ماحول کو متاثر کرتا ہے۔زیر زمین ریل چلانے کا موضوع برسوں زیر بحث رہا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔1980ء کی دہائی میں شروع کر کے پیدل چلنے والوں کے لیے مکہ اور منٰی کے درمیان سرنگیں بنا دی گئی تھیں اور منٰی سے میدان عرفات تک میلوں طویل سایہ دار راستہ بنا دیا گیا ہے مگر کار، بس اور ٹرک کی اب بھی بالادستی ہے۔

کتاب کے اس حصے کے لیے جن کتب سے اقتباسات لیے گئے ہیں وہ مغربی نومسلموں نے لکھی تھیں۔البتہ نصف کتب وہ ہیں جو مشرق وسطٰی کے مسلمانوں نے لکھی ہیں۔انہوں نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد مکہ میں نمودار ہونے والی بیشمار تبدیلیوں کی پیمائش کی ہے۔ان کے مصنفین کو کاروں اور ہوائی جہازوں کے بارے میں اتنا ہی علم ہے جتنا کسی زمانے میں ابنِ جُبیر کو بحری جہازوں اور اونٹوں کے بارے میں تھا۔یہ لوگ چونکہ موٹر کاروں کے عہد میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے یہ فاصلے کو دنوں، ہفتوں میں نہیں گھنٹوں میں ماپتے ہیں۔ان کی تحریروں میں جدہ ایئرپورٹ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

کافی حد تک سفر حج کی یہ روداد یں اندر کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔زیادہ تر درمیانی قسم کے مواد پر مشتمل ہیں۔اس میں باہر کے لوگوں کو اور مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور وہی دوغلی روایت استعمال کی گئی ہے جو علی بے العباسی نے 1807ء میں سب سے پہلے استعمال کی تھی۔درج ذیل اقتباسات کا عام سا لہجہ کتاب کے چوتھے حصے میں شامل اقتباسات کے لہجے کی نسبت زیادہ مقبول ہے۔جلال آلِ احمد کی ڈائری کے مندرجات جیسی تحریریں (1964ء) اس نثر کے بالکل برعکس ہیں جس کی نوک پلک درست کر لی گئی ہو جبکہ

میلکم ایکس کی خودنوشت کا لہجہ ایک رازدارانہ سرگوشی جیسا ہے۔ حمزہ بوگرے کی داستان، (جو 1983ء میں شائع ہوئی) بہت مانوس لگتی ہے۔ سعیدہ ملر خلیفہ کی سرگزشت (1970ء) ایک زاہدہ عابدہ خاتون کی تحریر ہے مگر بے ساختہ اور سرسری لکھی گئی ہے۔

ان سیاحوں کی معاشیات شاہی عروج کی معاشیات سے مختلف ہے۔ ان میں سفر کے دوران اس طرح کی خوش قسمتی کی باتیں ظہور پذیر نہیں ہوتیں جیسی برکات اور برٹن کو سفر کے دوران پیش آئی تھیں۔ مفلس، نادار ادریس شاہ کو سعودی شہزادے کی طرف سے مکے آنے کی دعوت ملی تھی، جسے اس نے اپنی تحریر میں اجاگر کیا ہے۔ جلال آلِ احمد نے اپنا سفر بڑی خاکساری کے ساتھ طے کیا جبکہ میلکم ایکس نے اپنے ہوائی ٹکٹ کے لیے پیسے اپنی بہن سے ادھار لیے تھے۔ یہاں تک کہ حمزہ بوگرے جو مکہ مکرمہ رہتا تھا، اس نے بھی ایک نوخیز گائیڈ کی حیثیت سے کچھ رقم کمائی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے سفرِ حج کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ایک مچھلیاں پکڑنے والی کشتی میں شامل اپنا حصہ فروخت کیا تھا اور پھر پبلشر سے پیشگی رقم لے کر کتاب شائع کی تھی۔

☆☆☆

19۔ حمزہ بوگرے...... مکہ مکرّمہ

1947ء

حمزہ بوگرے نے اپنی کتاب ''شیلٹرڈ کوارٹر'' 1983ء میں شائع کی تھی۔ یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں اس کی مکہ میں پرورش کا ذکر ہے۔ اس میں 1930ء اور 1940ء کی دہائیوں کے درمیان نوخیز حمزہ کو پیش آنے والی آزمائشوں اور خوشیوں کا تذکرہ ہے۔ بوگرے کی جوانی اور اس داستانوی سوانح کی اشاعت کے درمیانی چالیس برسوں میں جس قدر مکہ تبدیل ہوا تھا اتنا روئے زمین پر آباد چند شہر ہوئے ہوں گے۔ مصنف جب پیچھے مڑ کر جدید شہر کے زمانہ قدیم پر نظر دوڑاتا ہے تو اسے گلی کے وہ چراغ دکھائی نہیں دیتے جن کے نیچے بیٹھ کر وہ پڑھا کرتا تھا۔ وہ اس کہانی پر بھی نگاہ ڈالتا ہے جو پچھلی چار صدیوں کے دوران کسی بھی وقت وقوع پذیر ہوئی ہوگی۔ وہ جب اپنے زمانہء طالب علمی، اپنے سکول اور خاندانی زندگی کا ذکر کرتا ہے تو ہمیں اٹھارھویں صدی کے مکہ مکرمہ کے طالب علم کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مکہ کے ان ایام کی تفصیل دی گئی ہے جب تیل کی پیداوار نے سعودی عرب اور حجاز کو ابھی ایک نئی شکل نہیں دی تھی۔

یہاں جو اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں ان میں دو سفروں کی تفصیل دی گئی ہے۔ پہلے سفر میں ایک دس بارہ سال کا لڑکا اپنی ماں اور خالہ کے ساتھ مدینہ منورہ تک کا سفر کرتا ہے۔ جب اس سفر کا آغاز ہوتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کس قدر سادگی کے ساتھ ایک قافلہ تشکیل پاتا ہے۔ بوگرے خاندان کا مدینہ تک کا یہ سفر بارہ دن میں مکمل ہوا۔ اس زمانے میں حجاج کو ڈاکوؤں کے ہاتھوں لوٹے جانے کے واقعات میں کمی آ گئی تھی۔ ''آنٹی''۔ ''رات کا خوف'' ایسے عنوانات ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ان روایات کا سراغ بھی ملتا ہے جنھیں وہابیت نے ختم کر دیا تھا۔ اس تصادم کا زیادہ ذکر بوگرے کی خالہ کے بارے میں دی گئی تفصیل میں موجود ہے جہاں ایک قسمت کا حال بتانے والا جوتشی اسے سفر کے بغیر تکمیل تک پہنچنے کی نوید سناتا ہے۔ پھر شہید سپاہیوں کے صحرا میں نقارے بجانے کی آوازیں آتی ہیں۔ اس قسم کی مثالوں سے بوگرے ہماری توجہ روحانیت، موسیقی

اور مذہب کے درمیان پائے جانے والے غیر منطقی تصادم کی طرف مبذول کراتا ہے جس نے ایک ہزار برس تک سامی مصلحین کے لئے مشکلات پیدا کر دی تھیں۔

ہمارا دوسرا اقتباس حج کے دوران منیٰ تک کے ایک دن کے سفر سے متعلق ہے۔ جیسا کہ آرتھر ویول نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ مکے کے رہنے والوں کو ہر سال حج کرنے سے کسی طور بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انھیں بھی باہر سے آنے والے حجاج کے ساتھ حج ادا کرنا ہوگا تاکہ دو روز کے لئے عملاً پورا شہر خالی ہو جائے۔ فلبی نے بھی مکہ کے مستقل رہائشی افراد کے لئے حج کی ادائیگی کے سلسلے میں لکھا ہے لیکن بوگرے اس سمت میں ہمیں مزید آگے لے جاتا ہے۔ وہ ایک رپورٹر میں ایک نمول شے کی حیثیت رکھتا ہے، وہ جس کلچر یا ثقافت کا ذکر کرتا ہے وہ پیدائشی طور پر اس کا ایک فعال حصہ دار ہے۔ بعض معاملات میں وہ حج کے ایسے پہلوؤں کو محفوظ کر لیتا ہے جن کو کوئی دوسرا ریکارڈ نہیں کر سکا۔ اُسے خواتین کا مشعل بردار قیس میلہ یاد آتا ہے جو اس وقت منعقد ہوتا تھا جب شہر سے زیادہ تر مرد حجاج چلے جاتے تھے۔ یہ دنیا کے اُن معاشروں میں منعقد ہوتے تھے جہاں مردوں اور عورتوں کے مخلوط اجتماعات نہیں ہوتے تھے۔ ہمارے لئے زیادہ دلچسپی کا باعث بوگرے کا حج سروس انڈسٹری میں حج کے دنوں میں ملازمت اختیار کر لینے کا بیان ہے۔ مکہ کے سکالر جیب خرچ کے لئے ایسا کیا کرتے تھے اور یہ روایت آج بھی قائم ہے۔

حمزہ بوگرے 1932ء میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے نوجوانی میں اپنی جامعاتی تعلیم قاہرہ سے مکمل کی تھی۔ پھر اس نے نوزائیدہ سعودی ریڈیو اور ٹی وی میں کام کرنا شروع کر دیا تھا اور 1962ء میں ڈائریکٹر جنرل، براڈ کاسٹنگ کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ وہ نائب وزیر اطلاعات اور بعد ازاں جدہ میں کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے میں معاون رہا۔ بوگرے کی کہانیاں اور مضامین رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ اس کی عمر 52 سال تھی جب شیلٹرڈ کوارٹر چھپا، یہ جنگ عظیم دوئم کے مایوسی کے ایام میں مکہ میں اس کے ذاتی تجربات سے متعلق تھا۔ اس کی کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل تو ابھی نہیں ہوئی تاکہ سعودی ٹیلیویژن پر پیش کی جا سکے لیکن اس کی کہانیوں میں مقامی حالات پر گہری نظر ملتی ہے۔ طبقاتی تقسیم اور عمر کی بنیاد پر تشکیل پانے والے معاشرے کے مختلف گروہ اس کی چند ایک کہانیوں کا موضوع بنے تھے۔ بوگرے کے انتقال سے صرف ایک سال قبل چھپنے والی کتاب اس وقت شائع ہوئی تھی جب وہ اس طرز زندگی کی گواہ تھی جواب ناپید ہو چکی تھی۔

مدینے تک اونٹ کے ذریعے سفر کرنے کے پانچ برس بعد حکومت نے سعودی ایئر لائن میں توسیع شروع کردی تھی۔ 1952ء میں اس فضائی کمپنی نے برطانیہ سے کچھ ہوائی جہاز خریدے تھے۔ 1950ء کی دہائی میں جو پروازیں مکہ سے مدینہ جارہی تھیں، یہ نئے خریدے گئے ہوائی جہاز بھی ان میں شامل کردیے گئے تھے۔ بوگرے کو جس سفر میں 12 دن لگتے تھے اب وہ دو گھنٹوں میں طے ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد جلد ہی سعودی ہوائی کمپنی کی پروازیں بیرونِ ملک جانے لگی تھیں اور 1960ء کی دہائی کے آغاز میں اس فضائی کمپنی کی پروازیں شمالی افریقا، مشرق وسطیٰ اور ہندوستان بھر میں جانے لگی تھیں۔ 1970ء میں ہوائی سفر نے حرم تک دنیا کی زیادہ مسلم آبادی کا راستہ کھول دیا تھا اور کئی ملین لوگوں کے لئے حج ان کی دسترس میں آ گیا تھا۔ اس سال 40 فیصد حجاج ہوائی سفر کر کے مکے پہنچے تھے جن کی تعداد 1,50,000 تھی۔

اس پانچویں حصے میں مزید جو اقتباسات آئیں گے وہ زیادہ ہوائی سفر کے نفوذ اور اثر پذیری سے متعلق ہوں گے لیکن بوگرے کی کتاب پس بینی سے بالکل پاک ہے۔ اس کا طرز تحریر ہکلبری فن سے ملتا جلتا ہے۔ جس عہد کو ہم جدید کہتے ہیں اس سے یہ عہد بالکل مختلف ہے۔ آج یہ کئی صدیاں پہلے ٹوین مسس پی لگتا ہے۔

شیلٹرڈ کوارٹر سے لیا گیا: ''مکہ میں گزرے لڑکپن کی کہانی'' از حمزہ بوگرے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ تک کا سفر: میرے چچا (سوتیلے والد) کے انتقال کے بعد جب عدت کی مدت گزر گئی جس میں وہ نہ گھر سے باہر نکل سکتی تھی، نہ سفر کر سکتی تھی، تو میری والدہ نے مجھے روضہ رسول ﷺ پر مدینہ منورہ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ حسب معمول میری امی نے خالہ عاصمہ کے ساتھ مشورہ کیا۔ وہ بھی اس سفر میں ہمارے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوگئی تھیں۔ ٹرانسپورٹ میں واحد سواری اونٹ تھی جو ہم کو مدینے لے جاسکتی ہے چنانچہ میری خالہ نے ایک جانے والے خاندان سے بات کی جن کو مدینے جانا تھا تاکہ وہ ہمارے اونٹ کو بھی اپنے قافلے میں شامل کرلے۔ ایک ایسا خاندان جو پانچ اونٹوں پر سفر کر رہا تھا ہمیں ساتھ لے جانے پر رضامند تو ہوگیا تھا لیکن اس وقت خالہ عاصمہ نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ ایک اور خاندان تلاش کیا گیا جس کی روانگی کا وقت وہی تھا جس وقت ہم مکے سے اپنے سفر کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ میری امی اور خالہ اپنے زمانے کی روایات کی پوری پوری پابندی کیا کرتی تھیں۔ خالہ اپنے ساتھ ایک مرد کو گھر پر اس دن لائی تھیں جس دن ہمیں قافلے کے ہمراہ سفر پر روانہ ہونا تھا۔ پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ صاحب کس مقصد کے لئے لائے گئے ہیں۔ خاص طور پر اس

وقت جب وہ ہمارے گھر کے بالکل ایک کونے والے کمرے میں چلے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد جب انھیں چائے پیش کی گئی تو وہ گنگنانے لگے تھے اور خالہ عاصمہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ میں نے غور سے آواز سنی تو مجھے یہ آواز اچھی لگی اور میں یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ شخص کیا گنگنا رہا تھا۔ یہ یا تو ہمارے متوقع سفرِ مدینہ سے متعلق تھی یا نبی کریم ﷺ پر درود و سلام بھیجا جا رہا تھا۔ بالآخر میں نے جرات سے کام لیتے ہوئے خالہ سے پوچھ ہی لیا تھا کہ یہ شخص کون تھا اور اس کمرے (جس میں وہ شخص بیٹھا تھا) اور اس کھڑکی کے درمیان کیا رشتہ تھا جن دو کے درمیان یہ بار بار آ جا رہی تھیں۔ وہ گنگنانے والا شخص مُزاہد تھا جو لوگوں میں دنیا کی چیزوں سے بے نیازی اور مدینے حاضری کی آرزو پیدا کرتا ہے۔ خالہ کھڑکی کے پاس سے کمرے تک اس لئے بار بار جاتی تھیں تا کہ یہ تسلی کر سکیں کہ اس شخص کی آواز کوئی سن رہا تھا۔

میں نے زندگی میں کچھ عرصے بعد اپنے اللہ سے معافی مانگی تھی کہ میں کس قدر دقیانوسی باتوں میں یقین رکھتا تھا جو میری ماں اور خالہ نے مجھے سکھائی تھیں مگر میں نہ بھلا سکا ہوں نہ بھلانا چاہوں گا، وہ سریلی آواز جس میں وہ مزاہد گنگنا رہا تھا۔ میں اونٹ پر رکھے ہوئے شگدف میں امی اور خالہ کے درمیان بیٹھ گیا تھا اور ہمارا شتربان عطیہ ہمارے اونٹ کو لے کر جا رہا تھا۔ کچھ دور تک تو ہم شیطان سے بچنے کے لئے دعائیں کرتے رہے۔ ہم نے اس سے پہلے اونٹ کی سواری کبھی نہ کی تھی اس لئے ہمیں خوف یہ تھا کہ کہیں گر نہ جائیں۔ پھر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم عادی ہو گئے تھے اور اب ہمارا خوف جاتا رہا تھا۔ ہمارا اونٹ بھی ہمیں پریشان نہیں کر رہا تھا اور ہمیں اس سے کوئی بھی فوری خطرہ نہ تھا۔ ہمیں مکے سے باہر نکل کر جب قافلے کے باقی لوگ نظر آئے تو ہمارا اعتماد اور بحال ہو گیا تھا۔ مجھے یہ خیال بالکل نہیں تھا کہ مزاہد وہاں ہمارا انتظار کر رہا ہو گا۔ وہ اپنی سریلی آواز میں گنگناتے ہوئے ہمیں الوداع کہنا چاہتا تھا۔ وہ تمام حجاج کو دعائیں دے رہا تھا کہ اللہ ان کا حج قبول فرما لے۔

میں حالانکہ ان میدانوں اور پہاڑیوں میں سے اکثر سفر کرتا رہا ہوں پھر بھی مکے اور مدینے کے درمیان سفر میں لگنے والے 12 دنوں میں، میں نے اس قدر خوبصورت شفق کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں اور سہیل دو ہی وہ لڑکے تھے جو اس قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ رات کی آمد سے قبل ہم دونوں شگدف میں سوار ہو گئے تھے۔ اونٹ خشک گھاس کے درمیان سے بھاگتے جا رہے تھے۔ اڑتی ہوئی ٹڈیوں کو دیکھ کر ہمیں خیال آیا کہ ایسا تجربہ تو ہمیں زندگی میں جوانی کے ایام میں اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا۔ مچھروں کے کاٹنے سے ہمیں کافی

پریشانی ہو رہی تھی۔اونٹوں کی پیٹھ پر سونے سے ہمارے جسموں پر زخم آ گئے تھے لیکن ہم جہاں جا رہے تھے بس رحمت اللعالمین کے روضہ مبارک پر حاضری دینے کا ارادہ تھا وہ ہستی تو بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ عظیم تھی۔

سفر کے دوران مجھے خالہ عاصمہ نے ''رات کا خوف'' کے بارے میں بتایا۔یہی خوف مسافروں کو رات کے وقت راستے میں رک جانے پر مجبور کر دیتا تھا اور شتربانوں کو یہ مشورہ دیا کرتا تھا کہ یہ خوف اور زران شتربانوں کو راستہ بھلا دیتا تھا اور یہ بیچارے موت کا لقمہ بن جایا کرتے تھے۔اس کی خواہش تھی کہ وہ صحرا میں کیفے کھولے جن کی روشنیاں شتربانوں کو اس طرح اپنی طرف بلائیں جس طرح راستہ بھول جانے والے بدو پانی مل جانے کی خوش فہمی میں شتربانوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔یہ قافلے دوبارہ کبھی نظر آئیں گے نہ ہی ان لوگوں میں سے اونٹوں اور اس سامان میں سے جو یہ اونٹ اٹھائے ہوئے تھے دوبارہ کچھ مل سکے گا۔

خالہ عاصمہ ان لوگوں کی کہانیاں سنایا کرتی تھی جو رات کے خوف کی وجہ سے موت کا شکار ہو جاتے تھے۔حفظ ماتقدم کے طور پر وہ اس وقت جاگ رہی تھیں جس وقت قافلہ حرکت میں تھا۔وہ شتربانوں کو انتباہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ راستہ بھول جائیں گے اور ہم سب گم ہو جائیں گے۔''رات کا خوف ہے''،''رات کا خوف ہے'' کے بارے میں آواز سن کر میں نیند سے بیدار ہو گیا تھا۔شتربانوں نے اپنے اپنے اونٹ ایک جگہ روک دیئے تھے،اونٹ کو بٹھا دیا گیا تھا۔ہم نے کانپتی ہوئی خالہ کو بٹھا لیا تھا اور ٹھنڈے پانی کا جگ اس کے سر پر انڈیل دیا تھا وہ ان کی آواز سننا چاہتی تھی۔اس نے پانی کا ایک جگ اس کے سر پر دے مارا تھا۔وہ ایک ایسی حالت تھی کہ وہ ان کی آواز سننا چاہتی تھی۔وہ یہ یکھنا چاہتا تھا کہ تخیلاتی ''رات کا خوف'' تو کیفے کے مالک کی شکل وصورت تھی جہاں ہم گذشتہ رات ٹھہرے تھے۔وہ ایک اونٹ پر سوار ہو کر ہمارا تعاقب کرتے ہوئے آ پہنچا تھا تا کہ ہمیں وہ کمبل پہنچا سکے جو ہم کیفے میں کرسی پر بھول آئے تھے۔ہمیں فکر تھی کہ کمبل کہاں گیا اور اگر یہ بیچارا کمبل لے کر ہمارے پیچھے نہ آتا تو ہم اس پر شک کرتے کہ کمبل اس نے چرا لیا تھا۔مگر وہ تو اس کے مالک کو یہ کمبل پہنچانے آیا تھا۔یوں خالہ عاصمہ کے ذہن سے رات کا خوف رخصت ہوا۔مگر اس سے مجھے اپنی نئی کہانی کے لئے موضوع مل گیا تھا۔

ہم آٹھ راتوں سے سفر میں تھے اور آٹھ مختلف مقامات کے بعد ہمارا قافلہ بدر کے مقام پر پہنچا تھا۔

اس شام کسی کو بھی کوئی خدشہ درپیش نہ تھا اور ہم غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے پہنچے تھے۔ اونٹوں کو سڑک کے کنارے ایک کھپریل کے قریب بٹھا دیا گیا تھا، ریت پر چٹائیاں بچھا دی گئی تھیں۔ معمول کے مطابق کھانے کی تیاری شروع ہو گئی تھی۔ روٹی، گوشت کھانے کے بعد پانی پیا اور کھانے سے فارغ ہو کر خالہ عاصمہ نے کپڑوں کا بنڈل کھولا، کچھ ضرورت کی چیزیں نکالیں اور پھر جھونپڑے سے کچھ دور ہٹ کر بیٹھ گئی تھیں۔ خالہ نے کنگھی کی پھر بالوں میں تیل لگایا۔ پھر ایک سفید رومال سر پر کس کر باندھ دیا تھا۔ اس سفید کپڑے کے ٹکڑے کو شانبر کہتے تھے۔ اس کے اوپر انھوں نے ایک سفید شال اوڑھ لی تھی جس پر کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ پھر انھوں نے سیاہ پنسل سے بھنویں بنائیں، آنکھ کے پپوٹوں پر بھی کچھ لگایا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے شادی کے لیے کوئی خاتون تیار ہو رہی ہو۔

جب سب لوگ رات کو سونے کی تیاریوں میں مصروف تھے خالہ عاصمہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر صحرا کی طرف لے گئیں۔ جب ہم کافی دور پہنچ گئے تو وہ ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھ گئی تھیں اور مجھے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رات بھیگ چکی تھی اور اب خالہ عاصمہ نے کچھ اشاروں ہی اشاروں میں ایسی حرکات شروع کر دی تھیں جن سے مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ خاموشی سے رقص کر رہی ہیں۔ پھر وہ وجد میں آ گئی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دور سے ڈھول باجوں کے بجنے کی آوازیں آ رہی ہیں، انہوں نے ان آوازوں پر رقص جاری رکھا۔ میں ذرا سہار ریت کے ٹیلے پر بیٹھا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں خالہ عصمہ ہوش و حواس تو نہیں کھو بیٹھی ہیں۔ جب وہ تھک گئیں تو واپس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ دوبارہ میرا ہاتھ پکڑ کر قافلے میں آ گئی تھیں۔ ہمارے دیر سے واپس پہنچنے پر مجھے یہ جاننے کا تجسس تھا کہ یہ کس قسم کا رقص تھا اور خالہ کو کیا ہو گیا تھا۔ مگر امّی نے مجھے اشارہ کیا کہ میں خالہ عاصمہ کے سو جانے تک انتظار کروں اور خاموش رہوں۔ جب وہ سو گئیں تو امی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے ڈھول باجوں کی آواز آئی تھی تو میں نے جواب دیا کہ ہاں میں نے یہ آواز سنی تو تھی لیکن یہ معلوم نہ کر سکا تھا کہ یہ آواز سے کہاں سے آ رہی تھی۔ اس پر میری امی نے مجھے بتایا کہ یہ غزوہ بدر کے جنگجو سپاہیوں کے ڈھول باجوں کی آواز تھی، یہ وہ شہدا تھے جنھوں نے غزوہ بدر میں جام شہادت نوش کیے تھے۔ سال کے ایک خاص حصے میں جب چودھویں کا چاند ہو اس وقت یہ آوازیں صحرا میں سنائی دیتی ہیں۔ میری امی کا خیال تھا کہ خالہ عاصمہ کو اس بارے میں پورا علم تھا کہ انہوں نے پہلے قافلے کے ساتھ سفر کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ اس قافلے کے ساتھ آنے کا مطلب یہ ہوتا کہ ہماری آمد اور ان آوازوں کے وقت کے درمیان ہم

آہنگی پیدا نہ ہوسکتی تھی۔ پھر میری ماں نے مجھے اس راز پر سے پردہ اٹھانے سے منع فرما دیا تھا کیونکہ عام لوگ اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔

آج مجھے یہ اچھی طرح یاد نہیں آ رہا کہ میں نے جو کچھ سنا تھا اس پر میرا ردعمل مثبت تھا یا منفی۔ تاہم جب میری عمر میں اضافہ ہوا تو میں نے اس بارے میں غور ضرور کیا تھا پھر میں نے ایک اُموی مشہور شاعر کی ایک غنائی نظم پڑھی تھی جس میں صحرا میں جنوں کو آلات موسیقی بجاتے ہوئے بتایا گیا تھا۔

رقص کے بعد خالہ عاصمہ بالکل خاموش ہوگئی تھی۔ اب وہ کسی طرح کی فکرمندی کا اظہار نہیں کر رہی تھیں اور چہرے پر ایک سکون اور اطمینان لیے ہوئے تھیں۔ میں نے اس قسم کے تاثرات سال نو کے موقعہ پر، شادیوں میں اُن خواتین کے چہروں پر دیکھے ہیں جب یہ ڈھول باجوں اور بنسری کی آواز پر رقص میں آ جاتی ہیں۔ اگر میں نے ان جوانوں کی حوصلہ شکنی کرنی ہوتی تو میں ان کو بتاتا کہ میں نے قدیم افریقی قبیلوں کو، جن سے میں دوران سفر ملا تھا، اسی قسم کی نفسیاتی کیفیت سے اس وقت دوچار ہوتے دیکھا تھا جب یہ ڈھول باجوں کی تال پر رقص کرتے کرتے تھک جاتے تھے اور ان کے گیت بھی بدر کے گیتوں سے مختلف نہیں ہوتے تھے۔ انسان غالباً غنائیت اور موسیقی کو اسی طرح پسند کرتا ہے جس طرح وہ سوچنے اور غور و فکر کرنے کو پسند کرتا ہے۔

خالہ عاصمہ کا معاملہ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اس بارے میں دوسروں کو حیران کر دینے والی کہانیاں نہ بناتی ہوں۔ ایک بار خالہ نے مجھے ''الفریش'' کے لوگوں کی کہانی سنائی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ الفریش ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو المساجد اور آبیار علی کے درمیان واقع ہے۔ آج بھی جو شخص زیادہ رقم وصول کرتا ہے اہل مکہ اس سے پوچھتے ہیں کہ اس کا تعلق الفریش سے تو نہیں۔ یہ لوگ مدینہ منورہ جانے والی شاہراہ پر لوگوں کو لوٹ لیتے تھے۔ اگر حجاج المستورہ یا الصفرا کے مقام پر ان ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹنے سے بچ جاتے تو انہیں ابھی الفریش کے ڈاکوؤں سے واسطہ پڑنا باقی تھا۔ بیشک میں نے کبھی بھی خالہ عاصمہ پر یہ شک نہیں کیا تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہیں مگر جب خالہ نے مجھے یہ بتایا کہ انہوں نے برسوں پہلے ایک بدو کا سر کچل دیا تھا جب انہوں نے الفریش پر پڑاؤ ڈالا تھا تو مجھے حیرت ضرور ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں جو شے آئی اس سے انہوں نے اس کا سر کچلا تھا اور جب پوچھا کہ وہ کیا شے تھی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک فریم شدہ تصویر تھی۔ مجھے، سچ تو یہ ہے کہ ان کی اتنی طاقت اور قوت کا کبھی بھی اندازہ نہیں رہا تھا۔

مدینے میں داخل ہونے سے قبل، جو روشنی اور نور کا شہر تھا، خالہ نے فیصلہ یہ کیا تھا کہ عنبریہ گیٹ پر پولیس کی پڑتال کے بعد شتربان ہمارے اونٹ کو قافلے سے الگ کرلے گا پھر وہ باقی لوگوں کے مقابلے میں دوسرے رخ پر چلا جائے گا۔ مسجد نبوی کے جنوب میں پہنچنے کے بعد ہمیں ان کے اس فیصلے کی اہمیت کا اندازہ ہوا تھا اور ہم ان کی ذہانت کے قائل ہو گئے تھے۔ شتربان کو رکنے کا حکم دینے کے بعد خالہ نے شال کے ایک کونے میں بندھا ہوا ایک خط نکالا۔ پھر اونٹ سے نیچے اتر کر وہ ایک بہت بڑے محل کے اندر چلی گئی تھیں۔ وہ جلد واپس ہمارے پاس آ گئی تھیں۔ مدینے میں اپنے قیام کے دوران ہمیں اس محل میں ٹھہرنا تھا۔

جب کوئی بات میری سمجھ میں نہ آئے تو میں انگلی سے اشارہ کیا کرتا ہوں، چنانچہ میں نے اپنی امی سے پوچھا کہ یہ سب کیا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ خالہ عاصمہ ایک بہت بڑی جائیداد کے مالک سے مل چکی تھیں جس کے بڑے بڑے مکانات مدینے میں برائے کرایہ خالی تھے۔ انہوں نے اس سے یہ طے کر لیا تھا کہ ہم مدینے میں اس کے مکان میں کرائے پر رہائش رکھیں گے۔ وہ شخص جلدی اس لیے مان گیا تھا کیونکہ صرف حج کے موسم میں اس کے مکانات کرائے پر لگتے تھے ورنہ سال بھر خالی رہتے تھے۔ اس نے خالہ کو ایک خط دے دیا تھا کہ یہ خط گارڈ کو دے دیا جائے۔ ہمیں اس محل نما گھر کا اوپر والا حصہ مل گیا تھا۔ میرے لیے یہ سب باتیں انکشافات کا درجہ رکھتی تھیں۔

مدینے میں قیام کے دوران آخری روز ہم نے دوسرے حجاج کے ہمراہ روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر الوداعی حاضری دی تھی۔ مجھے اس موقعہ پر یوں لگا تھا جیسے خالہ عاصمہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ وہ روضہ مبارک کے بالکل سامنے گر گئی تھیں۔ حجاج اور نگران سبھی اس طرف متوجہ ہوئے۔ انہیں اٹھانے کی کوشش کی جاری تھی۔ میں اس دوران قرآن پاک کی کچھ آیات کا ورد کر رہا تھا۔ سورۃ فاتحہ میں نے کئی بار پڑھ ڈالی تھی۔ میں نے خالہ عاصمہ کی زندگی اور صحت کے لیے اللہ سے دعا کی کیونکہ وہ وطن سے اور خاندان والوں سے بہت دور تھیں۔

بالآخر خالہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری دعا سن لی تھی۔ میں اس وقت اس بات سے باخبر نہ تھا کہ خالہ نے محض ڈراما کیا تھا۔ ایسا انہوں نے اس لیے کیا تھا تا کہ روضہ مبارک کی جالیوں کو پکڑنے کا موقعہ مل جائے جو اس کے بغیر نہیں مل سکتا تھا۔ یہ بات انہوں نے بعد میں مجھے خود بتائی تھی کہ وہ مکہ مکرمہ واپس لوٹنے سے قبل روضہ اطہر کی جالیوں کو ضرور چھونا چاہتی تھیں۔

حج: بغیر کسی استثنیٰ کے ہر سال مکہ میں اس موقعہ پر جتنے خاندان موجود ہوتے ہیں سب حج ادا کرتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی حوالے سے حجاج یا حج سے وابستہ ہوتے ہیں، بطور ایجنٹوں کے، پھیری والوں کے یا اس فریضے کی ادائیگی میں شرکت کرنے والوں کی حیثیت سے۔ اس وقت یہ کتنی آسان بات تھی۔ آپ کو صرف ایک مقررہ دعا پڑھنی ہوتی تھی یا ایک دوسری دعا مسجد حرام کے اندر پھر آپ المدعا چلے جاتے تھے جہاں اونٹوں اور گدھوں کے مالک آپ کا انتظار کرتے تھے اور آپ کے کانوں میں ان کی آواز آتی تھی: ''کرائے پر سواری حاضر ہے''۔ یہ ایک طرح کا ان کا اشتہار ہوتا تھا۔ سواری مہیا کرنے کے لیے چند پیاسٹر دیجیے اور ان جانوروں میں سے کسی ایک پر سوار ہو جائیے۔ آپ تنہا بھی سوار ہو سکتے تھے اور کسی کے ساتھ بھی (اس کے پیچھے اسی جانور کی پیٹھ پر) جس طرح آپ پسند کریں۔ اب آپ عرفات جا رہے ہوں گے اگر آپ نویں دن تک نہیں جا سکتے تھے یا آپ منیٰ کے راستے میں ہوں گے۔ حج کے نویں دن مکہ میں ایک بھی مرد نظر نہیں آتا۔ البتہ رات کو پہرہ دینے والے چوکیدار ضرور یہیں ہوتے ہیں ایسے چور ڈاکو بھی جو اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہتے ہیں۔ چوروں کا یہ گروہ حج چوروں کے مقابلے میں غیر اہم تھا۔ مؤخر الذکر حجاج کے خیموں میں گھس کر اس وقت چوری کرنے کے لیے بدنام تھے جس وقت حجاج خیموں میں نہ ہوں۔ آپ نے ایسے موقعوں پر اکثر ''چور چور'' کی صدائیں سنی ہوں گی۔ پھر گارڈ خیموں مشعلوں کی روشنی میں ان کو پکڑنے کے لیے ان کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ کون تھے اور کہاں بھاگ کر گئے ہیں۔ کیا رات اسی طرح اندھیری رہے گی، وہ حیرت انگیز ایجاد جسے بجلی کہتے ہیں اور جس کا ذکر ابھی یہاں کسی نے نہیں سنا اور یہ لالٹین اور مشعلیں تو محدود سی جگہ کو ہی روشن کر سکتے ہیں۔

ان مخصوص راتوں میں صرف وہ عورتیں گھروں میں ہوتی ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے اس سال حج نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ سب ایک جگہ جمع ہو کر رات دیر تک قیس میلہ مناتی ہیں۔ عورتوں کا یہ ہجوم مردوں کے بغیر ہوتا ہے اور یہ سب مل کر خوشی سے چیختی چلاتی اور ایسے لوگ گیت گاتی ہیں جو اس میلے سے متعلق ہوتے ہیں۔

یہ بیشک ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ نے ہمیں کفر و الحاد سے نکال لیا ہے۔ اس کے باوجود گذشتہ صدی کے آغاز میں ہماری عورتیں اس میلے میں شریک ہوتی تھیں تاکہ مل کر گیت گا سکیں اور مکہ میں پیچھے اکیلی

رہ جانے پر اپنی تنہائی کی تکلیف کم کرسکیں۔ بچپن میں مجھے کئی بار اس میلے میں شرکت کا موقعہ ملا تھا۔ جب عورتیں اپنے ہاتھوں میں چوبی تلواریں لے کر ناچتی تھیں تو میں ان کے آگے آگے مشعلیں لے کر چلتا تھا۔ میری ماں اس رقص میں کبھی شریک نہ ہوتی تھیں مگر وہ دور بیٹھ کر دیکھتی ضرور تھیں۔ ان کے پاس پھل اور اخروٹ ہوتے تھے اور وہ بار بار اپنا ہاتھ تھیلے میں ڈالتی تھیں اور ان کے جبڑے مسلسل چلتے رہتے تھے۔

آخری قیس میلہ عرصہ ہوا منعقد ہوا تھا مگر اس کی یادوں کے دیرپا نقوش اب تک میرے ذہن پر ثبت ہیں۔ اس میلے میں کچھ دیو مالائی عناصر کا تانا بانا ملا ہوا ہوتا تھا۔ یہ سب کے سب اس قصے سے جا کر مل جاتے تھے کہ یہ عورتیں اپنے درمیان کسی مرد کے چھپ کر گھس آنے کا پتا کیسے لگاتی تھیں جو اکثر زنانہ لباس پہن کر آتے تھے ان کے ہاتھ میں لکڑی کی تلوار بھی ہوتی تھی اور انہیں اس بات کا پورا پورا یقین ہوتا تھا کہ انہیں کوئی بھی شناخت نہ کرسکے گا۔ مگر ہر بار غیر متوقع بات واقع ہو جاتی تھی۔ مجرم پکڑا جاتا جسے سزا بھی دی جاتی تھی۔ اسے یا تو عورتیں تھپڑ مارتی تھیں یا چوبی تلوار سے مارتی تھیں پھر اسے اس کے خاندان اور رشتہ داروں کے سامنے شرمندہ کرنے کے لیے میلے کے اختتام پر لایا جاتا تھا۔ مجرم کو سردار بھی لعنت ملامت کرتا تھا اور اس سے یہ وعدہ لیا جاتا تھا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا۔

درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہونے سے پہلے ہی قیس میلے کی ساری دلکشی میرے لیے ختم ہو گئی تھی۔ اب میرا شوق حج کی سرگرمیوں میں حصہ لینا تھا۔ مجھے ایک موقعہ پر بطور معلم یا گائیڈ کے مسجد الحرام میں حجاج کی رہنمائی کا موقع ملا تھا، جیسا کہ میری عمر کے درجنوں لڑکے بطور ایجنٹوں کے معاون کے یا تنہا ان حجاج کی رہنمائی کیا کرتے تھے۔ کچھ حجاج کو ہماری ضرورت اس لیے بھی پڑتی تھی کہ معلم یا گائیڈ کے دیئے گئے۔ مقررہ وقت کے بعد انہیں ہماری ضرورت پڑتی تھی۔ یہ ایک طرح کی ملازمت ہوتی تھی جو میری نسل کے بہت سے نوجوانوں کو مل جاتی تھی۔ حج کے ایام میں اس قسم کی ملازمت سے ہم سال کے باقی مہینوں کے لیے کچھ رقم جمع کر لیتے تھے۔ اساتذہ بھی اس میں حصہ لیتے تھے اور اپنی خدمات کسی ایجنٹ کو پیش کر دیتے تھے۔ اساتذہ کی اس قسم کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور انہیں ان آزادرہ کر کام کرنے والوں سے بہتر تصور کیا جاتا تھا جو مسجد حرام کے دروازوں پر حجاج یا عمرہ کرنے والوں کے انتظار میں کھڑے رہتے تھے۔

اس روایت کے زیادہ پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد میں نے ایک مختلف راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کا تعلق حج اور مناسک حج سے تھا۔ میں نے اپنے علاقے کے معروف ایجنٹوں کے سیکرٹری

کے طور پر کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اس ایجنٹ کے حجاج کے نام بحری جہازوں کے نام اور جو سامان وہ بطور امانت رکھواتے تھے اس کی فہرستیں تیار کرتا تھا۔ قربانی کے جانوروں سے متعلق ریکارڈ تیار کرنا بھی میری ذمہ داریوں کا حصہ تھا۔ ہم ان حجاج کے عام اخراجات بشمول کرایہ مکانات، اونٹوں، خیموں اور منیٰ میں خیمے لگانے کے اخراجات کا حساب بھی رکھتے تھے۔ حجاج کے مہمانوں کے لیے کھانے پر جو خرچ آتا تھا اس کا حساب بھی رکھنا ہوتا تھا۔ الوداعی کھانے پر پورے گروپ کے اخراجات کتنے تھے ان کی تفصیل بھی رکھی جاتی تھی۔

منیٰ تک جانے کا سفر خاصا محنت طلب تھا۔ اس سفر کے لیے جو تیاریاں کی گئی تھیں وہ اُن تیاروں سے مختلف نہیں تھیں جو کسی فوجی مہم کے لیے کی جاتی ہیں۔ ان میں ایک ہزار برس سے زیادہ برسوں کے تجربات کی نمائندگی کرنے والے قواعد وضوابط تھے۔ قافلے کے پیچھے پیچھے وہ اونٹ تھے جو مکہ کے مقامی افراد کے تھے، پھر ایجنٹ کا خاندان تھا جو چار اونٹوں پر سوار تھا اور اس کے پیچھے میرا اپنا خاندان تھا۔ اونٹوں پر رکھے ہوئے شکدف جو مکے کے مقامی لوگوں کے تھے، یہ دوسرے حجاج کے شکدفوں سے اس لحاظ سے الگ پہنچانے جاتے تھے کہ اول الذکر کو نرم و ملائم غالیچوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا جبکہ مؤخر الذکر کو پٹ سن کی بوریوں سے ڈھانپا گیا تھا۔ مکہ کے مقامی حجاج کے اُونٹ بھی دوسرے حجاج کے اونٹوں کے مقابلے میں زیادہ بڑے اور زیادہ صحت مند تھے۔

شکدف جب ایک بار اونٹوں پر باندھ دیے جاتے تو پھر اونٹوں کو ایک لمبی قطار میں لگا دیا جاتا تھا۔ شتر بانوں کو بڑی حکمت عملی کے ساتھ اس طرح تقسیم کیا جاتا تھا کہ جو اونٹ سب سے آگے ہو اسے سب سے بوڑھا اور زیادہ تجربہ کار شتر بان لے کر جا رہا ہو۔ دوسرے، تمام شتر بانوں کو قافلے کے دونوں طرف بانٹ دیا جاتا تھا اور ان میں سے ہر ایک کئی کئی اونٹوں کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ ان میں سے دو سب سے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ قافلہ چونکہ مصری حجاج پر مشتمل ہوتا تھا اس لیے جوں ہی سب سے آگے والا اونٹ چلنا شروع کرتا تھا وہ اپنی آبائی زبان میں چیخ و پکار شروع کر دیتے تھے۔ اس کے بعد ان کے گیت فضا میں گونجنے لگتے تھے۔ یوں ہم آگے بڑھتے جاتے تھے اور مکہ کے گھر پیچھے رہتے جاتے تھے۔ ہم مشرق کی سمت مشاعر یعنی منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کی جانب جا رہے تھے۔

شتر بانوں کو تقسیم کرنے کی حکمت عملی اس لیے اپنائی جاتی تھی کیونکہ ڈاکوؤں کے حملوں کا ڈر رہتا

تھا۔ اس طرح جب اونٹوں کی تعداد بڑھ گئی تھی تو رسی سے سب سے اگلا اور سب سے پچھلا حصہ علاحدہ کر دیا گیا تھا۔ اس میں بھی یہ ڈر رہتا تھا کہ پچھلے حصے کے بارے میں اگلے حصے کو کئی کئی گھنٹے بلکہ بعض اوقات کئی کئی دن خبر نہیں رہتی تھی۔ جب کوئی ایسا واقعہ پیش آتا تو ایک تجربہ کار شخص چلاتا تھا: ''شتربانوں ہوشیار ہو جاؤ...... ڈاکو آ گئے ہیں...... ڈاکو'۔ اس پر اگلا اور پچھلا حصہ فوراً متحد ہو جاتا تھا۔

ہم میں سے وہ جو کسی ایجنٹ کے ملازمین تھے، ہم اپنے ساتھ بدوی تھیلا رکھتے تھے۔ یہ اسی طرح کا ہوتا تھا جیسا آج کل کوئی بڑا تاجر بریف کیس کی شکل میں ساتھ رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ گاؤن پر پیٹی بھی باندھتے ہیں۔ ہمارا آجر ہمیں ایک خمدار خنجر بھی دیتا تھا تاکہ خطرے کی صورت میں ہم اپنی جان کی حفاظت کر سکیں۔

میں نے منیٰ اور عرفات تک زیادہ فاصلہ پیدل چل کر طے کیا تھا لیکن میں مذہبی جوش و خروش کی وجہ سے تازہ دم تھا، مجھے تھکاوٹ بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میری امی مجھے بار بار آوازیں دے رہی تھی۔ ''بیٹے! شگدف میں بیٹھ جاؤ اور آرام کرلو۔ تم شتربان تو نہیں ہو کہ مسلسل پیدل چل رہے ہو'' مگر میں پھر بھی پیدل چل رہا تھا۔ دراصل مجھے شتربانوں اور نوکروں کے ہمراہ چلنا لطف دیتا تھا۔ میں نے شتربانوں کے انچارج سے پوچھا کہ اس نے کتنے حج کیے تھے۔ میں نے اس سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ مجھے بھی کچھ اپنے تجربات کے بارے میں بتائے۔

اس کا حافظہ بلا کا تھا اور اسے مکے اور مدینے جاتے ہوئے جو حادثات پیش آئے تھے اس نے ان کی تفصیل سے ہمیں آگاہ کیا تھا۔

اس نے ایک بے حد تکلیف دہ بات یہ بتائی تھی کہ شتربان ڈاکوؤں کے ساتھ ساز باز کر کے حجاج کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اس نے بتایا کہ کس طرح ایک ڈاکے کے دوران جب حجاج نے اپنے دفاع میں ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا تو اس کا بیٹا مارا گیا تھا۔ مدینہ جاتے ہوئے انہوں نے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے ڈنڈے اور پتھر یا جو شے ہاتھ لگی استعمال کی تھی۔ ڈاکو گھبرا کر بھاگ گئے تھے اور دو مردہ ساتھیوں کی لاشیں بھی چھوڑ گئے تھے۔ اس کے بعد اس شتربان نے بتایا کہ وہ آئندہ کے لیے مسلح ہو گیا تھا تاکہ ایسے موقعوں پر قافلے کا دفاع کرنے میں آسانی رہے۔ وہ قافلے کے حجاج کو کسی صورت میں بھی ڈاکوؤں کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے گفتگو پر بڑا عبور حاصل تھا اور بہت تیز تیز بولتا تھا۔ بعض اوقات تو سننے والے کو یہ شک گزرتا تھا

جیسے وہ لکھی ہوئی کوئی عبارت پڑھ رہا ہے۔ وہ کہانی سنا رہا ہوتا تھا اور کسی کی کیا مجال جو کوئی مخل ہوتا۔ وہ مجھ سے بطور خاص بہت خوش تھا کیونکہ مجھ سے اچھا سامع اسے کہاں مل سکتا تھا۔

وقفوں وقفوں سے وہ قافلے کے سب سے پچھلے حصے میں چلا جاتا تھا تاکہ حجاج اور شتر بانوں کی خیریت معلوم کر سکے۔ وہ شتر بانوں کو موقعہ محل کے مطابق ہدایات بھی جاری کیا کرتا تھا مثلاً یہ کہ فلاں اونٹ کو آرام سے چلایا جائے، فلاں بیمار سا لگ رہا تھا اس کی طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت تھی وغیرہ وغیرہ۔ وہ اونٹوں کی گنتی باقاعدگی سے کرتا تھا، جب تسلی کر لیتا تو جس کسی سے بات کر رہا تھا وہاں واپس جا کر بات کا سرا وہیں سے جوڑ لیتا تھا جہاں یہ منقطع ہوا تھا اور اسے یہ یاد رہتا تھا کہ بات کہاں ادھوری چھوڑ کر وہ کہیں اور متوجہ ہوا تھا۔ وہ اکثر اپنی ہر کہانی کا آغاز یوں کیا کرتا تھا: ''ایک حج کا ذکر ہے کہ ہم مدینے جا رہے تھے اور'' پھر یہیں سے اپنی کہانی کو اٹھا لیتا تھا۔ کاش میرے پاس اس زمانے میں یہ سہولت موجود ہوتی کہ میں اس کی کہانیاں ریکارڈ کر لیا کرتا۔ اور پھر شائع کرتا۔ اس کی کہانیوں میں ٹریجیڈی کامیڈی (المیہ طربیہ) دونوں ہوتی تھیں۔ ان میں اونٹوں کے بارے میں بڑی معلومات ہوتی تھیں مثلاً اونٹوں کی عمر، وہ نغمے اور گیت جن پر وہ مست ہو جاتے تھے، حج راستوں پر کون کون سے مقامات کہاں کہاں تھے، پانی کہاں دستیاب ہوتا تھا، وہ مقامات جہاں پانی کی قلت ہوتی تھی، پیاس سے مرنے کے واقعات، مدینہ جاتے ہوئے الصفراء اور القریش قبیلوں کے درمیان جنگیں، وہ قبیلے جو قافلوں پر حملے کرنے کے لیے بدنام تھے اور زمانہ حال کا سب سے اچھا شتربان کون تھا، جو سب سے زیادہ بہادر بھی ہو یہ ساری معلومات اسے ازبر تھیں۔

ان کہانیوں کے دوران ایک یا دو بھکاری آ جاتے تھے، اس کے ہاتھ میں لمبی سی چھڑی ہوتی تھی جس کے ایک سرے پر ٹماٹر کی پیسٹ لگی ہوتی تھی، وہ یہ چھڑی ہلا کر بھکاریوں کو بھگا دیتا تھا۔ یہی چھڑی وہ کسی شکدف کے سامنے بلند کرتا اور اس میں سوار حجاج سے یوں ہمکلام ہوتا تھا:

''حجاج صاحبان! اللہ آپ کا حج قبول فرمائے''۔

حج کے اختتام پر عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر میری امی ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کرتی تھی۔ وہ کیمپ کے بچوں کو اکٹھا کر لیتی اور پھل اور اخروٹ میری طرف بھی پھینکتی جاتی تھی اور گاتی بھی جاتی تھی: ''وہ حج پر گئے تھے اور واپس آ چکے تھے''۔ بچے پھل اور اخروٹ جمع کر لیتے اور ایجنٹ اور اس کا خاندان لطف اندوز ہوتا

اور قہقہے لگاتا تھا۔ پھر ماں میری طرف ایک نیکلس قسم کی شے بڑھاتی جس میں وہ خشک کھجوریں پروئی ہوتی تھیں جو حج کے موسم میں اس خاص مقصد کے لیے بیچی جاتی تھیں۔ یہ عیدالفطر کے موقعہ پر بھی فروخت ہوتی ہیں ا اوران سے ایک لذیذ مشروب، کچھ اور چیزیں ملا کر بنایا جاتا ہے۔ میں اس تفصیل کو یہاں بیان کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مشروب بنانے کا طریقہ کیا تھا۔ اس لیے کہ مکہ اور جدہ کے بہت سے خاندان یہ مشروب تیار کرنے میں ماہر ہیں، یہ الگ بات کہ نوجوان نسل کو یہ پسند نہیں ہیں۔

منٰی میں گزاری گئیں راتیں واقعی خوشیوں بھری راتیں ہوتی ہیں، ہر کوئی خوش ہوتا ہے ہم اس موقعہ پر عرب بازار میں گھومتے پھرتے تھے جہاں سیاح اور خواتین بھی نظر آتی تھیں۔ یہ ماحول بے حد خوشگوار ہوتا ہے، شام کو کبھی کبھی کوئی قاری قرآن پاک کی تلاوت کرتا بھی دکھائی دیتا تھا جس کے گرد لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ ایک جگہ اور کچھ عرب قبیلوں کے لوگ رقص کرتے اور گیت گاتے نظر آتے تھے جس سے شادی کا سا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ منٰی کے مناظر میں یہ سب کچھ ایک اہم پہلو کی حیثیت سے موجود ہوتا تھا۔

☆☆☆

20: جلال آل احمد......ایران
1964ء

''جلال بہت سے دوسرے ادیبوں کے مقابلے میں اپنے بارے میں زیادہ دیانتدار تھا۔ ایرانی ادباء اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنے سے ڈرتے ہیں مگر جلال میں یہ ہمت و حوصلہ موجود تھا کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کے اخلاقی مسائل کا سامنا کر سکے۔'' (رضا بر ہانی)

''ہجوم میں گم'' پہلے مدینے پھر مکے کے تین ہفتوں پر مشتمل سفر کی ذاتی ڈائری ہے، جو 1964ء میں ایران کے نہایت متنازعہ ادیبوں میں سے ایک ادیب نے ،موقعہ پر لکھی تھی۔ اس مختصر سی کتاب میں جلال آل احمد نے سفر حج کے طبعی اور سماجی اثرات کی جانب گہری توجہ دی ہے۔ یہ نو سو سال پہلے نصر خسرو کی تحریر کی بازگشت لیے ہوئے ہے۔ جلال ایک پیشہ ور ادیب تھا جس نے اپنی کتاب کو خسرو کے طرز پر لکھا اور وہ اسے خوب جانتا تھا۔

آل احمد 1923ء میں ایک بااثر مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ وہ بطور ایک طالبعلم کے اپنے شیعہ مذہبی پدر سے الجھ پڑا تھا۔ وہ موروثی روایات سے بغاوت کر بیٹھا تھا اور جب وہ مکے کے لیے روانہ ہوا اس وقت تک کے بیس برسوں میں اس نے ایک نماز بھی نہیں پڑھی تھی۔ اس نے اپنی علمی زندگی کا آغاز بطور ایک استاد مصنف اور ثقافتی مشاہد کے کیا تھا۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایران کے بہت بڑے سماجی نقادوں میں شمار ہوتا تھا۔ دو عشروں سے زیادہ عرصے تک اس نے اہم ناول شائع کیے، کہانیاں لکھیں جن میں معاصر مسائل کو موضوع بنایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ علمی مضامین لکھے جو جرائد میں چھپے اور ایرانی معاشرے پر مضامین لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔

آل احمد اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ شیعیت کو اداراتی صورت دینے سے اس کے ملک کو کیا نقصان پہنچا۔ اس نے اس کی تعلیم عام ہونے میں ناکامی پر بھی قلم اٹھایا تھا۔ اس نے محمد رضا شاہ پہلوی کی

حکومت کے مغرب کی طرف جھکاؤ اور اس کی جدیدیت پر بھی کڑی تنقید کی۔اس نے دلیل کے طور پر یہ مثال پیش کی تھی کہ البرٹ کاموس کا ناول ''طاعون'' اُس تہذیبی اور ثقافتی بیماری کی تمثیلی تشریح تھی جسے جدید مشینی عمل نے جنم دیا تھا۔اس بیماری کو اس نے کئی نام دیئے تھے جیسے ''مغربی زہریلا پن''۔''مغرب پرستی''۔ وغیرہ.....اس نے ایران میں اس کی درآمد کے بارے میں متنبہ کیا تھا۔شہنشاہ ایران اس تنقید پر بہت ناراض ہوا تھا۔لیکن آل احمد نے اس سے بھی ایک قدم آگے جا کر ایران کے پورے سیاسی منظرنامے کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔اس نے زیادہ تر ایرانیوں میں پائی جانے والی روایتی اسلامی اقدار کی اہمیت پر زور دیا تھا جو شیعہ پیشوائیت سے بالکل مختلف تھیں۔ جہاں تک شاہِ ایران کی سیاسی مخالفت کا تعلق تھا اس نے اعلان کر دیا تھا کہ ایران کی تمام پارٹیاں لامذہبی زبان میں اپنے پروگرام پیش کر رہی تھیں جو خودکشی کے مترادف تھا اور یہ ایرانی قوم کے مذہبی کسانوں کو بالکل پسند نہ تھا جن کی ملک میں اکثریت تھی۔آلِ احمد نے مکہ کے سفر کے دوران اس نکتے کو بار بار اٹھایا تھا۔اس نے یہ بھی کہا کہ اُس نے یہ کتاب ایرانی دانشوروں کے جواب میں لکھی ہے جو ''ان واقعات کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے درمیان انتہائی احتیاط کے ساتھ اور ناپسندیدگی سے پھرتے ہیں''۔

پوری کتاب میں آل احمد کے نظریات کے بارے میں صحیح معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔وہ حج کی ادائیگی کو ایک خالصتاً ذاتی معاملہ سمجھتا ہے وہ جب مکے گیا تو اس کے ہمراہ اس کی بہن، دو برادران نسبتی ایک چچا تھے جو سب کے سب شیعہ تھے اور اس کی ڈائری کے مندرجات میں ان کی حالت، مزاج، ضروریات شامل ہیں جن پر اسے توجہ دینی تھی۔اس نے اپنے آپ کو ان سب کا محافظ اور نگران تصور کیا تھا۔اس کے لیے وہ یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ تقریباً 13 برس قبل اس کے بھائی کی مدینے میں موت کیسے واقع ہوئی تھی۔ یہ تحقیق کہانی کا موضوع بن جاتی ہے۔پھر اس کتاب کے لیے آلِ احمد کا یہ استعارہ بھی قارئین کی توجہ طلب کرتا ہے۔''میں اپنے بھائی کی تلاش میں آیا تھا اور ان تمام دوسرے بھائیوں کی تلاش میں بھی، نہ کہ خدا کی تلاش میں''۔آل احمد جیسے شخص کی طرف سے اس طرح کا بیان جذباتیت کی انتہائی شکل کا مظاہرہ تھا۔اس کے راستے میں آنے والے لوگ اُس کے لیے اہم تھے خواہ وہ خاندان سے تھے یا اجنبی تھے۔

''ہجوم میں گم'' آل احمد کی وہ کتاب ہے جو اول تا آخر اتفاقیہ ادا ہو جانے والے حج کی سرگزشت پر مبنی ہے۔ہمارے آخری ایرانی سیاح فارانی نے جو روداد حج لکھی یہ اس سے بالکل مختلف ہے۔

یہاں کوئی بھی تفصیل اتنی مانوس نہیں کہ اسے ریکارڈ کیا جا سکے۔ کوئی بھی ایسا موضوع نہیں ہے جو حدود سے باہر ہو۔ ایک چچا کا اسہال کا مرض، ایک عورت کی سرسری نظر، ایک ہمسفر کی ابتدائی دیوانگی کا ذکر آل احمد نے اپنے ذاتی ردعمل اور شکایت کے ساتھ پورے وزن کے ساتھ کیا ہے۔ کتاب کے صفحات ہمیں جوں جوں آگے لے کر چلتے ہیں ہماری نظر ان واقعات پر پڑتی ہے جو اس اہم مذہبی فریضے کی ادائیگی کے موقعہ پر پوری توجہ چاہتے ہیں اور کسی اور فلسفے کا بیان یہاں اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ اب یہ بات زیادہ اہم ہو جاتی ہے کہ حج کے موقعہ پر ایک فرد کس قسم کا رویہ رکھتا ہے۔ آل احمد کو اگر حج کے دنوں میں نظر آنے والی بدنظمی اچھی نہ لگتی تھی تو اس کی ندرت، جوش و جذبہ اور دباؤ بہت پسند تھا۔ اسے کھلے دل والے مذہبی لوگ اچھے لگتے ہیں مگر اسے منافقت اور کمینگی سے نفرت ہے۔ وہ جب اخلاقیات کا ذکر کرتا ہے تو تفصیل سے کرتا ہے۔ کوئی بھی شے ویسی نہیں جیسی وہ نظر آتی ہے کیونکہ ہر شے کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کا پوری گہرائی سے جائزہ لیا جائے۔

آل احمد نے مسجد حرام کو اس وقت دیکھا تھا جب اس میں دوسری بار توسیع ہو رہی تھی۔ اٹھارویں صدی کی سلطنت ترکی کے عہد میں اس میں ہر طرف تعمیر ہی تعمیر ہو رہی تھی۔ عبدالعزیز کا بیٹا شاہ سعود اور اس کے ماہرین تعمیرات نمازیوں کے لیے جگہ میں توسیع کر رہے تھے تا کہ یہاں سات لاکھ حجاج کے لیے جگہ بن سکے اور اس کام میں کئی برس لگ گئے تھے۔ 1964ء کے موسم بہار میں آل احمد نے دیکھا کہ عمارت کی تمام مشرقی سمت کو تعمیری مچان کے ذریعے شہر کے ساتھ ملا دیا گیا تھا۔ مطاف (خانہ کعبہ کے گرد طواف کی جگہ) پر سنگ مرمر لگا دیا گیا تھا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کے لیے اسے دو منزلہ بنا کر فرش سیمنٹ کا بنا دیا گیا تھا۔ آل احمد نے اپنی کتاب میں حج ہوائی سفروں، ہوٹلوں، گیراجوں، کثیر المنازل عمارات، مشینی مذبحوں اور برقیاتی روشنیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے جدہ کے حج ایئرپورٹ کا مفصل ذکر کیا ہے جہاں طبی کلینک اور حجاج کے لیے آرام گاہیں بنا دی گئی تھیں۔ اس نے مغربی تہذیب پر جس طرح حملے کیے ہیں۔ اس حوالے سے یہ ساری جدیدیت اس کے نقطۂ نظر سے مطابقت نہیں رکھتی۔

آل احمد اپریل کے سخت گرم دنوں میں بھی باہر گھومنے نکل جاتا تھا، اسے ایک گلی میں عجیب سے پائپ دکھائی دیے تھے جن پر اس نے تنقید کی جو مدینہ واٹر سپلائی سسٹم پر تنقید کے مترادف تھی۔ اس نے منٰی میں موجود مذبحوں کی جو خوفناک تصویر کشی کی ہے وہ اس سے بہت ملتی جلتی ہے جس کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے

سفر نامے میں کیا تھا۔ وہ جتنے عرصے تک یہاں ٹھہرا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ عربی میں گفتگو کرے خواہ ٹوٹی پھوٹی عربی ہی کیوں نہ ہو۔ بنچوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں اور آئس کریم ہاؤس میں موجود افراد سے سپاہیوں، طلبہ سے اور حجاج سے وہ عربی بولنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی وہ بس جو اسے رات کو مکہ لے کر جاتی ہے، ایک مابعد الطبیعیاتی بن جاتے ہیں۔ اس کے مشاہدات ماحصل نگاری کو رد کر دیتے ہیں وہ ایک صفحے پر آ جاتے ہیں اور اپنی جگہ کافی ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں آل احمد کی سابقہ تحریروں سے کہیں زیادہ وجودیت دکھائی دیتی ہے جو گمشدہ مذہبی ماضی کے ذخیرہ الفاظ کو دوبارہ واپس لانا چاہتی ہے۔ اس ڈائری میں غیر رسمی، بے ربط نثر میں طبع آزمائی کی گئی ہے جو جدید حج کے ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے سر تال کو گرفت میں لے لیتی ہے۔

☆☆☆

جمال آلِ احمد کے ''ہجوم میں گُم'' سے لیا گیا

جدہ۔ جمعہ 10۔اپریل 1964ء: ہم مہرآباد ایئرپورٹ (ایران) سے پانچ بجے صبح روانہ ہوئے تھے۔ ہم یہاں آٹھ بج کر تیس منٹ پر (مقامی وقت 7.30) پہنچے تھے۔ ہم نے ہوائی جہاز کے اندر ہی چائے اور کافی کے بغیر ناشتہ کرلیا تھا۔ ناشتے میں ڈبل روٹی، مرغ کا ایک ٹکڑا، ایک انڈا تھا جو ایک چھوٹے سے ڈبے میں بند تھے جس پر فضائی کمپنی کا نشان چھپا ہوا تھا۔ حجاج کو شک تھا اور وہ سوچ رہے تھے کہ ناشتہ میں شامل چیزیں کھالی جائیں یا نہیں۔ یہ گوشت حلال بھی تھا یا نہیں؟ ان کا شک کیسے دور کیا گیا تھا میں یہ نہ دیکھ سکا تھا۔ ہمارے معلّم اور گائیڈ نے جہاز کے عملے کی مدد کی جو ناشتہ تقسیم کر رہا تھا یقیناً مسافروں نے یہی سمجھا ہوگا کہ ہمارے گائیڈ نے اس کے لیے بل ادا کیا ہوگا۔ کھانے کے بعد ہمیں ایک مالٹا دیا گیا تھا اور اس بار بھی گائیڈ کی مدد سے ایسا ہوا تھا۔

مجھ سے اگلی نشست پر ایک معمر شخص بیٹھا ہوا تھا جو کچھ سہا ہوا سا لگتا تھا۔ یہ اس کا پہلا ہوائی سفر تھا۔ وہ لوگوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے نشست کے ساتھ بنی ہوئی ٹرے اس کے سامنے کھول دی تھی تا کہ وہ اس پر کھانا رکھ سکے۔ اس نے میرا شکریہ ادا کرتے مجھے بتایا کہ وہ اس ٹرے کو کھولنا جانتا تھا۔ اب ہم دونوں کے درمیان تھوڑی بہت بات چیت شروع ہوگئی تھی۔ وہ ایک ریٹائرڈ پولیس افسر تھا ان کے بچوں کی شادیاں ہوگئی تھیں اور اب وہ میاں بیوی اکیلے تھے۔ وہ اللہ کے گھر جا رہا تھا اس کا شکریہ ادا کرنے۔ تاہم وہ خوفزدہ تھا۔ ''کیا عرفات اسی قدر محنت طلب کرتا ہے جتنی بتائی جاتی ہے؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا بھی یہ پہلا حج تھا۔

ہمارے گروپ میں 85 حجاج ہیں۔ ان میں سے بیس تیس تاجر ہیں، کچھ سیّد ہیں، کچھ مولوی اور مبلغین اور دس ایسے دیہاتی ہیں جو صرف ترکی بول سکتے ہیں۔ ان میں 20 عورتیں بھی ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ میری بہن، اس کا شوہر، جاوید، دوسری بہنوں کے شوہر اور میرے ابا کے چچا ہیں۔ اس ہجوم

کے اندر ہمارا چھوٹا سا گروپ ہے۔ ہمارا گروپ ہمارے اپنے ہی علاقے سے ہے۔ وہ میرے والد کے پیروکاروں میں سے ہے۔ میں نے سب کو آمادہ کیا تھا کہ اس گائیڈ کو ساتھ لے جائیں۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا اور ایک باورچی اور باورچی کا معاون ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان انتظامات کی موجودگی میں ہمیں کسی شے کی کمی محسوس ہو سکتی ہے۔

جدہ، وہی دن، رات کا وقت: آج صبح جب ہم ہوائی جہاز سے اترے تو سیدھے مدینۃ الحج کی عمارت میں آ گئے تھے جو ہوائی اڈے کے قریب ہے۔ یہ ایک تین چار منزلہ خوبصورت عمارت ہے۔ اس میں چاروں طرف کھڑکیاں اور کشادہ بالکونیاں ہیں۔ کمرے ہوادار ہیں۔ پیاس بہت لگتی ہے، پانی پیے جائیں اور پسینے میں شرابور ہوتے جائیں۔ کمروں میں اتنی ہوا لگتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی پر محسوس کرتے ہیں۔ یہاں پہنچتے ہی میں نے ایران کا لباس اتار کر صندوق میں بند کر دیا تھا۔ میں نے آٹھ سعودی ریال میں ایک سفید عربی چغہ خرید لیا تھا۔ دو ریال کے سلیپر بھی خرید لیے تھے۔ چغہ دونوں طرف سے بند تھا جسے میں نے چاقو سے دونوں جانب سے کھول لیا تھا تاکہ اٹھ بیٹھ تو سکوں مگر کندھوں پر یہ اس قدر چست ہے کہ ہر وقت یہی محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بغلگیر ہو رہا ہے۔ معاف کیجیے میں موضوع سے ہٹا جا رہا ہوں۔ میں تو آپ کو مدینۃ الحج کے بارے میں بتا رہا تھا۔ یہ چار منزلہ ہے۔ ہم تیسری منزل پر ہیں۔ یہ سرکاری ملکیت ہے۔ حجاج ہوائی اڈے سے تھوڑی دیر کے لیے یہاں آتے ہیں، پھر ان کے جدہ جانے کا وقت ہو جاتا ہے جہاں سے انہیں مکہ و مدینہ جانا ہوتا ہے۔ اس بات کا انحصار ان کے حج موسم میں جلد یا بدیر آنے پر ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ بعض اوقات حجاج کو یہاں تین روز کے لیے روک لیا جاتا ہے۔ تاہم میرا خیال ہے ہم آج رات یہاں سے چل پڑیں گے۔ میں رخصت ہونے سے قبل وقت گزاری کے لیے یہ ڈائری لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔

مدینۃ الحج: ہمارے گروپ کے حجاج ناخوش ہیں کہ ان کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہے۔ وہ صبح سے کبھی اپنے سامان کھولتے ہیں کبھی دوبارہ باندھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ گھروں پر بیکار رہنے کی قیمت اب ادا کر رہے ہوں جہاں بلاشبہ ان کی بیویاں ہر شے کا خیال رکھتی ہیں۔ تمام سوٹ کیسوں پر کینوس چڑھا ہوا ہے ان میں تالے لگے ہوئے ہیں، رسیوں میں بھی بندھے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ایک ایک کر کے اپنی اپنی جائے نماز باہر نکالتے ہیں پھر ان کو لپیٹ کر سوٹ کیس میں رکھ دیتے ہیں۔ وہ نہیں ابھی یہ ٹھیک نظر نہیں

آ رہا'' اور جھنجھلا کر اسے دوبارہ کھول دیتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے ہر کسی نے اپنے مال مویشی، کیش رجسٹر کل ہی پیچھے چھوڑے ہوں گے۔ انہیں ہر بات میں ایک نیا تجربہ حاصل ہو رہا ہے۔ تہران سے جہاز آپ کو جدے تک تین گھنٹوں میں لے آیا ہے جبکہ اونٹ اور خچر پر سوار ہو کر آپ شاید سال بھر میں یہاں پہنچتے۔ ان حجاج میں ایک شخص ایسا بھی ہے جس نے یہاں کی گرمی اور حبس کے باوجود ابھی تک اپنی چمڑے کی واسکٹ نہیں اُتاری بلکہ بازار سے ایک عربی چغہ خرید کر اس کے اوپر پہن لیا ہے۔ اس کے کندھے ضرور درد کر رہے ہوں گے مگر اسے کون سمجھائے۔ وہ اچھی فارسی نہیں بول سکتا تھا تاہم میں نے بعد دوپہر اس سے مذاق کرتے ہوئے کہا: ''اُمید ہے آپ کو سردی تو نہیں لگ رہی ہوگی؟''۔ اصفہان سے آئے ہوئے ہمارے ایک ساتھی نے کہا: ''حاجی صاحب! اس نے اس چمڑے کی واسکٹ میں اپنی رقم سی رکھی ہے''۔ (ہم نے ابھی سے ایک دوسرے کو حاجی کہنا شروع کر دیا تھا) دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے یہاں پہنچتے ہی اپنی ساری پونجی سعودی ریالوں میں تبدیل کرالی تھی۔ چار ایرانی ایسے تھے جو ابھی تک ایرانی کرنسی کو سعودی کرنسی میں تبدیل کرانے کا پروگرام بنا رہے تھے اور بار بار اس خدشے کا اظہار کرتے تھے کہ کہیں انہیں کوئی دھوکہ نہ دے۔ یہ بیچارے تو وہ لوگ تھے جو اپنے وطن میں کبھی قم تک نہیں گئے تھے اور اب؟ کرنسی تبدیل کرنے والے فارسی، ترکی، اردو اور جاوی (جاوا کی زبان) ساری زبانیں جانتے ہیں۔

ہوا میں رطوبت ہے۔ جسم ہر وقت بھیگا بھیگا سا رہتا ہے اور آج رات ہڈیاں ضرور درد کریں گی اگر آپ سو سکتے ہیں تو آپ کی ٹانگیں، سینہ اور گردن کے آس پاس کا حصہ ننگا ہونا چاہیے۔ خواہ کچھ بھی ہو جتنے دنوں ایک حاجی کو احرام میں رہنا ہوتا ہے اتنے دنوں تک اس کا عادی ہونا ضروری ہے۔ چھت کے بجلی کے پنکھے رات دن مسلسل چلتے رہتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو ہم لوگ کیا کرتے؟ غروب آفتاب کے وقت جب ہوا چلنا بند ہوگئی تو ہم نے پنکھے چلا دیئے تھے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہم رات کے سفر کریں گے۔ میں بعد دوپہر اس عمارت کے دوسرے حصے اور منزلیں دیکھنے چلا گیا تھا۔ بالکونیوں کے بالکل سامنے اس عمارت کے گرد مختلف اقوام کے جھنڈے لہرا رہے تھے اور مختلف معلمین (گائیڈز) کے نام اور نشان بھی نظر آ رہے تھے، جن میں ترکی، ایران، عراق، شام اور مراکش کے پرچم نمایاں تھے۔ گائیڈ اس عمارت کے ساتھ ساتھ جانے والے راستوں پر مسلسل چل رہے تھے۔ یہ تمام نوجوان تھے ہر ایک نے خاکی وردی اور بیرٹ کیپ پہن رکھی تھی، ریوالور بھی ان کی کمر کے ساتھ لٹک رہا تھا اور ہاتھ میں ڈنڈے تھے۔

ہمارے قافلے کے لیے ایک چھوٹا شفا خانہ دوسری منزل پر تھا۔ جہاں ایک تجربہ کار ڈاکٹر، دوائیں اور دوا اردلی موجود تھے۔ انہیں اس ہفتے کے شروع میں یہاں تعینات کیا گیا تھا۔ ایران سے آنے والے محکمہ صحت کے افراد کی تعداد 72 تھی۔ ان میں سے 22 معالجین تھے جن میں کچھ خواتین تھیں۔ جب میں یہ شفا خانہ دیکھنے گیا اس وقت تک 449 مریض دیکھے جا چکے تھے۔ مریضوں کو جو شکایات تھیں ان میں آب و ہوا کی تبدیلی کی بیماری، لُو لگ جانے کا مرض اور اسہال قابل ذکر تھیں۔ اس گروپ میں 30 نائیجریائی، تین افغان، بہت سے سوڈانی، ترک، یمنی اور ایک مصری شامل تھے۔ اس چھوٹے شفا خانے کے دروازے ہر کسی کے لیے 24 گھنٹے کھلے رہتے۔ ڈاکٹروں میں سے کچھ اس وقت مکہ میں اور کچھ مدینہ طیبہ میں ہیں۔ یہ سب عید قربان پر مکہ مکرمہ میں جمع ہوں گے، حجاج ان کے بعد باری باری آئیں گے۔ یہ ساری معلومات مجھے اس شفا خانے کے ایک ڈاکٹر نے مہیا کی تھی۔

مدینہ طیبہ۔ سنیچر، 11۔ اپریل: ہم یہاں صبح کے ساڑھے آٹھ بجے پہنچے تھے۔ ہمیں دروازے پر افسروں اور عوامی نمائندوں نے خوش آمدید کہا۔ ہم گذشتہ رات کے 11 بجے سے بس میں سفر کر کے آئے تھے۔ بس کی نشستیں لمبی لمبی تھیں جن پر بیٹھے بیٹھے میرے پاؤں سوج گئے تھے اور اس وقت بھی درد کر رہے ہیں۔ مجھے زندگی میں ایسا درد اس سے قبل کبھی محسوس نہیں ہوا۔ مجھے شک ہے کہ میں چونکہ گرمی کی وجہ سے ننگی ٹانگوں کے ساتھ بھاگتا رہا تھا اس لیے میرا یہ حال ہوا تھا۔ میں نے چغے کے نیچے نکر پہن رکھی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے جدہ میں ایک کمبل خرید لیا تھا۔ اگر میں نے یہ نہ خریدا ہوتا تو میں پہلے ہی قدم پر منہ کے بل گر گیا ہوتا۔ میرے کندھوں کے درمیان اب بھی مجھے اس قدر درد ہوتا ہے جتنا قولنج کی وجہ سے پیٹ میں ہو جاتا ہے۔ مجھے ابھی تک کھانسی نہیں آئی تھی حالانکہ مجھے حلق میں تکلیف بھی تھی۔ اس دوران کسی نے آواز دی: ''اس کی طرف دیکھو! یہ حج کے لیے آیا ہے اور یہ اپنے بارے میں اس قدر فکر مند ہے۔ تمہیں چاہیے کہ ان گشتی شفا خانوں کو بھول جاؤ اور یقیناً انہیں ہی نہیں اپنے آپ کو بھی بھول جاؤ.......... یہ جذبہ پیدا ہوگا تو کوئی تکلیف قریب بھی نہیں آئے گی۔''

کل رات ہم نے آٹھ بجے سے دس بجے تک بس کا انتظار کیا تھا۔ میں تو مدھم سی روشنی میں بھی لکھنے بیٹھ گیا تھا جبکہ دوسرے لوگ جگہ کے لیے ایک دوسرے سے مسلسل الجھ رہے تھے۔ اس وقت گیارہ بجے چکے تھے۔ ہم کس قدر خوش تھے۔ ایک جگہ تو پہنچ کر میں نے [illegible] تھا کہ جیسے ہم واپس جدہ کے مرکز میں آ گئے ہیں۔

ہماری بس یہاں محصول چونگی ادا کرنے رکی تھی اور ہمیں بھی گنا گیا تھا۔ اب ہم مکہ کی سمت جانے والی سڑک پر تھے۔ اس وقت ٹھیک سوا بارہ بجے تھے۔ میں نے ایک بجے سے پہلے ہی اپنے آپ کو کمبل میں لپیٹا اور خراٹے لینے لگا تھا۔ میری آنکھ تین بجے اس وقت اچانک کھل گئی تھی جب بس میں کوئی فنی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ ہم جب بدر نامی گاؤں پہنچے تو صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ بس یہاں تو صرف دس منٹ کے لیے رکی تھی کیونکہ ڈرائیور زیادہ دیر کے بغیر آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ بس بار بار کسی نہ کسی خرابی کی وجہ سے تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد رک جاتی تھی۔ ہمارے گروپ میں تین ڈرائیور تھے، ان سب نے مدد کی پیشکش کی جو بس ڈرائیور نے مسترد کر دی تھی۔ اس سے ڈرائیور کی عربوں والی ہٹ دھرمی ظاہر ہوتی تھی۔ گاڑی کا کوربوریٹر صحیح کام نہیں کر رہا تھا۔ سب لوگ ڈرائیور کے ہاتھوں تنگ تھے، عورتیں بطور خاص شکایت کرنے لگتی تھیں۔ پاس سے گزرتی ہوئی دوسری گاڑیاں رک جاتی تھیں اور اظہار ہمدردی کرنے لگی تھیں۔ مگر ڈرائیور کسی کی سنتا ہی کب تھا۔ شاید ڈرائیور کو ڈر تھا کہ کسی نے اس کی مدد کر دی اور اس بارے میں بس مالکان تک بات پہنچ گئی تو اس کی تنخواہ میں سے کچھ پیسے کٹ جائیں گے۔ ہم جب بدر سے باہر نکلے اس وقت 6:30 بج گئے تھے۔ ہم نے منہ ہاتھ دھویا، وضو کیا، نماز ادا کی اور چائے بھی پی لی تھی۔ بس کی مرمت ہو چکی تھی اور اب کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ ہمیں اب مدینے تک کہیں رکنا نہ پڑا تھا۔ تاہم میرے چچا بدستور شکایت کرتے رہے تھے۔

اس وقت دوپہر ہے اور ہمارے گروپ میں سے کسی کی زبان پر حرف شکایت نہیں ہے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ سعودی افسر کسی بھی بس کو صبح نو بجے کے بعد دھوپ میں سفر کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ انہیں غروب آفتاب تک انتظار کرنا ہوتا ہے جس سے ایک نظام کے رواج پانے کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر یہ بسوں کی وجہ سے اکثر ہوتا ہے جو گرمی میں زیادہ گرم ہو جاتی ہیں اور کمپنی کا نقصان ہو جاتا ہے۔ جس گھر میں ہم رہائش پذیر ہیں یہ بہت عمدہ تعمیر ہوا ہے اور تعمیر بھی حال ہی میں ہوا ہے۔ یہ شہر سے باہر کھجوروں کے باغات کے قریب ہے۔ شمالی کھڑکی سے آپ باہر دیکھیں تو آپ کو بقیع قبرستان کا مرکزی حصہ نظر آ جائے گا ہمارے لیے پانی ٹینکر میں آتا ہے۔ نصف مربع میٹر کی قیمت ایک ریال پڑتی ہے۔

اتوار، 12۔ اپریل: آج تو میں گھر سے باہر بالکل نہیں نکلا۔ صبح کے وقت میں 8 بجے سے گیارہ بجے تک سویا رہا۔ میں دراصل دو تین دنوں میں جو نیند کم کی تھی، اس کی کمی پوری کر رہا تھا۔ نیند کے مارے میرا برا حال تھا اور رات کو میری حالت یہ تھی کہ کوئی مجھ سے کچھ کہتا تو میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں توجہ

ہی مرکوز نہ کرسکتا تھا۔آج بھی صبح کے وقت میری یہی حالت تھی۔ میں پانی کم پینے کی کوشش کرر ہاہوں۔گرمی اس قدر زیادہ ہے کہ آپ جتنا پانی بھی پی لیں پسینہ بن کر نکل جاتا ہے۔ جب پانی سیر ہو کر پی لیا جائے اور پسینہ آ جائے تو لطف آتا ہے، دراصل اس سے گردے صاف ہو جاتے ہیں۔معاف کیجیے میں پھر اپنی رام کہانی لے بیٹھا۔گذشتہ رات میں صبح کے چار بجے تک نہ سو سکا تھا۔اس دوران حجاج کا ایک اور گروپ آ گیا تھا جس کی وجہ سے گھر میں شور شرابا رہا۔انہوں نے تمام روشنیاں جلادی تھیں۔جس سے ہم لوگ جاگ گئے تھے۔ہم نے وضو کیا اور مسجد نبوی کی طرف چل دیئے تھے۔اس عرصے میں فجر کی نمازوں کے قضا ہو جانے کا سب سے بڑا نقصان ایک اور بھی تھا کہ صبح کی خنکی اور دن بھر مستعد رہنے سے انسان محروم رہ جاتا تھا۔صبح کو جلدی بیدار ہونے کا مطلب یہ تھا کہ آپ اندھیرے سے روشنی کو نمودار ہوتے دیکھ سکتے تھے،سناٹے کو حرکت میں بدلتے دیکھنے کا موقعہ ملتا تھا۔میں صبح جلدی بیدار ہو جانے کے بعد اس قدر اچھے موڈ میں تھا کہ سب کی خیریت معلوم کر رہا تھا،سب کو''السلام علیکم'' کہہ کر اس کی خیریت دریافت کرنے کو جی چاہتا تھا۔میری نماز میں ریا یا دکھاوے کا ذرہ برابر شائبہ نہ تھا۔ مجھے تمام دعائیں یاد آئیں اور میں قرآن پاک کی بہت سی مختصر اور طویل آیات تلاوت کرسکتا ہوں جو میں نے ان دنوں یاد کی تھیں جب میں چھوٹا سا بچہ تھا۔تاہم عربی الفاظ میری زبان پر ذرا مشکل سے آتے ہیں اور میں تیزی اور روانی کے ساتھ انہیں صحیح تلفظ کے ساتھ ادا نہیں کر سکتا۔صبح کے وقت جب میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا اس وقت آپ کا روضۂ مبارک میری نظروں کے سامنے تھا۔حجاج روضہ مبارک کو بوسہ دینے اور چومنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔پولیس کو کوشش تھی کہ انہیں اس سے باز رکھے۔میں نے رونا شروع کر دیا تھا اور اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور مسجد نبوی سے بھاگ کر باہر آ گیا تھا۔

ہم جس گھر میں مقیم رہے یہ نیا تعمیر ہوا ہے اور اینٹوں اور سیمنٹ سے تعمیر ہوا ہے۔مکان کا صرف نچلا حصہ مکمل ہوا ہے ابھی اس کی دوسری منزل اور تیسری منزل کا نصف حصہ زیر تعمیر تھا۔بجلی کی تاریں نامکمل حصے کی دیواروں کے ساتھ لٹک رہی تھیں۔پانی کا بھی انتظام باقی تھا۔جو پانی پہلی منزل پر دستیاب تھا وہ بھی ناکافی ہوتا تھا اور صبح وشام حجاج واویلا کرتے تھے۔کل جس وقت میں غسل کر رہا تھا میرے ساتھیوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔کیونکہ پانی ان کے سامان کے نیچے پہنچ گیا تھا۔ایک جیسے یہاں تین مکانات ہیں جن کا مالک ابی سینیا کا سید عمر نامی شخص ہے (جو سیاہ فام نہیں) ان میں سے دو کو تو ایرانی معلمین نے سات سات سو ریال

کرائے پر حج کے دنوں کے لیے دے دیا ہے۔ تیسرا البتہ ابھی کرائے پر نہیں لگا۔

آج صبح ایک سیاہ فام نوجوان ہمارے گائیڈ کو ملنے آیا تھا۔ وہ میرے اس مرحوم بھائی کو جانتا تھا جس کا تیرہ سال قبل مدینہ طیبہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ ایرانی سکالر مرحوم آیت اللہ محمد حسین بروجردی کا یہاں کے لیے نمائندہ رہ چکا تھا۔ یہ نوجوان ملازمت کی تلاش میں تھا اور نائب حج کے طور پر کام کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ نائب حج کون ہوتا ہے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ اس علاقے میں کسی حاجی کو معاوضے پر کسی کے والد یا والدہ کی طرف سے یا کسی رشتہ دار کی طرف سے مدینے سے مکے تک کا سفر طے کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ مناسکِ حج کا مشاہدہ کر سکے۔ میں نے پوچھا کہ اسے معاوضہ کیا دیا جاتا ہے۔ اس نوجوان نے خود بتایا کہ معاوضہ تو پانچ سو ریال ہے لیکن اسے اگر اڑھائی سو ریال بھی مل جائے تو وہ قبول کر لے گا۔ مجھے یاد آیا کہ پچھلے روز اس بارے میں وعظ کے اختتام پر ہمارے مبلغ نے اچھی رائے دی تھی کہ ''اگر ہمارے ماں باپ مذہبی رسوم کی ادائیگی نہ کر سکتے ہوں تو یہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو بہت تھوڑے سے پیسوں کے عوض یہ فریضہ تمہارے ماں باپ کی جگہ ادا کرنے کو تیار ہیں۔'' یہ سُن کر پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ شاید یہ واعظ اپنا پیٹ بھرنا چاہتا ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ مدینہ کی شیعہ برادری میں یہ کاروبار ہے۔ میرا بھائی ان کا ایجنٹ تھا اور اس نے یہ کام صرف دو برس تک کیا تھا۔ اسے وفات پر اسی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ میں کل جا کر اس کی قبر تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہمارے گروپ کے اس مبلغ کا تعلق ہمدان سے ہے۔ ایران میں سیاسی وجوہ کی بنا پر اُسے تبلیغ کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ میں اسے منگل کی رات اس کے والد کے گھر میں ملا تھا جہاں وہ اہل تشیعہ کے ایک اجتماع میں آیا تھا۔

جمعرات، 14۔ اپریل: ہمارا ریٹائرڈ پولیس افسر ایک دہشت بن گیا ہے۔ پچھلے چند روز وہ دھوپ میں اس قدر ادھر ادھر دوڑا ہے کہ لگتا ہے وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ ہم اس پر برابر دباؤ ڈالتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے شہر والے کپڑے اور ٹائی اتار کر عربی چغہ پہن لے مگر وہ ہماری کم ہی سنتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایسا کرے بھی تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ ہر وقت وہ اپنے آپ کو اس قدر ہوشیار باش رکھتا ہے کہ جیسے کسی انتظامی ڈیوٹی پر ہو۔ وہ شخص جو کبھی کسی اونچی دیواروں والے گھر میں رہتا تھا اور جس کی زندگی جیل خانہ جات میں فرائض منصبی ادا کرنے میں گزری تھی۔ اب ایک خیمے میں رہتا ہے جس کی نہ دیواریں ہیں نہ دروازے۔ اس کے ایک ساتھی نے ہمیں بتایا کہ ایک عورت کا کہنا ہے کہ اس کی بیوی نے تہران میں اسے بتایا

تھا کہ اگر کبھی ایسا کرنے کا کوئی جواز پیدا ہو جائے تو یہ فوراً پورا معاملہ چھوڑ دے اور گھر چلا جائے۔ لگتا ہے کہ ہمیں اس بارے میں نئی پیشرفت کی توقع رکھنی چاہیے۔

ان چار پانچ مبلغین اور مولویوں کے درمیان ہمارے گروپ میں ایک سیّد ہے جس کا تعلق بروجرد (ایران) سے ہے۔ وہ ایران میں تعمیر ہونے والی مسجد کے لیے معاونین اور مددگاروں کی تلاش میں رہتا ہے۔ تاہم مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہے۔ اسے چار پانچ تاجروں کا تعاون حاصل ہو گیا ہے، یہ لوگ ہر روز کمرے میں باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ وہ ہم سے بھی دو تین بار یہ کہہ چکے ہیں کہ ہم بھی ان کے ساتھ نماز کیوں ادا نہیں کرتے۔ محدث کسی کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا، رہا میرا چچا تو وہ بھی نہیں مانے گا اور جاوید بھی مجھے نہیں یقین کہ رضامند ہو گا۔ میں ہی پورے خاندان میں ایک واحد شخص رہ جاتا ہوں۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سجدے میں پانچ منٹ اضافی لگا دیئے جائیں تو انسان اللہ کے تخت سے تین میل قریب آ جاتا ہے۔ وہ بار بار مجھے تاکید کرتا رہتا ہے کہ میں نماز مغرب کے بعد گاؤں والوں سے اس کی گفتگو سنا کروں۔ میں گذشتہ شب بالآخر چلا ہی گیا تھا۔ اس کی گفتگو کے موضوعات تھے: شکوک و شبہات، غُسل، تطہیر اور نجاست۔ میں یہ سن کر پیٹ میں مروڑ محسوس کر رہا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی بتلانے والی باتیں تھیں؟۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مولوی مذہب کو کب تک لوٹے کے دستے سے باندھے رکھیں گے اور دین کا یہ دائرہ کب تک صفائی اور گندگی کے درمیان تک محدود رہے گا۔ ان لوگوں کو اپنا اصل مذہبی فریضہ کیوں فراموش ہو جاتا ہے۔ آپ جب کبھی بھی اس کے قریب جائیں وہ آپ کو مونچھوں کے موضوع پر لیکچر دینے سے باز نہیں آتا۔ اس سے بھی بدتر ہمارے درمیان ایک کرائے کا نوحہ خواں یا نوحہ گر ہے جو پٹڑی سے اتر جاتا ہے۔ اسے عادت ہے کہ وہ آپ سے یہ سوال ضرور کرے گا: ''آپ اپنے آپ کو سر اور کندھوں کے قریب نہیں پیٹتے؟'' یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے آپ کسی سے پوچھیں: ''تم چھت سے چھلانگ کیوں نہیں لگاتے؟'' جب میں واقعہ کربلا پر بولتا ہوں تو ہمارے درمیان موجود اس مبلّغ کی تعریف کی جانی چاہیے جو تاریخ اور حدیث کی روشنی میں تقریر کرتا ہے اور دلیل و منطق کی بنیاد پر گفتگو کرتا ہے۔ اس نے ایک روز تاریخ کی روشنی میں بتایا کہ کعبہ کب تعمیر ہوا تھا اور مناسک حج کیوں کر تعین ہوئے تھے۔ یہ بھی مناسب ہوگا اگر وہ کسی روز میدانِ کربلا کی تفصیلات سے بھی سامعین کو آگاہ کر دیتا ہے۔ وہ لوگوں کی آنکھوں کو پُرنم کر دیتا ہے مگر المیہ کربلا اور شہادت کی تصویر کشی نہیں کرتا۔ اس کی باتیں اثر کرتی ہیں اس کا اپنا دل دونیم ہو چکا ہے، میں بتا چکا ہوں کیوں......

اسی روز بعد دوپہر: ریٹائر پولیس افسر ٹھیک نہیں کر رہا۔ ہم نے اس کے سر پر برف کا ڈلا رکھ کر اسے لیٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرے خیال میں اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو خلوت پسند ہوتے ہیں۔ اور اب اس گروپ کے درمیان اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کیا کرے۔ اس سفر کے دوران اگر آپ آداب مجلس کے چکر میں پھنس گئے تو آپ کے لئے وقت گزارنا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ ہم نے بعد از کوشش بسیار اس کے جسم سے آج سردیوں میں استعمال ہونے والا گرم کوٹ اتروا دیا ہے۔ مگر مجھے یہ بالکل امید نہیں کہ وہ سفر کے اختتام تک اسے دوبارہ نہیں پہنے گا۔ اس کے علاوہ ہمارے چچا کا فشارِ خون بڑھ گیا ہے جو 200 ایم ایم تک پہنچ گیا ہے۔ ایک میں ہوں کہ مجھے اب تک یہ نمبر معلوم نہیں ہیں کہ بلڈ پریشر زیادہ کب کہلاتا ہے اور کم کس وقت۔ اس کا بھتیجا جو جاوید کا بھائی بھی ہے ہمارے چھوٹے شفاخانے کے عملے کا رکن ہے۔ آج وہ اسے شفاخانے لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے پوچھا: ''تم کیوں آئے ہو؟'' اب وہ کچھ بے چین سا ہو گیا ہے یہاں تک کہ اسے کھانا بھی اچھا نہیں لگتا وہ چل پھر نہیں سکتا مگر ہم ہر وقت اس کے لیے آہستہ بھی تو نہیں چل سکتے......

جاوید نے آج اپنے قالین 370 سعودی ریال میں فروخت کر دیئے ہیں۔ وہ بہت خوش تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اسے 150 تمان منافع ہوا تھا۔ یہ قالین سستے سے تھے اور روزمرہ استعمال والے تھے۔ میں جب اپنے بارے میں سوچتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ میں اس گروپ میں سب سے زیادہ غریب ہوں۔ میں نے ان ردی کتابوں سے ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر پیسے کمائے تھے اور چار پانچ سو تمان کے ساتھ حج پر چل پڑا تھا۔ یقیناً حج کے لیے یہ بہت کم خرچ تھا۔

اس گھر میں ہماری صورت حال یہ ہے کہ آپ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم سفر پر یا ایک خاص قسم کے سفر پر آئے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس ایک کمرہ نمازوں کے لیے ہے، ایک نوحہ خوانی کے لیے ایک کمرہ خواتین کے لیے مخصوص ہے جہاں بیٹھ کر وہ آپس میں بات چیت کرتی ہیں اور یہ سلسلہ باقاعدگی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ ہم نے ایک کمرہ بیماروں کے لیے الگ کر رکھا ہے۔ میں ریٹائرڈ پولیس افسر (میجر) کی بیمار پرسی کے لیے گیا تھا۔ میں نے دو اور افراد کو کمرے کے دوسرے حصے میں سویا ہوا دیکھا۔ ان میں سے ایک اسہال اور دوسرا سردی لگ جانے سے بیمار ہوا تھا۔ میری بہن کا کہنا تھا کہ اسے لُو لگ گئی ہے۔ میرے سامان میں وٹامن سی تھی جو میں اس مریض کے لیے لے گیا تھا۔ میں نے جب اسے یہ دی تو اس نے کہا کہ وہ سمجھا تھا

شاید یہ تو اس کے اپنے پاس بھی تھی اور ایسا ہی تھا، یہ اس کے پاس بھی موجود تھی۔ ہم دونوں نے اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ وہ رات سے پہلے دو گولیاں چوس لے تا کہ ٹھیک ہو جائے۔ مگر اس کے بعد میری اپنی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میرے سر میں دو پہر سے درد تھا۔ سفر کے اختتام تک ہجوم کے درمیان تنہا رہنا ناممکن تھا۔ ہم مطمئن تھے کہ کم از کم ہمارے خاندان کے سب لوگ اب تک ہر بیماری سے محفوظ تھے (گو میں اب ٹھیک محسوس نہیں کر رہا تھا)۔ لوگوں کے درمیان رہنا آسان ہے لیکن ان کا حصہ نہیں بننا چاہیے۔ اس لیے تک میں گروپ کے سائے میں رہ رہا تھا۔ گروپ کے سارے لوگ امیر اور باصلاحیت ہیں۔ مگر وہ تجربے کی دولت کے لحاظ سے بہت غریب ہیں جو بے حد خوفزدہ کرنے والی بات ہے۔ انہوں نے اس قدر غربت میں زندگی گزاری ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں کوئی تبدیلی آ جائے تو وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں وقتاً فوقتاً ان کو متحرک کرتا رہتا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس طرح کے گروپ میں تو احساس تنہائی بڑھ جاتا ہے۔

بُدھ رات، 15۔ اپریل: ایسا لگتا ہے کہ ہم جمعہ کے روز مکہ کے لیے روانہ ہو سکیں گے۔ جب ہم سب نے احرام باندھ رکھے ہوں گے۔ آج احمد ہماری تلاش میں آیا تھا، وہ کسی زمانے میں میرے بھائی کا ایجنٹ یا مقامی گائیڈ رہ چکا تھا۔ وہ میرے بھائی کی تجہیز و تکفین تک اس کے ساتھ رہا تھا۔ وہ پچاس برس کا ایک سیاہ فام، دراز قد، تندرست و توانا مسخرہ ہے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ میرے بھائی کی موت کیسے واقع ہوئی تھی۔ ایک رات وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا واپس آیا تو اگلی صبح اس کی بیوی نے اسے وہاں بھیجا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرے بھتیجے نے اسے جاوید کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا۔ وہ اسے لنچ پر ساتھ لے آیا تھا۔ ہم جب کھانا کھانے بیٹھے تو میں نے دیکھا کہ وہ کھانے میں شریک نہ تھا۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ وہ ایک لقمہ تک نہیں لے گا جب تک ہم اس سے یہ وعدہ نہیں کرتے کہ اگلی صبح ہم اس کے ساتھ لنچ کریں گے۔ یہ عربوں کے ہاں کی ایک روایت تھی۔ ہم نے وعدہ کیا کہ ہم ضرور آئیں گے۔ تاہم اس کے آنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ بطور نائب حج اپنے لیے گاہک تلاش کر رہا تھا، وہ پرانے شناساؤں کو ڈھونڈنے نہیں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم اسے اپنے گائیڈ اور دوسرے حجاج سے متعارف کرا دیں گے۔ جاوید نے بتایا کہ وہ تین سو تمان قبول کرنے پر راضی ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ مدینہ کی آبادی ساٹھ ہزار ہے۔ اس کی تین آئس کی کمپنیاں ہیں جن میں سے دو تو ان باغات میں تھیں جہاں میں گیا تھا......

میں مدینے کے علاقے میں ایک باغ کی تلاش میں تھا، جو یہاں سے مشرق میں ہو جہاں ہم رہائش پذیر تھے تاکہ میں وہاں واٹر پمپ پر جا کر نہا سکوں۔ ایک ریال کا بل ہاتھ میں لیے میں نے ایک دروازے پر دستک دی۔ ایک نوجوان باہر نکلا جس نے نکر پہن رکھی تھی اور اس کے ہاتھ میں لوٹا تھا۔

''السلام علیکم! میں نہانے آیا ہوں''۔ وہ مسکرایا اور جواب دیا: ''اندر آ جایئے''۔ میں نے ایک ریال کا بل بڑھایا مگر اس نے یہ نہیں لیا۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شیعہ ہے وہ تھوڑی بہت فارسی بھی جانتا تھا۔ وہ روضۂ مبارک پر رہنے والے دیگر لوگوں کی طرح تمام غیر ملکی زبانوں کے کچھ الفاظ جانتا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ وہ میرے بھائی کو جانتا ہے۔ اس نے میرے بھائی کے بیٹے (میرے بھتیجے) کے بارے میں پوچھا۔ دونوں کی عمر ایک جتنی تھی، ہو سکتا ہے دونوں مل کر کھیلتے رہے ہوں اس کا نام عباس تھا۔ پھر اس نے مجھے وہ تنصیبات دکھائیں جو کنویں سے پانی لاتی تھیں۔ میں نے اس سے اجازت لے کر صابن استعمال کرنا چاہا تھا تاکہ جسم کو اچھی طرح صاف کر سکوں۔ باغ کے اندر لگے ہوئے کھجوروں کے درخت ابھی چھوٹی عمر کے تھے اور ان کے نیچے نیاز بو اور ایک خوشبودار جھاڑی اگائی گئی تھی۔ صابن والا پانی ایک نالی کے راستے گٹر میں گر جاتا تھا۔ اس باغ میں انار کے درخت بھی لگائے گئے تھے۔

پمپ مسلسل چلتا رہتا تھا اور پانی بلا کسی رکاوٹ کے جاری رہتا تھا۔ چار انچ پانی میں مجھے لگتا تھا جیسے میں سمندر میں غوطہ زن تھا۔ باہر آ کر میں غروب آفتاب تک باغات میں رہا یہاں تک کہ مسجد نبوی کے میناروں سے مغرب کی اذان بلند ہوئی۔

جمعرات، 16۔ اپریل: میں صبح کو چھ بج کر تیس منٹ پر روانہ ہو گیا تھا۔ میرے پاؤں کے آبلے بالآخر ٹھیک ہو گئے تھے۔ میں نے چائے کے ساتھ ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے کھائے۔ میں ٹی روم میں نچلی منزل پر بیٹھا تھا کہ ہمارا گائیڈ بھی میرے ساتھ آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ریٹائر پولیس میجر کے بارے میں یقین سے یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بیچارا تو پاگل ہو گیا ہے۔ مگر اس نے ذاتی طور پر اسے بالکل ٹھیک دیکھا تھا، جب وہ اچانک وہاں پہنچ کر اس کے ساتھ کھیلتا رہا تھا۔ پھر پتا چلا کہ اس نے کل نیچے ایک کمرے میں اپنے آپ کو بند کر لیا تھا، جو سٹور تھا اور وہیں ایسا ہو گیا تھا۔ اس رات وہ حج نگران کی تلاش میں وہاں گیا تھا تاکہ اسے یہ کہہ سکے کہ اسے واپس بھیج دیا جائے۔ میں نے سوچا وہ شاید میرا مشورہ لینا چاہتا تھا مگر اس نے انتظار نہیں کیا تھا۔ پھر گائیڈ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ پولیس میجر جب واپس آیا تو وہ پلیٹیں توڑ رہا تھا، چاول زمین پر پھینک

دیئے تھے، دروازہ پر پیشاب کر دیا تھا۔ یہ دیکھ کر لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے تھے اور اسے جکڑ لیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ان لوگوں نے باندھ دیئے تھے اور اسی روز اس کا معاملہ پولیس کو بھیج دیا تھا۔ پولیس نے وہاں پہنچ کر اسے حراست میں لے لیا تھا اور پھر اسے ایک عارضی جیل میں ڈال دیا گیا تھا (جہاں ہم سوتے ہیں اس کمرے کی چھت پر ہمیں کچھ کھلبلی سنائی تو دی تھی مگر ہم نے اس پر توجہ نہ دی)۔ گائیڈ اسے لینے جیل گیا تھا تا کہ اسے اسی رات جدہ بھیج دیا جائے۔ جہاں سے اسے تہران بھجوانے کا انتظام کیا جا سکے۔ اس نے فخریہ انداز میں کہا کہ اس نے 250 سعودی ریال میں ٹیکسی کا انتظام کر لیا تھا اور اپنا ایک ملازم اس کے ہمراہ جدہ بھیج دیا تھا۔ میں نے اس سے کہا ایسا لگتا ہے آپ لوگ بہت جلد بازی سے کام لیتے رہے ہیں اور سخت مزاج بھی تھے اور اس سے بھی پہلے آپ اپنے معاملات میں کھوجی اور متجسس بھی ہوتے ہیں۔ معلوم نے پولیس میجر کے معاملے میں جو کچھ ہمارے گائیڈ نے کیا تھا اس میں ان سب میں سے کس کا انتخاب ہوا تھا؟

''حج ایک طرح سے میدان حشر ہے جس میں کوئی بھی کسی کی پرواہ نہیں کرتا'' اس نے کہا۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس پولیس میجر جیسا ایک مخبوط الحواس دن بھر ہماری خواتین کے درمیان بلا روک ٹوک دوڑتا بھاگتا پھرے، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے کہا اب تو یہ بات ختم ہو گئی کہ وہ یہاں سے چلا گیا......

مدینہ طیبہ کے مغرب میں پہاڑ کی ڈھلوان پر آبادی ہے۔ پلاسٹک کی بنی ہوئی سبز، پیلی، سرخ اور نیلی ٹیوبیں پانی کو گلیوں کے ایک سرے سے دوسرے تک، اس گھر سے اس گھر تک لے جاتی ہیں۔ یہ کافی لمبی ہوتی تھیں، پچاس گز سے زیادہ لمبی۔ یہ رنگین سانپوں کا سا منظر پیش کرتی ہیں۔ جن گلیوں میں سے ریڑھے گزرتے تھے وہاں یہ پائپ لوہے کے لگائے جاتے تھے۔ جوں ہی میں مغرب کی طرف گیا ٹریفک معدوم ہو گئی تھی۔ میں اب ایک اور شہر سے گزر رہا تھا جس میں درخت بہت تھے، کھجوروں کے درخت اور اناروں کے درخت۔ کھجوروں کے درختوں کی عمر کم تھی۔ انہیں مدینے میں سے کاٹ کر پہاڑ کے پیچھے اُگایا گیا تھا، لیکن وہ بھی اسی شہر کا ایک حصہ تھا۔

ہمارے علم میں یہ بات آئی تھی کہ آئندہ تین برسوں میں حجاج کو مدینے سے مکے تک ٹرکوں میں لایا جائے گا۔ آج کل یہ وہ بسیں استعمال کرتے ہیں جن کی چھتیں نہیں ہوتیں، ایسا اس لیے ہے کہ حجاج اُن بسوں میں سوار ہونے سے انکار کر دیتے ہیں جن کی چھتیں ہوں، جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ حجاج کو حج کے دوران سر ننگے رکھنے کا حکم ہے اس لیے چھتوں والی بسوں میں سفر کرنا جائز نہ ہوگا۔ ہم نے لنچ کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا

اور پھر چل پڑے تھے۔ ہم مدینے کے جنوب میں مسجد قبا بھی گئے تھے۔ یہ مسجد زہد و تقویٰ کی بنیاد پر تعمیر ہوئی تھی۔ یہ کافی بڑی مسجد ہے جس کا صرف ایک مینار ہے۔ اس کے ایک طرف قبلہ رُخ ایک شبستان ہے اور باقی کو تین اطراف میں بارہ دریاں ہیں، اس کا صحن بھی کافی بڑا ہے۔ ہم مسجد نبوی کے جنوب میں سڑک کے کنارے نئے تعمیر شدہ مکانوں کے پاس سے گزرے تھے۔ نئی نئی مساجد، میناروں کے ساتھ تعمیر ہوئی ہیں۔ شہر میں نئی تعمیرات ہو رہی ہیں، نئی سڑکیں بن رہی ہیں، سڑکوں، گلیوں کو روشن کیا جا رہا ہے۔

مکہ مکرمہ سنیچر، 18۔ اپریل:

ہم صبح 4:30 مکہ پہنچ گئے تھے، ہم نے گذشتہ شب 8:30 بجے مدینہ طیبہ سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ ہم سُرخ بسوں میں سے ایک بس پر سوار تھے جس کی چھت اتری ہوئی تھی۔ مسافر بعد دوپہر 5 بجے بس میں سوار ہو گئے تھے۔ پھر لمبے انتظار کے بعد ہماری بس آٹھ بجے روانہ ہوئی تھی۔ مجھے تیسری قطار میں چچا کے ساتھ نشست ملی تھی۔ میں دو مسافروں والی سیٹ پر تیسرے شخص کے طور پر زبردستی بٹھا دیا گیا تھا۔ ڈرائیور ایک اچھا انسان تھا، بس اچھی حالت میں تھی اور ہمارے گائیڈ کا دعویٰ تھا کہ اس نے ڈرائیور کی مٹھی گرم کی تھی۔ ہم صرف رابغ کے مقام پر رک کر براہِ راست یہاں پہنچے تھے۔ ہم نے راستے میں ایک جگہ بس کی سامنے والی بتیوں کی روشنی میں وضو کیا تھا۔ ہم نے مدینے ہی میں احرام باندھ لیا تھا۔ اب ہمارا سفر جاری تھا، آسمان پر ستارے حیرت انگیز طور پر قریب نظر آتے تھے۔ ہوا کے جھونکے براہ راست ہمارے چہروں سے ٹکرا رہے تھے جن کی رفتار پچاس سے ساٹھ میل فی گھنٹہ تھی۔ ہم پورا وقت سمٹے جا رہے تھے۔ میرے ذمے اپنے چچا کی دیکھ بھال بھی تھی، وہ بوڑھے تھے اور اونگھ رہے تھے جس کی وجہ سے ڈر لگ رہا تھا کہ وہ سامنے والی نشست سے ٹکرا نہ جائیں۔ میں نے رات کبھی جاگ کر نہیں گزاری تھی۔ اس سفر کے دوران مجھے جتنی شاعری یاد تھی میں نے سب دہرا ڈالی تھی۔ یوں ایک لمحے کے لیے بھی سوئے بغیر میں نے صبح کر لی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میں تو محض ایک چھوٹا سا تنکا تھا جو میقات میں آ گیا تھا نہ کہ کوئی انسان جو مقام ملاقات پر پہنچ گیا ہو۔ مجھے وقت لامحدود دکھائی دیا تھا۔ وقت کا ایک سمندر میرے سامنے تھا اور یوں لگا جیسے میقات ہمیشہ اور ہر جگہ موجود ہوتا ہے اور صرف ذات کے ساتھ ہوتا ہے۔ مقام ملاقات وہ جگہ ہوتی ہے جہاں آپ کسی سے ملتے ہیں لیکن وقت کا میقات صرف ایک ایسی ملاقات ہوتی ہے جو اپنی ذات سے کی جاتی ہے۔ مجھے خیال گزرا کہ بایزید بُسطامی (سن وفات 874ء) نے اس کے بارے میں اس وقت کیا خوب کہا تھا جب ایک حاجی جو بیت اللہ شریف کے لیے نیشاپور کے دروازوں سے نکل رہا تھا: ''اپنا یہ روپوں سے بھرا ہوا تھیلا نیچے رکھ دو، میرے

گرد چکر لگاؤ اور گھر واپس چلے جاؤ"۔ مجھے احساس ہوا کہ سفر اپنی ذات کو جاننے کا ایک اور طریقہ ہے، اس کی قدر پیمائی کا ایک طریقہ اور اس کی حدود کو گرفت میں لینے کا اور یہ کس قدر تنگ، غیر اہم اور خالی ہے، بدلتے موسموں اور آب وہوا کی سطح زمین کو باہمی مڈبھیڑ اور انسانی تجزیے کے ذریعے ثابت کرنے میں۔

اسی روز بیت الحرام میں: ایسا لگتا ہے کہ کعبہ بھی اگلے سال فولاد اور کنکریٹ سے مل کر از سرِ نو تعمیر ہوگا جس طرح مسجد نبوی تعمیر ہوئی ہے۔ نہ صرف یہ کہ صفا و مروہ میں سعی کی جگہ کو دو منزلہ بنا دیا گیا ہے بلکہ ایک مستطیل بیرونی دو منزلہ شبستان تعمیر کرنے کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ اس کے لیے سلطنتِ عثمانیہ کے عہد میں بنایا گیا شبستان گرا دیا جائے گا۔ سعی والی جگہ کی طرف جس شبستان کا رُخ تھا اسے گرا بھی دیا گیا ہے اور ایک دو برسوں میں بقیہ حصے بھی گرا دیئے جائیں گے۔ اس طرح موجودہ تعداد کی جگہ چار گنا زیادہ تعداد میں حجاج کے طواف کے لیے یہاں جگہ فراہم کر دی جائے گی جو کنکریٹ کے ستونوں کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ پرانے شبستان میں سے جو حصہ باقی رہ جائے گا وہ صرف دو تین مینار ہوں گے۔ کعبہ کے گرد طواف کے لیے جو جگہ تھی وہاں سنگ مرمر لگا دیا گیا ہے اور شبستان کے ڈھکے ہوئے حصے میں بھی سنگ مرمر لگ گیا ہے۔ طواف میں مصروف لوگوں کی نسبت سعی کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ جوں ہی دن کی گرمی میں اضافہ ہوتا ہے طواف کرنے والوں کی تعداد گھٹ جاتی ہے۔ (میں اس وقت بیرونی شبستان کے اوپر والے حصے میں بیٹھ کر یہ سطور لکھ رہا ہوں) یہاں سے مجھے خانہ کعبہ اپنے اس حجم سے نصف دکھائی دے رہا ہے جو میرے تصور میں ہوا کرتا تھا۔ وہ انجینئر جس نے یہ بیرونی شبستان بنایا ہوگا وہ غالباً اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ جب کسی عمارت کا کوئی حصہ گرا کر نیا بنایا جاتا ہے تو طرزِ تعمیر میں بھی تبدیلی کر دی جاتی ہے۔ کعبہ خود تو اسی سائز کا ہے لیکن اس کے باہر کی غلام گردش دوگنی چوڑی ہوگئی ہے اور اس کی اونچائی بھی دوگنی چوڑی ہوگئی ہے اور اس کی اونچائی بھی دوگنی ہوگئی ہے۔ خانہ کعبہ کو گرا کر اس کی جگہ نیا خانہ کعبہ تعمیر کرنا کیسا رہے گا؟ یقیناً اس کنکریٹ کے باہر باہر سے جو اسے ایک قوت دیئے ہوئے ہے۔ اتنے میں ایک دراز قد حاجی جس کے ہاتھ میں چھتری تھی میرے قریب سے گزرا اور مجھ سے یوں مخاطب ہوا: "حاجی صاحب! اپنی کتاب میں میرا ذکر بھی کر دینا، میں مشہد کا قندھاری ہوں"۔

اس کی بات میں گو طنز شامل تھا مگر پھر بھی میں نے اس سے بیٹھنے کو کہا۔ اس قسم کی باتوں کو تحریر میں لانا کوئی اچھے ذوق کی بات نہیں ہوتی۔ میں نے دو تین اور لوگوں کو بھی دیکھا تھا جن کے ہاتھ میں کاغذ قلم تھا اور

وہ کچھ لکھ رہے تھے۔ مگر میں نے سوچا کہ مجھے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر شاید اپنی کتاب کا مواد تحریر میں نہیں لا چاہیے۔

مکہ مکرمہ کے گرد یروشلم سے کہیں زیادہ پہاڑ ہیں۔ اس شہر کی تعمیر میں پتھر زیادہ استعمال ہوا ہے، جس میں چقماق زیادہ شامل ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ قبل از اسلام کے عرب اللہ کے گھر میں بت لے آئے تھے۔ بیت الحرام پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ پہاڑوں کے اوپر گھر تعمیر کیے گئے ہیں اور گلیاں اوپر تک جاتی ہیں۔ گلیوں میں نیون اشارے لگے ہوئے ہیں اور نیم فلک بوس عمارتیں ان گلیوں میں تعمیر کی گئی ہیں۔ گیراج اور موٹل بھی بہت ہیں، دُکانیں بہت زیادہ ہیں۔ بیت اللہ کے اردگرد کی ہر شے ہٹا کر ایک چوکور علاقہ زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں تاہم یہ کام ابھی مکمل نہیں ہوا۔ کوڑا کرکٹ بھی ادھر ادھر ڈھیروں کی شکل میں نظر آتا ہے۔ حجاج کا گزر زیرِ تعمیر حصے کے درمیان سے جاری رہتا ہے۔ اس شہر میں کوئی عمارت تعمیر کرنے کے لیے بنیادیں کھودنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ عمارت خواہ کتنی ہی بلند و بالا تعمیر کیوں نہ کی جارہی ہو اسے قدرتی پتھر کی بنیاد میسر آجائے گی جہاں سے اسے اوپر اٹھایا جاسکتا ہے۔ سوائے شہر کے مرکز کے جہاں نشیبی حصہ پایا جاتا ہے اور جہاں بیت الحرام واقع ہے۔ یہاں نئے شبستان کے لیے بنیادیں گہری کھودنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے ساتھ ساتھ کنکریٹ کی قوت بخشنے والی سلیں بھی موجود ہیں۔ لکڑی اور لوہے کے استعمال سے بیت الحرام کا پورا مشرقی حصہ شہر سے ملادیا گیا ہے۔

وہی سینچر کا دن، مکہ مکرمہ میں: صفا و مروہ کے درمیان سعی آپ کو 14 سو سال پیچھے لے جاتی ہے اور دس ہزار سال آگے۔ آپ کے سلیپر اگر پاؤں سے نکل گئے تو واپس جاتے ہوئے آپ کو بہت سے ایسے سلیپر پاؤں تلے آتے ملیں گے جو دوسرے لوگوں کے گم گئے تھے۔ معمر، کمزور اور بیمار پہیوں والی کرسیوں پر سوار سعی میں مصروف تھے، کچھ ڈولیوں میں سوار تھے، ایک آگے اور ایک پیچھے، یعنی ایک میں دو دو حجاج۔ یوں حجاج کے مجمع میں یہ بھی مناسک حج کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ کیا یہ اس اجتماع کی آخری منزل تھی؟ کیا یہ سفر ان کا آخری سفر تھا؟ غالباً دس یا بیس ہزار لوگ بیک وقت ایک ہی رسم ادا کر رہے تھے۔ خود فراموشی میں ڈوبے ہوئے ان افراد کے درمیان کیا آپ اپنے ہوش و حواس کو کام میں لا کر اس بارے میں کچھ سوچ سکتے ہیں؟ کیا آپ ایک فرد کی حیثیت سے کام کر سکتے ہیں؟ ہجوم آپ کو دھکیل کر آگے لے جائے گا۔ کیا کبھی آپ اس سے قبل ایسے ہجوم کے درمیان گھر گئے تھے جو خوفزدہ سا لگ رہا ہو؟ یہ خوفزدہ لوگوں کی خود فراموشی تھی، بے

مقصد گھومنا اور بھاگ جانے کے لیے پناہ ڈھونڈنا تھا۔ ایسے جم غفیر میں انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ واقعی ایک فرد کون ہے، کسے یہاں انفرادی حیثیت حاصل ہے آپ بتا سکتے ہیں؟ میں تو کم از کم نہ بتا سکوں گا اور دو ہزار اور دس ہزار میں فرق کیا ہے؟

ہر یمنی پر جب میری نظر پڑتی ہے تو وہ میلا کچیلا، بکھرے ہوئے بالوں اور اندر دھنسی ہوئی آنکھوں والا دکھائی دیتا ہے۔ جس نے کمر کے گرد رسی باندھ رکھی ہے وہ دیکھنے میں چھمہ دینے والا پادری جان نظر آتا ہے جو ابھی ابھی قبر سے نکل کر آیا ہو۔ سیاہ فام لوگ، دراز قد کے، بھاری جسموں والے پوری طاقت کے ساتھ حرکت میں تھے۔ ایک عورت نے جوتے بغل میں دے رکھے تھے اور یوں زار و قطار رو رہی تھی جیسے کوئی صحرا میں راستہ بھول گیا ہو۔ یہ سب لوگ جیسے بھی ہیں کم از کم یہ ایسے لگتے نہیں کہ جن کی مدد کو کوئی انسان جانے پر آمادہ ہو جائے۔ ایک مسکراتا ہوا نوجوان کسی سے ٹکرا کر آگے نکل جاتا ہے جیسے کوئی پاگل کسی پاگلوں کے بازار سے گزر جاتا ہے۔ ایک ضعیف اور کمزور و ناتواں شخص چلنے سے قاصر لوگوں کے دھکوں میں آ کر توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ میں نے سوچا میں اسے لوگوں کے اس ہجوم میں پاؤں تلے آ کر کچلا ہوا نہ دیکھ سکوں گا۔ میں بھاگ کر اس کا ہاتھ تھام لیتا ہوں اور اسے ہجوم کے اس ریلے سے نکال کر ایک طرف لے جاتا ہوں۔ مجھے خواتین کا ایک چھوٹا سا گروپ نظر آیا (12 سے 15 خواتین) انہوں نے سفید احرام پر مشتمل لباس پہن رکھا تھا۔ ان کی گردنوں کے پچھلے حصے میں بنفشی پھولوں کے ڈیزائن بنے ہوئے تھے۔ ہر ایک نے ایک دوسرے کے احرام کو کمر سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ طواف کے لیے ایک ہی قطار میں جا رہی تھیں۔

آپ کو سعی کے مقام پر خود فراموشی کا انتہائی مظاہرہ دکھائی دے گا۔ یمنی وہاں پہنچ کر ہر بار چھلانگ لگا کر آگے بڑھتے ہیں، پھر وہ کعبہ کو سلام کرتے ہیں اور نئے سرے سے سعی شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ میں تو ایسا نہیں کر سکتا۔ میں چیختا ہوا وہاں سے دوڑ پڑا۔ مجھے بایزید بسطامی یاد آئے کہ وہ اس ہجوم میں نہ آ کر کیوں ایک غلطی کر رہے تھے۔ طواف کے دوران بھی یہ حالت نہیں ہوتی، نہ یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ خانہ کعبہ کے دوران تو آپ ہجوم کے درمیان حجاج کے کندھے سے کندھا ملائے چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی سمت جا رہے ہوتے ہیں اور آپ انفرادی اور اجتماعی طور پر چکر لگاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا ایک مقصد ہوتا ہے اور آپ ایک نظام کی پابندی کرتے ہیں۔ آپ ایک مرکز کے گرد چکر لگاتے ہوئے ایک ذرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گویا یوں آپ دوسروں کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں ان سے الگ نہیں ہوتے۔ آپ کا

ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا تو ضرور ملا ہوا ہوتا ہے لیکن آپ ایک دوسرے کے روبرو تو نہیں ہوتے جہاں چہرہ، چہرے کے بالمقابل ہو۔ آپ کو گردش میں رواں لوگوں کے جسموں کی تیز حرکت میں بے غرضی نظر آتی ہے یا اس میں جو آپ ان کی زبانی سن رہے ہوتے ہیں۔ جبکہ سعی کے دوران آپ حضرت حاجرہؑ کی طرح آ جا رہے ہوتے ہیں جو آپ کر رہے ہوتے ہیں اس میں کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اس آنے جانے میں جو چیز پریشان کرتی ہے وہ نظروں کا نظروں سے مسلسل ملنا ہے۔ سعی کے دوران ایک حاجی کی دو ٹانگیں اسے دوڑنے یا تیز تیز چلنے میں مدد دیتی ہیں جبکہ دو آنکھیں تو ہوتی ہیں لیکن اپنی ذات کے بغیر یا جو ذات سے آزاد ہو چکی ہوتی ہیں۔ یہ آنکھیں دراصل آنکھیں نہیں ہوتی بلکہ ایک وبے نقاب شعور و آگہی ہوتی ہے یا یوں کہہ لیں کہ یہ وہ آگہی ہوتی ہے جو آنکھوں کے اندرونی کنارے پر اس انتظار میں بیٹھی ہوتی ہے کہ اسے حکم ملے تو وہ وہاں سے اڑ جائے کیا آپ ایسی آنکھوں کو ایک لمحے سے زیادہ دیر تک دیکھ سکتے ہیں؟ اس سے قبل میرا خیال تھا صرف سورج کو بے نقاب نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا مگر آج مجھ پر یہ راز فاش ہوا کہ آنکھوں کے اس سمندر کو بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ کوئی دیکھنے کی کوشش بھی کرے گا تو لمحے دو لمحے بعد بھاگ جائے گا۔ آپ بڑی آسانی کے ساتھ یہ جان سکتے ہیں کہ آپ اس ہجوم کے اندر ایک لامحدودیت کو عدم وجودیت سے کس طرح تخلیق کر سکتے ہیں۔ ایسا صرف اسی وقت ممکن ہے جب آپ مایوسی کو چھوڑ کر اُمید اور آس پر یقین رکھتے ہوں اور آپ نے یہ کام ابھی ابھی شروع کیا ہو۔ اگر آپ اس قسم کی لامحدودیت کے پاس موجود نہیں ہیں تو یہ سمجھ لیں کہ آپ کچھ بھی نہیں ہیں۔ آپ پھر سمندر بلکہ لوگوں کے ایک سمندر کی سطح پر کوڑے کا ایک ذرہ یا ہوا میں مٹی کا ذرہ ہیں۔ اسے زیادہ صاف اور واضح طور پر بیان کرنے کے لیے مجھے احساس ہوا کہ میں متجسس ہوا جا رہا تھا۔ میں پہلے ہی کنکریٹ کے ستون سے اپنا سر پھوڑ لینا چاہتا تھا۔ مگر ایسا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب آپ آنکھیں بند کر کے سعی کریں۔

پھر یہ کپڑے کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں جو پاؤں کے نیچے بچھائے جاتے ہیں۔ پہلے ان کو آب زم زم سے گیلا کرتے ہیں اور پھر خانۂ خدا میں سنگ مرمر کے فرش پر ان کو حجاج کے پاؤں کے نیچے بچھا دیا جاتا ہے (سنگ مرمر کا فرش ابھی مکمل نہیں ہوا) ایسا اس لیے کیا جاتا ہے تا کہ حجاج کے پاؤں جلنے سے بچ جائیں اور اس کپڑے کو متبرک سمجھ کر سنبھال لیا جائے کہ آخرت میں ہمارے گناہوں کی بخشش میں ہمارے کام آئے گا۔ کپڑے کے یہ ٹکڑے حاجیوں کے اس احرام کے علاوہ ہوتے ہیں جن کو کفن کے طور پر استعمال کرنے کے لیے

حجاج محفوظ رکھتے ہیں۔

میں پھر مشرقی چھت پر چلا گیا تھا تا کہ ایک ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر عبادت کر سکوں جہاں سے پورا بیت اللہ اور اس کے گردونواح کا علاقہ میری نظروں کے سامنے ہو۔ نماز کے لیے اذان 6 بجے ہوئی جو مدینے کے معمول کے وقت کے حساب سے کچھ دیر سے ہوئی تھی۔ اذان کی آواز سنتے ہی طواف رُک گیا تھا اور حجاج دائرہ کی شکل میں صف آرا ہو گئے تھے۔ ''اللہ اکبر'' کی آواز سنتے ہی مسجد حرام کے اندر موجود تمام لوگ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ نماز کے بلاوے پر جتنا بڑا مجمع یہاں اکٹھا ہو گیا تھا۔ اتنا بڑا مجمع دنیا میں کہیں اور جمع نہ ہوتا ہو گا۔ اس اجتماع کے یقیناً کوئی معانی ہوں گے! وہ معانی کاروبار، تجارت، سیر و سیاحت، فرائض کی ادائیگی، رسوم کی ادائیگی، اقتصادی مسائل، حکومت اور ہزاروں دیگر باتوں کے معانی سے ارفع و اعلیٰ ہوں گے۔ امام نے ادھر سلام پھیرا ادھر حجر اسود کو بوسہ دینے والوں کا ہجوم وہاں جا جمع ہوا۔ صفیں ختم ہو گئی تھیں اور طواف پھر سے جاری ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے کعبہ کے قریب کی صفیں اٹھیں اور چکر لگانے شروع کیے پھر ان کے پیچھے کی صفیں اپنی اپنی باری پر طواف کرتے ہوئے اجتماع کا حصہ بنتی گئی تھیں۔ جن معماروں نے نئی خمدار بارہ دریاں بنائی تھیں انہیں یقیناً اپنے کام کے عالیشان ہونے کا احساس ہو گا۔ جب یہ ساری توسیع مکمل ہو جائے گی تو یہ دنیا کا سب سے بڑا کھلا اور بغیر چھت کے معبد ہو گا جس کے دو نئے مینار اونچائی میں مقابلے کا چیلنج دے رہے ہوں گے۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے اچانک احساس ہوا کہ میرے پاؤں جل رہے تھے اور ان میں درد ہو رہا تھا۔ میں ایک کونے میں چلا گیا اور جھک کر دیکھنے لگا کہ میرے پاؤں کیوں جل رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان پر سرخ آبلے ابھر آئے تھے۔ میں نے احرام اوپر اٹھا کر دیکھا تو یہ آبلے میرے سینے پر، میرے پیٹ پر اور بازوؤں پر بھی تھے۔ اس کی وجہ میرے جگر کی خرابی اور دھوپ تھی۔ میں سیدھا ہو کر چلنے لگا تو میں نے دیکھا کہ ایک عورت مجھے دیکھ رہی تھی۔

اتوار، 19۔ اپریل: مکے کے اس پہاڑی علاقے کا سورج میرے لیے بڑا خطرناک ثابت ہوا تھا کہ میری خشک کھانسی واپس آ گئی تھی۔ میں ہر روز کھانسی کی دوا لے رہا تھا۔ بیشمار ایرانی حجاج گنجے تھے، خصوصاً بوڑھے جن میں دیہاتیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں سے ایک بوڑھا حاجی اپنا گنج چھپانے کے لیے سر پر ہمیشہ ٹوپی رکھتا تھا۔ وہ دوسرے سے اپنے سر کو چھپانے کی پوری کوشش کرتا تھا جیسے کوئی بیمار پرندہ ہو۔ وہ

دن رات ایک بارہ دری میں پڑا رہتا تھا۔ مدینے میں تو میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی لیکن یہاں میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ کل جب میں اپنی پانی کی بوتل سے پانی لینے گیا جو ایک ایسی کھڑکی میں لٹکی ہوئی تھی جو کھڑکی بارہ دری کی سمت کھلتی تھی تو میری نظر اچانک موصوف پر پڑی۔ ہم اس وقت سب لنچ کر رہے تھے۔ اس نے برف والے ٹھنڈے پانی کا پیالہ اپنے سامنے رکھا ہوا تھا اور تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں بانہیں گھٹنوں کے گرد حمائل کر رکھی تھیں، وہ سگریٹ پی رہا تھا اور ایک ایسے بچے کی مانند لگ رہا تھا جسے ڈانٹ پڑ گئی ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ حج پر ماتم منانے آیا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ کر یہ باتیں سمجھاتا رہتا تھا۔ وہ اپنے گروپ میں اکیلا تھا اس کے علاقے سے کوئی شخص نہیں تھا نہ اس کا کوئی دوست اس گروپ میں تھا۔ اس سے بدتر یہ بات تھی کہ اسے اسہال کا مرض لاحق تھا۔ میں نے اپنی پارٹی کو آواز دے کر پوچھا کہ کوئی ہلکی غذا ہو تو اسے دی جائے۔ پھر میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا: ''حاجی صاحب! یہاں ہر کسی کو اسہال ہو جاتا ہے، آب وہوا اس نہیں آتی، میں خود بھی پرہیزی کھانا کھا رہا ہوں۔ اسہال کوئی وبائی مرض نہیں ہے''۔ وہ یہ سن کر میرے ساتھ آ گیا تھا اور ہمارے گروپ کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ مجھے دراصل پولیس میجر کے معاملے نے چوکنا کر دیا تھا۔ یہ حاجی سمجھتا ہے کہ یہ گنجا ہے اور اسے سورج کی دھوپ سے اسے بچانا ہے اور دوسرے اس حقیقت سے اس قدر آگاہ نہیں۔ میں نے ایک اور حاجی کو بھی چھوٹے شفا خانے میں دیکھا تھا اس کا سر سُوج گیا تھا۔ بجائے اس پر پٹی باندھنے کے ڈاکٹروں نے اس کے سر کے گرد پگڑی باندھ کر اسے واپس بھیج دیا تھا۔ ان تمام سروں پر سورج بھی چمکتا ہے اور ان کو ہوا بھی لگتی ہے۔ میں اب رفتہ رفتہ ایک کل وقتی ڈاکٹر بن چکا تھا۔ اور اپنے گروپ کا سیکرٹری بھی۔ میں بیماروں کو نمکین گولیاں، وٹامن سی اور کھانسی کے شربت کے قطرے دیتا تھا۔ میں اکثر پٹی بھی باندھ دیتا تھا۔ ہر بار جب حجاج طواف اور سعی کے بعد واپس آتے تو یوں لگتا تھا جیسے جنگ خیبر سے واپس آئے ہوں۔ ان کے جسم پر کہیں نہ کہیں زخم ضرور ہوتا تھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ میرے پاس پٹیاں موجود رہتی تھیں۔ ایک حاجی کے پاؤں کے پنجے پر سے کھال اتر گئی تھی میں نے اس پر مرہم لگا دی تھی۔ میں نے آج بطور گروپ سیکرٹری کے اپنا دوسرا خط لکھا تھا جو اس حاجی نے مجھ سے لکھوایا تھا۔ اس حاجی کا نام بڑا دلچسپ تھا۔ حج بلوچ۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ اسے معلوم نہ تھا۔ جو خط اس نے مجھ سے لکھوایا تھا اس میں دو سطریں تو سفر کے بارے میں تھیں اور 50 افراد کو دو صفحات پر مشتمل مبارکباد کا پیغام۔

میں نے اب تک تین موقعوں پر مردوں کو اپنی بیویوں کے ہاتھ تھامے اس وقت دیکھا جب وہ

طواف کر رہے تھے۔ کیا یہ لوگ حج ہنی مون پر آئے ہوئے تھے؟ مجھے دو تین بار کچھ حاملہ خواتین بھی دکھائی دی تھیں۔ یہ اسی طرح طواف کر رہی تھیں جس طرح دوسری خواتین، نہ انہیں کسی احتیاط کا خیال تھا نہ کوئی ڈر۔ البتہ حجاج بڑے محتاط تھے۔

اُسی روز: میں مدینے سے روانہ ہونے کے بعد آج تک پرہیزی کھانے پر ہوں۔ میرا گزارہ چائے، پھلوں کے مُربّے اور دہی پر ہو رہا تھا۔ دہی کا اضافہ میں نے مکہ میں آ کر کیا تھا مگر دہی اچھی نہیں ملتی تھی، کھٹی ہوتی تھی۔ پھلوں کا مربّہ جو میں استعمال کر رہا تھا وہ جاپان سے آتا تھا۔ اس میں آڑو یا خوبانی ہوتی تھی۔ آم کا جوس ہندوستان سے آتا تھا۔ یہاں جو شے بھی ملتی ہے باہر سے آتی ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں پوری دنیا سے منگوائی جاتی ہیں۔ اسے مذاق نہ سمجھا جائے میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا بھر کے کارخانوں میں جو ضرورت سے زیادہ ہو کر بچ رہتا ہے وہ حج کے موقعہ پر یہاں کے لوگوں کے استعمال میں آ جاتا ہے۔ ہمارے تمام ساتھی خریداری میں مصروف ہیں جو کچھ خرید کر لاتے ہیں اس کی قیمتوں کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں، آپس میں تبادلہ خیال کر کے ایک دوسرے کو بتاتے ہیں کہ کون سی چیز کہاں سے ملتی ہے اور کون کون سی دُکانوں پر سودا بازی ہو سکتی ہے اور کہاں کہاں نہیں ہو سکتی کہ قیمتیں مقرر ہیں ان میں چائے کی پتی، کپڑا، یاقوت، چغے، عطر، گھڑیاں، مردانہ قمیص، جرابیں، جوتے اور بیشمار دوسری چیزیں شامل ہیں۔

پیر، 20۔ اپریل: اس صبح میں نے بھی خریداری شروع کر دی تھی۔ یہاں مارکیٹ ہی اتنی بڑی ہے کہ ہر شخص کا کچھ نہ کچھ خریدنے کو جی چاہتا ہے۔ زیادہ تر لوگ ایسے تحائف خریدتے ہیں جو واپسی پر عزیز و اقارب کو پیش کرنے ہوتے ہیں۔ ہر تحفے میں لیبل لگا کر کسی ایسے عزیز کا نام لکھ دیا جاتا ہے جسے وہ تحفہ دینا ہوتا ہے۔ میں نے تین عربی سکارف، بانس کی چھڑیاں، چار بال پوائنٹ پن، کئی درجن کوار گندل خریدے تھے۔ میرے ساتھیوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے کیا خریدا ہے۔ انہیں میرے خریدے ہوئے پن بہت پسند آئے تھے اور وہ بھی خریدنے چلے گئے تھے۔ البتہ بانس کی چھڑی کسی کو پسند نہ تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ بانس کو ناپسند کیوں کرتے ہیں۔ جو نیزہ معصوم علی اصغر (امام حسینؓ کے صاحبزادے) کے گلے پر لگا تھا وہ بانس کا تھا۔ کیا کوئی ایسا شخص ہے جو ڈائری تو مکہ کی لکھ رہا ہو مگر کربلا کے واقعہ کو درمیان میں کہیں نہ کہیں لکھنے پر مجبور نہ ہو گیا

ہو؟

منیٰ کو روانگی آج ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ گلیوں سڑکوں پر بے پناہ ہجوم تھا۔ اور یہ ڈرائیور کس طرح اپنی گاڑیوں کے ہارن بجا رہے تھے۔

اسی روز، رات کے وقت عرفات میں: ہم صبح 9 بجے ٹرک میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تھے اور 11 بجے عرفات کے میدان میں تھے۔ ہم صبح کے پانچ بجے سے ہی انتظار میں تھے کہ کب روانگی ہوگی مکہ سے روانہ ہوکر عرفات پہنچنا ہر لحاظ سے ایک نہایت اعلیٰ کوشش تھی۔ ایک شخص یہاں آ کر مذہبی اظہار کے معانی سیکھ لیتا ہے۔ انتظار۔ انتظار۔ انتظار، جیسا کہ ماضی میں تھا۔ کچھ بھی ہو میں ایسے موقعوں پر ڈائری لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ پھر ہم نے تین گھنٹوں میں تیرہ چودہ میل کا سفر طے کیا تھا۔ ٹرک میں اس قدر حجاج تھے کہ وہ ٹوٹنے لگتا تھا، لوگ شور مچاتے تھے، چیختے چلاتے تھے۔ جاوید نے مجھے ٹرک کی چوٹی پر، ڈرائیور کے کیبن کے اوپر بٹھا دیا تھا جہاں ہوا اس قدر تیز تھی کہ میرا احرام مجھ سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ مجھے سردی بھی لگ گئی تھی۔ ہارن بجتے رہے، بریکوں کے لگنے کی آوازیں آتی رہیں اور پھر غصے میں آئے ہوئے حجاج کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں جو ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ اچانک بریک لگتے ہی لوگ ایک دوسرے پر گر جاتے تھے۔ اب ہم میدانِ عرفات میں تھے۔ ہر طرف خیمے نصب تھے۔ ایک گلی کے کونے میں مسجد تھی۔ دوسرے سرے پر، سٹور، بکریاں اور گوشت کی دُکانیں تھیں۔ پورے میدان عرفات میں بجلی نہیں تھی۔ بڑے بڑے مٹی کے تیل سے جلنے والے لالٹین روشن تھے۔ کافی ہاؤسز پر بہت سے لوگ تھے۔ ایک سٹور کا مالک کاؤنٹر پر سویا ہوا تھا۔ بدو سڑک کے کنارے اپنی بھیڑ بکریوں کے درمیان سوئے ہوئے تھے، ان کے پاؤں نیلے اور پیٹھ اور گردن پر مہندی کا رنگ تھا۔

حد نظر تک خیمے ہی خیمے تھے۔ یہاں تو پولیس اور فوج کے سپاہی بھی احرام میں ملبوس تھے لیکن گشت کے وقت ان کے کندھوں پر رائفلیں تھیں۔ صرف ٹریفک پولیس کو وردی پہننے کی اجازت ہوتی ہے۔ یہ بدو ڈرائیوروں کو اشاروں سے گاڑیاں ادھر ادھر موڑنے کی ہدایات دے رہے تھے۔ بوائے سکاؤٹس ان حجاج کی مدد کر رہے تھے جو اپنے خیمے بھول جاتے تھے۔ ہم نسبتاً بہتر تھے اور اس وقت اپنے خیمے میں تھے۔ ہر شخص اپنی جگہ، اپنی قالین، کھانے اور دیگر چیزوں کے لیے فکر مند نظر آتا ہے۔ ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم پہاڑ کے دامن میں ہیں۔ سردی میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہر شخص جبلِ رحمت کی بات کر رہا ہے جسے ہم نے یہاں آتے وقت کچھ

فاصلے پر بیٹھا تھا۔ میں تھک بھی گیا تھا اور مجھے ذہنی بھی پریشان کر رہی تھی۔ ورنہ میں تو ایک لمحے کے لیے دوزخ میں جانا نہیں چاہتا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ حضرت آدم اور حوا جنت سے نکالے جانے کے بعد عرفات پر دوبارہ اکٹھے ہوئے تھے۔

اسی روز کل رات یہاں پہنچے کہ ہم نے سب سے پہلے اپنے اپنے بستر بچھائے تھے۔ مجھے اس وقت کسی چیز نے کاٹا تو میں نے ایک کیڑا سا اٹھا لیا تھا۔ بچھو سے ملتا جلتا تھا۔ میں نے اسے مار دیا تھا مگر مجھے احساس ہوا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں احرام میں ملبوس تھا اور میں نے اللہ کی مخلوق کو مار ڈالا تھا۔ مگر اب اس کا کیا فائدہ کیونکہ بہت دیر سے مجھے یہ احساس ہوا تھا۔ محمد شاہ اور میں دونوں مل کر اسے کمبل پر سے جھاڑ رہے تھے۔ کسی نے تو کہا تھا کہ یہ کیڑا زہریلا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ اللہ کی مرضی۔ اب ہم نے کھانا کھایا اور سو گئے تھے۔ رات سرد تھی اور میں نے کمبل کے نیچے اپنا احرام بھی اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ میں کھانا نہ کھا سکا تھا حالانکہ عباس کے شربت سے چند گھونٹ پی کر سو گیا تھا۔

عرفات ایک صحرا ہے جس طرح طائف جاتے ہوئے مکہ کے تین طرف پہاڑ ہیں اور درمیان میں میدان ہے۔ یہاں گرد و نواح کے علاقے کی نسبت سردی زیادہ پڑتی ہے۔ کسی حد تک گھاس بھی اگتی ہے خصوصاً پہاڑوں کے دامن میں۔ یہ مکہ کے مشرق میں ہے۔ کل رات ہم یہاں پہنچے تھے اس وقت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس علاقے کے بلند حصے میں بھیڑ بکریاں چر رہی تھیں۔ باقی کے مال مویشی حجاج کے ساتھ خیموں کے قریب تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ قربانی سے قبل ان بھیڑ بکریوں کو گھاس کھلائی جا رہی تھی۔ جہاں ہم ہیں یہ ایک پہاڑ کا دامن ہے اور ایرانی شیعوں کے خیمے یہیں ہیں۔ ان کو گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

صبح کے وقت زیادہ تر بدوؤں اور یمنیوں نے قربانی کے جانور ذبح کرنے شروع کر دیے تھے۔ بھیڑ بکریاں ذبح ہونے کے بعد خیموں کے سامنے لٹکی ہوئی تھیں اور ہوا میں ایک ناگواری بو پھیلی ہوئی تھی۔ اگر یہ سورج نہ ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا جو نصف گھنٹے میں ہر شے کو خشک کر دیتا ہے۔

میں نے سگریٹ کا ٹکڑا ریت پر اسی طرح پھینک دیا تھا جس طرح سمندر کے کنارے کوئی پھینکتا ہے۔ سخت گرمی تھی اور میں نے احرام کی اوپر والی چادر کی جگہ ایک سفید کیمبرک کی شال کندھوں پر ڈال لی تھی۔ کل رات اس صحرا میں پانچ لاکھ مٹی کے تیل سے جلنے والے لالٹین روشن تھے۔ ہمیں صحت عامہ سے متعلق سرکاری سطح پر بہت کم سہولیات حاصل ہیں۔ مسجد میں بجلی کی سہولت موجود ہے۔ سڑکیں گندی ہیں اور گرمی اس

قدر ہے کہ دوپہر کے بعد خیمے سے نہیں نکلا جا سکتا۔ مجھے خیال آیا کیوں نہ تھوڑی دیر کے لیے قرآن پاک کی تلاوت کرلوں۔ میں سورۃ البقرۃ کے اختتامی حصے پر تھا۔ میں قرآن کے حاشیوں پر اپنے مسائل سے متعلق نوٹ لکھتا جا رہا تھا لیکن میرے ساتھیوں کو یہ بات پسند نہ تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مجھے یہ سب کچھ بند کر دینا چاہیے کچھ بھی ہو چند پابندیاں قبول کر لینی چاہئیں۔

بُدھ، عید قربان، 22۔ اپریل: کل بعد دوپہر چار بجے لوگوں نے منٰی کی طرف جانا شروع کر دیا تھا۔ ان میں پیدل چلنے والے بھی شامل تھے۔ بدو بھی تھے جو تیز رفتار مشہور تھے اور وہ بھی تھے جن کے پاس سامان کوئی نہیں تھا۔ ہم نو بجے تک یہیں تھے۔ ہم نے رات کا کھانا خیموں سے باہر زمین پر بیٹھ کر کھایا تھا، کھلا آسمان ہمارے سروں پر تھا۔ ہمارا سامان ٹرکوں پر لادا جا چکا تھا۔ ایک روز کی یہ بدویانہ زندگی جو صحرا میں بسر ہوئی تھی یہ عمر بھر ساتھ رہنے والی تھی۔ عرفات میں تین روز پہلے سے خیمے نصب کر دیئے جاتے ہیں اور پھر حجاج کی آمد کا انتظار کیا جاتا ہے۔ ان کے جانے کے بعد بھی تین دن تک یہ خیمے اسی طرح لگے رہتے ہیں اور پھر انہیں آ کر اتارا جاتا ہے۔ میں ان خالی خیموں کے درمیان گھومتا رہا تھا۔ یہ صحرائی جہاز لگتے ہیں جو پانیوں پر چلنے کے بجائے صحرا کے سمندر پر چلتے ہوں۔ بدوؤں کی اس پکنک کی باقیات میں کیمپ کی آگ کی راکھ اور ہڈیاں ڈھیروں میں پڑی رہ جاتی ہیں۔ کوئی کتا، بلی نظر نہیں آتا۔ اگر ہمیں یہاں ایک دو دن مزید رہنا پڑ جائے تو پھر کیا ہو؟

کل رات ہمارے اس سفر کی مشکل ترین رات تھی۔ ہم احرام میں ملبوس اسی ٹرک کی چوٹی پر 9 بجے سے 10:30 بجے تک سوار تھے اور سردی بھی اتنی ہی تھی۔ ہم اسی راستے سے واپس جا رہے تھے جس راستے آئے تھے اور سردی بھی اتنی ہی تھی۔ ہم نے بسوں کی لمبی قطار دیکھی، ان کے علاوہ دیگر گاڑیاں اور ٹرک بھی بہت تھے۔ رات کی تاریکی میں کیمپ کی آگ فاصلے فاصلے سے چمک رہی تھی، مویشیوں کی بُو آ رہی تھی اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کی آواز سنی جا سکتی تھی۔ یہ آواز اسی طرح کی تھی جیسی آواز آپ رات کی تاریکی میں کسی درہ کے کونے میں دیوار کی دوسری طرف سے سنتے ہیں جہاں کوئی دیوار کو زور زور سے تھپتھپا رہا ہو۔ ہم رات کو پتھریلی زمین پر سو گئے تھے۔ مرد پہاڑ کے دامن میں زمین پر سو رہے تھے جبکہ عورتیں ٹرک کے اندر تھیں۔ ہم چار آدمیوں کے پاس ایک سفری قالین تھا۔ ہم نے سونے کے لیے اسے نیچے بچھا لیا تھا اور دو دو ہو کر لیٹ گئے تھے۔ ہم کمبلوں کو بھی مل کر استعمال کر رہے تھے اور انہیں ہم نے کندھوں تک کھینچ لیا تھا۔ میری پیٹھ ایک خاردار

جھاڑی کی طرف تھی۔ میرے قریب ہی چچا، محدث اور جاوید لیٹے ہوئے تھے۔ کل شیطان کو مارنے کے لیے میرے ساتھی کنکریاں جمع کر رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً بھیڑ بکریوں کا ریوڑ ہمارے کچھ فاصلے پر گزر رہا ہوتا تھا۔ صبح تک چرواہوں کے ہانکنے کی آواز آتی رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی اونٹ کے چلنے کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ سردی ہمارے احرام سے اندر گھس کر ہمیں پریشان کر رہی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی رات میں آنے والی صبح کا خیال کرنا چاہیے کہ وہ کس قدر اہم ہوگی۔ یہ اس عورت کے تجربے سے ملتا جلتا معاملہ تھا جس نے چالیس دن تک اپنے گھر میں حضرت خضر علیہ السلام کی آمد کا انتظار کیا تھا مگر آخری دن وہ انہیں دیکھ نہ سکی تھی۔ آخری لمحے میری تھکن، سردی اور رت جگے نے مجھے اس قدر رنڈھال کر دیا تھا کہ میں اٹھ کر بیٹھ نہ سکتا تھا۔ اس مشعر الحرام تاریک درے میں انسانوں اور جانوروں میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ میں نے وہاں لیٹے لیٹے اپنے آپ سے سوال کیا: کیا یہ بُلاوے کی منزل نہ تھی؟۔ کیا یہ وہی شے نہ تھی جس سے آپ نے لبیک کہا تھا۔ اپنی ذات سے بالاتر ہو جانے کے کیا معنی تھے؟''

ہم سے کچھ دور ایک بدو خاندان کافی بنا رہا تھا جس کی خوشبو میرے نتھنوں تک پہنچ گئی تھی۔ کیا خوشبو تھی لگتا تھا مجھے اڑا کر جنت میں لے جائے گی۔ جاوید جاگ گیا تھا، میں نے اس کی آواز سن لی تھی۔ وہ مجھے صبح بخیر کہہ رہا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی عربی میں بات کر رہا تھا اور چائے، کافی کی خوشبو اب ہر طرف پھیل رہی تھی۔ میں کوشش کے باوجود نہ اٹھ سکا تھا۔ صحرا کی راتوں کے بارے میں تو شاعری کی گئی ہے لیکن شاید صبح کے وقت کی کافی پر کسی شاعر نے طبع آزمائی نہیں کی۔ یہ صرف تازہ دم ہی نہیں کرتی بلکہ اس کی خوشبو میں میرے لیے بہت کچھ ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ میں دنیا کے دوسرے حصے سے اس سفر پر کیوں کر نکل پڑا تھا۔

وُہی جگہ اور وہی دن: ہم درہ مشعر الحرام سے صبح پانچ بجے روانہ ہوئے تھے۔ ابھی ہم نے ایک میل کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ راستہ بند ہو گیا تھا۔ اس کے کھلنے میں دو گھنٹے لگ گئے تھے۔ اس میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے۔ ہمیں ایک دوسرے تنگ درے کے راستے جانا پڑا تھا۔ ہر کوئی ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ گاڑیوں کے درمیان ایک گز کا فاصلہ تھا۔ ڈرائیور گاڑی کو تیز تر چلا کر فوراً بریک پر پاؤں رکھ دیتا تھا۔ ٹرک کے اندر نوے افراد ایک دوسرے کے اوپر ٹھونس دیئے گئے تھے۔ میں نے ٹرک کی چوٹی سے چھلانگ لگا دی تھی اور اب پیدل چلنے والوں کے ہجوم میں شامل تھا۔ میں جانتا تھا کہ شیعوں کے علاقے کو کون سا راستہ جاتا تھا۔ ہم گاڑیوں سے کچھ آگے نکل آئے تھے۔ حجاج سڑک کے کھل جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

نہیں انتظار تھا کہ یہ بے چینی ختم ہو جائے، سورج کی گرمی ختم ہو جائے اور کھانا تیار ہو۔ مگر وقت بعض اوقات بے معنی سا ہو جاتا ہے جس کی کوئی ترتیب نہ ہو کوئی ساخت نہ ہو۔

میں پہلے ایک سیمنٹ کی تعمیر شدہ دیوار کے پیچھے سے گزرا، یہ ایک مذبح تھا۔ پھر میں ٹرک کے کنارے ایک پرانے کافی ہاؤس کی چٹائی پر گر گیا تھا۔ میں نے چائے کے ساتھ ڈبل روٹی کے ایک دو ٹکڑے لے لیے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں پانی کی ایک اونچی سی ٹینکی بن رہی تھی۔ اب میں گلیوں سے ہوتا ہوا خیموں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ حجاج کا ایک جمِ غفیر آپس میں گڈمڈ ہو رہا تھا، گروپس ختم ہو گئے تھے صرف گروپ لیڈر الگ تھلگ نظر آ رہے تھے جن کے ہاتھوں میں اپنے اپنے گروپ کے شناختی نشان تھے۔ یہ خیموں کے درمیان سے یوں گزر رہے تھے جیسے یا تو خوفزدہ ہوں یا کوئی بہت اہم ضرورت درپیش ہو۔ میں ایران کے بازار میں یومِ عاشورہ کے موقعہ پر اس حالت میں ایک بچے کو دیکھا کرتا تھا۔ ہر ایک سفید احرام میں تھا اور "لبیک" کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ آج پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ سفید کے اندر کتنی قسمیں ہیں، کتنا تنوع ہے کم سفید، کریم رنگ میں سفید، نیلگوں سفید، دودھیا سفید، چمکتا ہوا سفید، انڈے کی طرح سفید وغیرہ وغیرہ۔ حجاج کی ہاؤہُو نے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا، ایک خوف سا دامنگیر تھا ہر کسی کو کہ وہ گُم نہ ہو جائے۔ اب مجھے یوں لگا جیسے ہم بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔ یہاں کچھ رہائشی مکانات ادھر ادھر تعمیر کیے گئے تھے۔ لوگ ان کی چھتوں پر کھڑے حجاج کو دیکھ رہے تھے۔ پھر سڑک اچانک ایک جگہ جا کر ختم ہو گئی تھی۔ ہجوم میں تمام لوگ ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے اور میں ڈر گیا تھا۔ دنیا کے مختلف خطوں، مختلف نسلوں کے لوگوں کے سروں سے نصف گز بلند ہو کر میں نے تمام ایرانیوں کو آواز دی کہ یہ ایک بالکل بند گلی ہے وہ جہاں جہاں پہنچے ہیں وہاں سے واپس ہو جائیں میں نے انہیں یہ بات بھی بتائی کہ یہ اطلاع اپنے پیچھے والے حجاج کو بھی دے دیں۔ انہوں نے ایسا کرنا شروع کر دیا تھا۔

حجاج کے اس مجمع میں ایک بوڑھا شخص بے ہوش ہو کر گر گیا تھا۔ ہم نے اسے دیوار کے اوپر اٹھایا تو مقامی لوگ اس کے لیے پانی لے آئے تھے۔ گُم ہو جانے کا ڈر، انجانی اور اجنبی جگہیں، چیزوں کو دیکھنے کی خواہش اور مناسکِ حج ادا کرنے میں شریک ہونے کی آرزو ہر حاجی کے سامنے بالکل نامانوس چیزیں جمع کر رہی تھیں۔ ہر شخص کی حیثیت سمندر میں ایک قطرہ آب کی تھی۔ تین بار تو میں نے اپنے احرام کو بچایا جسے اس ہجوم میں سنبھالنا اور جسم پر قائم رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ کبھی جسم کے اُوپر والے حصے کی چادر جسم سے سرک جاتی تو

کبھی نچلے دھڑ والی چادر سنبھالنی مشکل لگنے لگتی تھی۔ اب مجھے یہ بات سمجھ میں آئی تھی کہ حجاج اپنے ہمراہ اتنا سامان کیوں لاتے تھے۔ اس ساری افراتفری میں میری ڈائری اور اس کے اندر رکھی ہوئی پنسل کھوگئی تھی۔ واپسی پر میں نے ہر سٹور پر پتا کیا لیکن کہیں سے بھی نئی ڈائری نہ مل سکی تھی۔ تاہم میں نے ایک پنسل ضرور خرید لی تھی۔

اس مذبح کے بارے میں چند الفاظ: یہ ایک بہت وسیع پلاٹ پر ہے جس کے چاروں طرف ایک دیوار ہے اور اس میں داخلے کے لیے دو دروازے ہیں جگہ جگہ سے گڑھے بنانے کے لیے مٹی کھود کر اس کے ڈھیر لگا دیے گئے ہیں۔ مٹی کے یہ ڈھیر دیواروں سے بھی اونچے ہو گئے ہیں اور باہر سے نظر آتے ہیں۔ بکریوں، بھیڑوں اور اونٹوں کے ذبح شدہ جسم نظر آتے تھے کوئی زندہ جانور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بچوں کے ہاتھوں میں چاقو تھے اور وہ ان جانوروں کے بچ جانے والے گوشت سے کھیل رہے تھے۔ ہر ایک کے پاؤں خون سے لت پت تھے۔ میں نے اپنے احرام کو وہاں سے گزرتے وقت تھوڑا سا کھینچ کر اوپر کر لیا تھا۔ ایک صاحب 16 ملی میٹر کیمرے سے فلم بنا رہے تھے۔ محکمہ صحت اور سیکورٹی کے دو تین ملازمین اس کے ساتھ تھے۔ لوگ کند چاقو چھریاں ہاتھوں میں لیے اردگرد کھڑے تھے تاکہ فلم کا حصہ بن جائیں۔ انہوں نے ایک بکری کا سر تن سے جدا کر کے ایک طرف پھینک دیا تھا۔ ایک نوجوان آگے بڑھا اور اس نے اپنے چاقو کی نوک بکری کے گلے میں پیوست کر دی تھی۔ بکری کے گلے میں سے خون فوارے کی مانند نکلا تو وہ زمین پر تڑپ کر رہ گئی تھی۔ یہ نوجوان جانور ذبح کرنے میں مہارت رکھتا تھا۔ میں نے اس سے اپنا مقابلہ کیا تو مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ وہ مجھ سے زیادہ تجربہ کار تھا۔ زمین پر پڑا ہوا اونٹ ایک دو بار ادھر ادھر تڑپا تھا۔ میں جب اس کے قریب گیا تو وہ ساکت تھا۔ اونٹ جہاں کھڑا تھا وہیں ایک نوجوان نے اس کی گردن میں چاقو دے مارا تھا۔ گردن میں نیچے کی طرف ہاتھ بھر زخم لگایا گیا تھا۔ جانور نے جب سر گھمانا چاہا تو اس نوجوان نے اس کی ناک پر مکا مارا تھا۔ اونٹ نے بلبلا کر بھاگنا چاہا مگر لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر خون کا فوارہ بہہ نکلا تھا اور وہ اٹھ نہ سکتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ بے حس و حرکت زمین پر پڑا تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ گردن نیچی کر لی تھی۔ سانس لے رہا تھا لیکن اگلے لمحے سانس کی یہ ڈوری بھی کٹ گئی تھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس قربانی کے موقعہ پر جانوروں کا ذبح کیا جانا اس لیے بھی تھا کہ انسان انسان کو قتل کرنا بند کر دے۔ اگر ہم حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں بیٹے کی قربانی کے واقعہ کی طرف مڑ کر دیکھیں تو یہ بات سچ لگتی ہے مگر اس مذبح کو آپ کیا نام دیں

ہے؟ جو ایک بار اسے دیکھ لے وہ زندگی بھر سبزیاں کھانے کا فیصلہ کر لے گا۔ میں نے تین بار سیاہ فام، ایک عورت، ایک مرد اور ان کا ایک بچہ دیکھا تھا جنہوں نے ایک اونٹ کی قربانی دی تھی۔ وہ ذبح شدہ اونٹ کے گوشت کو ٹکڑوں میں تقسیم کر رہے تھے۔

ایک جگہ اور ایک نوجوان اونٹ کی قربانی دینے کی تیاری کر رہا تھا۔ پاس ہی بہت سی بکریاں اور بھیڑیں اپنی باری کی منتظر کھڑی تھیں، گندگی ان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہ اپنا چارہ کھا رہی تھیں۔ صرف بکریوں نے بھانپ لیا تھا کہ ان کے گلے پر چھری چلنے والی ہے شاید اسی لیے وہ وقفے وقفے سے ممیاتی تھیں اور پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ جب تک مذبح کے اندر موجود جانوروں کو ذبح نہ کر دیا جائے پولیس، جو دروازوں پر تعینات تھی، مزید جانوروں کو اندر نہیں لے جانے دیتی تھی۔

میں نے کئی لوگوں کو جب قربانی کے جانور ذبح کرتے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی اور جانوروں کے گلے پر چھری چلاتے وقت وہ ایک خاص خوشی محسوس کر رہے تھے۔ آپ سوچنے لگیں گے کہ یہ سب علم تشریح الاعضاء (اناٹومی) کے طالب تھے یا وہ کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دے رہے تھے جس پر وہ خوش تھے۔ دراصل حج کے دوران لوگ دو تین مشقیں کرتے ہیں جن میں سے آخری مشق قربانی کے جانور کو ذبح کرنا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ آنے والے زمانے میں صدیوں تک مناسکِ حج اسی طرح ادا کیے جاتے رہیں گے۔ ان کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کو مزارات پر حاضری، سیر و سیاحت، تجارت، تفریح اور ایک نئے تجربے سے گزرنے کا موقعہ ملتا ہے۔

جدہ ایئر پورٹ...... جمعرات، 30۔ اپریل: ہم ہوائی جہاز میں سوار ہو چکے تھے۔ یہ ایک چار انجنوں والا ہوائی جہاز ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہم جیٹ ہوائی جہاز سے واپس جائیں گے۔ میں اور تین چار اور مسافر جو آخر میں ہوائی جہاز میں سوار ہوئے تھے، ہمارے لیے کوئی نشست خالی نہیں تھی۔ ہمیں جہاز کا عملہ کاک پٹ کے پیچھے ایک چھوٹے سے ڈبے میں لے آیا تھا جہاں جہاز کا عملہ آرام کرتا تھا۔ درمیان میں ایک میز تھی جس کے دونوں طرف دو بنچ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے اندر داخل ہونا مشکل تھا۔ اس کا نقصان یہ تھا کہ انجن کی آواز سیدھی آپ کے کانوں میں آتی تھی۔ آپ نہ سو سکتے ہیں نہ جاگتے وقت کوئی کام کر سکتے ہیں۔ مجھے ایک بار پھر اپنی ڈائری میں پناہ لے لینی چاہیے۔ اگر میرے پاس یہ نوٹ بک نہ

ہوتی تو اس ساتھی کے بغیر میں کیا کرتا۔ اعلان ہوا کہ ہمیں 3 گھنٹے اور 35 منٹ جہاز میں رہنا ہوگا۔ ہوائی جہاز پرواز سے پہلے اور خاص طور پر اترنے کے بعد جھٹکے بہت کھاتا ہے، نشستوں کے انجر پنجر ہل جاتے ہیں نشستوں کے ڈھیلے پڑ جانے والے پیچ میں نے کس سے سخت کرنے چاہے تو اس کوشش میں میرے کپڑے پھٹ گئے تھے۔

میں اس سفر میں ایک تجسس کی وجہ سے آیا تھا۔ میں نے اس سفر میں شاید اسی لیے ہر شے کو بنظر عمیق دیکھا..... اور اب جب میں سفر مکمل کر کے واپس جا رہا ہوں۔ یہ نوٹ بک اس کا نتیجہ ہے۔ روداد سفر ہے۔ یہ ایک طرح کا تجربہ بھی تھا۔ یا یوں کہیے کہ یہ ایک سادہ سا واقعہ تھا۔ ان تجربات اور واقعات میں سے ہر تجربہ، ہر واقعہ سادہ تھا۔ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس میں تشکک کی تمام تہیں ایک ایک کر کے اترتی جاتی ہیں..... مجھے ایک لمحے یہ محسوس ہوا جیسے میں دنیا کے تمام فریب نظر کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میرا اپنا تعلق تو دنیا کے ایک کونے سے ہے اور اگر میں دنیا کے تمام کونوں کی تصویریں اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لیتا ہوں تو میں تو پوری دنیا کا انسان بن جاتا ہوں۔ میرے خیال میں پال نظان نے ''عدن عربی'' میں لکھا تھا: ''انسان محض دو آنکھوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے سفر میں تاریخ میں اپنی پوزیشن تبدیل نہیں کر سکتے جس طرح آپ اپنی جغرافیائی پوزیشن تبدیل کرتے ہیں تو پھر آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ رائیگاں چلا گیا''۔ ان ہی خطوط پر میں نے یہ سوچا کہ انسان زندگی اور کلچر کا مجموعہ ہے جو یکجا کر دیے گئے ہیں۔ ان میں کئی صلاحیتیں اور ایک دائرے میں گھرے ہوئے رشتے ہیں۔ تاہم کچھ بھی ہو انسان محض ایک آئینہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مخصوص چیزیں منعکس ہوگئی ہیں۔ یہاں تک کہ حاجی ہمدان بھی جو ابھی تک چمڑے کی واسکٹ پہنے ہوئے ہے۔ مگر ٹھہریئے، آئینے کی تو کوئی زبان نہیں ہوتی اور آپ صرف ایک زبان رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا اس طرح سر کے اندر موجود آنکھ، دل کی آنکھ سے جدا نہیں ہو جاتی؟ میں جب اس معاملے کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں تو اپنے دل کی آنکھ سے اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتا، نہ تہران کی مانوس زندگی کو دیکھ سکتا ہوں، نہ تہران کے شمالی اور جنوبی اضلاع کو دیکھ سکتا ہوں۔ تو پھر میں نے اس نوٹ بک کے آئینے کو کون سی تصویر دی ہے؟ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ میں نے بھی وہی کچھ کیا ہوتا جو امسال حج پر آنے والے لاکھوں لوگوں نے کیا ہے؟ اور ان لاکھوں لوگوں نے کیا جو چودہ سو سال سے حج پر آ رہے ہیں اور جن کے پاس ان کے بارے میں بتانے کے لیے بہت سی باتیں تھیں مگر انہوں نے کچھ بھی نہ کہا۔ یوں وہ خود غرضی کا مظاہر کرتے ہوئے

اپنے تجربے کے نتائج کو اپنی قبر میں ساتھ لے گئے یا زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ اپنی بہنوں، ماؤں، بچوں اور خاندانوں کے ساتھ چار دن اس کا ذکر کر کے خاموش ہو گئے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم ہر واقعہ کے تجربے کو اس کے پھل کے اندر بیج کی مانند سڑنے دیں۔ بیشک اس مخلصانہ سوال کا میں نے منفی جواب دیا ہے مگر میں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ اس لیے کہ ایرانی دانشور حج کے ان واقعات کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''آپ کے پاس کوئی اور جگہ نہیں جہاں آپ چلے جائیں''؟ وہ ایسا کہتے وقت یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ یہ ایک ایسی روایت ہے جس میں لاکھوں لوگ ایک ہی جگہ ہر سال جمع ہوتے ہیں اور ایک ہی طرح کے مناسک ادا کرتے ہیں۔ خیر میرے لیے یہ ضروری تھا کہ میں وہاں خود جاؤں وہاں خود موجود رہ کر مشاہدہ کروں اور یہ دیکھوں کہ نصر خسرو کے دور سے اب تک وہاں کچھ تبدیلیاں آئی ہیں یا نہیں آئیں۔

کسی بھی واقعہ میں، خواہ یہ اعتراف ہو یا احتجاج یا کوئی اسے بدعت کا نام ہی کیوں نہ دے یا جو چاہے کہے میں اس سفر حج پر پہلا مقصد یہ لے کر آیا تھا کہ اپنے بھائی کو تلاش کروں گا...... اور ان دوسرے تمام بھائیوں کو...... بجائے اس کے کہ میں خدا کو تلاش کروں کیونکہ وہ تو ان سب کے لیے ہر جگہ موجود ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

☆☆☆

21۔ میلکم ایکس...... امریکا
1964ء

''ہاں میں ایک انتہا پسند ہوں۔ شمالی امریکا میں سیاہ فام نسل انتہائی بُری حالت میں ہے۔ آپ مجھے ایک بھی ایسا سیاہ فام دکھا دیں جو انتہا پسند نہ ہو اور میں آپ کو ایک ایسا سیاہ فام دکھا دوں گا جسے نفسیاتی علاج کے لیے توجہ درکار ہے۔''

(میلکم ایکس)

میلکم ایکس ایک اشتہاری نوجوان تھا۔ وہ چوری کے جرم میں ایک بار سات برس جیل میں رہا تھا پھر 12 برس دوبارہ جیل میں اس جرم میں گزارے کہ نسل کی بنیاد پر وجود میں آنے والے ایک فرقے کے عقیدے کی تبلیغ کر رہا تھا۔ یہ سزا کاٹنے کے بعد وہ واپس اپنی نارمل زندگی میں آ گیا تھا۔ اس نے انتقال سے ایک سال قبل اسلام قبول کر لیا تھا اور اس سارے عمل میں اس مختصر سے عرصے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حج اس کی زندگی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا تھا۔ عمر کے آخری چند مہینوں میں وہ دو مرتبہ مکہ مکرمہ گیا تھا۔

میلکم لٹل 1925ء میں اوماہا، نبراسکا میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ارل لٹل ایک بپتستی مبلغ تھا جو مارقس گاروی کی عالمی نیگرو بہبود ایسوسی ایشن کا پرجوش پیروکار اور اس کی مقامی شاخ کا صدر بھی تھا میلکم کی ماں لوئیس نیم سکاٹش اور نیم غرناطوی تھی اور وہ بھی گاروی کی پیروکار تھی۔ گاروی افریقی یہودی تاریخ میں سب سے بڑی تنظیم چلا رہا تھا جس کے 1924ء میں دو ملین اراکین تھے۔ اس کی کامیابی نے ایک نوجوان قانون دان جے ایڈگر ہوور کو پریشان کر دیا تھا جو ایف بی آئی کا نیا ڈائریکٹر تھا۔ گاروی کو ڈاک کے فراڈ کیس میں جھوٹے الزام میں پکڑ لیا گیا تھا۔

جس برس گاروی جیل گیا، میلکم اُسی برس پیدا ہوا تھا۔ تین ماہ بعد پچاس ہزار پیروکاروں نے واشنگٹن ڈی سی میں سیاہ فاموں کے لیے جلوس نکالا تھا۔ یہ بے حد خوفزدہ کرنے والا اور الہامی دور تھا میلکم آنکھ

بچوں میں چوتھے نمبر پر تھا اور ایک ایسے غریب گھرانے میں نشوونما پائی تھی جس میں نجات کا الٰہیاتی فلسفہ سرایت کر گیا تھا۔ سیاہ فام ہونے پر فخر، نسلی علیحدگی پسندی، حبشی قوم گاروی کے نعروں کے الفاظ تھے۔ اس کی سوتیلی بہن ایلا کولنز نے بعد ازاں کہا تھا:

''ترقی پسندانہ پروگرام اور نظریات میلکم کی قدرتی اور طبعی ساخت میں شامل تھے۔ یہ اسے ورثے میں ملے تھے' میلکم کا جوانی میں نیشن آف اسلام (این او آئی) کی طرف مائل ہونے کا آغاز 1948ء میں ہوا تھا اور یہ اس کی ابتدائی زندگی کے پس منظر کا منطقی نتیجہ تھا۔ گروپ لیڈر عالیجاہ محمد پول تھا جس نے اپنے پیروکاروں کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا تاکہ ناانصافی اور نسلی استحصال سے نجات دلا کر ان کی برادری کو اصلی سیاہ فام کنٹرول میں لایا جا سکے۔ احتجاج کا ایک ہتھیار ذات کی تشریح کے ذرائع، اس قوم کو ضائع شدہ زندگیوں کی از سرِ نو تعمیر میں تخصص حاصل تھا۔ اس نسلی ظلم و ستم کے خلاف نبرد آزما ہونے کے خیال نے میلکم ایکس کو متحرک کیا تھا۔ اس نے 1950ء کی دہائی میں عالیجاہ کے مشن کو پھیلانے میں انتھک کوشش کی۔ اس میں اس کے فنِ خطابت نے بڑی مدد کی اور چند ہی برسوں میں رکنیت چند سو سے بڑھ کر چالیس ہزار سیاہ فاموں پر مشتمل ہو گئی تھی۔ 1959ء تک این او آئی کے 38 معبدوں کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جو نیویارک، سے لاس اینجلز اور اٹلانٹا تک پھیلے ہوئے تھے اور ان سب میں میلکم کا ہاتھ تھا۔ اس کے علاوہ سکول بھی قائم کیے گئے تھے اور چھوٹے پیمانے پر تجارت بھی ہو رہی تھی، ایک قومی اخبار نکالا جا رہا تھا، املاک بھی تھی اور 30 ریڈیو سٹیشن بھی قائم ہو چکے تھے۔

1963ء میں جب میلکم کی عالیجاہ سے علاحدگی ہوئی جس کا بہت چرچا ہوا تو اظہارِ ذات کی آزادی، جس کے لیے وہ اب تک زندہ تھا، کے راستے کی آخری رکاوٹ بھی ہٹ گئی تھی۔ اب اسے قوم کی کمزوریوں کا صحیح معنوں میں علم ہوا تھا۔ گو اس کا ڈھانچہ بہت وسیع تھا لیکن این او آئی کوئی مذہب نہیں تھی۔ مشہور ناول نگار جیمز بالڈون نے اس کے خود ساختہ ''اسلام'' کے بارے میں کہا کہ اس نے سیاہ فام انسانوں کے فخر کو تعمیر کرنے کے لیے سفید فام نسل کو شیطانوں کی نسل قرار دیا تھا۔ اس نے طاقتور بصیرت کو خالی الذہن داستانوں کے ساتھ مدغم کر دیا تھا۔ این او آئی نے اپنے آپ کو اسلامی علامات میں لپیٹ تو دیا تھا لیکن روایتی عملی صورت نظر انداز ہو گئی تھی۔ اس کے اراکین نہ تو رمضان کے روزے رکھتے ہیں نہ حج کے لیے جاتے ہیں۔

[illegible] 1960 [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] 1964 میں [illegible]
[illegible]
[illegible] پہنچی تھی۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ابن عبد العزیز [illegible]
بحیثیت ایک بادشاہ کے۔

رجعت پسندوں کے معیارات کے مطابق جب میلکم حج پر گئے تو وہ بمشکل مسلمان کی تعریف
پر پورا اترتا تھا۔ حج کی ادائیگی نے اس کی مذہبی زندگی کو گہرائی اور [illegible] بخشی تھی۔ اس نے اسے بطور ایک
رہنما کے اپنا حق منوانے میں مدد دی تھی۔ بیشک وہ تعلقات جو [illegible] کے خواہاں تھے [illegible] اس کے سفر
کے مقصد کا ایک حصہ تھا۔ مکہ مکرمہ جانے سے کئی ہفتے قبل میلکم نے ہارلم میں ایک نئی تنظیم کی بنیاد رکھی تھی جس کا
نام تھا "مسلم مسجد" ایک ادارہ۔ آپ بیتی میں اس جگہ اس نے اس نئی مسجد کے [illegible] میں ایک جگہ لکھا ہے [illegible]

اس نے پہلی بار حج کا ذکر یُوں کیا ہے: ''مجھے اس سے بھی آگے کی ایک بڑی تیاری کرنی تھی جس کی میں سمجھتا تھا مجھے ضرورت تھی۔ یہ بات میرے ذہن میں برسوں سے تھی اور میں نے اسے اللہ کے غلام کے طور پر ذہن میں محفوظ رکھا تھا''۔ اس بات کا ذکر یہاں ضروری ہے کہ صرف اور صرف ایک حقیقی مسلمان کو ایک مسجد کی بنیاد رکھنی چاہیے اور بطور ایک مسلمان کے اپنے آپ کو منوانے کا ایک ہی یقینی طریقہ ہے کہ حج کر لیا جائے۔ اسے اس کے اصل مقام پر رکھ کر دیکھا تو میلکم کا مکہ کا پہلا سفر ایک فرد کی کسی خواب کی تعبیر کی تلاش سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ کسی وسیع اور معتبر شے کی تلاش تھی جس کے لیے اس کے سوانح نگار لیوس ڈی کیرو جونیئر نے حال ہی میں اسے ''مذہبی اِستناد، اسلامی دنیا میں'' کا نام دیا ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جسے ہم اس روداد سفر میں ازمنہ وسطیٰ سے کارفرما دیکھتے ہیں۔

حجاج کو جو کچھ ملتا ہے وہ مکے لے آتے ہیں۔ میلکم اپنے ساتھ عمر بھر کی نسلی مساوات کی بھوک لایا تھا۔ وادئ منیٰ میں چند راتیں خیموں میں بسر کرنے کے بعد اس نے اعلان کیا: ''انسانی خاندان اور انسانی معاشرے کی تکمیل کے لیے تمام مذہبی، سیاسی، اقتصادی، نفسیاتی اور نسلی عناصر یا خصوصیات درکار ہوتی ہیں۔'' ہارلم میں جس طرح کی زندگی وہ گزار رہا تھا اس کے برعکس میلکم کا حج ایک مختصر سی چہل قدمی تھی جو وہ ایک سماجی جنت میں کر رہا تھا۔ اس کی اعلیٰ و برتر رُوح، مقدس قوانین اور عوامی لباس نے اسے ایک ایسی مساوات کا تجربہ اس پیمانے پر کرنے کے قابل بنایا تھا، جس کا وہ اس سے پہلے تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسے ان چند دنوں میں تمام نسلی امتیازات سے بالاتر ہو کر آزادی کے ساتھ لطف اندوز ہونے کا وہ موقعہ ملا تھا جس کے وہ کبھی خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ برجستہ یہ کہتا ہوا گھر آیا۔ ''میلکم آزاد تھا''۔ اس کے ایک دوست اوسی ڈیوس نے بعد ازاں یاد کر کے کہا: ''کوئی بھی شخص جس نے اسے مکہ جانے سے پہلے اور واپسی پر دیکھا تھا۔ پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اس نے نسل پرستی علیحدگی پسندی اور نفرت کو مکمل طور پر ترک کر دیا تھا''۔ اس دور کی اس کی بہت تصویریں ایسی ہیں جن میں وہ مسکرا رہا ہے، کچھ عرصہ پہلے اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ اس نے پرانی نفرت اور تشدد اپنے وجود سے کھرچ کر باہر پھینک دی تھی۔ ایک ولولہ، ایک جوش و جذبہ ہے کہ ان صفحات سے باہر اُمڈا پڑتا ہے۔ اس نے کہیں کہیں قطع تعلقی بھی کر لی تھی۔ وہ اپنے بارے میں از راہ مذاق کہا کرتا تھا: ''میں ایک ایسا طوطا تھا جو عالیجاہ کی زبان بولتا تھا، اس کے نظریات کا پرچار کرتا تھا''۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں تقریر کے دوران میلکم نے کہا: ''اب وہ طوطا پنجرے سے باہر آ گیا

ہے''۔

ہمارا پہلا مصنف نصر خسرو بھی میلکم ایکس کی طرح حج کے دوران ایک مصلح کا کردار ادا کر رہا تھا۔ یہ دونوں قاہرہ گئے اور پھر وہاں سے مسلم وزارت کے لیے مطالعہ کرنے کے لیے گئے۔ حج سے واپسی پر اپنے نظریات میں تبدیلی ظاہر کرنے پر اس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا جس میں وہ بچ گیا تھا اور پہاڑوں میں فرار ہو گیا تھا۔ میلکم اس کے برعکس 21۔فروری 1965ء کو اس وقت گولیوں کی بوچھاڑ میں مارا گیا تھا جب وہ ہارلم میں اپنے چند سو پیروکاروں کو خطاب کر رہا تھا...... این او آئی پر اس کی موت کا الزام لگا تھا جس کی تصدیق میلکم کے آخری بیانات سے ہو جاتی ہے۔ اسے یہ علم تھا کہ این او آئی کی نیویارک اور شکاگو کی شاخیں اس کا اثر و رسوخ کم کرنے پر تلی ہوئی تھیں، وہ ان کے معاندانہ عزائم سے بھی آگاہ تھا۔ اس نے خود ہی تو کسی وقت یہ ذہنیت بنانے میں ان کی مدد کی تھی۔ میلکم کو اپنی پوزیشن کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ وہ پہلے سے کہا کرتا تھا: ''جب یہ کتاب شائع ہو گی اگر میں اس وقت زندہ ہوا تو یہ ایک معجزہ ہو گا'' اور اس کتاب کی اشاعت سے چند ہفتے پہلے وہ مار دیا گیا تھا۔

میلکم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہ شخص تھا جس نے امریکا کو تقریباً تبدیل کر دیا تھا۔ اپنی موت کے چند برسوں بعد وہ ایک چھوٹی سی انڈسٹری کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اسے ایک تیغ آزمابت سمجھا جاتا تھا، اسے ایک طلسماتی اور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک لیڈر تصور کیا جاتا تھا۔ وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ناراض ترین انسان کے طور پر مشہور تھا۔ 1992ء میں سپائک لی کی ہالی ووڈ فلم میں اس طلسماتی کردار کے تصور کو از سر نو دنیا بھر میں منوایا گیا تھا۔ اس دوران ان علمی شخصیات نے جن کے پاس ایک نیا ایجنڈا تھا مختلف طریقوں سے اس کے کردار کا نفسی تجزیہ کیا ہے اور اسے بین الافریقی فریم میں وہاں لا کھڑا کیا ہے جہاں اس کی اندرونی زندگی کو سامنے لایا گیا ہے۔ ان کے لیے اور غیر مسلموں کے لیے میلکم کی زندگی کے فیصلہ کن عناصر تاریخی، سیاسی اور نسلی قوتیں تھیں۔ وہ بہت گہری مذہبی فطرت کا حامل انسان تھا اور اس کی زندگی تیغ زنی اور سپردگی و انکساری کا متصوفانہ امتزاج تھی جسے بہت حد تک نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ پھر بھی جب میلکم اپنی کہانی خود لکھواتا ہے تو وہ اس کہانی کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسروں نے جب بھی اس پر کچھ لکھا اسے سماجی اور نفسیاتی حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر میلکم کی اپنی نظروں میں اس کا مقدر اس کے خدا نے لکھا تھا۔ اس نے زندگی کا تجربہ نجات کے ایک ڈرامے کے طور پر کیا اور کم و بیش ایسا ہی اس نے اسے پیش کیا

ہے۔ مقبول عام کلچر نے اسے ایک سیکولر انسان کے طور پر دکھایا ہے کیونکہ اس کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے یہ ایک آسان طریقہ تھا۔ بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ جن قوتوں نے اس کی رہنمائی کی انہیں اس کی تصویر میں سے نکال دیا گیا ہے۔ مکہ مکرمہ سے واپسی پر اس نے اپنا نام تبدیل کر کے الحاج ملک شہباز رکھ لیا تھا۔ اس کی بیوی اور بچوں نے یہی نام اپنے ناموں کے ساتھ شامل کر رکھا ہے۔ میلکم کے تصدیق نامہ پر ایک چوکٹے میں یہ پوچھا گیا تھا کہ متوفی کا پیشہ کیا تھا، الفاظ تھے ''تجارت یا انڈسٹری'' اس خانے میں کسی نے بالکل صحیح لفظ ''اسلام'' لکھا ہے۔

☆☆☆

میلکم ایکس کی آپ بیتی

قاہرہ ایئرپورٹ، اپریل 1964ء

عربی میں حج کے لفظی یا لغوی معنی ہیں، کسی خاص مقصد کے لیے سفر پر روانہ ہونا۔ اسلامی قانون میں اس کا مطلب ہے کعبے تک کا سفر کرنا اور مناسک حج ادا کرنا۔ قاہرہ ایئرپورٹ پر درجنوں حج گروپ تشکیل پا رہے تھے اور لوگ احرام باندھ رہے تھے۔ یہ اپنے آپ کو جسمانی اور روحانی طور پر وقف کر رہے تھے۔ اس مقدس فریضۂ حج کے لیے، جس کے سفر کا آغاز قاہرہ سے ہو رہا تھا۔ مجھے مشورہ دیا گیا تھا کہ میں اپنا تمام سامان اور چار عدد کیمرے قاہرہ میں چھوڑ جاؤں جن میں سے ایک مُووی کیمرہ بھی تھا۔ میں نے قاہرہ سے ایک جوڑا کپڑوں کا اور جوتوں کا ایک جوڑا خریدا تھا۔ ہم اپنے حج گروپ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر قاہرہ ایئرپورٹ جا رہے تھے جب میں کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ مجھے خیال یہ آیا تھا کہ وہاں سے اب ان لوگوں پر نظر پڑے گی جو یہ جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے تھے اور خود بھی یہ کوشش کرنی تھی کہ وہی کیا جائے جو دوسرے کر رہے تھے۔

احرام باندھتے وقت ہم نے اپنا لباس اتار دیا تھا۔ اب ہمارے جسم پر دو ان سلی چادریں تھیں، ایک کو جسم کے نچلے حصے پر باندھ لیا جاتا ہے اور دوسری کو اوپر والے حصے میں اس طرح لپیٹ لیا جاتا ہے کہ دایاں کندھا اور بازو ننگے رہیں۔ سینڈل ایسے استعمال کیے جاتے ہیں جن میں ٹخنے ننگے رہتے ہیں۔ جسم کے نچلے حصے والی چادر باندھ کر اس کے اوپر ایک پیٹی باندھ لیجاتی ہے، جس کے اندر پیسے بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ عورتوں کے پرس کی قسم کا ایک بہت چھوٹا بیگ پاسپورٹ اور دیگر قیمتی کاغذات وغیرہ رکھنے کے لیے ساتھ لے لیا جاتا ہے، اسی میں تعارفی خطوط بھی رکھ لیے جاتے ہیں جیسے میرے پاس مصری سکالر ڈاکٹر محمد یوسف شوار بی کا خط تھا۔ نیویارک میں ڈاکٹر شوار بی نے حج ویزے کے حصول میں میری مدد کی تھی۔

ہزاروں افراد جو قاہرہ ایئرپورٹ پر جمع تھے ایک جیسے سفید احرام میں ملبوس تھے اور تھوڑی دیر میں جدہ جانے والی پرواز میں سوار ہونے والے تھے۔ آپ کوئی بادشاہ ہیں یا معمولی کسان، کوئی نہیں جانتا ہوگا۔

کچھ معروف شخصیات بھی اسی پرواز پر سفر کر رہی تھیں جس میں ہم بھی سوار تھے۔ احرام باندھنے کے بعد ہم میں سے ہر ایک کی زبان پر ''لبیک اللھم لبیک'' کے الفاظ تھے۔ ایئر پورٹ پر موجود مسافر ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ وہ حج ادا کرنے جا رہے ہیں۔

ہر چند منٹوں بعد کوئی نہ کوئی ہوائی پرواز حجاج کو لادے اڑ رہی تھی لیکن ہجوم میں کمی واقع نہ ہوتی تھی کہ جتنے مسافر چلے جاتے تھے ان سے زیادہ اور آ جاتے تھے۔ پھر حج پر جانے والوں کو رخصت کرنے ان کے عزیز و اقارب اور دوست بھی آئے ہوئے تھے۔ جو الوداع کہنے آئے تھے وہ حج پر جانے والوں سے درخواست کر رہے تھے کہ مکے پہنچ کر ان کے لیے بھی دُعا کریں کہ اللہ انہیں بھی حج کے لیے اپنے گھر بُلا لے۔ ہم جب جہاز میں سوار ہو گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز میں کوئی نشست نہیں بچی تھی لیکن مجھے بٹھانے کے لیے خصوصی انتظام کیا گیا تھا، اس لیے کہ وہ ایک امریکی مسلمان کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف ہوئی ہوگی، جسے جہاز میں نشست نہ دے کر مجھے اس کی جگہ بٹھایا گیا تھا۔

اس جہاز میں سفید، کالے، سرخ، گندمی سبھی سفر کر رہے تھے، ان میں نیلی آنکھوں والے بھی تھے اور خوبصورت بالوں والے بھی اور مجھ جیسے سرخ بالوں والے بھی۔ سب ایک ہی پرواز میں، ایک ہی جگہ، بھائیوں کی مانند! ہم سب ایک ہی اللہ کی عظمت و بڑائی کا ذکر کر رہے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کو یکساں عزت و احترام، خلوص و محبت سے اور بھائی چارہ کے جذبات سے دیکھ رہے تھے۔

ہمارے گروپ میں سے کچھ لوگوں نے ایک ایک نشست تک یہ خبر پہنچا دی تھی کہ میں امریکی مسلمان ہوں لوگ مڑ مڑ کر مجھے دیکھتے اور مسکراتے ہوئے اشاروں اشاروں میں اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ لنچ بکس ہر مسافر کو مل چکا تھا، سبھی کھا رہے تھے کہ اتنے میں کاک پٹ میں سے کپتان کا پیغام سنایا گیا کہ ہوائی جہاز میں جو امریکی مسلمان ہے وہ کاک پٹ میں آ جائے۔ کپتان ایک مصری تھا اس کا رنگ مجھ سے زیادہ سیاہ تھا۔ اگر وہ ہارلم میں آ گیا ہوتا تو کسی نے اسے دوسری بار دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی ہوتی۔ وہ ایک امریکی مسلمان سے مل کر بہت خوش تھا۔ اعلان کے بعد وہ خود باہر آ کر مجھے ساتھ لے گیا تھا۔ میری خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

جدّہ: جدہ ایئر پورٹ پر تو قاہرہ کے ایئر پورٹ سے بھی زیادہ ہجوم تھا۔ ہر ایک پارٹی ایک لمبی

قطار میں کسٹم کے مراحل سے گزرنے کی منتظر تھی۔ اس سے قبل ہر حج پارٹی کا ایک مطوف مقرر کر دیا گیا تھا جس نے اسے جدہ سے مکہ تک پہنچانا تھا۔ کچھ حجاج ''لبیک'' کی صدا بلند کر رہے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو مل کر ایک دعا مانگ رہے تھے جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا: ''اے اللہ! میں تیرے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ میں صرف اور صرف تیرے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ اس لیے کہ تیرا کوئی شریک نہیں۔ سب تعریف تیرے لیے ہے اور تیری ہی بادشاہی ہے''۔ اس دعا کا لب لباب اللہ کی واحدانیت ہے۔ صرف اُن افسروں کے جسم پر احرام نہیں تھا جو حج پارٹی کی رہنمائی کر رہے تھے۔ مطوف کے فرائض میں حجاج کو طواف کرانا شامل تھا۔

ہمارے پاسپورٹ دیکھے جا رہے تھے اور میں اپنے گروپ کے درمیان پریشان کھڑا تھا۔ مجھے خیال آرہا تھا کہ میں اسلامی دنیا کے منبع پر تھا اور میں امریکی پاسپورٹ پیش کرنے والا تھا جو اس کے بالکل برعکس تھا جس کے معانی اسلام کے تھے۔

ہمارے گروپ کے جج نے میری پریشانی بھانپ لی تھی۔ اس نے میرے کندھے پر تھپکی دی میں نے جس طرف بھی مڑ کر دیکھا میں نے ہر آنکھ میں مُحبت، عجز، اخوت اور ملے جلے جذبے دیکھے۔ اب ہمارا گروپ اس ڈیسک کے قریب پہنچ گیا تھا جہاں ایک کلرک ہمارے پاسپورٹ چیک کر رہا تھا۔ پاسپورٹ اور سوٹ کیس کی پڑتال کے بعد مسافر کو اشارہ سے آگے بڑھنے کے لیے کہہ دیا جاتا تھا تا کہ اس کے پیچھے کھڑا ہوا شخص اس کی جگہ لے سکے۔

میں اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ میں نے چابی سے جب اپنا بیگ کھولنا چاہا تو چابی کام نہیں کر رہی تھی۔ میں نے بیگ پھاڑ دیا تھا تا کہ وہ یہ شک نہ کریں کہ میرے بیگ میں کوئی ممنوعہ شے ہے جو میں دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ کلرک کی نظر میرے پاسپورٹ پر پڑی اور اس نے دیکھا کہ یہ ایک امریکی پاسپورٹ ہے۔ اس نے پاسپورٹ پکڑ کر میری طرف دیکھا اور عربی میں کچھ کہا۔ میرے قریب جو دوست کھڑے تھے سب فرفر عربی بولنے لگے تھے۔ وہ سب میری وکالت کر رہے تھے، مجھے متعارف کرا رہے تھے۔ جج نے مجھے انگریزی میں وہ خط دینے کو کہا جو ڈاکٹر شوار بی کی طرف سے تھا اس نے وہ خط کلرک کے سامنے رکھ دیا تھا جس نے اسے پڑھا۔ اس نے وہ خط واپس کر دیا اور کہا کہ میں یہ بات اسے زبانی بھی بتا سکتا تھا۔ میرے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی اور میں ایک ایسا احمق بنا کھڑا تھا جو ایک لفظ بھی نہ کہہ سکتا تھا۔ میں تو یہ بھی

نہیں سمجھ پار ہا تھا کہ کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ بالآخر وہ جج اداس سا ہو کر میری طرف مڑا۔

اس نے مجھے بتایا کہ مجھے شرعی عدالت میں جانا ہوگا۔ یہ مسلم عدالت عالیہ ان غیر مستند نومسلموں کے معاملات کا جائزہ لیتی تھی جو مکہ میں داخلے کی اجازت مانگتے تھے۔ یہ سب کچھ اس لیے ضروری تھا تا کہ کوئی غیر مسلم مکے میں داخل نہ ہو سکے۔ جمعہ کے دن کوئی عدالت نہیں لگتی تھی۔ اس لیے مجھے کم از کم سنیچر تک انتظار کرنا تھا۔

ایک افسر نے ایک عربی بولنے والے نوجوان مطوف کو مدد کے لیے بلایا۔ اس افسر نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے بتایا کہ ایئر پورٹ کے بالکل قریب ایک جگہ مجھے لے جائیں گے۔ میرا پاسپورٹ کسٹم کے عملے نے رکھ لیا تھا۔ میں یہ اعتراض کرنا چاہتا تھا کہ کسی بھی مسافر کا یہ قانونی حق ہوتا ہے کہ اس کا پاسپورٹ اس سے نہ لیا جائے مگر ایسا نہ کر سکا۔ میں اپنے احرام میں ملبوس اور سینڈل پہنے ہوئے اس مددگار کے ساتھ چل پڑا تھا جس نے سفید گاؤن اور سلیپر پہن رکھے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق لوگ ہمارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہمارے پاس سے گزرنے والے مختلف زبانیں بول رہے تھے۔ مجھے کسی کی بھی زبان نہیں آتی تھی۔ میری حالت زار دیکھنے کے قابل تھی۔

ایئر پورٹ کے بالکل سامنے ایک مسجد تھی اور ایئر پورٹ پر ایک چار منزلہ عمارت نظر آئی۔ ابھی تک صبح کی روشنی نہیں پھیلی تھی، ہوائی جہاز اڑ بھی رہے تھے اور اتر بھی رہے تھے۔ جہاں مجھے لے جایا جار ہا تھا۔ وہاں گھانا، انڈونیشیا، جاپان اور روس کے حجاج موجود تھے۔ جو منظر میری آنکھوں نے دیکھا شاید ہی اس جیسا رنگین منظر کسی کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کیا ہوگا۔ ہمیں چار منزلہ عمارت کی چوتھی منزل پر جانا تھا، ہمیں ہر نسل کے لوگ وہاں نظر آئے۔ ان میں چینی، افغانی اور انڈونیشی شامل تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے احرام کی جگہ ابھی تک اپنا قومی لباس پہن رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ نیشنل جیوگرافک میگزین کے رنگین صفحات ہیں۔

میرے گائیڈ نے چوتھی منزل پر پہنچ کر مجھے ایک ایسے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا جس میں پندرہ افراد موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر قالین پر سوئے ہوئے تھے۔ ان میں چند عورتیں بھی تھیں جن کے سر اور پاؤں ڈھکے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھا اردنی اور اس کی بیوی جاگ رہے تھے۔ انہوں نے بڑی اپنائیت سے مجھے دیکھا۔ دو مصری مسلمان اور ایک ایرانی اپنی جگہ سے اٹھے اور میری طرف اس وقت دیکھا

جب میرے گائیڈ نے ہمیں ایک کونے میں کر دیا تھا۔اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ نماز ادا کرنے کا طریقہ مجھے اشاروں سے بتائے گا۔ذرا تصور کیجیے کہ ایک مسلم وزیر کی حیثیت سے وہ شخص جو عالیجاہ محمد کی ''نیشن آف اسلام'' کا لیڈر بھی تھا اسے نماز ادا کرنے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔

میں نے اس کی نقل کرتے ہوئے وہی کیا جو وہ کر رہا تھا۔میں جانتا تھا کہ میں اسے صحیح طور پر نہیں کر رہا تھا۔مجھے یہ بھی احساس تھا کہ دوسرے مسلمانوں کی مجھ پر نظر تھی۔مسلمانوں کے ٹخنے جس طرح برسوں سے نماز کے دوران کام کر رہے تھے مغربی ٹخنے اس طرح بھلا کیسے کام کر سکتے تھے۔

ایشیائی جب بیٹھتے ہیں تو دو زانو ہو کر بیٹھتے ہیں اور مغربی کرسیوں پر سیدھا بیٹھنے کے عادی ہوتے ہیں۔جب میرا گائیڈ رکوع میں گیا تو میں پوری کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔میں قیام کی حالت میں بدستور کھڑا رہا۔ایک گھنٹے کے بعد میرا گائیڈ چلا گیا تھا اور یہ کہہ گیا تھا کہ وہ تھوڑی دیر بعد واپس آئے گا۔

میں نے سونے کے بارے میں تو سوچا بھی نہ تھا۔مسلمان مجھے دیکھ رہے تھے اور میں نماز ادا کرنے کی مشق کر رہا تھا۔میں نے اس بات کی بالکل پرواہ نہ کی کہ میں انہیں کس قدر مضحکہ خیز لگ رہا ہوں گا۔تھوڑی دیر بعد میں نے سجدے میں جانا سیکھ لیا تھا۔دو تین روز کے بعد میرے ٹخنے سوج گئے تھے۔

صبح ہوتے ہی یہاں سوئے ہوئے مسلمان جاگ گئے تھے۔انہیں فوراً ہی میرے بارے میں آگاہی ہو گئی تھی،ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور وہ سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔آج یہ راز مجھ پر کھلا تھا کہ قالین مسلمانوں کی زندگی میں کتنا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ہر شخص کے پاس ایک قالین نما جائے نماز ہوتی ہے،میاں بیوی یا اس سے زیادہ کا گروپ ہو تو بڑا قالین جائے نماز کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ان مسلمانوں نے اسی کمرے میں قالین پر نماز ادا کی۔پھر انہوں نے اسی قالین پر دستر خوان بچھا دیا تھا،یوں وہ قالین جس پر تھوڑی دیر پہلے نماز ادا کی گئی تھی اس وقت کھانے کی میز کا کام دے رہا تھا۔پھر دستر خوان لپیٹ کر برتن اٹھا لیے گئے تھے اور اب سب لوگ قالین پر بیٹھے ہوئے تھے جو رہائشی کمرہ بن گیا تھا۔پھر یہ لوگ سمٹ کر اسی قالین پر سو گئے تھے اور وہ قالین ان کے سونے والے کمرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔اس کمرے سے نکلنے سے قبل مجھ پر پہلی بار یہ منکشف ہوا کہ مال مسروقہ خریدنے والے نے مجھے ایک مشرقی قالین کی اتنی بھاری قیمت کیوں دی تھی جب میں بوسٹن جیل میں ایک ڈاکو کی حیثیت سے قید تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ جن ملکوں میں قالین بافی وہاں کی ثقافت کا حصہ ہے وہاں ان کی تیاری پر بہت محنت کی جاتی ہے۔

بعدازاں میں نے مکے میں قالین کا ایک اور استعمال دیکھا تھا۔ جب کبھی کوئی جھگڑا کھڑا ہو جاتا تو وہ شخص جسے نہایت عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور جو اس جھگڑے میں ملوث نہیں ہوتا تھا تو وہ قالین پر بیٹھ جاتا تھا اور جھگڑنے والے اس کے گرد بیٹھ جاتے تھے۔ یوں یہ قالین ایک عدالت کا کام دے رہا تھا۔ ایک اور جگہ اسے طلبہ کے کمرۂ جماعت میں بچھا کر اس سے کلاس روم کا کام لیا گیا تھا۔

ایک مصری مسلمان خاص طور پر مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ میں جواباً مسکرا دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ اس نے مجھے ''ہیلو'' کہا۔ میں نے اس سے نام پوچھا۔ اس نے انگریزی میں نیم نیم (نام) دُہرایا لیکن مطلب نہ سمجھ سکا تھا۔ ہم دونوں نے کوشش کی کہ ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھا سکیں مگر بے سود۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ وہ کوئی لفظ تو سمجھ لے۔ میں نے جب ''سکائی'' (آسمان) کہا تو اس نے بھی ''سکائی'' دہرایا۔ میں نے اب انگریزی میں کچھ اور کہنے کی کوشش کی.......... ''ہوائی جہاز......قالین۔ پاؤں۔ سینڈل۔ آنکھیں''۔ ایسے ہی چند اور الفاظ زبان سے ادا کیے کہ دیکھوں بھلا وہ انہیں بھی میرے بعد دُہرا سکتا ہے۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ میں ایک انسان سے بات کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں جو کچھ آتا گیا، میں کہتا گیا تھا۔ پھر میں نے کہا: ''محمد علی کلے''۔ وہاں جتنے مسلمان جمع تھے سب کے سب کرسمس کے درخت کی مانند روشن ہو گئے تھے۔ میرا وہ دوست میری طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا ''یُو۔ یُو (آپ ...آپ)'' یعنی آپ محمد علی کلے ہیں۔ میں نے کہا نہیں محمد علی کلے تو میرا دوست ہے۔ وہ میری بات کا آدھا مطلب سمجھ پائے تھے۔ کچھ بالکل نہ سمجھ سکے تھے مگر وہاں یہ بات پھیل گئی تھی کہ وہاں کاسس کلے آیا ہوا ہے، ہیوی ویٹ چیمپین کلے۔ مجھے بعد میں کسی نے بتایا تھا کہ پوری اسلامی دنیا یہ جانتی تھی کہ کس طرح سونی لسٹن کو کاسس کلے نے ہرا دیا تھا اور اسی موقعہ پر اس نے دنیا کو بتایا تھا کہ اس کا نام محمد علی کلے ہے اور اس کا دین اسلام ہے اور یہ فتح اسے اس کے اللہ نے دی تھی۔

ایک رشتہ وتعلق کا قائم کیا جانا ضروری تھا جو اس کمرے میں قائم ہو چکا تھا۔ میں ایک امریکی مسلمان تھا اور اب وہاں موجود افراد کی خواہش تھی کہ بات صرف مجھے دیکھنے تک محدود نہ رہے کچھ آگے بھی بڑھے۔ اب رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی مسکرا رہے تھے۔ وہ میرے قریب آ گئے تھے۔ اب وہ مجھے حیرت و استعجاب سے نہیں بلکہ دوستانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ میرا معائنہ کر رہے تھے مگر بہت دوستانہ ماحول میں۔ یوں لگتا تھا جیسے میں کوئی مریخ سے اترنے والی مخلوق تھا۔

میرا گائیڈ واپس آ گیا تھا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ اس نے نیچے والی منزل پر مسجد کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے نماز فجر کے لیے وہاں لے جانا چاہتا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ ہم ہزاروں حجاج کے قریب سے گزر رہے تھے۔ وہ ہر زبان بول رہے تھے سوائے انگریزی کے۔ میں اپنے آپ سے شکوہ کر رہا تھا کہ امریکہ سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے نماز ادا کرنے کا طریقہ کیوں نہ سیکھ لیا تھا۔ عالیجاہ کی نیشن آف اسلام (این او آئی) میں ہم نے نماز عربی میں کبھی نہ پڑھی تھی۔ بارہ سال پہلے میں جب جیل میں تھا تو بوسٹن میں ایک اسلامی تحریک چلی تھی جس کے ایک رکن عبدالحمید میرے پاس آئے تھے۔ بعد میں انہوں نے مجھے عربی میں طبع شدہ نماز بھی بھجوائی تھی۔ میں نے وہ یاد تو کر لی تھی لیکن اسے استعمال کبھی نہ کیا تھا۔

میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا کہ میرا گائیڈ نماز ادا کرنے کی ابتدا کرے گا۔ مسجد کے باہر وضو کا انتظام تھا جہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ نماز پڑھنے سے پہلے وضو ضروری تھا، یہ بات میں جانتا تھا۔ گائیڈ نے مجھے وضو کر کے دکھایا بھی تھا لیکن میں پوری طرح سمجھ نہیں سکا تھا۔ اس کا ایک خاص طریقہ ہے جو ایک پیدائشی مسلمان تو جانتا ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وضو کا جو مقررہ طریقہ ہے، وضو اسی طرح کیا جائے۔

میں مسجد کے اندر بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ وہ سجدے میں چلا گیا تھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی تھی...... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے آغاز کیا تھا۔ اب میں نماز میں پڑھے جانے والے عربی الفاظ نہیں دہرا رہا تھا تاہم ہونٹ ضرور ہلا رہا تھا تاکہ یہ پتا چلے کہ میں کچھ پڑھ رہا ہوں۔

میرا مطلب ہرگز ہرگز اس آواز کا مذاق اڑانا نہیں ہے۔ میں بھلا ایسی گستاخی کہاں کر سکتا تھا۔ جو جو مجھے دیکھ رہے تھے ان میں سے کوئی بھی مجھے یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ میں وہ نہیں پڑھ رہا تھا جو دوسرے پڑھ رہے تھے۔

اسی روز، کچھ دیر بعد: میں اپنی منزل پر کھڑا نیچے صحن میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے بطور کچھ کھوج لگانے کی کوشش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں سیڑھیاں اتر کر نیچے والی منزل پر آ گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں کہیں دور نہ نکل جاؤں اس لیے میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ ابھی 45 منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ میں دوبارہ نیچے پہنچ گیا تھا۔ اب میں راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے کچھ آگے نکل گیا تھا۔ مجھے اس عمارت کے

صحن میں ایک ریسٹوران دکھائی دیا۔اس میں بہت سے لوگ موجود تھے اور دنیا بھر کی زبانوں کے الفاظ ایک دوسرے کے کانوں سے ٹکرار ہے تھے۔میں نے اشارے سے ایک بُھنا ہوا مرغ منگوایا اس کے ساتھ میں نے آلو کے چپس کا آرڈر بھی اشارے سے دیا تھا۔میں مزے مزے سے بیٹھا مرغ کھا رہا تھا اور کھاتے ہوئے چھری کانٹے کی جگہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں میرا ساتھ دے رہی تھیں۔میرے اردگرد بیٹھے ہوئے تمام مسلمان اسی طرح کھا رہے تھے۔میں نے ستر سالہ معمر لوگ بھی یہاں دیکھے تھے جو کھانے میں مصروف تھے۔ یہ لوگ کھانا ایک جگہ مل بیٹھ کر کھاتے تھے،ایک ہی قالین پر قریب قریب سو جاتے ہیں۔حج کے موقعہ پر انسان کی اس وحدت کا مظاہرہ ہو رہا تھا جو ایک خدائے واحد کے بندے تھے۔

میں نماز مغرب ادا کر چکا تھا۔میں چوتھی منزل پر اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ اندھیرے میں سے اچانک ایک روشنی برآمد ہوئی۔

یہ دراصل اچانک ذہن میں پیدا ہونے والا ایک خیال تھا۔میں نے تھوڑی دیر پہلے نیچے صحن میں چار آدمی دیکھے تھے، یہ کوئی افسر تھے اور ان کے پاس ٹیلیفون بھی تھا۔میں نے سوچا کیوں نہ اُن سے جا کر ملا جائے اور فون نے مجھے یاد دلایا تھا کہ مجھے ڈاکٹر صاحب نے کتاب کے مصنف کے بیٹے کا فون نمبر دیا تھا جس کا نام عمر عظام تھا اور جو جدہ میں رہتا تھا۔

میں بغیر وقت ضائع کیے نیچے پہنچ گیا تھا جہاں میں نے وہ چار افسر بیٹھے دیکھے تھے۔ان میں سے ایک اپنا مطلب بیان کرنے کی حد تک انگریزی بول لیتا تھا اور پڑھ بھی سکتا تھا۔میں نے اسے ڈاکٹر شوار بی کا خط دکھایا۔اس نے خط پڑھا۔اب اس نے وہ خط باقی کے تین افسروں کو پڑھ کر سنایا۔وہ بیک زبان بول اٹھے ''ایک امریکی مسلمان''......ان کا تجسس بڑھ گیا تھا۔وہ بہت متاثر دکھائی دیتے تھے۔ان میں سے جو افسر انگریزی بول سکتا تھا میں نے اس سے التماس کی کہ ڈاکٹر شوار بی کے دیئے ہوئے فون نمبر پر میری بات ڈاکٹر عمر عظام سے جدہ میں کرا دے۔اس نے بخوشی فون ملا دینے پر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔اس نے فون نمبر ملا کر کسی سے عربی میں گفتگو شروع کر دی تھی۔

ڈاکٹر عمر عظام سیدھا ایئرپورٹ آ گیا تھا۔ان چار افسروں کی موجودگی میں اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے خوش آمد کہا۔وہ ایک نوجوان، دراز قد، صحت مند انسان تھا۔اس کا قد 6 فٹ تین انچ تھا۔وہ بے حد نفیس، خوش اخلاق اور خوش کلام انسان لگتا تھا۔وہ امریکا میں ہوتا تو اسے سفید فام کہا جاتا مگر جس طرح کا اس کا

رویہ تھا وہ سفید فام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا: ''مجھے آپ نے یہاں پہنچتے ہی فون کیوں نہیں کیا؟'' اس نے اپنی شناخت کرانے کے بعد ان افسروں سے فون استعمال کرنے کی اجازت چاہی۔ وہ عربی میں ایئر پورٹ کے کچھ افسروں سے بات کر رہا تھا۔ اس نے اس شخص سے جس سے وہ فون پر مخاطب تھا آنے کے لیے کہا۔

نصف گھنٹے سے بھی کم وقت میں اس نے مجھے وہاں سے آزاد کرا لیا تھا۔ کسٹم کے عملے سے میرا پاسپورٹ، سوٹ کیس لے لیا گیا تھا۔ اب ہم ڈاکٹر غلام عظام کی کار میں تھے اور کار فراٹے بھرتی جدہ شہر میں سے گزر رہی تھی۔ میں احرام میں ملبوس تھا اور میرے پاؤں میں سینڈل تھے۔ اس مہربان شخص کے حسن سلوک نے مجھے گنگ کر دیا تھا۔ مجھے واقعی اب یہ یقین ہو گیا تھا کہ ہم دونوں میں بطور انسان کوئی فرق نہ تھا۔ میں نے برسوں مسلمانوں کی مہمان نوازی کے قصے سنے تھے مگر ایسی گرم جوشی، اتنی محبت، اس قدر خلوص، یہ اخوت و بھائی چارے کی مثال اس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے ڈاکٹر عظام سے کئی سوالات کیے، وہ پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا اور اس نے سوئٹزرلینڈ میں تربیت حاصل کی تھی۔ اس کا شعبہ شہری منصوبہ بندی تھی۔ سعودی حکومت نے اقوام متحدہ سے اس کی خدمات مستعار لی تھیں تاکہ سعودیہ کے تمام مقاماتِ مقدسہ میں از سر نو تعمیر کے کاموں کی نگرانی ہو سکے۔ ڈاکٹر عظام کی ہمشیرہ شہزادہ فیصل کے بیٹے کی بیوی تھی۔ میں اس وقت سعودی عرب کے بادشاہ کے بیٹے کے برادر نسبتی کی کار میں تھا۔ یہ سب انتظام اللہ نے میرے لیے کیا تھا۔ ڈاکٹر عظام نے کہا: ''میرے ابا آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے''۔ یہ وہی مصنف تھے جنہوں نے مجھے اپنی کتاب بھیجی تھی۔

میں نے اس کے ابا کے بارے میں چند سوالات پوچھے۔ ان کا نام عبدالرحمٰن عظام تھا اور وہ عظام پاشا یا سردار عظام کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ یہ خطاب اس وقت تک استعمال ہوتا رہا جب تک جمال عبدالناصر (70-1918ء) صدر مصر نے ایسے تمام خطابات حکماً ختم نہیں کر دیئے تھے۔ ڈاکٹر عظام نے کہا: ''ہمارے پہنچنے پر وہ گھر پر ہی ہوں گے۔ وہ اپنا زیادہ وقت نیویارک میں اقوام متحدہ کے کام میں صرف کرتے ہیں اور انہوں نے آپ کو سمجھنے میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے''۔

میں لاجواب ہو گیا تھا............

عدالت عالیہ: رات کے کھانے پر مجھے بتایا گیا تھا کہ میرے معاملے میں ایک جج کمیٹی تشکیل

دے دی گئی ہے۔ جس کا نوٹیفکیشن بھی ہو چکا ہے اور اگلی صبح مجھے اس کے سامنے پیش ہونا ہے اور میں مقررہ صبح کو وہاں موجود تھا۔

جج کا نام شیخ محمد ہارکن تھا۔ عدالت میں سوائے میرے اور ہندوستان سے تعلق رکھنے والی ایک بہن کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا۔ یہ بہن کسی زمانے میں پروٹیسٹنٹ رہ چکی تھی۔ یہ بھی میری طرح اسلام لے آئی تھی اور حج کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ گندمی تھا، چہرہ چھوٹا سا جو حجاب جب میں چھپا ہوا تھا۔ جج ایک مہربان اور شفیق انسان تھا جو دیکھنے والوں کو متاثر کرتا تھا۔ ہم نے آپس میں گفتگو کی۔ اس نے مجھ سے کچھ سوالات کیے جن سے وہ میرے اخلاص اور سچائی کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے ہر سوال کا جواب سچ سچ دیا تھا۔ اس نے نہ صرف مجھے ایک مسلمان کے طور پر تسلیم کر لیا تھا بلکہ مجھے دو کتابیں بھی پیش کیں، ایک انگریزی میں، دوسری عربی میں۔ اس نے سچے مسلمانوں کے رجسٹر میں میرا نام درج کر لیا تھا۔ اب ہم ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے۔ مجھے رخصت کرتے وقت جج نے کہا: ''مجھے امید ہے آپ امریکا میں اسلام کے ایک عظیم مبلغ کے طور پر زندگی گزاریں گے''۔ میں نے کہا میں اِنشاء اللہ پوری کوشش کروں گا کہ اس مشن کو پورا کر سکوں۔

عظام کا خاندان اس قدر معزز اور محترم تھا کہ مجھے مکہ جانے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ میں نے جدہ پیلس نامی ہوٹل میں لنچ کیا۔ پھر میں کئی گھنٹے سویا رہا کہ ٹیلی فون نے مجھے جگا دیا تھا۔

شہزادہ فیصل کے افسرِ اعلیٰ تقریبات محمد عبدالعزیز مجید فون پر تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک خاص کار مجھے رات کے کھانے کے فوراً بعد مکہ لے جائے گی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں کھانے پینے کا خاص خیال رکھوں کیونکہ حج کی رسوم کی ادائیگی کے لیے بڑی قوت اور توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

میری حیرت کی انتہا نہ تھی۔ میرے ساتھ مکے تک دو نوجوان عرب تھے۔ جدید اور نئے ماڈل کی بہت قیمتی موٹر کار میں سفر بہت آرام دہ تھا۔ جہاں جہاں کار روکی گئی تھی۔ فوراً گزرنے کا اشارہ مل گیا تھا۔ میں بیک وقت بے حد خوش بھی تھا، اہم بھی، عجز و انکساری کا پتلا بھی اور ممنون و شکر گزار بھی۔

ہم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو یہ شہر مجھے اتنا ہی قدیم نظر آیا جتنا قدیم وقت خود تھا۔ ہماری کار سڑکوں کے ان موڑوں پر رفتار کم کر لیتی تھی جہاں دونوں طرف دکانیں تھیں۔ جس طرف میری نظر اٹھتی تھی موٹر کاریں، بسیں، ہزاروں حجاج دکھائی دیتے تھے جو دنیا بھر سے حج ادا کرنے آئے تھے۔

کار ایک جگہ رکی تو معلوم ہوا کہ ایک مطوف وہاں میرا منتظر تھا۔ اس نے ویسا ہی سفید چغہ اور سر پر سفید ٹوپی پہن رکھی تھی جو میں نے ایئرپورٹ پر دیکھی تھی۔ یہ ایک پست قد، کالی رنگت والا عرب تھا جس نے اپنا نام محمد بتایا تھا۔ اسے انگریزی بالکل نہیں آتی تھی۔

ہم نے گاڑی مسجد حرام کے بالکل نزدیک پارک کی تھی۔ ہم نے وضو کیا اور مسجد کے اندر داخل ہوئے۔ حجاج کی تعداد تھی کہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا انسانوں کا سمندر تھا۔ کچھ لیٹے ہوئے تھے، کچھ سو رہے تھے، کچھ دعائیں مانگ رہے تھے، کچھ طواف کعبہ میں مصروف تھے۔ یہ اللہ کا گھر تھا جہاں کوئی کسی کو روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔

خانہ کعبہ کے گرد بنی ہوئی نئی مسجد کو اگر میں الفاظ میں بیان کرنا چاہوں تو میرا ذخیرۂ الفاظ ختم ہو جائے گا اور میں لکھ نہ سکوں گا۔ میں بہت خوش تھا کہ اس مسجد کے توسیعی کام میں بھی ڈاکٹر عظام کا حصہ تھا جس کی نگرانی میں یہ کام ہو رہا تھا اور جو میرا میزبان تھا۔ مسجد حرام کا توسیعی حصہ جب تعمیر کی تکمیل تک پہنچ گیا تو یہ ہندوستان کے تاج محل سے خوبصورتی میں سبقت لے جائے گا۔

میں نے اپنے سینڈل اٹھا رکھے تھے اور میں مطوف کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میری نظر اس عظیم مسجد کے بالکل وسط میں ایک بہت بڑے سیاہ پتھر کے گھر پر پڑی یہ کعبہ تھا۔ ہزاروں حجاج اس کے گرد چکر لگا رہے تھے جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ہر عمر، ہر شکل ہر رنگ و نسل کے لوگ جن کا تعلق دنیا کے مختلف ملکوں سے تھا۔ میں یہ جانتا تھا کہ کعبے پر پہلی نظر پڑے تو کیا دعا مانگتے ہیں۔ میرا تو پورا جسم تمام حسیات سے عاری ہو گیا تھا۔ میرا مطوف مجھے حجاج کے ہجوم میں طواف کرا رہا تھا، وہ حجاج جو دعائیں مانگ رہے تھے اور جنہوں نے کعبہ کے گرد سات چکر مکمل کرنے تھے۔ کچھ حجاج اتنے بوڑھے تھے کہ ان کی کمر جھک گئی تھی۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جو ذہن پر ثبت ہو جاتا تھا۔ ایسے معذور حجاج بھی تھے جو چل پھر نہ سکتے تھے اور انہیں دوسروں نے اٹھا رکھا تھا اور طواف کرا رہے تھے۔ ساتویں چکر پر میں نے دو رکعتیں ادا کی تھیں۔ میں سجدے میں گر کر دیر تک فرش پر اپنی جبینِ نیاز کو رگڑتا رہا تھا۔

میں جس دوران سجدے میں تھا اس وقت مطوف نے لوگوں کو مجھ سے دور رکھا تا کہ میں ان کے نیچے نہ آؤں۔ اس کے بعد میں نے اور مطوف نے چاہ زم زم پر جا کر پانی پیا۔ پھر سعی کے لیے صفا و مروہ پر چلے گئے تھے جہاں حضرت ہاجرہؑ اپنے فرزند اسمٰعیل کے لیے پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں۔

عرفات کی جانب روانگی: اس کے بعد میں تین مختلف اوقات میں مسجد حرام گیا تھا تاکہ طواف کرلوں۔ اگلے روز طلوع آفتاب سے قبل ہم عرفات کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ ہم میں سے ہزاروں افراد بیک آواز ''لبیک۔ لبیک اللھم لبیک'' اور ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند کر رہے تھے۔ مکے کے اردگرد بے آب و گیاہ پہاڑ ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ پہاڑ آتش فشاں سے نکلنے والے لاوے کے کنھگروں سے بنے ہیں۔ سبزے کا ان پر نام ونشان بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ ہم یہاں دوپہر کو پہنچے تھے اور غروب آفتاب تک دعائیں مانگتے رہے تھے۔ ہم نے یہاں عصر اور مغرب کی نماز ادا کی تھی۔

بالآخر ہم نے اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے اور دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ ہم قرآنِ پاک کی آیات بھی پڑھتے جاتے تھے: ''آپ کہہ دیجیے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک (ہی) ہے۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے''۔

جبلِ عرفات پر کھڑے ہو کر حج مکہ کی تمام ضروری رسوم ادا کر دی گئی تھیں۔ جس کسی کو ان میں شرکت کا موقعہ نہ مل سکا تھا وہ اپنے آپ کو حاجی نہیں کہلا سکتا تھا۔

اب احرام کی پابندی ختم ہو گئی تھی۔ ہم نے شیطان کو سات کنکریاں بھی ماری تھیں۔ کچھ حجاج نے بال بھی کٹوا لیے تھے اور ڈاڑھیاں بھی۔ میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں شیو نہیں کروں گا۔ میں سوچ رہا تھا کہ نیویارک واپسی پر میری بیوی بچے جب مجھے ڈاڑھی کے ساتھ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ نیویارک مجھے یہاں سے کئی ملین میل دور لگتا تھا۔ وہاں سے آنے کے بعد میں ایک اخبار بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہاں کیا حالات ہوں گے۔ ایک نیگرو رائفل کلب جو ہارلم میں پچھلے 12 برس سے زیادہ عرصے سے موجود تھا، پولیس نے اسے دریافت کرلیا تھا اور یہ بات مشہور کر دی گئی تھی کہ اس کے پیچھے میرا ہاتھ تھا۔ عالیجاہ محمد کی نیشن آف اسلام کا مقدمہ میرے خلاف عدالت میں چل رہا تھا۔ مجھے اور میرے خاندان کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ ہم وہ گھر خالی کر دیں جس میں ہم لانگ آئی لینڈ میں رہتے تھے۔ امریکہ کے بڑے اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی ذرائع ابلاغ کے قاہرہ میں نمائندے تھے جو مجھے ہر طرف تلاش کر رہے تھے۔ یہ مجھ سے نیویارک میں برپا ہونے والے اس ہنگامے کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا چاہتے تھے جس کا سرے سے مجھے علم ہی نہ تھا اور مجھے خواہ مخواہ اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا تھا۔

مکہ مکرمہ سے ارسال کیے گئے خطوط: میں نے ڈاکٹر شوار بی کو خط لکھا تھا جس نے میری سچائی پر یقین کیا تھا اور مجھے مکہ جانے کا پاسپورٹ ملا تھا۔

میں رات بھر ان تمام احباب کو خط لکھتا رہا تھا جو میرے بہت قریب تھے۔ ان میں عالیجاہ محمد کا بیٹا ویلس محمد بھی تھا جس نے مجھ سے اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا کہ نیشن آف اسلام کے لیے نجات کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ صحیح العقیدہ اسلام کو تسلیم بھی کر لے اور اسی کی تبلیغ کرے۔

میں نے اپنی نئی تشکیل شدہ مسلم مسجد (سند یافتہ) ہارلم میں اپنے فرمانبردار معاونین کو بھی خط لکھا تھا۔ جس کے ساتھ میں نے ایک نوٹ بھی منسلک کیا تھا کہ میرے اس خط کی نقول پریس کو ضرور دے دیں۔

میں جانتا تھا کہ جب میرے خط کا علم واپس امریکہ میں لوگوں کو ہوگا تو بہت سے حیران ہوں گے۔ ان میں مجھ سے محبت کرنے والے دوست احباب، اور دشمن بھی شامل ہوں گے اور کئی ملین ایسے لوگ بھی کم حیران نہیں ہوں گے جنہیں میں جانتا ہی نہ تھا کیونکہ میرے عالیجاہ محمد کے ساتھ گزرے بارہ برسوں کے دوران تو انہوں نے میلکم ایکس کی جو تصویر بنائی تھی اس سے یہ نفرت کرتے تھے۔

میں خود بھی حیران تھا لیکن میری زندگی میں اس خط کی ایک مثال موجود تھی۔ میری تمام عمر تبدیلیوں کا مجموعہ تھی۔ جو میں نے لکھا تھا اور دل کی گہرائیوں سے لکھا تھا وہ یہ تھا:

اس قدیم سرزمین مقدس میں تمام رنگ و نسل کے لوگوں نے جس مہمان نوازی اور سچے بھائی چارہ کا مظاہرہ مجھ سے کیا ہے، یہ میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ محمد الرسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیمؑ کا وطن ہے اور ان تمام پیغمبروں کا وطن ہے جن پر آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔ پچھلے ہفتے سے میری زبان بالکل گنگ ہے اور میں حیرت سے بت بنا بیٹھا ہوں کہ میرے اردگرد تمام رنگ و نسل کے جو لوگ موجود ہیں انہوں نے مجھے اتنی محبت دی ہے جس کا میں کبھی تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

''مجھ پر اپنے اللہ کا یہ کرم بھی ہوا ہے کہ میں مکہ دیکھ چکا ہوں۔ میں نے کعبے کے گرد سات چکر بھی لگائے ہیں، جن میں میرا مطوف محمد میرے آگے آگے تھا۔ میں نے آب زم زم بھی پیا ہے میں سات بار صفا مروہ کی پہاڑیوں میں سعی بھی کر چکا ہوں۔ میں نے منیٰ میں بھی نماز ادا کی ہے، دعائیں مانگی ہیں اور میں نے جبل عرفات پر بھی نمازیں ادا کی ہیں۔

''لاکھوں حجاج تھے جو دنیا بھر سے آئے تھے۔ یہ تمام رنگ ونسل کے تھے۔ نیلی آنکھوں والے بھی اور سیاہ فام افریقی بھی لیکن ہم سب ایک ہی مناسک حج بلا کسی امتیاز کے ساتھ ادا کر رہے تھے۔ اتحاد اور اخوت و بھائی چارے کی اس سے بڑی مثال بھلا اور کہاں مل سکتی ہے۔ جبکہ امریکا میں تو ہمیشہ یہ سوچا کرتا تھا کہ سفید فام اور سیاہ فام کے درمیان اتحاد اور بھائی چارہ کی فضا قائم ہونی ممکن نہ تھی۔

''امریکہ کو ضرورت ہے اسلام کو سمجھنے کی کیونکہ یہی وہ واحد مذہب ہے جو معاشرے سے نسلی امتیاز کے مسئلے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ میں اسلامی دُنیا میں جہاں کہیں بھی گیا میں ان سفید فام انسانوں سے ملا، ان سے بات کی، ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اسلام نے ان کے ذہنوں سے سفید فاموں جیسا رویہ اور سلوک نکال دیا تھا۔ میں نے اس سے پہلے اخلاص وسچائی پر مبنی اخوت و بھائی چارے کی عملی شکل تمام رنگ ونسل کے لوگوں میں موجود کبھی نہ دیکھی تھی۔

''آپ کو میری طرف سے ہوسکتا ہے یہ سن کر صدمہ پہنچے کہ اس حج کے دوران جو میں نے دیکھا اور جو تجربہ مجھے ہوا اس نے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ میں اپنے پرانے خیالات تبدیل کر لوں اور کچھ ایسے فیصلے جو میں نے اس سے پہلے کیے تھے انہیں یکسر مسترد کر دوں۔ مجھے یہ مشکل بالکل نہیں لگ رہا کیونکہ بوجود اپنے راسخ عقیدے کے میں ہمیشہ ایک ایسا انسان رہا ہوں جو حقائق سے آنکھیں ملا سکتا ہو اور زندگی کی حقیقت کو ایک نئے تجربے اور نئے علم کے طور پر قبول کر لے۔ میں ہمیشہ سے ایک کھلے ذہن کا مالک انسان رہا ہوں جس کی اس لچک کے لیے ضرورت ہوتی ہے جو سچائی کے لیے ہر قسم کی ذہانت آمیز تحقیق میں ہاتھ میں ہاتھ لیے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

''اس اسلامی دنیا میں گذشتہ گیارہ دنوں میں، میں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھایا، ایک ہی گلاس میں پانی پیا، ایک ہی جیسے بستر اور قالین پر سویا ہوں ......اور ایک ہی خدائے واحد کی عبادت کی ہے۔ یہ وہ مسلمان تھے جن میں سے کچھ نیلی آنکھوں والے تھے، جن کے خوبصورت بال تھے، جو سفید فام تھے۔ یہ اپنے قول وفعل میں ''سفید فام'' مسلمان تھے۔ مجھے ان میں وہی خلوص محسوس ہوا جو مجھے نائیجیریا، سوڈان اور گھانا کے سیاہ فام افریقی مسلمانوں میں محسوس ہوا تھا۔

''ہم سچ مُچ آپس میں بھائی بھائی تھے۔ اس لیے کہ ایک خدائے واحد پر ایمان نے ان کے ذہنوں سے ''سفید فام'' کو مٹا دیا تھا۔ ''سفید فام'' ان کے طرزِ عمل سے نکل گیا تھا اور ''سفید فام'' ان کے رویئے اور ان

کی طرزِ زندگی سے نکل گیا تھا''......

ایک امریکی مُسلمان: شہزادہ فیصل سعودی عرب کا مطلق العنان حکمران تھا جس نے مجھے حکومت کا مہمان بنا کر رکھا تھا۔ اس سے مجھے بہت سے فوائد حاصل تھے۔ مجھے ایک ڈرائیور سمیت کار ملی ہوئی تھی جو مجھے دن بھر مکے کے مختلف اہم مقامات پر لے جاتی تھی۔ اس شہر کا کچھ حصہ تو اتنا قدیم تھا جتنا قدیم خود وقت تھا جبکہ باقی کے حصے میامی کے مضافات سے ملتے جلتے تھے۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میں نے اس سرزمین کو کن جذبات سے چُھوا تھا جس پر چار ہزار سال قبل اللہ کے عظیم پیغمبروں نے اپنے مبارک قدم رکھے تھے۔

''امریکی مسلمان'' کا سنتے ہی لوگوں میں تجسس اور دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔ مجھے اکثر و بیشتر محمد علی کلے سمجھا جاتا تھا۔ ایک مقامی اخبار نے میری اور کاسس کلے کی ایک تصویر اقوام متحدہ میں اکٹھے ہونے کی چھاپ دی تھی۔ میرے ڈرائیور سے جو میرا ترجمان بھی تھا لوگ محمد علی کلے کے بارے میں بہت سے سوالات پوچھتے تھے۔ یہاں تک کہ بچے بھی کلے سے محبت کرتے تھے اور وہ پوری اسلامی دنیا میں محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی تھی کہ افریقا اور ایشیاء کے سینما گھروں میں اس کے مقابلے پر مبنی فلم دکھائی گئی تھی۔ اس زمانے میں محمد علی کلے نے پورے افریقا میں لوگوں کے دل و دماغ میں جگہ بنالی تھی۔

میری کار مجھے جبل عرفات پر اور منیٰ میں خصوصی نمازوں کی ادائیگی کے لیے جاتی تھی۔ سڑکیں اتنی خراب اور خستہ حال تھیں کہ یہ ڈرائیور معلوم نہیں کس طرح ان پر کاریں چلایا کرتے تھے۔ خوفناک ٹریفک، بریکوں کی آوازیں، الٹتی ہوئی کاریں اور بلاوجہ بجائے جانے والے ہارن...... میرے خیال میں سرزمین مقدس میں اس قسم کی ساری ڈرائیونگ اللہ کے نام پر کی جاتی تھی۔ میں نے نماز عربی میں پڑھنے کی مشق کر لی تھی۔ اس وقت میری سب سے بڑی مشکل جسمانی تھی۔ جس طرح نماز ادا کی جاتی تھی میں اس کا عادی نہ تھا۔ اس لیے میرے ٹخنے سوج گئے تھے اور مجھے درد محسوس ہوتا تھا۔

لیکن اسلامی دنیا کی رسمیں اب مجھے اجنبی نظر نہیں آتی تھیں۔ اب میں اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کی پلیٹ میں، ان کے ساتھ مل کر کھا سکتا تھا۔ میں جس گلاس میں میرا کوئی مسلمان بھائی پانی پیتا تھا اسی میں سے پانی پی لیتا تھا۔ میں وضو اسی لوٹے سے کرتا تھا جس سے میرے کئی مسلمان بھائی کرتے

تھے۔ میں کھلے آسمان تلے اس چٹائی پر سو جاتا تھا جس پر آٹھ دس اور لوگ بھی سوئے ہوتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ مزدلفہ میں ایک رات میں آسمان تلے اپنے مسلمان بھائیوں کے درمیان صبح تک کروٹیں بدلتا رہا تھا کہ مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ پھر مجھے پتا چلا کہ دنیا کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے حجاج، ہر رنگ کے، ہر نسل اور ہر طبقے کے، بڑے بڑے افسر اور چھوٹے عہدیدار سبھی یکساں طور پر ایک ہی زبان میں خراٹے لیتے تھے......

یہ تاریخ کا سب سے بڑا حج تھا، یہ مجھے بعد ازاں کسی نے بتایا تھا۔ صرف ترکی سے 600 بسیں اور 50 ہزار سے زیادہ حجاج آئے تھے۔ میں یہ خواب دیکھا کرتا تھا کہ وہ دور کب آئے گا جب بحری اور ہوائی جہاز امریکی مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں مکے لایا کریں گے۔

ہجوم میں رنگ کا ایک نمونہ نظر آتا تھا۔ ایک بار یہ نظر آیا تو بعد میں بھی ہر بار یہی دکھائی دیا تھا۔ میرا تعلق چونکہ امریکا سے تھا اس لیے میں رنگ کے معاملے میں بہت حساس تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ہی رنگ کے لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور زیادہ دیر تک اکٹھے رہتے ہیں۔ یہ سب رضا کارانہ طور پر ہوتا تھا کسی دباؤ کے تحت نہیں نہ ہی اس کا کوئی اور سبب تھا۔ افریقی افریقیوں کے ساتھ اور پاکستانی پاکستانیوں کے ساتھ ہوتے تھے۔ میں نے اس بات کو ذہن نشین کر لیا تھا کہ امریکا واپس جا کر میں امریکیوں کو اپنے اس مشاہدے کے بارے میں بتاؤں گا کہ دنیا میں ایک جگہ ایسی بھی ہے جہاں ہر رنگ کے لوگ اخوت و بھائی چارے کی تسبیح میں پروئے ہوئے ہیں۔ جہاں رنگ کی بنیاد پر کسی کو دور نہیں رکھا جاتا۔ جہاں احساس برتری یا کہتری کا کوئی وجود نہیں۔ پھر رضا کارانہ طور پر لوگوں کے درمیان جو قدرتی طور پر قدر مشترک ہوتی ہے وہ اس کی بنیاد پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

میں جہاں کہیں بھی جاتا مجھ سے امریکا میں پائی جانے والی نسل پرستی اور نسلی امتیازات کے بارے میں ضرور سوالات پوچھے جاتے تھے۔ گو میرا پس منظر بھی یہی تھا مگر مجھے حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ امریکا میں پائے جانے والے نسلی امتیازات کے بارے میں لوگ اس قدر شدت سے کیوں کر سوچتے ہیں۔

مقاماتِ مقدسہ میں مجھے سینکڑوں ایسے مواقع ملے جہاں میں دنیا بھر کے ممالک سے آئے ہوئے امیر و غریب، تمام طبقات کے لوگوں سے بات کرتا تھا اور میں نے کوئی موقعہ ایسا ضائع نہیں کیا تھا جہاں میں

نے امریکا کے سیاہ فام باشندوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ذکر نہ کیا ہو۔ میں اپنے ترجمان کی مدد سے امریکی سیاہ فام انسانوں کی حالت زار کے بارے میں ہر شخص کو آگاہ کر رہا تھا۔ میں نے اس کی تبلیغ جبل عرفات پر بھی کی، میں نے اس کا ذکر پیلس ہوٹل، جدہ کی لابی میں بیٹھ کر بھی کیا۔ میں ایک ایک کی طرف اشارہ کر کے بتایا کرتا تھا کہ تم، ہم اور تم بھی امریکا میں ''سیاہ فام'' کہلاؤ گے۔ تم پر بم پھینکا جائے گا، تمہیں گولی ماری جاسکتی ہے، مارا پیٹا جاسکتا ہے۔ تمہیں محض اس لیے آگ لگائی جاسکتی ہے کہ تم سیاہ فام ہو، تمہارے ساتھ اس ناکردہ جرم کی سزا کے طور پر جانوروں جیسا سلوک ہوگا۔

جہاں بہت غریب حجاج مجھے تبلیغ کرتے دیکھتے وہیں دنیائے اسلام کی اہم ترین شخصیتیں بھی مجھے سنا کرتی تھیں۔ میں نیلی آنکھوں اور خوبصورت بالوں والے حسین امینی، مفتی اعظم یروشلم سے بھی یہی بات کیا کرتا تھا۔ ہمارا تعارف عرفات پر ترکی کے قاسم گلک نے کرایا تھا، جو رکنِ اسمبلی تھا۔ یہ دونوں حضرات اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور دونوں نے امریکا کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ قاسم نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ میں نے عالیجاہ سے اپنا تعلق کیوں ختم کر دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں امریکا کے سیاہ فام انسانوں کے اتحاد کے مفاد کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

میں نے مکے کے میئر شیخ عبداللہ عارف سے بھی بات کی تھی۔ وہ جب صحافی تھا تو اس نے مکہ کی بلدیہ کے طریق کار پر تنقید کی تھی اور شہزادہ فیصل نے اسے میئر بنا دیا تھا تاکہ یہ دیکھا جائے کہ وہ اس معاملے میں کیا بہتری کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص اس بات کا معترف تھا کہ نیا میئر پہلے سے بہتر کام کر رہا تھا۔ تیونس ٹی وی سٹیشن کے اسد محمد نے اپنے پارٹنر کے ساتھ مل کر فلم بنائی تھی ''دی مسلم فرام امریکا'' (ایک امریکی مسلمان یا امریکا سے آیا ہوا ایک مسلمان) اسی نے ایک بار شکاگو، امریکا میں عالیجاہ محمد کو بھی انٹرویو کیا تھا۔

جدہ پیلس ہوٹل کی لابی مجھے ایسے سامعین فراہم کرتی تھی جو مختلف ملکوں کے سرکردہ افراد ہوتے تھے اور جو ''امریکی مسلمان'' کو سننے کا بڑا شوق رکھتے تھے۔ میں بہت سے ایسے افریقیوں سے بھی یہیں ملا تھا جو یا تو خود کچھ عرصہ امریکا میں رہ کر آئے تھے یا انہوں نے دوسرے افریقیوں کی زبانی امریکا میں سیاہ فام باشندوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے بارے میں تصدیق کر لی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک روز ایک کابینہ کے وزیر نے جس کا تعلق افریقا سے تھا (جو عالمی حالات پر گہری نظر رکھتا تھا) مجھے بتایا کہ وہ اکثر امریکا جاتا رہتا ہے، شمالی امریکا بھی اور جنوبی بھی مگر وہ دانستہ اپنا قومی لباس نہیں پہنتا۔ جب وہ یہ بات کر رہا تھا اس وقت اس

کی آنکھوں سے امریکا کے خلاف نفرت کی آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔اس نے کہا: ''امریکا کا سیاہ فام کچلا بھی جا رہا تھا پھر بھی اس قدر خاموش، مطمئن اور آسودہ خاطر کیوں ہے؟ وہ ایک انسان ہونے کے ناطے اس زیادتی کے خلاف لڑتا کیوں نہیں......''

''امریکی مصنفین نے جو مقاماتِ مقدسہ میں سب سے زیادہ پڑھے جاتے تھے، امریکی سیاہ فام کے بارے میں معلومات عام کرنے میں بڑا کام کیا تھا۔ جیمز بالڈون کی کتابوں کا ترجمہ ہو چکا تھا اور ان کتابوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا جس طرح ایک اور کتاب ''بلیک لائیک می'' (میری طرح سیاہ فام) نے کیا جس کا مصنف جان گرفن تھا اگر آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے تو آپ کو یاد ہوگا کہ ایک سفید فام نے جس کا نام گرفن تھا اپنی جلد سیاہ کر لی تھی اور دو ماہ تک ایک حبشی بن کر امریکا میں سفر کرتا رہا تھا۔ پھر اسے جو تجربات حاصل ہوئے انہیں اس نے کتابی شکل دے دی تھی۔ ''یہ ایک بے حد خوفزدہ کر دینے والا تجربہ تھا''۔ مقاماتِ مقدسہ کے وہ لوگ کہا کرتے تھے جنہوں نے یہ کتاب پڑھی تھی۔ میں ان لوگوں سے کہا کرتا تھا: ''ٹھیک ہے مان لیا کہ یہ ایک بے حد خوفزدہ کر دینے والا تجربہ تھا، اس شخص کے لیے جس نے حبشی کا روپ دھار کر نقلی سیاہ فام بن کر 60 روز تک امریکا کے اندر سفر کیا تھا تو تم خود سوچ سکتے ہو کہ جو اصلی سیاہ فام تھے اور چار سو سال سے ان مظالم کو برداشت کر رہے تھے، ان کی حالت کیا ہوگی؟''

فیصل کے ساتھ انٹرویو: میں ایک دعا کر رہا تھا جو اللہ نے قبول کر لی تھی، دعا یہ تھی کہ شہزادہ فیصل مجھے ذاتی طور پر مدعو کرے اور مجھے سنے۔ ایسا ہو گیا تھا۔

میں جونہی کمرے میں داخل ہوا خوبصورت شہزادہ فیصل اپنے ڈیسک کے پیچھے سے نکل کر آیا۔ میں نے اسے دیکھ کر جو محسوس کیا وہ میں عمر بھر فراموش نہ کر سکوں گا۔ میں اس شخص کے سامنے تھا جو اپنے دور میں دنیا کا اہم ترین انسان تھا۔ مگر اس کی پروقار شخصیت میں حقیقی عجز و انکساری تھی۔ اس نے اپنے سامنے والی کرسی پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہمارا ترجمان ڈپٹی چیف آف پروٹوکول محمد عبدالعزیز مجید تھا، جو مصری نژاد عرب تھا اور دیکھنے میں ہارلم کا نیگرو نظر آتا تھا۔

شہزادہ فیصل یہ بھانپ چکا تھا کہ مجھے وہ الفاظ نہیں مل رہے تھے جن میں، مجھے شہزادے کا شکریہ ادا کرنا تھا کہ اس نے مجھے حکومت کا مہمان بنا کر رکھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ تو ایک مسلمان کی طرف سے دوسرے مسلمان کو مہیا کی گئی مہمان نوازی تھی اور بس۔ اور پھر جہاں تک میرا تعلق تھا میں تھا بھی تو ایک

غیر معمولی مسلمان جو امریکا سے آیا تھا۔ اس نے مجھ پر واضح کیا کہ جو کچھ اس نے میرے لیے کیا تھا اس میں اس کی خوشی تھی ورنہ اور کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔

شہزادہ فیصل کے ایک بہت تیز ملازم نے دو قسم کی چائے پیش کر دی تھی جس کا بیٹا محمد فیصل امریکی ٹی وی پر مجھے اُس وقت مل چکا تھا۔ جس زمانے میں وہ کیلی فورنیا یونیورسٹی میں وزیر تعلیم تھا۔ شہزادہ فیصل نے امریکی سیاہ فام مسلمانوں پر لکھے گئے مضامین پڑھ رکھے تھے جو مصری ادیبوں نے لکھے تھے۔ شہزادے نے کہا: ''جو یہ ادیب کہتے ہیں اگر یہ سچ ہے تو سیاہ فام مسلمانوں کا اسلام غلط اسلام ہے۔ میں نے گذشتہ بارہ برسوں کا اپنا کردار بیان کیا کہ کس طرح نیشن آف اسلام کو منظم کرنے میں میرا ایک خاص کردار تھا۔ میں نے بتایا کہ حج پر آنے کا میرا ایک اور صرف ایک مقصد تھا کہ میں سچے اور اصل اسلام کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ شہزادہ فیصل نے کہا: ''یہ تو بہت اچھی بات ہے''۔ اس نے کہا کہ اسلام پر بہترین کتب انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اس لیے اب یہ عذر قابل قبول نہیں رہ جاتا کہ کسی کو اس کا علم نہیں ہے، لاعلمی کا بہانہ اب بن ہی نہیں سکتا اور مخلص اور نیک نیت لوگوں کو اب گمراہ بھی نہیں ہونا، اس کا بھی اب کوئی جواز نہیں رہ گیا کہ کوئی یہ کہے کہ اسے گمراہ کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

22۔ سعیدہ ملر خلیفہ...... برطانیہ عُظمیٰ
1970ء

ایک برطانوی مجسمہ ساز اور خطاط سونیا ملر 1959ء میں لندن میں مسلمان ہوگئی تھی۔ ایک سال بعد اس نے اپنا نام تبدیل کر کے سعیدہ رکھ لیا تھا۔ اس نے کینیڈا تک کا سفر کیا جہاں وہ اپنے شوہر یُسری خلیفہ سے ملی جو ایک مصری یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ یہ جوڑا 1967ء میں قاہرہ آ گیا تھا۔ ملر خلیفہ کی کتاب ''دی ففتھ پلر آف اسلام'' (اسلام کا پانچواں ستون) ایک مختصر سی کتاب ہے جو ان کے سفر حج کی روداد پر مشتمل ہے اور 1970ء میں طبع ہوئی تھی۔ لیڈی کوبولڈ کی روداد حج کی طرح، جو پہلے شائع ہوئی، سعیدہ ملر نے اپنے سفر کے حالات قلمبند کرتے وقت اسلام اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت کے بارے میں زیادہ تر ذاتی محسوسات و تفصیل بیان کی ہے۔ اس کے سفرنامے کے ان آخری صفحات میں، جو اس مجموعے میں شامل کیے جا رہے ہیں، وہ کئی ملین خواتین کی نمائندگی کرتی ہیں جنہوں نے جدید مسلم خواتین کی حیثیت سے حج ادا کیا۔

ملر خلیفہ اپنے قارئین کو سفر حج کی تفصیلات بتائے بغیر براہ راست مسجد حرام میں لے جاتی ہیں، جہاں حج کی مذہبی رسوم ادا کی جا رہی تھیں۔ وہ بیگم بھوپال یا لیڈی کوبولڈ کی طرح ان گھروں کا ذکر نہیں کرتی جو مقامی حکمرانوں کے خاندانوں کے گھر تھے، اور جہاں انہیں جانے کا موقعہ ملا تھا۔ ان کے برعکس ملر جو اصطلاح استعمال کرتی ہے وہ ہے ''حریم''...... یعنی وہ جگہ یا گھر جہاں خواتین حجاج نے رہائش رکھی تھی اور ان کے گائیڈ نے یہ رہائش گاہ کرایہ پر لے کر دی تھی۔ یہ کئی درجن خواتین تھیں جو جدہ میں ایک ہی جگہ ٹھہرا دی گئی تھیں، پھر یہ مکہ مکرمہ میں بھی اکٹھی تھیں، یہاں تک کہ وادئ منیٰ میں بھی یہ سب ایک ہی جگہ تھیں اور بالآخر عرفات میں ایک خیمے میں بھی انہیں ایک ہی جگہ ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ عجیب قسم کا انتظام تھا جسے ہر حج کے موقعہ پر ہزاروں مرتبہ دہرایا جا چکا تھا۔

خواتین ہر سال حج کے موقعہ پر موجود ہوتی ہیں اور بااثر بھی ہوتی ہیں۔ 1970ء میں کل حجاج کا

تیسرا حصہ خواتین پر مشتمل تھا۔ملر خلیفہ کے سفر نامے کے صفحات میں جن خواتین حجاج کی تصویر کشی کی گئی ہے ان میں تین چیزیں مشترک ہیں: اسلام،قومیت اور دوست بنانے کی صلاحیت۔ان میں سے ایک جن کا نام دردیدہ تھا جو ایک معمر کمزور و ناتواں، خاتون تھیں جو تنہا سفر کر کے آئی تھیں اور قاہرہ ایئر پورٹ پر اس کے بیٹے نے اسے زبردستی خلیفہ کے سپرد کر دیا تھا۔دوسری خاتون کا تعلق گمبیا سے تھا۔وہ دادی تھیں اور چار بچے بھی ان کے ہمراہ تھے۔گو اس خاتون کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا اس کے باوجود یہ اپنا اور بچوں کا خیال رکھتی تھی۔ایک خاتون گائیڈ کی خوشدامن تھی۔یہ مزاج کی سخت اور مزاحیہ طبیعت کی مالکہ ترک خاتون تھی۔ایک ایسے معاشرے میں جہاں مرد و زن کو علاحدہ علاحدہ رکھا جاتا ہے اور مخلوط اجتماعات کی گنجائش نہیں ہوتی۔وہاں اس خاتون کا کردار بڑا دلچسپ دکھایا گیا ہے۔اس خاندان کی ایک عورت ہر سال بطور مطوف خدمات سرانجام دینے کے لیے قاہرہ سے روانہ ہوتی ہے جبکہ اس کا داماد مرد حجاج کے گائیڈ کے طور پر جاتا ہے۔

ملر خلیفہ نے اپنے پیش رو سفر نامہ نگاروں کی کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔وہ اپنی کتاب کے دیباچے میں کیپٹن برٹن، اور فلبی کے علاوہ دیگر مصنفین کا حوالہ دیتی ہے۔اسے یہ معلوم ہے کہ صحت و تحفظ کے حوالے سے حج کے انتظامات میں کتنی ترقی ہو چکی ہے۔یہ بھی اس کی معلومات میں شامل ہے کہ چند ٹیکنیکل امور میں ترقی نے کئی مشکلات بھی پیدا کر دی ہیں۔ان میں سے ایک ٹریفک ہے۔ایک پیراگراف میں جسے ہم نے اس کتاب میں شامل نہیں کیا، ملر خلیفہ ایک بس کے ذریعے عرفات سے مزدلفہ تک کا سفر جو پانچ میل کا تھا نصف رات میں طے کرتی ہے۔وہ لکھتی ہے: ''سخت گرمی تھی اور میری طرف والی کھڑکی پکی بند تھی۔میں اپنے پاؤں ایک انچ بھی نہ پھیلا سکتی تھی۔ہم سے آگے، پیچھے اور دائیں جانب گاڑیوں کا ہجوم تھا جو حجاج سے بھری ہوئی تھیں''۔آج بھی جو حاجی حج کے جاتا ہے ٹریفک کا مسئلہ اُسے جوں کا توں نظر آتا ہے۔آنے والے زمانے میں حج ٹریفک کے جام ہو جانے کا ریکارڈ دنیا بھر میں اپنے آپ کو پہلے نمبر پر منوالے گا۔

ملر خلیفہ کی کتاب میں متن کے ساتھ 20 تصاویر بھی ہیں۔ان میں گاڑیوں کی تصویروں میں ڈالسن، فوکس ویگن، عوامی بسیں اور ایک گدھا گاڑی ہے جبکہ اونٹ ایک بھی نہیں ہے۔جدہ میں ملر ایک نئے تعمیر شدہ حج گاؤں میں ٹھہری تھی۔انہوں نے جدہ، مکہ اور مدینہ کی شاہراہوں پر جب سفر کیا تو چار رویہ سڑک تھی کوئی حج ٹیکس وصول نہیں کیا گیا تھا۔یہ 1950ء کی دہائی کی بات ہے جب سعودیہ کے شاہ سعود نے ٹیکس

منسوخ کر کے کہا تھا کہ حجاج کو آنے دیں ٹیکس میں ادا کروں گا۔ اس سے تین سال قبل اس کے والد نے قومی بجٹ کے لیے زیادہ ترحج سے حاصل ہونے والے محصولات پر انحصار کیا تھا۔

ملر خلیفہ نے 1967ء کی چھ روزہ جنگ کے وقت قاہرہ کی جانب روانگی کی تھی۔ یہ قدرتی بات تھی کہ حج کے دوران حاضری میں اس علاقائی انقلاب کا عکس ضرورت آیا تھا۔ اس کے نتیجے میں اگلے سال مصری حجاج کی تعداد نصف رہ گئی تھی جو تقریباً دس ہزار تک تھی جس میں آئندہ پانچ برس تک کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ نہر سوئز آٹھ سال تک کے لیے بند کر دی گئی تھی، اور دوسری وجہ جنگ تھی۔ ایک غریب مسلمان ہوائی ٹکٹ کی قیمت کیسے ادا کر سکتا تھا۔ پھر بھی برے دنوں میں بھی مصریوں کی تعداد مقرر رہو جانے کے باوجود خروج کے لیے ویزوں کی تعداد کافی زیادہ رہی تھی۔ جانبداری کی شکایات زیادہ وصول ہوئیں تو صدر ناصر نے 1969ء میں حج کے لیے قرعہ اندازی شروع کرادی تھی۔ ملر خلیفہ نے اپنی کتاب کے ابتدائی صفحات میں لکھا ہے کہ یہ ''عوامی ووٹ'' بن گیا تھا۔

☆☆☆

سعیدہ خلیفہ ملر کی کتاب ''پانچواں ستون'' میں سے لیا گیا

حج کی تیاریاں: یہ 1970ء ہے اور مصر میں میرا یہ تیسرا سال ہے۔ یہاں میں جب سے آئی ہوں مسلسل یہی سوچ رہی ہوں کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ حج پر کیسے اور کب جاؤں گی۔

1967ء کی اسرائیل جنگ نے ہم سب کو ایک صدمے سے دوچار کر دیا ہے جس میں جانیں ضائع ہوئیں، نہر سوئز ہاتھ سے جاتی رہی اور ان سب سے بڑھ کر مصر کو جو شکست فاش ہوئی ہے اسے اس سے نکلنے کے لیے کئی برس درکار ہوں گے۔ جہاں تک حج کا تعلق تھا، بحری جہازوں سے اب حج کے لیے جانا ممکن نہیں رہا تھا اور نہر سوئز چونکہ استعمال نہیں ہو رہی تھی اور یہی مصر کی واحد بندرگاہ تھی جہاں سے حجاج اپنے بحری سفر کا آغاز کیا کرتے تھے، اب اسے سویلین لوگوں کے لیے ممنوعہ علاقہ قرار دے دیا گیا تھا۔ اب تو صرف ہوائی سفر سے ہی مکے جانا ممکن رہ گیا تھا اور اسی وجہ سے حجاج کی تعداد محدود کر دی گئی تھی اور غیر ملکی کرنسی جو ملتی تھی اس میں بھی کمی کر دی گئی تھی۔

پرانے زمانے میں قافلوں میں سفر کی اپنی مشکلات تھیں اور سفر سے قبل جو تقاضے متعلقہ محکمے کے افسروں کے ہوتے تھے، وہ بھی چند ایک تھے مگر آج کل صورت حال مختلف ہے۔ سفر مقابلتاً آسان بنا دیا گیا ہے مگر اس سفر پر روانگی بے حد مشکل ہوگئی ہے۔ بیشمار فارم پر کر کے ان پر مختلف افسروں کے دستخط اور مہریں ثبت کرانی پڑتی ہیں۔

مصری حکومت نے اعلان کیا تھا کہ شہر کے مختلف حصوں اور اضلاع میں عوامی ووٹ کے ذریعے ان تمام درخواست دہندگان کی قرعہ اندازی ہوگی جو حج پر جانے کے خواہشمند ہوں گے۔ تاہم اس قرعہ اندازی سے وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جن کے عزیزوں یا دوستوں میں سے کوئی یا مطوف اور گائیڈ سعودی عرب سے انہیں ٹکٹ بھیجے گا اور حجاز میں ان کے قیام کے دوران ان کے اخراجات برداشت کرنے کی ذمہ داری لے گا۔

1969ء میں ہم نے قرعہ اندازی میں شامل ہونے کے لیے اپنے نام درج کرائے تھے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اگلے سال یعنی 1970ء میں میرے شوہر نے ایک سعودی کو خط لکھا جس کا نام کسی نے ہمیں

دیا تھا۔ ہم نے اسے کبھی دیکھا نہ تھا لیکن اس نے ہمیں دعوت نامہ بھجوایا تھا۔ اب ہمیں سفر پر روانہ ہونے سے پہلے صرف اپنے ناموں کا سرکاری نوٹیفیکیشن جاری کروانا تھا تاکہ ہم روانگی کی تیاریاں شروع کر سکیں۔

اس سال 30 ہزار مصریوں نے حج درخواستیں دی تھیں۔ یہ تعداد اتنی زیادہ تھی کہ مقامی ہوائی کمپنیاں اتنے حجاج کو کسی صورت میں لے کر نہ جا سکتی تھیں حالانکہ غیر ملکی فضائی کمپنیوں سے ہوائی جہازوں کا ایک بیڑا کرائے پر بھی حاصل کر لیا گیا تھا۔ تقریباً سترہ ہزار خوش نصیبوں کے نام اس قرعہ اندازی میں نکلے تھے۔

سعودی عرب پوری دنیا میں مشہور تھا اور یہ خوشخبری کہ ہم فروری میں قاہرہ سے روانہ ہوں گے ہم تک کئی مہینوں بعد پہنچی تھی۔ اس سارے عرصے میں ہمیں بڑا انتظار رہا۔ جونہی ہماری مقامی پولیس کے ایک مہربان افسر نے ہماری تاریخ روانگی کا اعلان کیا، میرے شوہر اور میں نے حج کا خصوصی لباس اور دوسری ضروری اشیاء کی خریداری شروع کر دی تھی۔ شہر کے مرکز میں ایک دکان تھی جہاں سے میں نے اپنے لیے تین سوتی گاؤن خرید لیے تھے جو ٹخنوں تک لمبے تھے، حجاج کے لیے مکہ و مدینہ میں چونکہ کپڑوں کے دھونے کی سہولیات بہت کم ہوتی ہیں اس لیے میں نے دو اور گاؤن، سفید اور سبز رنگ کے خرید کر رکھ لیے تھے۔ اب یہ میرے لیے واپسی تک کافی تھے۔ میں نے ایک سفید حجاب بھی لے لیا تھا اور سفید موزے بھی۔ مجھے کافی دیر سے احساس ہوا کہ میرے سفید جوتے مجھے چھوٹے ہو گئے تھے مگر خوش قسمتی سے موسم گرما میں پہننے والا جوتا میرے کام آ گیا تھا۔

اب ہمیں احرام خریدنا تھا یُوسری کے لیے، چنانچہ ہم قدیم قاہرہ گئے جہاں چھوٹی چھوٹی بہت سی دکانیں جو خوبصورت احرام، پیٹیاں اور کھلے سینڈل بیچتی تھیں ٹھنڈے پانی کے لیے ہم نے چند کینوس بیگ بھی خرید لیے تھے جو روایتی مشکیزوں جیسے تھے یہ جب خالی ہوں تو جگہ بہت کم گھیرتے ہیں۔

ہم نے چند ضروری برتن اور ایک ولایتی چولہا (اسٹوو) اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی خرید لی جائیں۔ حج پر لکھے ہوئے ایک رہنما کتابچہ میں یہ مشورہ بھی دیا گیا تھا کہ ڈبوں میں بند اشیائے خوردنی ضرور ساتھ رکھ لی جائیں۔ میں نے کچھ چاول بھی لے لیے تھے۔ ہم نے بند ڈبے کی مچھلی، سبزیاں اور پنیر بھی خرید لیا تھا۔ ہم جس دکان سے سامان خریدتے تھے، دکاندار ضرور مکے پہنچ کر اپنے لیے دعا کی درخواست کرتے تھے۔ مصری زیادہ تر مذہبی خیالات کے حامل ہوتے ہیں اور ہر مصری کے دل میں حج پر جانے کی آرزو پلتی رہتی ہے۔

سرکاری اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے میرے شوہر کو پولیس اسٹیشن کے کئی چکر لگانے پڑے تھے۔ پھر ہوائی جہاز کی نشستیں حاصل کرنے اور ٹکٹیں خریدنے کے لیے کئی بار فضائی کمپنی کے دفتر جانا پڑا تھا۔ ہمیں مقامی مرکز صحت سے بھی رجوع کرنا پڑا تھا تاکہ چیچک، ٹائیفائڈ اور ہیضے کے ٹیکے لگوا لیں۔ نرس نے بڑی عقیدت کے ساتھ ٹیکے لگائے تھے اور ہمارے بخیر و عافیت مکے پہنچنے کی تمنا کا اظہار کیا تھا۔ اب ہمیں خریدے ہوئے سامان کو باندھنا تھا۔ دو سُوٹ کیس تیار ہو گئے تھے اور ایک سبز قالین بھی ساتھ رکھ لیا تھا جو میرے شوہر کے خیال میں بڑے کام کی چیز تھی۔

اگر ہمیں آج سے سو سال قبل قاہرہ سے اس سفر حج پر جانا ہوتا تو کھانے پینے کی اشیاء کئی گنا زیادہ خریدنی پڑتیں، کیونکہ اس وقت سفر یا تو کشتی کے ذریعے ہوتا تھا یا اونٹ پر، قافلوں کے ساتھ۔ ہمیں اس وقت چائے، کافی، چینی، چاول، کھجوریں بسکٹ، تیل، سرکا، لالٹین اور کھانے کے برتن درکار ہوتے۔ بہت سے پانی کے مشکیزے ساتھ رکھنے پڑتے۔ ایک خیمہ درکار ہوتا جس کی اس پرانے زمانے میں کم از کم 11 شلنگ قیمت تھی۔ ایک لکڑی کا صندوق ہوتا جس میں سارا سامان رکھا جاتا۔ میں اپنے تصور میں لدے ہوئے اونٹ کی خیالی تصویر بنا سکتا ہوں۔ اس اونٹ پر ایک پلنگ نما ڈولی ہوتی جس میں بوقت ضرورت سویا بھی جا سکتا تھا۔

ایک چیز ماضی اور حال میں ایسی ضرور ہے جو دونوں زمانوں میں موجود تھی اور صدیوں بعد بھی موجود رہے گی...... احرام کی دو ان سلی چادریں جنہیں حج سے واپسی پر آب زم زم میں دھو کر لایا جاتا ہے تاکہ مرتے وقت یہ کفن کے طور پر استعمال کی جا سکیں۔

قاہرہ ایئرپورٹ: قاہرہ کی صبح عموماً دلکش ہوتی ہے۔ مگر جس فروری کی ایک صبح کی یاد مجھے آ رہی ہے وہ خاص طور پر بہت دلکش تھی۔ ایئرپورٹ کی عمارت اور ہوائی اڈے پر کھڑے ہوئے ہوائی جہاز دھوپ میں چمک رہے تھے۔ مصری خاندان میں عموماً بڑی قربت پائی جاتی ہے۔ اسی لیے ہر آنے جانے والے عزیز کو رخصت کرنے یا خوش آمدید کہنے بہت سے لوگ ایئرپورٹ آ جاتے ہیں۔ ہمارے خاندان کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ ہمیں الوداع کہنے میری دو نندیں، میرے شوہر کے تین بھائی (میرے دیور) آئے ہوئے تھے۔

اس موقعہ پر نہ صرف رشتہ دار، دوست بلکہ پڑوسی بھی حج پر جانے والوں کو الوداع کہنے آ جاتے ہیں۔ باہر سے آنے والے کے انتظار میں تو بعض اوقات عزیز و اقارب پورا پورا دن اور رات ایئرپورٹ پر

گزار دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو کچھ لوگ اپنے ساتھ بینڈ باجے بھی لے آتے ہیں تا کہ خوشی کے اس موقعہ کو زندۂ جاوید بنا دیا جائے۔

حج پر جانے والوں کے لیے ایک شامیانہ لگا ہوا تھا جس کے نیچے سب آ کر جمع ہوتے تھے۔ جب الوداعی لمحات قریب آتے تھے اور کاغذی کارروائی شروع ہو جاتی تھی تو کئی افسر مدد کے لیے موجود ہوتے تھے۔ ہمیں پاسپورٹ اور کسٹم کی ضروری کارروائی میں بہت کم وقت لگا تھا۔ دوسری منزل سے لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر سفید احرام میں ملبوس مسافروں کو سپردِ خدا کر رہے تھے۔

ہم روانگی کے لیے مخصوص ہال سے اندر جانے کے لیے اٹھے ہی تھے کہ کسی نے میرے شوہر کے کندھے پر آ کر ہاتھ رکھا۔ یہ اس کا کوئی پرانا شاگرد تھا جسے استاد نے آج دس برس بعد دیکھا تھا۔ اس نو جوان کے ساتھ دو خواتین بھی تھیں، ایک جوان تھی دوسری معمر۔ شاگرد نے جلدی جلدی اپنے استاد کو بتایا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ مکے نہ جا سکتا تھا۔ کیا ایسا ممکن تھا کہ ہم اس کا خیال رکھیں؟ یوسری مان گیا تھا۔ مگر میں اس غیر متوقع التماس پر چونک گئی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ حج کے موقعہ پر ایسا اکثر ہوتا ہے جب کچھ لوگ اپنے عزیزوں کو خصوصاً بوڑھے مردوں اور خواتین کو دوسروں کی ذمہ داری میں دیتے وقت ذرہ برابر بھی نہیں ہچکچاتے۔ خواتین کے لیے تو ہمارے دین میں بڑی پابندی ہے کہ وہ کسی محرم کے بغیر حج پر نہ جائیں۔ جب میں اپنی کہانی سناؤں گی تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ پابندی کیوں لگائی گئی ہے۔ سفر کے دوران انسان کو اپنی، سامان کی اور اگر کوئی خاندان کا اور فرد ساتھ ہو تو اس کی فکر دامنگیر رہتی ہے۔ حادثات کا ڈر رہتا ہے، بیماری کا خدشہ ساتھ نہیں چھوڑتا۔ پھر مکہ میں بطور خاص ہجوم کے درمیان کسی خاتون کا خیال رکھنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے جسے کسی نے آپ کے سپرد ایئر پورٹ پر کیا ہو اور اس سے پہلے آپ سے اس سلسلے میں کسی نے بات بھی نہ کی ہو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تاکید فرمائی ہے کہ کوئی عورت لمبے سفر پر اکیلی نہ جائے۔

اس وقت میرے لیے بیشک یہ ایک نئی بات تھی۔ میں کوشش کر رہی تھی کہ یہ خاتون جسے ہم اس سے پہلے جانتے تک نہ تھے اس کے ساتھ سفر کے دوران اچھا وقت گزرے۔

مجھے جو خدشات تھے میں نے انہیں چھپانے کی پوری کوشش کی اور اس خاتون کی بہو نے میرا ہاتھ تھام کر، آبدیدہ ہو کر مجھ سے التماس کی کہ میں اس کی ساس کا خیال رکھوں۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ہم

پورا پورا خیال رکھیں گے اور وہ فکر نہ کریں۔ وہ خاتون خود نہ جانے کن خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اگلے لمحے میں اپنے خاوند کو دیکھ کر مسکرائی جس نے بڑی مہربانی اور ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اتنی بڑی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ اب میرا شوہر اس خاتون کا پاسپورٹ اور دیگر ضروری دستاویزات اس کے پرس سے تلاش کر کے نکال رہا تھا تاکہ اس افسر کو دکھا سکے جو اس کام کے لیے سامنے کھڑا تھا۔

جب ساری کاغذی کارروائی مکمل ہو گئی تو ہم کیفے ٹیریا میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ یہ بالکل ترکی کافی کی طرح پیش کی جاتی ہے مگر یہ کم گاڑھی ہوتی ہے اور اصولاً مصری اسے کم میٹھا پینا پسند کرتے ہیں۔

کیفے ٹیریا سفید احرام میں ملبوس حاجیوں سے بھر گیا تھا۔ مذہبی گیت لاؤڈ اسپیکر پر سنائی دے رہے تھے۔ ان کے ساتھ ڈھول بھی بج رہے تھے۔ جن لوگوں کو ضرورت تھی انہیں قرآن پاک کے نسخے بغیر کسی ہدیے کے تقسیم کیے جا رہے تھے۔ اگلی میز پر ایک حاجی تنہا بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ جن وریدہ نے رونا شروع کر دیا تھا۔ کیا اسے یہ خیال آیا تھا کہ اس انجانے سفر پر وہ بغیر اپنے خاندان کے کسی فرد کے تنہا جا رہی تھی؟ میں نے تسلی دینے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے مجھے عربی اتنی کم آتی تھی کہ میں اسے تسلی دینے میں ناکام رہی۔ راستے بھر ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتی تھیں اور سر ہلا دیا کرتی تھیں ہمارے درمیان بات چیت نہ ہو سکتی تھی۔

ہوائی جہاز میں: جہاز پرواز کر رہا تھا اور میں کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ بہت نیچے مجھے بھورے رنگ کا صحرا نظر آ رہا تھا۔ مجھے وہ حجاج یاد آئے جو قدیم دور میں صحرا میں سے گزرتے تھے، جن کے بارے میں، میں نے بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ میں نے سوچا ان صحراؤں سے گزرتے ہوئے، صدیوں پہلے حجاج کیا خیال کرتے ہوں گے، نہ پانی نہ سبزہ، سفر کی ان گنت مشکلات، راہزنوں ڈاکوؤں کا قدم قدم پر خطرہ! کیا انہیں کبھی یہ خیال آیا ہوگا کہ آنے والے دور میں دھات کے بنے ہوئے چاندی رنگ کے یہ پرندے مسافروں کو اٹھا کر فضا میں اڑ رہے ہوں گے۔ انہوں نے مسافروں کے علاوہ ٹنوں بھاری ان کا سامان بھی اٹھا رکھا ہوگا۔ اس قدیم زمانے کے بیچارے حجاج کو تو نہ سفر کی سہولیات میسر تھیں نہ تحفظ حاصل تھا۔ آج ہم جس آرام دہ جہاز میں سفر کر رہے ہیں جس میں کھانے پینے کا معقول انتظام موجود تھے، وہ انہیں دیکھ لیں تو کیا محسوس کریں گے۔

میں نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی جن وریدہ کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے دعا کر رہی تھی کیونکہ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ فضائی سفر سے خوفزدہ ہو کیونکہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ

اس کا پہلا سفر تھا۔ میں نے یہ امید کرتے ہوئے کہ میں اسے حوصلہ دے سکتی تھی، اس کا ہاتھ پکڑا اور جواباً اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور مسکرا دی تھی......

مُطوّف: یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک ٹریول ایجنٹ، مطوف کا تعارف کرا دیا جائے کہ یہ حج کے موسم میں کیا خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ یہ دونوں کام ایک ہی شخص کرتا ہے اور اس کی ملازمت عارضی ہوتی ہے، صرف حج کے ایام تک کے لیے، قمری سال کے آخری دو مہینوں میں یہ مصروف رہتا ہے۔ یہ حکومت اور حاجی کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے۔ اسے خاص فیس ادا کی جاتی ہے اور اس کے ذمہ کام یہ ہوتا ہے کہ پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات پر مہریں لگوائے، کسٹم کی کارروائی مکمل کرائے، رہائش، ٹرانسپورٹ کا انتظام کرے اور حج کے دوران مذہبی رسوم کی ادائیگی میں حجاج کی رہنمائی کرے کیونکہ بہت سے حجاج ان سے ناواقف ہوتے ہیں۔ حج کے موسم میں مطوف حجاج کو مکان کرائے پر لے کر دیتا ہے یا اپنے مکان میں کرائے پر ٹھہراتا ہے۔ شہر کے مرکز میں واقع ہوٹل ان دنوں میں بہت مہنگے ہو جاتے ہیں جہاں حجاج نہیں ٹھہر سکتے۔

عموماً ایک مطوف ایک ہی ملک کے حجاج کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر اس کی بیوی کا تعلق سعودی عرب سے نہیں اور وہ کسی اور ملک کی رہنے والی ہے تو مطوف اپنی بیوی کے ہموطن حجاج کو اپنی خدمات پیش کرنیکی کوشش کرتا ہے کیونکہ یہ پہلے سے ہی ان کی زبان اور روایات سے واقف ہوتا ہے۔ سب سے سستی رہائش وہ ہوتی ہے جس میں بہت سے حجاج مل کر کرائے پر رہتے ہیں۔ ان میں عورتوں اور مردوں کو الگ الگ کر دیا جاتا ہے۔ خواتین کے کمرے حریم کہلاتے ہیں یہ لفظ حرام سے نکلا ہے یعنی ممنوعہ (یعنی وہ مرد جو خواتین کے شوہر، باپ، بھائی یا بیٹے کے علاوہ ہوں)۔

ہر سال حجاج کی تعداد میں چونکہ اضافہ ہو رہا ہے اور جدہ، مکہ اور مدینہ ایسے شہر ہیں جو اس بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے چھوٹے پڑتے جا رہے ہیں اس لیے کسی کو بھی ان شہروں میں مقررہ مدت سے زیادہ عرصے کے لیے ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

سفر کے مختلف مراحل میں حجاج کے پاسپورٹ مطوف کے پاس ہوتے ہیں۔ زیادہ تر مطوف ایماندار اور مخلص ہوتے ہیں مگر کچھ ایسے نہیں ہوتے۔ تاہم ہر مطوف کو ایماندار، نیک اور سچا و مخلص محض اس لیے نہ سمجھا جائے کہ وہ شہر مقدس میں رہتا ہے۔ ان میں بھی دوسرے انسانوں کی کمزوریوں جیسی کمزوریاں ہوتی ہیں۔

جدہ ایئرپورٹ: مجھے جدہ پہنچے ہوئے صرف ایک گھنٹہ ہوا ہے مگر مجھے اچانک ایک دھچکا لگا۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ سوائے مسلمانوں کے کوئی بھی مقدس شہروں میں داخل نہیں ہوسکتا۔ مگر میں نے اور یُوسری نے کبھی بھی یہ نہ سوچا تھا کہ میرے برٹش پاسپورٹ میں کہیں بھی یہ لکھا ہوا نہ تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ پھر اس کے اندر کوئی مصری سرکاری اندراج ایسا نہ تھا جو اس بات کی تصدیق کر رہا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ ہم نے سوچا تھا کہ قاہرہ میں ایک بار میری سرکاری طور پر تصدیق ہوگئی تو یہی کافی ہوگی۔ لیکن سعودی امیگریشن افسروں کے ساتھ اس پر بحث کی ہی نہ جاسکتی تھی۔ انہیں کیسے یقین دلایا جاتا کہ میں ایک مسلمان خاتون تھی؟ ہم ایک بنچ پر بیٹھے انتظار کر رہے تھے جبکہ امیگریشن کے دو افسر آپس میں بات چیت کر رہے تھے کہ کیا کیا جائے۔ بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ میں اگلے روز عدالتِ عظمٰی میں جا کر حلفیہ بیان دوں کہ میں مسلمان ہوں تا کہ یہ ثبوت مل جائے کہ میں اسلام قبول کر چکی تھی۔

میں نے ایک بار پھر جِنن ودیدہ کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ یقیناً یہ سوچ رہی ہوگی کہ وہ بے چاری کن لوگوں کے سپرد کر دی گئی تھی جو خود اب مشکل میں پھنس چکے ہیں۔ دوسرے حجاج کی طرح وہ تو اڑ کر مکے پہنچنا چاہتی تھی، اسلام کا وہ مرکز جہاں دنیا بھر کے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔

جب ہم انتظار کر رہے تھے اس وقت دو انڈونیشی حجاج اندر داخل ہوئے۔ ان کے نازک نازک سے خدوخال تھے اور انہوں نے مغربی طرز کے سوٹ پہن رکھے تھے۔ چند دوسرے افراد احرام میں تھے، زیادہ تر حجاج اپنے اپنے قومی لباس میں تھے جس میں وہ بڑے پروقار اور خوبصورت لگ رہے تھے۔ انہوں نے جلد ہی اس لباس کی جگہ احرام باندھ لئے تھے۔

بالآخر جب ہم نے اپنے مطوف کا نام بتا دیا جس کے ساتھ ہمیں مکہ میں رہنا تھا تو ہمیں اس عمارت سے باہر نکلنے کی اجازت مل گئی تھی۔ ہمیں گرمی بھی لگ رہی تھی اور ہم تھک بھی بہت گئے تھے۔ مصر میں موسم سرما گزار کر آنے کے بعد ہمیں یہاں کا موسم کافی گرم لگا تھا۔ ہم نے اپنا سامان اور جِنن ودیدہ کا بھاری سوٹ کیس اٹھا لیا تھا۔ ہم ایک تین منزلہ عمارت کے صحن سے گرتے پڑتے نکل آئے تھے۔ یہاں بہت سے مطوف اپنے اپنے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ یہیں حجاج کے لیے ایک ہاسٹل تھا جس کا کوئی کرایہ نہیں تھا۔ سخت گرمی میں تھکی ہوئی جِنن ودیدہ اور میں حجاج کے ایک ہجوم میں سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ زیادہ تر حجاج کا بھاری سامان بھی ان کے قریب رکھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک جِنن جو قدرے چھوٹے قد کی تھی ہجوم میں سے نکل کر سامنے آگئی

جس نے جمن و دیدہ کی خیر و عافیت بڑی اپنائیت سے معلوم کی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ پرانی دوست تھیں۔ انہوں نے ابھی ایک دوسرے سے خیریت ہی دریافت کی تھی کہ چند نوجوان قلی آ گئے۔ یوسری بھی آ گئے تھے جو اپنے مطوف کی تلاش میں گئے تھے۔ ہمیں اب امید تھی کہ اب ہمارے پاسپورٹ جمع کر لیے جائیں گے اور ہم مکے کے لیے روانہ ہو جائیں گے لیکن میرے مسئلے کی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ یوں نہ رات اسی ہاسٹل میں بسر کی جائے۔

مکہ مکرمہ میں آمد: ٹیکسی نے پہلے ہمارے سوڈانی حجاج ساتھیوں کو ان کی منزل پر چھوڑا اور پھر ہمیں ایک تنگ موڑ پر آ کر اُتار دیا تھا۔ یمنی قلیوں نے ہمارا سامان اُٹھا لیا تھا۔ ہم تھوڑی دور تک اونچے اونچے پرانے مکانوں کے درمیان سے گزرے جن کے مالکان دروازوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دو خوانچہ فروش ایک جگہ بیٹھے نظر آئے۔ دو سبز ستونوں والے ایک مکان کی طرف ہمارے قلی مڑ گئے تھے۔ یہ ہمارے مطوف کا گھر تھا جس میں ہمیں مکے میں اپنے قیام کے دوران ٹھہرنا تھا۔ حاجی ثقفی کھڑا ہو گیا اور چہرے پر ایک مسکراہٹ لیے اس نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہم اندر جا کر پرانی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل پر پہنچ گئے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی دیواریں زردی مائل نیلی تھیں اور چھت لکڑی کی تھی۔

ہماری جانب منہ کیے ایک چاند چہرہ عورت بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں حقہ تھا۔ وہ کھڑی ہو گئی اور ہمارا استقبال بڑی گرمجوشی سے کیا۔ کمرہ میں اور بھی خواتین تھیں، جو سب کی سب فرش پر بیٹھی تھیں...... مجھے یوں لگا جیسے کسی ملکہ کے گرد اس کی کنیزیں جمع ہوں۔

''اھلاً و سھلاً! اھلاً و سھلاً'' (خوش آمدید!...... خوش آمدید!) اس چاند چہرہ خاتون نے عرب کے روایتی انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ اس کا دراصل مطلب یہ تھا: ''ہم آپ کے خاندان سے ہیں اور اب آپ ایک ایسی وادی میں ہیں جہاں تحفظ اور ہر شے کی فراوانی تھی''۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ عربی زبان کس قدر وسیع زبان تھی جس میں ایک ایک لفظ کے بیشمار معانی تھے۔

میں نے گھر کی ہر خاتون سے مصافحہ کیا۔ (مجھے بعد ازاں معلوم ہوا تھا کہ وہ خاتون ہمارے مطوف کی خوشدامن تھی۔ اور اس گھر کی بالائی منزل پر اس کا راج تھا) اس نے امید ظاہر کی کہ اس کے ساتھ میرا وقت اچھا گزرے گا۔ میں عربی زبان نہیں جانتی تھی اور مجھے اس کمرے میں ٹھہرنا تھا جس میں اور بھی کئی خواتین ہوں گی۔ غسل خانہ بھی چھوٹا سا تھا اور ایک ہی تھا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں کیسے وقت کٹے گا۔

اَب مجھ پر یہ بات تو واضح ہو چکی تھی کہ ہم سب عورتوں نے اس کمرے میں اکٹھا رہنا ہے ایک چھوٹے سے کمرے میں 12 عورتوں نے۔ حج کے موقعہ پر یہاں اسی طرح ایک ایک کمرے میں دس دس بارہ بارہ افراد اکٹھے رہتے ہیں۔ کسی نے بتایا کہ ان دنوں تو بعض اوقات لوگوں کو غسل خانوں میں سونا پڑتا ہے۔ ہمارے کمرے صاف ستھرے تھے اور غسل خانوں کو ہر روز صاف کیا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی اس صورت حال کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے میں وقت تو لگتا تھا

حریم میں زندگی: گذشتہ روز کی تھکن سے میں چُور چُور تھی اس لیے آج تو میں گہری نیند سوئی تھی۔ میرے اردگرد سوئی ہوئی عورتیں جب اپنی اپنی چٹائیاں لپیٹ رہی تھیں۔ میری اس وقت آنکھ کھل گئی تھی۔ مطوف کی خوشدامن اپنے بستر پر آرام سے لیٹی وقفے وقفے سے احکامات جاری کر رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ میں جاگ گئی ہوں تو اس نے مجھے بلا کر اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ ہماری گفتگو بڑے اچھے ماحول میں شروع ہوئی تھی۔ اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ جو وہ کہہ رہی تھی وہ پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اسی وجہ سے اس کے سوالوں کے جوابات بھی اسے درست نہیں مل رہے تھے۔ اب اس نے چلانا شروع کر دیا تھا، اس کا خیال تھا شاید اس طرح اس کی بات سمجھ لی جائے گی۔ اس کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو ایک مہربان جِن نے میرے بارے میں اسے بتایا کہ یہ انگریز ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ جواب نہیں دے پا رہی ہے۔

اتنے میں اس خاتون کے نواسے نواسیاں آ گئے تھے اور انہوں نے ایک کونے میں کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شیرنی اس لیے دھاڑتی ہے کہ اس کی آواز میں دوسروں کی آواز دب جائے۔ وہ خود جب چاند چہرے پر رومال ڈال کر سو جاتی تھی تو کمرے میں موجود عورتیں آزادی سے زور زور سے باتیں کرتی تھیں۔

جب وہ خاتون مہربان ہوتی تو کہتی: ''بی جِن آؤ بیٹھ جاؤ'' لیکن میں اس پر بھی چونک جاتی تھی۔ ایک روز جب وہ ظہر کی نماز ادا کرنے جا رہی تھی اس نے مجھے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اس نے وہیں سے چیخ کر آواز دی ''او جِن سعیدہ تم گاؤ تکیہ کیوں استعمال نہیں کرتی ہو؟''۔ میں تو جیسے کود کر اپنی کھال سے باہر آ گئی تھی۔

اس خاتون کی ایک بیٹی عامرہ بہت نرم طبیعت کی تھی۔ وہ دبلی پتلی لڑکی اٹھکیلیاں لے کر بانکپن سے

چلتی پھرتی تھی۔اس کا سر چھوٹا سا تھا اور خدوخال بڑے نازک تھے۔پلکیں بڑی بڑی اور آنکھیں ایک خاص سحر لیے ہوئے تھیں۔دراصل یہ دونوں ماں بیٹی قاہرہ کی تھیں۔ماں ہر سال سعودی عرب آجاتی تھی تاکہ حجاج مہمانوں کی دیکھ بھال کر سکے۔

ان دونوں کو حج کی مذہبی رسوم کے بارے میں اتنی معلومات حاصل تھیں جو شاید ہی عام خواتین جانتی ہوں۔ہم تمام خواتین ان دونوں ماں بیٹی سے یہ توقع رکھتی تھیں کہ یہ ہمیں لباس لے درست ہونے سے لے کر مناسک حج کی ادائیگی تک کے بارے میں مشورہ دیں گی۔وہ ایسا کرتی بھی تھیں لیکن مجھے صرف ایک بات سے اتفاق نہیں تھا کہ مشورہ دینے کا ان کا طریقہ بہت اوسان خطا کر دینے والا ہوتا تھا۔

حاجی ثقفی کے گھر میں ہر کونے میں کوئی نہ کوئی رہائش پذیر تھا اور اس گھر میں ہر وقت لوگوں کی آوازوں اور چلنے پھرنے سے زندگی کی چہل پہل موجود رہتی تھی۔

دوسری منزل پر ہم جن کا تعلق مصری حریم سے تھا، ہم بہت آرام سے رہتی تھیں۔ہم میں دو معمر جن تھیں، جن میں سے ایک کو چلنے پھرنے میں مشکل پیش آتی تھی کیونکہ اس کی ٹانگوں میں کوئی نقص تھا لیکن پھر بھی وہ جب تک چاہتی چلتی پھرتی رہتی تھی۔اس گروپ میں زیادہ خواتین یا مائیں یا دادیاں تھیں اور مجھے یہ بات افسوس سے کہنی پڑ رہی ہے کہ ان میں زیادہ بیوائیں تھیں۔تاہم ان میں سے دو نوجوان تھیں۔ایک کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی جس کا خاوند پہلی منزل پر دوسرے مردوں کے ساتھ ایک کمرے میں رہتا تھا۔یہ دونوں ہمعمر ہونے کی وجہ سے اکثر اکٹھی رہتی تھیں۔ان میں ایک تیسری میں آملی تھی۔عامرہ کی بیٹی جو سکول کی طالبہ تھی۔ہم سب سے سنجیدہ گفتگو کرتی تھی مگر یہ تینوں آپس میں ہنسی مذاق بھی کر لیتی تھیں اور قہقہے بھی لگاتی تھیں۔ناشتے کے وقت عامرہ ہمارے ساتھ بیٹھتی تھی، لنچ کے بعد وہ اپنے حلقے میں چلی جاتی تھی۔عامرہ قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتی تھی۔وہ دودھ کے بغیر قہوہ پسند کرتی تھی، جو چھوٹے چھوٹے خوبصورت بلوریں گلاسوں میں پیا جاتا تھا۔وہ ہمیشہ میرے لیے دوسرا گلاس بھی لے آتی تھی۔میرے خیال میں وہ جانتی تھی کہ اس سے انگریز جن تازہ دم ہو جاتی ہے۔چاند چہرہ خاتون اب حقہ منگوا لیتی تھی اور ہنسی خوشی اس وقت تک دھواں نکالتی رہتی تھی جب تک حقے کی گُڑگُڑ کی آواز نہیں پھیل جاتی تھی۔

وہ جب غصہ میں آجاتی تو عامرہ کو چیخ کر آواز دے کر بلاتی۔عامرہ بیچاری ایک مشرقی عورت کی طرح خاموشی کے ساتھ، نظریں نیچی کیے کھڑی رہتی تھی۔یہ اس کی اپنی بیٹی کے بالکل برعکس تھی جو عموماً سخت

جواب دے لیتی تھی اور جب ڈانٹ پڑتی تو بھیگی بلی بن جاتی تھی۔

سب سے اوپر والی منزل پر مصری خواتین رہتی تھیں سوائے میرے جبکہ نچلی منزل پر مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے حجاج رہتے تھے۔ ان میں عرب، مصری، افریقی، شامی اور دوسرے بھی شامل تھے۔ ہمارے بالکل نیچے دو کمرے تھے، پہلے کمرے میں میرا شوہر اور دوسرے مرد رہتے تھے، دوسرے میں افریقی خاندان تھے۔ ان کے رنگ جدا تھے، پس منظر مختلف زبانیں مختلف مگر بھی اتفاق اور محبت سے ایک جگہ رہائش پذیر تھے۔

مکہ مکرمہ میں پانی ایک بہت مہنگی شے تھی اور یمنی سقے روزانہ یہاں پانی بھر کر لاتے تھے۔ یہ جب پانی کے ڈول لے کر آتے تو بہت سے سوئے ہوئے حجاج کے اوپر سے گزرتے تھے۔ یہ ڈول انہوں نے اپنے کندھوں سے لٹکا رکھے ہوتے تھے۔ پھر وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل پر جاتے تھے تاکہ پانی کے ڈول خالی کر جائیں۔ یہاں اس پانی کے لیے حوض بنے ہوئے تھے جن میں نل لگے ہوئے تھے۔ غسل خانے بہت صاف ستھرے تھے جن کی باقاعدگی سے صفائی ہوتی تھی۔

میرے شوہر کے کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے بارے میں بعدازاں دوسرے حج کے موقعہ پر ہمیں پتا چلا تھا کہ اسے "باکس" کہتے تھے۔ یہ ایک تاریک سا کمرہ تھا جس میں باہر کی روشنی بہت کم داخل ہوتی تھی۔ مگر اس میں جو بھی رہتا تھا اسے تخلیہ ایسا ملتا تھا کہ اس کا کرایہ بھی زیادہ رکھا گیا تھا۔ یہ کسی شادی شدہ جوڑے کے لیے بہت موزوں تھا۔ اس وقت اس میں ایک مختصر سا خاندان رہائش پذیر تھا۔ اس کمرہ میں جو انگریزی کے حرف ایل کی شکل کا تھا ایک گمبیا کی حجن رہتی تھی جس کے ساتھ اس کے چار پوتے بھی تھے۔ سامان بھی تھا جس میں صندوق، کھانے کے برتن، توا اور کڑاہی بھی شامل تھی۔ وہ دادی تھی لیکن ہنس مکھ اتنی کہ نوجوان لڑکیوں سے زیادہ۔ ہم اس خاتون سے اس سے پہلے اس وقت ملے تھے جب ہم نے مل کر ایک ٹیکسی کرائے پر لی تھی۔ اس لیے حاجی ثقفی کے گھر میں ہمارے درمیان خوب بنتی تھی۔

یُسریٰ، میرا شوہر اسٹوو پر خود صبح چائے بناتا تھا اور کمرے کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پیتا تھا۔ وہ ان کے ساتھ بڑی دلچسپ بحث کیا کرتا تھا۔ وہ گیمبیا کی حجن کے لیے ایک کپ چائے ضرور الگ کر لیتا تھا جس کا وہ اکثر دوسروں سے ذکر کرتی تھی۔ آج وہ مجھے یاد آتی ہے تو میں اسے بہت اچھے الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتی ہوں۔ وہ کیا خاتون تھی جو تنہا حج پر آئی تھی۔ جب بھی پاسپورٹ، دوسرے کاغذات، ٹرانسپورٹ، سامان

یا رہائش کا مسئلہ ہوتا کوئی نہ کوئی حاجی آگے بڑھ کر اس کے کام آ جاتا تھا۔

ایک بار جب رات کو سونے کے انتظامات عارضی طور پر بدانتظامی کا شکار ہو گئے تھے تو میرے شوہر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں رات کو اس خاتون کے کمرے میں سو سکتی تھی۔ اس جن نے بڑی خندہ پیشانی سے اجازت دے دی تھی۔ اس نے اپنے ادھر ادھر بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ کر مجھے جگہ بنا دی تھی۔ پوتوں کو اس نے دیوار کے ساتھ ایک کونے میں سلا دیا تھا۔ جہاں وہ ایک کمبل کے اندر لیٹ تو گئے تھے مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ آواز نکالے بغیر اپنی موٹی موٹی آنکھیں گھما کر مجھے دیکھتے تھے۔

ہمارے نیچے ہر کمرے میں حجاج اور ان کا سامان یوں ٹھونس دیا گیا تھا کہ ایک انچ بھی خالی جگہ باقی نہ بچی تھی۔ اس پرانے گھر کی سیڑھیوں پر حجاج کا آنا جانا دن رات جاری رہتا تھا۔ وہ جب حرم جاتے تب بھی ان کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور جب واپس آتے تب بھی۔

مکہ میں پہلا جمعہ: آج مکہ مکرمہ میں میرا پہلا جمعہ تھا۔ میں حریم کی خواتین کے ساتھ مسجد حرام گئی تھی۔ جن ودیدہ نے بھی کوشش کر کے ہمارا ساتھ دیا۔ وہ جمعہ کی نماز حرم پاک میں ادا کرنے کی آرزومند تھی۔ ہم جب حرم میں داخل ہوئے تو حجاج کا ایک ہجوم نظر آیا۔ مسجد کے قریب ہماری معمر ترین جن نے اعلان کیا کہ وہ بہت تھک گئی ہے اور مزید آگے نہیں جا سکتی، وہ یہ کہہ کر جہاں تھی وہیں بیٹھ گئی۔ ہمارے اردگرد اور بھی بہت سے لوگ اپنی اپنی جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئے تھے۔ امام کعبہ کی آواز آ رہی تھی۔ اس وقت چونکہ لوگوں کی تعداد جمعہ کے روز بہت بڑھ جاتی ہے اس لیے یہ بہت مناسب رہتا ہے کہ نمازی حرم سے باہر بھی صف آرا ہو کر نماز ادا کر لیں۔ مکہ میں اس وقت موجود ہر شخص ہی نماز جمعہ ادا کرنے آ گیا ہوتا ہے۔

ہم میں سے کچھ نے اندر جانے والے بڑے دروازے کو چھوڑ کر بغلی دروازوں سے اندر جانے کو ترجیح دی تھی۔ مگر ہماری چاند چہرہ خاتون نے کہا کہ بڑے دروازے سے آرام کے ساتھ اپنی باری پر داخل ہوا جائے گا۔ ہم نے ایک دوسرے کو تھام رکھا تھا اور اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سینکڑوں حجاج اس وقت باہر بھی اسی دروازے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ ابھی نماز کا وقت نہیں ہوا تھا۔ میں نے اتنا بڑا اجتماع اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہزاروں حجاج حرم پاک کے اندر داخل ہو کر نماز کے لیے جگہ کی تلاش میں تھے۔ ان میں سے زیادہ کے پاس اپنی اپنی جائے نماز تھی جس کو بچھا کر وہ نماز ادا کرتے تھے۔ ہم دروازے سے تو اندر داخل ہو گئے اب مزید آگے جانے کے لیے راستہ نہیں مل رہا تھا۔ ہم نے بائیں طرف اپنا

رُخ موڑ لیا تھا۔ یہاں تنگ زینے پر کچھ جگہ خالی تھی۔ اوپر آخری سیڑھی پر مسلح سپاہی تھے۔ ہم نے دیوار کے ساتھ جانا چاہا تو ان سپاہیوں نے کسی وجہ سے اس پر اعتراض کیا، ہمیں دور رہنے کے لیے کہا گیا تھا۔ ہماری لیڈر خاتون زمین پر جان بوجھ کر گر گئی اور رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ سپاہی ہمارے عورتیں ہونے کے ناطے ہمیں وہاں دیوار کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دے دیں۔

انہوں نے ہمیں تھوڑا سا راستہ دے دیا تھا تا کہ ہم ان کے قریب دوسری سیڑھی پر جگہ حاصل کر لیں۔

ہم خواتین کے ایک سمندر میں شامل تھیں۔ ان کا تعلق مختلف رنگ و نسل سے اور ملکوں سے تھا۔ کچھ لوگ ہمارے درمیان سے راستہ بنا کر اوپر بالکونیوں میں جانے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے۔ اتنے میں شور مچ گیا ''حریم۔حریم'' کی آواز آ رہی تھی یعنی ادھر خواتین بیٹھی ہیں ان کو پریشان نہ کیا جائے۔ اس اعتراض کے باوجود کچھ حجاج اپنا راستہ بناتے ہوئے ہمارے قریب آ گئے تھے۔ پھر وہ وہیں کھڑے رہے۔ نماز کے دوران پیچھے سے ایک حاجی نے مجھے دھکا دے کر اپنی جائے نماز سے دور کر دیا تھا۔ بعد میں جب میں نے اس بات کا ذکر اپنے شوہر سے کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ ہوسکتا ہے اس حاجی کو یہ بتایا گیا ہو کہ اس کی جائے نماز کو کوئی دوسرا حاجی یا جن چھوئے بھی نہیں۔

حاجی ابھی تک حرم پاک آ رہے تھے کیونکہ اس میں ایک انچ جگہ بھی خالی نہ رہے تب بھی اندر آنے سے کسی کو روکا نہیں جا سکتا۔

حجاج کی اس قدر تعداد، رنگ و نسل، جغرافیائی علاقوں کے فرق اور مختلف مزاجوں کے انسانوں کے باوجود یہاں عموماً غصہ کسی کو نہیں آتا۔ زیادہ تر لوگ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں تاہم کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کوئی حاجی کسی دوسرے بھائی سے معمولی سی بات پر الجھ پڑتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ ایک موقعہ پر دو حجاج کے درمیان سخت الفاظ کا تبادلہ جاری تھا، دونوں خواتین تھیں۔ ایک نے دوسری کو تھپڑ مار دیا تھا۔ ہر طرف سے آواز آئی: ''حرام! حرام!'' (منع ہے۔منع ہے) ایک جن بیٹھ گئی تو دوسری عجیب نظروں سے سپاہیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آس پاس سے خواتین نے اس جن سے اظہار ہمدردی کیا جس کو دوسری نے تھپڑ مارا تھا اور اسے صبر کی تلقین کر کے اپنے جذبات پر قابو پانے کی تلقین کی جو کامیاب ہو گئی تھی۔ میں اس حقیقت کو ریکارڈ کرنا چاہوں گی کہ حج کے دوران یہ واحد واقعہ تھا جو میری آنکھوں نے دیکھا تھا.....

مکہ مکرمہ سے منیٰ کے لیے روانگی: مکہ سے روانہ ہونے والی ٹیکسیاں، بسیں، کاریں، ویگنیں، حجاج اور ان کے سامان سے لدی ہوئی تھیں۔ ''لبیک اللھم لبیک'' کی صدا فضا میں گونج رہی تھی۔ یُوسری اور میں نے گیمبیا کی بی جن کے ساتھ مل کر ٹیکسی کرائے پر حاصل کر لی تھی جس کے ساتھ اس کے پوتے بھی تھے۔ میں حیران تھی کہ پڑاؤ ڈالتے وقت یہ کیسے اہتمام کرتی ہوگی۔ منیٰ میں پہنچنے کے بعد ایک بار وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے ساتھ صرف کھانے پینے کا سامان رکھیں گے، جس میں اتنی خوراک شامل ہو جو چار روز کے لیے کافی ہو سکتی تھی۔ ایک کمبل، ایک چادر، تکیے اور پرانا سبز قالین بھی ساتھ لے لیا گیا تھا۔

منیٰ کا مکے سے فاصلہ صرف چار میل ہے۔ اس لیے وہاں پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت قصبہ ہے جو چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ موسم گرما میں کہتے ہیں یہاں مار ڈالنے والی گرمی پڑتی ہے۔ سبزہ و اشجار سے خالی یہ پہاڑ سورج کی گرمی منعکس کرتے ہیں۔ اس وقت اس پہاڑ پر سفید خیمے حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے جیسے چٹانوں میں سے کھمبیاں نکل آئی ہوں۔ منیٰ میں بنائے ہوئے گھر مجھے اونچے دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے زیادہ کو نیلا یا بھورا پلستر کیا گیا تھا۔ ان پر لکڑی کا کام بھی خوبصورت نقش و نگار کندہ کر کے کیا گیا تھا۔

منیٰ کی بڑی گلی لمبی اور چوڑی ہے جس میں سے گزر کر حجاج شیطان کو کنکریاں مارنے جاتے ہیں۔

حجاج کو ٹھہرنے کے لیے جو گھر حاجی ثقفی نے فراہم کیا تھا وہ تین منزلہ تھا۔ اس میں داخل ہونے کے لیے ایک تنگ سے نیلے دروازے سے گزرنا پڑتا تھا جس کی دیواریں پتھر کی تھیں اور گرمی سے بچنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جب ہم پہنچے اس وقت تمام کمرے کرائے پر اٹھا دیئے گئے تھے، اوپر والی منزلوں پر خواتین تھیں اور سب سے اوپر والی منزل پر سب سے بڑے کمرے میں مصری خواتین کا حریم تھا۔ ان میں سے دو خواتین میرے پاس آئیں کہ میں ان کے ساتھ رہ سکتی ہوں۔ ان کے پاس جگہ بہت کم تھی اس کے باوجود انہوں نے میرے لیے جگہ بنائی تھی۔ میں اگر وہاں چلی جاتی تو سونے کے لیے مجھے یقیناً مشکل پیش آتی۔ میں نے اپنے شوہر کے ساتھ باہر رہنے کو ترجیح دی جہاں اور خواتین اور مرد رہتے تھے۔ اس گھر کے عقب میں ایک بڑا سا خیمہ بھی حجاج کی رہائش کے لیے نصب کیا گیا تھا۔ میں خوش تھی کہ جن ودیدہ کو اس کی دوست لے گئی تھیں۔ اب وہ مصری خواتین کے ساتھ محفوظ تھی اور اسے میرے شوہر کی مدد کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

صحن میں مجھے اور میرے شوہر کو بہت سے خیمے نظر آئے تھے جن میں پاکستانی، ہندوستانی، سوڈانی اور مصری حجاج رہتے تھے۔ دوپہر کا کھانا تیار ہو رہا تھا۔ ہم تھک گئے تھے اور نماز سے پہلے ہم نے کھانا کھایا تھا۔ ہم نے زمین پر قالین اور کمبل بچھا لیے تھے اور جلدی ہی سو گئے تھے۔

عرفات: عرفات میں چھوٹی چھوٹی بہت سی پہاڑیاں ہیں۔ ہم ٹیکسی سے اتر آئے تھے تاکہ پورا میدان اور پہاڑیاں دیکھ سکیں جہاں ہر طرف خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔ خیموں کی جگہیں ہر مطوف کے نام کے حوالے سے مخصوص تھیں جہاں ہر ایک کا بڑا سا نشان لگا ہوا تھا۔ حجاج کے پڑاؤ کے قریب سے گاڑیاں گزر رہی تھیں جن میں حجاج آ رہے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمارے لیے حاجی ثقفی کے خیمے پہلے سے نصب کر دیے گئے تھے اور یہ ایسی جگہ تھے جہاں ہمارے کھو جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔

انتظامی امور قابل تعریف تھے۔ نصف ملین کے قریب حجاج کے لیے خیمے لگائے گئے تھے۔ قریب کے پانی کے ذخیروں سے صاف پانی وافر مقدار میں مہیا کیا گیا۔ بیت الخلا بھی خیموں کے تھے۔ عالمی ادارۂ صحت نے بعد میں سعودی حکومت کو مبارکباد پیش کی تھی کہ حج کے دوران کوئی وبائی مرض نہیں پھیلا تھا۔

بہت عرصہ پہلے حج کے دوران مقاماتِ مقدسہ میں کبھی کبھی وبائی امراض پھیل جایا کرتے تھے جن میں چیچک اور ہیضہ زیادہ پھیلتا تھا جس سے بہت سے حجاج موت کا شکار ہو جاتے تھے۔ آج کل سعودی حکومت تدارکی تدابیر پر زیادہ توجہ دیتی ہے جس کی وجہ سے وبائی امراض نہیں پھیلتے۔

میں اور یوسری ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ اتنے میں حاجی ثقفی اپنے خیمے سے نکلا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس خیمے میں حریم کی خواتین بڑی بی جن کے پاس جمع ہو رہی تھیں وہ غالباً اپنی خوش دامن کا ذکر کر رہا تھا۔

ثقفی نے میرے شوہر سے کہا: ''تمہاری بیوی کو بھی وہاں جانا چاہیے تاکہ بڑی جن اسے عرفات میں ادا کی جانے والی مذہبی رسوم کے بارے میں بتا سکے''۔

میرے شوہر نے جواب دیا: ''میں اسے اس بارے میں بہتر بتا سکتا ہوں''۔ حاجی ثقفی کچھ ناراض ہو گیا تھا۔ میرے شوہر نے پوچھا کیا تمہاری خوشدامن میری بیوی کو انگریزی میں بتا سکے گی۔ میں بھی حیران تھی کہ میں عربی نہیں جانتی تھی اور بڑی جن انگریزی نہیں بول سکتی تھی، پھر وہ مجھے کس زبان میں بتا سکتی تھی۔ یہ بڑی مضبوط دلیل تھی اور ثقفی کی سمجھ میں آ جانی چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ میرا شوہر تو دو حج پہلے بھی کر چکا تھا، اسلامی ادب کا مطالعہ بھی وسیع کیا تھا اور وہ مجھے بہت اچھی طرح اس معاملے میں بتا سکتا تھا۔ پھر میں جس

اطمینان کے ساتھ اپنے خاوند سے رہنمائی حاصل کر سکتی تھی اور کسی سے بھی حاصل نہ کر سکتی تھی۔

ثقفی نے جب یہ دیکھا کہ میرا شوہر نہیں مان رہا تو اس نے ایک اور خیمے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس خیمے میں پاکستانی رہتے ہیں جو تعداد میں بھی زیادہ نہیں، ہم کیوں نہ وہاں چلے جائیں۔ہم نے وہاں جا کر دیکھا کہ حجاج یا تو قرآن سن رہے تھے یا دعائیں پڑھ رہے تھے۔

منیٰ کو واپسی: ہم ایک بار پھر حاجی ثقفی کے گھر میں واپس آ گئے تھے۔ہم نے کنویں کا پانی پیا جس کا ذائقہ تبدیل ہو گیا تھا۔ہم نے دراصل پانی کو ابال کر پینا بھی بند کر دیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہیں سے صاف ستھرا جراثیم سے پاک پانی خرید لیں گے۔

صحن کے عقبی دروازے کے نزدیک ہم نے اپنا خیمہ نصب کیا تھا جو سیدھا گلی میں نکلتا تھا۔ ہمارے خیمے سے کچھ ہی دور لکڑیوں کی آگ پر توا رکھ کر کھانا پکتا تھا۔اس کے قریب ہی ڈھلوان تھی جس کے ذریعے پانی بہہ کر ہمارے خیمے کی طرف آ سکتا تھا۔میں نے جب اس خدشے کا ذکر حسن سے کیا جو ثقفی کا اچھی طبیعت رکھنے والا معاون تھا تو اس نے ہمیں تسلی دی کہ ایسا نہیں ہوگا، ہم بے فکر رہیں۔

ہمارے خیمے کے بعد ایک بہت غریب ہندوستانی خاندان کا خیمہ تھا۔ یہ حجاج کمزور اور بوڑھے تھے۔انہیں دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ بیچارے غربت وافلاس کے مارے ہوئے ہیں۔

ان میں اور متمول حجاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔متمول اور خوشحال حجاج بہت صحت مند، تندرست وتوانا تھے، جن کی صحت اور ظاہری شکل وصورت سے بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ انہیں کوئی مالی پریشانی نہیں ہے۔

ہمارے خیمے میں ایک نوجوان شوہر، اس کی خاموش طبع اور ڈرپوک بیوی اور اس کی ماں تھی۔ایک روز میں جب کھانا تیار کر رہی تھی تو مجھے اپنے کندھے پر کسی خاتون کا ہاتھ محسوس ہوا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ایک ہندوستانی جن مجھ سے کچھ پیسے مانگ رہی تھی۔ میں مسکرا پڑی تھی اور ظاہر یہ کیا کہ میں اس کی بات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ جب میرے شوہر آئے تو میں نے یہ واقعہ سنایا۔میرے خاوند نے مجھے بتایا کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی حاجی یا جن بھیک مانگ رہی ہو۔حج تو صرف ان لوگوں پر فرض ہے جو صاحب استطاعت ہوں۔پھر حجاج میں سے کسی کی کوئی ضرورت ہو بھی تو مختلف فلاحی تنظیمیں ان کی مدد کرنے کے لیے ہمہ وقت کمربستہ رہتی ہیں۔چنانچہ ایسے حجاج جو بھیک مانگنے کی نوبت کو پہنچ جائیں، ان کی تعداد آٹے میں نمک کے

برابر ہوتی ہے۔تاہم یہ ہوسکتا ہے کہ کسی حاجی نے سارے پیسے سفر کے دوران خرچ کر لیے ہوں اور اب یہاں قیام کے دوران خرچ کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ بچا ہو۔ بعدازاں مدینے میں ہمارے پاس دو حجاج تشریف لائے تھے۔انہوں نے ہمیں بتایا کہ ان کے ساتھ کیا بیتی ہے۔ہم نے ہندوستانی جن کو نقد رقم نہیں دی تھی بلکہ اسے اور اس کے مختصر سے خاندان کو کھانے پر مدعو کرلیا تھا۔انہوں نے اسے قبول کرلیا تھا۔ پھر وہ اپنے گاؤں سے جو غلہ ساتھ لائے تھے اس میں سے کچھ پکا کر انہوں نے ہمیں پیش کیا تھا۔ یہ دلیے سے ملتی جلتی کوئی شئے تھی۔

مکہ مکرمہ کو واپسی: اوپر والی منزل پر خواتین بیٹھی ہوئی تھیں اور اپنا اپنا سامان درست کر رہی تھیں۔تمام سوٹ کیس چھت پر رکھے جا رہے تھے کیونکہ کمرے میں جگہ بہت کم تھی۔ انہیں مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ جب کسی شے کی ضرورت پڑتی اسے کمرے میں تلاش کرنے میں ہر چیز اُتھل پُتھل ہو جاتی تھی۔

دن تیزی سے ساتھ گزر رہے تھے اور ہمیں انتظار تھا کہ مدینہ طیبہ جانے کی ہمیں اجازت کب ملتی ہے۔ خواتین کو اب آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی کچھ پہچان ہوگئی تھی۔ اب ہماری لینڈ لیڈی بھی پہلی جیسی خونخوار نہیں لگتی تھی۔ میری یادوں کی گیلری میں حج کے دنوں کی تصویریں محفوظ ہیں۔ ان میں ایک تصویر وہ بھی ہے جس میں ایک چھوٹے سے کمرے میں خواتین بیٹھی باتیں کر رہی ہیں یا لیٹی ہوئی ہیں جبکہ لینڈ لیڈی نے سُوتی رومال سے اپنا سر باندھ رکھا ہے اور گھر میں پہننے والے ایک ارغوانی سوٹ میں ملبوس ہے۔ وہ اس وقت حقہ پی رہی ہے، وہ وقفے وقفے سے حقے کی نال منہ سے نکال کر کمرے میں موجود خواتین کے ساتھ باتوں میں شامل ہو جاتی ہے۔

مناسک حج کی ادائیگی سے ہٹ کر لوگوں کی ایک دلچسپی خریداری میں تھی۔ جو کچھ خرید کر لایا جاتا تھا۔ اس کی قیمتوں کے بارے میں تبادلہ خیالات ضرور ہوتا تھا۔ یہ خریداری مکے، مدینے اور جدے سے کی جاتی تھی۔ مصریوں کو خریداری میں دلچسپی یوں بھی زیادہ ہوتی تھی کہ جنگ کے بعد وہاں اشیائے خریداری کم ہو جاتی تھیں۔ مصریوں کی خریداری میں شامل چیزوں میں گھڑیاں، بجلی کا سامان، کپڑا، عطریات سرفہرست ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ اچھی اور خوبصورت سرخ، نیلی یا سبز جائے نماز ضرور خریدی جاتی تھی اور کئی کئی کی تعداد میں خریدی جاتی تھیں۔ یہ تحائف میں شامل تھی جو تحائف واپسی پر حجاج اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں کو دیتے تھے۔ عموماً جائے نماز کے ساتھ تسبیح بھی شامل کر لی جاتی تھی۔ جائے نماز پر بیت اللہ اور روضۂ رسول

مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بنا ہوا ہوتا تھا۔ بچیوں کے لیے ہار ضرور خریدے جاتے تھے جن کی سینکڑوں قسمیں تھیں۔ مدینہ طیبہ میں یہ ساری چیزیں ان دُکانوں سے مل جاتی تھیں جو مسجد نبوی کے قریب واقع بازار میں تھیں۔ مکے میں ایک بہت بڑا بازار ہے جہاں سے ہر شے مل سکتی ہے۔ کپڑا، چینی کے برتن ساختۂ ایران اور افغانستان قالین کی خریداری زیادہ کی جاتی ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ آپ نماز سے پہلے خوشبو لگایا کرتے تھے۔ حجاج آج بھی مدینہ منورہ سے اپنی پسند کی خوشبو لے کر جاتے ہیں۔ آپؐ کو مسواک بہت پسند تھا، آج بھی مکہ و مدینہ میں فٹ پاتھ پر مسواک ہزاروں کی تعداد میں روز بکتے ہیں۔ یہ دانت بھی صاف کرتا ہے اور مسوڑوں کے لیے بھی بہت مفید ہے۔ حج کے دنوں میں دونوں مقدس شہروں کے بازاروں میں رات دن خریداروں کی بھیڑ رہتی ہے۔ دُکاندار ان دنوں خوب کمائی کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ موسم حج کا انہیں بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔

چھوٹی سی چھوٹی دُکان میں درآمد شدہ سامان ملتا ہے مثلاً جاپان کے ٹیپ ریکارڈز اور برطانیہ کے سگریٹ کی بڑی مانگ ہوتی ہے۔ یہاں کوئی سینما گھر نہیں، تھیٹر ہال کوئی نہیں لیکن شام کے وقت کیفے ٹیریا میں ٹیلی ویژن پر ناظرین کی دلچسپی کے لیے بہت سے پروگرام پیش ہوتے ہیں۔

ہم عموماً رات کو چھت پر بیٹھتی تھیں اور پھر ہم نے چھت پر چٹائیاں بچھا کر تاروں بھرے کھلے آسمان کے نیچے سونا بھی شروع کر دیا تھا۔

مگر اب ہماری واپسی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ منٰی سے ہماری واپسی کے تقریباً ایک ہفتہ بعد ہمیں حکومت کی طرف سے اجازت مل جاتی تھی کہ ہم مدینے جا سکتے تھے۔ قلی سامان اٹھانے کے لیے آ جاتے تھے۔ ہم مصری حریم کی خواتین نے ایک ایک کر کے لینڈ لیڈی سے الوداعی ملاقات کی اور اسے بوسہ دیا۔ اب مجھے اس سے بہت کم ڈر لگتا تھا۔ غالباً میں نے دوسری خواتین سے یہ بات سیکھ لی تھی کہ مجھے عجز و انکساری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ میں اس کے رخسار پر بوسہ دینے کے لیے جھکی تو میرے حجاب کا ایک سرا لینڈ لیڈی کے حقے کے اس حصے سے ٹکرا گیا تھا۔ جس میں ایک پیالہ نما شے میں کوئلہ جلتا ہے۔ میں مارے ڈر کے وہاں سے اس طرح غائب ہو گئی تھی جیسے دھوئیں کے بادل میں جن غائب ہوتا ہے۔

حج کے معانی: میں اور میرا شوہر حرم پاک کی طرف روانہ ہوئے تا کہ الوداعی طواف کر لیا

جائے۔ہم بھی دوسرے حجاج کی طرح حرم کو الوداع کہتے وقت افسردہ واداس تھے۔ہمیں وہ قابل رشک لمحات یاد آرہے تھے جو ہم نے اللہ کے گھر میں گزارے تھے۔

معروف ترک مصنف احمد کمال جس نے حج گائیڈ لکھی (دوسرا سفر) مکے کے بارے میں کہتا ہے:

''اور مکہ مکرمہ محض ایک جغرافیائی مقام ہی نہیں، جہاں مناسک حج ادا کرنے حجاج آتے ہیں بلکہ یہ تو ایک ذہنی کیفیت ہے۔ مکے میں حجاج کو وہی کچھ ملتا ہے جو وہ اپنے ساتھ یہاں لاتے ہیں۔ہم یہاں اس لیے نہیں آتے کہ ہمیں کسی اُمنگ کی تلاش ہوتی ہے۔ بلکہ ہم تو پہلے سے ہی ایک امنگ ساتھ لے کر آتے ہیں۔حج تو عقیدے اور ایمان کا اعلان ہے۔اس کی تلاش وجستجو نہیں ہے''۔

جو کچھ احمد کمال نے کہا اس میں پوری پوری سچائی اور صداقت شامل ہے مگر میں پھر بھی اس سے کسی حد تک متفق نہیں ہوں کیونکہ حج کے معانی مختلف حجاج کے لیے مختلف نہیں ہیں۔مثلاً میرا شوہر کہتا ہے کہ وہ اپنی روحانی بیٹری از سرنو چارج کرانے حج پر جاتا ہے اور وہ اس طرح اپنے دل کی روحانی حساسیّت میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔میرے نزدیک حج کا مطلب ہے ایک تلاش وجستجو کا سفر جس کے اختتام پر ایک دروازہ انتہائی گہرے روحانی تجربے کی سمت کھلتا ہے حالانکہ میرا مکے کا سفر عقیدہ وایمان کا اعلان تھا۔

23۔ مائیکل وُلف...... امریکا
1990ء

گذشتہ تمام تعارف جو یہاں کرائے گئے، ان کی مانند یہ بھی سفرِ حج کو ایک خاص پس منظر اور سیاحت نامے یا رہنمائے سفر کے طور پر قاری کے لیے پیش کرتا ہے۔ تاہم اس میں، میں خود ایک سیاح تھا۔

میں نے جب 1990ء میں حج کیا، اس وقت مجھے مسلمان ہوئے تین برس گزر گئے تھے۔ میں نے نوجوانی میں شمالی اور مغربی افریقا کے سفر میں تین سال گزارے تھے۔ یہ وہ علاقہ تھا جس میں اسلامی ممالک کی تعداد زیادہ ہے۔ 40 برس کی عمر میں میری مذہب سے دلچسپی میں اضافہ ہوا تھا اور مجھے اپنے لیے اسلام میں ایک خاص کشش محسوس ہوئی تھی۔ میں اب تک صرف عیسائیت اور یہودیت کی رُوحانی روایات سے واقف تھا۔ میں نے چند سال مسلمانوں کے ساتھ گزارے تھے اور میں نے روزمرہ ضابطۂ حیات میں مذہب کا عمل دخل دیکھا تھا: اس کی روح عقیدۂ مساوات پر مبنی تھی اور اس میں سماجی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ سب سے آخر میں اس کا ایک ستون حج تھا جس کے لیے سفرِ حج اختیار کر کے مکے جانا ہوتا ہے اور میرے اندر بیٹھے ہوئے سیاح کو اس میں کشش نظر آئی تھی۔

میرے وطن سے مکے تک پہنچنے کے لیے حج پیکج موجود تھے: کیلی فورنیا سے بذریعہ ہوائی جہاز تین ہفتوں پر مشتمل سیاحتی ٹکٹ ملتے تھے جن کے ذریعے امریکی مسلمان، اپنے ملک سے مکے جا سکتے تھے تاکہ حج ادا کر سکیں اور واپسی پر اپنے کام اور خاندان کے ساتھ آملیں۔ میرے ذہن میں ایک طویل سفر کا خیال تھا۔ میں بجائے کسی گروپ کے ساتھ جانے کے اکیلا مارچ 1990ء میں امریکا سے چل پڑا تھا۔ میں تین ماہ مراکش میں ٹھہرا۔ اسی کی روداد پر مشتمل اقتباسات اس کتاب میں شامل کیے جا رہے ہیں۔ میں نے مراکش کو اپنے سفرِ حج کے لیے مقامِ آغاز کے طور پر اس لیے منتخب کیا تھا کیونکہ میں رمضان کا مہینہ ایک اسلامی ملک میں گزارنا چاہتا تھا اور میں جس ملک کو جانتا تھا اور جو مجھے پسند تھا وہ مراکش تھا۔ میں جون کے

مہینے میں مکے حج کی ادائیگی کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہوا تھا۔ سعودی حکومت کے بتائے گئے اعداد و شمار کے مطابق 1972ء میں 52 حجاج امریکا سے حج پر گئے تھے۔ میں 1990ء میں جب حج پر گیا تو جس ہوٹل میں، میں ٹھہرا ہوا تھا۔ صرف اس میں اس تعداد سے زیادہ امریکی مسلمان ٹھہرے ہوئے تھے جو حج کے لیے آئے تھے۔ میرے پاس اپنی میز پر لگی ہوئی اس زمانے کی ایک تصویر ہے جس میں چار حجاج مدینہ منورہ میں ایک پتھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے سفید چغے اور سروں پر سکارف باندھ رکھے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ قدیم عرب سے باہر نکلے ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق برازیل سے ہے، تیسرا بولیویا کا ہے اور چوتھا لاس اینجلز (امریکا) کا۔ ہم نے اور چند درجن دوسرے لوگوں نے جن کا تعلق ہمارے نصف کرۂ ارض سے ہے، بغیر کسی پیشگی تیاری کے نیو ورلڈ ڈیلیگیشن (نیا عالمی وفد) تشکیل دیا اور چار ہفتوں پر مشتمل سفر کر کے اکٹھے حج ادا کیا تھا۔ ہم مکہ مکرمہ میں جاپانی ساخت کی ٹیکسیوں میں خوب گھومے۔ ہم نے دور دراز کے فاصلوں پر ٹیلیفون پر باتیں کیں جن میں اٹیلانٹا، رایو ڈی جنیرو اور سان فرانسسکو شامل تھے۔ ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر ہم سیاست اور مغربی تہذیب کی خوبیاں اور خرابیاں زیر بحث لاتے تھے۔ ہم این بی اے باسکٹ بال کا کھیل بذریعہ سیٹلائٹ دکھایا جانے والا بھی دیکھتے تھے اور جرمنی کی بنی ہوئی بسوں میں میدان عرفات تک بھی جاتے تھے۔ ٹریفک بذریعہ کمپیوٹر اور ٹی وی کے بند سرکٹ کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ میں یہ جانتا تھا کہ اگر کبھی میں نے حج پر کوئی کتاب لکھی تو وہ اس سے قبل اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب سے مختلف ہوگی۔ تیس برسوں میں ایک بین الاقوامی کانووکیشن عالمگیر بھی بن چکی تھی اور نہایت فضیاتی بھی۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس کی لازمی مذہبی رسوم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہم نے خانہ کعبہ کا طواف بالکل اسی طرح کیا جس طرح نصرو خسرو نے 1050ء میں کیا تھا۔ ایسے موقعہ پر ہماری مثال اُن جدید پیکروں جیسی تھی جن میں لازمانی جذبات سمو دیئے گئے تھے۔

حج: ایک امریکی کے حجِ مکہ کے دو حصے ہیں: 150 صفحات میں مراکش کا ذکر ہے اور

اس کے بعد کے 150 صفحات میں حجاز کا تذکرہ ہے۔ مراکش میں مجھے ایک مانوس اور اپنائیت کا سماجی ماحول میسر آیا تھا۔ مجھے یہاں ایک گھر کا سا ماحول ملا تھا۔ میرے جتنے بھی سفر اس سے پہلے کے تھے۔ ان میں، میں نے کبھی بھی مکے کا سفر کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ آج اس شہر مکہ کی مقامی آبادی میں ان حجاج کے

آباؤاجداد مقیم ہیں جو حج کے بعد یہیں رہ گئے تھے۔ ہر سال کئی ملین لوگ ایک خاص عرصے میں یہاں آ کر نہ صرف آبادی میں عارضی سا اضافہ پیدا کر دیتے ہیں بلکہ کچھ پیچیدگیاں بھی جنم لیتی ہیں۔ ان کا نہ تو چھٹیوں کے ساتھ کوئی تعلق ہے نہ تجارت سے۔ موسم گرما کے نصف میں آنے والی گرمی تکلیف دہ تھی اور میں نے زندگی میں اتنا بڑا اجتماع اس سے قبل کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔ ان حالات میں مجھے احرام کی بہت تعریف کرنی پڑی تھی۔ جس میں دو ان سلی سفید چادریں محض ایک علامت ہیں۔ اس شدت کی گرمی میں یہ حجاج کی حفاظت کرتی ہیں۔ ایسے میں کوئی اور جگہ ہوتو دماغ پھر جاتے ہیں۔

جس کسی نے بھی اس کتاب کا نصف حصہ اب تک پڑھ لیا ہے اسے ضرور یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ حج کی ادائیگی کوئی آسان کام نہیں ہے؛ خاص طور پر اس وقت جب حج کے لیے کوئی عمر کی قید نہیں رکھی گئی۔ اگر یہ مشکل کام نہ ہوتا تو یہ حج نہ ہوتا۔ ایک حاجی کے لیے کسی نہ کسی طور یہ ایک چیلنج رہا ہے: اس میں جسمانی تگ ودو اور جدوجہد سے ایک روحانی تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اس سے انسان میں صبر وتحمل پیدا ہوتا ہے؛ انہماک اور ایک خاص تحریک ملتی ہے، یہ سمجھ میں آتا ہے کہ واقعات کے بہاؤ کا تعاقب کہاں کرنا ہے، اپنا خیمہ کہاں نصب کرنا ہے، مشکل سے کس طرح بچ کر نکل جانا ہے اور تھکن سے کیسے بچنا ہے۔ آج جسمانی خطرات تو اس لیے درپیش نہیں ہوتے کہ راہزنوں، چوروں اور ڈاکوؤں سے حجاج کو واسطہ نہیں پڑتا، جو کبھی صحراؤں میں لوٹ لیے جاتے تھے تو کبھی موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے تھے۔ ہوائی سفر اور جدید ریاستی نظام نے ماضی کے وہ مسائل حل کر دیئے ہیں۔ اب حج کے موقعہ پر کئی کئی ملین کے اجتماع کا وزن، ٹریفک، شوروغل اور انسان کی خودساختہ بے آرامی جیسے مسائل اس کی پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ ایک حاجی جہاں امن وسلامتی کی توقع رکھتا ہے وہاں اسے افراتفری، گھبراہٹ اور اسی قسم کی دوسری باتیں پریشان کر دیتی ہیں۔ جدید حج کے لیے حجاج کا صحت مند ہونا لازمی ہے تا کہ وہ اس فریضے کی ادائیگی میں پیش آنیوالی مشکلات کا مقابلہ کر سکے۔ معمر حجاج اور بچے ہمیشہ کی طرح آج بھی زیادہ تکالیف اٹھاتے ہیں۔

مراکش میں میرے سفر حج کے پروگرام کی تشکیل میں کئی ماہ لگ گئے تھے اور درج ذیل اقتباسات اسی عرصے کی روداد پر مشتمل ہیں۔ کتاب کے اس حصے میں، میں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ حج کے لیے کی جانے والی تیاریاں بھی حج سے کچھ کم بامعنی نہیں ہوتیں۔ یہ اقتباسات میرے جدہ ایئرپورٹ پہنچنے کے بعد بھی دو مہینوں کے عرصے سے متعلق ہیں جس میں ایک رات کا وہ سفر بھی شامل ہے جو میں نے اونٹ پر

حجاز میں داخل ہونے کے لیے کیا تھا۔ اس کے بعد مکہ میں ادا کی جانے والی ابتدائی مذہبی رسوم کی ادائیگی کی تفصیلات ہیں جو بیسویں صدی کے اختتامی عرصے میں ادا کی گئی تھیں۔ میں نے اس میں کچھ ذکر شہر میں اپنے گھومنے پھرنے کے بارے میں بھی شامل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ حرم پاک میں رات کے پچھلے پہر کے مناظر کی تصویر کشی ہے اور وہ اقتباسات ہیں جن میں عرفات جانے والے حجاج کے جلوس کا ذکر ہے۔ اب تک یقیناً یہ علاقہ قارئین کے لیے جانا پہچانا علاقہ بن چکا ہوگا۔ چند ایک باتیں حج کے بعد کے وقت سے تعلق رکھتی ہیں جو ان اقتباسات کا حصہ ہیں۔

☆☆☆

”حج: ایک امریکی کا حج مکہ“ میں سے لیا گیا...... مصنف: مائیکل وُلف

مراکش: یکم مئی 1990ء: موسم گرما آ چکا تھا اور اب جبکہ ماہِ رمضان المبارک ختم ہو چکا تھا اور اسلامی کلینڈر کے مطابق اب حج کی تیاریوں کے آغاز کا زمانہ تھا۔ حج تو جولائی میں ہو گا لیکن تیاریاں ابھی سے شروع کر دی جائیں گی۔ مراکش سے سعودی عرب تک تین ہزار میل کا فاصلہ تھا جس کے لیے ویزا، نشستیں محفوظ کرانا اور اسی طرح کے دیگر انتظامات درکار تھے۔ بہت سے لوگوں کے لیے تو یہ تیاریاں فوری طور پر شروع ہو جانی چاہیے تھیں۔ مدینے میں حج کا ذکر گفتگو کا موضوع بن گیا تھا۔ ہر روز مقامی اخبارات پورے صفحے پر مشتمل اشتہارات چھاپ رہے تھے جن میں مکہ آنے والی پروازوں کی تفصیل شائع ہوتی تھی۔ میں نے بازار میں چند حجاج سے ملنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب کے سب تاجر تھے۔

بن یوسف مدرسے سے کچھ فاصلے پر عبدالہادی کی الیکٹرانکس کی دُکان تھی وہ ایک 55 سالہ شخص تھا، قد چھوٹا اور جسم مضبوط لیکن جلد بالکل بچوں کی جلد کی مانند ملائم تھی۔ اس کے چہرے پر ایک لکیر کی مانند مونچھیں تھیں۔ اس کی دُکان کے سامنے ٹھیلے والے اور چھابڑی فروش کھڑے رہتے تھے۔ اس کی دُکان میں سامنے والے حصے میں کچھ چیزیں لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے رکھی ہوئی تھیں جن میں تین ریڈیو ٹرانسسٹر، ایک وڈیو ٹیپ مشین، دو کیسٹ ریکارڈر اور ایک رنگین ٹی وی شامل تھے۔ وہ انہیں فروخت نہیں کرتا تھا۔ میں نے اسے کبھی کوئی ایک آدھ شے بھی بیچتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی اصل آمدنی مرمت میں تھی۔

دُکان کے اندر عقبی حصے میں الیکٹرانکس کا بہت سا سامان جو استعمال شدہ تھا ڈھیروں کی شکل میں رکھا ہوا تھا۔ چونکہ درہم کی مراکش سے باہر کوئی قیمت نہ تھی اس لیے مراکشی درآمد شدہ اشیاء سے آسانی سے نہیں بچھڑتے۔ کوئی الیکٹرانکس کی شے جتنی بھی پرانی ہو جائے وہ اسے پھینکتے نہ تھے۔ بلکہ عبدالہادی کے سٹور میں لے آتے تھے۔ دُکان کی لمبائی چوڑائی 25 مربع فٹ تھی۔

گو وہ ہر سال مکے جاتا تھا لیکن عبدالہادی کا شمار بمشکل خوشحال تاجروں میں ہوتا تھا۔ اسے دُکان سے چونکہ زیادہ منافع حاصل نہیں ہوتا تھا اس لیے وہ جب حج پر جاتا تو سفر حج کے اخراجات پورے کرنے کے

لیے وہ بطور گائیڈ کام کرتا تھا۔ امسال اس کے ساتھ تین خواتین تھیں، متمول تین خواتین آپس میں بہنیں تھیں، جو اس کے سامنے گاہکوں کی طرح قطار بنائے کھڑی رہتی تھیں۔ جب ہم ملے ان دنوں وہ ان تینوں کے ہوائی ٹکٹوں کا انتظام کرنے میں مصروف تھا۔ رمضان المبارک کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ ویزے کی درخواستوں کے فارم پُر کر رہا تھا۔ یہ فارم اگلے روز اس نے بذریعہ ڈاک رباط بھجوا دیے تھے۔ ایک ہفتے کے بعد اس نے مجھے خوشی کے ساتھ بتایا کہ رباط سے کاغذات آ گئے تھے۔ مجھے قدرتی طور پر ان سب باتوں میں دلچسپی تھی حالانکہ میں نے ابھی تک اپنے لیے ویزا حاصل نہیں کیا تھا۔

میں نے عبدالہادی سے مکے جانے کے لیے اس کے اہلِ رجوع (گاہکوں) کے بارے میں پوچھا تو جواب دیا: ''ایک ہے جو بہت بوڑھا ہے اور دوسرا نابینا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کا کوئی بھائی زندہ نہیں ہے۔ یہ دونوں مرنے سے پہلے مکے جانے کے آرزومند ہیں اور میں خود تو وہاں جا چکا ہوں۔ انہوں نے میرے لیے ٹکٹ خرید لیا تھا کہ میں ان کے ساتھ بطور محافظ و نگران کے جاؤں۔'' حج اپنی ابتدا سے اب تک بہت سے مذہبی سفروں کی طرح تجارت سے جوڑ دیا گیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کیا عبدالہادی بھی تھوڑی بہت تجارت کر لے گا۔

اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''تیل کی وجہ سے وہاں کی معیشت اس قدر مضبوط ہے کہ سامان وہاں سستا ہے۔ میں اپنے ساتھ واپسی پر دو کیمرے اور ایک ٹی وی سیٹ لاؤں گا''۔

میں نے مکہ میں عبدالہادی کی اس وقت تصویر لینی چاہی جس وقت اس کے ساتھ تین متمول خواتین (تینوں بہنیں) تھیں اور وہ سخت گرمی میں ان کے ساتھ تھے اور ان کے کندھوں پر "21 کا ٹی وی تھا۔ اس نے مکہ کے ایک ہوٹل کا نام ایک کارڈ پر لکھ رکھا تھا۔

اسلام میں فریضۂ حج کی ادائیگی صرف صاحب استطاعت پر لازم ہے۔ متوسط طبقے کے لوگوں کے لیے حج کے انعامات مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ پورے مراکش میں مرد محنت کرتے ہیں اور بعض اوقات برسوں تک یہ کام جاری رہتے ہیں۔ تھوڑے عرصے کے لیے دُکانیں چھوڑ کر مختصر سی مدت کے لیے مکے جانے کے لیے وہ تھوڑا سا اقتصادی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ہوائی سفر سے پہلے سفر بہت حوصلہ شکن ہوتا تھا۔ اس سفر میں مہینے تو کبھی سال ہا سال بھی لگ جاتے تھے، حاجی واپس آتا تھا تو زیادہ معزز اور محترم بن کر آتا تھا مگر آج کل حج کے انعامات زیادہ ذاتی ہیں۔ جب

حج سے واپسی پر اس کے سوٹ کیس باہر آتے ہیں تو پڑوسی ضرور توجہ دیتے ہیں مگر حجاج کی تعداد میں پچاس گنا اضافے نے اس سفر حج کو کم متاثر کن بنا دیا ہے۔ ان دنوں ہر شخص ایک فریضے کی ادائیگی کے لیے جاتا ہے، وہ اپنی زندگی میں ایک تبدیلی لانا چاہتا ہے، اپنی روح کی تازگی چاہتا ہے، مگر اکثر وہ شخص تجارت کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ کچھ بزرگوں کی موت پر آہستہ آہستہ ماتم مناتے رہتے تھے۔ کچھ کا خیال ہوتا ہے نہیں اچھا ہوا وہ چلے گئے۔ مراکش کے لوگ خاندان کی اکائی قائم رکھ کر زندگی گزارنے والے لوگ ہیں۔ ہوائی سفر سے مکے جانے پر وہ تین ہفتے تک گھروں سے دور رہتے ہیں اور زیادہ تر لوگ جن کے پاس پیسے بھی کم ہوتے ہیں اس سفر پر چل پڑتے ہیں۔ یہ لوگ چند مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے جاتے ہیں اور ان کی آرزو ہوتی ہے کہ اس کعبے کی زیارت کر لیں جس کی طرف قبلہ رُو ہو کر وہ عمر بھر نمازیں ادا کرتے رہے ہیں۔ وہ واپس گھر لوٹتے ہیں تو حاجی کا خطاب لے کر آتے ہیں جو تا حیات ان کے نام کے ساتھ چسپاں رہتا ہے۔

حج اسلام کا پانچواں ستون ہے۔ مجھے زندگی میں ایک بھی شخص ایسا نہیں ملا جس نے کوشش کی ہو کہ حج نہیں کرنا۔ یہاں تک کہ شہر کے رہنے والے نفیس لوگوں نے بھی حج کے بارے میں یہی خیال کیا کہ اس سے زندگی بدل جاتی ہے، اور یہ تبدیلی مستقل ہوتی ہے عمر بھر کے لیے۔ الیاس کینٹی نے اپنی کتاب ''ہجوم اور طاقت'' (کراؤڈز اینڈ پاور) میں لکھا ہے: ''بہت سے ہمعصر مسلمانوں کے خیال میں جب تک آپ نے حج نہیں کیا تھا سچ تو یہ ہے کہ آپ نے زندوں جیسی زندگی ہی نہیں گزاری تھی''۔

مراکشیوں میں اتنے غریب لوگ بھی تھے کہ سفر حج کے لیے پیسے ہی ان کے پاس نہ تھے مگر ان کی ٹرانسپورٹ کے انتظامات کیسے معجزانہ طور پر ہو گئے اور وہ کس طرح جادو کے قالینوں پر بیٹھ کر سرزمین مقدس پر جا کر اترے، اس بارے میں بڑی کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔ جب انسان مکے سے دور زندگی گزار رہا ہوتا ہے تو یہ کہانیاں زیادہ مشہور ہوتی ہیں۔ ایڈورڈ ویسٹر مارک نے ایک کتاب تین جلدوں میں لکھی ہے۔ کتاب کا نام ہے ''مراکش میں مذہبی رسم اور عقیدہ'' (Ritual And Belief in Moroco) جس میں اس نے ایسی کئی کہانیاں بیان کی ہیں۔ وہ ایک قصہ اس طرح بیان کرتا ہے:

> ''سیدی حامد بقو جانامی ایک بزرگ کے ایک مُرید نے مکے جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس بزرگ نے اپنے مرید سے کہا کہ وہ سمندر پر جائے اور سمندر میں چھلانگ لگا دے۔ وہ وہاں چلا تو گیا تھا لیکن اپنے پیرو مرشد کے حکم کی تعمیل میں اپنے

آپ کو سمندر کی لہروں کے سپرد نہ کر سکا تھا۔ اتنے میں ایک شخص گھوڑے پر سوار آیا اور اس سے پوچھا کہ وہ وہاں کیا کر رہا تھا۔ یہ سن کر کہ وہ اگر سمندر میں کود جاتا ہے تو وہ مکے پہنچ جائے گا، وہ گھوڑ سوار بلا تامل گھوڑے سمیت سمندر میں داخل ہو گیا تھا۔ سمندر میں موجود بزرگ نے اس گھوڑ سوار کو گھوڑے سمیت کندھوں پر اٹھا کر دونوں کو مکے پہنچا دیا تھا''۔

ایک اور کہانی میں مسجد حرام آپ کے پاس پہنچا دی جاتی ہے۔ یہ کہانی اس طرح سے بیان کی جاتی ہے:

''ایک بزرگ نے اپنے مریدوں کو ایک بار کہا کہ وہ اس کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر جائیں۔ دراصل وہ وہاں سے انہیں مکے کی مسجد حرام کی زیارت کرانا چاہتا تھا اور اس نے یہ زیارت کرائی تھی۔''

ابتدا میں یہ قصے کہانیاں اس لیے بھی بیان کیے جاتے تھے تاکہ ایک روحانی پیغام کو عام کیا جائے۔ بعد ازاں یہ مقامی لوک کہانیوں کا حصہ بن گئی تھیں۔ اب ان کہانیوں کو اولیائے کرام کی زندگی سے منسلک کر کے حقیقت کا روپ دے دیا گیا تھا۔

جدہ ایئرپورٹ: 21۔ جون: میں نے مراکش کو اپنے سفرِ حج کے آغاز کے لیے اس لیے چنا تھا کہ یہ میرا دیکھا بھالا علاقہ تھا۔ میں کئی برسوں سے یہاں آ رہا تھا اور اس کے مختلف علاقوں کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ میں یہاں کے لذیذ کھانوں کے ساتھ ساتھ قدیم موروں سے بھی واقف تھا۔ میں دکانوں پر جا کر یہاں کی مقامی زبان میں مول تول کیا کرتا تھا۔ میں نیند میں درہم گنا کرتا تھا۔ میں مراکش کے بڑے بڑے شہروں کے گلی کوچوں سے واقف تھا۔ میرے وہاں کچھ دوست بھی رہتے تھے۔

سعودی عرب میں، میں کسی سے واقف نہ تھا۔ میں کبھی بھی اس ملک میں نہیں گیا تھا۔ البتہ اب میں مناسکِ حج ادا کرنے جا رہا تھا جن کی پیچیدگیاں مجھے اکثر پریشان کر دیتی تھیں۔ میں ان میں کسی طرح بھی صحراؤں کی پیمائش اور لوگوں کا تجزیہ کر کے اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اس مقصد کے لیے یہ سفر بالکل نہیں کر رہا تھا۔ میں تو مکے صرف اس لیے جا رہا تھا کہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش تھی اور میں سعودی شہروں کے نمائندے کی حیثیت سے بالکل نہیں جا رہا تھا۔

ہوائی جہاز جونہی فضا میں اڑا، میں نے اپنے آپ کو تھوڑا سا سخت دل اور بے حس بنا لیا تھا۔ میرے آگے پیچھے وہ لوگ بیٹھے تھے جن کے ساتھ میں نے اگلا مہینہ مکے میں گزارنا تھا مگر اس کا ابھی مجھے علم نہ تھا۔ ہمارے عقب میں سورج بحیرۂ احمر کے کناروں پر ڈوب رہا تھا۔ ہر شخص خاموش تھا۔

ہم آٹھ بجے جدہ ایئر پورٹ پر اتر گئے تھے۔ ہمارے ساتھ جو عورتیں تھیں ان کے سروں پر سکارف تھے اور انہوں نے سفید چغے پہن رکھے تھے۔ ہر مرد احرام میں تھا۔ ایک چادر میں نے جسم کے نچلے حصے پر باندھ رکھی تھی۔ دوسری سے جسم کا اوپر والا حصہ اس طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ ایک کندھا ننگا تھا۔ حجاج کا یہ لباس صدیوں سے یہی چلا آ رہا تھا۔ جدہ ایئر پورٹ کے پس منظر میں ہم ان چرواہوں کی طرح نظر آتے تھے جو ابھی بھاپ کا غسل کر کے نمودار ہو رہے ہوں۔ سخت گرمی تھی، جہاز سے نکلتے ہی میں پسینے میں ڈوب گیا تھا۔

ہم ایک سٹیڈیم نما جگہ پر اکٹھے ہوئے جہاں حجاج کا ایک کافی بڑا ہجوم موجود تھا۔ اپنی وسعت کے لحاظ سے یہ دنیا کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے۔ اس سال چھ ہفتوں میں یہاں ایک ملین حجاج اترنے والے تھے، ہر پانچ منٹ بعد ایک جمبو جیٹ اتر رہا تھا۔ یوں ہر پانچ منٹ بعد چار ہزار فی گھنٹے کے حساب سے حجاج یہاں پہنچ رہے تھے۔ یہ دنیا کا واحد "سالانہ" ایئر پورٹ تھا۔ یہاں اترنے والے جہازوں کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک خاص سسٹم رائج تھا۔ موسم حج کے بعد چند ہفتے گزرنے پر پورا کمپلیکس اگلے سال تک بند کر دیا جاتا ہے۔

ہمارا گروپ چھوٹے بڑے حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ میں کسٹم کی کارروائی سے فارغ ہو کر تین درجن حجاج کے ساتھ ایک ہال میں جا ملا تھا۔ ہمارے آگے آگے ایک لبنانی اپنی خمدار چھڑی کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے اسے ہوائی جہاز کے اندر بھی دیکھا تھا جہاں اس نے مغربی سوٹ پہن رکھا تھا مگر یہاں اس نے سفید احرام باندھ لیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود عصا اس عصا سے مشابہت رکھتا تھا جس کی مدد سے بھیڑ بکریوں کو درختوں سے پتے گرا کر کھلائے جاتے ہیں۔ اس کا نام تھا محمد ماردینی اور عمر یہی کچھ تیس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ دوسروں کی نسبت زیادہ جانتا تھا کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔ ہم چلتے جا رہے تھے اور مجمع کے درمیان میری نظریں اسی پر تھیں۔ اگر ہم پیچھے رہ جاتے تو وہ ہمیں رہنمائی کے طور پر اشارہ کر دیتا تھا۔

حجاز میں داخلہ: رات چاند کے بغیر تھی، راستے میں بجلی کی روشنی تھی، جہاں کہیں یہ ختم ہو جاتی، میری نظر صحرا پر پڑتی تھی، کہیں کہیں پہاڑیوں پر جھاڑیاں اور گھاس کے میدان بھی دکھائی دیتے تھے۔ سڑک

گھوم پھر کر ایک میدانی علاقے میں داخل ہوگئی تھی اور پھر جلد ہی بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ ایک دوسری سے فاصلے پر پہاڑیاں چھوٹے چھوٹے جزیرے لگتی تھیں۔ کبھی کبھی راستے سے ذرا ہٹ کر اونٹوں کے ریوڑ نظر آتے جو چر رہے ہوتے تھے۔

ہم جوں جوں آگے بڑھتے جاتے تھے، حجاج نے تلبیہ پڑھنا شروع کر دیا تھا:

میرے اللہ میں تیری اطاعت کے لیے حاضر ہوں

میں حاضر ہوں اور تو بے مثال ہے، تیرا کوئی ہم رتبہ نہیں

میں حاضر ہوں!

ساری تعریفیں تیرے لیے ہیں، ساری رحمتیں تیری ہی ہیں، بادشاہت تیری ہی ہے

اے اللہ تو بے مثال ہے تیری برابری کوئی نہیں کر سکتا

کئی ہفتوں تک میں نے حجاج کو یہ الفاظ دہراتے سنا تھا۔ تلبیہ کے معانی ہیں: ''انتظار کرنا، تیار رہنا، کسی حکم یا کسی ہدایت کے لیے''۔ اس کا ایک کام تو یہ ہے کہ آپ اپنا ذہن صاف کر لیں اور اپنے آپ کو کسی بھی چیز کے لیے تیار کر لیں۔

احرام کا مجھ پر بھی بڑا گہرا اثر ہوا۔ اس نے میرے مہینوں کے انتظامات کو ختم کر دیا تھا۔ ایک طرح سے اس نے خود میری نفی کر دی تھی۔ ایک جیسا احرام طبقاتی تقسیم اور ثقافتی فیشن کو ختم کر دیتا ہے۔ امیر غریب سبھی اس یکساں حج کے لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ احرام میں وہی مساوات اور مومیت پائی جاتی ہے جو موت کے وقت اس کفن میں ہوتی ہے جس میں لپیٹ کر مردے کو دفن کیا جاتا ہے۔ یہ بات مجھے بعد میں سمجھ میں آئی تھی۔

مکہ مکرمہ بحیرۂ احمر سے پچاس میل مشرق میں ہے۔ یہ ایک جدید شہر ہے جس کی آبادی ایک ملین ہے۔ یہ سطح سمندر سے ایک ہزار فٹ اونچائی پر واقع ہے۔ اسے چاروں طرف سے ان پہاڑوں نے گھیرا ہوا ہے جن پر کسی قسم کا کوئی سبزہ نہیں اُگتا۔ ان پہاڑوں میں درے ہیں: ایک شمال کی جانب شام کی طرف کھلتا ہے۔ دوسرا جنوب میں یمن کی طرف اور ایک مغرب میں ساحل کی طرف چلا جاتا ہے۔ چوتھا وہ ہے جہاں سے ایک پر پیچ سڑک طائف کو جاتی ہے۔ دن کے وقت یہ پہاڑیاں آتش فشانی یک رنگی اختیار کر لیتی ہیں اور رات کو یہ آسمان کے رنگ میں رنگی جاتی ہیں اور نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

مکہ مکرمہ کے بارے میں پہلی جو چیز میرے علم میں آئی وہ یہ تھی کہ میں اس کی املا غلط لکھا کرتا تھا۔ میں نے رات کی روشنیوں میں تیر کے نشان کے ساتھ انگریزی میں لفظ مکہ لکھا دیکھا تو پتا چلا کہ اسے ''ایم ای سی سی اے'' نہیں بلکہ ''ایم اے کے کے اے ایچ'' کے ساتھ لکھا جانا چاہیے۔ انگریزی بولنے والے پھر بھی اس کا تلفظ اسی طرح ادا کرتے ہیں جس طرح اسے آج تک انگریزی میں لکھتے چلے آرہے ہیں جو غلط ہے بلکہ سراسر غلط ہے۔ پرانی انگریزی میں جس طرح مکہ لکھا جاتا رہا ہے اور اس کی موجودہ املا کے ساتھ اس کے نام میں لغوی اعتبار سے زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ ایک مقدس شہر ہے، یہ نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش ہے اور اسلام میں اسے ایک مقدس شہر کے طور پر ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے انگریزی ہجوں کا فیصلہ عربی دان کریں گے انگریزی دان نہیں کہ اس کی بنیاد اس لفظ کے لغوی معانی قرار پاتے ہیں۔ کفار کا اس شہر مقدس میں داخلہ ممنوع ہے۔ میں نے ایک جگہ اس شہر مقدس کی حدود شروع ہونے والے مقام سے کچھ پہلے یہ بورڈ لکھا ہوا دیکھا تھا:

''معائنے اور تلاشی کے لیے رُکیے۔ غیر مسلموں کے لیے داخلہ ممنوع ہے''۔

ہماری ویگن اس بورڈ کے قریب جا کر رُک گئی تھی۔ دو سپاہی آئے اور ویگن کے اندر ٹارچ کے ذریعے روشنی کر کے دیکھا۔ ہمارے پاسپورٹ، ویزوں کی پڑتال ہوئی۔ حجاج باتیں کر رہے تھے تاہم چند ایک گھبرائے ہوئے تھے۔

کچھ مغربیوں کا خیال ہے کہ مکہ غیر ملکیوں کے لیے ممنوعہ شہر ہے۔ مگر ایسا نہیں غیر ملکی تو اس شہر میں رہ رہے ہیں اور گذشتہ تیرہ سو برس میں بہت سے حجاج جو دوسرے ملکوں سے آئے تھے۔ حج کے بعد ہمیشہ کے لیے یہیں رہ گئے تھے اور پھر کبھی اپنے اپنے وطن واپس نہ لوٹے تھے۔ اسے اسی لیے ایک ایسا شہر سمجھا جاتا ہے جس میں دنیا بھر کے ممالک کے لوگ بستے ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ یہ مکمل طور پر ایک اسلامی ملک ہے۔ صرف یہاں ایک مسلمان کا ہی کوئی مقصد یا کاروبار ہو سکتا ہے۔

اس چوکی کے افسران ہمارے پاسپورٹ ایک ٹوکری میں رکھ کر لائے تھے۔ یوں ہم اس سے نکل کر اب آگے بڑھ رہے تھے۔ حجاز کا زیادہ علاقہ بنجر ہے۔ گاڑی کی سامنے والی بتیاں بے آب و گیاہ پہاڑیوں کو ہماری نظروں کے سامنے لے آتی تھیں۔ پہاڑیوں پر کہیں کوئی درخت نظر نہ آتا تھا اور انہیں دیکھ کر وادیٔ موت کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ خطِ فلکی اسٹیفن کرین کی ان سطور سے باہر نکلتا نظر آتا تھا:

ڈور افق پر،

پہاڑیوں کی چوٹیاں جمع ہوگئی تھیں

اور میں نے دیکھا کہ

پہاڑوں نے قدم بہ قدم مارچ کرنا شروع کردیا ہے

یہ پہاڑ چلتے بھی جاتے تھے، گاتے بھی جاتے تھے

''ہاں ہم آتے ہیں! ہم آتے ہیں''!

ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر سڑک مشرق کو مڑ گئی تھی اور اب سامنے ایک کھلا راستہ تھا۔ معدنی تارکول کسی ہوائی اڈے کی مانند روشن ہوگئی تھی۔ روشنی کے اخراج سے پہاڑیاں چمک اٹھی تھیں۔ ہماری ویگن ایک جگہ پہنچی جہاں چالیس ٹن وزنی قرآن پاک خمدار آڑھے ترچھے لوہے کے شہتیروں پر رکھا ہوا تھا۔ کسی نے مجھ سے پوچھا: ''تم نے دیکھا وہ کیا ہے؟'' اب ہم جہاں تھے وہاں سے مکہ مکرمہ ایک پیالے کی مانند چاروں طرف سے پہاڑوں کے درمیان گھرا کھڑا تھا۔

مکہ مکرمہ میں آمد: ہم اسی رات حجاج کے ہجوم کے ہمراہ ام القریٰ روڈ پر چڑھ رہے تھے۔ اونچائی پر پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ پانچ ہزار حجاج اوپر چڑھ رہے تھے۔ چوٹی پر پہنچ کر میں پنجوں کے بل کھڑا تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا یہاں سے نیچے کیا ہے جو وادی کے دامن میں چمک رہا تھا۔ یہ بیت اللہ تھا، دنیا میں بغیر چھت کا سب سے بڑا معبد۔

ہم جب اوپر چڑھ رہے تھے تو میں مارڈینی کے پیچھے تھا۔ ہمیں جلد ہی ایک سعودی گائیڈ شیخ ابراہیم سے متعارف کرایا گیا تھا جو ایک مقامی یونیورسٹی میں حدیث کے پروفیسر تھے۔ میں نے پوچھا کہ ہمارے نبیؐ نے مسجد حرام کے بارے میں کیا فرمایا ہے۔

ہمارے گروپ کے ساتھ جن چار گائیڈ کو مقرر کیا گیا تھا ان سب میں شیخ ابراہیم ایک شریف النفس اور سب سے کم سخن گائیڈ تھا۔ وہ خاموش رہا تو میں نے تھوڑا سا آگے جاکر اپنا سوال پھر دہرایا۔

اس نے کہا: ''یاد رکھنا کہ کعبہ ایک متبرک عمارت ضروری ہے لیکن یہ ان لوگوں سے زیادہ متبرک نہیں جو اس کے گرد چکر لگاتے ہیں'' اور پھر زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے انگلی سے زمین پر ایک دائرہ کھینچتے ہوئے کہا: ''یہاں تم جو کچھ بھی کرو کسی کی دل آزاری نہ کرنا، تم سے اتفاقاً بھی کسی کو کوئی تکلیف نہ

پہنچے۔اب ہم عمرہ ادا کرنے جارہے ہیں۔ہم خانہ کعبہ کے گرد طواف کریں گے۔صفاومروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سات بار چلیں گے،جس طرح حضرت حاجرہ چلی تھیں۔اس پر غور کرو جس طرح ایک حاجی کے لباس کی ریہرسل کرتے ہو۔نہ کسی کو پیچھے کھینچ کر اُس سے آگے بڑھو نہ کسی کو دھکا دو۔بس اطمینان اور صبر وتحمل کے ساتھ ساری مذہبی رسوم ادا کرتے جاؤ۔اگر کوئی تم سے الجھ پڑتا ہے تو اس کے راستے سے ہٹ جاؤ، درگزر سے کام لو۔اگر تم نے کسی کو نقصان پہنچایا تو تمہارا حج قبول نہیں ہوگا۔تم نے خواہ مخواہ اسے ادا کیا جبکہ تمہیں جو حاصل ہونا تھا اس سے محروم رہ گئے۔''

شیخ ابراہیم نے عمرے پر طویل لیکچر دے دیا تھا۔آئندہ چار ہفتوں میں اس نے اتنی لمبی بات کبھی نہ کی۔پہاڑی سے نظر آنے والا منظر اس قدر دلکش تھا کہ بحث کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ایک ایسا مینار نظر آ رہا تھا جو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

ایک مسجد درمیان سے بے چھت دکھائی دی۔یہ ایک وادی کے اندر یوں کھڑی تھی جیسے کسی پیالے میں رکھی ہوئی ہو۔اس کے اطراف میں سات مینار میخوں کی طرح ٹھونک دیئے گئے تھے۔اس کی تعمیر پر پتھر زیادہ استعمال ہوا تھا،اور رات کو یہ روشنیوں کے سیلاب میں نہائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

ابراہیم اسے حرم شریف کا نام دے رہا تھا۔یہ 160,000 مربع گز پر مبنی ہوئی تھی۔جب کبھی یہاں بہت زیادہ ہجوم ہوتا تو یہاں 1.2 ملین حجاج سما جاتے تھے۔دوسری منزل کی گیلریاں روشن تھیں۔پہاڑی کی چوٹی سے مینار تر چھے لگتے تھے۔میں اس عمارت کی بلندی کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔اس کی باہر کی دیواریں نیلگوں بھورے سنگ مرمر کی تھیں اور ہر پتھر کا رنگ مختلف عکس دے رہا تھا۔مینار دائرہ نور کے اندر دکھائی دیتے تھے۔ہر سمت وادی دمک رہی تھی۔

میں نے اس سے قبل اس قدر دل بہلانے والا خوبصورت معبد کبھی نہ دیکھا تھا۔میں نے زندگی میں خوبصورت اور بڑی بڑی عمارتیں تو بہت دیکھی تھیں لیکن وہ سب میرے ذہن سے اس وقت محو ہوگئیں جب میری نظر حرم پاک پر پڑی تھی۔کسی اچھی عمارت کو قابل دید بنانے والی ساری چیزیں اس ایک عمارت میں موجود تھیں۔

ہم سڑک کے ایک ایسے حصے میں تھے جو پہاڑی سے نیچے اتر کر ایک پُل کے نیچے سے گزرتا تھا۔ہم ایک جگہ سے مڑے تو عمارت نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔پہاڑی سے نیچے اترتے ہی گرم ہوا نے ہمارا

استقبال کیا۔ ٹریفک کا شور وغل پیچھے رہ گیا تھا۔ سال کے خاموش دنوں میں جہاں موٹر کاریں اور بسیں کھڑی کی جاتی تھیں ۔ آج رات وہاں حجاج نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ حجاج نے زمین پر بستر بچھا رکھے تھے۔ سڑک کے کنارے کھانا کے کچھ حجاج دائرہ بنائے لالٹین درمیان میں رکھ کر قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ زیادہ تر حجاج سو گئے تھے۔

اب ہم دوبارہ ایک ایسے مقام پر تھے جہاں سے مسجد حرام دوبارہ نظر آ رہی تھی۔ سڑک کے پار ہم ایک دروازے پر جا کر رُک گئے تھے۔ ابراہیم نے ہم سے خطاب کیا۔ جب یہ مکمل ہو گیا تو ہم مسجد کے اندر حجاج کے ہجوم کا حصہ بن گئے تھے۔

مسجد الحرام: مکہ مکرمہ پہنچنے والے زیادہ حجاج حرم شریف میں باب السلام سے داخل ہوتے ہیں۔ ابن بطوطہ اسی دروازے سے اندر گیا تھا۔ آج رات تو سیڑھیوں پر حجاج اس قدر زیادہ تھے کہ ہم یہ روایت قائم نہ رکھ سکے۔

ہم مسجد کے ایک اور دروازے کی طرف چلے گئے تھے جسے باب الملک کہتے ہیں۔ ہم نے اپنے سینڈل دروازے پر چھوڑ دیئے تھے اور اندر داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں اندر رکھا تھا۔ اندر پہنچ کر ہم دعائیں پڑھتے جا رہے تھے اور اللہ سے اس کی رحمت اور کرم کے طلبگار تھے۔ ہم نے بیشمار حجاج کو قالینوں پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ کچھ باتیں کر رہے تھے کچھ قرآنِ پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے۔ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔ پنکھے ہلکی رفتار کے ساتھ چل رہے تھے۔ تین لاکھ حجاج جمع تھے اور ہمیں باہر کے دروازے سے اندر تک پہنچنے میں پندرہ منٹ لگ گئے تھے۔

چار ایکڑ پر پھیلا ہوا فرش تھا۔ نہایت قدیم ستون دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہی ستون تھے جنہیں اپنی اپنی باری پر برکات، برٹن اور قطب الدین نے گنا تھا اور سب نے مختلف تعداد بتائی تھی۔

میں نے اس عمارت کے بارے میں پڑھ بھی رکھا تھا اور اسے مراکشی ٹی وی پر دیکھ بھی چکا تھا لیکن اس وقت اس کی پیمائش کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس میں جگہ کتنی تھی اور اس جگہ میں حجاج کی کتنی تعداد سمائی ہوئی تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ حجاج میں بربر، ہندوستانی، سوڈانی، یمنی، ملائشیائی، پاکستانی، نائیجیرین، انڈونیشی، بلوچی، بنگلہ دیشی، ترک، عراقی اور کرد شامل تھے۔ ایک پرسکون اور خاموش ہجوم تھا اور کہیں دھکم پیل نظر نہ آتی تھی۔ تعداد بڑھتی جا رہی تھی لیکن اس سے اس پرسکون ماحول میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ مکہ مکرمہ پہنچنے

کارش ختم ہو گیا تھا۔ حجاج پہنچ چکے تھے۔ اب اس سرزمین مقدس کے قوانین ان سب پر لاگو تھے۔ ایک امن و سلامتی کی فضا تھی جسے ہر کوئی محسوس کر رہا تھا۔

مجھے ایک 80 سالہ افغان نظر آیا، چھ فٹ قد، ہاتھ پھیلائے اپنے اللہ کے حضور گڑگڑا رہا تھا اور آنسو اُس کی ہتھیلیوں پر گر رہے تھے۔ میں نے اپنے اندر ایک ایسی فرحت و شگفتگی محسوس کی کہ اس دوران ستونوں کی گنتی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

طواف: ہم ڈھکی ہوئی بارہ دری سے گزر کر نیچے سنگ مرمر کے صحن میں اتر گئے تھے۔ یہ اس عمارت کا مرکز تھا۔

دنیا کی دیگر تمام مساجد کی چار اطراف ہیں۔ لیکن مسجد حرام کا درمیانی حصہ گول ہے اور بغیر چھت کے ہے۔ لمبائی میں اس کا سنگ مرمر کا فرش 560 فٹ اور چوڑائی میں 350 فٹ ہے۔ اس کے مرکز میں کعبہ کی عمارت ہے، یہ چار منزلہ شش پہلو عمارت چقماق کی بنی ہوئی ہے جس پر سیاہ غلاف چڑھا ہوا ہے۔ تھامس کارلائل نے اسے قدیم ترین ماضی کا ایک نہایت مستند ٹکڑا کہا ہے۔ اس کی سادگی اور سیاہ عکس اپنے اندر ایک متوازن آہنگ رکھتا ہے۔ آج رات ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جس سے غلاف کعبہ حرکت میں تھا۔ میں نے اپنے پاؤں کے نیچے آج سنگ مرمر کے فرش کو ٹھنڈا محسوس کیا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا تو ستارے جھلمل جھلمل کرتے نظر آئے تھے۔

ہم کعبہ سے پچاس ساٹھ گز دور تھے اور اس کے گرد باہر باہر سے چکر لگا رہے تھے۔ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی دیکھنے والا مبہوت ہو جاتا تھا۔ لوگ رو بھی رہے تھے اور دعائیں بھی مانگ رہے تھے۔ عورتیں ستونوں کے ساتھ جھکی ہوئی تھیں، وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو قیمتی موتیوں کی طرح بہہ رہے تھے۔ وہ خیریت سے پہنچنے پر اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں اور اپنی اپنی آرزوئیں، حسرتیں مالک حقیقی کے حضور میں پوری ہونے کے لیے پیش کر رہی تھیں۔ میں ان کے جذبات میں شریک تھا۔ ہم کعبے کے مشرقی کونے میں تھے جہاں حجر اسود ایک فریم میں مڑھا ہوا ہے۔ ہمارا چہرہ اس سیاہ پتھر کی طرف تھا اور ہم عرض کر رہے تھے:

اللہ! میں تیرے مقدس گھر کے گرد چکر لگانے کا ارادہ رکھتا ہوں

اسے میرے لیے آسان بنا دے

اور اس کے گرد میرے سات چکر منظور بھی فرما لے

ہر حاجی خانہ کعبہ کے گرد طواف کا آغاز حجر اسود کے پاس سے کرتا تھا اور گھڑی کی سوئیوں کے برعکس چکر لگاتا تھا۔ ہم جوں ہی خانہ کعبہ کے قریب پہنچے یہ ڈرامائی طور پر بڑا ہو گیا تھا۔ ہم اپنے احرام کو درست کرتے ہوئے حجر اسود کے بالمقابل پہنچ کر اسے سیلوٹ کرتے تھے۔ اس کے بعد ہم پھر چکر لگانے لگتے تھے۔

خانہ کعبہ کو اپنے بائیں ہاتھ رکھتے ہوئے ہم نے مڑنا شروع کر دیا تھا۔ ابراہیم اور مارڈینی آگے آ گئے تھے اور وہ جو کچھ پڑھتے جاتے ہم وہی الفاظ ان کے پیچھے پیچھے دہراتے جاتے تھے۔ ہم کبھی کبھی ایسے حجاج کے پاس سے بھی گزرتے جن کے ہاتھوں میں دعاؤں کے مطبوعہ کتابچے ہوتے تھے جن کو وہ پڑھتے جاتے تھے۔ تاہم زیادہ لوگ وہ تھے جو منہ زبانی دل کی باتیں اپنے رحیم و کریم خالق تک پہنچانے میں مصروف تھے۔ کچھ کا تو انداز بھی گفتگو اور بات چیت کا سا ہوتا تھا۔ میں نے مارڈینی کو روک کر پوچھا کہ دونوں میں سے کون سا طریقہ زیادہ موزوں تھا۔ اس نے چلا کر کہا: ''ایک خدا ہے اور بہت سی زبانیں! جو تم چاہتے ہو کہو یا جو تم سنتے ہو اس کو دہراؤ یا صرف اتنا کہتے چلو ... اللہ اکبر... میں نے تینوں طریقے آزمانے شروع کر دیئے تھے۔

طواف کے دوران پہلے تین چکروں میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہیں جسے ''رمل'' کہتے ہیں یا ''کندھوں کو اس طرح حرکت دینی ہوتی ہے جسے طرح ریت میں چلتے وقت دی جاتی ہے''۔ رچرڈ برٹن نے اسے جمناسٹک میں قدم اٹھانے کے مشابہ قرار دیا تھا مگر میں نے یہ کبھی بھی نہ سوچا تھا کہ حج اس قدر اتھلیٹک بھی ہو سکتا ہے۔ ہر چکر کے بعد طواف کرنے والا حجر اسود کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ میں یہاں پہنچ کر ہاتھ بلند کر لیتا اور کہتا ''اللہ اکبر!'' میں نے معمر، کمزور اور بیمار حجاج کو دوسروں کے کندھوں پر سوار بھی طواف کرتے دیکھا تھا اور پلنگ نما ڈولیوں میں بھی جنہیں عموماً کسی مرد نے اٹھا رکھا ہوتا تھا۔ خانہ کعبہ کی چھت میں ایک پرنالہ تھا، جہاں یہ دعا درج تھی:

قیامت کے اُس روز

جب سایہ صرف تیرا ہو گا

اے میرے مالک! مجھے اپنے سایے میں لے لینا

اور مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوض کوثر سے

اپنی پیاس ہمیشہ کے لیے بجھانے کا موقعہ فراہم کر دینا

ہم نے کعبے کے نزدیک تیز تیز قدموں کے ساتھ چکر لگائے۔ جب یہ پورے ہو گئے تو ماروینی نے آہستہ آہستہ خانہ کعبہ سے فاصلے پر جانا شروع کر دیا تھا اور ہم اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ میں بھی ایسا ہی کرتے ہوئے باہر کے دائرے کے کنارے پر آ گیا تھا جہاں ہم نے بقیہ چار چکر آرام آرام سے چلتے ہوئے لگائے اور یوں سات چکر مکمل کر لیے تھے۔

غلاف کعبہ سیاہ ریشمی کپڑے کا تھا، اسے کسوئی کہتے ہیں۔ مجھے بعد ازاں کسی نے بتایا تھا کہ غلاف کعبہ کو اس عمارت کا احرام بھی کہتے ہیں۔

چاہ زم زم: طواف کرتے وقت ضروری تھا کہ اس کا ادراک کر کے اسے ادا کیا جائے۔ اس کا بلا دنگاری سے متعلق پیغام، جبکہ اللہ کا گھر مرکز میں تھا، مجھ پر آخری چکروں کے دوران واضح ہوا تھا۔ کندھے سے کندھا ملائے حجاج کے قلب آخر میں کھل جاتے ہیں اور ان کا نقطۂ نظر تبدیل ہو جاتا ہے۔

آخری چکر ہمیں واپس مشرقی کونے میں لے آیا تھا۔ ہم نے پاس سے گزرتے وقت حجر اسود کو سیلوٹ کیا اور پھر مقام ابراہیم پر آ گئے تھے۔ یہاں ایک خاص عزت وسرفرازی کے ساتھ نوافل ادا کیے جاتے ہیں...... ہم نے بھی کعبے کی طرف منہ کر کے دو رکعتیں ادا کی تھیں۔

اب ہماری طواف کی مذہبی رسم ادا ہو چکی تھی مگر ابھی شام باقی تھی۔ اس کے بعد ہم کچھ سیڑھیاں اتر کر چاہ زم زم پر پہنچ گئے تھے جو ایک غاردار کمرے میں تھا۔ جونہی ہم نیچے پہنچے رات کی گرمی میں کمی آ گئی تھی۔

ابن بطوطہ جب یہاں آیا تھا اس زمانے میں چاہ زم زم سطح زمین پر تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں نہیں اترنی پڑتی تھیں۔ اب ایک نشیبی کمرے میں ہے۔ جن چمڑے کی بالٹیوں سے پانی کنویں سے نکالا جاتا تھا سب غائب ہو گئی ہیں اور وہ نفع خور جو بھاری فیس وصول کرتے تھے ان کا وجود بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ کنویں کو ایک جگہ اور زیر زمین منتقل کر دیا گیا ہے۔

جس پہلی رات میں چاہ زم زم پر گیا تھا اس رات وہاں ہوا میں نمی تھی۔ حجاج صرف آب زم زم پینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اسی پانی کو اپنے جسموں پر بھی ڈال لیتے ہیں۔ چاہ زم زم کا کمرہ کیا تھا ایک غسل خانہ تھا۔ سارا فرش گیلا ہو گیا تھا جو جگہ خشک رہ گئی تھی وہاں اکا دکا سلیپروں کا جوڑا رکھا ہوا تھا۔

اگر یہ کنواں نہ ہوتا تو مکہ مکرمہ کا وجود نہ ہوتا۔ خشک اور بنجر حجاز میں اس کنویں کا نکل آنا بڑی حیرت کی بات تھی۔ صحرا کی شہری زندگی کا سارا انحصار پانی پر ہوتا ہے۔ ہزاروں برس گزر گئے مگر آج تک یہ کنواں

پورے شہر کو پانی مہیا کر رہا ہے۔اس کنویں کو دیکھ کر میری سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کو عبادات اور نماز سے کیوں منسلک کر دیا تھا اور نماز سے قبل وضو کے ذریعے جسم کے مختلف حصوں کو پاک وصاف کرنے کی پابندی لگا دی تھی۔ زمانہ قبل از اسلام میں بھی یہ کنواں ایک مقدس رسم کا حصہ تھا۔ آج حجاج اس قدیم روایت کی پیروی میں اس کنویں کا پانی پیتے ہیں۔اس پانی میں چونکہ معدنیات شامل ہیں اس لیے یہ بھاری ہے مگر مجھے آب زم زم کا ذائقہ میٹھا لگا تھا نمکین نہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ یہ بہت ٹھنڈا تھا، اس لیے کہ تہ خانے میں اسے ٹھنڈا کرنے کے ایک عمل سے گزارا جاتا ہے۔

سعی: آج رات کی ہماری آخری مذہبی رسم سعی تھی جس کے لیے ہمیں صفا و مروئی پر جانا تھا۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں خانہ کعبہ کے فرش پر سے گزرنا تھا۔ہم نے حجر اسود کو سیلوٹ کیا، پھر صحن کو عبور کر کے ہم جنوب کی سمت صفا و مروئی پر پہنچ گئے تھے۔صفا و مروئی کے درمیان دوڑنا سعی کہلاتا ہے۔ دونوں پہاڑیوں کے درمیان فاصلہ ایک چوتھائی میل تھا۔آنے اور جانے والے حجاج کے لیے دو راستے بنا دیے گئے ہیں۔

سعی کا آغاز صفا کی پہاڑی کی چوٹی سے ہوتا ہے اور یہ ختم ہوتی ہے دوسری پہاڑی مروئی پر جا کر جو اس عمارت کے شمال میں ہے۔میں نے اس سے قبل کسی عمارت کے اندر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں کبھی نہ دیکھی تھیں۔ان کی چھتوں پر گنبد بنا دیئے گئے ہیں۔ یہاں بھی طواف کعبہ کی طرح بوڑھوں اور بیماروں کے لیے رعایت رکھی گئی تھی۔کرائے کی پہیوں والی کرسیوں پر ایسے حجاج سعی کر سکتے تھے۔

سات بار دونوں پہاڑیوں کے درمیان آنا جانا ہوتا ہے جو تقریباً دو میل بن جاتے ہیں۔تیسرے ہی چکر میں میری ٹانگیں تھک گئی تھیں۔طواف اور سعی میں فرق یہ تھا کہ یہاں طواف جیسا رش نہیں تھا۔دو مقررہ مقامات کے درمیان سات بار آنا جانا ہوتا ہے جس میں ثابت قدمی درکار ہوتی ہے۔سعی میں طواف کی طرح چکر نہیں لگائے جاتے۔

سعی سے فارغ ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے احرام میلے ہو چکے تھے۔ہم ایک دوسرے سے مصافحہ کر رہے تھے کہ چند حجام آ گئے اور اپنی خدمات پیش کیں۔اب ہمیں بال ترشوانا تھے۔اس کام سے بھی فارغ ہو گئے تو ہم باب الملک کی طرف گئے تاکہ اپنے اپنے سینڈل لے لیں۔

گائیڈز: ہوٹل واپس جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ہمارے گروپ کے دو تین حجاج ابراہیم کو کچھ رقم دے رہے ہیں۔وہ بار بار انکار کر رہا تھا کہ وہ یہ رقم نہیں لے گا۔

میں نے یہاں گائیڈز کے بارے میں جو سنا تھا یہ منظر تو اس کے بالکل برعکس تصویر پیش کر رہا تھا۔ مجھے مراکش میں خبردار کیا گیا تھا کہ میں مکے میں ان لوگوں سے بچ کر رہوں۔ یہ طاعون کی مانند پیچھے پڑ جاتے ہیں۔سفرحج کے بارے میں جن لوگوں نے بھی لکھا کسی نے بھی ان کو اچھے نام سے یاد نہیں کیا۔سنا یہ تھا کہ گائیڈ حجاج سے مختلف حیلوں بہانوں سے زیادہ سے زیادہ رقوم حاصل کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔حجاج بیچارے تھک کر چُور ہو جاتے ہیں،کبھی کبھی انہیں ہیضہ پریشان کر دیتا ہے۔کبھی چور پڑ جاتے ہیں اور رہی سہی کسر مطوف پوری کر دیتے ہیں۔ایلڈن رٹر نے 1925ء میں حج کیا تھا وہ لکھتا ہے کہ یہ لوگ بخشیش وصول کرنے کے حیلے بہانے ایجاد کرنا خوب جانتے ہیں۔احمد کمال نے 1961ء میں لکھا:

> ''حجاج کے تمام گائیڈز کا تعلق مکہ میں ان کی ایک تنظیم سے ہے۔ہر تنظیم ایک خاص قوم یا علاقے کے حجاج کے لیے بطور گائیڈز ایسے افراد کو بھیجتی ہے جو ان کی زبانیں بول سکتے ہوں اور جن کی روایات اور دوسری باتوں سے یہ واقف ہوں۔یہ علم ایک دو دھار والا بلیڈ ثابت ہوتا ہے۔یہ خون بھی بہاتا ہے اور ان کی حفاظت بھی کرتا ہے۔حالانکہ یہ گائیڈز خانہ کعبہ کے قریب رہتے ہیں لیکن اس قربت نے انہیں فرشتے نہیں بنایا۔''

میں نے ماردینی سے پوچھا کہ وہ اس بارے میں کیا کہتا ہے۔اس نے کہا کہ گائیڈ نہایت ضرر رساں ہوتے ہیں۔مگر ماضی میں حجاج کو ان کی ضرورت ہوتی تھی اور آج ان کی سرگرمیاں مقرر کر دی گئی ہیں۔ البتہ کچھ ان میں سے آج بھی حریص ہوتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر اپنی خدمات ایمانداری کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں۔پرانے زمانے میں یہ کام بہت کرتے تھے لیکن روزی کمانے کا ان کا دورانیہ مختصر ہوتا تھا۔ جہاں تک ابراہیم اور اس کے ان شیوخ کا تعلق ہے جو گائیڈز کے طور پر کام کرتے ہیں یہ مختلف ہیں۔یہ دن میں باقاعدہ ملازمتوں پر بھی ہیں اور انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔یہ جامعات میں پروفیسر ہیں اور ان دنوں چھٹیوں میں یہ کام جزوقتی طور پر کرتے ہیں۔ان میں سے کچھ اسلامی امور کے محکمے سے وابستہ ہیں اور سرکاری مہمان افسروں اور وفود کے لیے گائیڈز کے طور پر بھی خدمات سرانجام دیتے ہیں......

ماردینی کی بات سن کر گائیڈز کے بارے میں میری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا یہ نہ ہوتے تو ہمارے گروپ کا کیا بنتا۔ ہم بس سے اتر کر مذہبی رسوم کی ادائیگی میں لگ گئے تھے۔ یہ سب حجاج کے لیے یکساں تھیں۔ آپ کا مقام و مرتبہ کچھ بھی ہو، آپ تھکے ہوئے مکے پہنچے ہوں مگر آپ کو یہ رسوم پہلی رات کو ہی ادا کرنی ہوتی ہیں۔ لگتا تھا یہ ایک اچھے گائیڈ کے بغیر ممکن نہ تھا۔ یہ کوئی روم اور تاج محل آگرہ کا معاملہ نہ تھا کہ کوئی صناعی کا نمونہ آپ نہ دیکھ سکے تو کوئی فرق نہ پڑے گا۔ یہاں تو ایک مذہبی رسم بھی ادا ہونے سے رہ جائے تو آپ کا حج خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ حجاج کی اکثریت زندگی میں ایک ہی بار یہ فریضہ ادا کرتی ہے۔ ان کے پاس نہ تو وسائل ہوتے ہیں نہ موقعہ کہ وہ اگلے سال دوبارہ آ جائیں۔ ہر ایک کی ضرورت یہ تھی کہ حج پہلی ہی بار صحیح صحیح ادا ہو جائے تا کہ اس کی قبولیت کی توقع رہے۔

22۔ جون: میں نے اب تک عمرے کی ساری رسوم ادا کر لی تھیں۔ پہاڑی سے نیچے آ کر میں مسجد کے ''ڈی'' شکل میں ہونے پر غور کر رہا تھا۔ بات سمجھ میں یہ آئی کہ یہ ڈیزائن ہی مناسب تھا کیونکہ حجاج کے لیے دو جگہیں مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے بنانی مقصود تھیں، یعنی صفا و مروہ میں سعی اور خانہ کعبہ کا طواف۔ یہ دونوں مقامات زمانہ قدیم سے اسی طرح الگ الگ چلے آ رہے ہیں۔ مسجد کی بنیاد رکھتے وقت تکوین نگاری کی منطق کو سامنے رکھا گیا تھا۔

میں اس کے توسیع شدہ حصوں کو دیکھ کر تعریف کر رہا تھا۔ 1939ء میں ایک لاکھ حجاج مکے آئے تھے اور آج اتنی تعداد میں حجاج ہر روز یہاں پہنچتے ہیں۔ انہیں جگہ مہیا کرنے کے لیے مسجد کے کمپلیکس کو ہر سمت میں وسیع کر دیا گیا ہے اور اس توسیع میں بہت سی چٹانوں کو اپنی جگہ سے ہٹانا پڑا ہو گا۔

نصف شب کے حجاج: جون میں حج کے دوران لُو لگ جانے کے خدشات زیادہ بڑھ جاتے تھے۔ سعودی حکومت نے میزبان کے طور پر 150 طبی مراکز قائم کر دیئے تھے تا کہ علاج کی سہولیات فراہم ہو سکیں۔ شہر کے سینکڑوں کلینک ایسے تھے جن میں ہلال اخضر (آج کل ہلال احمر) کی نرسیں کام کرتی تھیں۔ ٹی وی پر ہر شام حفاظتی تدابیر کے بارے میں بتایا جاتا تھا اور دو ورقی اشتہارات گلی کوچوں میں تقسیم کیے جاتے تھے۔ انہیں سب سے بڑا اور اہم مشورہ یہ دیا جاتا تھا کہ دھوپ میں نہ نکلیں۔ حجاج دن بھر سڑکوں پر رہتے تھے اور ان کے گائیڈ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔

ہماری سب سے بڑی دشمن گرمی تھی۔ بالآخر میں نے گرمی سے بچنے کے لیے اپنی تمام سرگرمیوں کے اوقات بدل دیئے تھے۔ میں صبح اور دوپہر کے درمیان تین گھنٹے سو جاتا تھا۔ پھر ظہر اور عصر کے درمیان دوسری بار آرام کرتا تھا۔ میں اپنے مقررہ اوقات کی پابندی کر رہا تھا اور حرم میں شام کو جاتا تھا۔ یوں میرا شام سے صبح تک کا قیام مسجد حرام میں گزرتا تھا۔

ماردینی نے تو مجھے ''نصف شب کا حاجی'' کہنا شروع کر دیا تھا۔ ہر موسم گرما میں مکہ، یانبو اور جدہ کو زمین پر دنیا کے گرم ترین مقامات بتایا جاتا تھا۔ میں جب 20 برس کا تھا تو میں نے دو سال مغربی افریقا میں گزارے تھے۔ میرا خیال تھا یہاں کی گرمی کا مجھ پر اثر نہیں ہوگا لیکن مکے میں تو چند روز کے بعد ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ سرزمین حجاز کی گرمی نے سعد الدین محمود شبستری کے اس شعر کو نئے معانی پہنا دیئے تھے جس کا مفہوم یہ ہے:

اگر سب سے چھوٹے ایٹم کو توڑا جائے تو اس کے مرکز میں سے سُورج برآمد ہوگا۔

ایئر کنڈیشنڈ لابی سے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولتے ہی یہ احساس ہوتا تھا جیسے جلتے ہوئے انگریزی چولھے (سٹوو) کی جانب دروازہ کھل گیا ہے۔

شام کے وقت مسجد حرام حیرت انگیز حد تک ٹھنڈی ہوتی تھی۔ فرش کے نیچے سے ٹھنڈے پانی کے پائپ گزرتے تھے اور کچھ محرابی راستے ایئر کنڈیشنڈ تھے۔ میں وہاں اکثر صبح تک رہتا تھا۔ میرے ساتھ ایک جائے نماز اور قرآن پاک کا ایک نسخہ ہوتا تھا۔ مجھے ان اوقات میں یہاں بڑا سکون ملتا تھا۔ ہر ہال میں پانی کے ٹینک تھے، فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے اور رات کو بھی باہر گلیوں میں کھانے پینے کی اشیاء مل جاتی تھیں۔ میں نے اپنے جوتے رکھنے کے لیے ایک پلاسٹک کا تھیلا ساتھ رکھ لیا تھا۔ حرم شریف میں داخلے کے لیے 64 دروازے ہیں اور ایک بار اندر داخل ہونے کے بعد میں پوری مسجد میں گھوما کرتا تھا۔ جوتے اگر باہر اتار دیئے جاتے تو پھر واپسی پر جوتوں کے انبار میں سے اپنے جوتے تلاش کرنا ایک مسئلہ بن جاتا تھا، وہ بھی اس وقت جب ایک ہی جیسے جوتے بہت سے ہوتے تھے۔ اپنے جوتے پلاسٹک کے تھیلے میں رکھنے کے بعد میں جب چاہتا اندر باہر آ جا سکتا تھا۔ یوں مجھے تسلی ہوتی تھی کہ میں جو جوتا پہن کر آیا تھا اسی میں واپس جا رہا ہوں۔

ہر رات مجمع مختلف ہوتا تھا، مُوڈ مختلف ہوتا تھا۔ مسجد کے اندر آپ مختلف مناظر دیکھ سکتے تھے جس کا انحصار وقت اور بلندی پر ہوتا تھا۔ مغرب اور عشاء کی نمازوں کے درمیان 90 منٹوں کا وقفہ ہوتا تھا۔ میں ان

اوقات میں کوشش کرتا تھا کہ چھت پر چلا جاؤں جہاں حجاج کا ہجوم نچلے حصے کی نسبت کم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اکثر چھت پر ٹھنڈی ہوا بھی لگتی تھی۔

میں صبح کے وقت گلیوں میں نکل جاتا تھا جہاں حجاج کا رش اس وقت کم ہوتا تھا اور سورج کی تمازت نہیں ہوتی تھی۔ باب العمرہ کی طرف سے جو راستہ گلی میں نکلتا تھا وہاں لوگوں نے میزوں پر کافی تیار کر کے رکھی ہوتی تھی اور چھوٹے بازار بھی کاروبار کے لیے آہستہ آہستہ کھلنے لگتے تھے۔ ان کے اوپر جو دفاتر تھے ان پر انگریزی میں بورڈ آویزاں ہوتے تھے۔ میں نے ایک جگہ یہ بورڈ دیکھا تھا:

آزمائشی ادارہ

غیر اسلامی ممالک کے حجاج کے لیے

نمبر 7

صرف ریال وصول کیے جاتے ہیں

قربانی کے جانوروں کے لیے کوپن یہاں سے حاصل کریں

یہ ایک تحائف کی دکان تھی جہاں حکومت کی طرف سے مقرر کوپن دینے والا حجاج کے ہاتھ قربانی کے جانور بیچتا تھا۔

قسم قسم کے عطریات کی خوبصورت شیشیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ احرام، دوائیں اور اسی قسم کی چیزیں بیچنے والے پھیری والے بھی موجود تھے اور کتب فروشوں کی دُکانیں بھی تھیں۔ میری پسندیدہ بک شاپ میں لکڑی کی الماریاں تھیں اور اس کی چھت 17 فٹ اونچی تھی۔ اس دکان پر اسلامی کلاسیکی ادب بکتا تھا جو بیروت اور ریاض سے چھپ کر آتا تھا۔ اس پر پوسٹر بھی فروخت ہوتے تھے، لکھنے کا سامان بھی ملتا تھا اور پوسٹ کارڈ بھی دستیاب تھے۔

ایک روز مجھے اس گلی میں ایک درجن تاجک حجاج نظر آئے وہ اس کتابوں کی دُکان میں داخل ہو رہے تھے۔ گذشتہ 70 برسوں میں یہ روس سے الگ ہونے والی اس ریاست کے پہلے حجاج تھے۔ ان کے سروں پر بھورے اونی ٹوپ تھے، انہوں نے کریم رنگ کے چغے پہن رکھے جن پر کمر بند تھے۔ وہ اندر داخل ہوئے اور ایک ترجمان چن کر بات چیت کا آغاز کیا۔ وہ ترجمان کاؤنٹر پر چلا گیا تھا۔ یہ اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھ کر یہ اندازہ لگانا چاہتے تھے کہ وہ عربی میں روانی سے بات کر سکتا ہے یا نہیں۔ انہیں عطریات نہیں

بلکہ کتابیں چاہئیں تھیں۔

روس میں قرآن پاک ایک طویل عرصے سے ممنوع تھا اور تاشقند میں اس کا ہدیہ ایک سو ڈالر تھا جبکہ یہاں یہ صرف پانچ ڈالر کا تھا۔ ان تاجکوں نے 12 نسخے خریدے اور دُکان سے چلے گئے تھے۔

خانہ کعبہ کا طواف رات دن جاری رہتا تھا۔ کسی بھی وقت طواف کے لیے مخصوص حصہ حجاج سے بھر جاتا تھا۔ میں ہر شام پانچ بجے مسجد حرام چلا جاتا تھا اور نو دس بجے تک وہاں رہتا پھر نصف شب کو واپس آ جاتا تھا۔ ٹرانسپورٹ کی اس وقت کوئی پرواہ نہیں کرتا تھا بلکہ پیدل چلنے والے حاجیوں کے گروہ وقفے وقفے سے ہوٹل کے قریب سے گزرتے رہتے تھے۔

میں بہت دفعہ حجاج کے ہجوم کے درمیان رہا، میں نے ہر بار یہی دیکھا کہ حجاج یوں چل رہے ہیں جیسے یہ ابھی ابھی مکے پہنچے ہیں۔ ان معنوں میں حرم ایک طواف گاہ تھا۔ دن بدن ہماری رفتار میں ایک تمکنت اور وقار پیدا ہو رہا تھا۔ یہ اس شہر کا ذکر ہے جس میں تین ملین حجاج جمع تھے۔ روشنیوں کا شہر، سڑکوں کے جال والا شہر جس میں ٹریفک کے ہارن سنائی دے رہے تھے اور اذان کی آواز گونج رہی تھی۔ جدید مکہ ہمارے گرد گھوم رہا تھا مگر رفتار پسپائی والی تھی۔ شہر بہت بڑا لگتا تھا۔ برکات لکھتا ہے: ''میں نے مشرقی دنیا میں جتنے سفر بھی کیے ان میں سے جو سکون مجھے مکہ میں ملا وہ اور کہیں نہ ملا تھا''۔ وہ دراصل اس طمانیت کا ذکر کر رہا تھا جو حج کے دوران مکے میں حاصل ہوتی ہے۔

حجاج کے گروپ مکے پہنچتے ہی یہاں کے ماحول سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ ہم سوئے بھی، ہم نے کھانا بھی کھایا، ہم نے نماز بھی ادا کی، ہم احرام میں ملبوس مکے کی گلیوں میں بھی گھومے پھرے اور ہم نے مذہبی رسوم بھی ادا کی تھیں۔ جس طرح جدہ کے ہوائی اڈے پر جہاز چکر لگاتے ہیں اسی طرح ہم نے شہر کے چکر کاٹے۔ ہم بخیر و عافیت مکے پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب ہم انتظار میں تھے۔

ہر روز ایئرپورٹ سے ہزاروں حجاج آ رہے تھے۔ اب عمرے کی رسوم ادا کرنے میں حجاج کو زیادہ وقت لگ رہا تھا۔

مسجد الحرام کے 64 دروازوں میں سے چند ایک ایسے ہیں جو زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ میں ایک شام اس بارے میں پوچھتا رہا اور باب النبی کی طرف چلا گیا تھا۔ عمارت کے عقب میں جانے کے لیے راستہ لمبا تھا لیکن ایک بار آپ اندر داخل ہو جائیں تو پھر صفا کے آخری نچلے حصے سے گزر کر مسجد کے صحن میں پہنچنا

آسان ہو جاتا ہے۔ یہ دروازہ چونکہ آنحضورؐ کو اپنے گھر سے قریب پڑتا تھا اس لیے آپؐ زیادہ تر یہی دروازہ استعمال کرتے تھے۔ چند بلیاں اکثر اس دروازے کے قریب گھومتی پھرتی نظر آتی تھیں۔

آپ خواہ کسی بھی دروازے سے داخل ہوں آپ بالآخر خانہ کعبہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ حجاج کی تعداد زیادہ ہونے کے باوجود مجھے مسجد کے عقب میں بیٹھنے کے لیے جگہ مل ہی جاتی تھی۔ کوئی ستون وہاں ضرور ہوتا تھا جس سے میں ٹیک لگا لیا کرتا تھا۔ یہ جگہ پرسکون تو ہوتی تھی مگر یہاں سے خانہ کعبہ نظر نہیں آتا تھا۔

کبھی کبھی مجھے خانہ کعبہ کے قریب پہنچ کر بیٹھنے کی جگہ بھی مل جاتی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جو مجھے پسند تھی اور میری کوشش رہتی تھی کہ میں یہیں پہنچ کر بیٹھوں۔ کعبہ بالکل میری نظروں کے سامنے ہوتا تھا۔ میں سنگ مرمر کے فرش پر اس کا ہلکا سا عکس بھی دیکھ سکتا تھا۔ بعض اوقات تو یہاں مکمل خاموشی ہوتی تھی اور مسجد حرام ایک موسم گرما کے محل میں بدل جاتی تھی، جو زمانہ قدیم میں جنت کے کسی محل کی مانند تعمیر کرایا جاتا تھا جہاں شعراء اور مفکرین اپنی شامیں گزارتے تھے۔

حجاج کے گروپ یہاں آ کر بیٹھ جاتے اور پانی پیتے تھے۔ ایک روز میں نے اپنے پیچھے پیچھے آتے ہوئے چند پاکستانی دیکھے، تین چار مرد اپنی بیویوں کے ساتھ تھے جن کے بیٹے بیٹیاں بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ مردوں نے پہن تو شلوار قمیض رکھی تھی مگر جب میں نے ان کی گفتگو سنی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ برٹش انگریزی ہے۔ ان کے بچوں کا انگریزی بول چال کا لب ولہجہ بریڈفورڈ کے لہجے سے ملتا جلتا تھا مگر میرا اندازہ غلط نکلا تھا کیونکہ وہ تو لاہور (پنجاب کا دارالخلافہ) کے تھے۔

ایک رات اور مجھے وہیں جگہ مل گئی تھی جہاں مجھے اٹلانٹا سے آیا ہوا ایک نو بیاہتا جوڑا ملا۔ خاتون کا تعلق ترکی سے تھا۔ نوجوان کی عمر صرف بیس سال تھی جو کسی بیمہ کمپنی میں ملازم تھا۔ دونوں کی پرورش جنوبی دنیا میں ہوئی تھی جہاں وہ دونوں زیرِ تعلیم رہے تھے۔ میں نے اس نوجوان کو دیکھا کہ آب زم زم کا ایک پیالہ اپنی بیوی کو پیش کر رہا تھا۔

یہ حرم پاک حاضری دینے والے جوڑے ہوتے ہیں جو اپنے ہنی مون کے لیے مکے کے سفر کا انتخاب کرتے ہیں۔ میں کبھی کبھی انہیں ساتھ ساتھ حرم پاک میں دیکھا کرتا تھا۔ جہاں وہ شرما کر رہتے تھے اور اس مقدس جگہ کا پورا پورا احترام ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ مسجد الحرام سے باہر شہر کی گلیوں میں سے گزرتے وقت وہ کبھی کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے تھے۔ مارد یلی کا خیال تھا کہ اگر کوئی خاندان استطاعت رکھتا ہو تو شادی

کے بعد حج کی ادائیگی سے شادی کا یہ بندھن مزید مضبوط ہو جاتا تھا اور ایسا بچوں کی پیدائش سے پہلے کرنا ضروری تھا۔

ان دونوں کا تعلق جارجیا سے تھا اور وہ اپنی گفتگو سے پہچانے جاتے تھے۔ میں نے جب ان سے پوچھا کہ کیا وہ عربی بول سکتے ہیں تو مرد تو سہم سا گیا تھا مگر لڑکی نے جواب دیا: ''ہم ترکی بول سکتے ہیں مگر ہم نماز انگریزی میں پڑھتے ہیں''۔

ہم جب بس میں سوار ہوئے اس وقت آسمان سرخ ہو رہا تھا۔ ہمیں یہاں ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اب ہم صحرا کی طرف روانہ ہونے والے تھے۔ ہماری بس ٹریفک کے درمیان سے بمشکل راستہ بناتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اب مسجد حرام ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ کبھی کبھی تو پیدل چلنے والے ہم سے آگے نکل جاتے تھے۔ کہیں کہیں رک کر ہم نے یہ سفر جاری رکھا جس میں ہماری بس کی رفتار 15 میل فی گھنٹہ رہی۔

ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ جب تک حجاج پہیوں والی سواری میں سفر نہیں کرتے تھے انہیں مکے پہنچنے میں کتنی مشکلات پیش آتی ہوں گی۔ سانپ کی طرح بل کھاتی ٹریفک پہاڑیوں پر چڑھ رہی تھی۔ کہیں کہیں پیدل چلنے والے ہجوم میں سے کوئی حاجی کسی گاڑی کے بمپر سے ٹکرا جاتا تھا۔ گاڑیاں جدید سڑکوں پر رواں دواں تھیں، کہیں کہیں وہ صحرا میں سے مختصر اور کم فاصلے والا راستہ بھی اختیار کر لیتی تھیں۔ صرف پچاس برس کے اندر اندر ایک ازمنۂ وسطیٰ کا شہر جدید ٹرانسپورٹ کے ذریعے بالکل بدل گیا تھا۔

میں سوچتا تھا جب کاریں نہیں رہیں گی تو ان کی جگہ حضرتِ انسان نے کون سی سواری ایجاد کر لی ہوگی۔ چیزوں کو نئے سرے سے تربیت دینا واقعی مشکل ہوگا۔ شہر کو از سر نو تعمیر کیا گیا تھا جس میں ربڑ کی پہیوں والی ٹرانسپورٹ نے سڑکوں پر دوڑنا تھا۔ سرنگیں بنائی گئی تھیں۔ سڑکیں چوڑی ہو گئیں اور ہمیں 1930ء کی دہائی کی صورت حال سے بالکل نکال لیا گیا تھا جب سفر حج اونٹ پر سوار ہو کر طے کیا جاتا تھا۔ ہیری سینٹ جان فلبی نے منیٰ قافلے کے بارے میں لکھا تھا: ''ان کی تعداد پچاس ہزار ضرور ہوگی اور سب کے سب عرب کی سب سے بڑی باربردار سواری اونٹ پر سفر کر رہے تھے۔''

آج کی سب سے بڑی **سواری** پیٹرول پر چلتی تھی۔ گاڑیوں کے قافلے میں بمپر سے بمپر جڑا ہوا لگتا تھا۔ حج کے دوران موٹروں کا استعمال یکسر تبدیل ہو گیا تھا اور ہم اس عہد کی تاریخ کے لوگ تھے۔ اونٹوں کے قدموں کی آواز کی جگہ گاڑیوں کے پہیوں اور ہارن کی آواز نے لے لی تھی۔

اونٹ پر چار سو پاؤنڈ وزنی سامان لادا جاسکتا ہے جو 120 درجہ حرارت کے موسم میں بغیر پانی پیے 20 روز تک 60 میل یومیہ سفر طے کرسکتا ہے۔ وہ مزید پانچ میل اسی حالت میں اس وقت تک طے کر لیتا ہے جب تک گر کر مر نہ جائے۔ کوئی احمق ہی ہوگا جو اونٹ کی قدر نہیں کرے گا۔ دوسری طرف ہماری بس میں سوار کوئی مسافر بھی یہ نہ جانتا تھا کہ اونٹ پر سواری کیسے کی جاتی ہے۔ لیبیا کے فاروق نے اونٹ پر سواری کی تھی جس کا ازراہ تمسخر کہنا تھا: ''ذرا تصور تو کریں کہ آپ سوتی احرام باندھے ہوئے اونٹ پر رکھی لکڑی کی زین پر سوار ہوتے تو کیسا لگتا؟''

منیٰ سے عرفات تک: اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ منیٰ کی پوری آبادی حرکت میں تھی۔ یہ پہاڑی سے نیچے اتر رہے تھے۔ مجھے پہلی بار پوری وادی کا خوبصورت منظر دکھائی دیا تھا جو ایک میل چوڑی وادی تھی، اس کے مغرب میں مکہ اور مشرق میں عرفات تھا۔ راستے میں زیادہ مقامات ایسے آئے جہاں خیمے نصب تھے۔

میں سان فرانسسکو میں ٹریفک کی بھیڑ سے گزر چکا تھا، مجھے یہ بھی تجربہ تھا کہ رش کے اوقات میں نیویارک کی سرنگوں میں گزرتے وقت کیا حال ہوتا تھا۔ میں واشنگٹن کی طرف جاتے ہوئے بھی بہت کچھ دیکھ چکا تھا مگر جو ہجوم یہاں نظر آیا ایسا اس سے قبل کہیں نہ دیکھا تھا۔

جس وقت ہم ویگنوں میں سوار ہو رہے تھے اسی وقت ایک پیلا ہیلی کاپٹر سڑک کے اوپر کچھ بلندی پر نمودار ہوا۔ یہ کافی دیر فضا میں منڈلاتا رہا پھر اس نے ایک تار پر ٹوکری گرائی اور پھر ہجوم میں سے ایک کمزور ناتواں حاجی کو اٹھایا اور پہاڑیوں کی سمت غائب ہو گیا تھا۔ ماردینی نے ہیلی کاپٹر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ ایک گشتی شفا خانہ تھا اور سعودی فوج کے پاس ایسے سات ہیلی کاپٹر ہیں۔ پوری وادی میں ان کے اترنے کے لیے پیڈ بنا دیے گئے ہیں۔

ہم اب عبدالعزیز سٹریٹ کی جانب جا رہے تھے۔ اس طرف پڑاؤ ڈالنے والے زیادہ تر حجاج پاکستانی تھے۔ مجھے ان میں ایسی مائیں بھی نظر آئیں جن کے ساتھ شیر خوار بچے تھے، میں انہیں دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ حج اور وہ بھی جولائی کے مہینے میں اور ہر عورت کے کولھے پر شیر خوار بچہ، مجھے یقین نہ آتا تھا۔ ماردینی نے مجھے بتایا کہ اس میں دراصل معاشی مسئلہ درپیش تھا کہ یہ مائیں ان بچوں کو نرسوں کی تحویل میں ... کر نہیں آسکتی تھیں کہ ان میں اس کی استطاعت نہ تھی۔

گرمی اس قدر زیادہ تھی کہ پانی کی طلب مسلسل پریشان کر رہی تھی جس سے زیادہ عمر کے لوگ بھی پریشان تھے۔ان کیمپوں میں ستر اسی برس کے مرد اور عورتیں تھیں۔کمر جھکی ہوئی لاٹھی کے سہارے چلنے والے، منہ میں دانت نہیں تھے، آنکھوں کی بینائی برائے نام باقی تھی۔انہوں نے یقیناً یہاں آنے کا فیصلہ خود کیا ہوگا تاکہ حج کا فریضہ ادا کر سکیں اور مرنے سے قبل حج کی برکتوں سے مستفید ہو سکیں۔عورتوں کی حالت زار ان سے بھی بدتر تھی۔مرد سفید احرام باندھے بظاہر تو زندہ نظر آتے تھے لیکن درحقیقت ان کا ایک پاؤں اس دنیا میں تھا تو دوسرا، آنے والی دنیا میں، گویا اپنی اپنی گور کے کنارے کھڑے ہوئے یہ بندگانِ خدا حج ادا کرنے آئے تھے۔

پہاڑی سے نیچے اتر کر دیکھا تو ہجوم کم ہو گیا تھا اور کاریں، ٹرک، بسیں اور ویگنیں بہت سے حجاج کو لے کر جا چکی تھیں۔کئی منٹ تک تو مجھے کچھ نظر نہ آیا سوائے فولادی ٹوپیوں اور صندوقوں کے چمکتے ہوئے ڈھکنوں کے۔اب ہم ایک ایسی جگہ سے گزر رہے تھے جہاں سے وادیٔ منٰی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جا سکتی تھی۔

رات کی تاریکی میں سوائے اردگرد کے پہاڑوں کے ہر شے چھپ گئی تھی۔ یہ پہاڑ اس وقت ہر شے پر حاوی تھے۔غار حرا یہاں سے مغرب میں تھی، شمال میں کوہ صابر تھا جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی دینے گئے تھے اور جبریل امین نے انہیں آکر روک دیا تھا۔

ہماری ویگن اب میدان کے درمیان میں پہنچ چکی تھی۔یہاں آکر منٰی، مزدلفہ اور عرفات کے راستے آپس میں مل جاتے تھے۔یہ لمبی اور ریتلی سڑکیں کبھی بلند ہو جاتیں تو کبھی پھر صحرا کو عبور کرنے لگتی تھیں۔یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بڑی سی ٹاٹی دھوپ میں بچھا دی ہو۔یہ راستے صحرا میں ایک دوسرے کے متوازی جا رہے تھے اور اس سے یہ وادی ایک میل کے چوتھائی فاصلے پر مشتمل ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔گاڑیوں کی رفتار رینگنے والے کیڑوں کی رفتار سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ہم اپنے دائیں بائیں سے گزرنے والی گاڑیوں کی رفتار کا اندازہ لگا سکتے تھے۔کبھی کبھی ہماری پوری گاڑیاں نظر آتی تھیں اور کبھی صرف ان کی چھتیں۔مجھے ایسا لگا جیسے صحرا میں کوئی آب دوز چل رہی ہو۔

ہزاروں حجاج پیدل جا رہے تھے۔ان کی کوشش یہ تھی کہ ان کی رفتار قریب سے گزرنے والی ٹریفک جتنی ہو جائے جو گرد و غبار کے بادل اڑاتی جا رہی تھی۔یہ گرد و غبار تقریباً تین میل تک اسی طرح موجود رہا۔فضائی جائزہ لیا جاتا تو یہ پیدل چلنے والوں کا راستہ بہت نمایاں دکھائی دیتا مگر ویگن کے اندر سے اسے ریت

سے جدا کر کے دیکھنا مشکل لگتا تھا۔ اگر ماردینی نے مجھے یہ نہ بتایا ہوتا تو مجھے یہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جہاں گرد و غبار کے بادل اڑ رہے تھے وہاں نظروں کو کسی ایک مقام پر ٹھہرانا ممکن نہیں رہا تھا۔ گرمی کی لہریں ریت میں سے خارج ہو رہی تھیں۔

جہاں یہ وادی تنگ ہو گئی تھی وہاں ہمیں دریا کا طاس نظر آیا تھا۔ اس کے خشک کناروں پر ایک راستہ کاروں کے لیے بنا ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر ٹریفک کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے اپنے اونٹ کی رفتار تیز تر کر لیا کرتے تھے۔

سڑک رفتہ رفتہ بلند ہو رہی تھی اور اس کے دونوں اطراف میں پہاڑیاں ایک جانب رہ گئی تھیں۔ ہم مزدلفہ کے ایک میل چوڑے طاس میں داخل ہو گئے تھے۔ اس وادی میں پھر سے خیموں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پہاڑیاں منیٰ کی پہاڑیوں کی طرح سفید ہو گئی تھیں۔ آٹھویں صدی میں زبیدہ خلیفہ بغداد کی بیوی کی بنوائی ہوئی ایک آب ریز بھی نظر آئی۔ اس سے صدیوں بعد آنے والے زمانے میں حجاج کے لیے بڑی سہولت ہو گئی تھی۔ اس راستے سے خلیفہ ہارون الرشید اور اس کی بیوی زبیدہ نے نو بار حج کیا تھا۔ ان کی آمد پر انہیں خوش آمدید کہنے اور مہمان نوازی کے لیے صبح کے وقت کسی ایک روز ریت پر قالین بچھا دیے جاتے تھے۔

سڑک کے کنارے بنے ہوئے فٹ پاتھوں کو پیدل چلنے والے استعمال کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ حجاج نے کتبے اٹھا رکھے ہوتے تھے جو حجاج کے گروپوں کو اکٹھا رکھنے میں مدد دیتے تھے۔ میں نے اسپین شمالی افریقا کے مُور، لیبیا کے بربر سوڈان کے سیاہ فام، شامی، فلسطینی، کُرد، عراقی، منگول، سرکیشیائی، ایرانی، بلوچی، افغان اور ملایائی، دیکھے تھے۔ میں اس منظر میں اس قدر کھو گیا تھا کہ مجھے یہ احساس ہی نہ رہا تھا کہ ہم نے مزید کتنا سفر طے کر لیا تھا۔

اب ہم ایک ایسی سرحد کی طرف بڑھ رہے تھے جو مزدلفہ کو میدانوں سے جدا کرتی تھی۔ عرفات جو حج کی ایک رسم کی ادائیگی کا مقام تھا۔ اب صرف ایک میل دور رہ گیا تھا۔ وادی کے منہ پر ہمیں دو ستون نظر آئے جن پر سفید چونا کیا گیا تھا۔ یہ مقدس سرزمین کے کنارے کی نشان دہی کر رہے تھے۔ ہماری بائیں جانب ایک اور خشک دریا کا طاس تھا۔ یہاں وہ جھاڑیاں اگتی ہیں جن کے مسواک بنتے ہیں جو مکے میں فٹ پاتھ پر زیادہ بکتے ہیں۔ وادی سے کافی نیچے مسجد نمیرا تھی اس کے مینار بندرگاہ میں کھڑے بحری جہاز کے بادبانوں کی مانند کھڑے تھے جن کی تعداد چار تھی۔

میدان عرفات میں پہنچ کر مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی تھی کہ رٹر اور برکات نے کیوں اپنے اپنے سفرناموں میں لطور مشاہدوں کے اسے دو دو صفحات دیئے تھے۔ عرفات میں پہنچ کر حج ایک موضوع کی وسعتوں سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کا پھیلاؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ وسعت منظر حدِ نگاہ سے نکل گئی تھی۔ ہم مختلف چیزوں کے گرد جو فریم لگاتے ہیں یہ اس فریم میں آ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا مرکز ہر جگہ تھا، یہ ہر استدلال کو درہم برہم کر دیتا تھا اور دل کو کھول دیتا تھا۔

ریت کا چار میل پر مشتمل پیالہ جس میں ہم ابھی ابھی داخل ہوئے تھے اس میں خیمے ہی خیمے نصب تھے جن کے چاروں طرف چقماق کے پہاڑ تھے۔ ایک ہی جیسے سفید کینوس کے خیمے قطار در قطار نصب تھے۔ وقتی طور پر اپنے اپنے گھروں سے دور کئی ملین حجاج ان خیموں میں مقیم تھے۔ انہیں دو سڑکیں ایک دوسرے سے الگ کر رہی تھیں اور حجاج کے اس کیمپ سے یوں بل کھا کر گزر رہی تھیں جیسے نہریں وینس سے گزرتی ہیں، جو دھند میں آ جا رہی ہوں۔ ہم ان کینوس کے دریاؤں میں سے ایک میں آ کر رک گئے تھے۔ اب میں نے اپنی نوٹ بک اپنے تھیلے میں ڈال دی تھی۔ اب مجھے لکھنا کچھ نہیں تھا البتہ خارجی استفسار ضرور کرنا تھا۔ میدان سے ''لبیک'' کی صدا مسلسل بلند ہو رہی تھی۔

ہم ویگن کی کھڑکیوں سے باہر کا نظارہ کر رہے تھے کہ یہ ایک جگہ آ کر رک گئی تھی۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

''جنگ سے پہلے تو تم شہادت کی آرزو میں تھے۔ اب اسے اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ لیا'' (آلِ عمران۔ 3:143)

اگر عرفات یوم حشر کے لیے ڈریس ریہرسل تھی تو ایک بات تو یقینی تھی کہ وہاں تنہا کوئی نہ ہوگا۔ سڑک پر رواں دواں حجاج کے ہجوم دو دنیاؤں کی مخلوق لگتی تھی۔ حج اس وقت نہایت ساوی منظر پیش کر رہا تھا جو حقیقی اور علامتی کے درمیان متحرک تھا۔ باہر ریت پر احرام میں ملبوس ایک حاجی ہماری ویگن کے پاس سے گزرا جس پر سبز جھنڈا لہرا رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ہم ویلس سٹیونز کی نظم میں داخل ہو گئے ہیں۔ گلی میں پھرتے لوگ جنت میں پھرتے انسان بن گئے تھے۔ لوگ خلاء میں فاصلوں پر چھوٹے دکھائی دینے لگے تھے۔ لہراتے ہوئے پرچم پروں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ویگن جھٹکے سے آگے بڑھی، مجمع ایک نقطے میں سمٹ گیا تھا اور ہم اپنی ویگن میں میدان سے نیچے کی طرف پہنچ گئے تھے۔

عرفات: سڑکیں ایک شورش سے پُر مقام میں چھوٹی چھوٹی رگیں تھیں جو ایک بڑے اور پرسکون و خاموش حج کے جسم میں رواں دواں تھیں۔ ہم نے پارکنگ کی جگہ تلاش کر کے اپنی ویگن وہاں کھڑی کر دی تھی۔ اب میں نے کیمپ کے مختلف مقامات کی طرف نظر دوڑائی۔ وادی کے ایک بڑے حصے پر حجاج کا یہ بہت بڑا کیمپ اس وقت ایک چھوٹی سی عارضی دنیا آباد کیے ہوئے تھا۔ سڑکوں کے چوراہوں پر سٹال بھی تھے اور پھیری والے بھی۔

سڑکوں کی نسبت کیمپ ٹھنڈے بھی تھے اور نہایت منظم بھی۔ یہاں زندگی مدھم سروں کے ساتھ گزر رہی تھی۔ ایک نوجوان ایک پلاسٹک کی بالٹی دھونے کے لیے آگے بڑھا۔ تین عراقی عورتیں ایک اسٹوو کے قریب بیٹھی تھیں اور کافی پی رہی تھیں۔ پاس ہی ایک چھوٹا سا بچہ رو رہا تھا۔

وادی میں آج پہلی بار ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگے تھے۔ ہم چلتے جا رہے تھے کہ ہوا میں کچھ کاغذ اڑتے دیکھے۔ دس روز بعد اس میدان میں بھی آج ٹھنڈک محسوس ہوئی تھی۔ ساڑھے دس بجے درجہ حرارت 93° تھا۔ مکہ میں موسم گرما میں اتنا کم درجہ حرارت کبھی نہ سنا گیا تھا۔

ہم کہیں بیٹھ کر منظر سے لطف اندوز اس لیے نہ ہو سکتے تھے کہ خیموں کی گزرگاہوں نے سارا منظر آنکھوں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ مجھے اس موقعہ پر جب کوئی حوالہ نہ سوجھا تو میں نے خیال کیا کہ یہ ممکن تھا کہ حج ادا کیا جائے اور اس منظر سے لطف اندوز ہونے کا خیال ذہن سے نکال دیا جائے۔ سڑک پر کئی بسیں اکٹھی کھڑی تھیں، میں رک کر انہیں دیکھنے لگ گیا تھا۔ یہ سب مقفل تھیں اور ان سب کا رنگ سفید تھا۔ البتہ ان میں ایک چھوٹی سی پٹی آسمانی نیلے رنگ کی بھی تھی۔ ان میں سے ایک کے پیچھے سیڑھی لگی ہوئی تھی جس پر چڑھ کر اس بس کی چھت پر سامان لادا جاتا تھا۔ میں اس سیڑھی کے ذریعے بس کی چھت پر چڑھ گیا تھا۔ اب میں جبل رحمت کا پورا نظارہ کر سکتا تھا۔

یہ وادی کے بند سرے پر کوہ نمیرا کے دامن میں تھا۔ مشرقی سمت دو سو فٹ میدان سے بلند اس کی چوٹی نظر آ رہی تھی جس تک پہنچنے کے لیے پتھر کی بڑی بڑی سیڑھیاں استعمال کی جاتی تھیں۔ چٹانوں کا یہ سلسلہ جو ایک دوسرے کے اوپر واقع تھا حج کا مرکزی حصہ تھا۔ میدان عرفات میں موجود ہر شے کی ساخت، خیمے بھی کا رُخ اس کی طرف تھا۔ ایک اونچا پتھر کا سفید ستون اس کی چوٹی کو ظاہر کرتا تھا۔ بس کے اندر سے یہ بالکل ایک دیاسلائی کے برابر دکھائی دیتی تھی

جبلِ رحمت: میں اب جبل رحمت پر پہنچنے والی ایک درجن پگڈنڈیوں میں سے ایک پر تھا۔ ان پر میری طرح بہت سے حجاج، جبل رحمت کی طرف چل کر جا رہے تھے۔ یوں تو یہ سارا میدان ہی عرفات تھا مگر یہاں سے متعلق ساری کارروائی کی نمائندگی یہ جبل کرتا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کی چوٹی پر جا کر کھڑے ہوئے تھے اس لیے حجاج وہاں تک جانا چاہتے تھے۔

ایک بل کھاتی ہوئی سڑک پوری پہاڑی کے گرد چکر کاٹتی تھی۔ جہاں سے میں نے کھڑے ہو کر اسے دیکھا تھا۔ وہاں سے یہ ایک سڑک نہیں بلکہ چرواہوں سے بھری ہوئی خندق دکھائی دیتی تھی۔ ایک پانی کا سرکاری ٹرک سڑک پر آ رہا تھا۔ حجاج اس کے گرد ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں ان کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا۔ مجھے وہاں سے گزرتے وقت راستے میں پھینکے ہوئے پلاسٹک کے درمیان سے اپنا راستہ بنانا پڑا تھا۔ میں اب دوسری طرف جا کر وہاں کھڑا تھا جہاں میرا منہ جبلِ رحمت کی طرف تھا۔

پتھر کی چوڑی سیڑھیاں پہاڑ کے جنوبی حصے کی طرف جا رہی تھیں۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے پہلے بائیں پھر دائیں مڑنا پڑتا تھا۔ پھر یہ راستہ آپ کو جبل رحمت کی اس چوٹی پر پہنچا دیتا تھا جہاں وہ سفید ستون کھڑا تھا۔ نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد راستے میں ایک پختہ تکیہ بنا ہوا تھا جہاں بتایا جاتا ہے کہ بنی نوع انسان کے جدامجد حضرت آدمؑ اور اماں حوا جنت سے نکالے جانے کے بعد دوبارہ آپس میں مل گئے تھے۔ حجاج یہاں پہنچ کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتے ہیں اور اس منظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اس ہفتے کے شروع میں ایک روز میں یہاں آ چکا تھا جب یہاں کوئی نہ تھا۔ آج میں دور سے دیکھتا ہوں تو مجھے ہر چٹان پر چھوٹے چھوٹے انسان نظر آتے ہیں، ان میں سے کچھ تو سنتریوں کی طرح بے حس و حرکت کھڑے ہیں اور پہاڑ کی چوٹی کے قریب تو ان کے چہرے بھی دور سے بہت چھوٹے لگتے ہیں۔ دوسرے چھتریوں کے نیچے بیٹھے باتوں میں مصروف تھے اور کچھ دعاؤں کی کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ہر چند منٹ کے وقفے کے بعد دو سو حجاج کا کوئی گروپ ایک جگہ مل کر کھڑا نظر آتا تھا۔ یہ اپنے احرام کو کندھوں پر لہرا رہے تھے اور ''لبیک اللھم لبیک'' کی صدا بیک زبان بلند کر رہے تھے۔ ان کی آواز کے جواب میں میدان سے دور بھی آواز کئی حجاج کی زبان سے ایک ہی وقت میں بلند ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

پہاڑی کے پیچھے چٹانوں کا ایک بلند و بالا حصہ تھا جہاں سے چوکور میدان نظر آتا تھا۔ یہ ایک ایسی گیلری تھی جس میں حجاج کے خیمے اور کاریں کھڑی تھیں، آج یہاں ہزاروں مقامی حجاج بھی جمع تھے۔ اہل مکہ

ان رین بسیروں کو گھر کی بہترین نشستیں سمجھتے تھے اور یہ لوگ گھروں سے نکل کر یہاں آ جاتے تھے۔ یہ منظر میدان کے اس پار بے حد دلکش لگتا تھا۔

جبل رحمت کے عین اوپر بہت کم خیمے تھے۔ چٹانوں پر ہر طرف خیمے نصب تھے لیکن ڈھلوانوں پر خیمے بڑی مشکل سے کھڑے ہوتے تھے۔ دراڑوں میں سے کہیں کہیں ببول کی قسم کے پودے پھوٹ آئے تھے۔

سڑک کے بیرونی حصے میں ہجوم کم تھا۔ وہاں کھلی زمین کے غیر متوقع ٹکڑے تھے اور ٹرک کاریں نہیں تھیں۔ وہاں لوگ آسانی کے ساتھ ادھر ادھر گھوم سکتے تھے۔ کچھ تو ہاتھوں میں ہاتھ دیئے گھومتے تھے۔ کہیں کہیں پھیری والوں کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ اب یہ ہجوم گھڑی کی سوئیوں کی حرکت کی مخالف سمت میں چکر لگا رہا تھا لیکن ایسا محض حسن اتفاق تھا کیونکہ جبل رحمت کے گرد چکر لگانا مذہبی رسوم میں شامل نہ تھا۔ ایک منٹ کے بعد ہجوم نے اپنی سمت بدل لی تھی۔ یہ کوئی بامقصد یا طے شدہ طواف ہر گز نہ تھا۔

پہاڑی کے دامن کے نزدیک سڑک کے اندرونی کونے پر جذبات زیادہ ابھرتے تھے۔ میں نے وہاں دس بارہ فلپائنی عورتیں دیکھی تھیں۔ یہ رو رہی تھیں۔ اس سے کچھ آگے ایک پریشان حال حاجی جس کی حنائی داڑھی تھی سڑک کے کنارے مراقبے میں بیٹھا تھا۔ پہاڑی کے اوپر احرام میں ملبوس حاجیوں کے گروپ چڑھ رہے تھے۔ جبل رحمت اس وقت ایک عجیب رنگ پیش کر رہا تھا۔ میں جس قدر اس کے قریب آ رہا تھا۔ میرا ذہن اسی قدر خالی ہوتا جا رہا تھا اور پھر یہ جگہ مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔

میں نے چلنا جاری رکھا اور جلد ہی ایک دوراہے سے گزرا جہاں ایک بوڑھی یمنی عورت سیب بیچ رہی تھی۔ میں نے اس عورت سے اس کے سارے سیب خرید لیے تھے اور آگے بڑھ گیا تھا۔ یہ سیب چھوٹے تو ضرور تھے مگر تھے بالکل سرخ۔ مجھ پر بے خودی یا نیم مدہوشی بالکل طاری نہ تھی بلکہ ایک ضبط اور خاطر جمعی کی سی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔

جبل رحمت پر وقت بہت تیزی کے ساتھ گزرا تھا۔ جب میرے پاس پھل ختم ہو گیا تو میں واپس چل پڑا تھا۔ آسمان دھندلا ہو گیا تھا اور سورج مکے کی پہاڑیوں کے جانب نیچے ہو گیا تھا۔

مکہ مکرمہ، 15 ۔ جولائی: مکہ پہنچ کر مجھے جتنے روز قیام کرنا تھا۔ میں نے زیادہ وقت حرم پاک میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں یا تو اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھتا رہتا تھا، یا مراقبے میں بیٹھ جاتا تھا یا پڑھنا

شروع کر دیتا تھا۔ میں ادھر ادھر ٹہلتا بھی تھا اور خانہ کعبہ کا طواف بھی کرتا تھا۔ میں کبھی کبھی بیٹھ جاتا اور صرف دیکھتا رہتا تھا۔ اس دوران میں مسجد حرام سے بالکل نکل آتا تاکہ جیولری مارکیٹ کے قریب لکڑی کے کسی کھوکھے سے کچھ کھا پی سکتا۔

اب مجھے حج دوسروں کی نسبت مختلف سا لگنے لگا تھا۔ میں نے تصور ہی تصور میں اسے جیسا پایا تھا، میں اسے نقش کر لینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ میرے ذہن سے محو ہو جائے۔ میں نے ایک نوٹ بک میں اس کا خلاصہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ کیلی فورنیا سے میں حج کو ایک ایسا سفر سمجھا تھا جو ایک طبعی منزل تک کا تھا۔ درحقیقت حج ایک سیماب صفت، تغیر پذیر تھا، تمام تر ایک تسلسل، ایک طریقۂ عمل (ایک Process)۔ مجھے اب حیرت ہو رہی تھی کہ میں کس قدر حقیقت سے دور رہا تھا۔ مغرب میں حج کا تصور یہ تھا کہ یہ ایک سفر پر جانے، کہیں ایک منزل پر پہنچنے کا عمل ہے لیکن حج کے اس قریب المرگ تصور کو تسلیم کر لینا غلطی تھی۔ جیسے یہ دعویٰ کرنا کہ گھر کھانے کے لیے جانے کا عمل کام سے فارغ ہونے سے شروع ہو کر گھر کے پورچ میں پہنچ جانے پر ختم ہوتا تھا اور اس میں کھانے کا ذکر بالکل حذف کر دیا گیا ہو۔

مکہ مکرمہ میں آمد تو صرف ایک آغاز تھا۔ حج کی منزل تو یہ تھی کہ اسے اچھی طرح ادا کیا جائے۔ حج کی مذہبی رسوم بہت مشکل تھیں، کبھی کبھی ناقابل پیمائش جیسے زندگی گزارنا۔ اس کے باوجود زندگی کو ایک کتے بلی کی لڑائی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ انسان کہیں اور ہو تو سوائے بہترین لمحات کے، ہر شخص اپنا خیال رکھتا ہے لیکن حج کے دوران لوگ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ حج سفر کی ایک ایسی رسم ہے جس میں دوسرے لوگ بھی شریک ہوتے ہیں۔ میں نے حج کو بجائے اپنی نظروں سے دیکھنے کے دوسروں کی نظروں سے دیکھا۔ اسے اس طرح دیکھنے سے یہ ایک محبت کا عمل بن گیا تھا......

جب پسینہ اور عمل ساتھ ساتھ رہتے تھے تو میں یہاں بطور خاص تعریف و تحسین سے کام لیتا تھا۔ تصور اور خیال میں آنے والے کسی کام سے اور خوب محنت کرنے سے، ایک خاص دورانیے کی روحانی رسم ایک نجی اور ذاتی آرزو کو پورا کرتی تھی۔ خواہ اس کے جتنے پہلو بھی دوسروں کے لیے تھے، یہ تجربہ ایک گہرائی کے ساتھ ذاتی تھا۔ کسی حاجی کو ایک لمحے کے انتخاب کا موقعہ دینا ایک ایسی خدمت تھی جو ازمنہ وسطیٰ کے زائرین کے دنوں سے مغرب میں نہیں پائی جاتی تھی: اس نے مذہبی زندگی کو ایک معراج بخشی تھی۔

☆☆☆

کچھ مترجم کے بارے میں

نام تصدق حسین راجا، آبائی گاؤں بادشاہ پور ضلع چکوال۔ ایم۔ اے انگریزی، ایم۔ اے اُردو کرنے کے بعد اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1985ء میں ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ نسیم حجازی اور ان کی ناول نگاری پر لکھا۔ 1960ء سے 1984ء تک درس و تدریس سے وابستہ رہے اور کئی ایک اچھے تعلیمی اداروں میں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ 1985ء سے 1998ء تک مقتدرہ قومی زبان میں دارالترجمہ کے سربراہ کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ ایک مختصر سا عرصہ محی الدین اسلامی یونیورسٹی نیریاں شریف (آزاد کشمیر) میں بطور کنٹرولر امتحانات/پرنسپل یونیورسٹی پوسٹ گریجویٹ کالج کام کیا اور ان دنوں سلطانہ فاؤنڈیشن، اسلام آباد میں بطور پرنسپل ڈگری کالج برائے خواتین کام کر رہے ہیں۔

تصانیف و تالیف میں ان کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد 26 بنتی ہے جن میں سے بارہ انگریزی سے اُردو میں تراجم پر مشتمل ہیں۔ چند ایک کتابوں کے نام یہ ہیں۔

1۔ داستان میری (آپ بیتی) 2۔ پتھر کی آنکھ (افسانے) 3۔ نسیم حجازی۔ ایک مطالعہ 4۔ نوادرات عرشی امرتسری 5۔ اقبال۔ پیامبر اُمید 6۔ Iqbal-A Cosmopolitan Poet 7۔ یوسف ظفر کی بات 8۔ جیلانی بی اے کی کہانی 9۔ سید مودودی۔ مردِ عصر و صورت گر مستقبل 10۔ واصف علی واصفؒ۔ سوانح و افکار 11۔ اسلام اکیسویں صدی میں (Islam 2000) 12۔ سیدنا بلالؓ (Bilal (RAU)) 13۔ سر تسلیم خم ہے (Struggling to Surrender) 14۔ سید مکی مدنی العربی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (The Life of Muhammad (SAW) The Prophet of Allah) 15۔ اللہ کی نشانیاں (Allah is Known Through Reason) 16۔ عقل والوں کے لیے (For Men of Understanding) 17۔ دنیا اور اس کی حقیقت (The Truth of the Life of this World) 18۔ نظریہ ارتقاء۔ ایک فریب (Evoluation Theory-A Deceit) 19۔ تباہ شدہ اقوام (The Perished Nations) 20۔ معجزات قرآن (Miracles of the Quran) 21۔ مکہ مکرمہ کے ہزار راستے (One Thousand Roads to Makkah)۔



دینی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ

''مکہ مکرمہ کے ہزار راستے'' اسلام اور حج کے متعلق پہلے سے موجود علمی کارناموں میں ایک انمول اضافہ ہے جس میں تاریخ، ثقافتی اور جغرافیائی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے مولف، مائیکل وولف نے گیارھویں صدی سے بیسویں صدی تک کے مختلف حالات کے تناظر میں لکھے گئے حج سفرناموں کا انتخاب مشرق ومغرب دونوں سے کیا ہے، منتخبات میں شامل اس کے اپنے مشاہدات بھی کتاب کے حسن میں اضافے کا باعث بنے ہیں۔ اگرچہ مولف نے مختلف ادوار کے حجاج کے خیالات اور محسوسات یکجا کیے ہیں لیکن اس تنوع کے باوجود ہر ایک کا مقصد ارشاد باری کے آگے سرتسلیم خم کرنا ہی ہے۔ تحریر انوار کی تجلیوں سے بھری ہوئی ہے۔ زائرین نے اپنے حج کے محسوسات کو جس اسلوب میں قلمبند کیا اس کو مترجم، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، نے نہایت ہی دلنشین انداز میں اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ترجمہ زبان کی سلاست اور انداز کی بے ساختگی کا آئینہ دار ہے۔ سادگی میں رچی ہوئی نثر، زبان کی مٹھاس اور لہجے کا ترنم مترجم کے قلمی جہد مسلسل کا ایک پرتو ہے۔ اصل تحریریں غیر رسمی ہیں اور ترجمہ بہت مانوس ہے جو دلوں کو گداز عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی مترجم کی فنی پختگی کی علامت ہے۔ کتاب پڑھ کر یہ احسان گزرتا ہے کہ قاری خود حجاز مقدس کی لطافتوں سے بہرہ ور ہو رہا ہے، ایسا یقیناً عمدہ انداز بیان سے ہی ممکن ہوا ہے۔

ایک مسلمان ہونے کے ناطے صاحب ترجمہ شبانہ روز مسلمانوں کے ذہنی جمود پر دستک دیتے نظر آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ترجمہ کرنے کیلئے وہ ان کتب کا انتخاب کرتے ہیں جن کی گزرگاہ قلب انسانی ہے۔

اس کتاب کا شائع کرنا وقت کی اہم احتیاج ہے کیونکہ دنیا میں بالعموم اور یورپ وامریکا میں بالخصوص اسلام کی منفی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے ایسے میں ایک نومسلم امریکی کے قلم سے ایسی تحریر کا منصۂ شہود پر آنا اور اردو شناس حلقوں کے لئے اس کے ترجمے کی اشاعت سے نہایت ہی مثبت ترتیب پائیں گے، یقیناً یہ کاوش دینی ادب میں گران قدر اضافہ ہے اور مشعل راہ بھی۔

پروفیسر محمد صدیق قریشی

Voice 7352795

پروگریسو بکس یوسف مارکیٹ ۰ غزنی سٹریٹ ۰ اردو بازار ۰ لاہور

ISBN---969-8325-05-Q